

قرۃ العین حید

گردش رنگین



دانیال

گردشِ لنگِ چمن



نور العین، شہناز اور نامید کے نام

گردشِ ناکِ حَمْنِ

قِزَّةُ الْعَيْنِ حَيْدُ

دانیال

”گردش رنگ چن“ کے جملہ حقوق جناب سید مصطفیٰ احمد صاحب (۵۸-سی ہلاک ۴-
گلشن اقبال-کراچی) کے نام محفوظ ہیں۔

سال اشاعت : جولائی ۱۹۸۷ء

قیمت : ۲ سو روپے

طابع : شکیں پرنٹنگ پریس کراچی

سرورق : خلیق ٹوئچی

ڈاکٹر امینہ نور الدین احمد

کتابت : سید محمد احمد ششی

ناشر : ملک نورانی

حوری نورانی

مکتبہ دانیال : وکٹوریہ چیمبرز ۲

عبدالقادر دہلوی، وڈ کراچی



ع گرویش رنگ چمن ہے ماہ و سال عند لیث
غالب

خطاطی از ڈاکٹر امینہ بیگم

ناول کی تصاویر مصنفہ نے بنائی ہیں۔

۲۴۴ : دیوانِ ملکہ جان کا سرورق بشکریہ اردو سیکشن، برٹش لائبریری لندن۔

۶۰۴ : کی آبی تصویر ایک انگلش لتھوگراف پر مبنی ہے۔

ترتیب : پیہرا رائے چودھری۔

ہنرست ابواب

- ۱ - جل بہار ۱۳
- ۲ - جو ٹھکوں تو شاخِ کلاب ہوں ۳۷
- ۳ - سرخِ پٹارمی ۸۶
- ۴ - سرائے طغرل بیگ  ۱۰۵
- ۵ - تختِ رواں ۱۱۶
- ۶ - دعاؤں کا سفر ۱۳۷
- ۷ - دشتِ ماریہ ۱۴۶
- ۸ - چورن والی جَن ۱۵۵
- ۹ - پریوں کا کھٹولہ ۱۵۹
- ۱۰ - دیکھو کھیلیں دھمالِ خواجہ معین الدین ۱۸۶
- ۱۱ - اڑھائی دن کا جھونپڑا ۱۹۳
- ۱۲ - مسِ نواب باقی اف جے پور  ۱۹۹
- ۱۳ - پورٹریٹ اف اے ناچ گزل ۲۰۳
- ۱۴ - روشن چوکی ۲۱۰

۲۱۶

۱۵۔ ہیراجنم امول تھا

۲۲۶

۱۶۔ پری چہم



۲۲۵

۱۷۔ ماہ و سالِ غذیب

۲۶۹

۱۸۔ ولایتی چکر

۲۸۱

۱۹۔ پھول والی گلی

۲۸۷

۲۰۔ نیک پروین

۳۰۹

۲۱۔ تارے والی کوٹھی



۳۲۵

۲۲۔ پری محل

۳۳۷

۲۳۔ لال بی بی

۳۴۵

۲۴۔ نور ماہ خانم

۳۵۳

۲۵۔ یہ قصہ ایک نوجوان برطانوی اسکالر کی نظر میں

۳۸۸

۲۶۔ گھر گھوڑا انخاس مول

۴۰۴

۲۷۔ اندر جال عرف اسرار دربار پردھان پور

۴۱۳

۲۸۔ تاش کا محل

۴۲۵

۲۹۔ نواب بیگم کی واپسی



۴۵۷

۳۰۔ بیل تھ کلب

۴۶۴

۳۱۔ جھار و تارا

۴۷۶

۳۲۔ جہان مستور

۴۸۰

۳۳۔ علی کا دھونا

۴۹۷

۳۴۔ بن دیوی



۵۰۸

۳۵۔ مارٹین کوٹھی

۵۲۰

۳۶۔ بن ساگر کے باسی

۵۲۹

۳۷۔ دریائے نور

۵۳۹

۳۸۔ روم و تبریز

۵۴۵

۳۹۔ جنگل میں جگنو

۵۵۷

۴۰۔ قطب ستارہ

۵۶۷

۴۱۔ مدھوبن

۵۸۸

۴۲۔ کلیانی ندی



۶۰۷

۴۳۔ بیلے میں میلہ

۶۱۷

۴۴۔ گل عجائب

۶۲۶

۴۵۔ خطِ سوم



۶۴۸

۴۶۔ جنگلی بطخ



۶۷۸

۴۷۔ دریائے نما

۶۸۳

۴۸۔ پانیوں پہ بہتی موسیقی

ختنامہ-۶۹۹





(۱)

جل بہار

”واہ۔ بڑی نقتے باز جن بندی ہے صاحب۔“ ڈاکٹر منصور کا شغریٰ نے گلِ عجائب کے نیچے سے گذرتے ہوئے داد دی۔

”تسلیم۔ آپ نے آج نوٹس۔“ ڈاکٹر عین بیگ نے روش پر ہلکی شاخ ہٹائی۔
 ”بچھلی بار جب ہم آئے موسلا دھار بارش۔ ہاتھی ڈباؤ گھاس کیا پتہ چلتا۔“ منصور نے ٹھٹھک کر کوٹھی پر نظر ڈالی۔ ”مکان بھی تم نے معقول خریدا۔ ایک برساتی اور نواو تو بے چارے شو چاؤلی کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے۔“

”یہ کون صاحب ہیں؟“

”اماں وہی چینی شاعر۔“

”میں کسی چینی شاعر کو نہیں جانتی۔“

”کوئی مضائقہ نہیں۔“

”نہ جا پانی نہ کویریں۔“

”تو وہ کہنے لگا۔“

”کب؟ اچھا ابھی جب تم چین گئے تھے؟“

”سودا دہزار سال پہلے۔“

”تم سودا دہزار سال پہلے چین گئے تھے اور اب لوٹے ہو۔“

”وہ کہہ رہا تھا۔“ منصور نے تنگلے سے ٹک کر ڈھال کے نیچے ہی گومتی کا جاترہ لیا۔ ”ایک

شام وہ بے چارہ اسی طرح اپنے گھر کے پھانک پر کھڑا تھا۔ سامنے زرد دریا پر زرد سورج۔“

”کیا وہ یرقان کا مریض تھا؟“

”اچھا خبر۔ سرخ سورج زرد دریا میں ڈوب رہا تھا۔ تب اس نے اپنا باب اٹھا کر یوں گایا:
 میں نے آدمیوں کی بستی میں گھر بنایا ہے۔
 اگر تم اس کی وجہ پوچھو تو میں کہوں۔
 میرا دل کہیں بہت دور رہتا ہے۔
 اور خود ہی اپنا ساتھی ہے۔
 مشرقی جگہ کے پاس کھڑا میں کاہلی سے گل داد دیتی توڑا کرتا ہوں،
 سکون کے ساتھ میں جنوبی پہاڑوں کو ٹکلتا ہوں۔
 ڈوبتی روشنی میں پہاڑی ہوا خوش گوار ہے،
 آوارہ پرندوں کے جوڑے اڑے جا رہے ہیں،
 ان باتوں میں کچھ گہرے معنی موجود ہیں۔
 میں اس کا اظہار کرنا چاہتا ہوں
 مگر اچانک وہ الفاظ بھول گیا۔

منصور خاموش ہو گیا۔ ہوا میں خشکی تیر رہی تھی۔ گوشتی پردہ دور تک روشنیاں جل اٹھیں۔
 پرندوں کے جوڑے بسیرا لینے درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

”باغ میں آؤ مغربین
 ”باغ ہی میں تو ہوں۔ تم واپس آؤ ڈاکٹر منصور جہاں کہیں بھی ہو۔“
 ”مجھے ایک وکٹورین نظم یاد آگئی تھی ! COME INTO THE GARDEN, MAUD !“

وہ مکان کی طرف لوٹے۔
 ”تمہیں اتنی ساری چیزیں کیسے یاد رہتی ہیں۔“
 ”یاد رہتی ہیں۔ بس وہ لفظ بھول گیا۔“

”مجھے بھی وہ الفاظ نہیں آتے۔“

”مگر تم وہ برسانی تمز و ربوالو“

”اجی ہاں اتنا آسان ہے۔ آجکل کے زمانے میں۔ ابھی ماشائیں ایک ہاتھ روم جو ADD

کرنا ہے۔ وہ شاردانے میسرے کھاتے میں ڈال دیا۔“

”تو چینی شاعر اپنے دوستوں کی گاڑیاں کہاں کھڑی کرے گا؟“

”چینی شاعر یہاں کہاں سے آگیا۔؟ گاڑن روم کا سلائیڈنگ پٹ کھسکا کر بیٹھے

سفید بالوں اور شرتی آنکھوں والی ایک خاتون نے دریافت کیا۔

”ایک اچھا شاعر ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ ہر زمانے میں۔ گڈالوننگ مسزینگ۔“

”بیٹھے رہو۔“ انھوں نے جواب دیا اور نہایت مصروفیت کے ساتھ سنہری زنجیر سے

آویزاں عینک لگا کر گل رنگ آسمان کے مطالعے میں منہمک ہو گئیں۔

”میں نے وہاں وہ دیکھیں۔“ منصور نے دریچے کے قریب پہنچ کر بیچ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کہاں کیا۔“ عنبرین نے کھڑی بجری پر گرائی۔

”سینکینگ کے ایک غار میں۔ تصویریں۔ وہ تصویریں باقی ہیں۔ ترپھی آنکھوں والی منگول

شہزادیاں۔ ریشمیں قبائیں۔ بند ریشمیں جوتے۔ ہاتھوں میں لائے ڈنٹھلوں والے پھول دوہڑا

سال سے منجمد اور منتظر۔“

”تم کو کیا معلوم کہ وہ شہزادیاں تھیں یا غریب مصیبت زدہ عورتیں جنہیں اچھے کپڑے

پہنا کر تصویر بنانے کے لئے کھڑا کر دیا گیا تھا؟“ مسزینگ نے دریچے میں سے پوچھا

منصور نے پلٹ کر کہا ”MA'AM آپ کے گلاب بہت کامیاب رہے۔ آؤٹ سائز؛

سکاغذی خوشبو سے عاری۔ دوغلے۔ پرانے اصل گلاب وہ رہے۔ بے چارے

مغلوں کے لائے ہوئے خوشبودار“

”تمہارے ہاں ٹی روز ہے؟“

”ہاں۔ تاکہ انگلش کنٹری سائیڈ کی یاد دلاتا رہے۔“

”تمہاری امی جب فلاور شوں اپنے گلاب بھیجیں تو انہیں چاہئے کہ کارڈ پر محض گل عنڈلیب لکھیں۔ اپنے نام کے بجائے۔“

”واہ گل عنبریں کیوں نہ لکھیں؟“

”کیونکہ عنڈلیب بالونیکم انکا نام ہے اور HYBRID گلاب اگانا انکا مشغلہ۔ تم اپنے کچن گارڈن کے پھول گو بھی دو بھی بھیج دینا گل عنبریں کے نام سے۔“

”تھینک یو۔“ عنبریں نے ہونٹ چمکائے۔

”تم نے اس کو ٹھی کا نام تو اب تک سوچا ہی نہیں۔“

”گلشن آفریدہ۔“ عنبریں نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔

”کیوں بھی۔ بالکل آفریدہ۔ گوشتی کی مناسبت سے اس کو تو جمل بہار کر لو۔ نرسنگ ہوم کا نام ماشا اللہ تم نے اچھا رکھا کہ منصور۔ شاردہ۔ عنبریں = MASHA۔ میں نے عرض کیا تھا۔ شاردہ منصور عنبریں SHAMA بہتر رہے گا اہل ہندو سے شاما بھیجیں گے۔ مسلمان شمع۔ قومی یکمیت بھی ہوتی رہے گی۔“

”شمع! نرسنگ ہوم ہے یا فلمی رسالہ۔؟“

”باغ عدن میں۔“ درتچے سے آواز آئی ”آدم و حوا چیمزوں کے نام تجویز کر رہے ہیں

لیکن بے چاری حوا کی رائے کس نے لی تھی۔ تمہارے اللہ میاں نے نام بھی آدم ہی سے۔“

”تمہاری امی WOMEN'S LIBBER بھی ہیں؟“

”زبردست۔“

منصور نے نظر اٹھائی۔ یرندوں کی ڈارپس اور خواتین بادلوں کے نیچے نیچے سلوموشن میں گذرتی جا رہی تھیں۔ عنبر گارڈن روم کی طرف چلی گئی۔

”یہ سارس“ عنڈلیب بیگ نے کھرٹکی میں سے اطلاع دی ”سایبر سے آئے ہیں۔“

”پرسوں نرسوں میں نے ایک کارٹون دیکھا۔“ منصور نے بیچ کے ستھ پر کہنی ٹیک کر بزرگ خاتون کو مخاطب کیا۔ ”کہہ ارض ہے۔ اس پر قطب شمالی کی جگہ بمبئی اور اس کے اوپر سے پرندوں کی تنکون نما ذاریں گزر رہی ہیں۔ دو چڑیاں اس فلائیٹ فورمیشن میں سے ذرا ہٹ گئی ہیں ان کا لیڈر ڈانٹتا ہے۔ خیال رکھو۔ نیچے سالم علی رہتے ہیں۔“

”لولی۔“ مسز بیگ نے قہقہہ لگایا۔ ”میرے نانا کبوتروں اور بیٹروں کی حد تک گلی شاہ تارا دلی کے سالم علی تھے۔“

”ان کا کبوتر آسمان پر پہنچ کر تارا رہو جاتا تھا؟“

”ٹھہرو۔ میں ذرا قطب ستارا تلاش کر لوں۔“ مسز بیگ نے پھر عینک لگائی۔

”ابھی پہلے روز“ منصور نے عجز میں کو مخاطب کیا۔ ”جب میں تمہارے ہاں آیا اور گیٹ روڈ کے غلٹانے کا رستہ دریافت کیا، تم نے کہا، ادھر سے چلے جائیے جدھر اتمی کا اسٹوڈیو ہے۔ تو مجھے بہت عجیب سا لگا۔ زیادہ تر اتمی لوگ کے لئے کہا جاتا ادھر سے جائیے جہاں اتمی کی نماز کا تحت پچھا ہے۔“

”اتمی نماز نہیں پڑھتیں۔“

”میں نے بہت کم امتیاں ایسی دیکھی ہیں جو نماز پڑھتی ہوں۔“

”وہ دیکھو ایک قاز جا رہی ہے۔“ مسز بیگ نے آواز دی۔

”بلوچی لوگ قازوں کو حاجی کہتے ہیں۔“ منصور نے انہیں بتلایا۔ ”ہر سال عربستان کی سمت پرواز! حاجی تعلق۔“

”قطب ستارہ تو بادلوں میں دکھائی نہیں پڑتا۔ پر زمرہ۔ زمرہ بہت تیزی سے چمک رہی ہے۔“ مسز بیگ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اور غائب ہو گئیں۔ گلو تیا سوان سن کے لڑزاں کلوز اپ کی طرح۔

”سن سیٹ بولوار۔“

”کیا۔؟“

”تمہاری والدہ اس وقت بالکل گھور یا سوان سن معلوم ہوئیں۔ بے حد صبر رہیں گے۔“
”ہوں۔“

”اب بھی ہیں۔“

”ہوں۔ میں تو سہی۔“

”زمرہ بھی غائب۔“ مسز بیگ نے پھر دریغ میں سے جھانک کر اطلاع دی۔
”میس۔ کیا آپ شامانی ہیں؟ آپ کے اجداد تو تھے ستارہ پرست جب وہ سائبریا سے
چلے۔ اور میرے بھی۔“

”نہ شامانی نہ ٹامانی۔ اے منصور بیٹا۔ اب تم سدھارو۔ بارش گھری کھڑی ہے۔“
”یس۔ میس۔“

”مسز بیگ پھر غائب۔“

”سنو۔“ عنبرین نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے بھی لامارٹینیر میں پڑھا ہے؟“
”لامارٹینیر۔۔؟“ وہ ہنس پڑا۔ ”مدرسہ فقیوری بھی۔ انٹر سائنس کے لئے علی گڑھ جانے
سے پہلے انگریزی کپڑے نہیں پہنے تھے۔ تھے ہی نہیں کھڑاؤں اور اسٹگ پاجامہ اور سر پر گول
ٹوپی یہ جو تم ہندوستان میں ہر جگہ دینی مدارس کے غریب طالب علموں کا حلیہ دیکھتی ہو محاکر
بھی ایسا ہی تھا۔“

”پھر تم ایسے سوفٹی کیٹ ٹیکوں کر بنے۔؟“

”لمبا قفہ ہے بائیس سال کی عمر سے برٹش اور امریکن اپر کلاس والوں کی صحبت۔ دس
سال BOSTON BRAHMINs کا علاج معالجہ۔ لیکن تمہیں ایک بات بتاؤں؟ اپنے
اور بچن کو نہیں بھولا۔“

”اور بچن یاد رکھنا ضروری ہے؟“

”بالکل نہیں۔ اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔“

”تم ڈاکٹر نہ بنے تو کیا بنے؟“

”آبازندہ رہ گئے ہوتے تو مولوی۔ باقاعدہ ندوی یا دیوبندی مولانا۔ مگر وہ کیا ہے۔“

خارا کا پیشہ آذر تراشی — ارے بھئی وہ کیا ہے — کار مچلاں — خارا کا پیشہ — نہیں — ارے اس پر یاد آیا — ”منصور نے اطمینان سے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ ”ابھی بمبئی میں ایک صاحب ملے پیشہ انکا تکیہ کلام ہے۔ پیشہ۔ پیشہ ڈاکٹر صاحب ہر مرض کی دوا ہے پیشہ۔ سارا کھیل ہے پیشہ کا۔ دراصل مجھے اس وقت انہی کی والدہ کو دیکھنے جانا ہے۔ وہاں سے ایک اور مہاپو بنی پتی کے ہاں جاؤں گا۔ ان کی بڑی بہن علیل ہیں۔ سنو عنبر۔ وہ خاتون اب تک پورے چونتیس سال ناول لکھ چکی ہیں پینتیسواں زیر تصنیف ہے۔ پچھلے ناول کا نام تھا آریس مصحف اس سے پچھلا زمرہ کا گلوبند“

اچانک ندی اور آسمان آتش بازی سے چمک اٹھے۔
 ”آج شب برات تو نہیں ہے؟“ منصور نے چونک کر پوچھا۔
 ”نہیں تو۔ یہ گورنمنٹ نے لکھنؤ فیسٹول کیلئے شاہی کی جل بہا اور بسنت کا میلہ ری والیو کیا ہے۔ آتش بازی۔ کنکورے بازی اور پیراکی کے مقابلے۔“

”آہا۔ میں تو لکھنؤ بہت برسوں کے بعد آیا ہوں۔ یہاں ایک مذہبی جل بہا کی رسم بھی قدیم سے چلی آتی ہے۔ گوشتی کی کشتیوں پر آتش بازی شب برات کی شام۔ لوگ باگ سبے ہوئے بچروں پر بیٹھ کر بارہویں امام کے نام عریضے گوشتی میں بہا دیتے ہیں۔ کورے کاغذ پر زعفران سے لکھ کر۔“
 ”اگر تم عریضہ ڈالو گوشتی میں تو اس پر کیا لکھو؟“

”اں — یہی کہ ماتنا خوب چلے۔“

”بس —؟“

”اور کیا۔ وہی تو آج کل ہمارا مسلہ ہے لیکن میں اس قسم کے توہمات سے سرکار نہیں رکھتا۔“

”وہابی —!“

”جو سمجھو۔ انسان کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور اپنے دماغ اور جو جملے پر۔“

اچھا بھئی اب بھاگتے ہیں۔ ”وہ بیچ سے اٹھا۔ راستے میں ذرا جل بہا رملنا خطہ کرتے جائیں گے۔“

”ہا ہا — گوشتی کی جل بہا رکھو۔ بارہ من کی دھوبن دیکھو —“

CYNICAL عینین ۱. گڈ ناسٹ —

وہ قریب کھڑی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

باغ میں جگنو چمک رہے تھے۔ آسمان پر تارے اور آتش بازی کی روشنیاں۔ عینین کھڑی اٹھا کر دریچے کے پاس گئی۔ "امی جان —"

"میں ڈیر —"

"امی آپ بالکل بیچ اینڈ جوڈی شو کی طرح کھڑکی میں آجاتی ہیں!"

"ہا ہا — بیچ اینڈ جوڈی شو —"

"امی — ہم گوتی میں عربیہ — ہمیں — وہ — امی ہم ہر ساری بنوالیں؟ چینی شاعر —"

"ارے بیٹا — چینیوں کے مکان تو میں نے سنگار پور میں دیکھے تھے ۱۹۲۴ء میں ایک سے

ایک فینسی فینک — سرخ نقش و نگار — سرخ فریم والے گول دروازے —"

"امی یہ لکھنؤ کا گول دروازہ بھی چینیوں نے —"

موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ تیز روشنی

"— چینیوں نے بنایا تھا؟ ارے تم — خیریت؟"

"آلہ مقیاس الہ باد! انھوں نے بھول کیا تھا — ثابت ہوا ڈاکٹری میں میرا دل نہیں لگتا —"

"تو میرا کون سا لگتا ہے —!"

"آدھی آدھی عمر میں اپنی پردیس میں خدائی خوار پھر کر پیشہ کماؤ۔ وہ سارا اٹھا کر مٹا میں

جھونک دو۔ پھر کہو ڈاکٹری میں دل نہیں لگتا۔ شاباش۔ بہت کامیاب بزنس پاؤں نہ ثابت

ہو رہے ہو تم دونوں —" مسز بیگ سنجیدگی سے بولیں۔

"کم آؤں اولڈ گرل — آج شام یہ تھوڑا سا پیشہ نہیں کما لے گا تو کیا غضب ہو جائے گا۔

منصور اندرجا کرفون کروان دونوں مالبجولیاٹی امیرزادیوں کو۔ کل صبح کلینک میں حاضر ہوں —"

"شیور — اس کے بعد ایک عدد PIZZA —"

”چلے گا۔“ عنبرین دوڑتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ اسے بھیگے درختوں میں اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

دریچے میں کھڑی عندلیب بیگ آہستہ سے بولیں۔
 ”چھول گوبھی کو گل عنبرین پکارنے والا مذاق آئندہ نہ کرنا۔ اسے کوپلیکس اسی بات کا ہے کہ وہ ایک PLAIN JANE ہے۔“

”آئی ایم سوری میم۔ میں نے تو محض تفریحاً۔“ وہ آئی ایم سوری۔ مجھے بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے۔ بیوقوفی کی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ آئندہ خیال رکھوں گا اور عنبر PLAIN JANE کہاں ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے۔“

”واقعی۔؟“

”بالکل۔ یقیناً۔“

”آئی ایم گلیڈ۔“ مسز بیگ نے مطمئن سی سانس لی۔ ”پانی گرنے لگا اندھا جاؤ۔“

”میم۔ یہیں کھڑکی میں سے کوڈی ماروں؟“

”WHAT'S THAT - P.“

”سوری۔ میں بمبئی کی زبان بول رہا تھا۔ یعنی کوڈ جاؤں۔ دیکھئے یہاں سے برآمدے تک ایک دم کتنی کچھڑ ہو گئی۔“

”ڈونٹ بی سلی۔ لوگ کیا کہیں گے۔“

”لوگ یہاں کون ہیں؟“

”اسی وقت کوئی آن پہنچا عنبرین کا پشینٹ اور وہ کیا دیکھتا ہے کہ مشہور و معروف ڈاکٹر کا شغری مشہور و معروف ڈاکٹر بیگ کے گھر میں رات کے وقت کھڑکی کے راستے۔“
 اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اچانک وہ سیٹی بجائی کھڑکی میں سے غائب ہو گئیں۔ منصور نے ذرا متعجب ہو کر کان لگائے سیٹی کی دھن مانوس سی تھی اب مسز بیگ نے اسی دھن کو نیچے سڑوں میں الاپنا شروع کیا۔ ”شام ڈھلے کھڑکی تلے تم سیٹی بجانا چھوڑ دو۔ شام۔“

وہ بھونچکا سا سر جھکائے پتلون کے پائینچے اچکا کر آمد سے کی طرف روانہ ہوا۔ عجیب
چلتی بڑی بی ہیں۔ بڑکی اتنی متین اور بڑبڑا اور والدہ سیٹھیاں بجا رہی ہیں۔

صدر دروازے کی چٹخنی کھلی۔

ڈائیننگ روم میں داخل ہو کر ڈاکٹر منصور نے چائیں طرف نظر ڈالی۔ میز پر بڑھیا بلجین لیں
کی چادر۔ ڈل سلور۔ وسط میں رو پہلا شمع دان۔ دیواروں پر یورپین شہروں کے مناظر ستر بیگ
کی تباہی ہوئی کرسی پر بیٹھا نیکیں اٹھایا۔ عنبرین گرما گرم PIZZA لے کر داخل ہوئی۔ پلے کی ایسی
لہجہ آنکھوں والا نیپالی ملازم قابو سے بھری کشتی اٹھائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

کھانا شروع ہوا۔ ڈاکٹر منصور کا شغری نہایت مطمئن اور ہنسی ڈوری معلوم ہو رہا تھا۔
ستر بیگ کے غیر متوقع فلمی گیت سے جو وقتی حیرت طاری ہوئی تھی زابل ہو چکی۔ مانوس امسکین
اسٹائیل کینڈل لایٹ ڈنر شائستہ، ذہین، باذوق شگفتہ مزاج میزبان خواتین۔ بچہ مزیدار
کھانا۔ دنیا میں انسان کو اور کیا چاہیے۔

عنبریں — ”پیزا کا ٹکڑا کاتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ تم کو ان مایخو لیاٹی
مصنف کا دولت کدہ دیکھنا چاہئے۔ تم بھی جب امیر کبیر ہو جاؤ اپنا مکان اسی طرح سجائو۔ ساٹن
بروکیٹ کے پردے۔ اور صوفے سنہری مچھلیوں سے بھر لینگ۔ باپ رے۔ ایل۔ ایم سی
ٹیٹ میں حرف آخر“

”ایل۔ ایم سی۔ ٹیسٹ کیا ہوتا ہے؟“ ستر بیگ نے دریافت کیا۔

”بجسٹو محمد ن کو نسل —؟“ عنبریں نے سوچ کر پوچھا۔

”LOWER-MIDDLE-CLASS TASTE“ منصور نے جواب دیا۔

”ان کا گھر دیکھو گی تو سمجھ میں آئے گا کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ایل۔ ایم۔ سی ٹیسٹ سارے ملک میں پھیل گیا ہے۔“

”یہ کون لوگ ہیں؟ آپ اسٹارٹس؟“

”نہیں۔ پرانے جاگیردار۔ مگر عصری بد مذہباتی کا شکار۔ بالکل یو۔ کے۔ پی۔“

”یو۔ کے۔ پی۔ کیا مطلب؟“ عین نے پوچھا ”یونائیٹڈ کنگ ڈم اٹ۔“

”نہیں۔“

”یونین کیر آلا پروڈکٹس۔“

”نہیں۔ اور سوچو۔“

”یو۔ کے۔ پی۔ یو۔ کے۔ پی۔ نہیں۔ تم بتلاؤ۔“

”آلو کے پٹھے۔ وہ۔ لال باغ سے جو سڑک حضرت گنج جاتی ہے۔ وہاں ایک زمانے

میں لال سییاں رہا کرتی تھیں۔“

”لو صاحب ایک اور معتمہ حل کرو۔“ عین نے مصنوعی الجھن کا اظہار کیا۔

”سز بیگ غور سے سُننے لگیں۔“

”لال سییاں کون ہوتی تھیں؟“ عین نے پوچھا۔

”ان کی وضاحت کا یہ وقت نہیں۔ بات سنو۔ تو ان میں سے ایک لال بی بی جس کی سب سے

بڑی کوٹھی تھی وہ پاکستان چلی گئی وہ کوٹھی سرکاری نیلام میں ایک پنجابی شہزادہ نے خرید لی

ایمر جنسی لاگو ہوتے ہی وہ حضرت انکم ٹیکس کے گول مال سے بچنے کے لیے راتوں رات کینیڈا

بھاگ گئے کوٹھی ان سابق زمینداروں کے ہاتھ بیچے گئے۔“

”کمپنی اسٹائل بنگلہ تھا۔ اسے گر اکر ان لوگوں نے BAD-TASTE MODERN

سہ منزلہ مکان۔۔۔ پر سی محل۔۔۔ دختر بلند اختر کے نام پر۔“

”تم نے وہ پرانا بنگلہ دیکھا تھا؟“

”ہاں بھی۔ اس پنجابی بزنس مین کا لڑکا میرے ساتھ۔“

”لال سییاں کون چیز تھیں؟“ عین نے بے صبری سے دہرایا۔

”پھر بتاؤں گا۔۔ اس دفعہ وہاں اس طرح پہنچا کہ ناول نگار خاتون کی ہمیشہ خبر دکان آیا۔ سنا ہے چین سے ایکوپنکچر سیکھ کر آئے ہیں۔ باجی جان کو ARTHRITIS —
”عرض کیا بندہ نیورولوجسٹ ہے ایکوپنکچر تو تفریحاً سیکھ لیا تھا۔ بہر حال ساڑھے
پانچ بجے شام وقت مقرر ہوا۔ یہ پچھلے مہینے کی چار تاریخ کا واقعہ ہے۔“

”کب کہاں کیوں اور کیسے۔“ ”عزیزین بولی تم جرنلسٹ کیوں نہ بنے۔“
”یاں ہر بات ہر معاملہ بالکل صحیح، بلاکم و کاسٹ اور پکا ہونا چاہئے، مسزنگ نے صاف دیکھا۔
”منصور تم کیا ہر وقت لیبورٹری میں بیٹھے رہتے ہو؟“ ”عزیزین نے پوچھا۔
”ایک حد تک۔“

”کبھی کبھی تنہا بھی تھوڑے۔۔۔“
”اس میں خطرہ ہے۔“

”منصور میاں میں تمہاری ہم خیال ہوں۔ انسان کو بالکل منطقی ہونا چاہئے اور واضح جوہم
ایشیائی ہیں ہی نہیں۔ ہمیں فرانسیسیوں کی طرح ہونا چاہئے۔ منطقی۔۔۔“
”اتنی بات لال لال بی بی کی کوٹھی کی ہو رہی تھی۔“

”سنو تو سہی۔ ابھی عقل کو تنہا چھوڑنے کا وقت بھی آیا چاہتا ہے۔ میں کوٹھی کے پھاٹک
میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا احاطہ چند درخت، کنکر پیٹ اور شیشے کی پہاڑی جیسا مکان اور
چاروں طرف سناٹا۔ میں نے عمارت کا چکر لگایا۔ ایک طرف ایک بڑے میاں تہمد باندھے اُچک
اُچک کر لگی کے ذریعے امرود توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اشارہ کیا کہ ایک امرود
جو بہت اوپر لگا ہوا تھا توڑ دوں۔ میں نے درخت کے گرد گھوم کر مطلوبہ امرود کا جائزہ لیا۔ انسان
اچانک غیر متوقع حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ دوسرے لمحے میں تنے پر یادوں کا کرناخ پر موجود! نیچے
سے بڑے میاں ہشکار رہے ہیں۔ بیٹا بندر کو۔

”لے کے تھر کا نام آگے بڑھ کر کو۔“

”مسترے پن کی سولیشن تھی۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ وہ امرود توڑ کر ہی دم لوٹگا۔“

چنانچہ جوتے موزے اتار کر شاخ پر پیر جمائے۔

”دحقیقت میں اسوقت اپنے بچپن میں پہنچ گیا تھا۔ دنیا میں اس گھڑی میں تھا اور وہ جہلی بڑے میاں۔ اور امرود کا بیڑ۔ اور میں ساری فکرؤں سے آزاد۔“

”امرد توڑ کر نیچے اترا تو کیا دیکھتا ہوں وہ بزرگ میرے موزے پہن کر بگٹ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ حیران پریشان درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ تب مجھے صورت حال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ اتنے میں ایک حاتون پھیلے برآمدے میں نمودار ہوئیں۔“

”ہیردین کا اسٹیج پر داخلہ۔ کیا پہننے تھی؟“

”نیل نعل کا جپ شوٹ۔“

”صورت شکل؟“

”بس ٹھیک تھی۔“

”غمر۔۔۔؟“

”وہ کل پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ بعد تسلیمات دریافت کیا آپ ڈاکٹر مفقو تو نہیں؟ میرے پیروں پر نظر ڈالی۔ میں نے کہا آداب بجالاتا ہوں۔ میرے موزے۔۔۔ ندامت سے بولی۔“

معاف فرمائیے گا یہ ہمارے منشی جی ہیں۔ ہماری مرحوم ریاست کے پرانے منیجر۔ سینائیل ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ کچھ نہیں کہتے۔“

”منشی جی احاطے کی دیوار پر چڑھ چکے تھے وہاں سے نعرہ لگایا۔ عوج بن عتیق زندہ باد۔“

”پاگلوں کا گھرانہ نہیں تو۔“ عندلیب بیگ نے اظہار رائے کیا۔ ”مگر کوئی بہت ہی معتد اور فاندانی لوگ ہیں۔ پرانے کارندے کی اتنی دلداری۔۔۔“

”جی۔ چنانچہ وہ ذرا شرمندہ سی موزے اتروا کر لائی۔ اب ان کو کیا پہننا لپک کر اندر گئی اور بڑھیا مغللیں ٹرکس سلیر لے آئی۔“

”جوتے کیا ہوئے؟“ عبیر نے پوچھا۔

”قبلانی بہادر لے بھاگا تھا۔ وہ بھی بہت مدتیغ اور شانداڑ تھا۔ اصل افغان ہاؤنڈ۔“

کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ سڑکوں کے آوارہ کتوں کیتوں کی شکلوں پر کیسی مسکینی عاجزی اور عزت

برستی ہے۔ ان کے ایک سپریشن بھی وہی ہوتے ہیں مفلس لاچار انسان جیسے۔ اور اعلیٰ پالتور۔“
”منصور۔ ٹریک پر واپس آؤ۔“

”اچھا تو میں وہ سلیپر بہن کر خاتون کے ساتھ اندر گیا۔ ان کی بڑی بہن ایک گلابی دیو ادوں والے کمرے میں شیز لونگ پر نیم دراز مصروف تصنیف و تالیف تھیں۔ وہ بھی خاصی — یعنی وہ بھی کل پیدا نہیں ہوئی تھیں بلکہ پرسوں بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ سمجھو زمانے کا سڑو گرم سہے ہوئے تھیں۔“

”لباس — ۹۔“

”اں — شاید کاسنی عزارے کا جوڑا۔“

”اللہ کے بندے اتنا لمبا قصہ بے تکان سنا گیا۔ ان دونوں بہنوں کے نام توبت ر۔

عندلیب بیگ نے پوچھا۔

”ایملی اور شارلٹ!“ عنبر نے شگفتگی سے کہا۔

”میں سمجھا آپ واقف ہونگی۔ مشہور ناولسٹ ہیں۔“

”اے مشہور ناولسٹ تو بہتری ہیں۔“

”ارے صاحب۔ وہی۔ نگار خانم۔“

”ہاں یہ نام تو دیکھا ہے۔ ریلوے بک اسٹالز کے PAPERBACKS پر۔ سمجھتی تھی

فرضی نام ہے۔“

”قلبی نام ہے جناب۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”اس پر یاد آیا۔ ایک صاحب کہنے لگے

قلبی ام تو سنے تھے۔“

”یہ کون صاحب ہیں اس قدر جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔“ عنبر بولی۔

”نگار خانم۔! واقعی ایسے نام یا فرضی ناولسٹوں کے ہوتے ہیں مثلاً اصلیت میں

عبدالواحد طباطبائی۔ فرضی نام نگار خانم۔ یا پاکستانی ایکڑ سوں اور گانے والیوں کے —

ضیحہ خانم۔ فریدہ خانم۔“ عندلیب بانو نے کہا۔ ”عنبر تمہیں یاد ہے جب ہم لوگ اسکاٹلینڈ

جا رہے تھے جہاز پر وہ انیگلو عورت ملی تھی۔ نور ماڈریک۔ نور ماہ خانم کے نام سے

پاکستانی فلموں میں ناچتی تھی۔ بتا رہی تھی لکھنؤ ہی سے لاہور گئی تھی۔ وہاں سینما میں ناچنے کے لئے نوہماہ خانم بن گئی۔“

”آپ لوگ بھی بات کو کم سائڈ ٹریک نہیں کرتیں!“ منصور نے یاد دلایا۔

”اچھا نگار خانم کا قصہ ختم کرو۔“

”ختم؟ ابھی تو شروع ہی ہوا ہے۔ آواز دی بستی ڈاکٹر صاحب کے موزے دھو کر انکی گاڑی میں رکھ دو۔ میں نے عرض کی میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ سیدہ متعجب ہوئیں۔ آپ اتنے برسوں امریکہ میں رہے وہاں سے کار نہیں لائے؟ میں نے کہا لایا تھا نرسنگ ہوم کھولنے میں پیسہ کی کمی پڑ رہی تھی اس وجہ سے بیچ دی۔ پوچھا امریکہ میں تو آپ نے بہت پیسہ کمایا ہوگا۔ چلیے صاحب یہاں بھی وہی پیشہ پیشہ کی گردان شروع ہو گئی۔ میں نے جواب دیا جی ہاں بہت کمایا تھا مگر جوئے کی لت کی وجہ سے جمع نہیں کر پایا۔

”جوئے کے لفظ پر وہ چپ ہو گئیں۔ پھر گویا سنی ان سنی کر کے بولیں، عجیب بات ہے یہاں سے ڈاکٹر بھاگ بھاگ کر امریکہ جاتے ہیں آپ وہاں ٹیل ہوئے ہوئے واپس آگئے۔ کہاں بوسن کہاں لکھنؤ۔ یہاں بھلا آپ کا کیا دل لگتا ہوگا۔ میں نے جواب دیا مجبوراً آنا پڑا وہاں کچھ گھلے ہو گئے تھے۔ اچھا۔ کیسے گھلے؟۔ میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا اب تفصیل کیا بتاؤں کچھ قانونی کیس ہو گئے تھے میرے خلاف۔ دو ایک لڑکیاں بھی عدالت میں پہنچنے پر تلی ہوئی تھیں چنانچہ بھاگ آیا۔

”میں نے محسوس کیا سچویشن خاصی FARCE میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ نگار خانم پھر چند منٹ کے لئے خاموش ہو گئیں کچھ سوچنے کے بعد دریافت کیا۔ اب تو آپ جو نہیں کہتے؟ میں نے جواب دیا بڑی عادتیں کہاں چھٹی ہیں۔ آپ تو خود اتنی بڑی نباض فطرت انسانی ہیں۔ بہت خوش ہوئیں۔ فوراً پوچھا آپ نے میرے ناول پڑھے ہیں؟ میں نے مبہم سا سر ہلا دیا۔ فرمایا آپ کو یاد ہوگا میرے ناول محبت کے چند ناول ہمارے غزالہ جو دروہر کی مرثیہ ہے۔ نینی تال بوٹ کلب میں ایک یونانی دیوتا جیسے حسین ڈاکٹر سے اتفاقہ۔

”میں فوراً دماغ سوچ آف کر کے سوچتا رہا کہ ان کی بہن میرے بوٹ تلاش کرنے گئی ہے یا نئے جوتوں کا آرڈر دینے۔ اتنے میں ملازم کافی دانی لے کر آیا۔ مہری جوتے“

”چاندی کی کشتی میں رکھ کر لائی ہوگی۔ نواب لوگ جو ٹھہرے۔ چھوٹی بہن کا کیا نام ہے؟“

عبریں نے سوال کیا۔

”صاحبزادی شہوار خانم۔ شوقیہ گڑیاں بناتی ہیں۔ جا پانی فلاور ڈیکوریشن وغیرہ امیر زادیوں کے مشاغل۔ گفتگو سے اخذ کیا کہ والدین حیات نہیں آباہور سے سے قبل جنوبی یوپی کے بڑے جاگیردار تھے۔ وہ علاقہ اب مدھیہ پردیش میں شامل ہو چکا ہے۔ جانے کون سا ضلع بتایا تھا۔ اس وقت میں نے اپنا دماغ سوچ آف کر رکھا تھا۔ تین بھائی ہیں۔ پندرہ بیس سال قبل انھوں نے یہاں شمال میں آگرہ وانی نیپنی تال وغیرہ میں ٹمبر کی تجارت شروع کی۔ بقول ان کے ایک فیکٹری ڈالی۔ ہم لوگ گوشت بھی ایک سپورٹ کر رہے ہیں مڈل ایسٹ۔ پچھلے سال ایک کروڑ کا ٹرن اوور ہوا۔ نگار خانم نے فر فر بتایا۔ سیاسی عزائم بھی رکھتی ہیں کہنے لگیں ڈاکٹر صاحب شکر ہے کہ اب ہندوستانی مسلمان سرکاری ملازمتوں کے بھروسے پر نہیں بیٹھے رہتے کاروبار میں لگ گئے ہیں ان میں سکت اور توانائی آرہی ہے میرے غیر خواہ مضر ہیں کہ اسمبلی الیکشن کے لئے کھڑی ہوں۔ کہتے ہیں کہ آپ ایک روز یوپی کی چیف منسٹر بھی بن سکتی ہیں آخر آسام کی چیف منسٹر بیگم انوارہ تیموتھیس کہ نہیں۔ دلی اور یوپی میں بھی کتنی بیگمات نامور لیڈر ہیں۔ مگر میرا اصل میدان ادب ہے۔ ابھی مجھے اردو ناول کو بہت بلندی پر لے جانا ہے۔ تاکہ وہ ویسے دینز اور باربر کا ٹیلنڈ کے ناولوں کا مقابلہ کر سکے۔ ڈائجسٹ بھی میرے ناول قسط وار شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے کچھ ڈائجسٹوں کے نام بھی بتائے۔

کنواری بالی۔ بہو بیگم۔ بیوہ۔ خوشدامن۔“

”اے ہٹو۔ یہ ڈائجسٹوں کے نام ہیں؟ عندلیب بیگ نے کہا۔

”اسی قسم کے بتائے تھے۔ پھر کہنے لگیں اب میں تنقید بھی لکھ رہی ہوں

”میں دم بخود گھڑی دیکھی۔ شہوار سے کہا کتنا بندھوا دیں تاکہ باہر جاسکوں یا مجھے خود

پھاٹک تک پہنچائیں۔“

”میں دیکھتی ہوں صاحبزادی شہوار WHATEVER سے غلوں بڑھتا جا رہا ہے۔“
عنبریں ذرا کھائی سے بولی۔

”جی دیکھتی جائیے۔ شہوار خانم بالکل میموں کی طرح کو بلائی بہادر کو بلائی بہادر چلائی
باہر گئیں۔ میں نے باہر آکر موٹر بانیٹک سنبھالی۔ پھاٹک کی طرف بڑھا۔ ایک کوٹھری نظر آئی۔
اندر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ میں سمجھا چوکیدار ہے آواز دی کہ کتاب بند ہوا ہے۔ جواب ندارد۔ روشنی
اس پر پڑی تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص۔ جھبڑے کپڑے بال جھاڑھنکا ڈکھڑی داڑھی۔ سُرخ منجوش
آنکھیں۔ زنجیر سے بندھا زمین پر بیٹھا دکھلائی دیا جیسے اندھیرے غاریں چھپا PRIMITIVE
انسان۔“

”پریمیٹو انسان زنجیروں سے کہاں بندھتا تھا۔“ عنبریں نے ٹوکا۔

کھانے کے بعد وہ تینوں ڈرائیگ روم میں واپس آئے۔

”جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا انٹر سائنس میں۔ میرس روڈ پر ایک کوٹھی تھی بڑی
پراسرار سی۔ کہاؤند میں گھنا جنگل۔ بہت اندر جا کر ایک قدیم جنگل۔ ایک پرانی فلم ایکٹریس
اس میں رہا کرتی تھی۔“ صوفے پر بیٹھتے ہوئے منصور نے کہا۔

عندلیب بانو نے سر ہلایا۔ ”جانتی ہوں۔ میں نے انکی آخری فلم سہ چالیس میں دیکھی
تھی کلکتے میں۔ عنبریں کی سالگرہ تھی۔ پارٹی کے بعد میں اور ماما اور فلومی سنا سکند شو۔“

”اُئی جان آپ کو میرا سہ ولادت اس طرح نشر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“
”نیور مائنڈیار WHO CARES ہاں تو میاں مصور۔ تم پڑھی سے اُتر کر

علی گڑھ جا پہنچے۔“

”بالکل صحیح ٹریک پر تھا نگار خانم یہ وہ علی گڑھ والی کوٹھی یا دائی ہمیں لگتا تھا جیسے

اس کے اندر مس ہیوشم رہتی ہوں چارلس ڈکنز والی جن کے گھر کے سارے کلاک اور

گھڑیاں بند ہو چکیں۔ وہ پاگل مجھے گھوڑے جائے۔ اتنے میں شہوار بی بی دوڑی ہوئی آئیں اور
کہا۔ کو بلائی بہادر کو بندھوا دیا ہے۔

”میں نے دل میں سوچا اب تک تو ان کاشین قات درست تھا کتنے کے سلسلے میں کسی بڑھیا ایم کی روح ان میں حلول کر جاتی ہے۔“

”آپ نے تو ایک انسان بھی یہاں بندھوا رکھا ہے۔ اسے پاگل خانے کیوں نہیں بھیجتیں؟ میں نے برہم ہو کر پوچھا۔“

”کہنے لگیں۔ کیا بتایا جائے وہی ہمارے باؤں منشی جو ہیں جن سے آپ کا سابقہ پڑا۔ ان ہی کا بیٹا ہے ماں باپ نہیں چاہتے کہ نگاہوں سے ادھل رہے۔ درست کیا بات ہے ہم ان کا بہترین علاج امریکہ بھیج کر کر داسکتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ مگر ہمیں منشی جی کی دلداری منظور ہے وہ ہماری سابق ریاست کے وفادار منبرہ چلے ہیں

”کب سے ان کا دماغ خراب ہوا ہے؟ میں نے پوچھا۔ بولیں پیدائشی سمجھئے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جنون بڑھتا جا رہا ہے۔“

”انسان کا بھی تو عمر کے ساتھ جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے اس نے نیو کلیر بم کہاں بنائے تھے۔“ عندلیب بانو بولیں۔ ”اب وہ غار میں واپس جا کر خود ساختہ زنجیروں میں جکڑ گیا ہے۔“ ”منبریک! باتیں تو آپ اتنی عمدہ کرتی ہیں اور وہ سطحی نگار خانم بطور رائٹر مشہور ہیں جو ڈینس رومنز کو انگریزی کا بہترین ناولسٹ۔“

”خیر انصاف کرو بے چاری کے ساتھ۔ ڈینس رومنز بھی اپنے فن کا استاد ہے۔“ عندلیب بانو نے فراخ دلی سے کہا۔ ”تم خاصے اینٹی نگار خانم ہو رہے ہو۔ فرسٹ امپریشنز پر کبھی نہیں جانا چاہئے۔“

”بہر حال۔ تو میں نے کہا امریکہ چھوڑ اس غریب کو رانچی ہی بھجوا دیجئے بولیں خطرناک نہیں۔“ ”تو زنجیروں سے کیوں بندھوا رکھا ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ کہنے لگیں۔ دراصل کچھ مجذب سے ہیں دورہ پڑتا ہے لوگوں کو مارنے دوڑتے ہیں۔ چنانچہ زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ آج شام پھر حالت غیر ہوئی تھی۔ پڑوس کے لوگ اور نوکر چاکران کو بابائی پکارتے ہیں۔“

”میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور بھاگا۔ ایک مہینے کے بعد آج شہوار نے پھر رنگ کیا ہے کہ ان کی باجی کو دیکھ جاؤں۔“
 ”موسٹ انٹر سٹنگ۔“
 نیپالی ملازم کافی کی ٹرے لے کر حاضر ہوا۔

”مگر اس خاندان کے لواحقین میں ایک چھوڑ دُو دُو پاگل۔ ممکن ہے یہ ان کے غریب رشتے دار ہوں۔ منشی جی اور ان کے بیٹے باباجی۔ دراصل پاگل پن بھی ڈیکڈنس کی ایک علامت ہے۔“ عندلیب بانو نے کافی بناتے ہوئے کہا۔
 ”جی ہاں اکثر پیرانے زمیندار گھرانوں میں اور راجوں نوابوں کے ہاں ایک آدھ فائر انفل ضرور مل جائے گا یا پیدائشی ایڈیٹ۔ بھئی کے قدیم پارسی خاندانوں کے پاگل تو مشہور ہیں میں جب بریج کینڈی ہاسپٹل میں —“
 ”وہ فلم ہم نے برسٹر میں دیکھی تھی۔“ عندلیب بانو نے بات کافی — ”ایک بریز بلیں قدیم خاندان دکھایا تھا وہ اپنی RANCH پر رہتے تھے خوب بڑا سا گھر۔ اُداس سا — آدھے لوگ دیوانے — اور جو دیوانے نہیں وہ پروڈرٹ — مرد و عورت سب — اپنے بھیانک رازوں کی دوسرا تھ میں اس سناٹے کے اندر اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔“
 ”شاید اسی فلم میں تو تھا ائی جان کہ انھوں نے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو بڑے بڑے بنجروں میں بند کر کے درختوں سے لٹکا رکھا تھا۔ وہیں کھانا بھجوا دیتے تھے۔ ایک مجبوظ الحواس بچے کو کتے کے KENNEL میں رکھ چھوڑا تھا۔ ہو برل —“

”یہ لوگ تو مجھے ایسے خوفناک معلوم نہیں ہوتے۔ بڑی بہن خاصی AMBITIOUS اور جینٹ ہیں۔ چھوٹی والی بھولی سی ہے۔ بس میم بننے کا شوق بہت ہے — کو بلائی کھان! کو بلائی کھان!“ منصور نے باریک آواز میں نقل اتاری۔

”شہوار اچھا نام ہے۔“ عندلیب بانو سوچ کر بولیں۔ ”یہ لوگ مغل ہیں یا پٹھان؟“
 ”مجھے تو خالص دیسی معلوم ہوئے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص مغل یا پٹھان ہو۔“

”نہیں مگر ہرنسل کے کچھ لاشعوری تقاضے اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ تم نے اپنا نام اتنے فخر سے کا شغری کیوں رکھا ہے جو ہندی میں کاس گھری لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔“

”میںم دراصل ایسا ہوا کہ ہمارے پردادا بخاری تھے جب وہ روسیوں نے سمرقند بخارا وغیرہ پر قبضہ کیا تو بہت سے مولوی مللا وہاں سے بھاگ آئے ہندوستان۔ براہ پشاور بہاے پردادا بھی بھاگ آئے۔ بمبئی کی مسجدوں میں نمازوں کے وقتوں کی دیکھ بھال کرنے والے اور پیش امام کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے سب بے چارے مسکین لوگ بخاری کہلاتے ہیں میں نے وجہ پوچھی معلوم ہوا ان کے باپ دادا کچھ زار روس کے قبضے کے وقت بھاگ آئے تھے کچھ اکتوبر انقلاب کے بعد۔ یہاں آکر مسجدوں میں پیش امام بابانگی بن گئے۔“

”اگر وہیں رہ گئے ہوتے تو ان میں آج کوئی سائنٹسٹ ہو تا کوئی خلا باز۔“ عندلیب بالو نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میرے پردادا دہلی کی ایک مسجد میں مؤذن ہو گئے تھے۔ پیش امام صاحب نے اپنی بڑی سے اُن کا نکاح پڑھا دیا۔ میرے دادا اور والد بھی ساری عمر مؤذن اور پیش امام ہی رہے مجھے یاد ہے مغرب کے وقت حسب دستور محلے کے ہر دروازے پر جا کر گنڈی کھرکھڑاتے ہیں ساتھ ساتھ چلتا اور گھر کی بی بی دروازے کے اوٹ سے ایک روٹی اور ذرا سا سالن یا دال پیاے میں ڈال دیتی۔ ایسی مفلسی میں میرا بچپن گزرا۔“

”مانی گوڈ۔“ عنبریں نے آنکھیں پھیلا کر بچہ افسردگی سے اسے دیکھا۔

”آپ پر رومانی کرب کی کیفیت طاری ہو گئی! سنتی جائیے۔ اسکول سے لے کر ایم۔ بی۔ بی ایس تک وظیفے لے کر اور ٹیوشن کر کے پڑھا۔ والدین میرے بچپن میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ میں اکلوتی اولاد تھا امریکہ میں بیڑھائی بھی میرٹ اسکا لرشپ پر کی۔ اسی وجہ سے جب نگار شہوار جیسے چوہٹ لوگوں سے ملتا ہوں لو حیران رہ جاتا ہوں۔ جس وقت میں وہاں سے چل رہا تھا اور شہوازی سنگم کو بلانی بہادر کو بلانی بہادر چلائی افغان کے پیچھے دوڑی تھیں ایک غریب مسکین بوڑھا پھاٹک پر کھڑا تھا اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ ان سے کچھ کہا۔ انھوں

نے زور سے ہڑک دیا گویا وہ بزرگ ان کے کوہائی کھان سے بھی کمتر مخلوق تھے۔
 ”قتلانی۔ تو بڑی برتر مخلوق ہے بھی جوان کو انگریزی آواز اور لب و لہجہ اختیار کرنے
 پر مجبور کر دیتی ہے“ عنبریں نے کہا۔

”ہاں اور اس وقت مجھے تعجب ہو کہ ایسے لوگ ہمارے معاشرے کے لیڈر ہیں۔ سطحی
 بیچس۔ نمائش پسند، اقتدار پرست۔“

”میاں تم سیلف میڈ ہو“ عندلیب بانو نے کہا۔ ”لیکن اپنے مزاج اور تجربات کی بنا پر درمند
 بہت سے سیلف میڈ لوگ اپنے مزاج اور تجربات کی بنا پر خود غرض اور سخت دل ہو جاتے ہیں
 رہیں نگار اور شہوار تو یہ اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسروں کی محنت کا پھل اس سے
 چھین کر خود کھانا اس کا تاریخی رول رہا ہے۔ مجھے یاد ہے آج سے پچاس سال قبل لندن کے
 کسی اخبار میں چھپا تھا کہ ایک اوسط درجے کا راجہ نواب اپنی ذات پر دوستو سے چار سو یاؤنڈ
 روزانہ خرچ کرتا تھا جب کہ اس کی پر جا کی آمدنی چند پینیس یومیہ پر مشتمل تھی۔

”دوسری بات یہ ہے کہ بھی ممکن ہے ان دونوں بہنوں کے اندر بھی کوئی نیکی اور گہرائی
 موجود ہو پہلی ملاقات میں تم نے ان کا ایک ہی رخ دیکھا۔ انسانوں کے متعلق فیصلے کرنے میں
 جلد بازی نہیں برتنا چاہئے۔“

”میں باؤس کو مؤذبانہ یاد دلانا چاہوں گی“ عنبریں نے کہا۔ ”موضوع زیر بحث یہ تھا کہ
 ڈاکٹر منصور بخاری سے کاشغری کیسے بنے۔“

”وہ۔ ہاں تو والدین کا انتقال ہو چکا تھا مادر سہ فقیری میں مرزا منصور احمد لکھوایا گیا تھا
 وہاں سے نکل کر میں نے بخاری کے بجائے کاشغری کا اضافہ کر لیا۔ بخاری بہت COMMON
 نام تھا۔“

”تو اس طرح آپ گویا روسی کے بجائے چینی نشتر ادھو گئے۔“

”جی ہاں۔ اس وقت ہندی چینی سجد بھائی بھائی بھی تھے۔“

”میراجو تا ہے جاپانی میرا کوٹ انگلستانی سر پہ لال ٹوپی روسی پردل ہے ہندوستانی
 عندلیب بانو پھر لاپٹے لگیں۔“

منصور کو "شام ڈھلے کھرٹکی تلے" - "بیاد آیا۔ بے اختیار ہنس پڑا۔" پہلے سوچا
یار قندی لکھو اوں۔ لیکن یار لوگ اسے شکر قندی کر دیتے خصوصاً علیگڑھ میں - سوچا
کا شغری ہی ٹھیک ہے -

"نہایت رومینٹک نام ہے -" عنبریں بولی۔
"ہم - کانوں میں سلکٹ روڈ پر سے گزرتے کاروانوں کی گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں -"
عندلیب بانو نے صاڈ کیا۔
"آپ کو ادیب یا شاعر ہونا چاہیے تھا۔"
"ارے مورے بچو - ہونا تو جانے کیا کیا چاہیے تھا۔"

"ابھی جب میں چین گیا تو وہ لوگ سنکیانگ وغیرہ بھی گھمانے لے گئے۔ کا شغریں چین
مولوی مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔"

"چین مولوی بے حد کیوٹ لگتے ہیں، عنبریں نے کہا، مگر تم چین کیسے گئے؟ ہم
ہندوستانیوں کا بوجہ اقلے چین چین ما چین جانا ذرا۔"

"بھئی میں وہ ڈاکٹر سار دبیانی ہیں نا - ایکو پیچکر والے - ان کے ذریعے -"
"چنانچہ آپ کا س گھری بھائی پیچکر والا بن گئے -" عنبریں نے کہا۔

"آداب عرض کرتا ہوں۔ اور صاحب نام کی بات تو یوں ہے کہ جب پیکنگ سے بمبئی واپس
اور معلوم ہوا ایک لیڈی ڈاکٹر لیبیا سے لکھنؤ ٹریف لائی ہیں اور پانڈز شپ میں کلینک اور
نرسنگ ہوم قائم کرنا چاہتی ہیں۔ سوچا قیمت آزمائی کر لو۔ آپ کا اسم گرامی بتایا گیا۔
ڈاکٹر آئے بیگ - آپ کا SURNAME مغربی فیشن ہے - اُصولاً بھی غلط۔ آپ
عنبریں بیگم ہیں۔"

"درست۔ ڈاکٹر مسعودہ خان کو مسعودہ خانم ہونا چاہیے۔" عندلیب بانو نے کہا۔
"مگر جب بیبیاں خود کو خانم کہلاتی ہوں تو آپ فرماتی ہیں کہ یہ پاکستانی ایکٹرسوں اور گانے
والیوں کا سامان لگتا ہے۔ دراصل الفاظ سب پامال ہو چکے ہیں۔" منصور نے جواب دیا۔

”کلمتہ کے اسکول اور کالج میں اس کا نام عنبریں بیگم ہی لکھایا گیا تھا یہاں انڈیا میں تو مس بیگم چل جاتا ہے۔ مگر انڈیا میں ڈیکل کالج والے بیگم باپ کا نام سمجھے۔ لہذا بیگم کرنا پڑا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو الفاظ — نام — سب یا مال ہو چکے ہیں۔ لوگ بولتے بولتے تھک گئے۔ کم از کم دس ہزار سال سے تو باقاعدہ اور متواتر بولے جا رہے ہیں۔ اسی لئے وہ شخص جو نگار خانم کے سرونٹ کو اوڑھ میں زنجیروں سے بندھا چُپکا بیٹھا ہے وہ کتنا محفوظ ہے۔“

”بیگم صاحبہ فرض کیجئے ہم سب کے ناموں کے بجائے نمبر ہوتے۔ نمبر تین۔ نمبر بارہ نمبر سات۔ بمبئی کے ہسپتالوں میں وارڈ بوائے اطلاع دیتے ہیں صاحب گیارہ نمبر خلاص ہونا مانگتا — یعنی گیارہ نمبر ہیڈ کمار لیض مرنے والا ہے۔“

”خلاص ہونا مانگتا —“ عندلیب بانو نے جھڑپ لے کر دہرایا۔

منصور نے موضوع تبدیل کیا ”عندلیب آپ کا تخلص ہے؟“

وہ خاموش رہیں۔

”معاف کیجئے میں بھی نگار خانم کی طرح ذاتی سوالات کرنے لگا۔ ہم ہندوستانی مغرب

میں کتنا ہی رہ لیں خصلت تھوڑا ہی بدلتی ہے۔“

”نہیں بھئی۔“ انھوں نے چونک کر جواب دیا۔ ”تخلص نہیں ہے۔ والدہ نے مجھے عندلیب

بانو بیگم لکھا۔ خود ان کے دادا نے ان کا نام گلرخ بانو بیگم رکھا تھا۔“

”گلرخ بانو بیگم! لگتا ہے گویا ہمایوں نامہ کھل گیا۔“ منصور نے بے ساختہ داد دی۔

عندلیب بیگم تلخی سے مسکرائیں۔

”ٹائم جنٹلمین —“ عنبریں نے گلوٹلاک پر نظر ڈال کر اعلان کیا۔

کیا مطلب —؟“ منصور نے پوچھا۔

”اے کیا تمہارے امریکہ میں یہ رواج نہیں؟ ہمارے برطانیہ کے PUBS میں تو

بار میڈلس یہ دو الفاظ کہہ دیتی ہے۔“

”بھئی ہم امریکہ کی بارز ہی میں بہت کم جاتے تھے۔“

”تو تو میں ہارنے کے بعد جیل جانے سے قبل غم غلط کرنے کے لئے کیا کرتے تھے۔“

”بس پیاز کھاتے تھے۔“

”ڈاکٹر کا تس گھری گھری گھری گھری دیکھنے کے بجائے اب بھاگے۔“

”ڈاکٹر کا تس گھری۔“ منصور نے دہرایا۔ ”اور جب لکھنؤ پہنچ کر ڈاکٹر کیٹری میں آپکا فون

نمبر دیکھ رہا تھا ابک صاحب بولے۔ یار یہ غنبرین کون شے ہے۔ بہتر دو کی کسی دو کا نام؟

”ہا ہا ہا۔ پی۔ جے۔“

”پی۔ جے؟“

”پھیلٹ جوک۔!“

”بھئی اب واقعی سدھارو۔“ عندلیب بانو نے تردد سے کہا۔ ”ہم لوگ یہاں نئے نئے

آتے ہیں۔ پڑوسیوں کو معلوم ہے کہ تم غنبر کے کو لیک ہو مگر یہ چھوٹا شہر ہے۔“

”آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں۔؟“ غنبر انڈینڈنٹ ڈاکٹر ہے۔ پندرہ سال برطانیہ دس

مڈل ایسٹ میں گزار کر آرہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ کنویں کے میڈیکل سے ڈرتی ہیں۔“

وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

”اب آدھی رات کو تمہاری موٹر بائیک یہاں سے جا بگی سارے محلے پر الم نشرح کہ

امریکہ والے ڈاکٹر صاحب انگلینڈ والی ڈاکٹر ٹنی کے ہاں ڈنر کھا کر جا رہے ہیں۔ تم کو کیا پتہ

یہاں کی گھریو بیویوں کے پاس کتنی فرصت ہے۔ یہ تمہارا بھئی تھوڑا ہی ہے۔ یا لوٹن۔“

”تب تو نگار خانم ٹھیک ہی کہتی تھیں میں وہاں سے کیوں لوٹ آیا۔“

”اچھا کل ان کے ہاں جاؤ تو اگر ساری رپورٹ دینا۔“ عندلیب بانو نے دلچسپی سے کہا۔

”اچی آپ کو بھی Gossip میں مزا آتا ہے۔ ابھی پڑوسیوں کی اس عادت کی شاکی تھیں؟“

”گوسپ کیا ہے؟“ مشاہدہ حیات! اگر اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔“ عندلیب بانو

نے فرانسسیسی انداز میں کندھے اچکا کر ونگ کیا۔

(۲)

جو جھکون تو شاخ گلاب ہوں

”بنت کی پھوار اور سنہری دھوپ! یاد ہے امی ایسے میں گرتی کہا کرتی تھیں اے لوی اللہ میاں ہنس رہے ہیں! امی جان بعض دفعہ نٹا کا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں پھیر جاتا ہے۔ ہیرے کی لونگ۔ ابرق سے دمکتا لہریا دوپٹہ — کتنی مشاقی سے دوپٹے چلتی تھیں نٹا —“

بارش کی تیز تر چھی پھوار نے ٹیٹھے دھندلا دیے۔ سودا سلف کی ٹوکریوں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے حسین بخش نے جھاڑن نکالا ”بیٹا ذرا تھپیے۔“

”ٹھیک ہے حسین بخش — چلے چلیے — گرتی کی نکسالی اردو! سادون کی رم جھم۔ بھاؤں کے جھالے۔ مانگھ کی مہاؤں — کبھی تھیں تمہاری نگوڑی انگٹش میں سبکے لئے وہی ایک اللہ ماری رین! ایک دفعہ بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی بولیں۔ ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں سادون بھاؤں بہن بھائی ہیں جو گلے مل کر رو رہے ہیں۔ بہن کی رخصتی پر بھائی روتا ہے۔ کیسی خوبصورت بات — ڈیم —

بریک۔ ایک بے نیاز کالا بجا رسا منے سے گذر گیا۔

”— امی جان! — وہ بتاتی تھیں کہ سادون ہیں وہ سب پردے دار بہا رکس میں ٹھس کر قطب صاحب جاتی تھیں۔ سارا گھر — وہاں بڑی چل یوں محبتی۔ وہ جھوٹے پر بیٹھ کر لاپتیں۔ اماں میرے بھیا کو بھیجوری کہ سادون آیا۔“

”تمہاری گرتی کا نہ کوئی بھیا تھا جو انہیں سادون میں بلاتا نہ میکہ۔ اب کوئی اور بات کرو۔“

”امی جان۔ اینگلوسیکسن لوگوں نے جذبات کو جرم کیوں سمجھ لیا ہے؟ میرا خیال ہے

ب آپ بھی اپنے اس انگریز مزاج کو بدلے کیونکہ آپ اینگلو سیکسن نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں کبھی کبھار تھوڑے سے آنسو اعصاب کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ مانی گوش — گزنی پجاری کتنا روتی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھی ہیں۔ سامنے مینہ برس رہا ہے۔ ادھر انکی آنکھوں سے آنسو — ساتھ ساتھ گانے کی کوشش — راجہ کوڑیا کھو لورس کی بوندیں پڑیں۔ مجھے پکارتیں — اری اولونڈیا — امیر خسرو کی پہلی بوجھ — سموسہ کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا — گلانہ تھا —! میں جبکہ کر جواب دیتی۔ ان پہیلیوں کے جواب انہوں ہی نے سکھائے تھے پھر میں کہتی۔ ننا تم بھی تو بے سہری ہو۔“

”تمہاری ننا کو ساری عمر آنسو بہانے سے بہت فائدہ ہوتے؟ بکو اس بت کرو۔“
 ”او۔ کے۔ او۔ کے۔ موم — ایسی عمدہ موسم بہار کی بارش ہو رہی ہے۔ کوئی چیرفل ٹونگ ہو جائے۔ مثال کے طور پر بہار کا خیال —“

”بنگال بہار کا خیال چھوڑو۔ موثر چلاؤ دھیان سے“

”ہا ہا ہا — ویری گڈ — انہیں اتنی پلیز“

”ہوں — ہوں — پھولوں والی کنٹھ میں کاسنت گروا — پھولوں والی —“
 ”جولی گڈ — ذرا اولیوم اونچی کیجئے“

”حمین بخش۔“

”اونچا سنتے ہیں۔ اطمینان سے گائیے — دیکھیے اس وقت کار کیا پروائی کے جھونکے سمان جا رہی ہے — کم آؤن اولڈ گرل — اچھا جان عالم کی کوئی چیز — موقع کی مناسبت سے بقول منصور — کیا ہے کہ — یہ لکھنؤ ہے اور رت لبنت!“
 ”ہوں — ہوں — ہوں — اچھا نواب صاحب رامپور کی ایک بندش سونگی — نواب رضا علی خان کی — بنگ میں —“
 ”شینور“

”ہوں — ہوں — کبھی انکو نہ مرے ہاتھ کا بھایا پانی — جب دیا میں نے — برا ہو گیا اچھا پانی۔“

پھر خاموش۔

”بھئی امی پلیز۔“

”او گھٹا کالی گھٹا تھم کے کہیں سانس بھی لے ہوا جاتا ہے میرے ذیل سے اونچا پانی“

چینیٹ اڑاتی موٹریں۔ اسکوٹر۔ رکشائیں۔ خوش باش زرد پوش سیلانی۔

”جی اہو روتا ہے میرا تو اچھا کیا ہے، دکھ تو کر دیتا ہے پھر کا کلیجہ پانی“

موپڈ سوار لڑکیاں۔ خود پہنے موٹر بایک پہ فرائے بھرتا

”ارے منصور۔! عنبر گاڑی روکو۔ اے بیٹا۔ منصور۔“

وہ چھتر منزل کی سمت بارش کی لطیف دھند میں سے نمودار ہوتا ہے۔
پیہو بہار گائے جا ابر بہار چھا گیا شہیدینار کے سامنے گرجتا
ٹھٹھکھٹاتا کلوز اپ کول گیٹ مسکراہٹ لبنت رت کی بجلی

”ہائے عنبر۔ گڈ آفٹر نوٹن منریگ۔ سلام حسین بخش!! اتوار منانے
نکلی ہو ڈاکٹر صاحب اور میں تمہاری طرف آ رہا تھا۔“

”اتوار نہیں کچھ اور۔ ایک پشینٹ کافون آیا تھا۔ اسے دیکھنے فرنگی محل
جار ہی تھی۔ شاہ مینا صاحب کے نزدیک پتہ چلا کہ سیاستی ہو گیا۔
پاٹے ناے پر کر فیو لگا ہے۔ گھر لوٹی۔ امی نے کہا۔ ماما بدل پساری۔“

”عجیب اول جلوں نام ہے۔ یار کہیں ماما تیں بدلی جاسکتی ہیں!!“
”بس تو امین آباد سے واپس آ رہے ہیں۔ تم بتاؤ شہوار یکم سے مل آئے؟“

واٹ اے ہینڈ سم فیلو — گویا آلا آرے — آلا - ذرا موٹر سبھال برج بالا۔
 ٹاور برج اٹھا۔ مورنما بجا چلا آتا ہے پھلیوں کا پھریرا اڑاتا
 ہنگلی — کلامیڈ — ڈسی — ٹیمز — زائندہ رود۔ نو سر۔ یس سر۔
 وہ تو گومتی کے تپ پر۔ بھیکے گل مہر کے سائے میں موٹر بائیک پر بیٹھا
 گویا آلا آسمان کو دیکھتا ہے

”بارش تنہی اور کنلوے موجود۔ عنبرین چلو ہم بھی سیلی گارڈ میں جھگٹ“
 چونہ اور رُت رنگی ہے جو گندے کے رنگ کی — سرسوں کے پھول من،
 پہ گھٹا بن کے چھا گئے — اچھا ہوا کہ ایسے سمے تم بھی آگئے — کرتی نہیں
 بسنت کا درشن تو رے بنا۔

”عنبرری یکس — جلد تمہیں ان فسادوں کی عادت ہو جائے گی۔“
 ”یس۔ اف کورس“

تختہ گل کے کنارے ایک ہری پنج۔
 حسین بخش مودب، مہذب، افیونی باورچی
 امی جب بچپن برس قبل لکھنؤ آئی تھیں افیونی داستان گوچوک میں نشوونو
 زہر عشق سناتے تھے بچپن اور جوڑ دو تو سرشار کا لکھنؤ۔
 مزید ستر پچھتر عہد نواب سعادت علی خان وزیر ہند — ۱۸۵۱ء
 میں اپنی تسبیح روز و شب کا

بچپن سال پہلے والی امی ابھی موجود ہیں۔ بلی گارد کی طرح شکستہ۔ وقت کی گولہ باری چھیلے۔ بلی گارد کے کاسل غدر میں گولوں سے پھلنی ہو گئے۔ کھنڈر سامنے موجود۔ جی لہو روتا ہے میرا تو اچنبھا کیا ہے۔ دکھ تو کر دیتا ہے پتھر کا کلچہ پانی۔ چار ٹوہریاں۔ اور شادابی۔ تناور درخت۔ سگلاب کے تختے۔

”عنبر۔ کل رات ندوۃ العلماء کے سامنے زبردست آتش بازی ہو رہی تھی۔ جل بہار دیکھتا گھر پہنچا تو ٹورزم والے شریش چندر صاحب کا فون۔“

”نہایت نفیس آدمی ہیں۔“

”فرما رہے تھے لکھنؤ فیسٹول شروع ہو چکا۔ آپ اب تک تشریف نہیں لائے۔“

”ضرور تشریف لے جاؤ۔ تم تو بڑے زبردست CULTURE-VULTURE ہو۔ شہوار بیگم کو بھی ساتھ لے جانا مینا بازار۔“

”ہلو۔ عنبر۔ کیا بات ہے؟“

”ان پر ڈپریشن کے دورے اسی طرح پڑا کرتے ہیں۔ کل رات سے ان کا یہی عالم ہے۔“ امی کی شکایت۔

”ہائیں! بلکہ عنبر!!۔۔۔ یہ کیا سن رہا ہوں؟ تم بھی تو اس افسانوی ساحل پر رہتی ہو۔ بسنت رُت میں چھتر منزل اور فتر بخش کے جھروکوں سے بیگمات گوشتی کے میلے کا نظارہ کرتی تھیں۔ بادشاہ اور خواص و عام سب زرد پوش۔ مور و ماہی نما بچروں پر سوار۔ میرا شامنت کا بھیس بدل کر اسی کنارے پر۔۔۔ والدہ دیکھو لکھنؤ کی وضع داری۔ ایک بزرگ لڑکھڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہاتھ میں بسنتی رومال!“

ایک نحف الجٹہ بڑے میاں آہستہ آہستہ چلتے آن کر خالی پنج کے قریب رکتے ہیں۔ سفید جھاگ ایسی دوپٹی۔ سفید انگرکھا۔ سفید مونچھیں۔ بارعب چہرہ۔ حسین بخش پیک کر انھیں سلام کرتے ہیں۔ جھاڑن سے بیخ پونچھ اپنی اینٹ پر واپس بڑے

میاں یا علیؑ کہہ کر بیچ پر فردکش۔ چھڑی کی موٹھ پر دونوں ہاتھ دھرے
انگرکھے میں ملبوس ایک پیرئید کردار۔ مڑ کر دیکھا ایک دوبار جیب سے کوئی چیز
بند مٹھی میں نکالی۔ بستی رومال کی اوٹ کر کے مٹھی منہ تک لے گئے بجائے کس
چیز سے شغل کر رہے ہیں۔ شاید یہ بھی افیم کھاتے ہوں۔ انگلیوں میں عقیق
اور فردزے کی نفرتی انگشتیاں۔ اب دوسری جیب سے خاک شفا کی تسبیح۔
شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔

”میم۔۔۔ یہ صاحب یقیناً ایک تباہ حال وثیقہ دار ہیں۔“ منصور کی
امی سے سرگوشی۔ ”حسین بخش نے بھی انکو بڑے ادب سے سلام کیا۔“
”حسین بخش بینک میں بھلا بتاؤ اس شہر کے ڈیکٹنس کی کوئی حد ہے۔
ایک پھٹے حال نواب صاحب۔ ایک انیمچی باورچی۔ کاخ سعادت علیخان
کے باغ میں دونوں سرنگوں۔۔۔ یرقان زدہ موسم۔۔۔ اللہ اللہ۔“

”عنبر۔۔۔! چیرپ!“

”بن غازی میں شاردانے جان کھالی۔ لکھنؤ چلو وہاں میرا سارا خاندان
ڈاکٹر ہے نرسنگ ہوم کے لیے تمام سہولتیں مل جائیں گی۔ توبہ توبہ۔ مجھے
سیدھے کلکتہ واپس جانا چاہیئے تھا۔ مزے سے رہن اسٹریٹ میں پریکٹس
کرتی۔ افوہ ذرا اس طرف جا کے دیکھو۔ ہزاروں ہزار RIOT POLICE“

”ایسا تو اور کہیں نہیں ہوتا بیٹا لکھنؤ کے بھی چند عتے ہیں جن کے لیڈروں
کے لیے حضور یہ روزی روٹی کا سوال ہے۔ جب بڑی بھیا آئی ہے۔“
”سنہ اٹھارہ حسین بخش؟“

”ایسا ہی رہا ہوگا بیٹا۔ ہمارے آبا بتلاتے تھے۔ حضور پہلے شیعہ اور سنت
جماعت دونوں کے تعزیے ایک ساتھ تال کٹورہ پھول کٹورہ کی کر بلاؤں میں

جاتے تھے۔ بڑی بہتیا سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے ایک بڑے مولانا صاحب نے فرمایا مٹی ڈھول تاشے بجاتے ہماری ان کربلاؤں میں آتے ہیں ہماری سوگواری میں خلل پڑتا ہے۔“

”مگر وہ تو ماتمی نقارے ہوتے ہیں حسین بخش۔“
 ”جی بھیا۔ تو سنت جماعت اپنے تعزیے ماہ نگر لے جانے لگے۔ پھر وہ چاریاری جھنڈا کھڑا ہوا۔“

”سر اینٹی مکڈونل کی دو کرامات۔ پہلی اردو ہندی۔ دوسری شیعہ سُنی؛ ایک اور فرنگی SCAPEGOAT۔“

”ڈوکومنٹری پروف موجود ہے بھئی۔ دستاویزی شہادتیں۔ ثبوت۔“
 لفٹنٹ گورنریو۔ پی سر اینٹی مکڈونل کے رول کے۔۔۔ باقی یہ کہ فرنگی کی حرکتیں تو اودھ میں ڈیڑھ سو سال سے اسی قسم کی تھیں۔ یہ سلطنت ہی انھوں نے کھڑی کی تھی مغل دہائی کے مقابلے پر۔ اودھ پر اصل حکومت اس ریڈیٹنسی سے کی جا رہی تھی۔“

”یہ معاملہ تو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ایرانی پارٹی۔ تورانی پارٹی۔ جاسٹھ کس نے تاراج کیا؟“

”مسز بیگ۔ کہنی نے لکھنؤ میں شیعہ مہرہ آگے بڑھایا۔ دہائی کے سُنی مہرے کے مقابل میں اور اسے مذہبی غلو اور عیاشی۔“

”سُنی مہرہ پہلے ہی پٹ چکا تھا۔ اس غریب کو شہ دینے کی اب کیا ضرورت تھی اور بے چارے مغل بادشاہ تو بالکل اینٹی شیعہ نہیں تھے سوائے۔“

”اگر موصوف نے دکن کی سلطنتوں کو ملیا میٹ نہ کیا ہوتا تو نہ شہواجی مرہٹہ زور پکڑتے نہ مغل ایمپائر ٹوٹتی۔“

”تم کیا ہو۔۔۔؟“

”کیا مطلب کیا ہوں۔ آدمی ہوں“

”نہیں اسوقت کچھ شیعہ سے لگ رہے ہو“

”سبحان اللہ! کل تم مجھے دہائی سمجھی تھیں! انسان کے خیالات پر سائن بورڈ لگائے جاؤ۔ شاباش۔ بندہ حنفی المذہب تو رانی پیدا ہو لیکن معاملات کو انکے صحیح تناظر میں دیکھنے کا قائل“

”اضافیت کی ایک حقیقت یہ ہے کہ فریم ان ریفرنس مختلف ہوتے ہیں“

”بنیادی حقائق ہر پرسپیکٹو سے یکساں ہیں۔ انفرادی مشاہدہ اپنے پرسپیکٹو کے لحاظ سے

مختلف لیکن SPACE-TIME CONTINUUM ———“

”یہ تم لوگ کس گڑبڑ بھالے میں لگ گئے“

”منوعہ ترین! کمپنی کی حکومت نے انگریز لڑکیاں شاہی حرم میں پہنچائیں اور کنگز

نصیر الدین حیدر کو محرم کی مصروفیات میں لگا دیا۔“

”اینگلو امریکن پارٹی سے تو بٹیا تم بھی فیضیاب ہوئے۔ بلکہ بوسٹن ٹی پارٹی سے! —

در نہ کسی گلی محلے میں پڑے طبابت کر رہے ہوتے حکیم منن صاحب! لیکن لکھنویں تم نے

فرنج پارٹی والے کے اسکول میں پڑھا اذرا سکے بعد ———“

”میم میں نے ———“

”امی ژنرال کلا دمارتین کو بہت ایذا پہنچا کرتی ہیں“

”فیس ٹینگ مین — کیوں نہ کروں“

”میم دہ ایک سو بچراف فورچون تھا اور اس نے ہندوستان میں رہنے والی یورپین

قوم کی تعلیم کے لیے دولت چھوڑ دی جو اس نے اودھ میں بٹوری تھی ———“

”تمہارے فوجی سرداروں نے کتنے اسکول کالج قائم کیے؟ خواہ مخواہ کی قوم پرستی مت کرو۔“

دور سڑک پر فخر کی آوازیں۔

”غصہ یہ بلوائی نہیں معلوم ہوتے۔ ٹھیر میں دیکھ کر آتا ہوں“

”نیم۔۔۔ ایک نیتا امریکہ کا دورہ کر کے لوٹے ہیں۔ جلوس ایرپورٹ سے آ رہا ہے“

”یہ کون سی پارٹی ہے؟“

”پتہ نہیں لیکن پرکوشن بہت لمبا ہے۔ کچھ امیرالامراء۔ چند چکلے دار۔ باقی سو بجزاف فوجوں“

”وہ بیچ پر بیٹھ گیا۔“ جی۔ توجزل کلاڈ مارٹین۔۔۔“

”ہمارے لوریٹو ہاؤس میں ایک مرتبہ لیون اور کیل کٹا لاما رٹینیر سے۔۔۔“

اب جا کر انکے ولایتی پن کی وجہ سمجھ میں آئی۔ ”قطع کلام معاف منبر نیگ لیکن آپکے والد

بہادر روشن خیال رہے ہونگے جو آپکو اُس زمانے میں انگلش اسکول۔۔۔“

”بالکل ولایتی۔۔۔“

”آج تم مسلمان لوگ کا بڑا دن ہے؟ والے ٹایپ؟“

”قطع“

”واہ نگر صاحب wogs کا ہماری سوسائٹی کو موڈز ایئر کرنے میں بڑا کونٹری بیوشن

رہا اور میں سمجھتا ہوں سعادت علی خان نواب وزیر اودھ ہندوستان کے پہلے wog تھے۔

ایک طرف بسنت کا میلہ شروع کر داتے ہیں دوسری طرف انگریزیت۔

”اور یہ رینڈنسی + ماسک بال گرینڈ ڈنر۔ بوبرومیل جیسے بانکے وگ لگائے وہ سامنے

والی سیڑھیاں اتر کر کوچ پہ سوار ہو رہے ہیں۔

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پر اپنے پوڈر

کوچ پہ ناز کی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن“

”بیٹا تمہیں میرا نشا خوب یاد آئے۔“

”بیلی گاؤد بھی انکی یاد نہ دلائے؟“

”معاف فرمائیے گا حضرت —“ نزدیک کی بیچ سے آواز آئی ”سید انشا کے اشعار اس طرح ہیں۔“

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسی ناز پہ جلوے کی دکھائے گا پھین
نسترن بھی نئی صورت کے دکھائے گا رنگ
کوچ پہ ناز کی جب یاؤں رکھے گا بن ٹھن
کس قیامت کا سبک سیر ہے اسکا راکب
حاضری نکھائے جو سکلکتہ تو لندن میں ٹھن

”بہت بہت شکریہ۔ غایت“ منصور نے کہا۔ بڑے میاں نے جھک کر تسلیم عرض کی۔ منصور اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے اپنا تعارف کرایا۔ ”ناچیز کو مرزا منصور احمد کہتے ہیں۔ جناب کی تعریف؟“ ”ننگ اسلاف کا نام پوچھ کر کیا کیجئے گا۔ غریب خانہ و کٹوریہ اسٹریٹ پر ہے۔ واپس جا رہے تھے۔ کرفیو پاس پاس نہ تھا۔ دو گھڑی سستانے کے لئے ادھر آ نکلے۔ آپ صاحبان کی بصیرت افروز گفتگو کان میں پڑی۔“ ”میں چین میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا۔!“ ”عنیب بیگم نے کہا۔“

”ماشا اللہ — ماشا اللہ —!!“

”تسلیم“

”نواب صاحب فی الحال تو بلبلیں نالہ زن ہیں“ منصور انکے پاس جا بیٹھا۔

”آج کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ نہ محرم نہ شبیں نہ بارہ وفات“

”ہیہات“ گمنام نواب نے آہ سرد کھینچی ”ہاتف بگفت آہ شدہ لکھنؤ خراب!“

جب ادبار آتا ہے عقلوں پہ پتھر پڑ جاتے ہیں۔ وہ پتھر اہل اسلام ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ حاکم شام کے متعلق چار الفاظ پر مشتمل ایک فارسی فقرہ

پاٹے ناے پر ہمیشہ آفت ڈھاتا ہے۔ آج صبح کسی لڑکے نے وہ دہرایا:

”پریڈنٹ اسد کا پاٹے ناے سے کیا تعلق؟“

”سیک صاحبہ نے بہت ٹوک کی لی! ماشا اللہ!!“ عنذیب بانو کے تجاہل عارفانہ پر موضوع تبدیل کیا۔ ”جنرل کلاڈ مارٹن بہترین مرغ باز بھی تھے۔“ پان کی ڈبیانکالی۔ بولے

— ”یورپین سیاحوں کو لکھنؤ میں ماسکوا اور ڈریسڈن کی جھلک نظر آئی۔“

درختوں کے سائے طویل ہوئے۔ اور سلسلہ گفتگو۔

آغا میر۔ انشا۔ مصحفی۔ میر تقی میر۔ کرنل دیم گارڈنر۔

منصور نے کہا۔ ”انگریز کے اقبال کی ایسی ہی ہے رسی۔ آدنیختہ ہے

اسمیں فرانسس کی ٹوپی۔ اردو داں فرنگی اسکی سوسائٹی میں شامل تھے اور وہ

بیہرک لکھتا تھا۔ یاں وقت سلام اترے ہے ابلیس کی ٹوپی“

”ابیلے لوگ تھے“

”کون۔؟ انگریز۔؟“

”نہیں صاحب۔ لا حول ولاقوة۔ سنا ہے ابک زمانے میں پیرس یورپ کا لکھنؤ

کہلاتا تھا“

”ماشا اللہ۔ یہ ہے اصل وطن پرستی۔ سن لیجئے۔ مسز بیگ۔ لیکن ہوا واقعہ ہے کہ لکھنؤ پر

فرینچ کلچر کی چھاپ بھی مقرر پڑی۔ فرامیس کی ٹوپی۔ فرامیس کی ٹوپی۔“ منصور نے

مفکرانہ انداز میں ناک کھجائی۔ ”اس پر یاد آیا کیسے پتے کی بات۔“

”جو گندرنے کل کہی۔“ مسز بیگ بولیں۔

”اودھ اور لکھنؤ میں اتنی جاذبیت تھی کہ فرات ہے تو وہ گوتمی۔ سین اور ٹیمپ ہیں

تو وہ گوتمی۔ فرامیس، انگریز۔ یوریشین۔ سب نوابوں کے تمدن میں مدغم۔ بقول شخصے

سرشار نے طینیوب کے اُس پار بھی لکھنؤ آباد کر دیا۔ دیکھنے میں چھوٹی ٹی ندی۔ مگر نیل

کا حکم تھی ہے۔ مثال کے طور پر مسز بیگ دوپلے اور نپولین کی بوٹ شپ والی ہیڈ کو

گوتمی میں غوطہ دیا گیا تو وہ بھورت گشتی نما لکھنوی ٹوپی نمودار ہوئی۔“

”سبحان اللہ“

”ہمارے ایک دوست کا ارشاد ہے کہ اہل فرانس جب نگارستان لکھنؤ میں محافلِ رقص و سرود دیا کرے تھے تو خوشدلی سے اپنے ٹوپ مجرے والیوں کے سروں پر رکھ دیتے کبھی ٹھمکی لگا کر وہ بانگی ٹوپیاں اربابِ نشاط خود اوڑھ لیتیں۔ اس طرح وہ کارچوب سے سچ کر انکی پوشاک میں شامل ہو گئیں۔ ایک بار موسیٰ کے باغ میں۔“

عندلیب بانو نے تعجب اور دلچسپی کے ساتھ بات کافی ”تمہارا مطلب ہے منصور — کہ ناچ گرنے کی کشتی نما ٹوپیاں فریج اور کین کی تھیں؟“

”دی۔ مادام۔ اور آپ کو وہ واقعہ تو معلوم ہو گا کس طرح نواب حامد علی خان والی رامپور کی مغلیں مرصع ٹوپی کی وضع پر مہاتما گاندھی نے کھادی کیپ رائج کی!“

”خیاط فلک اس کی ٹوپی اسکے سر پر رکھتا جاتا ہے۔ نواب نے ایک اور راہ بھری۔“

دو پور میں ہوتی سبزے پر اکڑوں بیٹھ کر حلیم پیئے لگے۔

عندلیب بیگ بہن پڑیں ”ہمارے بانی کے اولیں ہوتے تھے۔ چریسے۔ مدکیے۔ ہمارے بادشاہ اور شہزادے۔“

”آپ بھی آخری شاہانِ مغلیہ اور تاجدارانِ اودھ کے متعلق وہی روایت رکھتی ہیں۔ عیاش۔ نکمے۔ واپیات۔ زحمت نہ ہو تو ذری انہی مجبوریوں پر غور کیجئے۔“

نواب صاحب نے فرمایا ”غلام قادر روھیلا۔“

”مسلمانوں نے مسلمانوں پر کم ظلم ڈھاتے ہیں؟“ مسز بیگ بخشے والی نہیں۔

”روھیلوں سے جان بچا کر شہزادہ سلیمان شکوہ مملکت اودھ میں پناہ لیتے ہیں۔ شاہِ عالم کے فرزند۔ اکبر شاہ ثانی کے برادرِ خورد۔ نواب آصف الدولہ چھ ہزار ماہانہ انکا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں وہ اینا دربار آراستہ۔“

”مچارکھی ہے سلاطینوں نے وہ توبہ دھاڑ — کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ!“

عندلیب بیگ نے سودا کی گواہی دی اور سلیمان شکوہ کے متعلق نواب صاحب کو یاد دلایا

”لکھنؤ میں اپنی عیاشیوں کی بدولت رستو گویوں کے مقروض“
 بیگم صاحبہ ایک دیک لگے شاہ بلوط کو متواتر ٹھونگیں مارتی کھٹ کھٹ بڑھیا سی
 لگیں۔ منصور نے گناہ بزرگ کو معذرت طلب نگاہ سے دیکھا۔
 ”سیلمان شکوہ سے قبل انکے بڑے بھائی تشریف لائے تھے دلی سے۔ مرزا جہاندار
 نواب وزیر نے انکو بڑی تکریم سے مارٹن کوٹھی میں ٹھہرایا انہوں نے فوراً لہو لعب فیتق و فحور
 چھوٹے ہی وزیر ہند میربان کی منظور نظر قاصد بھگت پر عاشق گورنر جنرل دارن سٹنگنز سے
 درخواست کی ہمیں بھگتہ دلوا دیجئے۔ اس فرمائش پر سٹنگنز بھی چھینپ گیا۔“
 ”جی بیگم صاحبہ۔ انہیں نواب جہان آبادی خطاب عنایت کیا شاہزادے نے۔
 نادر گرامی شہزادہ عالی قدر۔“ گناہ بزرگ نے ملائیت سے کہا۔ ”وہ سب بنارس میں“
 ”پھر سیلمان شکوہ کے بھتیجے دلی سے وارد ہوئے۔ مرزا جہانگیر۔ وہ شراب میں
 ڈھٹ لکھنؤ کی گلیوں میں گھوڑا دوڑاتے بلڑ مچاتے چوک کے کوٹھے سے دمڑی کو بھگا لے گئے۔
 یہ تو آپ لوگوں کی حالت تھی۔ انگریز آپ کا ملک آپ سے کیوں نہ چھینتا“

”جن دنوں طوائف الملوکی چالو تھی طوائفوں سے ملوک کا بہت رابطہ رہا، یار عنبر“
 منصور نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہاری والدہ لورڈو ہاؤس کے بعد کیل کٹا یونیورسٹی؟“
 ”شوق بہت تھا مگر شادی ہو گئی۔ یونیورسٹی نہ جاسکیں۔ البتہ ایک فیملی فرینڈ تھے۔
 کاسیٹھ۔ میٹا برج سے تعلق رکھتے تھے۔ انکی لائبریری گویا انکے قبضے میں تھی تم خواتین
 کلکتہ کی علمی روایات سے واقف نہیں ہو اور تم بھی عجیب سے ڈاکٹر ہو۔ ایکسپو یونیورسٹی۔“
 ”ہا۔ ہا۔ ویری فنی! ڈاکٹر اور سائنسٹ ہی تو اکثر لٹریچر اور آرٹ میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔
 تم کو اپنے مکان کی آرٹسٹک سیننگ کی اتنی فکر کیوں ہے؟“

خاموشی۔ بخت باد بہاری کی آنکھیلیاں۔ آم کے پیڑ میں چھپی ایک شاما گانے لگی گویا
 اب تک اپنے کیوں کی منتظر تھی۔ بوند باندی شروع ہوئی۔ اچانک بجلی کڑکی۔

”یہ نہیں برق اک فرنگی ہے۔“ منصور سیداننا پر لوٹا
 ”رعد و باراں خٹون جنگی ہے۔“ پرنس نے پھر بات شروع کی۔
 ”سلطنت خدا داد میسور کو انہوں نے خاک کیا۔ دلی پہ وہ چھاتے۔ مرہٹوں کا انہوں نے
 زور گھٹایا۔ سعادت علیاں کی خوش انتظامی۔ اودھ پر ہن برسا دیا۔ ع چاندنی چاندی کا پتھر
 دھوپ سونے کا ورق! — مگر جان کھینی کی ٹوٹ۔“
 چھینٹا پڑا۔ پھر دھوپ نکل آتی۔ چڑیاں بارش میں خوب نہالیں۔ اب چوہیں پروں
 سے صاف کرنے میں مصروف تھیں۔
 ”سنا ہے نواب وزیر جان بلی کو مستقل DEFY کیا کیے۔ لائق اور بیخوف حکمراں تھے
 — انکا جامہ دار کا فرغل ایک میوزیم میں اس طرح رکھا ہے جیسے انہوں نے ابھی تیار کر
 کھوٹی پرٹانگ دیا ہو۔ ہم نے سوچا ہم اسے پہن لیں تو کیسے لگیں۔“
 ”آپ وہ فرغل نہیں پہن سکتے مرزا صاحب آپ بالکل مختلف انسان ہیں۔ وقت
 کے ارتقاء کا تقاضا ہے۔ آپ کی شخصیت مختلف ہو چکی ہے۔“
 ”سنا ہے بلی نے زہر دلویا۔“
 ”انکی علالت کی اطلاع بلی کا رد بھی گئی فوراً ڈاکٹر ولسن کو یکر پہنچا۔“

ریزیڈنسی کے موڈل میں ایک DR. JUDAH'S HOUSE موجود ہے۔ وہ
 کون سے ریزیڈنٹ کے فرزیشن تھے۔

میں عنبرین JUDAS TREE کے نیچے بیٹھی ہوں۔ جو ڈز نے رومن سپاہیوں
 سے کہا تھا۔ میں یسوع کو چوموں گا۔ تم سمجھ
 ڈرپ - ڈرپ - ڈرپ - بلی گارد کے درختوں سے خون

”کہتے ہیں ڈاکٹر نے انجکشن کے یہاں گئے میں فیتہ باندھ کر سعادت علیاں
 وزیر ہند کا کام تمام کیا۔“

تختہ گل یہ تتلیاں اڑتی پھر رہی ہیں - درختوں پر بیٹھی چڑیاں چیمچہائیں -

”جان سیلی عمدہ بیگم پہ جان دیتا تھا۔“

”کون عمدہ بیگم؟ جن کی بہن فیروز پور جھڑکے کے نواب شمس الدین۔“
 ”محترمہ آپ نے ہمیں اچھے میں ڈال دیا۔ جاکٹھ سے چلیں تو فیروز پور
 جھڑکے جا پہنچیں! یہ وہ عمدہ بیگم نہیں ایک حسین لاوارث لڑکی تھی کلاڈمارٹن
 والی سیلی بیگم نے پالا تھا۔ جوان مری۔ جاہنہار کا جان سیلی نے مقبرہ بنوایا۔
 روز بایں پہ جاتا۔ اسکے بالوں کی ایک لٹ لاکٹ میں لٹکائے رکھتا۔ نو سال
 لکھنؤ میں رہا۔ کمپنی کی جزیں مضبوط کر گیا۔ نایاب مخطوطات سمیٹ چلتا بنا۔“
 ”اندیہ آفس میں محفوظ ہو گا وہ ذخیرہ۔ یہاں برباد ہو جاتا۔“
 ”جی۔ بیگم صاحبہ۔“ وہ کانپ سے گئے۔ بستی رومال سے چہرہ پونچھا۔
 جیب سے گول گھڑی نکالی۔

”آپ ہی آپ سے پکارا تھا۔ دل بھی جیسے گھڑی فرنگی سے منصور نے آہستہ سے کہا۔

”بیگم صاحبہ۔ شیعہ مہرہ تھانہ سنی۔ جلی رسی کا بل نکالنا مقصد تھا۔ اکبر شاہ ثانی
 نے لارڈ مائر اگورنر جنرل کو دربار میں بکھڑا رکھا۔ دلی کارینڈینٹ بادشاہ کا موروثی لقب
 چھیننے کو کہہ رہا تھا۔ لاٹ صاحب نے اسی پر اکتفا کیا کہ ان غریب کو نیچا دکھانے کیلئے مروجہ
 وزیر ہند سعادت علی خان کے بیٹے نواب وزیر غازی الدین حیدر کو لندن سے ہر میجسٹری دی
 بنگ کا خطاب دلوا دیا۔

”لکھنؤ کے ریڈینٹ نے سلیمان سنگھ کو حکم دیا اب آپ فرمانروائے اودھ سے نذر قبول
 کرنے کے بجائے ان سے برابری سے ملا کیجئے۔ اب وہ آپ کے خاندان کے وزیر نہیں خود
 بادشاہ ہیں۔“

”جب ہم یہاں پڑھتے تھے۔“ منصور نے کہا۔ ”شاہ نجف کے چراغاں کی تمام

ساتویں آٹھویں محرم کو برقی تمقوں سے امام باڑے کے پھاٹک پر ایک نام انگریزی
 حروف میں جگمگاتا تھا HIS MAJESTY KING GHAZI UDDIN HYDER
 اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی خوشی اور THRILL محسوس ہوتی تھی حالانکہ نہ
 وہ بادشاہ باقی تھے۔ نہ انکی سلطنت۔“

”نواب آصف الدولہ کی مانند نصیر الدین حیدر سائیس اور انجینئرنگ کے
 شائق تھے لکھنؤ کا ہر فرد و بشر مسلح تھا۔ بچے تیروکان سے کھیلتے تھے۔ آپکے
 نزدیک اہل لکھنؤ نازک مزاج مرغ باز ہی رہے۔“

”آخری مغل بادشاہ اور اودھ کے فرمانروا اگر عیش پرست ظالم اور
 لغو تھے، محمد شاہ محض رنگیلیے، واجد علی شاہ صرف ناچا گایا کرتے تھے، تو
 سارے ہندوستان میں دولت اور تجارت کی یہ فروانی کیسے رہی؟ سلطان عالم
 جب میاں برج لے جائے گئے ہیں اودھ کا بچہ بچہ اشکبار تھا۔ بھلا کوئی جابر اور
 نکتہ بادشاہوں کے لیے روتا ہے؟“

”وزیر اعظم حکیم مہدی منتظم الدولہ نے انگریزی اسکول کھولا۔ میٹھو کا چھاپہ
 خانہ۔ ہسپتال۔ آپکے خیال میں بس یہاں یا امرا و جان آدا تھیں یا بشیریں اور کبوتر۔
 ”ایسی ثقہ، پر تکلف آزاد خیال سوسائٹی کا دراصل آج آپ تصور نہیں کر سکتیں
 آپکے پیمانے مختلف ہیں۔ فرسی من لاج کے ممبر انگریزی داں مسلمان امرا آئے
 دن ولایت جاتے تھے۔“

”نواب صاحب۔ چند امیروں وزیروں کے لندن ہو آنے سے پوری سوسائٹی
 موڈرن نہیں ہو جاتی۔ ورنہ سرسید کو اتنی جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔“

”غدر نے اس پورے معاشرے کو نیست و نابود کر دیا۔ اب ہم آپکو کیا بتلائیں۔“
 ”معاف فرمائیے گا نواب صاحب۔ یہ بادشاہ اور شہزادے لوگ آپکے اجداد تھے لیکن
 میری والدہ مرحومہ کی ایک جتن بی سے ملاقات تھی۔ جنہوں نے اپنے منہ بولے ماموں سے

آپکے اس عمر ملائی، اس جہان انسا نہا کی تفصیلات سنی تھیں۔ وہ بزرگ اس زمانے کے لکھنؤ میں موجود تھے۔
 ”گویا آپکا راوی بھی ضعیف نہیں!“

نواب مخدوم علیا دختر میجر والٹرز۔ ملکہ نصیر الدین حیدر۔ مادام پمپا دو رثانی۔ سوتیلے پاپا انکے علی بخش میراثی راستے سے لڑکیاں اٹھواتے تھے۔ رہیں قمر چہر گارڈنر۔

ایسے دل گرفتہ تباہ حال نرم مزاج سے اجنبی کے لیے اس قسم کا جارحانہ انداز بھی دیمینز لب میں شامل ہے؟ اس بوڑھے آدمی کا سارا سرمایہ اسکا ماہی ہے۔ جسکا منافع بقدر اشک بلبل اسے ہر ماہ ملتا ہوگا۔ بطور وثیقہ۔ نہ یہ کرکٹ ہے نہ کروکٹ بلکہ بلیٹ کے نیچے گھونسہ۔ اسکا پاسٹ اسے مطمئن، متفخر کرتا ہے اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ اسے بھی رن ڈاؤن کیے جا رہی ہیں۔ ”آج کے مورلز مختلف ہیں؟“ منصور نے پوچھا۔

ہوا چلی — دور دور تک پھولوں کی کیاریوں میں رنگ برنگی لہریں پیدا ہوئیں۔ نواب صاحب نے ارشاد کیا ہے
 ”اپنے گیللاس شگوفے بھی کرینگے حاضر
 آکے جب غنچہ گل کھولینگے بوتل کے دہن
 پتے بل بل کے بجادینگے فرنگی طنبور
 خود نسیم سحر آویگی بجانے ارگن
 حوض مندوقِ فرنگی سے مشابہہ ہونگے
 اسیمں ہو دینگے پریزاد بھی سب عکس نکلن“

منصور آگے کو جھکا بغور سن رہا تھا۔ نواب صاحب۔ ارے بھی عنبر
 یہ مندوقِ فرنگی انشا اللہ خاں نے CAMERA OBSCURA کو تو نہیں کہا تھا

جو دانیانِ فرنگ ایجاد کر چکے تھے کیا عجب ہے جان سہلی صاحب نے ایک عدد ولایت سے منگوا لیا ہو۔“

”وہ کون چیز جناب والا؟“

”کیمبرے کی ابتدائی صورت قبلہ۔ یہ شعر یقیناً اسی کے متعلق ہے۔ صدوقِ فرنگی اور اسیس پریرا د عکس فکس۔“

”برسٹل میں اسکا موڈل دیکھا ہے۔ سمجھئے کمرے کے برابر گنبد۔ اسکی چوٹی پر ایک عدد گھوٹنے والا لینس۔ نیچے فرش پر دودھیا شیشے تماشائیوں کے لیے چوگرد گیلری۔ تیز دھوپ میں گنبد کے باہر کا منظر اور چلتے پھرتے لوگ اس LENSE پر REFLECT ہوتے تھے۔ اور اس کا الٹا عکس دودھیا شیشے پر۔“

”نیچے صاحب میرا نشانہ کا شعر آئینہ ہو گیا ! کیا عجب ہے کہ بلی گار میں مصحور انگریزوں نے اسی شے کے ذریعے ہماری افواج کی نقل و حرکت کا معائنہ۔ واللہ مرزا صاحب۔ آپ نے کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ اب جا کے صدوقِ فرنگی کے جوہر کھلے۔“

”جوہری محلے میں نواب صاحب۔“ منصور نے چرخِ فساد زدہ شہر کے رخ گھمائی۔
”میرا نشانہ تو جھوٹی ٹولے کے نزدیک رہتے تھے،“ نواب نے پھر کئی کاٹی۔

”حسین بخش بولے۔“ میرا نشانہ جس مکان میں آکر رہے تھے وہ ماشاء اللہ سے اب بھی آباد ہے۔ مرزا محمد عسکری کا دولت خانہ۔“

”مرزا عسکری غالب والے مرزا خانی کو تو والِ دلی کے پوتے — دادا انکے مرزا انور بیگ فوجِ آصفی میں افسر تھے۔ انھوں نے یہ مکان ایک ٹیلے پر بنوایا تھا۔ جھوٹی ٹولے کے نزدیک۔ میرا نشانہ دلی سے آن کر وہیں ٹھہرے تھے اور مصحفی۔“
”وہ کمرہ بھی میرا نشانہ والا سی طرح موجود ہے نواب صاحب۔ ہمارے بڑے

لے لکھنؤ کے شیعہ علماء کا محلہ۔

ابا مرزا محمد عسکری صاحب کے ہاں کھانا پکاتے تھے۔
 ”وہ بھی پیسے کی دال پر اشرفی کا بگھار لگاتے ہونگے!“
 ”نواب صاحب۔ ایک مرتبہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کی ایک
 ضیافت میں سروجنی نائیڈو بھی شریک تھیں۔ کہنے لگیں اور کچھ ہو نہ ہو آپ
 لوگ کپڑے بہت اچھے پہنتے ہیں کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں۔ سر رضا علی نے
 بلبل ہند کو جواب دیا۔ سلطنت تو کھو چکے۔ کھانا بھی اچھا نہ کھائیں؟!“
 ”اسی چوڑپن کی وجہ سے تو سلطنت کھوئی۔“ مسز بیگ نے نقہ دیا۔

”شاہی سا کھنؤ وینس جیسا شہر تھا۔ دریا کے دونوں طرف محلات اور جوئیلیاں۔
 — جوئیلی علی نقی خاں بہادر کی!“ منصور نے ندی کی سمت اشارہ کیا۔
 ”جی ہاں بلی گار د کے پھاٹک سے ریڈیڈنٹ اپنے بجرے پر سوار ہوتا اور
 برطانوی جھنڈا لہراتا یہیں سے بنگال نکل جاتا۔ گومتی جو نیور کے آگے گنگا سے ملتی
 ہے۔ وہاں سے سیدھا نکلتے۔ اس کنارے پر قلعہ بھی بھون سے لیکر لامارٹینر کالج
 تک محلات اور باغات کا سلسلہ۔ گومتی کے دونوں کناروں پر آبادی کیوجہ
 سے ریڈیڈنسی کا دفاع مشکل تھا۔ اس وجہ سے ایام غدر میں انگریزوں نے یہ ساری
 عمارتیں کھدوا ڈالیں۔ صرف چھوٹی بڑی چھتر منزل باقی بچیں۔ حضرت محل والدہ
 برجیس قدر نے تعلقہ داروں سے کمک حاصل کی۔ مردانہ لباس پہن کر خود ہاتھی
 پر بیٹھیں انکی زنانہ فوج بھی بے جگری سے لڑی۔“

”سُن لیجئے مسز بیگ۔ زنانہ فوج!“ منصور نے کہا۔ ”ملکہ حضرت محل کی۔
 ”جون سنہ ستاون کے پہلے ہفتے میں ہماری فوجوں نے اودھ پر برطانوی
 حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ریڈیڈنسی کے اندر پانچ ہزار فرنگی مع جن بیچہ پناہ گزیں
 تھا۔ ۳ جون کے روز بیگم حضرت محل کے لشکر نے یلی گار د کا محاصرہ کر لیا۔
 ستائیس دن تک انگریزوں کو یہاں محصور رکھا ہم لوگوں نے! مسلسل گولہ باری۔“

درو دیوار چھلنی ہو گئے۔ بڑیس قدر کو لال بارہ دری میں تخت پر بیٹھایا گیا۔ ان کے ایک پوتے کلکتہ میں رہتے ہیں۔ ایک لندن۔ ایک علیگڑھ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ایک پڑپوتی کلکتہ میں ایڈوکیٹ ہیں۔
 ”نواب صاحب ابھی تو بلی گارد کا محاصرہ ہی جاری ہے۔“ متصور نے ادب سے یاد دلایا۔

”جی۔ تو خورشید منزل کے سامنے تین جنرل آکر ملے اور اپنی فوجیں لیکر برطانوی ریڈیٹنسی کی طرف بڑھے۔

”یہی بسنت رت۔ نوروز۔ ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء۔ جب سر کوہن کیمپ بل کا فارغ لشکر لکھنؤ میں داخل ہوا۔ اکبری دروازے سے لیکر دکنشنگ یہ پیتال شہر کھڈا ڈالا۔ اسکے ملبے سے سڑکیں بنوائیں۔ قیصر باغ میں ایک بارہ دری تھی جس میں واجد علی شاہ جشن مہتاب کے لئے رولق افروز ہوتے تھے۔ اسے کھڈا ڈالا کیونکہ اختر پیا کے کلکتہ نہ دھارنے کے بعد عوام وہاں جمع ہو کر زار و قطار روتے تھے۔

”حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی نے فرمایا تھا۔۔۔ شب کو سونیکے ایک سلطنت میں صبح کو اٹھیں گے دوسری سلطنت میں۔ روشنی اور پانی سب انکے قبضے میں ہو گا۔ جب چاہیں گے بند کر دیں گے۔ لوگ قبروں پر جا کر کہیں گے تم لوگ امن میں ہو کا شہم بھی تم میں ہوتے۔۔۔ قہر کا سرپوش ہندوستان پر ڈھانپ دیا گیا ہے لوگ مثل پھلیندوں کے بکھرینگے۔

”حضرت مولانا نے غدر کے بعد کبھی برف نہیں کھایا۔ انگریزی کا غدر نہیں لکھا۔ ولایتی شکر استعمال نہیں کی۔ انگریزی بوٹ نہیں پہنے۔ ریل پر سفر نہیں کیا۔ درست اس سے فرق اس وقت کچھ نہیں پڑا۔ گاندھی جی نے مدتوں بعد یہی سب کیا۔ فرق پڑا۔ غدر کے بعد حضرت مولانا نے کسی مشرک کی صورت نہیں دیکھی انہوں نے ایک پیش گوئی کی تھی کہ انگریز بکریوں کی طرح بھاگیں گے۔ بھاگے۔ یہ بھی

فرمایا تھا ٹوپی والے جائیں گے۔ پگڑی والے آئیں گے۔ آئے۔ اور اب۔
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو۔“

”نواب صاحب۔ کوئی تاریخی شہر ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں رہا۔ جتنا
کنارے اسوقت آٹھویں دہائی آباد ہے۔ یا شاید نویں۔ غنیمت ہے جو
ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں۔“

پولس فائرنگ کی مدھم آواز پر نواب صاحب کرا ہے۔ ”میرے بزرگ تو محرم کی ایک
”مشرکہ تہذیب بنا گئے تھے۔“ انہوں نے سبقتی رومال سے آنکھیں خشک کیں۔
”روٹوں کی تہذیب۔“ والدہ عمنہیں نے زیر لب کہا اور آہستہ سے منصو کو مخاطب
کیا۔ ”تمہیں مومک ٹرٹل یاد ہے؟ جو مستقل آہیں بھرتا اپنی المناک کہانی سناتا اشک
بہاتا رہتا تھا۔ میں بھی بہت جلد ایس کی طرح آنسوؤں کی جھیل میں پچنے لگوں گی
یہ گراف دکھو۔ عہد آصفی میں تیرہ دن۔ پھر چالیس۔ زارینہ کیتھرین ثانی کے دور میں سوا
دو مہینے۔“

”زارینہ کون۔؟ یہاں مسز بیگ آپ نے ہمیں بھی گڑبڑادیا۔“
”بادشاہ بیگم۔ ملکہ غازی الدین جدر۔“

”اوہ۔ دہ زارینہ۔ لیکن دولت اور فرصت کی فراوانی بوشوئی کل ٹورے کو جنم دیتی ہے
لکھنؤ کی اسنوبال کرتی رسوم اعزاداری کتنی غریب پرورش ثابت ہوئیں اور انکا فال آؤٹ
آجنگ سارے ہندوستان کی شیعہ سنی اعزاداری میں نظر آتا ہے صاحب۔ آج کا ذاکر
اور سوزن خواں ہر سال لکھنؤ چوچورا مارو جے سے نکلتا ہے تو سیدھا لندن اور ٹورانٹو۔
میرانیس آج موجود ہوتے توجب قطع کی مسافت شب راتیں البرٹ ہال میں پڑھا کرتے۔“
جھکی۔ لفاظ۔ مسز بیگ نے سوچا۔ بزرگ نہایت ممنویت کے ساتھ منصو کی تقریر
سماعت فرما رہے تھے۔

”اعلیٰ شاعری، خطابت، فلسفہ کائنات، آداب مجلس، فنکاری، صناعی،

پچھڑی، یونیم دی تھنگ — پیور میوزک، پیور ڈرامہ۔ مرثیوں کی گریورین گونج۔
 ویسٹرن اسٹیج پر گریک کورس آیکو متاثر لڑتا ہے۔ یہاں گھر گھر بال بکھرے سیاہ پوش
 نوم خواں عورتیں ہاتھ میں شمعیں اٹھائے تنگے پاؤں چلتی کسی یونانی ٹریجڈی کی نقل نہیں
 کر رہیں لیکن پام سنڈے، ایش ونس ڈے کو رس کرسٹی کے جلوس درست مجرم غلط۔
 ”اور بطور کلائمیکس نالہ و بکا۔ چھریاں۔ زنجیریں — HIGH CULTURE —
 بولتونی کل ٹورے۔“

”جی ہاں۔ یہ البتہ“ وہ منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔ پھر ایک پوائمنٹ یاد آیا ”پچھلے سال
 میں نے یہاں ایک کاتھینم ہائی گورٹج کو نہایت نفیس مجلس پڑھتے سنا۔ اور
 کشن لال فیض آبادی کی انجمن نوم خوانی — اعلیٰ تہذیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ
 دوسرے بھی اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے ہم نے برطانوی تمدن اپنایا۔ شاہی کی کچھر کا
 فال آؤٹ — ادھ کے اکثر دیہات میں سنی عوام جم کے ماتم کرتے ہیں —“
 ”جی ہاں بھیا۔ اور ہمارے کے ہاں دیہات میں ہندو عورتیں دسے روتی ہیں۔
 اور انڈیا بھرے میں سنت جماعت کے تعزیے سب سے زیادہ شاندار سلیس۔ پٹے بازی۔
 خلیفاؤں کے اکھاڑے“

روبرٹک روڈ پر پھر نعرے خلیفہ منصور دیکھ کے آؤکس پہلوان کا اکھاڑہ نکل رہا ہے۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا عنبر۔ یہ خلیفہ کیو با سے واپس آئے ہیں۔ شیران باندیسر
 منتظم الدولہ نے دونوں کے ماہی مراتب کا بند و بست ایک ہی دن کیا۔ فرگٹ اٹ۔
 حسین بخش کوئی دہا سنا سیے“

”آج کتلوا کی رات — اماں کھلا دیں دودھ بتاسہ — پیاسے گئے حسن
 حسین — رن ماچلی ترو ریارسے —“

”تضادات کی سرزمین۔ ہندوستان —“ عنبریں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہم لوگ —“ منصور نے جواب دیا، ”عرصہ دراز مغرب میں گزار کر لوٹے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ تضادات عجیب لگتے ہیں۔ اجمیر شریف میں بے شمار تلک دھاری آر۔ ایس۔ ایس درکر جلوس سے نکل درگاہ پر حاضری دیتا ہے“

”CRAZY COUNTRY“ یار

”ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد لکھنؤ میں تعمیر کی جا رہی ہے۔ شہر کے تاریخی مقابر اور مساجد کھنڈر ہو گئیں۔ امام باڑوں کے لیے شاہان اودھ کے ٹرسٹ موجود ہیں لیکن حسین آباد اور شاہ نجف والوں نے انکے بیرونی حصے سستے کرائے اور پگڑی پراٹھا دیے۔ اب وہ باہر سے مسلم معلوم ہوتے ہیں سارے ہندوستان کے اوقاف کی مالیت ایک کھرب ہے۔ کروڑوں سالانہ کی آمدنی متولی خورد برد —“

”اوقاف کے معاملات —“ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا، ”ہمیشہ سے دگرگوں چلے آتے ہیں۔ حافظ جی فرما گئے ہیں۔ ع کے مے حرام دلے بہہ زمال اوقاف است!“

”حافظ جی کا الیکشن جب ہوا ہم بجنور میں تھے۔ ڈاکٹر فخر احمد انصاری کے ہاں ملازم تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو حافظ محمد ابراہیم صاحب کے پاس چلے گئے۔ کانگریس سرکار بنی۔ ہم بٹلر پولیس لکھنؤ۔ حافظ جی کے ایک چٹڑی سے ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا“

”واہ میاں حسین بخش۔ خوب فلور کروں کی۔ دل بدلی!“

”بھیا۔ یہ بڑے آدمیوں کے معاملے ہیں۔ ہم غریبوں کو جہاں دوروٹی کا سہارا۔ بٹلر پولیس کے مطبخ میں ہمارے خالو موجود تھے ہمیں مشالچوں میں بھرتی کروادیا“

”بٹلر پولیس!“ پیر مرد نے ایک اور آہ بھری۔

”ابا جب ٹھا کر نواب علی کے ہاں کام کرتے تھے لاٹ صاحب بٹلر کو بہت دفعے چاہ پانی مہاراجہ علی محمد خاں کے وہ کپے دوست تھے تبھی اپنے پولیس کا نام —“

”جان کچنی کے انگریز نوابوں کی ٹریڈیشن کا اس صدی میں آخری نواب —“

گمنام بزرگ نے گویا فٹ نوٹ لگایا۔

”بجنور میں کانگریس کی چہل پہل دیکھی یہاں ٹیلر سیلیس لیگ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔“
 ”جہاں امرائے شرقیہ اور عمائدین بنگالہ نے۔“ نواب نے کہنا شروع کیا۔
 ”ایک بار پھر۔ سنہ سینتیس میں۔“

”بس ذرا جغرافیہ میں گڑبڑ ہو گئی، کھٹ کھٹ بڑھیا نے ٹھونگ ماری۔
 ”دیوبندی مولانا لوگ کانگریس کے ساتھ تھے“ حسین بخش بولا کیے۔

”دیوبندی اور فرنگی محلی“ منصور نے جذبے سے کہا۔ ”ایک بار مولانا آزاد نے گاندھی جی سے فرمایا تھا یہ بوریہ شین غلام جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں مسلمانوں میں ان سے زیادہ انقلابی جماعت اور کوئی نہیں۔“
 ”گولیاں چلنے کی آواز آئی۔

”امیر احمد خان راجہ محمود آباد اور راجہ صاحب سلیم پور لیگ لے دو لوں بڑے لیڈر شیعہ مگر لیگ میں حضور شیعہ سنی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب مسلمان ایک۔ پھر ایک سنی لیڈر کانگریس سے لیگ میں آ گئے ایک شیعہ لیڈر لیگ سے کانگریس میں گئے۔“
 ایک غبی سی دھوبن چڑیا گھاس پر بیٹھی بڑے غور سے یہ گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جب وہ ادھر سے ادھر آتے اور یہ ادھر سے ادھر گئے۔“
 ”ادوہ میرا تو سرگھوم رہا ہے“ عنبریں نے فریاد کی۔
 ”سیر یڈن لو۔ ٹن۔“ ریڈیو کی اشتہاری آواز میں منصور۔
 ”توپٹیا ان دونوں کا آپس میں جھگڑا تھا۔ پھر حضور وہ تبر اندر صحابہ ابھی ٹیشن۔“
 ”فرنگی محل کے مولانا لوگ اس ٹنٹے میں نہ ادھر نہ ادھر۔ شیعہ سنی دونوں انکی عزت۔“

”فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ۔“ نواب صاحب نے پھر بات کی۔
 ”شہنشاہ اورنگ زیب نے قائم کیا تھا۔ اور اس میں ہمارے زمانے تک شیعہ سنی مابعد ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ریاستوں کے خاتمے تک شیعہ

والیان ریاست اسے گرانٹ دیا کئے۔ صاحب! اینٹی مگ ڈونل اور جیمز سنٹن کیا کر پاتے اگر خود ملت بیضا عقل سے معری نہ ہوتی۔“

”عبرین بیگم لکھنؤ کا شاہی کیریکٹر تو مسلمانوں نے آزادی کے بعد یہ شیعہ سنی جھگڑے بڑھا کر خود اپنے ہاتھوں سے ختم کیا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا آلکار بن کر،“ منصور نے افسردگی سے کہا۔ ”۸ ربیع الاول کا چُپ تعزیه — کیا منفرد لرزہ خیز نظارہ تھا۔ سیاہ رنگ کا پہاڑ کا پہاڑ — آہستہ آہستہ متحرک۔ ہزاروں کا جلوس۔ سب خاموش ہندو مسلمان سب تنگے پاؤں۔

اور وہ حضرت قاسم کی شادی CELEBRATE کرنے کے لیے تینوں شاہی امام باڑوں کا زبردست چرغاں — آصفی۔ شاہ نجف۔ حسین آباد۔ ذوالجناح اور اور مہندی اور سونے چاندی کی ضربیوں اور علموں کے پرودشن — شاہی کے زمانے کی وردیاں پہنے پنجشاخے اٹھائے امام باڑوں کے اہلکار۔

”ہر تعزیے پر لکھنؤ کے کاریگروں کی حنائی ختم تھی مینہار چوڑیوں سے تعزیہ بناتے تھے۔ مالی گھاس سے۔ دُھن روئی سے۔ کہار مٹی سے۔ مصری سے بنتے تھے تعزیے۔ آزادی کے برسوں بعد تک یہ نظارے موجود میں فیض آباد روڈ پر مقیم تھا۔ عاشور کی صبح سویرے سے ماہ نگر کی سٹی کر بلا کی طرف تعزیے جانا شروع ہوتے۔ ایک سے ایک شاندار۔ عزیزوں کے معمولی۔ سب ماتمی تاشے کے ساتھ۔ تاتا بندھا رہتا — ”اجاڑ سہ پہر تک تعزیوں کی تعداد میں کمی آجاتی۔

”مجھے یاد ہے آخری سال جب میں نے اپنے برآمدے سے وہ منظر دیکھا دیران راستے پر چھوٹا سا سبز رنگ کا نہایت HUMBLE کاغذی تعزیہ۔“

”چند غریب مسکین تہہ پوش سنی اسے لیے جا رہے تھے۔ اس شام میں

امریکہ روانہ ہو رہا تھا۔ وہ منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ خزاں آلود پتوں پر سے گزرتا
سنان شُرک پر آخری تعزیه، منصور نے ایک گہری سانس لی اور سگریٹ جلایا۔
”تجارت اور گلف کی کمائی سے مسلمان ذرا پیسے تھے کہ پھر گھمسان کارن پڑا۔“
”نیا سرمایہ دار سستی ہے۔ کارگر مفلس شیعہ، مسزنگ نے یاد دلایا۔

”ابھی بہار میں بریلوی اور دیوبندی مولوی ایک دوسرے سے دھواں دھار
مناظرے کرتے دکھلاتے دیے۔ ویسٹ میں کیا ہائی چرچ اور کوپرچ والے لڑتے ہیں؟“
”ہم لوگ باربرین ہیں۔ اس سب کونینٹ کے تمام باشندے۔ انگریز ہمیں
ٹھیک پہچانا تھا۔“
”کم آؤں امی“

”یہ میں نہیں کہہ رہی، سرسید لکھ گئے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں“
دھوبن چڑیا قریب آ بیٹھی۔ ”سُنیوں کے تعزیه۔ درگاہوں اور ضرکوں
کے سامنے ہندوؤں کی بھیڑ۔ ماشا اللہ۔ لیکن اس خوشگوار رقت خیر منظر نامے
کے باوجود کسی ایک قسم کا فرقہ دارانہ فساد آج تک رکا ہے؟“ مسزنگ نے سر ہلایا۔

”ہر قسم کے پائیدار بلوے مناسب اجرت پر ہمارے ہاں سے کروائیے۔ ٹن“

ایک مجہول سے پرند نے غنڈوں جیسی سیٹی بجائی۔
ایک سیانا کو آسمان کی ہنسی جھلا کر حاضرین کو صرچاؤنگ کرتا ہوا اڑ گیا۔
”یہ لوگ کتنے مزے سے بسنت منار ہے ہیں۔ سینٹ سالم علی کی اُمت“
عنادل چن کا پر اب حوص چھپا رہا تھا۔ آسمان کی سمت سر نہوڑا کر ایک ایک
گھونٹ پر گویا اپنے خالق کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ ننھی چڑیاں پانی پینے میں جُٹ گئیں۔

”اے دشمنوں۔ میں نبی نوں فرزند چھوں۔ میں تین دن نوپا سوچوں۔ تمہارے

ایک پانی نو گھونٹ مانگوں چھوں۔ اے حسین عجب آپ اوپر ہمارا پستاؤ چھے۔
اے سید الشہدا۔

”زینب پکاری رہیا چھے اے مارا ماں جایا بھائی انے ضعی ناسورج انے پونم
ناچاند۔ سیکینہ کہے چھے۔ اے باوا جی صاحب کہاں چھو۔ اے باوا جی صاحب۔
اوٹھو۔ اوٹھو۔ مارا اوپر ظلم تھتی رہیو چھے۔ اے حسین۔ عجب۔
”اے حسین۔ کربلا سے شام نی طرف گرم ریت نی زمین پر چلی رہیا چھے۔ نہ پاؤں
میں جوتی چھے ناموزہ چھے۔ اے حسین عجب آپ اوپر ہمارا پستاؤ چھے۔ اے
سید الشہدا“

عنبریں زار زار رو رہی تھیں۔
میں جوڈ نکے درخت تلے بیٹھی ہوں۔ اور میرے پیروں کے نیچے دشتِ ماریہ کی
پتی ریت ہے۔ موسم بہار کی ایک سہ پہر ہندی کنارے سبزے پر موجود ایلس کے مانند
میں کہاں کہاں۔ ہر گلستان صحرا۔ ہر دریا نہر علقمہ۔

منصور مڑ بڑا گیا ”سوری عنبریں ایک گجراتی۔“
عندلیب بیگ دھیمی آواز میں بیٹی کو ڈانٹ رہی تھیں ”اپنی نانی کی روٹی نواسی۔
انکی رقیق القلبی کا انجام بھول گئیں؟ یہ آدمی شواؤف ہے۔ بھگیتا۔ ہمیشہ اٹلگو میل
نوشکی کرتا ہے۔“ منصور کو پکارا ”سنی۔ مجھے یقین ہے تم کو بنگالی ٹائل لیلام نوے مرثیے
بھی آتے ہونگے۔ مگر اب اینسین گونج سے نکلا جائے۔ کافی ہوئی۔ چلو ذرا ریڈ نیسی کی
شیکسپیرین ایکوٹن آئیں“

بیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک وسیع ایوان میں داخل ہوئے۔ نواب صاحب نے

ادپر آسمان کو دیکھا۔ ”چھتیں گر جاتی ہیں تاکہ فلک حقہ باز صاف نظر آئے۔“
 میوزیم میں سیلانی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک گائیڈ آگے بڑھا۔
 ”ارے یہ ہمیں کیا بتلائیں گے“ نواب صاحب نے ادا سی سے کہا۔ منصور
 نے دس کانوٹ نکال کر انکے حوالے کیا۔ وہ سلام کر کے پیچھے ہٹا۔ مسز بیگ نے
 طویل سنہری زنجیریں آدیناں چشمہ لگایا۔ دیواروں پر سچی تصاویر دیکھنے میں
 منہمک ہوئیں۔

”لکھنؤ ریڈیٹنسی کا محاصرہ۔“ غنبریں نے کہا ”انگلینڈ نے اسکی ایک
 عظیم الشان قومی لیجنڈ تیار کر ڈالی۔ ناول۔ تصویریں۔ نظمیں۔ برطانوی بہادری
 کی حکایات۔ اور ہم نے کیا بنایا ہے؟ ۱۹۵۷ء میں گومتی کے کنارے ایک
 عدد بھڈا مینار۔ حضرت محل کے جانبازوں کی یاد میں بھونڈا بھڈا۔ اب ہم محض
 KITSCH کے استاد ہیں“

کالج کے چند لڑکے منہ کھولے غنبر کے گرد جمع ہو گئے۔ انکی سمجھ میں نہیں
 آیا وہ کیا کہہ رہی ہے۔

”میڈیم کیج کیا۔؟“ سیاہ فریم اور موٹے شیشوں کی عینک لگاتے ایک
 پڑھاکو لڑکے نے گردن بڑھا کر سوال کیا۔

چوڑی دارپا تاجامہ اور لمبی قمیصیں پہنے کالج کی لڑکیاں، منستی ہوتی اندرائیں۔

”قبلہ آپ نے غور فرمایا۔ مغلیہ تہذیب کس طرح اپنے آپ کو RE-ASSERT

کر رہی ہے؟ سارے ہندوستان کی لڑکیاں ہماری نانیوں دادیوں والا لباس
 پہن رہی ہیں۔ انکے ماں باپ ہونٹوں میں ’مغلنی‘ کھانا کھاتے ہیں اور غزلوں
 پر سر دھنتے ہیں“ وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ایوان میں گئے۔

”بس اتنی سی بات پر خوش ہوتے رہو کہ مجلس چالو ہو گئیں۔“
 ”غنبر بیچ میں مت بولا کرو۔“ نواب صاحب ہندوستان کے اشرے

مغرب کے نوجوانوں کے ہاں ایک ملبوساتی انقلاب آچکا ہے خود ہندوستان میں اس ریولیوشن کا ذمے دار کون ہے؟ — مسلم سوشل پکچرز؟
 ”مسلم سوشل پکچرز“ غذیب بیگ نے استہزائے دہرایا: مجرا۔ مشاعرہ۔
 قوالی اور برقعہ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔ ہندی مسلمانوں کا امیسیج کیا ہے؟ ایک قدامت پرست بیک ورڈ جاہل کمیونیٹی۔
 ”جب تک ’ملا‘ حاوی ہے یہ IMAGE برقرار رہے گا۔“

”بس۔ مولوی کے پیچھے پڑے رہو۔ اسرائیل میں ایک کٹر مذہبی یورپین یہودیوں کا فرقہ ہے۔ جب اسرائیلی فوج کی لڑکیاں مارچ پاسٹ کرتی نکلتی ہیں وہ انکی طرف سے پیٹھ موڑ کر دیوار کی طرف منہ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ انکے نزدیک عورتوں کی یہ آزادی شریعت موسوی کے خلاف ہے۔“
 ”درست۔ لیکن میرے ’ملا‘ تعداد میں کچھ زیادہ ہیں۔ میں خود ’ملا‘ کا بیٹا ہوں۔
 مان لو میری بات — عزیز بیگم!“

”بات میرا آثار سے شروع ہوئی تھی!“ نواب صاحب محفوظ ہوئے۔
 ”لیکن قبلہ ملاحظہ فرمائیے۔ مغلیہ کلچر اپنے آپ کو نہایت نامعلوم طور پر۔“

”مرزا صاحب۔ خاتالی ہند خواجہ عزیز لکھنوی کی پڑیوتی عزیز بالو وفا کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔ میں جمال فطرت حسن ہوں مری ہر اداسے حسین تر۔“
 ”میں جمال فطرت حسن ہوں مری ہر اداسے حسین تر“ منصور نے دہرایا۔
 ”جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں جو اٹھوں تو ابر بہار ہوں!“
 ”سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ اُف غضب کر دیا۔“ ڈاکٹر نے بیباختہ داد دی۔
 ”واہ جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں۔“

”ستہ جیت رے“، ”عزیز بالو کی خاندانی مجلس کی تصویریں لے گئے۔ پکچر کے سیٹ بنانے۔ چیزوں کی فطری اور تاراجی سیٹنگ۔“

وہ چاروں چند شکستہ ستونوں پر بیٹھ گئے۔ حسین بخش ہاتھ باندھے ایک طرف کو کھڑے رہے۔ غالباً انکے پرکھ اس طرح دست بستہ اسی جگہ کرنل سلیم کی ڈنر ٹیبل پر ڈیوٹی بجالاتے ہوں گے۔

”بیگم صاحب ہم لپک کے بھیا کے لیے بالائی خرید لاویں چوک سے —
کرفیو تو فرنگی محل کی طرف لگا ہے۔“
”بیھیے آرام سے۔ خود بالائی کو جی چاہ رہا ہے۔ بھیا کے لیے آویں۔“

”فرنگی محل میں کرفیو لگا ہے۔ پہلے میلہ لگتا تھا۔ مرزا صاحب آپ کو وہ —
آتش کا شعریا دے۔ ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام
چھانے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام
”نواب صاحب معاف کیجئے گا۔ یہ ہمارے معاشرے کا زوال تھا۔
علمائے دین کا گڑھ اور انکے مکانات سے سٹے ہوئے بالا خانے۔“

”بھیا فرنگی محل میں حیدر جان جو تھیں جنکا امام باڑہ ہے۔ ایک بار
ایک راجہ نے ان سے کہا بی صاحب ایسا ملہار کا تے کہ بارش ہونے لگے۔ انہیں
نے دعا مانگی جناب امیر سے۔ مولا میری لاج رکھ لیجئے — پھر جو میگھ ملہار
گایا انہیں نے۔ جہا جم پانی گرنے لگا۔ راجہ نے انعام میں ہاتھی دیا۔ وہ انکی
ڈیوڑھی پر بندھا رہتا تھا اور حضور جلی خورشید کو تو ہم نے بھی دیکھا ہے۔“
”جلی خورشید!“ مسز بیگ نے دہرایا۔

”بیگم صاحب آپ نے بھی انکا نام سنا ہے؟ کلکتے تک انکی شہرت تھی۔
بہترین شہسوار تھیں۔ اور کنکوے بازی کی استاد ہر سال میڈیکل کالج کے
پیچھے جئاتوں کی مسجد کے پاس جو میدان تھا — گومتی کنارے۔ وہاں کے اوپر

پتنگ بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ شہر کے عالی مقام لوگ ان سے کنگوے لڑانا
فخر سمجھتے تھے۔“

”ہمارے ایک دوست ہیں۔ پروفیسر سر یو استوا۔ ہندوستان کے نامی
گرامی ریاضی دان۔ سرائے معالیٰ خاں کے باشندے۔“

”وہ بھی پتنگ باز ہیں؟“ عنبریں نے پوچھا۔

”تھے لڑکپن میں۔ جلی خورشید کے کمالات کنگوے بازی کا بڑے ذوق
و شوق سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔“

”جی بھیا۔ جلی خورشید کے کنگوے میں تلو کا نوٹ باندھ دیا جاتا تھا۔
اس زمانے میں تلو کا نوٹ! وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ میدان میں آتی تھیں۔
سب سے آخر میں۔ کوئی ان سے جیت نہ پاتا تھا۔ لوگ پتنگیں ٹوٹنے بارہ بنگی
تک دوڑے جاتے تھے۔“

”۱۹۳۷ء کے الیکشن کی سرگرمیوں میں لکھنؤ کی نامی طوائفوں نے حصہ لیا تھا۔ جلوسوں میں وہ
شامل ہوئیں۔ قومی نظمیں وہ پڑھتیں۔“

”ارباب نشاط میں فیلو ٹریولرز تک تو پیدا کیں اس شہر نے۔ سنا ہے
آزادی سے سات آٹھ سال پہلے ایک کامریڈ حسنی کہلاتی تھیں۔ بہت سے نامور
کامریڈ لوگ انکے ہاں جمع ہو کر اپنے جلسے کرتے تھے۔ اچھا۔ تو جلی خورشید۔“
”ارے بھئی منصور۔ اب غنشو جلی خورشید کو“ عندلیب بیگ جھنجھلائی

وہ گناہ بزرگ کی طرف متوجہ ہوا جو پھر تبیح پھرنے لگے تھے۔
انہوں نے جیب سے بادام اور پستے نکال کر دوستوں کو پیش کیے۔
چھڑی کے سہارے ذرا دقت سے کھڑے ہوئے۔
”اب اجازت۔ جان صاحب کا اللہ بلی!“ کھنڈر کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

عمر نے کہا: ”آپ کو کار پہ پہنچا دیتی ہوں۔ لیکن کرفیو۔ جب تک ہمارے ہاں تشریف لے چلیے۔“

”عنایت۔ ابھی ہم ذرا ٹہلتے ہوئے بریگڈیر نقوی کے ہاں جاویں گے۔“
 ”ہم لوگ بھی قریب ہی رہتے ہیں۔ تشریف لائیے۔ خاصہ تناول کیجئے۔“
 منریگ یکمخت بجد ثقہ ہو گئیں۔ منصور انکی شخصیت کی رنگارنگی کو دھیان سے نوٹس کر رہا تھا۔

”عنایت۔ پھر کبھی حاضر ہونگے۔“

”جھک کر تسلیمات بجالانے کے بعد سر نہ ہوڑائے بلی گارد کے پھاٹک کی سمت روانہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے۔ کمر خمیدہ۔ بے نام و نشان۔“

بارش کی ایک بوند ٹپ سے منصور کے ہاتھ پر گری۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا: ”مجھے لگتا ہے ان بے چارے کو حال ہی میں کہیں دیکھا ہے۔ کہاں یاد نہیں جھلک سی دیکھی تھی۔“

”کلبک میں آئے ہوں گے۔“

”ہٹیا ہم تو نواب صاحب کو پہچان گئے تھے۔ ظاہر نہیں کیا۔ انکے باپ نے جلی خورشید کی خاطر اپنی بہت بڑی جائیداد بیچ ڈالی تھی۔“

”جائیداد کیا چیز ہے جیسے بخش ہم وہ لوگ ہیں جو موسم بہار کو بھی رہن رکھتے ہیں۔ زمینداری ابولیشن میں باغات بچ گئے۔ چنانچہ آجکل آم کی فصلیں دو دو تین تین سال کے لیے گروی رکھ کر ایک بار پھر گلچھڑے یا مقدمے مسلمان زمینداروں کی خاندانی مقدمہ بازئیوں نے پنڈت موتی لعل نہرو اور سر تیج بہادر کو مالالام کر دیا تھا۔“
 ”بھیا۔ کانپور میں آغا میر کے پڑپوتوں نے تلو تلو کے نوٹ جلا کر ایک لاٹ صاحب کے لیے چار بنائی تھی۔ اب یہ عرب اربوں روپیہ عیاشی میں پھونک رہے ہیں۔“

عمر نے ہمارے اندر یہ بنیادی کموریاں کس وجہ سے ہیں؟

”کمزوریاں ۛ یا اللہ یہ توکل —“

”اوہو! مگر آپ تو مار سے عاقبت اندیشی کے ابھی سے چنوں پر اکتفا کر رہی ہیں!“
”چنے ۛ نہیں تو۔!“

”ابھی میں نے چند چنے چنے۔ ارے یہاں تو نواب صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ مانی کوڑے دوسروں کو پیش کرنے کے لیے بادام ایک جیب میں۔ پیٹ بھرنے کی خاطر چنے دوسری میں۔ اسمیں سوراخ رہا ہوگا۔“

”دو پہر جب یہ باغ میں آن کر بیٹھے اس بنجر جیب سے میٹھی میں کچھ نکالا اور مال کی اوٹ میں نوش کرنے لگے۔ میں انیم سمجھی۔ مجھے دیکھتے پا کر فوراً تسبیح سنبھالی۔“
ڈاکٹر نے ایک چٹا اٹھا کر تھیلی پر رکھا اور اسے بغور دیکھا۔ گویا کائنات صغریٰ۔ شام ہو رہی تھی۔ بیلی گارڈ سنسان ہو چلی۔

”محمد علی شاہ بادشاہ“ منصور کی آواز گونجی ”نصیر الدین حیدر۔ غازی الدین حیدر۔ سعادت علی خان۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔“ کچھ نہیں۔!! میں ذرا بدیت کے ساؤنڈ افیکٹ سننا چاہتا تھا۔“ وہ ہنس پڑا۔
تین چار بابا بلیں پر پھٹ پھٹاتی دریا کی طرف اڑ گئیں۔

”مرض کردیہ ایک رومن تھیٹر ہے۔ چہروں پر ماسک لگانے چند سیاہ پوش طویل القامت بادشاہ یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔ اللہ آوہم زمین پر بیٹھ کر شاہوں کی موت اور معزولی کی غمگین کہانیاں سنائیں۔“

FOR GOD'S SAKE, LET US SIT UPON THE
GROUND AND TELL SAD STORIES OF
THE DEATH OF KINGS, HOW SOME
HAVE BEEN DEPOSED; SOME SLAIN IN

WAR SOME POISONED BY THEIR WIVES:
 SOME SLEEPING KILLED; ALL
 MURDER'D : FOR WITHIN THE
 HOLLOW CROWN THAT ROUNDS THE
 MORTAL TEMPLES OF A KING KEEPS
 DEATH HIS COURT AND THERE THE
 ANTIC SITS SCOFFING HIS STATE AND
 GRINNING AT HIS POMP ALLOWING
 HIM A BREATH, A LITTLE SCENE TO
 MONARCHISE, BE FEARED AND
 KILLED WITH LOOKS, INFUSING HIM
 WITH SELF AND VAIN CONCEIT, AS IF
 THIS FLESH WHICH WALLS ABOUT
 OUR LIFE, WERE BRASS IMPREGNABLE,
 AND HUMOR'D THUS COMES AT THE
 LAST AND WITH A LITTLE PIN BORES
 THROUGH HIS CASTLE WALL, AND
 FAREWELL, KING!

”میںم — بوٹن کے ایک پرائیویٹ کلکشن میں ایک تصویر دیکھی تھی کہ پنی اسٹائل۔
 لکھنؤی مشور نے اون دی اسپوٹ بنائی تھی۔ کہ جان عالم تخت پر راجہ اندر کی کوسٹیوم۔
 سامنے مصنوعی پرنگائے ایکٹریس۔ مقام: بارہ درہ قیصر باغ۔ ہینڈسم آدمی تھے۔
 ”ایک اور تصویر اسی آرٹسٹ کی — جان عالم انگریزی شاہی پوشاک

پہنے کھوڑے یہ سوار قلعہ چھٹی بھون کے سامنے اپنی فوج کا معائنہ کر رہے ہیں۔

”کو مک اد پیر اکاسین۔“

”گر نیڈا د پیرا۔ فلک شگاف ٹریڈی سے گونجتا۔“

”بھیا۔ جان عالم کے بول سماعت فرمائیے۔ کبھی بولے چھن۔ کبھی بولے چھن۔“

کبھی بولے چھن ترے گھونگرو۔ ہے یہ شوم پن کہ صدا کی پن نہیں کرتے پن تیرے گھونگرو۔“
کھنڈر خاموش رہا۔

”چنانچہ یہ چنا۔ جوان بادشاہوں نے جان کمپنی کو ادھار دیا۔“ اس پارخانہ بدوشوں کی خیمہ گاہ میں لائینیں ٹٹمانے لگیں۔ منصور نے اس طرف دیکھا: ”گو وہ تھے لکھی بنجارے اور کھپ بھی انکی بھاری تھی۔“

”انشاء اور شیکسپیر کے علاوہ مجھے یقین ہے تمہیں سارا نظیر بھی ازبر ہوگا پر اب گھر۔“
”بیگمات اودھ کا خزانہ اور شاہان اودھ نے جو کروڑوں روپیہ کمپنی کو اسکی جنگوں کی خاطر قرض دیا۔“

”کمپنی اپنے مہربانوں کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ مگر وہ منڈوہ کب کا ٹوٹ چکا۔ چلو اٹھو۔“
”اودھ توں۔ جو دہ لکھوا گئے اپنی اولاد اور لواحقین کی آئندہ پیڑھیوں کے لیے بطور وثیقہ ابدی۔ اب تلک کہیں ہزاروں کہیں بوجہ افزائش سل بقدر اشک۔“ لیکن چونکہ معاملہ وراثت کا ہے منربگ۔“

”وراثت کا معاملہ میں خوب جانتی ہوں۔ زیادہ بورت کرو۔“

”کمپنی وائٹ ہال ساؤتھ بلاک نی دہلی۔ قرضدار اور قرضخواہ دونوں سلامت۔ لہذا قرضخواہ اپنے بوسیدہ دوشالے اوڑھ کر ہر ماہ وثیقہ آفس۔ سلطان عالم کی پولیٹیکل نیشن البتہ محض انکے پڑپوتوں تک جاری رہے گی۔“ اس نے ساکت گومتی پر لگا ہوا دوڑائی: ”جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔ میاں حسینی۔ اختر پیا کا کوئی۔“
”گیا دل بھی چھین جو نہی بولے چھن۔ یہ لگی لگن کوئی ڈالے گن تو میں مانوں گن۔“

”نہیں کچھ اور۔“

”برائے میر مجھ سا زندہ میخانے میں گر آئے۔ گرے ساغر۔ لٹھ شیشہ۔ ہنسے ساقی۔
 بچے دریا۔ ہمارے ابا مرحوم کے لڑکپن تک شاہی کی رعیت زندہ تھی۔ جو سلطان عالم
 کی یاد میں گاؤں گاؤں رہتے اور اندر سبھا کرتی روتی پھرتی تھی“ بوڑھے خانساں
 کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملائیں۔

انہوں نے بھی ماسک لگا رکھا ہے۔ کوک اوپیرا۔ نہیں۔ گرینڈ اوپیرا کے
 آخری مُنہ۔ نجانے یہ کون ہیں۔ اور گنہام نواب۔ اور منصور کا شعری۔ میں عمر بین اس
 اندھیرے میں موجود سارے وجود سے خوفزدہ ہوں۔ جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔
 نانی اماں۔ تاریخ کا قرض خواہ و شیعہ دار۔ جینی دی لک سب ٹکسالی۔ گمشدہ سکوں
 کی طرح تاریکی میں چمکتے۔ اس نجیب گردی میں نکنت اور یجیل تصویریں مٹ گئیں۔ جھومر
 ٹیکے لگا۔ تے امی حضور، ابا حضور، ہائے اللہ کہتی ایکڑ سیس، مضحکہ خیز ”نواب“، ”افونی
 ملازم“ فلم اور ٹیلی ویژن کے اسٹاک کردار کنوئو جی کی بدولت باقی رہیں گے۔ مستقبل کو
 دیے ہوئے اودھ لوں کی جعلی نقلیں۔

”بھیا شہری نہیں سونے کے بھاؤ بک رہی ہیں۔ بہت سے وثیقہ داروں کی
 حالت بھی سُدھر گئی“

”بیشک۔ اس روز ایک اعلیٰ صاحب کو دیکھنے گیا۔ کڑھ ابوتراب۔ مجلسرانگی آدھی
 گر چکی۔ اس سے ملتی اپنے نئے ایرکنڈیشنڈ مکان میں صاحب فراش مولانا ترائی کے
 کیسٹ سماعت فرما رہے تھے۔ باہر نکلا تو پرانے مکان کی شکستہ چھت میں جڑے مٹکے
 نظر آئے صحیح و سالم۔ اگلے وقتوں کے ایرکنڈیشنڈ کیا انجینئرنگ تھی ڈیڑھ سو سال میں
 دوسری منزل کے بوجھ تلے نہ وہ چٹے نہ ٹوٹے۔ آج تک موجود۔ گذشتہ سے پیوستہ“

”ارے مورے بھیا۔ وہ مٹکے لکھنؤ کے کہاروں ہی نے گھڑے۔ یہیں تو اللہ میاں
 نے ڈھالا۔ ہم باقی نہ رہیں گے؟ آزادی کے بعد گئی یک بیک جو ہوا پلٹ۔ کتنے ریسوں

نے اپنی املاک رستوگیوں کے ہاتھ بیچ دیں مگر ان پچھلے کوئوں کے اندر تشریف لے جائیے اب بھی کتنے قدیم کتبہ اس طرح آباد ہیں۔ ماشاء اللہ۔ خدا کی شان ہے۔
 ”بیحد خدا کی شان ہے واقعی۔ ان اوراقِ مصوّر گلیوں میں اُبتی خلقت۔ بھینوں کے طویلے۔ اوپن ایئر بم پولس، اس پر یاد آیا غیر کہ تمہیں اس لفظ کی وجہ تسمیہ معلوم ہے؟
 ٹامیوں نے۔“

”افوہ بھئی۔ اب اس مضمون پر ریسرچ مت شروع کرو۔
 وہ دونوں ہنستے ہوئے بیڑھیاں اترنے لگے۔

”سیگم صاحب۔ بھیا کی بات پر ہمیں ٹھا کر صاحب دھان پور کا دھیان آگیا۔
 وہ مرحوم اللہ جنت نصیب کرے جہاں کوئی انوکھا لفظ سنا ہمیں پکارے جیٹنی ذرا لغت تولانا۔ آزادی ملتے ہی بٹکر سیلیس والے تو روانہ ہوئے۔ ہم ٹھا کر صاحب کے پاس جاپنگ ٹڈ آگئے۔ انکے اکلوتے بھتیجے دلتن میاں انکے وارث تھے۔ بلا کے ذہین۔ اور شریر۔ اپنے تایا کی طرح کتابیں پڑھنے کے وہ بھی شوقین۔ مگر مجال ہے جو انور سٹی کے امتحان کی تیاری کبھی کی ہو، اور غضب کے کھلاڑی۔

”ایک باری سیگم صاحب۔ ایک مس صاحب امریکہ سے آئیں۔ انگریز چلے گئے تھے اور امریکن اور روسی آنے لگے تھے۔ تو یہ مس صاحب کا لٹن میں ٹھہریں۔ دلتن بھیا انکے ساتھ ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ انکی ہوئی بڑھ دے پارٹی۔ دلتن بھیا کے ایک جوڑی دار تھے۔ کنور سینڈی۔ ان سے ایک شرط بندی۔ پھر جا کر میاں سے بولے۔ ہم آپکے جنم دن پر آپکو سب سے بھاری تحفہ دینگے۔ سادون کا مہینہ۔ برتی بارش میں رات کو جا کر بنا رسی باغ سے ایک ہاتھی چرایا۔“

”پورا ہاتھی چرایا۔ اور پکڑے نہ گئے؟“

”کالچ کے زمانے کی شرارتیں سیگم صاحب۔ کنور صاحب سے شرط جیت لی۔
 راتوں رات گج راج اپنے ٹھکانے پر واپس!“

”ادھر ٹھاکر صاحب مرے۔ ادھر زمینداری کُل۔ ایک لاکھ کی مالیت پر چھ ہزار معاوضہ۔ وہ بھی چالیس اور بیس سال کی قسطوں میں۔ بڑے بڑے لوگ راتوں رات کنگال ہو گئے۔ سچ مچ انکے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گذر بسر کے لیے ساہوکاروں کے ہاتھ بانڈیکشت بیچ ڈالے۔ پھر زیور بکے۔ اسکے بعد گرتے مکانوں کی اینٹوں کڑیوں کی نوبت آئی۔ بہت جگہ ایسا ہوا، یکم صاحب جیسے چار بھائی تھے دو بھائی طلبے میں اپنے حصے کی اینٹوں دروازوں کی قیمت پیشگی وصول کر کے ہجرت کر گئے۔

”ہمارے دِلن بھیا کے کوئی آگے نہ پیچھے۔ راجہ صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی کھل کھیلے، بانڈ، کوٹھیاں موٹریں، کتابیں بیچ بیچ رنگ رلیاں منایا کیے۔ ہم سے کہتے خیمینی ذرا آج فلاں چیز کے دام لگا آنا۔ نخاؤں مضر کا بازار بنا ہوا تھا۔ کیسے کیسے نام و نشان وہاں کوڑیوں کے مول بکے۔ دِلن بھیا کے پاس جب کچھ نہ بچا ایک روز لاہور سدھارے۔

”انکے جانے کے بعد ہمیں اپنی مرضی کا کام نہ ملا۔ بی بی مرگئیں۔ ہم نے امین آباد میں سیخ کباب کا فوچہ لگا لیا۔ اسی فوٹ پاتھ پر ایک پنجابی شرنار تھی پوری کچوری بیچتا تھا۔ اس نے اتنا بچا یا کہ جا کے لندن میں ریٹورانٹ کھول لیا۔ ہم نے جتنا کما یا اس سے دو گنا خرچہ اکلوتی بیٹی تھی۔ چیمپی۔ آنکھ کا تارا۔ اسکا بیاہ کیا۔ وہ خاوند کے ساتھ ڈھا کہ چلی گئی۔ برابر خط لکھا کرتی۔ دسمبر سنہ شرمیں اسکا آخری کارڈ آیا کہ اباما راما ری یہاں بھی شروع ہو گئی ہے پھر اسکا کچھ پتہ نہ چلا۔ ہم نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ کس سے فریاد کریں؟

”لڑکے آوارہ نکل گئے۔ بہت کوشش کی تھی کہ لکھ پڑھ جاویں۔ منصور بھیا ٹھیک کہتے ہیں۔ امیر غریب سب۔ ہم لوگوں کی آنکھیں ہی نہیں کھلتیں۔ ہمارا کیا حشر ہوگا؟ ہم تو خیر لب گور بیٹھے ہیں مگر یہ آٹھ دس کروڑ؟“

”وہ سب کے سب نہ آپکے دِلن بھیا جیسے ہیں نہ آپکے لڑکوں جیسے۔ چلیے گھر چل کر ڈنر تیار کیجیے۔“

”ہماری کیا اوقات یکم صاحب کہ ان معاملوں میں زبان کھولیں مگر ووٹ بھی تو ہمیں سے مانگنے آتے ہیں۔ کسے ووٹ دیں؟ ان لڑنے لڑوانے والوں کو؟

— زمیندار بھی پرانے گئے۔ دوسرے بھیس میں نئے آگئے۔
 ”آپکوان پُرانوں سے اتنی اُلفت کیوں ہے؟“
 ”اے کانمک کھایا تھا۔“

”اتنی سجداری کی باتیں کرتے کرتے آپ پھر بوقونی پر اتر آتے ہیں۔ اصلیت میں انہوں
 نے آپکا نمک کھایا تھا۔“
 ”مُنیے سگم صاحب۔ لال جھنڈے والوں نے بھی تو کچھ نہ کیا۔“

عبر اور منصور گیٹ پر ملے۔ عندلیب بیگ سڑک پر جانے کے بجائے پھر باغ کی سمت
 مڑ گئیں۔ حسین بخش جو دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے تیزیز چلتے آ رہے تھے رو رہنک رڈ
 کی رونق اور ٹریفک پر نظر ڈال کر حیدلجوں کے سکوت کے بعد بولے۔ ”کتنا کچھ بگڑا۔ اور
 کتنا کچھ بنا۔ بیٹا۔ آزادی سے پہلے یہاں کچی سڑک تھی۔ دیران۔“
 ”بگڑا زیادہ۔ بنا کم۔ سب کچھ بگڑ کر از سر نو بننا چاہیے۔“
 ”عبر تم نکلائیٹ تو نہیں؟ کلکتہ۔“
 ”نیا دپرست کہہ لو۔“

”آہا! تخریب یا تعاون کے بجائے تطہیر! مشکل یہ ہے کہ کچھ اور نیا دپرست بھی ہیں
 جو چاہتے ہیں کہ مثلاً شاہ پیر محمد کا ٹیلہ دوبارہ چھمن ٹیلہ کہلاتے۔ شاہان اودھ ہم موڈرن
 لوگوں سے زیادہ ذہین تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب اور لکھن جی دونوں کو ایک چوکھٹے
 میں فٹ کر دیا تھا۔ انکی تخلیق کردہ رواداری اتنی دیر پا نکلی کہ لکھنؤ میں آج تک ہندو
 مسلم فساد نہیں ہوا۔ ایودھیا والی خانہ جنگی بھی واجد علی شاہ کو معزول کرنے کے لیے
 ایسٹ انڈیا کمپنی نے کروائی اور نہایت دور اندیشی سے مزید جھگڑے کا بیج بویا۔ مگر اس
 پورسٹ سوسائٹی کے لیے میشر سلاطین ہند نے ہوشمندی۔“
 ”حسین بخش کھنکارے۔“

”— اور سیکولرزم کا ثبوت۔ جی میاں حُسنی آپ کچھ کہہ رہے تھے؟“

”کچھ نہیں بھیا۔ ہم بیٹا کو بتلانے والے تھے۔ ادھر جنرل مارٹن کی بیڑھی کوٹھی تھی۔ جس میں شہزادہ سلیمان شکوہ دئی سے آن کر رہے تھے۔ اسے گرا کر ٹرانسپورٹ آفس۔ آزادی کے بعد۔ ست محلہ بھی گر گیا۔“

”ذرا قریب کے کھنڈر جا کر دیکھو۔ مجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھو۔“

”نواب کیواں جاہ والا قدر۔ ٹھمریوں والے کد سپیان کا محل چو لکھی۔ اب غلے کا گودام۔ اسے ہی محفوظ کر لیتے کہ جنگ میں بیگم حضرت محل کی آخری کمین گاہ تھی۔“

”اور۔۔۔“

”روشن الدولہ کی کچھری نیا کورٹ بنانے کی خاطر توڑ ڈالی مگر وہ اتنی مضبوط نکلی کہ اسے گرانے ہی پر بہت لاگت آئی۔ بیگم کوٹھی بھی گئی۔ چھوٹی چھتر منزل سٹہ کی برسات میں گری۔ بارہ دری فیصلہ باغ۔ بادشاہ باغ۔ لال بارہ دری، سب برباد۔“

”اور۔۔۔“

”راجہ لکھت رائے کا محل۔ آصف الدولہ کے وزیر تھے۔“

”کلکتے میں گریں گی مجھے جھجھو جھونٹے دے کر کہتی تھیں بڑھیا اپنے برتن بھانڈے سمیٹ لے راجہ کا نیا محل بنتا ہے پرانا محل گرتا ہے اڑا اڑا دم۔“

”نئے محل تو بیٹا بے حساب بن گئے۔ پر ہمیں بڑے بھاری جھونٹے لگے۔ سنا ہے افریقہ میں کوئی قبیلہ ہے جب آدمی بہت بوڑھا ہو جاتا ہے اسے مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ خود نہیں مارتے۔“

”کیمبرج یونیورسٹی کی روشوں میں جو بحری صدیوں پہلے جمائی گئی تھی اسے جہازت کی سی احتیاط کے ساتھ صاف کیا جاتا ہے۔“

”بیٹا وکٹوریہ اسٹریٹ چوڑی کرنے کے لیے پرانا نچاس پھوڑ دیا سات آٹھ برس پہلے تک وہاں ہر اتوار کو کھنڈ کی قدیمی شان دکھلائی دیتی تھی۔ دوپٹی ٹوپیاں انگرکھے چوڑے عرض کے پائینجائے پہنے، پٹے رکھائے وضعدار شریف لوگ چڑیوں کی مارکیٹ میں آتے۔ جلیہ کا بج کے گیٹ کے پاس پیل کا درخت تھا۔ بوڑھے ہیلے، چڑ بیمار

اسکی عمر چار یا پنج سو سال بتلاتے تھے۔ اسکی چھاؤں میں پرندوں کا بازار لگتا۔ کبابی، بریانی اور بالائی والے۔ کبوتر، بیڑیں۔ ہریل، اھیل مرغ۔ اور اسکا نام لیجے بلبلس۔ طوطے، مینائیں، لال، چرکوتے۔ کالے جادو کے لیے اُتو تک تو وہاں مل جاتے تھے۔ بیڑ باز نئے سینرن کے واسطے بیڑیں خریدتے۔ کبوتر اور مرغ باز۔“

”بقول امی کبوتر اور بیڑیں ہی لکھنؤ کو چمک گئیں۔ انہیں اس تذکرے سے چڑھے۔“
 ”عنبر تمہاری امی چڑیلوں سے چڑتی ہیں، وہ تو خود بڑ واپر۔ اچھا۔ خیر دوسری بات یہ کہ ان کبوتر بازوں میں موڈرن تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل تھے۔ ہم خود اکثر انوار کے روز سیر کے لیے وہاں جاتے تھے، یہ تو آپینشن مل فایٹ کی طرح اہل لکھنؤ کا گویا قومی مشغلہ تھا۔“

”پرانے نحاس کے ساتھ وہ پیل بھی گیا۔ اس درخت کے سوگ میں لوگوں نے گھروں میں دو دن تک چولہے نہیں سلگے۔ کھانا نہیں پکا۔ وہ بازار سُونا ہو گیا۔“
 ”یعنی پارلیمنٹ آف بڑوڑ ٹوٹ گئی۔ منطق اشرف المخلوقات! عنبر بیگم! یہ محض مرغ بازی نہیں ایک پوری تہذیب کی موت تھی۔ افسوس ہم امریکہ میں تھے ورنہ بہت دُند مچاتے۔“

”پیل کٹنے پر سر نہ کٹے؟“

”بیٹا لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد سنہ سینتالیس تک میں تو ہوا نہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ پیل سرکار نے خود کاٹا تھا۔ اب سندھی پنجابی شرنارتھیوں کی اولاد کبوتر بیچتی ہے۔ انکا بوجھ لکھنؤی ہو چکا ہے مگر وہ پرانا ماحول ختم ہو گیا۔ اور بھیا یہ ابھی سات آٹھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے جب تاریخی عمارتیں گرائی جا رہی تھیں ہمارے شیعہ سنی اپنے بھیانگ فسادوں میں جُٹے ہوئے تھے۔ مہینوں کر فیول گار تہیا۔ شیعہ سنی اپنی پالی ٹکس لڑاتے یا لکھنؤ بچانے کی کوشش۔ انہیں فرصت کہاں تھی؟“
 ”شیش محل والوں نے اس کا دروازہ سوختہ لکڑی کے بھاؤ بیچ دیا۔“

”عنبر تم نے تم تارے والی کوٹھی پہلے دیکھی تھی؟ سفید، جارجین محل۔ رصد گاہ

ابھی خیال آیا کھنڈ کے عوام اسٹیٹ بینک کو اب بھی اسکے پرانے نام سے یاد کرتے ہیں ورنہ دراصل اب آپکا دو تھانہ تارے والی کوٹھی کہلانا چاہیے۔ کیونکہ آپ علوم فلکیات و نجوم “
”بکومت“

ڈوبتے سورج کی روشنی میں ٹہلتے ہوئے وہ چاروں ریڈیڈنسی کے مختصر انگریزی قبرستان کی سمت نکل گئے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ برگد کے نیچے پہنچ کر مسز بیگ نے مرمی قبروں کا جائزہ لیا۔ پھر عینک لگائی اور کتبوں کے نام اور تاریخ وفات اناؤنس کرنے لگیں۔ میڈلین انیز۔ ۱۸۸۷۔ ایمافٹز جیرلڈ۔ ۱۸۴۵۔ لفٹ جیمز گرہم۔ ۱۸۷۵۔ ولیم ریلج۔ ۱۹۱۲۔ ایمیلیا جین۔ ۱۹۱۲۔ درختوں کے پتے بارش کی بوندوں کے ساتھ قبروں پر ٹپ ٹپ گرا گئے۔
”کر بچیں عقیدہ ہے کہ قیامت ایسٹر کے روز آئے گی۔ ساری قبریں اپنے اپنے مُردے اُگل دیں گی“ مسز بیگ نے کہا۔
وہ تینوں ایمیلیا جین ۱۹۱۲ کے کنارے پر بیٹھ گئے۔
بیمگی ہوئی ہوا درختوں میں سرسرائی۔

ایسٹر مورنگ۔ روز قیامت۔ ایمیلیا جین مٹی جھاڑتی قبر سے برآمد ہوتی ہیں۔ سعیدیس کے گاؤں سے کیڑے مکوڑے جھٹکتی ہیں۔ افسوس کرتی ہیں۔ یہ گاؤں انھوں نے حضرت گنج سے خریدا تھا اور اسے پہن کر ”یور وینیزاؤنلی“ کے چھتر منزل کلب میں والتس ناچا کرتی تھیں۔ نیلی گومتی کے کنارے بلوڈینیوب۔
قبر سے نکلیں تو کفن پوش نواب مریم سلطان بیگم دکھلائی پڑیں۔ ملک غازی الدین حیدر۔ ڈاکٹر جیمز سٹورٹ کی دختر بلند اختر۔ ایمیلیا جین نے بخوشی ان سے مصافحہ کیا۔ گواک نیٹو بادشاہ کی کوئین تھیں مگر اپنی وصیت کے مطابق

کیقو لک قبرستان میں دفن کی گئی تھیں۔ دونوں میدان حشر کی طرف چلیں۔
وہ انگریز نثر اد صاحبات محل کہ کلمہ گو میں اپنے اپنے مزاروں سے نکل کر
اہل اسلام کے گیمیں لگ رہی ہیں۔

”قمر چہر اور عمدہ بیگم وغیرہ کا حشر عسائیوں کے ساتھ ہوگا یا مسلمانوں کے؟
عبر نے آواز بلند ذرا تردد سے دریافت کیا۔

”ہماری قیامت ایسٹر کے روز تھوڑا ہی آئے گی“ منصور نے کہا۔ ”یا کیا پتر
دونوں ایک ہی روز پڑیں چاند کے حساب سے!“
مسز بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کلکتے میں بے چاری فلو مینا
کی قبر اس طرح بھگتی ہوگی“

”اُمی جان چلیے گھر چلیں۔ آپ کار لے جائیے۔ ہم لوگ پیدل آتے ہیں“
وہ ایلیا جین ۱۹۱۲ پر سے اٹھیں۔ سر جھکائے سڑک کی طرف روانہ
ہو گئیں۔ حسین بخش چھتری لے کر انکے پیچھے پیچھے دوڑے۔

”فلو مینا کون تھیں؟ کل شام بھی تمہاری والدہ نے انکا ذکر کیا تھا“ منصور
نے سگریٹ پھینک کر لفٹیننٹ جیمز گرہم ۱۸۷۵ پر سے اپنی ہلیٹ اٹھائی۔

”ہماری GOAN آیا۔ اُمی جب پیدا ہوئی تھیں تب سے اس نے انھیں
پالا پوسا تھا۔ بے انتہا وفادار۔ پورے پچاس برس اس نے ہم لوگوں کی خدمت کی۔“
وہ دونوں برگد تلے سے نکل کر خاموش راستے پر آگئے کچھ فاصلے پر ”اولڈ روز“

رنگ کی ساڑی میں ملبوس ایک آہستہ خرام خاتون روربنک کو لونی کے دو منزلہ
سرکاری مکانات کی سمت جاتی دکھلائی دیں۔ ندی میں سورج اسی آہستگی
سے ڈوب رہا تھا۔

”مسز جو رڈن۔“ ”عبر نے ریجیدہ آواز میں کہا۔“ غروب آفتاب واحد وقت

ہے جب نئے اسکائی اسکریپرز سے دور لکھنؤ کی پرانی اسکائی لائن شفق اور گومتی کی اس سرخی میں ڈوب کر ٹامس ڈینیل کے فریم میں واپس چلی جاتی ہے۔ اس وقت مسز جورڈن چہل قدمی کر کے اپنے خاموش فلیٹ کی طرف آتی ہیں۔

”مسز جورڈن! — کچھ کھٹی سی جی!“ منصور نے کہا۔ ”رائٹ — انکے شوہر کر سچین کالج میں پڑھاتے تھے۔ یہ آئی۔ ٹی میں۔ لاؤنڈریز تھا۔“

”مسز جورڈن کا انتقال ہو گیا۔ شاردانے آئی۔ ٹی سے انٹر کیا تھا۔ وہ بتلا رہی تھی۔ دو دیورانی جٹھانی تھیں۔ یہ انوکھس جورڈن تھیں دوسری میوزک جورڈن وہ پیانو سکھلاتی تھیں۔ اس وقت ہندوستانی استانیاں تین چار ہی تھیں۔ اب سارا اسٹاف INDIANISE کر لیا گیا ہے۔ لورڈو کانونٹ سے بھی ساری یورومین NUNS واپس گیتس کیرالا کی آگئی ہیں۔ محض لا مارٹیز میں ابھی گورے استاد باقی ہیں۔“

”عبر میرا خیال ہے ہم فرنگیوں کے جانے سے واقعی اداس ہیں۔ کم از کم نو سیلیجیا کی حد تک تو ہیں۔ ورنہ ایک انڈین کر سچین تنہا پنشن یافتہ استانی کو ریڈیڈنس کے انگلش قبرستان کے پاس سے چپ چاپ گزرتے دیکھ کر تم غمگین کیوں ہوئیں؟“

”ہم انگریزوں کے جانے سے اداس نہیں۔ مگر انڈو برٹش تمدن میں جو فاسٹس تھیں انکی جگہ پر جو گنوار پن —“

”گنوار پن جمہوریت کی اولیں ایٹھجوں میں ناگزیر ہے۔“

”او کے۔ او کے۔ میں تفوڑا ہی کہتی ہوں کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں پہلے زیادہ تر ریسٹوں کے لڑکے پڑھتے تھے اسوجہ سے وہ بہت بڑھیا بانی کلاس جگہ تھی۔ اب اس میں کسانوں اور جولاہوں کی ہزاروں ہزار اولاد تعلیم حاصل کر رہی ہے اس وجہ سے میں افسوس کرنا چاہیے۔ ڈیم اٹ۔“

”جی نہیں۔ بنیادی طور پر آپ بھی ELITIST ہیں۔“

”ابھی تو تم مجھے نکسلائیٹ بتا رہے تھے!“

”تم بھی مجھے کبھی وہابی سمجھتی ہو کبھی شیعہ۔!! نہیں۔ تم زبردست اسنوب ہو۔ میں کہ ایک غریب ملا کا بیٹا ہوں۔ کسی گوان آئے میری پرورش نہیں کی نہ میری والدہ نے لورڈ ہاؤس کلکتہ میں پڑھا۔ میں SNOBBERY کے مختلف رنگ خوب پہچانتا ہوں“

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔

”اور سناؤ۔ نگار خانم کیسی ہیں؟“

”مہر سقیں کہ شطرنج کے کھلاڑی دیکھوں کھانا کھاؤں۔ میں بھاگ آیا“

”شہو آ رہت خوبصورت ہے۔ تم کو کیسی لگتی ہے؟ بتاؤ۔ بتاؤ نا۔“

”عنبر۔ خفقانی مت بنو۔“ منصور نے چڑ کر دوسرا سگریٹ جلایا۔ ”ڈاکٹر

کے اعصاب مضبوط ہونے چاہئیں۔“

”بس۔ تم یبورٹری میں ڈٹے رہو۔ میں خفقانی ہوں؟ ڈاکٹر انسان نہیں؟

پتھر کے بت ہیں؟ تم کیوں چین اسموکنگ کرتے ہو؟“

وہ پھاٹک پر پہنچ گئے۔ منصور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”پہلے ذرا گھر سمیر کلب“ کول گیٹ مسکراہٹ مفقود۔ ”بہی کی ایک ٹرنک کال

کا بھی انتظار ہے“

”امی تو تمہارے لیے ہی سامان لینے ماتا بدل کے ہاں گئی تھیں“

”سوری۔ اگلے ہفتے۔ آج تو اتنا وقت بیلنگار د میں آپ ہی لوگوں کے

ساتھ گزار لیا۔ اگلا سینچر۔ او۔ کے؟ کھانا بھی۔ خداحافظ۔
فلش گورڈن — رت بسنت کی بجلی کی طرح غائب۔

مسز بیگ کو ٹھی کے پھاٹک پر منتظر تھیں۔
”ہلو اولڈ گرل“ غبر نے کھوکھلی آواز مصنوعی بشاشت سے ماں کو مخاطب کیا۔
”منصور۔؟“

”چلا گیا۔“

”کیوں؟“

”پرسوں آپ ہی نے اس سے کہا تھا اس کا روز روز آنا اور گھنٹوں بیٹھا
ٹھیک نہیں۔“

”یہ بات نہیں۔ تم نے اسے اپنی تختوں سے جھٹلادیا۔ بات بے بات اس
سے الجھتی کیوں ہو؟ مردِ سڑی جھگڑاؤ لڑکیاں پسند نہیں کرتے۔“

”میں لڑکی ہوں؟ بوڑھی پھونس خود ہی تو کہتی ہیں کہ عورتوں کو سکند فڈل
نہیں بننا چاہیے۔ ابھی ان بے چارے اتنے مہذب مسکین بزرگ سے تکرار کرنے
لگیں۔ چلیے اندر چلیں۔“

غذیب بانو پھاٹک پر کہنیاں ٹیکے کھڑی رہیں۔

”اُمی۔ اب کیا سوچ رہی ہیں بھئی؟“

”حُسن بخش نے جلی خورشید کا قصہ چمڑ دیا۔“

”تو۔۔۔؟“

”مجھے ججن بی کا خیال آگیا۔“

”چھوڑیے۔ اب ججن بی کو کہاں تک یاد رکھیے گا؟“

”مرتے دم تک۔ جیسے ممانہیں نہ بھول سکیں۔“

”بے چاری ججن بی کا کیا قصور تھا اُمی۔“

”دشنو۔ دوسرے کنارے پر مسلمان بجا روں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ انکی عورتیں بڑے شوخ خوبصورت رنگوں کے عزارے پہنتی ہیں۔“
 ”انکی جھونپڑیوں کے مقابل آرٹ کالج اور ندوۃ العلماء۔ اور ان دونوں دنیاؤں سے انکا کوئی تعلق نہیں۔“

”میدرڈ میں۔۔۔ جب میں ایک چمسی ڈانس کرا سکیج بنا رہی تھی تم سے کہا تھا۔ آٹھ سو سال پہلے اگر یہ خانہ بدوش انڈیا سے یورپ نہ بھاگتے وہاں آج بھی ہنڈرے اور ڈوم اور کنجری کہلا رہے ہوتے۔“

”آئین اکبری میں ہے کہ کنجری قبیلے کی عورتیں ناچتی گاتی ہیں اکبر نے انکو کچنی پکارا۔“

”مجھ بجا رن کے لیے یہ پڑاؤ بھی جان لیوا نکلا۔“

”باؤچی ٹولے کے حسین بخش کافی نہیں تھے“

”جو آج وکٹوریہ اسٹریٹ کے دھتھے دار بیٹھ گئے۔ مجھوتوں کے رکھوالے۔“

”اندر چلیے۔ بجا روں کے چراغ بجھتے جاتے ہیں۔ ہوا اتنی تیز ہے۔“

”اس موسم کی ہوائیں آندھی بن کر آتی ہیں۔ سنو غیر گننام نواب صاحب نے عزیز بانو کا وہ کون سا شعر پڑھا تھا۔ جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں۔“
 ”اس وقت سے پتہ ہے میں کیا سوچ رہی ہوں؟ میں سوچ رہی ہوں۔ میں شاخ گلاب کی طرح جھکی تو سہی۔ ابر بہار کی طرح اٹھ کیوں نہ پائی۔“



(۳)

سُرخ پٹاری

”بیٹے۔ اس روز باہر سے باہر ہی چلے گئے۔“
 ”جی میں نے غبر سے معذرت۔“
 ”اچھا ذرا کچن کا چکر لگاؤں۔“

ڈاکٹر کا شعری دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ شفق کی روشنی میں ہر اچھا باغ بے حد
 دل فریب معلوم ہو رہا تھا۔ نالیوں میں بہتا شفاف پانی کبھی نقری نظر آتا کبھی ارغوانی
 بڑی بڑی مینائیں گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ عتابی اور سفید نالیوں کے فرش
 پر کھٹ کھٹ کرتی، طوطے کے رنگ کی ساری میں ملبوس عنبیں بیگ کمرے میں
 داخل ہوئی۔

”ہلو منصور۔“

”ہاتے طوطا پیری!۔“ اس نے امریکن انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ ”یار وہ بنگالی
 بیرسٹر بڑا بے وقوف تھا جو ایسی خوبصورت کوٹھی اتنی سستی بیچ گیا!“
 ”وہ پانڈی پجری آشرم جا رہا تھا سنیا س لے کر۔“
 ”عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ آشرموں میں جا بیٹھتے ہیں۔“

”جب میں نے اسے خریدا اس پر بیڈیگوریت چھانی ہوئی تھی۔ جھلملیوں والی
 کھڑکیاں اندھیرے اداس کمرے۔ ایکڑ وٹک باغ میں نے کھڑکیوں میں سلائیڈنگ
 پٹ لگوائے۔ کمروں کو روشن اور ہوا دار کیا۔ افوہ بڑا خرچہ بیٹھا۔ تم کہتے ہو برساتی
 بنوالو۔“

”اب اس وکٹورین بنگالی ماحول کی جگہ تمہارے ہاں یوروپین کونویل ٹچ آگیا،
یہ بھی اچھا لگتا ہے۔“
”کونویل؟“

”ٹروپیکل درخت اور کوٹھی کا اسٹائل۔ اسکے لئے تم کچھ کر نہیں سکتیں۔ نہ کرنا
چاہیے۔ شمالی افریقہ میں یوروپین کونویل چھوڑ دو۔ امن ایماں ترک کی جھلک موجود ہے۔
اور اندلس کی — اور —“

”یہی تو سارا پرولم ہے۔ جھلکیاں بے شمار۔ آدمی ایک۔“
”سلفے سے موزیک اور اسٹینڈ گلاس دریچے بھی تو بنائے جاتے ہیں۔“
”یہ کوٹھی اس ایریا کے لینڈ ٹری رومینک منظر میں شامل تھی۔ لال بارہ دری۔
چھتر منزل۔ روشن الدولہ کی کچہری۔ قیصر باغ۔ لیکن یہاں بد مذاقی کے بل ڈوزر چل گئے

”اسکاٹ لینڈ میں میں اپنی بے دند میں بیٹھتی اکثر ایک آدمی بیگ پائپ بجاتا
منسان پہاڑی راستے پر سے گزرنا دور دھند لکے میں کھوجاتا تھا — میں اس آواز
کو دوبارہ سننا چاہتی ہوں۔ مگر ملکہ پچھراج کو بھی انکی اپنی سینگ میں۔
”اڈنبرا اور بیگ پائپ۔ ہندوستان کی مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکرز پر بانگوں کا
سلسلہ — فجر اور مغرب کی لرزہ خیز اذانیں — ہر دو ار گئے ہو؟“
”ہوں ہوں۔“

”گنگا دیوی کے مندر کی جل بہار۔ کیرالا کے سفید چرچ۔ رنگین چھتریاں لگائے
پلوں پر سے گزرتے گریس فل لوگ۔ سردیوں پر رومال باندھے موپلا عورتیں۔
چیز کا ایک دوسرے سمبندھ اور مناسبت ہے۔ لیکن یہاں کیا ہو رہا ہے؟ چھتر منزل
کوڈرگ ریسرچ انیٹیوٹ بنا کر برباد کر دیا۔ روشن الدولہ کی کچہری گرائی جا رہی ہے۔
قیصر باغ کے پھاٹک تو کھنڈر ہو گئے اور شیڈیم کے سامنے وہ نیلا پیلا سوراخوں والا پھاٹک
تعمیر کیا گیا ہے بقول تمہارے BAD-TASTE MODERN — دنیا کا گلوب پچوں کے
یارک میں لگانا چاہیے تھا۔ سعادت علیاں اور خورشید زادی سے اسکی کیا —“

”میرے انگٹے میں تمہارا کیا کام ہے۔ لاؤ ڈاسپیکر پر۔“ عندلیب بانو نے اندر آتے ہوئے جواب دیا۔

”دیکھو شام کس تیزی سے گزر رہی ہے“ منصور چند کیسیٹ نکال کر دریچے میں واپس گیا۔ ”یہ میں نے ڈسک از فالنگ کا ترجمہ کیا ہے۔“
”بل ڈوزر۔“ عنبریں نے دہرایا۔

”لندن برج از فالنگ ڈاؤن فالنگ ڈاؤن مائی فیئر لیڈی۔“ منصور نے کہا۔
”عنبر تمہاری باتیں سن کر میرا چہرہ گر گیا۔ ایسے منفی بیانات جاری نہ کرو۔ تمہیں اپنے ڈپریشن کو شکست دینی چاہیے۔ اسی بات پر ذل بہادر تھا یا سے کہو کافی لائے مع چوکولٹ کیک۔“
”بہادر۔“ عندلیب بانو نے پکارا۔ پھر عنبریں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”تم روز بروز زیادہ ری ایکٹری ہوتی جا رہی ہو۔“ یہ بہادر سنگھ چیتھڑے لگائے نیپال کی گھاٹیوں میں پتھر ڈھوتا تھا اس وقت گویا اپنی میٹنگ میں صحیح اور مناسب تھا۔ بلکن ہے اسکی بہنیں فارس روڈ پر بیچ دی گئی ہوں بھتی میں۔ مینی اسکرٹ پہنے سُرخ تیتوں کے نیچے کھڑی پتھر کی سلاخوں سے جھانکتی اداس نیپالی لڑکیاں۔ ان پتھوں کی ہی میٹنگ ہونی چاہیے؟“

”ہاں۔ جواب دو عنبریں!“ منصور نے جوش سے مطالبہ کیا۔

والدہ پھر غائب۔ باہر کار اسٹارٹ ہوئی۔

”امی کے پاس بہت سے دقیانوسی ریکارڈ بھی موجود ہیں۔ کسی روز سننا۔“
”مائی نیم مس گوہر جان آن کیل کٹا۔“ منصور نے اشتیاق سے پوچھا۔
”ہاں۔ اسی ٹاپ کے گوہر جان۔ سردار منصور میں کچن۔ دُلا ری۔“

منصور نے ایک کیسیٹ لگایا: "لو سنو — تمہاری ملکہ پکھراج اپنی ٹروٹینگ میں"

"ہر شاخ میں شگو نے انداز لو پھوٹے"

عبر نے آواز اونچی کی۔

"ہو ابخت سبز۔ ملا رخت سبز"

"واہ — واہ —!" منصور نے داد دی۔

"چلے میگسار سوتے لالہ زار — مے پردہ دار شیشے کے در سے جھانکی —"

"ما تم جھٹلمن —!" عبرتس نے خوشدلی سے اعلان کیا۔

"صاحبزادی شہوار خانم کا فون"

"کہہ دیجئے حسین بخش ہم یہاں موجود نہیں — سنو عبرتہ جو سامنے والے آم کے

درخت ہیں انکے ایٹ مونسفیر کو نہ چھیڑنا"

"ہرگز نہیں!"

وہ بیکخت بڑی بتائش نظر آئی۔ منصور نے شہوار کو انور کیا۔

"ہو ابخت سبز — ملا رخت سبز — آفت گئی خزاں کی۔"

"بالکل یہی جھنگل کی SETTING رکھو — جھٹ پیٹے وقت بن دیوی ال بھرمت

میں سے گذرا کرے گی۔ کبھی اپنی جھلک دکھلا کر اچانک غائب ہو جائے گی۔ بن دیوی جو

انسانوں سے ڈرتی ہے — یہ ایک رگ ویدک شاعر نے کہا تھا۔ ڈھائی ہزار

سال پہلے"

"باپ رہے۔ تم کو اتنا انٹرٹینمنٹ لڑ پچرا زبر ہے! ڈھائی ہزار سال سے کم بات

نہیں کرتے۔ واقعی نگار خانم تم کو بہت بھاؤ دینگے۔"

”وہ دیکھو — بن دیوی کی جھلک — پیلی ساری میں۔“

”وہ ہمارے مالی کی بیوی ہے۔“

”نیور مائنڈ۔ تمہاری مالن کا نسلی اور مابعد الطبیعیاتی تعلق اس رگ ویدک بن دیوی کے تصور سے بالکل فط بیٹھتا ہے۔ ادریٹنگ ایکدم پرفیکٹ۔ بورسے لے آم کے درخت۔ گومتی کا کنارہ — گودھو لے کا سٹے۔ مالن کا نام امبیکا تو نہیں؟“

”نہ۔ رم کلیتا۔“

”خیر۔ رام کلی بھی چلے گا؟“

”سوال یہ ہے بارہ درسی قیصر بارغ ہلدی کے رنگ میں کیوں پڑتی؟“

”چند سال قبل ایک میرا العقول کلرا اسکیم بنائی گئی تھی۔ اسکے تحت“

”جب بیٹ صاحب پوٹی گورنمنٹ کے چیف سکریٹری تھے؟“

”ان نامحور رنگوں سے موصوف کا کوئی تعلق نہیں۔ کوئی موڈرن آرٹ والا ٹاؤن

پلانر — معاملات کچھ اندھا دھند میں کچھ پیچیدہ۔ وکٹوریہ پارک کا نام بیگم حضرت محل

پارک رکھا گیا۔ بیگم کا مجسمہ نصب کرنے والے تھے۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا ایک مسلم

شخصیت کا بت نہیں لگوانے دینگے۔ چنانچہ وکٹوریہ کی چھتری خالی پڑی ہے۔“

”امیر الدولہ لائبریری میں“ مسز بیگ کی آواز آئی ”کنگ غازی الدین حیدر

کا مر مر میں بت تو مدتوں سے موجود ہے — جب میں لڑکپن میں یہاں آئی کبھی تب بھی

دیکھا تھا۔ اور نصیر الدین حیدر کا بھی۔“

”آپ —؟“

”برہما بیکری گئی تھی۔ تمہارے لیے چوک لیٹ کیگ۔ اور میاں سارے مسلم ملکوں میں

تو مسلمان شخصیتوں ہی کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔“

”اکثریت کی بت پرستی کی وجہ سے ہندی مسلمان حد سے زیادہ محتاط ہے —

امی ذرا سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“

”ماں! تو سمجھتی کیوں نہیں؟“ منصور نے فلمی مکالمے کی نقل اتاری۔
 ”منسربگ کھکھلا کر ہنسیں۔ اسی انداز میں ایک اور پامال فلمی ڈائیلاگ دہرایا۔
 ”اچھا بیٹا جا۔“ اجلدی سے ہاتھ منہ دھولے۔ میں تیرے لئے چا لائی ہوں۔“

ان دونوں میں کتنا زبردست RAPPORT قائم ہو گیا ہے۔ لوگ جبرئیلین گیب کی بات کرتے ہیں! عنبر نے کیک کا ڈبہ ماں کے ہاتھ سے لیکر میز پر رکھا۔
 بہادر ٹرے لے کر حاضر ہوا۔

”منصور تم کافی اینٹی مسلم بھی ہو۔“ عنبر نے کافی بناتے ہوئے اظہار خیال کیا۔
 ”میں نے اب تک جو کچھ کہا اس میں کوئی پوائنٹ غلط ثابت کرو۔ کرو غلط ثابت ابقی بات کہتا ہوں۔ سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے۔ کیا تم خود ہی پرسوں نہیں کہہ رہی تھیں شیعہ سنی فسادوں میں دونوں فریق ہندو مسٹروں کے پاس ایک دوسرے کی شکایتیں لیکر جاتے ہیں ان سے فیصلے کی درخواست کرتے ہیں۔ کتنی شرمناک صورت حال ہے۔ بنارس میں شیعہ فریق دوسری قبروں کا معاملہ سپریم کورٹ تک لے گئے ہیں قبریں اس جگہ سے اکھڑنے کا مطالبہ۔“

”جعلی ہیں وہ قبریں۔“

”اگر مزار اکھڑنے کی قانونی مثال قائم ہو گئی تو بھیا نک ممکنات کا ابھی سے اندازہ کر لو۔
 پھر شکایت نہ کرنا۔“

”دس از ڈریڈفل۔ ویسٹرن آدمی چاند پر پہنچ گیا یہاں مبریں۔“

عنذلیب بیگ نے مایوسی سے ہاتھ پھیلائے۔

منصور بہت مضطرب انداز میں پیالی آئندہ پر رکھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

افسوس کہ عنبر FUNDAMENTALIST نکل گئی۔

اور ایسی فری تھنکر ماں کی بیٹی۔

وہ کمرے کے اشیائے آرائش پر بے دھیانی سے نگاہ دوڑاتا رہا۔ ایسی

چیزیں جو عموماً ہر ولایت پلٹ کے کھر میں موجود ہوتی ہیں ایفل ٹاور وغیرہ۔ ایک کو نے میں دھری ایک گول پٹاری نے متوجہ کیا۔ وہ قریب جا کر اسے غور سے دیکھنے لگا پچھلے چند ماہ میں وہ کئی بار یہاں آچکا تھا لیکن لاکھ سے رنگی وضع قدیم کی اس پھولدار پٹاری کو نوٹس نہیں کیا جو ایک کشمیری اسکرین کی اوٹ میں رکھی ہوئی تھی۔

”دلی میں —“ اس نے آہستہ سے کہا — ”میری دادی اماں کے پاس اسی طرح کا ایک پٹارا موجود تھا — جامہ دانی۔ جانشین پر رکھی رہتی تھی۔ یہ پٹاری آپنے نخاس سے خریدی ہوگی؟ یا شیش محل — میر عبد اللہ۔“

”نہ نخاس نہ میر عبد اللہ۔“

”اس پر یاد آیا — امراؤ جان میں میر عبد اللہ کو دیکھا؟ ایک سین میں باقاعدہ نیلا جو غم پہنے —“ منصور نے پھر پٹری بدلی۔

”یہ پٹاری بھی ANTIQUE ہے سو سال سے زیادہ پرانی —“ عندلیب بانو اٹھ کر کشمیری اسکرین کے پاس آئیں۔ شکستہ پٹاری لاکر دیوان پر رکھی۔ گنبد نما ڈھکن احتیاط سے کھول کر کپڑے کی چند گڑیاں نکالیں۔

”یہ بھی سو سال قبل بنائی گئی تھیں۔ یہ ان گڑیوں کی پٹاری ہے۔“

”نو کیڑنگ —؟“ منصور نے بڑے اشتیاق سے ایک گڑیا اٹھائی۔ شکر پارے کی آنکھیں۔ ناخنوں اور ہتھیلیوں پر سُرخ تول کی کتریں بکالے دھاگے سے بنی لانی چوٹی گوٹے کا موباف۔ پوتھ کا چھوٹی گوٹ کا دلی والا غرارہ۔ ریشمی شلوکہ اور دوپٹہ۔ زری کی جوتی۔ ناک میں چاندی کا بلاق۔ گلے میں پوتھ۔ کلاسیوں میں موتی کی چوڑیاں۔ اسے رکھ کر نوکیلی مونچھ چو گوشہ لٹپنی اور گمکد کے چُخنے والا ایک گڈا اٹھایا۔ غبر فاقانہ انداز سے بولی —

”SEE THIS IS WHAT CIVILISATION IS ALL ABOUT.“

یہ میری گرینی کی پٹاری ہے۔ میری گریٹ گریڈ مدر نے یہ گڑیاں میری GRANNY کے لئے بنائی تھیں۔“

سنوار کر عندلیب بانو نے انکو دیوان پر ایک قطار میں بٹھال دیا۔ اور پٹاری میں ہاتھ ڈال کر ایک برقعہ نکالا۔ چھوٹا سا سوتی نسل کا ک برقعہ۔ بوسیدہ — ”میری والدہ مرحومہ کا برقعہ۔ اس زمانے میں نو دس سال کی لڑکی پردہ نشین ہو جاتی تھی۔“
 - نہایت احتیاط سے اسے بھاڑا۔ تخت پر بچھا کر اسکی ٹکینیں درست کیں۔
 پلکیں ساری کے کونے سے چھوئیں گویا آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے اسنے کمال رہی ہیں۔

برقعہ لیٹ کر واپس رکھا اور ایک خالی عطر دان پٹاری سے برآمد کیا۔
 ”میرے گریٹ گریڈ فادر نے یہ عطر خود کشید کیا تھا۔“ عنبر نے ایک خالی شیشی پیش کی۔ عطر کب کا اڑ چکا تھا۔

”بہت ہی بڑھیا۔“ منصور کی سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہے۔ تو بے سر پرانے دیسی عطر کی خالی شیشی کی اسے پہچان نہ تھی۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ بالکل اتفاقیہ اور نادانستہ وہ ان ماں بیٹیوں کی نجی زندگیوں کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اجنبیوں کا اپنی زندگی میں اس طرح بھاگنا انکو پسند نہ آئیگا۔ کسی کو پسند نہیں آسکتا۔ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا اور قالین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب لگے ہاتھوں گو متی کی جل بہا رہی دیکھ لو۔“ اڈنبرا میں وقت گزاری کے لئے ایک آرٹ اسکول جو این کر لیا تھا۔ عنبر میڈیکل کالج میں AMBER کہلاتی تھی میں آرٹ اسکول میں ANDY، الماحاب تھا۔ بیٹی اتنی کٹھن پڑھائی میں مصروف۔ والدہ شوق فضول میں مگن۔ ایک تجرباتی تھیٹر میں بھی کام کیا۔ اس زمانے میں لالینیت کے تھیٹر کا بڑا زور تھا۔ پھر لوگ اس سے بھی بور ہو گئے۔“

ڈیم سبل تھورن ڈائیک کے سے وقار کے ساتھ اطاف کلشن سے گذرتی، دو میٹرھیال
 اتر کر وہ اپنے مہمان کو ایک نیم تاریک کمرے میں لے گئیں۔ اتنے روشن اور پر فضا خالص

انگلش اسٹائل گارڈن روم کو انہوں نے اپنا اسٹوڈیو کیوں نہ بنایا۔ منصور نے اچھی سے سوچا، اور تصویر خانے کے دریچے داکے۔ یہیں سے جھانکتی وہ اس شام گھوڑیا سوان سن معلوم ہوئی تھیں۔

منزبگ نے ایزل پر سے پردہ سرکایا۔ ”لو بھئی۔ جل بہار۔ چھتر منزل کے سامنے شاہی کے بجرے“

پیچھے سے عنبر کی آواز آئی۔ ”منصور یہ قالین دیکھو میں بے طہران میں خرید اٹھا۔“ وہ دیوار پر آویزاں کاشانی قالین کی طرف مڑا۔ بغیر آئینوں کے شلو کے اور گھردار شلواروں میں ملبوس سروں پر رومال باندھے تین فریہ ایرانی عورتیں گادکیوں کے سہارے بیٹھی قلیان، سگریٹ اور شربت سے شغل کر رہی تھیں۔ پس منظر میں گنبد اور محرابیں۔

”غالباً حرم سرا“ عنبر نے کہا۔ ”یہ والا مرا کو۔“

مراقشی قالین پر ایک عرب شہسوار ایک حیدنہ کو سامنے بٹھائے اڑا جا رہا تھا۔ تعاقب میں غنیم یار قیب۔ اوپر تاروں بھرا آسمان۔ چاند مینار بکھور کے درخت۔

”عورت کے متعلق اقوام مشرق کے رویے ان قالینوں سے عیاں ہیں۔ اب میں انکے سامنے ایک سوویٹ خلا باز لڑکی کی تصویر لگاؤں گی!“ عندلیب بانو نے اعلان کیا۔

”آپکو WOMEN'S LIB کی قیادت کے لیے میدان میں آنا چاہیے!“

”میں لیڈر ٹائپ نہیں۔ حالانکہ خالی بیٹھے میرا جی گھبراتا ہے۔ باہر دسیوں مشغلے تھے۔ یہاں تصویریں کہاں تک بنائے جاؤں۔ پھر انکا کیا کروں۔“

”نمائش۔“

”نمائش؟“

”جی۔ قاعدہ ہے کہ مصوّر تصویریں بنانا ہے پھر انکی نمائش کرتا ہے۔“

”میں بہت بے قاعدہ مصوّر ہوں“
 ”آپ کی تخلیقات؟“ منصور نے ذرا خائف ہو کر چند CERAMICS کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اطاق پذیرانی میں واپس آئے۔
 ”لیلیا میں —“ عندلیب بیگ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے چند ایک
 سر بھی بنائے تھے۔ تانے میں دکھلاؤں؟“
 ”اُنی پھر کبھی۔“

آرٹسٹ اپنے بارے میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن عنبر منصور کو اپنی طرف
 متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ مسز بیگ سے گفتگو میں لگا رہا۔

یہ دونوں میرے خلاف GANG UP کر رہے ہیں اس نے چڑ کر ایک رسالہ اٹھایا۔

”اور چودہ سو سال سے مسلمان بچیاں گڑیاں کھیل رہی ہیں۔ اے بیٹا وہ بھی تو پتلے
 پتلیاں ہوئیں۔ بس یہی تو کہتی ہوں۔ NO LOGIC — کیا تم بوری ہو رہے ہو؟“
 ”نہیں تو نمیم۔“

”جب سے لکھنؤ آئی ہوں۔ گوشہ نشین تبارک الدنیا۔ اس دریچے میں کھڑے ہو کر
 دن میں پرندہ شناسی۔ رات کو آخر شماری۔ A LONELY OLD WOMAN — تم ایک
 ہمنیال مل گئے تو اتنی باتیں کر ڈالیں۔“

”اُنی آپ کو گوشہ نشینی پر کس نے مجبور کیا ہے؟ لٹ کلا اکیڈمی والے لال بارہ درمی
 میں آپ کی نمائش کرنا چاہتے تھے آپ نے انکار کیا۔ وہ کون بھاٹیہ اُنی۔ آپ نے
 اسے بھگا دیا۔“

”کرن بھاٹیہ کون؟“ منصور نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”عینر کی ایک مینٹنٹ ہے۔ بمبئی کے ایک زنانہ انگریزی دیکلی کی کورسپونڈنٹ
 ایک روز میری تصویریں دیکھ کر بولی۔ میرا انٹرویو کر کے ایک تصویریں فیچر چھاپے گی اس
 رسالے میں۔ دراصل اس پر اس چیز کا بہت رعب پڑا کہ میں نے پندرہ سال ولایت میں
 رہ کر تصویریں بنائیں۔ مضمون لکھ کر لائی۔ وہ شروع اس طرح ہوتا تھا۔ شرمیلی
 عندلیب بیگ جنکی تصاویر کی نمائش اڈنبرا، لندن، پیرس اور برسلز میں ہو چکی ہے۔
 ”بیٹا میں نے یہ تم سے کب کہا تھا میری تصویروں کی نمائش آج تک کہیں نہیں ہوئی۔
 میں محض سنڈے پینٹر ہوں۔ بولی چھوڑیں اسٹی جی۔ فرک کیا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں
 پر رعب پڑ جائیگا۔ کون لندن پیرس پوچھتا چھ کرنے جا رہا ہے۔ میں نے کہا میں اس غلط
 بیانی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ وہ چھو کر می اڑی رہی۔ مجھے غصہ آگیا اسکا مضمون بھاڑ
 کے پھینک دیا۔“

گیلری میں فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ عینر نے جا کر بات کی منہ پھلائے لوٹی۔
 ”پھر شہوار خانم! مارے شان کے خود بات نہیں کرتیں۔ پہلے انکی آیا بنتی والوات
 کرتی ہے۔ پھر خود تشریف لاتی ہیں۔ پوچھ رہی ہیں تم یہاں آگئے ہو یا نہیں۔ کیا
 جواب دوں؟“

”ٹھہرو۔ میں نیپتا ہوں۔“

چند منٹ بعد وہ واپس آیا۔

”کیا ہوا؟ نگار خانم پھر علیل ہیں؟“

”نہیں بھئی۔ کل شہوار کہہ رہی تھی THE MESSAGE کا کیسٹ منگوایا ہے۔
 وہ آگیا۔ اب کل دل جا کر دیکھ لوں گا۔ یوں تو پکچر دیکھنے کو ملے گی نہیں۔“
 ”کیوں؟“ مسز بیگ نے سوال کیا۔

”مسلمانوں نے اسے انڈیا میں BAN جو کر دیا ہے۔“

”اے بیٹا میں تو اسے دیکھ چکی ہوں بن غازی میں۔ ہمیں BAN کروانے کی کیا بات تھی؟ پہلی مرتبہ طلوع اسلام پر فلم بنی۔ ساری دنیا کو دکھانے کے لیے۔ اور اتنی لا جواب — سچ ہے۔ سر سید احمد خان نے تو سو سال پہلے کہا تھا کہ مسلمان عقل کے دشمن ہیں۔ منصور بیٹے اسے دیکھ کر تو انگلی بند میں بہت سے انگریزوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور سنو تو۔ ایک پکے مسلمان ڈائریکٹر نے اسے بنایا۔ نہ ہمیں تمہارے پروفٹ دکھلائے گئے۔ نہ انکے چاروں کیلٹ۔ آواز تک کی نمائندگی تو کی نہیں گئی پروفٹ محمد کی۔ علمائے ازہر نے اس فلم کی تعریفیں —“

”کی ہونگی یہاں تو اس بچے کو دیکھے بغیر اردو اخباروں نے اس کے خلاف جو شیپلے اڈیٹوریل لکھے۔ نمائش سے پہلے ہی BAN کروادیا۔ اب ہم کس کس بات کے دے رہے روئیں؟ منصور نے جواب دیا۔

”حضرت ابوطالبؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت بلالؓ کو تو دکھلایا ہے —“ عجب نے اعتراض کیا۔ ”اوٹنی تو دکھلائی ہے فلم میں۔ آنحضرتؐ کی“

”اوٹنی؟ مسلمان مصوروں نے تو براق کی ان گنت تصویریں بنا ڈالیں۔“
عندلیب بانو فوراً اٹھ کر اسٹوڈیو میں گئیں وہاں چند منٹ کھٹ پٹ کر گیا کیں۔
اسلامک آرٹ پر دو ضخیم کتابیں اٹھائے واپس آئیں۔

طویل سنہری زنجیر والی عینک ناک پر جمائی۔ ورق گردانی شروع کی۔

”چھوڑیے انی۔ منصور میوزک سننا چاہتا ہے۔“

”قصص الانبیاء، معراج نامہ، سب میں آدم نامہ محمد پیغمبروں کی باضابطہ صورت گری موجود بغداد اسکول — یہ دیکھو اور دیکھو — خمسہ نظامی — اور یہ رسول اللہ براق پر سوار — جنت کا منظر جبریلؑ شتر سوار جو رہیں —“ جوش کے ساتھ دوسرا ورق — ”یہ — شاہ رخ مرزا کی فرمائش پر معراج نامہ مصور — یہ نوائی کی الجواہر میں رسول اللہ صحابہ اور حضرت بلالؓ۔“

”اور یہ لو — رشید الدین کی جامع التواریخ — انبیاء اور رسول اللہ کے آٹھ پورٹریٹ مع حضرت ابو بکرؓ — سلطان مراد دوسم کا زبدۃ التواریخ — اور سلسلہ نامہ — سولہویں صدی — میوزیم آف ٹرکس آرٹ — استانبول — صفویہ ایران میں اس قسم کی تصویریں بنائی گئیں تو تعجب نہیں — ایران میں آج بھی گھر گھر رسول خدا اور حضرت علیؓ کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مگر عثمانیوں کا ترکی نقاب پوشی کی روایت ترک مصوروں نے شروع کی۔ سلطان احمد اول کا دور۔ خاتنامہ۔ مصور قلندر چغتیس تصاویر ”یہ دیکھو۔ رسول خدا اور حضرت خدیجہؓ کی پہلی ملاقات۔ درمیان میں حضرت جبریلؑ۔“ مسز بیگ نے ٹرکس آرٹ کی ایک اور ضخیم کتاب گھولی — ”چودھویں صدی کے ایک نابینا ترک کی حیات نبویؐ — سلطان مراد سومؒ کے حکم سے مصور کی گئی۔ سنی اسلام کے روحانی پیشوا خلیفۃ المسلمین کے حکم سے۔“

”یعنی علمائے دین اس تصویر کشی کے مخالف نہ تھے۔“ منصور نے کہا۔
 ”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سیر النبیؐ کو ہر عثمانی سلطان کے عہد میں السطریٹ کیا گیا — مراد سومؒ دالی کتاب میں آٹھ سو چودہ تصویریں ہیں — عمل احمد نور بن مصطفیٰ — چھ جلدوں میں — اب تم کو احمد نور کے دو سید خوبصورت MINIATURES دکھلائی ہوں — ’آغاز نبوت‘ — یہ دیکھو — پردیٹ آف اسلام۔ دائیں طرف بی بی خدیجہؓ — بائیں طرف نوح علیؑ۔“

”حضرت علیؓ کے روئے مبارک پر نقاب نہیں ہے۔“ منصور نے رہمارک کیا۔
 ”ان تصویروں کے ڈیکورادر رنگوں کی اپنی سبیلزم ہے۔ یہ تینوں ہاتھ باندھے ایک صف میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیونکہ خدیجہؓ اور علیؓ اولین ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کا نیلا لباس پاکیزگی کی علامت — ”لباس تینوں کے ترکی حضرت علیؓ کا بادہ سبز۔“

”لکھتے ہیں سبز رنگ اس چیز کا مظہر ہے کہ علیؓ بڑے ہو کے قرآن شریف کی MYSTICAL تفسیر کرنے والے ہیں۔ دیپچے کے باہر سنہرے آسمان کے نیچے اڑو کے

گلابی شگوفے عشق الہی کے آغاز کا سہل۔ بادام کی سفید کلیاں حکمتِ قرآن کے KERNEL بہت باریک نکتہ ہے۔۔۔۔۔“ منصور نے کہا۔

”جنت سے آئی ہوئی ندی باہر باغ سے گذر رہی ہے۔ گویا رحمتِ خداوندی۔۔۔۔۔ دیوارِ پتلوار کا نشان انسان کے دل کو اپنی محبت سے گھائل کرنے والی سیف اللہ۔“

”سبحان اللہ!“

”گلابی قالین اور کاسنی دیوار پر ستاروں کے PATTERN مومنوں کی روحیں!۔۔۔۔۔ لکھا ہے قرآن میں معرفتِ الہی کو روشن ستارے سے نشیبہ دی گئی ہے۔

”اب ایک اداس منظر اور اسکی سہلزم۔۔۔۔۔ رسولِ خدا کی وفات۔

”سربانے نقاب پوش فاطمہ۔۔۔۔۔ سر پر شعلہ نور۔۔۔۔۔ سرخ پوشاک انکے خونبار دل کی ترجمان۔۔۔۔۔ آنکھوں پر رومال رکھے علی گریہ فرما رہے ہیں۔ حسن حسین دوزخ و بیٹھے رو رہے ہیں۔۔۔۔۔ در و دیوار پر پر بنے آڑے ترچھے غیر واضح خطوط ماحول کے الم اور دلوں صدمے کے گہرے اثر کی علامت“

”گویا الیکٹریک ڈیکرام کی لکیریں۔۔۔۔۔ کمال ہے۔“ منصور نے متحیر آواز میں کہا۔

”کمرے کے باہر دھندلا آسمان۔۔۔۔۔ دیپچے کے شیشوں پر بارش کی بوندیں آنسوؤں کی طرح بہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔“ منربگ نے کتاب بند کی۔ ”سعدی اور جامی وغیرہ کو اسٹریٹ کرنے کے لئے بھی بے شمار انبیاء کی تصویریں بنائی گئیں۔ ترک، ایرانی اور مغل مصوروں نے مشہور صوفیاء کے پورٹریٹ۔۔۔۔۔“

”امی اب مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟“ عنبریں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مذہبی مصوری اسلامک آرٹ کی غالب روایت نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اسکے خلاف ہے۔ تو بس ختم ہوتی بات۔ چھوڑیے اس قصے کو۔ مسلمان بت شکنی کے لئے بدنام، مگر ایک بار آپ نے خود ہی بتلایا تھا کہ شروع کے عیسائیوں نے بت شکنی کے جوش میسر

یونان دروم کے بہترین مجسمے توڑ ڈالے۔ باز لطیم کے پادریوں نے بہت بڑائی سمجھ کر طے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان پڑھ عوام کو جیزس کے متعلق سمجھانے کے لئے تصویریں بنائیں جائیں۔ مسلمان علماء نے اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ چلیے اب کھانا کھائیں۔“

اماں PAGAN - بیٹی مولون -

ڈنر کے بعد ڈرائیگ روم میں واپس آکر اپنے خود کی تلاش میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ”وہ رہا۔ یوحین کی تحویل میں۔“ مسز بیگ نے بتایا۔
عبر نے بگ شیلف پر رکھے پورٹریٹ کے نزدیک سے سہلیٹ اٹھائی۔
”میری ایک سہیلی تھی۔“ مسز بیگ قریب آکر بولیں۔
منصور نے نقرنی فریم والے دستخط شدہ پورٹریٹ پر نظر ڈالی۔

EUGENE PETERSON, CALCUTTA, 14-9-1928

اطلسی ایوننگ گاؤن۔ نازک صراحی دار گردن میں موتیوں کی طویل دھڑکی مالا۔ تیز روشنی میں جھکتے مصنوعی لہروں والے بال۔ باریک پنپل سے بنائی ہوئی بھنویں۔
”ہولی وڈو؟“

”ٹولی وڈو! یعنی ٹالی گنج۔ کلکتہ!! سفید روسی۔ فلمی نام اندر آدیوی۔ بے چاری خود کو کسی روسی گرینڈ ڈیوک کی اولاد بتاتی تھی۔“

”ANASTASIA SYNDROME.“

”پر تھوئی راج اس کے سپر و سوا کرتے تھے؟“

”پر تھوئی راج۔ ہ راج کپور کے باپ؟“

”بالکل وہی۔“

”آپ تو پٹاری سے ایک سے ایک عجائب و غرائب نکال رہی ہیں۔ اور نہایت۔“

”بس۔ اتنا آج بھر کے لیے کافی ہے۔“

”منگ پلٹ۔؟ منصور نے ٹھٹھک کر ایک قاب کی طرف اشارہ کیا۔
”ہاں لیکن نقلی۔“

خود پہن کر منصور اب ایک منخل کیمپو دیکھنے لگا جو چین پیٹرن کی تصویر اور منگ پلٹ کے درمیان ایک نقلی یونانی مورتی کے سہارے رکھا تھا۔ عندلیب بانو نے بہاد کو لپکا را۔ وہ اندر آکر کافی کے برتن سیٹھنے میں مصروف ہو گیا۔
”یہ تو اور پینل معلوم ہوتا ہے۔“ منصور نے کیمپو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل اصلی۔“

”امی نے آج اس گھر کا پورا کنڈکٹڈ ٹور کر دیا۔“
”بس ہو شیم کا گھر ہے مگر اسکی گھڑیاں ابھی بند نہیں ہوئیں۔“ منسریگ بولیں۔
”اسے اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں؟“
”ضرور۔“

”عاج کی بیضوی سطح پر منقش کسی گمنام تیموریہ شہزادی کا مینا توڑ۔ منصور نے احتیاط سے اٹھایا۔
”اسے دیکھ کر تو وہ کشن گڈھ کی بنی ٹھنی یاد آتی ہے۔“
”آپ آرٹ کڑمک بھی ہیں؟“ عنبریں لے رواں تبصرہ کیا۔
”ہماری صحبت میں رہیے گا ہمارے فضائل کا آپ کو علم ہوگا۔ لیکن منسریگ اسمیں واقعی راجستھانی اسکول کا سا بچ ہے۔“
”شاید کسی جے پوری مصوٰر نے بنائی ہو۔“

”واہ واہ۔ سیاہ کا کلیں۔ آپ رواں کا دوپٹہ۔ جانے کیا کیا زیور۔ آپ کو ان کہنوں کے نام معلوم ہیں؟ بیٹھی قلیان نوش کر رہی ہیں۔ واہ صاحب۔ بڑا نقشے باز نقاش تھا۔ بہت خوب اس قسم کے نوادر کی نقلیں آجکل فائو اسٹار ہوٹلوں کے آرکیٹڈز میں

بھاری قیمتوں پر بکتی ہیں۔ یہ تو اصلی ہے سید بیش قیمت ہوگی۔“
 ”بڑی قیمتی تصویر ہے بیٹے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بہادر یہ ڈبہ لیتے جاؤ۔ کاغذ سمیٹو۔“
 بہادر کیک کا خالی ڈبہ اور برتنوں کی کشتی اٹھا کر باہر چلا گیا۔
 ”کہاں سے خریدی —؟“
 پردوں کی ڈوریاں کھینچتے ہوئے عندلیب بیگ نے سادگی سے جواب دیا: ”یہ میری والدہ مرحومہ کی تصویر ہے۔“

منصور چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر ان بزرگ خاتون کو دیکھا جو دریچے کے پردے برابر کرنے کے بعد اب دیوان کے کنش درست کر رہی تھیں۔ عینبر کا فی ٹیبل پر بکھری اسلامک آرٹ کی کتابیں ترتیب سے رکھنے میں مشغول تھی۔ ایک لحظے کے لئے منصور کو یہ منظر ایک تابو سا لگا۔ تو یہ دونوں شہزادیاں تھیں۔
 اسے وہ بیگم صاحبہ یاد آئیں جنکو پنڈت نہرو نے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے وی۔ آئی۔ پی۔ روم میں قیام کی اجازت دے دی تھی وہ تب سے اپنی اولاد، عملے اور ساز و سامان کے ساتھ وہیں مقیم دوسرے مدعیان وراثت اور حکومت ہند سے مقدمہ لڑ رہی تھیں کہ خود کو واجد علی شاہ کی پڑپوتی بتاتی تھیں۔ امریکن اخباروں میں انکے انٹرویو چھپتے تھے۔
 لیکن عندلیب بیگ کن غیر مرمی طاقتوں سے اپنا مقدمہ لڑ رہی ہیں؟ دفعہ دارہ روئی گرنیڈ ڈیوک کی اولاد یو جین پیٹرسن عرف اندرا دیوی کے مانند نہایت پر اسرار نظر آتیں۔
 اس روز بیل گاڑ دیں ان غربت زدہ و شبیہ دار نے غیرت کے مارے اپنا نام نشان بتانے سے احتراز کیا تھا۔ یہ ماں بیٹیاں دولت مند تھیں لیکن انہوں نے بھی آج تک اپنے رائل کنکشن وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ صاحبزادی شہوار کے برعکس جو اٹھتے بیٹھتے اپنی سابق جاگیکہ افانے — اس نے کمیوکی پشت پر لکھا نام پڑھا — نواب بیگم۔

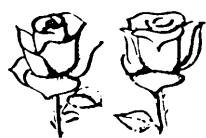
یعنی نواب گلرخ بانو بیگم۔

وہ دل میں مزید خائف اور نادام ہوا۔ اس شام جب مسز بیگ نے اپنی والدہ کا نام گلرخ بانو بیگم بتایا اس نے مذاقاً کہا تھا — ”گویا گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ کھل گیا۔“ بدیمیزی کی بات مہذب ہیں۔ خاموش رہیں۔ میسری چوتھی ملاقات میں انکے ساتھ یہ بے تکلفی! میں ایک ایل۔ ایم۔ سی۔ مولوی کا بیٹا۔ یہ قدیم ارٹو کریٹ — ایسوجہ سے عتبر اتنی بڑی SNOB ہے۔ وہ بھی اس روز والے گمنام نواب صاحب کی گمشدہ دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔

منصور نے کیسیو کو منگ قلاب کے نزدیک احتیاط سے واپس رکھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا خود سر پر جمایا۔ ماں بیٹیوں کو گڈ ٹائیٹ کہہ کر صدر دروازے کی طرف جاتے ہوئے ایک بار پھر مغل کیسیو پر نظر ڈالی — نواب بیگم صاحبہ بک شیلٹ پر اپنی جگہ متمکن تھیں۔ ملکہ حضرت محل کی طرح — پچوان کی مہنل نزاکت سے سنبھالے — یہ فلک کی حقہ بازی۔

نازنین کچ کلاہ کی شیبہ کو پھر غور سے دیکھا۔ اور چونکا۔ کشتی نما کیپ جو دوپلے سے جلی تو لکھنو پہنچ کر — اسے سیلی کا ردائی گفتگو یاد آئی اور وہ بہت حیران ہوا۔ — کہ خیاط فلک کس کی ٹوپی کس کے سر پر رکھنا جاتا ہے۔ سی دوپلے۔







(۴)

سرائے طغرل بیگ

دنوازیگیم و ماہر دیا تو بیگیم دختران مرزا عثمان - غریبی قلعہ مخفی - حضرت شاہجہاں آباد۔

سرائے طغرل بیگ میں مشعلوں کا دھوس اور بارود کا دھواں۔ بھٹیاروں اور بار برداری کے جانوروں کی دہشت زدہ چیخیں۔ ایک زخمی لنگڑا کتا اپنے مردہ آقا کے پاس بیٹھا پنچوں سے زمین کُرید رہا ہے۔ شاید قبر ہونا چاہتا ہے۔ دالان کے ایک گوشے میں ایک دوسرے سے بندھے مردہ مولوی مجاہدین۔ سرائے کے پچھواڑے بنے کے گھونسلوں کی طرح درختوں سے لٹکتے مزید مقتول مجاہدین۔ رات جب بھکڑ چلا وہ لاشیں گول گول گھومنے لگیں۔ تلنگوں کی کمپنی ان کو بتیاں سمجھ کر بہت ڈری۔ اندر سرائے میں سرشام بھیروناچ گیا۔ پھر وہ اپنے بیل پر بیٹھ کر دوسرے شمشاؤں کی سمت نکل گیا۔ جن کے مردوں کی راکھ اپنے انگ پر مل کر سما دھی لگائے گا۔ زبر لگاؤ تو تھو۔ لاش۔ زیر لگاؤ تو تھو۔ ابدی مسرت۔

دین! دین! چلا کر لڑنے والوں کو گورے خاکیتوں نے جام شہادت پلایا۔ اب وہ گورے کسی MESS کی بار پر بیٹھے وکٹوریہ کا جام صحت نوش کر رہے ہیں جواب کوئین ایمپریس اف انڈیا ہے ہون سن شہزادوں کے بریدہ سر حضرت بادشاہ کو پیش کر چکا۔ سرائے طغرل بیگ میں صرف چند جاندار باقی ہیں۔ ایک وہ گھائل کتا جو مسلسل رو رہا ہے۔ ایک زخمی بھشتی جو کٹڑے کی بھسک کھسک کر نیم جاں مولویوں کو پانی پلا رہا تھا۔ (چند منٹ قبل وہ بھی مر گیا) او ایک سردنور میں چھپی دو بچیاں۔ تنور کے گرد ان کا کنبہ لاشوں کی صورت میں موجود ہے۔ ماں باپ جوان بھائی چچا۔ ماموں۔ سب۔

وہ خانم کے بازار سے نکل کر آگرے کی طرف بھاگ رہے تھے سرائے طغرل بیگ میں تنگنوں اور خاکبوں نے آلیا جنگل میں چھپے مجاہدوں نے چار پانچ لال منہ والے ٹھنڈے کیے گوروں نے سب کو بھون ڈالا۔ دو بچیاں اس سردنور کے اندر چھپ گئی تھیں۔ وہ بلک بلک کر روتی، ماں باپ اور بھائیوں کے لاشے بھانک کر دکھتیں اور پھر چغیں مار کر سر اندر کر لیتیں۔ اونٹ بیل خچر سرائے سے بھاگ نکلے تھے۔ ایک روز ناہوا لنگڑا کتا باقی تھا اور دو لڑکیاں۔ حسین گوری جٹی مغل زادیاں۔

روتے روتے ہلکان ہو گئیں۔ بھوک سنانے لگی۔ بڑی نے چھوٹی سے کہا — ”چھوٹو۔ میں کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈتی ہوں تینور سے اچکی۔ چاروں طرف مُردے۔ ہیبت زدہ ہو کر پھر سر جھپا لیا۔ چند منٹ بعد ہمت کر کے باہر کودی۔ سلاطینوں کا زاردارہ تنگے لوٹ کرے جا چکے تھے۔ بھٹیاریں غائب۔ شاید ڈاکین بن کر سامنے پیپلوں پر جا بیٹھیں۔ چولہے سرد۔ پونم کا چاند بھانسیوں والے درخت کے عین اوپر نحوست سے چمک رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتا ساٹا۔

اچانک سیلوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹناہٹ۔ باہر ایک رتھ آں کر رکا۔ زنا نہ ہنسی کی آواز جو اس ہولناک رات میں کسی چڑیل کا تہقہ معلوم ہوئی۔ پچانگ جھکڑ کی وجہ سے آپسے آپ بند ہو گیا تھا۔ درز میں سے ہری کین لالینوں کی روشنی اندرائی۔ عورت پھر ہنسی۔ بڑی لڑکی کی ذرا ہمت بندھی۔ ”چل مہر۔ چل کر دکھیں۔“ چھ سالہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنور سے باہر کھینچا۔ گود میں اٹھا کر لاشیں پھلانگتی پچانگ کی طرف چلی۔ کواڑ ذرا سا کھول کر دیکھا ایک گوری دیسی عورت نظر آئی۔ کشمیری شال میں لپیٹ۔ رتھ کا پردہ ہٹا کر ایک مونچھیل بلم بردار سے بات کر رہی تھی۔ پیچھے دو بیل گاڑیوں پر چھو لہاری اور نوکر چاکر۔ دیکھتے دیکھتے بیرونی چبوترے پر جھاڑو دی گئی۔ دسترخوان بچھا۔ کُسن چُنے گئے۔ سنا ہے جس طرح حضرات میں نظر آتا ہے — پہلے بھشتی چھڑکاؤ کرتا ہے پھر شاہ جنات کا تخت۔ ایک وردی پوش ملازم نے ٹفن باسکٹ کھولی۔ ٹفن کے بند ڈبے۔ ڈبل روٹیاں۔

بوتلیں بھری۔ چمچے۔ ماچس سے انکٹھی سلگائی گئی۔ جتھ بھرا گیا۔ چاند کی روشنی میں وہ حینہ رتھ سے اتری۔ بھاری پشتواز۔ ناک میں بلاق بٹھمک بٹھمک چلتی، آن کر گدیے پر بیٹھ گئی۔ کھانا شروع کیا۔ پل کی پل میں بھیروکا شمشان اندر کے اکھاڑے میں تبدیل ہوا۔ نوعمر لڑکی بچی کو گود میں اٹھائے پھانک سے نکل کر ڈرمی ڈرمی چوترے کے نیچے پہنچی۔ اوپر دیکھا۔ اور التجا کی —

”اللہ کے واسطے کچھ ہمیں بھی دو۔ بڑی بھوک لگی ہے“

حینہ نے ایک فرنگی ڈبہ اس کی طرف پھینک دیا۔ بھگدڑ کا زمانہ۔ ہر طرف بھکاریوں اور بھوکوں ننگوں کی مہبتات تھی۔
”اس میں کیا ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”کھالے خنزیر نہیں ہے۔ ہم بھی مسلمان لوگ ہیں“ ایک سُرخ مونچھ والے آدمی نے جواب دیا۔ اور غور سے لڑکی پر نظر ڈالی۔ ”اوپر آجا۔ تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ تیرے ساتھ والے کہاں ہیں؟“

”اندر سرائے میں“

”یہ سرائے ہے یا بھوتوں کا ڈیرا۔ سننا پڑا ہے“

”سب سنا جو رہے ہیں۔ گھوڑے بیچ کر“ لڑکی نے سراٹھا کر جواب دیا۔ رتھ پر لہراتے فرنگی سیرق پر نگاہ پڑی۔ سن ہی رہ گئی۔ چند گھنٹے قبل بالکل ایسا جھنڈا سنبھالے گوروں نے دھاوا بولا تھا۔ وہ بچی کو اٹھائے اٹھائے پھر پھانک کی طرف مڑی۔ بچی نے فرنگی ڈبہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ”آپا — آپا — بھوک۔ اس نے نحیف آواز میں فریاد کی۔

بڑی بہن نے سُرخ کوٹ اور اونچی سیاہ ٹوپیاں ڈانٹے تلنگوں کو اپنی طرف تانکتے پایا۔ لڑکھڑا کر بچی سمیت چوترے کی سیڑھی پر گر پڑی۔

ایک کالکتا زمین سونگھتا جنگل سے نمودار ہوا۔ گھاس پہ بکھری مٹن چاپ کی ہڈیوں پر لپکا۔ ایک اردلی نے اسے ستھر مارا۔ وہ چپیں چپیں کرتا تارکی میں غائب ہو گیا۔

پوربیا رتھبان چو ترے کے کنارے سہما بیٹھا تھا۔ وہ چلا آیا۔ ”دیارے دیا۔ گجب کر
دہین کھان صاحب۔ کاجا نہیں بھیر وکالتا ہو۔ اڈکا مار بھگائین۔“

”ابے تیرے بھیر و جی تو کو کہتا ہے بیل پہ سواری کرتے ہیں۔“ سرخ مونچھوں والا
چچک رو آدمی بولا۔ وہ کتنا لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔

”چودھری۔ امی دوسرے بھیر و ہوں۔ سنکر بھگوان کے سیوک۔ جہاں انیا چار ہوا نیاتے
ہوا اپنے کالے کتے پہ سوار ترنت ہواں پہنچ جات ہیں۔“

”ابے گھاٹر اتنا اتیا چار تو سو چکا اب تلک کیوں نہ آتے۔“ طویل القامت چودھری
نے جواب دیا۔

”کو دن پوربیا نہیں تو۔“ مہ جیس بھیر ہنسی۔

ہری کین لالٹین بدھم پڑ رہی تھی۔ مشعلیں روشن کی گئیں۔

دیوار کے نیچے ایک بچو نے آنکھیں چمکاتیں۔ لڑکی نے سنبھل کر بچی کو گود سے اُتارا۔
انکے گھٹنوں سے لیٹ گئی۔

اب ایک سپاہی حسینہ سے مخاطب ہوا۔ ”راستے میں کپتان ٹنکر کے گوبندے نے
خبر دی تھی کہ طفل بیگ کی سرکا مورچہ جیت لیا۔ سب کا صفایا ہو گیا۔ تو یہ چھوکر یاں کیا
آسمان سے ٹپک پڑیں؟“

”چڑیلیں ہیں گی۔“ تندو نے اظہار خیال کیا۔ ”چودھری جی ہاتھ جوڑیں۔ پڑاؤ کرنا ہے
تو چلو اگلے گاؤں۔“

”چپ احمق بیٹھا پڑا ہے جارہا ہے۔ یہاں اب بھی باغی چھپے ہوئے ہیں تجھے چڑیلیں
نظر آرہی ہیں۔“ ایک سپاہی نے بند و ق کندھے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ حسینہ گھبرا کر
اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو پیادے رفل تان پھانگ کی طرف بڑھے۔ ایک نے ہوا میں فائیر کیا پھوٹا
بچی بہن سے پیٹ کر چینی۔ بڑی کے مغل خون نے جوش مارا۔ خشتناک ہو کر گرجی۔ ”یہ مردوں
کی سرائے ہے مردہ خورو۔“ اندر جا کر لاشوں پر گولیاں چلاؤ۔ کُتو۔ سیزبد کے بیٹو۔“
سپاہی سرائے کا ایک چکر لگا کر ذرا نادام سے واپس آئے۔ پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ سرخ

”موتھ والا چوتھرے کے کنارے بیٹھا زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کر لٹکا را —
 ”عقل کے دشمنو۔ سارے مورچے جیتے گئے۔ دلی فتح ہو چکی۔ اب مردوں سے لڑنے کا کیا فائدہ
 پھر اس نے جبینہ کو ڈانٹا۔ ”اری تو کیوں گھبرا گئی۔ مٹی۔ آرام سے بیٹھ۔ — رب کا
 شکر ادا کر کوئی قافلہ آتے کوئی جائے تو اپنے لیے مرغ مسلم لکھوا کر لائی ہے۔ ذرا اس لونڈیا کو
 دیکھ۔ جنگل بیابان آدھی رات ہو کا عالم اور یہ مصیبت کی ماری، لاشوں میں گھری تجھ سے
 دونوں کی بھیک مانگ رہی ہے۔ ساتھ ایک ننھی سی جان — آجا بیٹی — دونوں اوپر
 آجاؤ — شاباش — اس نے ہاتھ کا سہارا دیکر دونوں بہنوں کو چوتھرے پر کھینچ لیا۔ مٹی
 نے ایک پلیٹ اس کی طرف سرکادی۔ سرخ موتھ پھر چوتھرے کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور فلسفیانہ
 انداز میں آہستہ آہستہ بولا۔ ”خوب کہا بہت خوب! مردوں کی سرائے — لاشوں کے
 قافلے ایک دروازے سے آتے ہیں۔ دوسرے سے غائب ہیں۔ بیچ میں جو ہے سو نظر بندی
 — لیکن بھٹیاریں کو دیکھو! کراتے کے لئے مٹیوں سے جھگڑتی ہے۔“ پھر اس نے بڑی
 لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”بیٹی۔ ڈرمت۔ جب نلک میں زندہ ہوں تم دونوں کا بال بیکانہیں
 ہونے دو لگا — لو پانی پیو۔“ اس نے فلاسک سے پانی انڈیلا۔ دونوں سہیت زدہ
 لڑکیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ مشعلوں کی روشنی میں وہ علاؤ الدین کے
 چراغ سے نمودار ہونے والا جن سالک رہا تھا۔ سرخ موتھ نہیں سرخ چہرہ۔ کانوں میں منڈیاں
 کشمی رنگ کا بڑا سا پگڑ۔ پیازی اور سفید دھاری دار چونہ۔ عمر و عیار کی داستانوں والا جینی
 تورانی جن۔ ناک نقشہ مٹی نامی اس پری چہرہ جیسا۔ گوجیک نے صورت بگاڑ دی تھی۔ وہ جتنی
 مغرور اور سچ معلوم ہوتی تھی وہ اتنا ہی درد مند اور شفیق۔ عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔ درویشوں
 جیسی —

چھوٹی بچی نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ دونوں بھوک سے نڈھال تھیں لیکن
 بڑی بہن نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ کیا پتہ دقتی یہ پری روجنا تھی ہو۔ اور یہ سرخ
 فام شخص جنات۔ لیکن وہ تو بڑی نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ”بسم اللہ کرو بیٹی۔ کھاؤ۔ کیا اتنا پڑی
 یہاں کیسے آئے تم بد بخت لوگ۔“

”کل رات شہر سے بھاگے اس سرزمین آن کر چھپے تھے مرزا بھوڑے کے ساتھ۔“
 ”مرزا بھوڑے کی کون ہو؟“ چکن روسٹ کی ٹانگ چباتے ہوئے مٹی نے پوچھا۔

”اکا انکے عرض یگی تھے رانی صاحب۔“

’رانی صاحب‘ پر ’مٹی‘ مسکرائی۔ ننھی مہر و بڑی رغبت سے ڈبوں والی فرنگی نعتیں
 چکھنے میں جُٹ چکی تھی۔

دلنواز حیرت سے اس بدرمیں کو دیکھا کی۔ لال چوہلی میں جہاں پناہ ہوئی دیوالی دسہرہ
 رکشا بندھن مناتے تھے رجاؤں کی دانیوں کی آرتی کی تھالیاں لیے چھم چھم کرتی دیوان خاص
 میں آتی تھیں۔ اس نے تو کینچنیوں کو بھی دور سے دیکھ رکھا تھا۔ جب قلعے میں مجرے ہوتے
 تھے اور اکا انکا ذکر کرتے تھے۔ جیسے بوسٹ چونے والی۔ مگر اس شاندار حسینہ کو کوئی چوڑے
 والی کہے گا؟ یہ قوم اجتہ سے بھی نہیں تھیں قطعی رانی تھیں۔ ادھی رات کو لاؤشکر سمیت سفر میں
 بے خطر مصروف۔

ورنہ تُوڑ۔ آسمان سے من و سلوے لیے اتر آئیں۔

”کھاؤ نامیری پتی۔“ سترخ مونچھ نے دوبارہ بڑی شفقت سے کہا۔ ”میرا نام
 چودھری فتح محمد ہے۔ یہ میری بہن ہے مٹی ڈرومت۔“

ایک سیاہ فام تنگ دلنواز کی ڈانٹ سے جلا بھٹا کھڑا تھا۔ بندوق کی نالی اکی طرف
 کر کے اسے تنگ کرنے کے لیے بولا۔ ”تھوڑے جھٹ پٹ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

دلنواز مہر و کے اوپر جھک گئی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی ”میری بہن کو نہ مارنا۔ مجھے
 مار دے۔ چل۔ چلا گولی۔ چلانا بکار۔“ وہ ہیجانی آواز میں رونے چلانے لگی۔
 مہر و نے اسکا ساتھ دیا چودھری نے اُٹھ کر تنگے کا گلا دیا۔ ”بدمعاش تیرا کوڑا مارشل نہ
 کر داول تو میرا نام بدل دینا۔“

”چھوڑ دیو چودھری۔“ رکھ بان نے التجا کی۔ ”ای کا لاپانی چڑھائے ہن۔ کپتان رنکر
 کا سموچہ رسالہ ناچت رہا۔ اکی دلی ہو جیت لیہیں۔ انہیں کے سنگ اکی ہو ملڑ مچاوت ہے۔“
 دوا دلی تنگے کو کپڑا دکھا کر پرے لگتے۔ چودھری دسترخوان پر واپس آیا۔

”تو بہ یہ چھو کر یاں تو دو بال جان ہو گئیں، مٹی نے منہ بنا کر کہا۔

”چپ رہ مٹی، سن بیٹی، کیا نام ہے تیرا —؟“

”دنواز بانو بیگم —“

”ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔ دنواز بیٹی، تو سیانی ہے گھرا مت۔ کسی کی مجال نہیں جو تجھے ٹھہری
آنکھ سے دیکھے۔ سن۔ میں چودھری فتنے کہلاتا ہوں۔ چودھری فتح محمد۔ بڑے بڑے بد معاش
مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میری اماں اللہ بخشے چودھراتین کی گدی سنبھال چکا تھیں مٹی میری
ہمیشہ ہے۔ ہم لوگ کرنل ہیئرٹ کے ساتھ بھرت پور گئے ہوئے تھے۔ کرنل صاحب مٹی پر
بہت مہربان ہیں۔ نہیں سمجھی؟“

”جی نہیں۔“

”سن لڑکی۔ یہ میدان حشر ہے۔ سارا ہندوستان میدان حشر ہے۔ جہاں سر چھپانے کو
جگہ مل جائے غنیمت جان۔ رب کریم رنگارنگ سیلوں سے اپنے بندوں کو رزق پہنچاتا ہے
ہمارے لئے بھی وسیلے اس نے مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم راضی بردشا ہیں۔ اس زندگی کو چھوڑ
نہیں سکتے۔ کہاں جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دھاڑی اتارا۔ ہم سب کو اپنے اپنے لکھے
پورے کرنے ہیں۔ دانے دانے پر مہر ہے۔“

دنواز کے لئے کچھ نہ پڑا۔

”ہمارا ٹبر رنگیلے کے زمانے میں کشمیر سے دلی آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ کشت و خون
انوکھی بات نہیں۔ کشمیر میں بھوک بہت تھی اور قتل و خون بھی۔ شاہجہاں آباد پہنچ کر پیٹ
تو بھرے ارے تو انک بھوک کیوں بیٹھی ہے؟“

دنواز نے ڈرتے ڈرتے ایک مٹن چاب اٹھائی۔

”آرام سے کھا۔ ابھی فرنگیوں نے تیرے گنبے کو تہ تیغ کیا ابھی تو انکی دی ہوئی رزق۔“
دنواز نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”ہاتھ کھینچنے سے کچھ نہ ہونے کا بچی۔ فرنگی کا بخشا ہوا آب و دانہ اب ہم سب کا مقدر
ہے۔“ چودھری نے ایک لقمہ بنا کر چھوٹی بچی کے منہ میں دیا۔ اس نے جہاں لی پوٹہ ترہوا تو

مہر کو فوراً نیندا آگئی۔ چودھری نے بڑے اصرار سے دنواز کو کھانا کھلایا۔ ”اچھا تو نے منوڑی کشمیرن کا نام تو سنا ہوگا۔ کئی سلاطینوں سے منی کی یاد اللہ تھی۔“
 دلی فتح ہو چکی۔ سلاطین بھی صیغہ ماضی میں شامل ہوئے۔ اس لفظ پر دنواز پھر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ مرزا بھوڑے، انکا خاندان، اپنا کنبہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اور وہ سب چند قدم کے فاصلے پر اس وحشت سرا میں مرے پڑے تھے اور وہ اسی جگہ بیٹھی ولایتی کھانا اڑا رہی تھی۔ اس نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی۔

چاند غروب ہو چکا تھا۔ زور سے ہوا چلی۔ پچھلے جنگل میں پیڑوں سے لٹکتے نیچرے چڑھتے گیدڑ بولے۔ چند دل چلاتے ہوئے اوپر سے گزرے۔ دونوں بہنیں منوڑی کشمیرن کے نزدیک گدیوں پر غافل سو رہی تھیں۔ صبح سویرے کو انکو ہار سے منوڑی کی آنکھ کھلی تو دیکھا روشن آسمان پر گدھ اور چلیں اور کوئے منڈلا رہے ہیں وہل کر اپنے بڑے بھائی کو پکارا۔ چودھری ایک طرف کو بیٹھا وظایف میں مشغول تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے بھی اوپر دیکھا اور فوراً عملے کو آواز دی۔ ”بندوبست۔ ایکدم کوٹیک مارچ۔۔۔“

تندو سبیلوں کو چارہ کھلانے کے بعد اب خود جینا کر رہا تھا۔ نوکر چاکر اور سپاہی گڑھیا کے کنارے ہواک میں مصروف تھے۔ فوجی حکم سنتے ہی جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگے۔ چودھری فتح محمد نے بہن کے قریب آکر اس کے کان میں کہا۔ ”منی دیکھنا بچیاں نہ جاگ جائیں چیلوں اور گدھوں کو دیکھ کر انکا دم نکل جائے گا۔“ انگلی کے اشارے سے عملے کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ کرنل ہیٹرٹ کے کیا ونڈ کے ملازم چودھری کو مذاقار سالدار صاحب پکارا کرتے تھے۔ کہنے والے یوں بھی کہتے تھے کہ چودھری فتح محمد نے اگر دھاڑی کا جہنم نہ لیا ہوتا تو یقیناً کوئی بڑا آدمی بنتا۔ سپہ سالار طویا کیف الملوکی کے زمانے میں کسی ریاست کا بانی یا مدبر وزیر یا صاحب علم و فضل لیکن قسمت میں بدلتھا کہ پہلے بہن کے پیچھے بیٹھ کر سارنگی بجائے اور اب چاؤڑی دایوں کے معاملات کا تصفیہ کیا کرے۔ اگلے ماں اصغری کی لازڈلیک کے انگریز افسروں سے راہ درسم رہی تھی۔ بہن منوڑی عرف منی

عرصے سے سفر و حضر میں کرنل جارج ہیئرٹ کے ساتھ رہتی تھی اسکے بڑے بھائی کی حیثیت سے چودھری کو کرنل کا تقرب حاصل تھا۔ اس اعلیٰ افسر کا ذاتی اسٹاف اس سے ڈرتا تھا۔ لیکن چودھری بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ خدا ترس اور دلیسر — اماں اپنے بیٹے کی شادی دستور کے مطابق برادری کی ایک لڑکی سے کر گئی تھیں۔ وہ نیک بخت اپنی لڑکیوں سمیت طاعون کا شکار ہوئی۔

دعائیں مانگتا کہ پروردگار عالم منواری کو ایک چاندی بچی عنایت کرے تاکہ اس قدیم ڈیرے دار گھرانے کی نسل معدوم نہ ہو۔ مگر خدا کی مرضی کہ منواری لاؤں ہی رہیں۔ شاید یہ بھی اچھا ہوا۔ کرنل باپ ہونا تو وہ لڑکے کو کر شان بنا کر کلکتے کے یوریشین ہتیم خانے میں ڈال دیتا۔ وہ غریب دوسرے دو غلے چھو کروں کے ساتھ فوجی ہینڈ بجاتے عمر گزار دیتا۔ لڑکی جان بازار کلکتہ کی یوریشین لال بی بی کہلاتی۔ خود کو میم بھتی ماں اور ماموں کو مٹہ نہ لگاتی۔

کوئچ کے انتظامات کا جائزہ لیتا چودھری چھو لدا ریوں کی بیل گاڑی کی طرف گیا۔ میخیں گاڑنے اور چولہے کھودنے کے کدال اور پھاوڑے نکالے۔ دو آدمیوں کو حکم دیا فوراً سرائے کے عقبی جنگل میں گنج شہیدان تیار کریں۔ ایک لٹھ بند کونزدیک کے گاؤں دوڑایا کہ چند کلمہ گو مدد کے لئے پکڑ لائے۔ ایک ناشتہ دان بھرا اور بھالگنا سوا بہن کے پاس واپس آیا۔ لڑکیاں اب بھی بے مددھ سو رہی تھیں آہستہ سے بولا۔ ”مُو تُو اللہ کا نام لے کر گھر جا — میں شہیدوں کو دفن کر کے ہی دلی پہنچوں گا — کوئی شکر م مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ پیدل — اگر زندہ سلامت نہیں پہنچا تو کہاں سماعت کیجو اور ان دکھیاری بچیوں کا زندگی بھر خیال رکھو — فی امان اللہ“

منواری کی مدد سے دونوں خوابیدہ لڑکیوں کو رتھ پر چڑھایا۔ منواری کو میدان جنگ فتح و شکست کی خونریزی اور پُر خطر حالات میں فوجوں کے ہمراہ طویل فاصلے طے کرنے کی

عادت تھی۔ اس نے لڑکیوں کو رتھ کے غالیچے پر لٹایا۔ خود شوازمیٹ کر بیٹھی۔

نندو نے ہم بھولا کا نعرہ لگا کر سیلوں کو چابک رسید کیا۔

چودھری فتنے سر جھکاتے پگڑی کے شملے سے مونچھیں پونچھتا سرائے طفلر بیگ
کی طرف لوٹا۔

قافلہ روانہ ہوا۔

آگے آگے کمپنی کا پرچم لہراتا رتھ۔ چڑھتے سورج کی کرنیں رتھ کے سنہرے کلس سے
ٹکراتیں تو وہ جگمگا اٹھا۔ نندو نے رفتار تیز کی۔ برطانوی پرچم صبح کے خوشگوار جھونکوں میں
پھٹھٹانے لگا۔ گا ہے بگا ہے جلی ہوئی لاشوں کی سٹرانڈ سیم سحر میں مل جاتی۔

رتھ میں جتنے سپاہیل، جیسے ہم راج کے کالے بھینے، چھن چھن کرتے خراب آباد
دہلی کی سمت دوڑنے لگے۔





(۵)

تختِ روان

دارالسرور رام پور۔ بینظیر کامیلہ ۱۸۸۱ء۔ حضرت امیر مینائی نے فرمایا ہے
امیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور۔ خبر ہے میلے میں اس مہ لقا کے آنے کی
مئیہ شکوہ آبادی اور جلال لکھنوی اس جشن جانفرا کے متعلق شنویاں لکھ رہے ہیں
جان صاحب بولے بدر منیر پھر پوٹا میلہ ہے جشن کا۔ پھر بینظیر باغ میں میلہ ہے جشن کا

نواب مرزا داغ دہلوی نے مثنیٰ بانی حجاب کو کلکتہ اطلاع بھیجی۔
آگیا بے نظیر کامیلہ۔ دل پابند وضع کھل کھیل
میلے والوں میں دھوم تھی میری۔ خوش جمالوں میں دھوم تھی میری

اخبار صولت پرویزی مراد آباد کا اڈیٹر رقم طراز ہے۔

”خوش جمالوں کے پرے نہر پر جمع ہیں مجبوروں پر سیر کر رہے ہیں۔

بہر غیرت ناہید کی پری تائیں اندر کے اکھاڑے کا سماں باندھ رہی ہیں فیسوں ساز آتش بازی
سے متور باغات میں خیال کے انار ٹھمری کی پھلجھڑیاں دادر سے کی ہوائی ٹکریز ہواؤں کے
ہمدوش در جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے۔

حضور نواب کلب علی خاں بہادر دام افشا کے مہمانان گرامی میں مہاراجہ ہو لکر آف
اندور، مہاراجہ ڈگ بچے سنگھ آف بلرام پور (اودھ) اور ہربائی نس نواب صاحب
سہراب نگر رامپور میں ہنوز تشریف فرما ہیں۔

”کل رات یکتائے روزگار مودھو طبعی کی سنگت میں (قدر پیا) کی ایک بندش (ہٹو چھڑو
نہ موری نیند اچٹ جات) دلی کی بی دلتواز اس شوخ و شیریں کار شہر آشوب نے
اس ادائے دلبری سے ادا کی کہ دریا بدل نواب صاحب سہراب نگر نے مالا مرادید کی

اپنے گلوئے مبارک سے اتار کر فی الفور بی صاحبہ کو عطا کی۔ دو سالہ مودھو پیلچی کو عنایت فرمایا۔
 کیوں نہ ہو۔ رع جبے پکھا دوج میں دھوم مودھو کی
 ”راپور دربار کی جادسی، جھوسن اور بی مئی کلکتے کی بی تھی، لکھنؤ والی مشاعرہ خوش نوا
 ہنگین جان، دلی کی امیر جان میلے میں جلوہ آراہیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ اس سال اس جشن دل
 افروز کی جان بی دنواز ہی ہیں کہ بحیثیت جانشین منوری کشمیر اپنی خالہ کا نام منور کر رہی۔
 ہیں میلے کے ٹھیسٹریں ”کوہ قاف کی پرسی“ بنی ہیں۔“

گاؤ تیکے سے ٹیک لگائے دنواز بغور سن رہی تھیں۔ چودھری فتنہ ملاج کے نزدیک
 بیٹھے پان بنانے میں مصروف تھے۔ کشتی نہر کے کنارے روشن گیس لیمپ کے نیچے رکی ہوئی تھی
 نیند کی ماتی مہرو نے اخبار ہاتھ سے لکھ کر جمائی لی ”آگے چلو“ دنواز نے ملاج کو حکم دیا۔
 بجرا چل پڑا۔ اگلے لیمپ کے نیچے پہنچ کر پھر رکا۔ مہرو نے اخبار اٹھایا۔

”ناظرین باتمکین۔ آج کی بات معلوم ہوتی ہے۔ عذر کو فرو ہوئے محض آٹھ سال
 ہوئے تھے نواب یوسف علی خاں تاظم نے دلی کی پھول دالوں کی سیر کی تقلید میں اس فرح
 بخش میلے کی بنا ڈالی۔ مرحوم دربار مغلیہ کی شان و شوکت کو اپنے دربار گہر بار کے آداب و
 رسوم کے ذریعے دوبارہ زندہ کیا۔ جات عالم کے دور تعیش کی تجدید فرمائی۔ دلی اُجڑ چکی۔
 لکھنؤ مٹ گیا۔ مگر خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آفتاب برطانیہ کی ضیا پاشی کی بدولت
 راپور اور دیگر نیٹور ریاستوں کی رونق ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ فلاکت زدہ شعراء، علماء و فضلاء
 اہل صنعت و حرفت، باکمال گویے اور رقاصائیں قدر شناس والیان ریاست کی سرپرستی
 اور جو دستا سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ فی الوقت سات مہینوں کی گرامی گویے اور نت کار
 راپور دربار میں ملازم ہیں۔ ہمارا کار سپانڈنٹ مقیم راپور کو کسی ندی کے پار
 سے رقم طراز ہے کہ حضور نواب صاحب یوسف علی خان جت مکانی نے شاہان مغلیہ کی تقلید
 میں جو ”محکمہ ارباب نشاط“ قائم کیا تھا وہ بھی دن دوئی رات چوگنی تر تری کر رہا ہے۔ نواب
 مرحوم کے عہد حکومت میں اس محکمے کی افسر اعلیٰ داروغہ محبوب جان خود ایک بلند پایہ

مغینہ تھیں۔ بتایہ ہونے کے بعد نواب صاحب مرحوم کے ہمراہ حج کر آئی تھیں۔ شہر رامپور میں ایک وسیع مسجد انھوں نے تعمیر کروائی۔“

”مٹی بھی چاہتی تھی کہ کوئی کار خیر کر جائے۔ افسوس۔ بے وقت موت نے مہلت نہ دی۔“
چودھری فتنے نے مضمون سنتے سنتے آہ سرد بھری۔ ”آگے پڑھو بیٹی مہر۔“

”بس ماموں جی۔ اتنی کم روشنی میں سمجھائی نہیں دیتا سر میں درد ہونے لگا۔“
بحرا جگمگاتی تہرکا چکر لگاتا رہا۔ کچھ دیر بعد دلنواز نے کہا ”ماموں جی — یقین نہیں آتا — انہی آنکھوں نے پھانسیوں کے کھڑکھڑاتے جنگل دیکھے۔“

”ان نینوں کے یہی پر کیے۔“ چودھری نے جواب دیا۔

”دکھیا رابا دشاہ رنگون میں بور یہ نشین رہا۔“

”چپ“

نواب کے مہمان انگریزوں میموں سے لدی ایک کشتی پاس سے گزر رہی تھی۔
دلنواز نے پروا نہ کی کہتی رہیں۔ ”فرزند دلبند دولت انگلشیہ مزے اڑا رہے ہیں۔“
جآن عالم کے دور تعیش کی تجدید — !!“

”کہ عالم دوبارہ نیست۔“ چودھری فتنے نے مختصر اُگھا۔

”سبھی مزے کر رہے ہیں سوا ان کے جو کاتے پانی میں قید ہیں یا جن کے عزیز دار پر لنگ گئے۔ ہم بھی تو عیش کر رہے ہیں۔ اپنے پیاروں کو بے گور و کفن چھوڑ کر۔“ مہر بولی
”اگر ماموں جی نے اپنی جان پہ کھیل کر انکی تدفین نہ کی ہوتی۔“

بحرا کنارے پر پہنچ گیا۔ نواب صاحب شہر اب نگر کی معتمد خاص خان پری لیمپ کے نیچے منتظر تھی۔ دلنواز کلی دار پاٹھان کے پاتینچے سنبھال کر کنارے پر اتریں۔

”بی صاحبہ۔“ خان پری نے قریب آن کر سرگوشی کی۔ ”سہرا کل صبح واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ سے قطعی جواب طلب فرمایا ہے۔“

دلنواز چپکے کھڑی رہیں۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

خان بری فوراً میلے کی بھیسٹیں غائب ہو گئی۔ دلتواز اور مہر و فینس میں بیٹھیں۔

”یہ کیا آیا۔ تم نے تو تھیلی پر سرسوں جمالی۔“

”نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ مجھے تو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا۔ بائیس سال ذلت کی زندگی بسر کرنے کے بعد اللہ مجھے عزت بخش رہا ہے۔“

”اماں متوڑی زندہ ہوتیں کبھی یہ رائے نہ دیتیں۔ سنا ہے کہ یہ نواب لوگ جس حرم سے خفا ہوتے ہیں اسے کوئے بکنی بنا دیتے ہیں۔“

دلتواز نے باہر جھانکا چند دالیان ریاست فٹنوں میں سوار ہو رہے تھے۔

”ان موڈوں کو دنیا جہان میں اور کسی بات سے غرض نہیں۔ ہر وقت ایک ہی دھن
— عورت — عورت — توبہ — مہرو نے منہ بنایا۔“

”ابھی تم پڑھ تو رہی تھیں۔ برطانیہ سر یہ سلامت ہے اخبار چنی لکھتا ہے۔ پہلے ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کر لیا کرتے تھے اب اس سے بھی فرصت۔“

”تمہارے والے بھی ایسے ہی ثابت ہوں گے اور کوئی نظر میں سمائی اور تمہارا بیٹہ کٹا۔“
”مہرو، متوڑی، وہ گرگ باراں دیدہ، بھی یہی کہتیں۔ اصل وارث تو ان کی تم ہو

میں اس منصب کے لائق نہیں۔“

”مگر آیا۔ ہفتہ دس روزی صاحب سلامت اور بڑھتے تم کو نکاح کا پیغام
”مہرو نواب صاحب بڑے نیک نام رئیس ہیں۔ پابند شرع و دیگمات محل میں

موجود ہیں۔ تیسری میں ہوں گی۔ اپنے مذہب کے مطابق متوعات تک تو رکھتے نہیں۔“

”پردے میں دم بخت ہو جاؤ گی ساری عمر کے لئے۔ اور چوتھی جو آگئی تو۔“

”منظور۔ اب مجھ سے رئیسوں کے سامنے کھڑے ہو کر مبارکبادیاں نہیں گائی جاتیں

بہت ہولیا۔ بائیس برس۔“

متوڑی کشمیر نگوڑی ناٹھی مرے۔ منہ بولی بیٹی دلتواز کو اپنی جائیداد کشمیر کا

وارث قرار دے گئی تھیں۔ ان کا اور ان کی ماں اصغر کی واسطہ زیادہ تر فرنگی فوجی

افسروں سے رہا تھا۔ چاؤڑی میں اصغر کشمیرن کی طرح منوڑی بھی برادری کی چودھراتن بن چکی تھیں۔ سرخ مونچھوں والے رواقی برادر بزرگ تھے دھاڑیوں کے سردار کی حیثیت سے عرصے سے چودھری فتح محمد کہلا رہے تھے۔ دنوازا اور مہرو کی اسی شفقت سے نگرانی کرتے تھے جس شفقت اور دلسوزی سے انھوں نے سرائے طفول بیگ کی اس ہولناک رات ان بہنوں کی دستگیری کی تھی۔ چاؤڑی میں ماموں جی کہلانے لگے تھے کہ دنوازا اور تہر دانھیں ماموں جی کہتی تھیں۔

دنوازا بھی منوڑی کی طرح ٹھاٹھ باٹ سے سفر کرتیں۔ اب پہلی اور تھکے بجائے آگ کاڑیاں چل رہی تھیں۔ نامہ بر کو تر رٹیاں تیر ہو کر ٹیلی گراف کے تاروں پر جا بیٹھے تھے۔

نواب کلب علی خان کے رامپور سے دلی واپس پہنچے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نواب صاحب سہراب نگر کے چیف سکریٹری کا تار ملا۔ ہزہائی نس یاد فرماتے ہیں فوراً پہنچے۔

اس مبارک و مسعود سفر میں نہ خاں صاحب اور سازندے ہمراہ تھے نہ خادمہ البیلی۔ البتہ ماموں جی۔ سہراب نگر ایک مین لائن پر پڑتا تھا۔ اسٹیشن پر چیف سکریٹری صاحب اور خان پری استقبال کے لئے موجود۔ کپارٹمنٹ کے دروازے سے سینس تک سفید کٹاؤ کے کام کی سرخ قنات لگائی گئی۔ دنوازا نے بسم اللہ کہہ کر دایاں قدم پلیٹ فارم پر رکھا۔ قنات کے باہر چودھری فتح پگڑی کے شملے سے خوشی کے آنسو بار بار پونچھا کئے۔ فینس کے بعد دواپر — درمیانی پردے دار کوچ میں دنوازا اور خان پری۔ اگلی میں چیف سکریٹری۔ پچھلی میں اہلکار اور چودھری فتح بیکہ شاندار قافلہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج سرخ پہاڑیوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا۔ غمخیز پردے کی اوٹ سے جھانکا سپاٹ چیل میدان میں سڑک پر سے گذرتی تینوں گھوڑا گاڑیوں کے طویل متحرک سائے ایسے معلوم ہوئے جیسی سیلہ پر چھاتیوں کی تصویریں۔ جو انگریزی کتابوں میں دیکھی تھیں۔ دنوازا نے سوچا یا گویا شیریں خسرو پر وزیر سے بیاہ کرنے جا رہی ہو۔ یا آلہ رخ کا کارواں۔

بھورے ٹیلوں کے پیچھے چند مقابر نظر آتے۔ پھر ایک وسیع، کافی آلود تالاب اُس پار سہراب نگر کا بازار۔ اُفق کے قریب ایک پہاڑی پر پھیلی قلعے کی عمارتیں۔
 سرسبز باغات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھنڈی سڑک پر پہنچ کر حکام اعلیٰ اور برٹش بیڈینٹ کی کوٹھیوں کے سامنے سے گذرئی کوچ شاہی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک میں مڑ گئی۔
 کوٹھی پر پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ دست بستہ عملہ برآمدے میں مستعد کھڑا تھا۔

دوسرے روز۔ نماز ظہر پڑھ کر سرکار جامع مسجد سے واپسی میں تشریف لائے۔
 دنوآز اور ان کے ماموں جی سے سہمی تر کلفت گفتگو کے بعد قلعے چلے گئے۔ خان پری روز آتی۔
 خان پری اور اس کا شوہر نسلًا گرد تھے۔ اور سرکار کے جاں نثار ملازم۔ ہزبائی نس کی والدہ ان دونوں کو نجف اشرف سے ہمراہ لیتی آئی تھیں۔ خان پری کے شوہر کو سرکار کے باڈی گارڈ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ خان پری جب بے نظیر کے میلے میں دنوآز سے ملی تھی اسے بی صاحبہ کہتی تھی اب انکو خانم کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ چند روز بعد سرکار کہے گی۔
 چودھری فتح محمد اپنے کمرے میں بیٹھے دن بھر بوستان خیال پڑھا کرتے۔ دنوآز اپنی خواہگاہ میں وکٹورین چھپر کھٹ کے اوپر نیم دراز اپنے بوستان خیال کی سیر میں مگن رہتیں اور خان پری کی راہ دیکھا کرتیں۔

یہ گرد و خورت نوعمری میں ہندوستان آگئی تھی۔ صاف اردو بولتی تھی۔ سرکار کی شرافت اور کریم النفسی اور قلعے کی سازشوں کے قصے سناتی۔ ہزبائی نس دوسرے والیان ریاست کے برعکس نہ عیاش تھے نہ ظالم۔ دنوآز خانم کا حسن، اور شریفانہ انداز و اطوار ان کو بے حد پسند آئے تھے۔ ایک لکھنؤی سوز خواں کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ ایک جمعرات رامپور کی ایک نجی مجلس اعز امیں اس لاثانی فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہزبائی نس سہراب نگر گانے سے زیادہ ان کی سوز خوانی پر رتجھے تھے۔

سرکار اپنی بیوہ بہن کو بہت مانتے تھے۔ اہم معاملات میں ان سے صلاح مشورہ لیتے۔۔۔ دونوں بیگمات، سبینیر اور سکند ہزبائی نس مدتیغ نواب زادیاں تھیں شہزادی

خانم کی اپنی بھادجوں سے بالکل نہیں مٹی۔ خاص کر چھوٹی بھادج سے۔ اس وجہ سے وہ قلعے سے باہر اپنے ذاتی محل میں رہتی ہیں اور بے حد خوش کہ بھتیان پر سوت لارہے ہیں

دلتنواز خانم کے لئے علیحدہ محل آراستہ کیا جا رہا ہے۔ ہیروں کا تاج بنوایا گیا ہے۔ ان کا ذاتی اسٹاف منتخب ہو چکا ہے۔

ایک شام خان پری نے قلعے سے آن کر اطلاع دی: عقد اگلے جمعے کو ہوگا۔ دلتنواز خاموش رہیں۔ رئیسوں کی شادیوں میں جا کر گایا بہت تھا۔ یہ معلوم نہ تھا اس قسم کی سچوئشن میں خود کیا کرنا یا کہنا چاہیے۔ چودھری فتنے بھی کچھ نہ بتا سکتے تھے ان کے ڈیرے پر خاندان میں سات بیڑھیوں سے کسی لڑکی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ اب دلتنواز نے دن بھر عبادت کرنا مناسب جانا۔ جو نیر بیگم صاحبہ۔ ہیروں کا تاج۔ شکرانے کی ختنی نفلیں بیڑھتیں تم تھا۔

مبده کی شام۔ پانچ کا عمل رہا ہوگا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ چند سکند بعد بیڈروم کا بھاری محلیں پردہ ہٹا کر خان پری نمودار ہوئی۔ بوستان خیال کی پری۔ تنگ موریوں والی گھیر دار شلوار۔ کمر میں پٹکا۔ چرمی پیٹی میں اڑسا منسا مریض خنجر۔ محلیں جیکٹ۔ سر پر پگڑی نما دوپٹہ۔ کوہ قاف کی گسی پری کی اماں۔ مسکرا کر بولی ”خانم سرکار نے گاڑی بھجوائی ہے۔ اندھیرا پڑے ٹھنڈی سڑک پر ہوا خوری کر آئیے گا۔ اور یہ سرکار نے ایک خط آپ کے نام بھیجا ہے۔“

ٹپکے سے خریطہ برآمد کیا۔ خریطے سے سر بہر لفاظہ نکال کر پیش کرتے ہی واپس مڑی۔ ”اے بی بھالی کہاں جاتی ہو۔“ دلتنواز نے دریافت کیا۔

”سرکار نے فرمایا ہے آپ کو پرچہ دے کر فوراً شہزادی خانم کی خدمت میں جاؤں ایک خط ان کے نام ہے۔ جمعے کے روز وہ لڑکی والی مین گی۔ آپ کی طرف سے۔“

”اچھا۔ دلتنواز نے کہا۔ پھر چھینپیں

”شہزادی خانم باغ باغ ہیں۔ چھوٹی بیگم پرسوتن آرہی ہے۔“
”اچھا۔“

”نندبھاج کا رشتہ ہی ایسا ہے۔ خانم۔ ایک دوسرے کی دشمن ہوتی ہیں۔“
”اچھا ہاں ہاں ٹھیک کہتی ہو خان پری۔“

ماس نندوں کی شکایتوں سے پُر ٹھمریاں داد رے بہت گائے تھے۔ مگس دان
رشتوں سے بھرا پُر اکنبہ کب کا تہ تیغ ہو چکا — بالا خانوں کے مادری نظام میں رشتوں
کی نوعیت مختلف تھی۔

خان پری رخصت ہوئی۔ دلتواڑ نے سرکار کا مراسلہ لفافے سے نکالا لہذا القاب
نہ تمہید۔ نمبر وار چند اطلاعات — ۱۔ مہر مبلغ ایک لاکھ سکہ رائج الوقت۔ ۲۔ بہرائی نس
نواب دلتواڑ محل خطاب۔ (صاحب ریڈیڈنٹ بہادر نے تھرڈ بہرائی نس کے مرتبے
کی منظوری دیدی ہے) ۳۔ شادی کے بعد محض اپنی ہمیشہ مسماۃ تھر واولپنے ماموں
چودھری فتح محمد سے کا ہے لگا ہے ملاقات کی ہماری طرف سے اجازت ہے۔

”سے کو دو بارہ پڑھا۔ چہرے کا رنگ بدلا۔ گردن خواص دروازے پر پہنچ چکی تھی۔
”ذرا ٹھہرنا۔ مجھے بھی سرکار کو ایک خط بھیجنا ہے۔ بے حد ضروری۔ فوراً جواب کر
ان کے ہاتھ میں دو — پہلے قلعے جاؤ۔ پھر شہزادی بیگم کے ہاں چلی جانا۔“ دلتواڑ
نے حکم دیا۔ وہ اسی لمحے سے اپنے آپ کو بہرائی نس سمجھنے لگی تھیں۔

”خانم قلعہ اڑھائی میل دور ہے۔ کب گئی اور کب آکر شہزادی خانم کے گھر پہنچی۔ وہ
تو اسی طرف رہتی ہیں۔“ خان پری نے جواب دیا۔ اس نے ایسی ایسی بہت دیکھی تھیں۔ آپ
خط لکھ رکھیے۔ باہر گھوم آئیے۔ آٹھ بجے تک آکر لے جاؤں گی۔ سرکار نوبے خاصہ تناول فرماتے
ہیں۔ اس وقت میرا وہاں ہونا لازمی ہے۔“

خان پری کے جاتے ہی دلتواڑ خط کا جواب لکھنے بیٹھیں —

”سرکار۔ شرط سے کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ چودھری فتح محمد میرے ماموں
نہیں ہیں۔ میرے ماموں جان مرزا اٹھاسپ نقتبند اور میرے والد مرزا عثمان بیگ غدر

میں شہید ہوئے۔ اپنے بزرگوں کی روجوں کو شرمنا نہ چاہتی تھی۔ آج تک کسی پر اپنی اہلیت ظاہر نہ کی۔ حتیٰ کہ آپ کو بھی نہ بتلایا۔ نکاح نا بے پر میرے والد کا نام مرزا عثمان بیگ لکھوائے گا۔ اس بد بخت بندی کی داستان رنج و مہن یوں ہے — اپنا قصہ قلم بند کر کے خط لفافے میں رکھا۔ چودھری فتنے نے اندرا کر کہا۔ ”بیٹا گاڑی بہت دیر سے تیار کھڑی ہے“

کوچ کوٹھی سے نکل کر مال روڈ کی طرف روانہ ہوئی۔ شام ہو چکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں نے درختوں کو سنہرا کر دیا تھا۔ سڑک خاموش پڑی تھی۔ گاڑی کے اندر بھی خاموشی طاری تھی — چودھری فتنے اندر بیٹھے تھے خان پری کا طویل مونچھوں والا مسطح کُردشور کوچ بکس پر ممکن تھا۔

گاڑی ایک میل دور نکل آئی۔ دنواڑے باہر جھانکا۔ پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے عجیب و غریب فخر و مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ سامنے وہی مقبرے نظر آئے جو ریلوے اسٹیشن سے آتے ہیں۔ دُور سے دکھائی پڑے تھے۔ سب سے اونچے گنبد پر گھاس اُگ آئی تھی۔

”کوئیل کا مقبرہ۔“ چودھری فتنے نے بتایا۔

”اے ہے۔ چھوٹی مٹی مٹی کوئیل اور اس کا اتنا بڑا مقبرہ بیسیوں کے بھی کیا چونچلے ہیں!“

”بیٹی یہ کوئیل چڑیا نہیں ایک بنگال تھی۔ سرکار کے پردادا کے حرم میں داخل تھی ایک روز انھوں نے اسے سوتے میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔“

”ہے۔ ہے۔ کیوں؟“

”شک ہو گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا بے قصور تھی۔ پچھتائے اور مقبرہ بنوایا۔ ہماری والدہ خدا ان کو بخشنے شاہی کے لکھنوی رہ چکی تھیں ان سے کتنے واقعات ایسے سنے اور خود دیکھے ایک کینز تھی صبح دولت — غازی الدین حیدر کی ملکہ بادشاہ بیگم نے اسے انتہائی اذیت دے دے کر ہلاک کر دیا۔ بیگم سمر کو اپنے یورپین شوہر اور ایک کینز کے متعلق شبہ ہو گیا تھا اس بے چاری کو قتل کروا کے اپنی مسہری کے نیچے گاڑا۔“

”تم تو بیٹا انگریزی راج کی امی جی میں جوان ہوئی ہو۔ دلی میں رہتی ہو۔ نیویارک میں
کے حالات اب بھی وہی ہیں جو پہلے ہمارے بادشاہوں کے ہاں تھے۔ انگریزی قانون
یہاں لاگو نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔“
”یہ بھی تو ایک چھوٹا سا لکھنؤ ہے۔“ دنوا نے باہر جھانک کر کہا۔

”ارے یہ کیا خاک لکھنؤ ہے ہم لوگوں نے غازی الدین حیدر سے لے کر جان عالم
تک کا زمانہ دیکھا ہے۔ جب بھی میجر ہارٹلے کے ساتھ اماں لکھنؤ جاتی تھیں۔
”بیٹا اماں اتنی کسبیوں کو جانتی تھیں انکے دیکھتے دیکھتے لکھنؤ کے بادشاہوں کی ملکائیں
بن گئیں۔ سلطان محل۔ پھول محل۔ بادشاہ محل۔“

”مجھے سرکار درتس محل کا خطاب دینے والے ہیں۔“ دنوا نے کہا۔
”مبارک ہو۔ بھو ڈیرے دار کی لڑکی حسینی نصیر الدین حیدر کی جاہ و حشمت والی نواب
خورشید محل۔ اور آجاگر۔ بیبا جان۔ مندر۔ سندرا۔ ڈوم دھارڑی کروڑ پتی ہو گئے۔“
”آپ کی والدہ حرم سلطانی میں نہ پہنچ پائیں؟“

”کیا ہوتا کیا نہ ہوتا سب مقدر کا کھیل ہے۔ جارج والٹرز کا نیپور کا ایک انگریز
فوجی تھا۔ اس کی لڑکی نصیر الدین حیدر کو بھاگتی۔ نواب مخدرہ علیا۔
”اماں والٹر صاحب کے مرنے کے بعد علی بخش طلبی سے واسطہ رکھتی تھی۔
”بادشاہ نے اس کا نکاح علی بخش سے کروا دیا۔ نواب مخدرہ علیا کی وفات کے بعد
انکے سوتیلے باپ انکی زبردست جاگیر پر قابض ہو گئے۔“

”ایک بار جب اماں میجر کے ساتھ لکھنؤ جا رہی تھیں انھیں اٹھوانے کی کوشش
ناکام۔ کہاں کا شاہی حرم۔ سب مقدر کا کھیل۔ بیٹی یہ گونج کیسی سنائی دے رہی
ہے۔ زمین آسمان جھنجھٹا اٹھے۔ تو سن رہی ہے؟“

مقبوروں کا چکر لگا کر کوچوان کچھی ٹھنڈی سڑک پر واپس لایا۔
دور فلے کی طرف سے توپیں سر ہونے کی آواز آئی۔ بوم۔ بوم۔ بوم۔

دنواز مسکرائیں۔ شادی کی خوشی میں گو لے باد ہوائی آج ہی سر ہونے لگے علیا حضرت
 بیگم صاحبہ سہراب نگر۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔
 لیکن کوچوان کو کیا ہوا کہ فوراً گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور گاڑی موڑ کر تیز رفتار سے
 ریڈیٹنٹ کی کوٹھی کی طرف بڑھا۔

سات۔ آٹھ۔ نو۔

گاڑی کوٹھی سے کچھ دور پر رک گئی۔ مگر در سالدار کوچ کس سے کو دکر پھاٹک کی
 طرف دوڑا۔ ریاستی فوج کا ایک شہسوار دستہ قلعے کی سمت بھاگا جا رہا تھا۔ چودھری
 گاڑی سے اتر کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ دنواز تعجب اور دلچسپی سے باہر بھاگتی رہیں کچھ
 دیر بعد سالدار سر جھکائے آہستہ آہستہ کوچ کی جانب آیا۔ چودھری سے کچھ کہا۔
 چودھری نے سراٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ زیر لب کچھ پڑھا۔ کھڑکی کے نزدیک آئے۔
 دھیرے سے بولے۔ "اللہ کی مرضی۔ بیٹی سرکار جنت کو سدھارے۔"

دنواز چند سیکنڈ تک چودھری کو تنکٹی رہیں۔ پھر کہا۔ "کیا۔؟ یہ کیسے ہو سکتا
 ہے۔ افواہ ہو گئی۔" منتظر تھیں کہ بوڑھا بھی اس خبر کی تردید کرے۔ وہ خاموش رہا۔ اب
 اس اطلاع کا اثر شروع ہوا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چکر۔ گھوڑا گاڑی طوفان کے
 تھپیڑے کھاتی گول گول گھومتی سرپٹ دوڑی۔ چودھری باہر کھڑا بکے جا رہا تھا۔ بیٹی
 یہ دنیا مردوں کی سرائے ہے۔ وغیرہ۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ یا میرا دماغ چل گیا۔ یہ کیا
 بک رہا ہے۔ بڑھا کبجر۔ کل جی بھا۔ کم ذات۔ دُور پار کوئی مرتا ہے تو گو لے دعا کرتے ہیں؟
 تو میں تو میرے بیاہ کی خوشی میں سر کر رہے ہیں۔ سلامی کی گیارہ توپ۔ اور یہ بکتا ہے
 کہ خدا نخواستہ سرکار کے دشمن۔ چودھری فتنے نے کوچین سے کہا گیٹ ہاؤس
 واپس چلے۔ سوچا اب یہاں سے جلد از جلد بھاگنا چاہیے۔ کل صبح تنگ جانے کیا ہو گیا
 نہ ہو۔ فرنگی نے ان ریشموں کو مطلق الغان کر رکھا ہے۔ نیٹو ریاستوں کے معاملات بہت
 دیکھے تھے۔ دلی عہد کی اپنے سوتیلے بھائیوں سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ ریڈیٹنٹ ابھی

قلعے میں موجود ہے۔ فوجیں حرکت میں آچکی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔ خان پری کا شوہر کوچ بکس پر واپس گیا۔ چودھری جی گاڑی کے اندر مقابل کی سیٹ پر بیٹھے۔ دروازہ بند کر کے پردے برابر کیے۔ دلنواز سر تھامے بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر بعد بولیں۔ ”ماموں جی میں نے گنا۔ گیارہ توپ۔ ہماری گیارہ توپ کی سلامی ملکہ کی طرف سے مقرر ہے نا۔“

چودھری نے ملائیت سے کہنا شروع کیا۔ ”بیگم! بیٹے۔ سُن یہ جو ریاست تھی نا۔“
”تھی کیا مطلب۔ اللہ رکھے ہے۔ ہماری اسٹیٹ سہرا بنگر۔“

”بیٹی! رسالدار صاحب ریڈیٹس سے سناؤنی لائے ہیں۔ خان پری کو تیرے پاس بھیجنے کے بعد سرکار نے دیوان صاحب اور ریڈیٹنٹ صاحب کو طلب فرمایا۔ ان سے گفتگو کرتے رہے۔ اچانک طبیعت بگڑی۔ محل کا فرنگی ڈاکٹر فوراً پہنچا۔ سب جتن کئے۔ مگر سرکار کا اوپر سے بلاوا آچکا تھا۔ بیٹادہ تو ہیں سرکار کے مرتبے ہی ولی عہد کی تخت نشینی کی خوشی میں داعی گئیں۔ نئے رئیس کو سلامی دی گئی تھی۔“

دلنواز غور سے چودھری کو دیکھتی رہیں۔ گیس کے لیمپ میں ہوا بھرتے جاؤ تو وہ رفتہ رفتہ روشن ہوتا ہے اسی طرح بوڑھے دھاڑی کے الفاظ ذہن کے دھندلکے میں جاگر ہوئے۔

چودھری اب خوفزدہ آواز میں سرگوشی کر رہا تھا۔ ”بیگم! بیٹی۔ کوٹھی واپس پہنچتے ہی اسباب باندھے۔ صبح تڑکے یہاں سے بھاگ نکلیں۔ تا نگمیکہ کریں گے اسٹیشن پر جو ریل گاڑی ملی اسی میں بیٹھ جائیں گے۔ سُن رہی ہے؟ مجھے سب حالات یہاں کے معلوم ہو چکے ہیں۔ دوپاٹیاں ہیں۔ ایک چھوٹی بیگم اور ان کے لڑکے کے طرفدار دوسری شہزادی بیگم کی پالٹی۔ تجھ سے نکاح کرنے پر سرکار کو شہزادی بیگم نے اگسا بٹھا۔ دونوں پالیٹوں میں بہت خون خرابہ ہوتا ہے۔“

دلنواز چپ رہیں۔ چودھری سمجھانے میں معروف تھا۔ ”اس ریاست نے سارے طور طریقے شاہان اودھے اپنا رکھے ہیں۔ وہ بہادر لوگ موت سے بہت ڈرتے تھے۔ سُن رہی ہے؟ مردوں کی سرائے میں رہتے تھے اور موت سے ڈرتے تھے۔ جب ایک

شاہ اودھ کا انتقال ہوتا وراثت کے جھگڑوں کے ڈر سے اس کا بیٹا فوراً تخت نشین ہو جاتا دوسرے دن وزیر اعظم دربار میں حاضر ہو کر عرض کرتا — ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے۔ جہاں پناہ اس کی تجویز و کیفین کے لئے کچھ امداد فرمائیں۔ بیابا دشاہ خزانہ عامرہ سے ایک رقم عطا کرتا۔ باپ کی لاش چور دروازے سے نکالی جاتی غسل میت تک محل میں نہیں دیا جاتا تھا۔“

بُت بنی سنائیں۔ چہرہ جذبات سے عاری۔ آنکھیں خشک۔
 بوڑھا کبوتر گیس کی لالین کی طرح سنسناتا رہا۔ ”یہاں بھی کل صبح دربار میں حاضر ہو کر دیوان بہادر عرض کریں گے ایک غریب الوطن مسافر کا۔۔۔۔۔ وغیرہ۔“
 کوچ اب تالاب کے کنارے سے نکل کر بازار سے گذر رہی تھی۔ دفعتاً دلنواز نے کھڑکیوں کے پردے کھینچے۔ سر باہر نکال کر کوچمین کو پکارا۔ ”گاڑی روکو۔۔۔“
 بڑی بھیانک سی آواز تھی۔ کوچمین نے گھبرا کر باگیں کھینچیں۔ دلنواز دروازہ کھول کر بھرے بازار میں اتر آئیں۔ دوکانوں پر جمع لوگ سرکار کی اچانک موت پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ انھوں نے چونک کر اس بازاری عورت کو دیکھا جو اگر سرکار یوں چٹ پٹ نہ ہوتے تو دور روز بعد ان کی علیا حضرت بننے والی تھی۔
 دلنواز نے ایک بھٹکے سے دوپٹہ سر سے اتارا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی تالاب کے کنارے پہنچ گئیں۔ چودھری اور رسالدار پیچھے پیچھے دوڑے۔

چودھری فٹے ہانپتے کانپتے تالاب پر پہنچے۔ اطمینان کی سانس لی۔ بیگمآں بیٹی آرام سے منڈیر پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ چودھری کو دیکھ کر سرکار کا پرچہ اور اپنا خط شلو کے کی جیب سے برآمد کیا۔ یہ خطرات کے نوبتے خان پری نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے والی تھی قبہ لگایا۔ چودھری نے تاسف سے سر ہلایا۔ صدمے نے بے چاری بچی کے دماغ پر اثر کر دیا۔ دھیرے سے بولے۔ ”بیٹی رنج نہ کرو۔“
 ”رنج۔۔۔“ دلنواز نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لوڑھے کو دیکھا۔ ”چودھری! رنج

ہے اس بات کا ہے کہ سرکار نے آخر دم تک مجھے تمہاری بھانجی سمجھا۔ میرا یہ خط ان سب نہ پہنچا۔ دونوں پرچوں کے یرزے یرزے کیے اور انھیں ہوا میں اچھال دیا۔

چودھری فتح محمد سن سے رہ گئے۔ دل ٹوٹ گیا۔ اس عورت کی میں نے جان پائی تھی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی تھی۔

”جاؤ پوت دکھن —“ شدو نے آواز لگائی۔
 ”وہی کرم کے پھٹن —“ چھوٹی بہن شمو نے چلا کر کہا۔ دونوں بچے بالا خانے کے مختصر صحن میں ”دھوپ بھاؤں“ کھلتے پھر رہے تھے۔ جاڑوں کا سورج کبھی بادلوں میں چھپتا کبھی تیزی سے چمکنے لگتا۔ شملے میں برفباری ہوتی تھی۔ ہوا کے سرد دھبوں کو س سے اڑکھلتے پھر بند ہو جاتے۔ دن تو اڑاپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ مہرو باورچی خانے میں البیلی سے شہ تیار کر رہی تھی — شدو اور شمو ”اونچا نیچا ٹیلہ“ کھیلنے لگے شدو ایک مونڈھے پر چڑھ کر چلایا فیر سے بدھو گھر کو۔“

”آئے۔ جان بچی لاکھوں —“ شمو کھکھلا کر ہنسی۔

”خالہ بن گئیں خیلہ —“ شدو نے نعرہ لگایا۔

”خیلہ جان بیلہ —“ شمو لپکاری۔

”خالہ بن گئیں خیلہ —“

”خیلہ جان بیلہ —“ بیلے میں بے میلہ — جمنابی پہ کھیلا اونچا نیچا ٹیلہ —“ شدو نے کوڈو کو ڈکرا لاپنا شروع کیا۔

دور اچوت افسر جو دھپوری صافے باندھے برجس اور فل بوٹ ڈائنے زینے میں دار ہوئے۔ چودھری فتنے دروازے کے پاس مونڈھے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے راز اٹھے تپاک سے آداب تسلیمات کر کے ان کو لال کمرے میں لے گئے۔ شدو برآمدے

اور صحن کے چکر لگا کر لاپا کیا۔ ”خالہ بن گئیں خید۔ تیلے میں ہے میسلہ۔ جتنا؟
پہ کھیلا۔ اونچا نیچا۔“

چودھری فتنے لپکے ہوئے باہر آئے آہستہ سے کہا۔ کمبخت غل نہ مچا۔
”ماموں جی۔ ماموں جی۔ کھیلا اور ٹیلہ کی تک نہیں ملتی۔“

”شاعری کر رہا ہے نالائق۔ چودھری نے نیچی آوازیں ڈانٹا۔ ”چل سارنگی سنہا
استاد جی آتے ہوں گے۔ خبردار جواب آواز نکالی۔ شمشو بیٹی۔“ انھوں نے پیاراً
کہا۔ ”گھنگر دے آ۔“

”ماموں جی۔“ مہرونے باورچی خانے سے جھانک کر کہا ”آج آپ ہی بنادیئے
استاد جی نے آج کی چھٹی لے رکھی ہے،“ ماموں جی پگڑی کے شملے سے چہرہ صاف کر۔
باورچی خانے میں گئے سیرگوشی کی۔ ”ارسی مہرو۔ خدا کا شکر ادا کر۔ بیگماں کی سائی آگئی
بات پھیل گئی تھی بیگم بننے سہرا بنگر چلی گئیں۔ بھجن لال کی دوکان سے مٹھائی منگو
ہوں۔ جل پان۔ نیلم گدھ مہراج کے آدمی ہیں۔ بہت بڑی اسامی ہے،“
وہ پھرتی سے لال کمرے کی طرف دوڑ گئے۔

بچے اسی طرح کھیل میں مصروف رہے۔ ”جاد پوٹ دیکھن۔ خالہ بن گئیں خید
ایلی کٹنی چولے کے پاس بیٹھی روغنی ٹکیاں بنا رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ”جو تہ
کہتی ہو تمہارا بچے گنگوڑے وہی دہراتے ہیں۔“
باہر آکر مہرونے پیٹے کے کاٹن کھینچے۔ ”خاموش۔ بد ذات زبان گڈی۔
کھینچ لوگی۔“ دونوں بچوں کو مارتی بیٹنی دلواز کے کمرے میں گئیں۔

آپا آرام کرسی پر ہیں نجی بیٹھی تھیں۔ ”اپنی اولاد کو بہت نفیس تربیت د
رہی ہو بیوی،“

”آپا تم بھی توجب سے منحوس نگر سے لوٹی ہو اٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ۔ جاؤ پو۔
دکشن۔۔۔ وہی بچوں کے کان میں پڑتا رہتا ہے،“

”تم نہیں بکتی رہتیں خیر سے بدھو۔“

”چلو خیر۔ معاف کرو۔ اٹھو۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ خیلا جان بیلا۔“
”پھر وہی۔“

مہر نے قہقہہ لگایا ”توبہ۔ توبہ۔ اب نہیں۔ میری اچھی آپا۔ اٹھو کپڑے بدلو۔ کنگھی چوٹی کرو۔ ایسا بھی کیا سوگ۔“

”کس دل سے کروں کنگھی چوٹی۔ سرکار دکھیا کی میت۔“
”پھر وہی صبح صبح۔“

”کر بلائے معلیٰ کے راستے میں ہوگی۔ اتنا لمبا سفر۔ اجنبی مافرا۔“
”باؤلی ہو گئیں۔“

”ریل گاڑی۔ جہاز۔ اونٹ۔ اونٹ پر لدا سیاح تالوت۔“
مہر دبرہم ہو کر چینی۔

”خبردار۔ آپا۔ آئندہ جو تم نے نام لیا۔ بھرے پُرے گھر میں۔“
”یہ بھی رین لیبر اے بنو۔ چلاؤ مت۔“

ماموں جی دروازے میں آئے ”یہ مٹی کے ڈیرے والیاں ہیں یا بھٹیاریں۔؟“
باہر مہاراجہ صاحب نیلم گڑھ کے افسر آئے بیٹھے ہیں۔ ذرا چپ رہو کم بختو۔ ”قرب آکر
آہستہ سے بولے۔“ بیکماں بیٹی مبارک باشد۔ اگلے مہینے کی اکیس تاریخ کو لوڈ راج کا بیاہ
ہے۔ تیار می شروع کر دو۔“

لال کمرے میں مہاراجہ نیلم گڑھ کے آدمیوں نے دستور کے مطابق نفرتی تھالی میں
بیعانے کا مٹھیں کیسہ اور پان پیش کیے۔ دلنواز نے کانپتے ہاتھوں سے بڑھ اٹھایا۔
راچوت رخصت ہوئے۔ اپنے کمرے میں واپس آئیں۔ کچھ دیر چپکی بیٹھی رہیں۔
پھر طنبورہ اٹھا کر ریاض شروع کیا۔

”مبارک ہو۔ مبارک ہو۔“ مہر و ہنستی ہوئی اندرائی ”لاؤ کبھی دو۔ تمہارے کپڑے دھوپ میں ڈالو۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے۔ پشوازیں کون سے صندوق میں رکھی ہیں؟“

”دیکھ لو۔ میں تو سہرا بن کر۔ جاتے وقت سب کپڑے یہیں پھینک گئی تھی۔ پھر آتسو۔“

”پلنگ منتنی۔“

”خاموش۔ بڑی بہن سے بدزبانی کرتی ہے مردار۔“

مہر نے ایک صندوق کھول کر پشوازیں نکالیں ”ساڑیاں بھی لیتی جاؤ۔ ٹکڑے ہندوؤں کی شادی ہے۔ پہن کر اندر کے اکھاڑے والی بننا۔“

— بنارس ساڑیاں برآمد کیں۔ قالین پر رکھتی گئی۔ ململ میں لپٹا ایک بندل

نکالا۔ ”یہ کیا ہے آپا۔“

آپا نے الاپتے الاپتے سراٹھا کر دیکھا ”رامپڑ میں رضائی نہیں بنوائی تھی؟ ادھبلا پڑی ہے۔ نکال لو۔ لے جاؤ گی ساتھ۔ وہاں بھی تو بڑی سردی ہوگی۔“

مہر نے زرد اور ادھی چٹائی کی گوٹ کی حسین رضائی کھول کر قالین پر پھیلائی ”واہ۔ کیا چیز ہے۔ ابھی البیلی کو ڈھنکے کے ہاں بھیجتی ہوں۔ کل پرسوں تک

ڈورے بھی ڈال دے گی۔ تم مہاراجہ پر ڈورے ڈالنا!“

باہر ماموں جی پچوں کو بتانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ اندر آپا ریاض کر رہی تھیں زندگی اپنے پرانے ڈھرے پر واپس آگئی تھی۔ مہر واطمنان کی سانس لے کر اٹھی پشوازیں اور نامکمل رضائی اٹھا کر صحن میں چلی گئی۔

طائفے کے ساتھ بی دلنواز چیم چیم کرتی نیلم گدھ سیٹھن پر اتریں۔ کیلے کے پتوں اور اور گیندے کے پھولوں سے سجے پلیٹ فارم سے گذرئی کھلی فٹن میں ننگے سر بیٹھی شہر کے

بازاروں سے گذرتی رنگ بھون پھیں ہر طرف بیاہ کی جہل پہل تھی بھوپا بھوپنی کے تماشے۔
 جا بجا پنڈالوں کے نیچے بھگت باز، قوال، دھاڑی بچے اور بھانڈو لوگوں کو محفوظ کر رہے تھے
 رات کو شہنائی نوازوں کی روشن چوکیاں گشت کرتیں۔ تخت رواں پر کھڑی مطہر بائیں
 ہمیشہ دلبر سجان مبارک باشد، گاتی پھریں — شادی کا جشن سات دن تک جاری
 رہا۔ آخری روز صبح منہ اندھیرے حسب دستور پھیریں پہنچے ہوئے۔
 مہر دیں رسیوں کی شادیوں میں کھڑے ہو کر مبارکباد لیا گاتے گاتے تھک گئی ہوں
 اسی لئے میں نے ”ہاں“ کر دی۔

دربار ہال میں سنگھاسن کے سامنے کھڑی بی دلتوا اور ان کی ساتھ والیاں
 پھیر دیں الپ رہی ہیں — پیا آؤں کی بھی پیریا درو جو ٹھٹھاری ہوں۔
 پیا کر بلائے معنی کے گورستان پہنچ گئے۔
 عشق بازی میں کرامات نہ ہو کیا معنی جس کو دل چاہے ملاقات نہ ہو کیا معنی
 درو جو ٹھٹھاری ہوں۔

کرامت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ پیروں کا تاج بنوایا گیا تھا۔ درو جو ٹھٹھاری ہوں۔
 آٹھویں رات مہاراج نے برٹش ریڈیٹنٹ ہسٹریل انڈیا ایجنسی اور بمبئی پریزیڈنسی
 سے آئے ہوئے انگریز حکام اعلیٰ کو ڈنر پر بلایا۔ دلتوا نے ساتی گرمی کی۔ اس شام انھوں
 نے کانوں کے بالی پتے اتار کر دلائیٹی آویزے پہنے تھے۔ پیشانی پر بالوں کے ”چھو“ قرمزی
 رنگ کی بنا رسی ساڑی۔ مہاراج دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔ کام کٹڈ لا خطاب
 عنایت کیا۔ سمرات بکر ماجیت کی راج نرنکی کام کٹڈ لا۔

دو بجے صبح تک خود کام کٹڈ لا فرانسسی شراپیں کافی مقدار میں اڑا چکی تھیں سکھپال
 میں سوار ہو کر رنگ بھون کے مہمان خانے واپس پہنچیں۔ طویل راہداریاں طے کر کے
 اپنے کمرے میں داخل ہوئیں۔ سنگی جالی والے تابدانوں سے چھپتی چاندنی نے کمرے میں
 اجالا بکھر رکھا تھا۔ کونے میں لمپ روشن تھا آفتدان میں آگ دھک رہی تھی۔ رنگ
 بھون کے اسٹاف کی ایک داسی اندر وسیع ڈرینگ روم میں مچو خواب تھی۔

دنواز نے دوشالہ صوفے پر پھینکا۔ ایک دم سردی سی محسوس ہوئی پڑاۓ کی گوٹ کی رام پوری رضائی جودئی سے چلتے وقت مکمل کرائی تھی پلنگ پر بڑی نظر آئی۔ لباس تبدیل کرنے سے پہلے رضائی اوڑھ کر آتش دان کے قریب بیٹھ گئیں۔ منٹ بھر ہاتھ تاپے۔ صحرا کی رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ آگ کے اور قریب ہو کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں پہنچے کا پری بند اتارنے میں مشغول ہوئیں۔ کوئی ایک کے سرد کی وجہ سے پتہ بھی نہ چلا رضائی کا ایک کونہ آگ میں جا گرا۔ روئی بھڑک اٹھی۔ پل کی پل میں دنواز عرف بیگمال کشمیرن کا تین چوتھائی چہرہ اور جسم ٹھلس کر رہ گیا۔

العظمۃ اللہ۔ جو چند منٹ قبل کام کندہ لاتی تھی اب شمشان کے شعلوں میں لپٹی ایک چڑیل۔ ہیبت رُت کی سرد موتوں میں بھیر داپنے بیل پر سوار صحراؤں سے گذرنا جاتا ہے۔ مہاکال جو پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔

ہمارا جی صاحب نیلم گڈھ کے انگریز سرجنوں اور حکیموں کے طویل علاج معالجے کے بعد شفایاب ہو کر دنواز دی لوٹیں اس وقت تک ان کا قلب بالکل لوٹ چکا تھا۔
تایب ہو گئیں۔ (اس کے علاوہ اور کبھی کیا سکتی تھیں کسی بگڑے دل نے کہا۔)

مفتی کی طرح نقاب مسکاد تو بھیا تک صورت۔ ہیبت طاری ہونی ہے۔ گھر کے باہر نقاب گھر کے اندر گھونٹ جس میں سے نصف چہرہ جو جلنے سے بچ رہا تھا نظر آ جاتا ہے۔
آدھی گوری پاروتی۔ آدھی بھدر کالی۔ جوگ مایا۔

آتشزدگی کے حادثے کے وقت چالیس کے اوپر تھیں لیکن ہجوم عشاق میں کمی نہ آئی تھی۔ چند سال بعد بحیثیت جانشین متوری کشمیرن برادری کی چودھرائن کی مسند پر رہائیں۔ انھوں نے مصلے سنبھالا۔ دھن یوں کا گرو نہ کیجیے۔ جھوٹ وچن مت بول رہے۔ گھونٹ کا پٹ کھولا تو ایک خوفناک صورت۔ بچھ پیا لیس گے۔

بیری والے پیرچی کے آنگن میں ایک بیرپ سے برقعے کے دامن پر گرا۔ پیرچی نے ٹھاکرا نہیں عنایت کیا۔ فرمایا: ”یہ جنت کا درخت ہے۔ اسی کے پتے اُبال کر مُردے نہلاتے باتے ہیں۔“

— ایک غریب الوطن مُلّا فراس شہر سے جانے والا ہے۔ اس کے سفر آخرت کے لئے حضور کی امداد درکار ہے — دنوازانے سر جھٹکا۔ پیرچی بیران کی ہتھیلی پر رکھ کر دیا تھے —

”یہ بشارت ہے۔ خداوند کریم شاید تم کو معاف فرمادے —“
دنوازانے بیعت کی۔ ایک مسکین سامرید پیرچی کی چلیں بھرنے پر مامور تھا۔ مرشد نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر حاضر ہوا۔ ”کل پاک صاف کپڑے پہن کر بعد نماز جمعہ آجانا — اور تم بھی —“ انھوں نے دنوازانے کو حکم دیا۔

بروز جمعہ پیری والے شاہ صاحب نے شربت کے پیالے پر مہماؤں دنوازانے کو بیگم بنت عثمان بیگ شہید کا عقد اس لاؤ لدرنڈو سے مرید سے پڑھ دیا۔ شرع محمدی پوری کی۔ بعد نماز مغرب اپنے مجہول الحال شوہر کے ہاں پنڈت کے کوچے منتقل ہو گئیں۔
اب وہ ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتیں۔ موٹے ٹھوٹے کپڑے پہنتیں۔ سنت رسولؐ کا اتنا خیال کہ لباس میں دس دس پیوند — شوہر ایک مطب میں نسخے باندھتے تھے۔ ان کی قلیل تنخواہ میں گذر کرتیں۔

ایک روز ڈولی کر کے جاؤڑی پہنچیں۔ مہر کو سمجھایا بجایا کہ وہ بھی تو بہ کرے۔ وہ ہرگز نہ مانی۔ چودھری فتنے کچھ نہ بولے۔ چپ چاپ بیٹھے تسبیح پھیرا کیے۔

دنوازانے انھیں گلی کا تہتھاں روانہ کیا۔ منشی رام سرن وکیل کو بلا کر اپنی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ مہر کو بخش دی۔ کچھ رقم تہتہ کے مدرسے کے لئے علیگڑھ منشی آرڈر کر دی۔ قانونی لکھا پڑھی کے بعد ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عازم بیت المقدس پر ایک دھبلا بھی اپنے لیے نہ رکھا۔ گناہ کی کمائی سے حج جائز نہیں۔ چند روز بعد خاوند

نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا۔ ووتوں بمبئی روانہ ہوئے۔

نکمش رنگ کا بڑا سا پگڑ باندھ لائیں ٹیکتے چو دھری فتح محمد دکھیا خدا حافظ کہہ اسٹیشن پر آئے تھے۔ پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھائے۔ کہا تو اتنا کہا — ”بیرہ سہرا بنگر سے چلتے وقت تو بار بار دہرائی تھی جاؤ پوت دکھن وہی کرم کے بھین — آگ میں جلی تب بھی یہی رٹا کی۔ اب بتا۔ تجھ سے بڑا خوش قسمت کون ہے؟ بیٹا میں تیر ماموں نہ سہی پر جب کعبہ شریف کا پردہ تھام کر اپنے بزرگوں کی مغفرت کی دعا کرے گی؟ بدبخت کی بخشش کے لئے بھی ہاتھ اٹھا لیجو —“

میاں بیوی تھر ڈکلاس کے دھکے کھاتے بمبئی وارد ہوئے۔ بھنڈی بازار۔

حاجیوں کا مسافر خانہ افلاس زدہ آسامی اور بنگالی مسلمانوں سے پٹا پڑا تھا۔ جتنی دیر میاں ٹکٹ وغیرہ کی دوڑ بھاگ کرتے یہ ہال میں بیٹھی دوسری پردہ نشینوں کی طرح برقعے میں ملفوف دیوار کی طرف منہ کئے رہتیں کھانا بھی اسی طرح کھاتیں۔

سمرائے طغرل بیگ سے روانہ ہونے والی کلمہ گو ڈیرے دار کے رتھ میں گویا ہم دونوں کی سواری کے بیٹھے جتے ہوئے تھے۔ بمبئی سے جدہ کے لئے لنگر اٹھانے والا مشرک فرنگیوں کا دفانی جہاز سفینہ نوح تھا کہ بنت مرزا عثمان شہید کو سلامتی کے کنارے کی سمت لئے جا رہا تھا۔ لال تلخے کی پروردہ بچی دلنواز یا نو بیگم پچیس سال قبل معدوم ہوئی۔ چاؤڑی کی دلنواز عرف بیگم اب غائب۔ ایک نقاب پوش عریب بد قطع عورت اپنے مفلس شوہر کے ہمراہ لیتیک اللہ تم لیتیک پکارنی مکہ معظمہ جا رہی ہے۔

(۶)

دُعَاؤُن کا سفر

مکہ اور شہرب کی گلیوں میں میاں بیوی نے کئی برس گزار دیئے۔ مدینہ منورہ میں آبی بے کے مزار مقدس کے نزدیک جانے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔ جلتی ریت پر دوڑ بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو دیا کرتیں۔ یا خاتونِ جنت میری شفاعت کروادیکھو۔ یا بی بی مجھے بھنٹوا دیجیو۔ یا بنت رسول اللہ اس گناہ کا رکنیز پر کرم کیجیو۔ یا میری شہزادی — میاں بیوی نجف اشرف کربلائے معلیٰ کا ظہین اور بڑے پیر کے روضے کی زیارات سے مشرف ہوئے۔ مکہ شریف میں شوہر ایک یتیمی عطار کی دوکان پر نوکر ہو گئے تھے۔ ایام حج میں متمول ہندی مسلمانوں کی خدمت کرتے۔ اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی۔ بڑی عمرت اور قناعت کی زندگی دونوں کی تھی۔ حرم شریف میں بیٹھ کر نفلیں پڑھا کرتے دنو آزا اپنی قسمت پر رشک کرتیں اور اللہ کے کرم پر متحیر رہتیں اس غفور الرحیم نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

سدا کے روگی شوہر مر گئے۔ چند مہینے عثمانی حکومت کے ایک ترک افسر کے ہاں ماما گیری کی۔ خانم بہت نک چڑھی تھی اس سے نہ پٹی۔ ترکمن کی نوکری ترک کی۔ فاقوں کی نوبت آگئی۔ حج کے زمانے میں گداگری اختیار کرنا گوارا نہ تھا۔ ماں جانی کی محبت نے جوش مارا ابھی کا ایک دولت مند مہین کنبہ حج کر کے واپس جا رہا تھا۔ خدیجہ بانی سبٹھانی نے ان کے حال زار پر ترس کھا کر جہاز کا ٹکٹ خرید دیا۔ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

بائیس خواجہ کی چوکھٹ پر واپس پہنچیں۔ تسیجیوں اور دینی کتابچوں کا بکس یمنی عطار کے تیار کردہ چورن کی شیشیاں مع نسخہ جات ساتھ لائی تھیں۔ برائے

تجارت - ریوے اسٹیشن پر انٹر کرنا نکلے کیا - سیدھی پہنچیں قتلی قبر - معلوم ہوا پیری والے شاد صاحب کا وصال ہو چکا - ان کا زر پرست اور ڈھونڈی بھتیجا سجادے پر بیٹھا تھا - ڈبوڑھی کے اندر گئیں - پیرانی اماں کے ہاتھ چوڑے - چند روزہ قیام کی اجازت چاہی - سائبان کے ایک کونے میں بڑا سفر کی تکان کی وجہ سے ایسی بے خبر سوئیں کہ دوسرے روز دوپہر کو آنکھ کھلی - ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں - گھر والوں کو قیام عربستان کے واقعات سنائے - ان کی واضح بیرخی محسوس کی - بڑی بھونے کھانا سامنے رکھا - چند لقمے زہر مار کر کے برقعہ اوڑھا - ڈولی بلانی -

فانوس اور ہانڈیاں روشن ہو چکی تھیں جب اپنے سابق بالا خانے پر پہنچیں - جو دراصل منواری کشمیرن کا بالا خانہ تھا - پھر دنوا ز عرف بیگماں کا کہلایا - اب مہر و کا کمرہ کہلاتا تھا - کبھی کی جائیداد بادشاہوں اور حکمرانوں کی حکومتوں کی طرح کچھ پتہ نہیں کل کس کے قبضے میں ہوگی -

سنہ ستادون کی فتح کے بعد لال قلعہ انگریزوں نے خالی کر دیا - سینکڑوں عورت سلاطین زادوں کی مجبواؤں نے چاؤڑی آباد کی - وہ بھی عبرت کی جاتھی کہ چاؤڑی میں کچھ عرصہ قبل شاہجہاں آباد کے اصل حاکم مرہٹہ سردار عدالت لگاتے تھے - یہ بھی مقام عبرت -
حیثیت نام تھا جس کا -

سابق مغنیہ اور رقاصہ دنوا ز عرف بیگماں ڈولی سے انٹر کر اپنے مانوس زینے پر گئیں - محض آٹھ سال قبل یہ ساری عمارت ان کی ملکیت تھی - نیچے دوکانیں - اوپر وسیع مکان - بازار کے رخ طویل بالکنی - جس پر حقیقی پڑی رہتی تھیں - اندر ایک پردے دار کوٹھری میں مہرو کی بہو رہتی تھی - مہرو کا نوجوان لڑکا شندواب طائفے کا منجر تھا - مہرو کی لڑکی شمو کے جمال جہاں سوز اور گلوکاری کی وہی شہرت تھی جو آج سے تیس بیس سال قبل اس کی ماں اور خالہ نے حاصل کی تھی -

زینے پر پہنچ کر دلنوازا چانک بہت گھبرائیں۔ نیچے روسائے شہر کی گھگھیاں۔
— اوپر لال کمرے میں محفل شعر و سخن جاری —

دلی کی مقبول ترین معینہ مہر و اپنی ذہانت اور حاضر جوابی کے لئے مشہور تھیں۔ فن طباطبائی میں طاق — ابھی چند روز قبل جب صاحب گورنر جنرل کسٹور ہند کلکتہ سے انٹرویو لائے۔ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے ان کا بیچ کیا گیا میزبانوں میں مہر و بھی شامل تھیں۔ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا نور مٹی مونی پلاؤ حضور و ایسے بہادر نے نوش فرمایا۔ کھٹک کی ماہر دلنوازا اور مہر و اور انکی ہم پیشہ بہنیں گویا اس سوسائٹی کی گیشا گرہ تھیں۔ کہ جاپان کی طرح یہاں بھی گھریلو بیویاں سوشل تقاریب میں شامل نہ ہوتی تھیں نہ ہندو۔ نہ مسلمان۔ سوائے کلکتہ بمبئی کی چند فرنگی چال ہندو پارسی اور سیکیمانی بوہری خوبی خواتین کے۔ بھرت ناٹم کی ماہر دیو داسیاں جنوبی ہند کی قدامت پرست ہندو سوسائٹی کی گیشائیں تھیں۔

اس وقت ۱۸۹۲ء میں، دیو داسی راج رتنم کو مدرائے میں اور بی مہر و جان کو دلی میں یہ بتلایا جاتا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب اسی ہندوستان میں اعلیٰ نسب شریف زادیاں اڑیسی کچی مڈی موسنی آتم بھرت ناٹم کھٹکلی اور کھٹک ناچیں گی محفلوں میں گائیں گی۔ بن ٹھن کے مشاعروں میں غزل سرا ہونگی آدم زاد آسمان میں تھگلی لگائے گا۔ کھٹک کی تکار کرنے والی نرنگی سماج کی تھٹھکا رکے بجائے سرکاری اعزاز حاصل کرے گی تو دیو داسی راج رتنم سوچتیں یہ آدمی بھنگ پی گیا ہے اور مہر و اس پیش گوئی کو شاہ بڑے کی گپ گردانتیں۔

چمپا کھلی — گلاب کھلا — موتیا کھلی — مہر و داغ کی غزل سنا چکی تھیں کہ مہری نے پیچھے سے آکر سرگوشی کی — ”بیوی ایک بڑھیا نیچے دروازے پر کھڑی ہے۔ حج کر کے لوٹی ہے۔ تم سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہے۔“ خوشی کے مارے مہر و کا

دل دھڑکنے لگا۔ آپا اگتیں۔ حاضرین جلسہ سے اجازت طلب کر کے مسرور و مضطرب زینے کے دروازے پر پہنچی۔ آپا کا آدھا سوختہ چہرہ اندھیرے میں نظر نہ آیا۔

مہر و نے بے اختیار آگے بڑھ کر بہن کے گلے لگنا چاہا۔ دنوازا ایک قدم پیچھے ہٹیں مہر و وقت بھری آواز میں بولی ”سلام آپا۔ عمر دراز۔ اندر تو آؤ۔“

بولیں جس روزان سیڑھیوں سے اتری قسم کھائی تھی اب اس پلید جگہ قدم نہ رکھوں گی۔ اب تو یہ گنہہ گار پاؤں حرم شریف، مدینہ منورہ، کربلائے معلیٰ۔ ”گلا زندہ گیا۔“

سنبھل کر وعظانہ انداز میں پھر بات شروع کی ”مہر و بندی۔ بس انتنا

کہنے آئی ہوں کوچ نگار ابجنے سے پہلے پہلے اب بھی تو بہ کرے۔ جانے کس گھڑی

ملک الموت تیری روح قبض کرنے آجائیں۔ بڑھا پا دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے جب

مجھے مسافر بنا کر گور میں اتاریں گے یا رشتنا تیرے مٹھی بھر مٹی ڈال کر واپس چلے جائیں

گے۔ گور کا گڑھیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیر اور تو۔ اور تو اور۔ بنو۔ ہمزا بھی ساتھ چھوڑ کر

بھاگ جائے گا۔ تختوں تلے منوں خاک کے نیچے نقد دم اکیلی۔ منکر نکیر وں کو کیا جواب

دے گی۔ ہیں۔ ہاں اور جب بروز قیامت تو سر سے مٹی بھاڑنی قبر سے نکلے گی۔“

مہر و حق دق آپا کا منہ تک رہی تھی۔ زینے کی تاریکی میں تجن بی کے اس غیبہ متوقع

اور ناگہانی ہیبتناک وعظ نے اُلٹا اثر کیا۔ موت سے وہ بے حد خوفزدہ تھی کہ چھ سال کی

جان نے پورے خاندان کی لاشوں کے ساتھ سارا دن اور آدھی رات بتائی تھی معاً

طیش آگیا۔ بڑی بی نے آتے کے ساتھ کیا بدشگونی کی تقریر بھڑادی۔ ملک الموت آئے

دشمنوں کے پاس ”اے آپا بیگمات۔“ اس نے ہاتھ نچا کر کہا ”اچھی بہنا ہو۔ نہ سلام نہ

دعا۔ نہ خیر خیریت۔ آٹھ برس بعد لوٹیں تو چھوٹے ہی گور گڑھا کرنے لگیں۔ اے تم تو اب

فوارے پر جا کر پادریوں سے مناظرے کرو۔ اے ہاں مر دے شونی ملانی نہیں تو۔“

ذرا اپنا غصہ دھیمہ کیا۔ بولی ”اچھی یہ تو بتلاؤ۔ کب آئیں۔ کہاں ٹھہری ہو۔“

جتن بی چپ کھڑی تسبیح پھیرا کہیں۔

”آپا۔ اے آپا۔ اے بی کیا بہری بھنڈ بھی ہو گئیں؟ کس حال میں ہو؟“

— پھر تاؤ آیا — ”باقی یہ کہ بوا میری فکر نہ کر جس پاک پروردگار قادر مطلق نے مجھے اس کو ٹھٹھے پر پہنچایا اسی سے روزِ محشر جواب طلب کر دل گی۔ اسے بی ہم تم تو معصوم بچیاں تھے۔ اس پالنہار نے ہمیں یہاں کیوں پھینکوا دیا؟ اپنی مرضی سے تو ہم یہاں آئے نہ تھے — پہلے ہمارے ماں باپ بہن بھائی سارے کنبے کو اس اللہ پاک نے تلنگوں خاکوں کی تلواروں سے ذبح کر دیا۔ پھر چند گھنٹوں بعد اس میرے رب کریم نے مجھے اور ہمیں ایک کچنی کے حوالے کر دیا۔ آپا بیٹھ جاؤ کب تلک کھڑی رہو گی۔“

صحن میں سے ایک مونڈھا گھسیٹ کر زینے میں سرکا دیا۔ حجن بی لٹ سے مس نہ ہوئیں۔ مہر دے تھک کر کواڑ سے ٹیک لگالی۔

دفعۃً پھر گویا ہوئیں ”مان جا مہر و قیامت سہرہ کھڑی ہے۔ کہیں تیرا حشر منوری کشمیرن کے ساتھ نہ ہو۔“

”قیامت؟ اجی قیامت اس روز طفل بیگ کی سرایس آکر گذر گئی اب اور کیا آئے گی۔ آئی تو دیکھ لیں گے۔ رہیں اماں منوری۔ تو اچھی یہ تو بتاؤ اس رات اگر ہم دونوں بھوک سے بلبل کر جان نہ دیدیتے تو یا جنگلی جانور ہم زندوں کو نوچ کھاتے یا کوئی مواسکھ تلنگا جاٹ اٹھائے جاتا۔ اُپلے تھپواتا بھنگی کے ہاتھ پڑ جاتیں۔ جھاڑو ٹوکر اکرواتا آج کسی گاؤں کھڑے میں پڑے جھینک رہے ہوتے یا دلی پہنچتے تو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتے۔ ارے اماں منوری تو فرشتہ رحمت تھیں۔ کیا ہمیں لاشوں اور گیدڑوں اور مردہ خور جنگلی کتوں کی دوسرا تھ میں چھوڑ آئیں؟ ہم کو جو عیش آرام عزت دولت یہاں —“

”شیطان بے پناہ مانگ مہر و کفر نہ بک تو بہ کر —“

”بیوی خان بہادر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔“

”آئی ہوں۔“ چند سال قبل مہر دے سب سے کہہ دیا تھا آپا کا مکہ شریف میں

انتقال ہو گیا۔ لوگ انھیں بھول بھال چکے تھے مگر اے لو وہ تو سامنے موجود ہیں بھوت کی طرح۔

ہندی میں بھوت کے لغوی معنی ماضی کے ہیں۔ اردو میں بدروح۔ لغوی طور پر ہرگزری ہوئی چیز بھوت ہے۔ بھوت کال یعنی ماضی میں شامل۔ بھوت کو بھگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپا کو کس طرح اپنے آپ سے اتارا جائے؟ بے چاری دکھیا ماری میرے وجود کا حصہ ہیں۔ سگی بہن۔ مگر اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بھوت ہیں۔ ججن بی نے ہار نہ مانی۔ لولیس: ”اور جو میرا آپا جل گیا سارا۔ وہ از غیبی مار نہ تھی؟“ گوان کو محسوس ہوا کہ مہر کی منطق کے آگے ان کی تاویل ذرا کمزور پڑ رہی ہے۔ برفقہ پھیلا کر فرش پر بیٹھیں۔ مہر دھونڈھے پر تنگ گئی۔ عثمانی ساٹن کا کلی دار پانجامہ اور طلاکار جوتیاں پہنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے شوخی سے بحث کرتی وہ اصل ”مونڈھے والی“ معلوم ہو رہی تھی۔

”وہ حادثہ تھا آپا۔ بڑے بڑے نیک نمازی پرہیزگار اللہ والے حادثوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اے لوا بھی پرسوں سے پتے روزا خبر میں چھپا تھا کہ حاجیوں کی ایک اگن لوٹ میں آگ لگ گئی۔ سینکڑوں حاجی جل کے راکھ ہو گیا۔ تمہیں کتنا سمجھایا۔ ذرا سا جہرہ مجلس کیا تو کیا ہوا لوں سنیاں نہ لو۔ تمہارے گانے کے قدردان تم کو اس طرح سراہتے۔ وہی آؤ بھگت ہوئی۔ مگر تمہاری تو اس بیری والے بوبک نے مت کاٹی۔ دنیا بھڑوا دی۔ ایک فقے کے پتے باندھ دیا۔ برسوں پردیس کی خاک پھانکی۔ چلو اللہ توبہ اللہ معاف کرے حج کرائیں اچھا کیا۔ مبارک ہو روز حشر ہماری سفارش بھی کر دینا۔ مگر اب تو گھر لوٹ آؤ۔“

”مہر و — ماموں جی کیسے ہیں؟“

”ان کو تو عمرے بھی چار ساڑھے چار سال ہو گئے۔“

”اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے۔“

”گھر واپس آ جاؤ اور یہیں بیٹھ کر سب کے گناہ بخشواتی رہو۔ جم جم آؤ۔ ہم سب

ہاتھوں چھاؤں کریں گے بھانجی بھانجا ہو تمہاری خدمت کو حاضر ہیں۔“
 دکنواڑ چپ رہیں۔ اس لمحے ان کے قدم ڈگمگائے۔ باد چلی خانے سے لذیذ کھانوں
 کی لپٹیں آرہی تھیں۔ غرب تنان کی پھیکی سیٹھی غذا کھانے کھاتے عاجز آگئی تھیں۔ یہاں
 دو وقت کی روٹی کا سہارا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تنہائی
 میں بزرگانِ دین سے ایک طرف گفتگو کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اپنے مرحوم پیر صاحب سے
 لو لگائی۔ بند پوٹوں کے سامنے پیری کا درخت سرسرا یا جنت کا پیر جس کے پتوں میں اُبلے
 پانی سے آخری بار نہلائی جاتیں گی۔ سفید کھڑکھڑاتے لٹھے کا تھکان۔ فینچی۔ تختے گھڑے
 کوری چٹائی۔ آن واحد میں سب کی جھلک نظر آگئی۔ آنکھیں وا کیں۔ پیری گوندنی میں
 تبدیل ہوئی۔ ایک چڑ بانک عورت سامنے مونڈھے پر ہرا جمان تھی۔ گوندنی جیسی سونے
 میں پسلی۔ رات کی رانی جیسی معطر کام کٹہلا۔ بیباک۔ جیباختہ۔ انھوں نے اس
 اجنبی زنِ فاجتہ کو مخاطب کیا۔

”نہیں مہر و اب چل چلاؤ ہے۔ جنے کس وقت بلاوا آجائے۔ سات حج کرنے کے
 بعد اب یہ دبیز نہ پھلاٹنے کی“

”رہو گی کہاں؟ وہ تمہارے لگھ بھگت تو گئے مر۔“
 ”مہر و بندہ ان کا وصال ہو گیا۔ بد زبان۔ بے ادب۔ کافر نی۔ پہلے تو ایسی
 گستاخ نہ تھی۔“

”اب بات یہ ہے آپا۔“ مہر و نے بڑے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہاری
 دعا سے اب میرے ہاں بڑے بڑے انگریزی داں عالم فاضل آیا کرتے ہیں۔ دو چار
 مہربان سید کے مدرسے کے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ شعر و شاعری کے چکر میں وہ بھی آجاتے
 ہیں۔ اس وقت بھی اندر بیٹھے ہیں۔ تو یہ لوگ آپا بیگم آپس میں ولایتی فلسفہ بگھارتے ہیں
 — چار باتیں میرے کان میں بھی پڑ جاتی ہیں یوں کہتے ہیں کہ نہ حضرت آدمؑ نفع نہ اماں
 تو — شروع میں بند رہتا۔ یوں کہتے ہیں کہ یہ جنت جہنم عذاب و ثواب جزا
 سزا سب ڈھکوسلہ ہے۔“

”اللہ بخٹے آکا نوشتہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے۔ یاد ہے ایک مشاعرے میں وہ غزل انھوں نے پڑھی تھی۔ بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ عہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن —“
 ”ہائے مہر و نہجی — ہر طرح سے ماری گئی۔ گناہ فلک کی گردش نے کرائے۔ دین اسلام خود بُری صحبت میں بیٹھ کر کھویا۔ نوح اگر مجھے معلوم ہونا انگریزی پڑھ کر یوں ایمان غارت ہوتا ہے کا ہے کو علی گڑھ چندہ بھیجتی —“

”آپا اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم ہی کہو ہو کہ اس کے حکم بنا پتہ نہیں ہلنا: اتنے میں مہر و کوپکا تزا انگریزی قریش کا ایک جنٹلمین لال کرے سے نکل کر صحن میں آہنچا ”اچھا اللہ محمد کے حوالے —“ جن بی نے کہا اور گھبرا کر فوراً نقاب میں منہ چھپا لیا۔ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ زینے کی نیم تاریکی میں غائب۔

جس وقت چتلی قبر پہنچ کر بیرمی والے مکان پر اترتی ہیں اطمینان کا سانس لیا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ گھر والے کھانا کھا چکے تھے۔ جن بی سیلپر گھسیٹی داخل ہوئیں۔

”آؤ بیٹھو“ پیرانی اماں نے رکھائی سے کہا۔ وہ مہروم پیرجی کی چوتھی اور سب سے کم سن بیوی تھیں۔ جب نو سال قبل جواں سال دنوازاگ میں جلنے کے بعد پیرجی سے بیعت کرنے آئی تھیں۔ تب سے پیرانی اماں ان سے بے آگ حلتی تھیں۔ یہ نکاح کر کے عرب چلی گئیں انھوں نے شکر ادا کیا۔ خیر۔ بڑے میاں خود ہی اللہ میاں کو پیارے ہوئے۔ مگر اب جو یہ دوبارہ آن ٹپکیں ان کو بٹھلا کر کون کھلائے گا۔ تعویذ گنڈے کی آمدنی الفط۔ بھتیجا جلی پیر۔ نوسکھ اور اناڑی۔ اللہ ماری تینوں سوتنوں کی اولاد اور پوتوں پوتیوں کی پلاٹین کا پیٹ پالنا۔ تنٹیا مرج بہوئیں۔ اوپر سے ان بلائے بے درماں کو سہیڑوں۔

”اے بی جہاں گئی تھیں وہاں کھانے کو تو نہ ملا ہوگا۔ کہاں گئی تھیں؟“

”آئیے کھانا کھا لیجئے“ ایک بہو نے آواز دی۔ بھاری قدموں سے جو لے پائیں

ہونے پچکھا سالن سامنے رکھا جنگیری سے روٹیاں نکالیں۔ مہر کی التجائیں یاد آئیں۔
- آپا نہ جاؤ کہاں در بدر کی ٹھوکریں کھانی پھر وگی۔

دوسری صبح سے جتن بی اپنا وجود کارآمد ثابت کرنے کے لئے کمر بستہ ہوئیں۔
مسالے پیسے — چینگڑ پولوں کو نہلایا دھلایا۔ بڑیاں توڑیں۔ سیروں آٹا گوند ڈالا۔
ہفتہ بھر اس طرح گذرا۔ اب پیرانی اماں اور ان کی بہوؤں نے انکو باقاعدہ ماما چھو چھو
سمجھ لیا۔ ہر وقت کی دُوبدو بیگیاں پندرہ روزہ میں اس دانستاکل کل اور مشقت سے
چھیں بول گئیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ٹھانی۔ اب تک ہمت نہ پڑی تھی کہ در در
جا کر نیچیں اور چورن بیچیں۔ اور رات کو سوئیں کہاں؟ اب اللہ کا نام لے کر اعلان کر دیا
”پیرانی اماں لو میں چلی۔“

”اے بی کہاں جاؤ گی گلی کوچوں کی خاک چھانسنے۔“ پیرانی اماں نے اخلاقا کہا۔
”نہیں بس اب چل ہی دوں۔ جمعرات کی جمعرات حاضر ہوں گی۔“ جتن بی نے ہونٹ
پچکا کر جواب دیا۔ ”بو عجبہ بند یہیں چھوڑے جانی ہوں۔ پھر آکر لے جاؤں گی۔“
پیرانی اماں چپکی بیٹھی چھایا کتر کہیں۔ بیگمات نے دالان کے کونے میں رکھے
اپنے ٹرنک میں سے دو درجن رنگ برنگی سیچیں نکال کر کلائی میں ڈالیں۔ چورن کی
شمشیاں صدری کی جیبوں میں ٹھونسیں۔ بیٹھی ایڑی کی سلیم شاہی گھسیٹتی مکان سے
نکلیں۔ کچھ فاصلے پر ایک شاندار خانقاہ کے صحن میں سرو کے درخت سرسرا رہے تھے۔
بیرونی احاطے میں میرزا جان جاناں منظر کا مزار نظر آیا۔ سوچا معلوم کروں شاید زمانخانے
میں ماگیری مل جاتے۔ نہیں۔ اگر یہاں بھی گت بنی تو؟ بہتر یہی ہے کہ چورن اور تیسوں
سے جو چیز آنے روز ملیں نابنائی سے خریدوں نان قلیہ اور کسی درگاہ کے کونے کھدے
میں جہاں فقیر نبال سوئی ہیں سوزنی بچھا کر وہیں پڑ رہا کروں۔ اللہ رزاق ہے۔

لیکن نہ آدم نہ خوا۔ شروع میں محض بند رہتا؟ تو بہ۔

(۷)

دشتِ ماریہ

گلُرخ بانو عرف نواب فاطمہ بنت مرزا دلدار علی برلاس نظر فروش ساکن گلی شادانارا دلی

گلُرخ بانو بیگم نام دادا نے رکھا تھا جو تازہ وارد ولایتی مغل تھے۔ نواب فاطمہ نانا نے جن کے ایرانی قرلباش اجداد نوچہاں کے زمانے سے شاد گنج آگرہ میں رہتے آئے تھے۔ پیدائشی سبز قدم تھیں کہ نہ ہیاں دھبیاں سب پر لگتا تھا بی بی کی جھاڑو پھر گئی۔ جو غدیر مارے جانے سے بچے ان کو — ٹھوٹھو — دباؤں نے چن لیا۔ پانچ سال کی تھیں بیٹھے ہیں ماں اور آٹھ سالہ اکلوتے بھائی نے قصا کی۔ دلی کے صاحبِ جہنیت عظمِ فروش اور کبوتر بازی کے دلدادہ باپ نے بوڑھی پڑوسن کی مدد سے پالنا شروع کیا دوسری شادی کی فکر میں تھے کہ نپ دق کے شکار ہو گئے پلنگ پر پڑے رہے۔ اب ننھی مٹی نواب فاطمہ باپ کی تیمارداری میں لگ گئیں۔ وہ لیٹے لیٹے خوش الحانی سے سوز اور مرانی پڑھا کرتے۔ اور روتے۔ دوکان اپنے عزیز ترین دوست مرزا سبط احمد کے سپرد کی بی بی کا انگریزی علاج ہرگز نہ کروایا کہ الکل آمیز ادویہ کیسے پیتے۔ یونانی جاری تھا جب حالت دفعتاً بگڑی۔ بچتن پاک کی گواہی چہار دہ معصومین کا واسطہ دیکہ بچی مرزا سبط احمد کے سپرد کی۔ مرزا صاحب کشتہ زلی کی عدالت میں پیشکار تھے۔ مرتے وقت مرزا برلاس نے یوں کہا بھائی سبط نواب فاطمہ تمہارے توالے۔ یہ مکان دکان بھی تمہاری امانت۔ بچی سیانی ہو جائے تو ایک نیک شریف اشنا عشری کھر مغل زادہ دیکہ کر اس کا عقد کر دینا مکان دکان اس کے جہیز میں دینا۔ جو نقد می تمہارے توالے کر رہا ہو اس سے اس کے کپڑے لئے گھنہ بنا دینا۔ کچھ اس کی مرحومہ ماں بنا گئی ہے۔ ۱۔

مرحومہ کے زیورات کا صندوق بھی تم کو دیتا ہوں۔ نواب فاطمہ کی شادی سے پہلے نہ کھولنا۔ کبھی شوق میں غید بقرعید نور و زبر زیور پہنا چاہا۔ بچہ ہے گنوا دیگی۔ بس اس کی شادی کے وقت ہی کھولنا۔ زیوروں کی فہرست صندوق کے پیش تختے میں موجود ہے۔ جو نقدی کم کو دیتا ہوں میری تجہیز و تکفین فاتحہ۔ اور مجلس کے بعد جو بچے بنک میں نواب فاطمہ کے نام سے اکاؤنٹ کھول کر ڈال دینا باقی جب تک تمہارے ہاں رہے اپنے گھر جانے سے پہلے، اس کے اوپر جو خرچہ آئے اس رقم میں سے منہا کرتے جانا۔“

مرزا دلدار علی تاجر آدمی حساب کتاب کے پکے۔ ایک ایک بات اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے متعلق اپنے دوست سے طے کر کے سارا انتظام بچتہ کر کے مرے بچی کے ولی خود عدالت کے پیش کار قانونی آدمی مرزا کی وفات کے فوراً بعد روتی سیٹھتی پچھاڑیں کھاتی آٹھ سالہ نواب فاطمہ کو اپنے ہاں لے آئے۔ چلتے وقت نواب فاطمہ کی گڑیوں کی سدرخ پٹاری بھی ساتھ لے لی۔ صندوق زیورات گڑیوں کے نیچے چھپا دیا۔ بچی کو ایکے پر بٹھال کر اپنے گھر پہنچایا۔ گھر پہنچتے ہی زیورات کا صندوق پٹاری سے نکال اپنے آہنی ٹرنک میں مقفل کر دیا۔ اس رات نواب فاطمہ روتے روتے بھوکے سو گئی۔ چراغ کی روشنی میں سبط احمد کی بیوی نے صندوق پٹرنک سے نکالا اور بچھلی کو ٹھری کا کچا فرش کھود کر اس میں دفن کر دیا۔ بوا اس زمانے میں لوگ بنکوں میں زیور کہاں رکھیں تھے۔

نتیجے کے بعد مرزا سبط احمد مرزا دلدار علی مرحوم کے مکان کا سارا اثاثہ دو چھکڑوں پر لا کر اپنے گھر لے آئے۔ مکان کرائے پر اٹھا دیا۔ خوشبو خانے کے شیشے اور کنٹنر سب اپنی تحویل میں لئے دوکان پر قبضہ کر اپنے بھتیجے کو اس پر بٹھا دیا۔

نواب فاطمہ ان کے گھر میں دن رات رو کر رہتی۔ زندانِ شام میں مسلسل گریہ فرماتی بناب سیکینہ کی ایک بے زبان کینیز۔

مرزا سبط احمد کی بیوی نے کہنا شروع کیا۔ کیا نحوست سمیٹ لائے۔ بھینٹ کے آنسو ہی نہیں تھمتے دور دفان کا لامٹہ۔ باپ کی موت اور اچانک اپنا گھر چھوٹ جانے کا ایسا دہا کا لڑکی کے دل پر بیٹھا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے پتے کی طرح لرزے لگتی۔ گھنٹوں گم سم پتی

یا پھر رونا شروع کر دیتی۔ ”کچھ ہاتھ بھی بلا شہزادی گلرخ“ مرزا کی بیوی ایک روز اس کے آگے آئے گا کو نڈا رکھ کر بولیں۔ اب وہ دن بھر کام کرتی اور روتی — اس گھر میں آئے ایک مہینہ گزرا تھا برتن دھوتے میں ہاتھ سے چینی کا ڈونگا کر کر ٹوٹ گیا۔ مرزا صاحب کی بیوی نے چلانا شروع کیا ”بھن پیری۔ منخوس ددھیال نہیال ماں باپ بھائی سب کو چٹ کر گئی جب سے یہاں آئی ہے تین تو میری مرغیاں مر گئیں۔ بچوں کو بخار نہیں چھوڑتا۔“
 لوصاحب آج اتنا قیمتی ڈونگا چھن سے توڑ ڈالا۔ کام کی نہ کاج کی ڈھائی من اناج کی۔
 ”اتنا تو کام کرتی ہے صبح سے نختی سی جان۔“ ہونے کہا۔

”تو بیوی تم ہی اس کا خرچہ اٹھاؤ۔ میرے بس کا روگ نہیں۔“

اب اٹھتے بیٹھتے مرزا کی بیوی نے لڑکی کے کان میں بات ڈالنا شروع کی — ان کے باوا ہمارے مقروض مرے۔ ہم وہ نقصان بھی سہیں اور صاحبزادی کو بھی پالیں —
 نواب فاطمہ مقروض کا مطلب نہیں سمجھتی تھی اس نے بہو سے کہا ابا کو تو دق ہو گئی تھی۔ بہو اصل حالات سے ناواقف تھی اس نے جواب دیا شاید تمہارے ابا نے ہمارے سسر سے قرضہ لیا ہوگا۔ پیسہ لیا ہوگا ادھار۔ وہ ادا نہیں کر سکے۔ ساس نے دور سے دیکھا۔ بہو سے بولیں ”یہ بیٹی اس کے کان میں کیا بالاپرورہی ہو ایس؟“

دو تین مہینے گزر گئے ایک روز پیشکار صاحب نے نواب فاطمہ سے کہا ”بیٹا بات یہ ہے کہ ہمارا تباہ ہو گیا ہے لاہور۔ تم کو ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ سرکاری قانون یہ ہے کہ جو بچہ جس شہر کا ہے اسی جگہ رہے۔ اس لئے ہم تم کو ایک دوست کے ہاں پہونچائے دیں ہیں وہاں تم بڑے آرام سے رہو گی۔ اپنا سامان باندھ لو“ نواب فاطمہ پچھلے چند مہینوں میں کچھ سن سی ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں صرف اتنا آیا تھا کہ یہ ہے میں ہم تم کو ایک اور جگہ پہونچاتے ہیں سامان باندھ لو۔ فرمانبرداری سے اٹھ کر دالان میں گئی۔ پرچھتی پرچھٹھ اپنی لال پٹاری اتاری۔ اس میں اپنی گڑیاں ٹٹول کر دیکھیں کہ حفاظت سے ہیں —
 طمان ہو گیا کہ موجود ہیں۔ مع ابا کے عطر کی ایک شیشی۔

مرزا کی بیوی نے اس کے روزمرہ کے چند کپڑے اسکی پٹاری میں ٹھونس دیئے۔ بڑھیا کپڑوں کا صندوق وہ پار کر چکی تھیں۔ دری چادر تکیہ اور رضائی مُتلی سے باندھی نواب فاطمہ کے گھر سے آیا ہوا سارا قیمتی سامان ایک کمرے میں مقفل کر رکھا تھا۔ پٹاری اور بستر اسنبھال وہ اپنے نئے سفر کیلئے تیار ہوئی۔ مرزا صاحب نے اس کو ایکٹے پر بٹھالا اور پلیماروں کی طرف چل دئے۔ ایک واقف کار شیخ عبدالباسط گوٹے والے سے بات کر چکے تھے۔ ایک یتیم دیسیر لڑکی ہے۔ روٹی کپڑے پر اپنے ہاں اوپر کے کام کے لئے رکھ لیجئے ثواب ہوگا۔ شیخ صاحب نے خلال کرتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا تھا بھوادیجئے۔

پیشکار صاحب اب نواب فاطمہ کی جائداد پر بلا شرکتِ غیر سے قابض تھے۔ قانون داں آدمی۔ سب کام نگریم سے کیا تھا۔ مکان دکان زیورات عطریات کا اسٹاک سب ملا کر نواب فاطمہ کوئی تین سہارا کے ترکے کی مالک تھی اس زمانے کا۔ اللہ اکبر آج کا سمجھو چاس لاکھ جو اس سے چھین گیا۔

شیخ عبدالباسط صدر بازار اپنی دکان پر جا چکے تھے۔ ایک باؤلا سا چھوکر امداد ڈیوڑھی پر کھڑا ناک کھجڑا ہاتھا۔ مرزا صاحب نے اُسے آواز دی ”ادھر آئے۔ لونڈیا کو اندر رہو بچا دے۔ شیخ جی سے کہنا پیشکار صاحب آئے تھے۔ یہ دونوں ننگ سنبھال“ نواب فاطمہ خود کو دکر ایکے سے اتر آئی۔ اُسے گاڑیوں پر سے اُترنا چڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پیش کار صاحب نے کوچوان سے کہا۔ چل بھی سیدھے کچہری آج دیر ہو گئی اور پیچھے مرزا نواب فاطمہ پر نظر ڈالے بغیر جلدی سے ایک آگے بڑھوا لیا۔ جیسے اچانک خوفِ خدا سے ڈر گئے ہوں۔

مردوٹے ریلوے کے قلیوں کی طرح پٹاری بغل میں دبائی بستر اس پر رکھا اور بولا آجا میرے پیچھے۔ و دزنانی ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں پہنچی مدوڑ پر دے کی وجہ سے ڈیوڑھی پر رک گیا۔ نواب فاطمہ بستر ادھکیلتی ہوئی دالان میں لے گئی۔ پھر پٹاری

اٹھا کر لائی۔ کسی نے اس کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔ ایک لڑکی پلنگ پر بیٹھ رہی، بال کا ڈھ رہی تھی۔ مراد آبادی کٹورے سے پانی پینے کے بعد سر اٹھا کر دیکھا۔ صحن میں ایک ننھی بچی لال رنگ کی پٹاری سنبھالے سہمی کھڑی ہے اور مٹر مٹر چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پچھلے تین ماہ میں یہ دوسری اجنبی جگہ تھی۔ جہاں قسمت کے پھیرنے اسے لا ڈالا تھا۔

شیخ جی کی بیوی بادرچی خانے سے اٹھ کر آئیں۔ بچی نے تیز سے سلام کیا۔

”اری کہاں سے آئی ہے۔ پہلے کہاں تھی؟“

”پشیکا صاحب کے ہاں۔“

”وہاں کام کرتی تھی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ کپڑے انھوں نے ہی بنوا کر دیئے؟“

پھر آنکھوں میں آنسو۔ ”ابا نے بنوائے تھے۔“

”کب مرے ابا تیرے؟“

”ابھی مرے ہیں رمضان شریف میں۔“

”کیا کرتے تھے؟“

”عطر بھیل بیچتے تھے۔“

”اور تیرا کوئی نہیں؟“

”نہ۔“

”اجی جس کا کوئی نہ ہو اس کا خدا ہے۔“ شیخ صاحب کی بیوہ بہن نے پن کٹی پر سے

سر اٹھا کر ارشاد کیا۔ ”ادھر آ۔ ذرا میرے سر میں تیل لگا دے۔ ابھی طرح۔ یہ پٹاری

چھوڑ۔ رکھ ادھر۔ کیا اس میں خزانہ لے کر آئی ہے ہیرے کے زیور ہیں جو اس سے چھپی

کھڑی ہے۔ کیا ہے اس کے اندر؟“

”کپڑے اور گڑیاں۔“

سب نے قہقہہ لگایا۔ نواب فاطمہ کے دل پر چوٹ پڑی۔

”لا اپنی گڑیاں دکھا۔ کس نے بنائی تھیں؟“
”انہوں نے۔“

”اے ہے چھوڑو غنیمتی کی پٹاری۔ اسے کام پر لگاؤ۔ پہلے تیل ڈال سر میں پھر ذرا لپک
لر مسالہ تو پیس دیجیو۔ شاباش۔“

سو نہی سی جان نواب فاطمہ جواب نوابن چھو کر یہ کہلاتی ہے روٹی کپڑے پر شیخ
عبدالباسط گوطے والے کے ہاں ملازم ہے پیسہ کار صاحب نے یلٹ کر اس کی خبر
نے لی۔ نہ شیخ جی نے کبھی اس کے متعلق کچھ پوچھا۔ دلی شہر میں ہزاروں یتیم
بچے رلتے پھرتے ہیں۔ جب نواب فاطمہ کے ساتھ یہ مصعب ہوا۔ اس کے دلی نے
امانت میں خیانت کی۔ اس کی جائیداد پر قابض ہوا اس کو کھیا کو خبر ہی نہ تھی کہ اس کے
ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ مگر دن بھر کے کام سے تھک کر جب رات کو سونے لیٹی تو گلی شاہ نانا
اور اپنا گھر اکثر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ایک ایک چیز کو یاد کرتی۔ سہ درے میں نعت خانے
کے برابر گلاب کے پودے کا گملہ رکھا تھا۔ صحن میں چنبیلی اور ہارسنگھار کی کبیریاں
مرزا دلدار شوقین نفیس طبع آدمی تھے۔ مکان مشہد مقدس اور کربلائے معلیٰ کی تصاویر
اور طغروں سے سجایا رکھا تھا۔ منے سے امام باڑے کی سیاہ چھت گیری میں بہتر شہدائے
نام کا رچوب سے کر ڈھے ہوئے تھے۔ سامنے دالان میں اماں کے جہیز کا ایرانی فالین
بچھا رہتا۔ چاندنی کے چاروں کونے پر بھرت کے میر قزش۔ وسط میں مسند۔ پلنگوں پر نفیس
سوزنیاں۔ چھت پر کونروں کے گلابک۔ وہ ایک ایک چیز کا تصور کرتے کرتے سو جاتی، کبھی
رات کو وہ محرم کا زمانہ یاد کرتی پہلی سے اربعین تک کے نوچے جو آب پڑھا کرتے تھے اور
ایک بار وہ سب آگ کاڑی میں بیٹھ کر لکھنؤ گئے تھے محرم کرنے۔ دھندلا سا یاد تھا۔
اور ایک بار نانا آبا کے ہاں شاہ گنج آگرے اور شہید ثالث کا روضہ۔ اور خوب دال بوٹھ
اور پیٹھے کی مٹھائی کھائی تھی اور نوچے جو آب پڑھتے۔ یاروچہ، خون۔ کہ ۶
دیدہ چساں، روز و شب۔ چراہ در غم کد، غم سلطان کربلا۔ نامش نچکر، حسین۔

زنشراکہ از علیٰ — مادرش کہ بود فاطمہ — جدش کہ — مصطفیٰ — چوں شد ؟
شہید شد — بہ کجا ؟ دشت مار بہ —

عموماً وہ قانی کا یہی نوحہ دہراتے دہراتے سو جاتی ہے۔ فجر کی اذان کے ساتھ کلمہ پڑھتے ہوئے اُبٹھ بیٹھتی ہے۔ آنگن کے کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکالتی ہے مُنہ مُنہ ہاتھوں سے چرخ کی رسی کھینچتی ہے۔ تب جا کر ڈول اوپر آتا ہے۔ شب کُشتہ شد ؟ نہ۔ روز۔ چہ سنگام ؟ ز سر جشمہ فنا۔

نواب فاطمہ ڈول سے پانی نکال کر اپنا لوٹا بھرتی ہے۔ منڈیر بر بیٹھ کر وضو کرتی ہے اتنی دیر میں گھر والے نماز کے لئے اُٹھ جاتے ہیں۔ خود نماز کے بعد وہ بہو کے ساتھ مل کر گھر بھر کا ناشتہ تیار کرتی ہے۔ جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر آنگن میں دھری بل پر ڈھیروں مسالہ پیسنے میں جُٹ جاتی ہے۔ تھوڑا بڑھتی ہی میں آکر سودا سلف دیتا ہے وہ خود ہاتھ بٹھا کر اس سے لے لیتی ہے۔ اب وہ نو سال کی ہو چکی ہے۔ اس کے لئے چھوٹا سا برقعہ سدا دیا گیا ہے۔ میلے کپڑے۔ اچھے بال۔ پٹاری خالی پڑی ہے۔ دو جوڑوں سے کتنی بھر سکتی ہے۔ گرٹیاں گڈے البتہ اس میں حفاظت سے رکھے ہیں۔ جب کبھی فرصت ملتی ہے نکال کر اُن سے کھیل لیتی ہے نقلی موتیوں کا ہار اور چند چوڑیاں باطخانے سے شیخ صاحب اپنی پونی ٹونہ کے لئے لائے تھے اُسے پسند نہ آئیں اس نے نواب فاطمہ کو دیدیں وہ سینت کر پٹاری میں رکھ لی ہیں۔ عید پر پہننے کے لئے۔ اس کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں تھیں وہ شمر کے ہوتوں سوتوں نے اتار لیں اپنے گھر سے چلتا کرنے سے پہلے۔ دیکھو کلام مجید میں بار بار آیا ہے کہ یتیموں کا مال غصب کرنے والے کتنے بڑے گنہگار ہیں۔ خاتینوں منافقوں ریاکاروں اور حاسدوں کے کروت و دیکھ کر قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر ایمان لانا پڑتا ہے ہوا۔

آغا سائے تازہ ولایت دادا کی پونی کلرخ کا رنگ پٹکا پڑنا تھا۔ گھنے سیاہ بال ستواں ناک سر مگیں آنکھیں کیا پری رُو مغل بچی تھی کہ اس افلاس اور معیبت میں بھی پاند ساروشن ہونا جا رہا تھا۔ تیرہ سال کی ہو چکی۔ شیخ عبدالباسط کی بیوی نے طے کیا اگلی

صبح الاول ہندو چھو کرے کے ساتھ دو بول پڑھوا دیں گی۔ کنواری جوان لڑکی گھر میں کھانا گناہ۔ وہ خود شیخ صاحب کی طرف سے ان کی بیویوں اپنے اپنے شوہروں کی طرف سے چوکنی ہو گئی تھیں۔

گوٹے والوں کے اس دولت مند مذہب پرست گھرانے کی فربہ مطمئن بیویاں چوڑے پائیچوں کی شلواریں پہنے کڑتوں پر موٹے موٹے طلائی بٹن لگائے ٹھوس پیلے سونے کے شیر دھاں کرٹے کلائیوں میں پھنسائے دن بھر پان چباتیں اور مرغین کھانے نیا کرتیں۔ شیخ صاحب کی بیوی۔ بیوہ بہن۔ دو بیویاں اور ایک پونی غوثیہ جو نوابن سے دو تین سال چھوٹی تھی سب کی سب ہر وقت کھانا پکانے میں جٹی رہتیں۔ گھر کے مرد زیادہ تر دکان پر رہتے یا مردانے میں۔ نہایت خوش باش اور بے فکری مستورات کھانے کھلانے نذر نیاز، شب برات، گیارہویں شریف، بی بی کی صحنک امام جعفر صادق کے کونڈے، سادوں کے پکوان، موسمی کھانوں، گھریلو تقریبوں میں ہمہ تن مصروف اور مگن۔ کوئی شادی ہوتی اس کی ریت رسمیں ہفتوں مہینوں جاری رہتیں۔ نوابن دن سے لے کر رات تک کام کرتے کرتے ادھ موٹی ہو جاتی ابھی اس کے کان میں بھنگ نہ پڑی تھی کہ نیم پاگل مدد سے اس کا بیاہ ہونے والا ہے۔ ایک دن معلوم ہو گیا۔

بڑی بہو کپڑے دھوپ میں ڈال رہی تھیں گوٹے لچکے سے لیے بادے کا ایک پرانا دھڑا سُرخی دوپٹہ نکال کر ایک طرف کو رکھا۔ ان کی لڑکی غوثیہ نے کہا اماں لاؤ ہمیں دو۔ ہم گڑیا کے دوپٹے بنائیں گے۔

”رہتے دے“ ہاں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نوابن کا بیاہ سر پر آ رہا ہے۔ نگوڑی دہن بن کر کیا اڑھے گی؟“

قریب کھڑی نوابن دھوپ میں لال پیلی مرچیں سکھا رہی تھی دھک سی رہ گئی۔ میرا بیاہ کس سے ہو رہا ہے؟ رات کو کھٹولی پر لیٹنے سے قبل اس نے غوثیہ سے پوچھا ”مدد سے اور کس سے؟“ غوثیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”مردو سے؟“ نوابن نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔

”تو اور کیا تیرے لئے حیدر آباد کا شہزادہ آئے گا؟“ یہ کہہ کر غوشیہ نے نتختوں کے چوکے پر لوٹ لگانی اور خوب ہنسی۔

اس رات جب سب سو گئے نوابن کھٹولی سے اٹھی۔ تاروں کی چھاؤں میں دبے باؤں چلتی جا کر کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ ایک بھوری بلی پھت پر سے کودی۔ بے مروت بے رحم زرد زرد آنکھوں سے اُسے گھورتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ دور ایک کتا دیا۔ بڑا خوفناک سناٹا طاری تھا۔ سارا دلی شہر سو یا پڑا تھا اس وقت اس نے محسوس کیا کہ ساری دنیا دشتِ ماریہ ہے اور اس میں وہ تنہا کھڑی ہے۔ اور اس سے زیادہ ستم رسیدہ ہونا ممکن نہیں ہے اس لمحے اس نے طے کیا کم از کم ایک دن قبل بتائیں گے کہ نکاح ہو رہا ہے بس رات کو چپکے سے آکر اسی کنویں میں کود جاؤ گی یہ طے کر کے اُسے ذرا سکون سا محسوس ہوا اور وہ واپس آکر اپنی کھٹولی پر پڑ گئی۔



(۸)

پُھوَرَنُ وَاِی حَجِّن

گرمی جاڑے برسات دلی کی گلیوں میں، اور چاندنی چوک میں پھیری والے بھانت
بھانت کی صدا میں لگاتے۔ قدرت کا بنا جلیبا کھالو—گل گلاب بہدانہ—قند میں بنا
بہدانہ—شاہ مرداں کی لالٹریاں—تیس ہزاری باغ کے پونڈے ہیں لے چل—
ان آوازوں میں ایک کمسن لڑکے کی منحنی آواز بلند ہوتی—اجی تسبیحیں آئیں
مدینے پاک سے—چورن لے لو مکے شریف کا—

اس باریک صدا پر کراہی کر خنداری آوازیں غالب آجائیں—اوئے میاں۔
شبدی گوہر کے باغ کا دانہ قند میں بنا—کھانڈ کا کھلونا ہے پیسے کا—کھانڈ کی لکڑی
ہے پیسے کی—چاٹ ہے—ہندوستان کے میوے کی—چاٹ ہے ہندوستان
کے لٹکے کی—ساس کے چورے کا گٹکا—

بچہ پھر پھچھڑوں کی پوری طاقت سے چلاتا—مکہ شریف کی چورن—آپ زمرم
میں پس چورن—لکڑہضم—پتھر ہضم—چورن—

ایک برقعہ پوش بڑی بی تھیلا سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ رینگا کرتیں۔
موسم گرما میں صدا میں بدل جاتیں—بھول والے پکارتے—بہار ہے
موتیا میں—جی مدن بان ہے موتیا کے کٹوروں میں—پانچوں کپڑے معطر ہوتے
ہیں چنبیلی میں—گڈمی ہے چپاکی—بڑے کھٹے ہیں رائے بیل چنبیلی کے—
بہشتی کٹورا بجاتے—کوئی طالب اللہ پلا دے سبیل—کوئی طالب حسین کا
پلا دے سبیل—ٹھنڈا بھر کے لائے ہیں پانچ کوڑی میں—تیرے پاس ہے تو
دے جا—نہیں تو پی جا راہ مولا—پیاسو سبیل ہے شہیدوں نام کی—

— ملے شریف کی چورن — آب زم زم —
 — رنگت کے گھڑے ہیں لال تر بوز — جاہیں لون والی —
 — بوندا باندی بھڑبلی کے — جھرنے کا بتا شہ کوڑ ہے —
 — دیاسلانی بے آگ روشنی — بے آگ مہتاب —
 — مرمرا بے بانس متی کا — سنگھاڑے ہیں شمس تلاء کے ہرے دودھیا،
 — خاک شفا کی تسبیح —

رات پڑے بڑی بی اور بچہ کسی سائبان کے نیچے جا بیٹھتے۔ بچہ نابنائی سے کھانا خرید لانا۔ سر جوڑ کر دونوں کھاتے اور وہیں پر کر سورتے۔ بھادوں کے بھالے نے ستایا تو چورن والی جن بی نے ایکے پر بیٹھ کر سلطان جی کا رخ کیا۔ وہاں ایک پھانک لے کوئے میں ہا دن دستے میں چورن کو شتیں پستیں۔ دودھ پیسے کی پڑیاں زائبرین خریدے جاتے رات کو چند قدم پر سنگ سرخ کی اس سرائے میں جا پڑتیں جہاں پانچ سو سال ادھر ابن ابیطیہ نے قیام کیا تھا۔

پیرانی اماں کے گھر سے نکل کر جن بی نے اللہ کوکل تسبیح بیچنی شروع کی تھی مگر آواز لگانے سے بے طرح جھینپ رہی تھی تبھی دوسرے روز ہی سے یہ یتیم بے خانماں بچہ ایک وفادار کتے کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔ جن بی نے اسے غیبی امداد مانا۔ اسے صدالگانا سکھلایا۔ اور گویا باقاعدہ اپنی بزنس شروع کر دی۔

سلطان جی آئے ایک مہینہ گزرا تھا۔ لونڈا دلی کی کلیوں کا روزا محبوب الہی کے آستانے پر دل نہ لگا — ایک روز جب فجر کی اذان پر جن بی کی آنکھ کھلی دیکھا لڑکا غائب۔ ساتھ ہی جن بی کا حریطہ ندر جس میں انھوں نے اپنی ساری پونجی کا اندوختہ کیا تھا گھبرا کر جامہ دانی میں سے کھتی لکالی۔ صرف ایک روپیہ ملکہ کے چہرے والا ٹھن سے گرا۔ اپنا بے بضاعت سامان باندھ اللہ اللہ کرتی سر و آہیں بھرتی پھر باہر نکلیں طے کیا مہر و کے گھر واپس چلی جاتیں۔ راستے بھر سوچا کیس۔ گاڑی ایک قبرستان سے

گذری دفعۃً خوفِ خدا نے پھر آن دلوچا۔ فرشتوں کے گرز۔ تھوہڑ کی بھیجا۔ آبِ زقوم۔
 ہمیشہ ہمیشہ۔ جب تک اللہ گنہگار مومنین کو پوری سزا نہ دے لے۔
 بلیما آروں میں پہنچ کر کرایہ ادا کیا۔ اور انزگتیں۔ صدا لگانے کی ہمت نہ پڑی۔

ارے اسی نغمہ آراں کی پری تانیں بڑے بڑے گئی جنوں کو مسحور کرتی تھیں۔
 راگ سے روگ کاٹتی تھیں۔ کوہِ قاف کی پری کہلاتی تھیں۔

اس وقت حلق سے ایک نجف آواز نکلی — مدینے شریف کی چورن —

ایک چڑی مارے بھروں کی بہنگی اٹھائے چلانا ہوا آیا۔ ٹوٹیاں طوطا بے پالنے کو۔
 نرچہ ہے بہر آسن طوطے کا۔ کالا کو آچھوٹے۔ چھوڑ دیں جل جو گئے کو۔ چھڑا دو۔ دو
 جالوریں۔ بسیرا دیں۔

اے میرے مالک پروردگار عالم مجھے بھی کہیں پناہ دلو اے جتن بی نے ہل بلا
 کر دعا مانگی۔ پیچروں میں بند پرندے بے پناہ شور مچا رہے تھے جتن بی نے پھر
 اہل دنیا کو مطلع کیا ”سبج ہے کر بلائے معنی کی تسبیح ہے خاک شفا کی“ — لیکن آواز
 مفید چڑیوں کی فریادیں ڈوب گئی۔ آخر تھک کر گلی کے کنارے کھڑی ہو گئیں۔ برقعے
 سے ریلوے سگنل کی طرح ہاتھ باہر نکالا۔ کلابی میں رنگارنگ تسبیحیں — مجسم سوال۔
 تین چار دن اس طرح گذرے۔ کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو دروازوں پر
 جاکر دستک دیتیں — ”خاک پاک کی تسبیح — چورن کے شریف کی۔“
 رات کو ایک خالی دوکان کے برآمدے میں جا پڑتیں۔ جمہرات کے روز پھیری پر نکلیں
 حویلی حسام الدین حیدر کے پھاٹک میں مڑ گئیں۔

مبارز الدولہ حسام الملک حسام الدین حیدر غالب کے ختمِ نواب الہی بخش معروف

کے عزیز دوست تھے انکے بیٹے حسین مرزا سے مرزا نوشہ کا لڑکپن سے یار نہ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد حسام الدین حیدر کی وسیع و عریض حویلی کے اندر محض ۱۱ اور دیندار پنجابی آن بے تھے۔ یہ چورہ فروش نسلاً ملتان کے کھتری تھے۔ صدیوں قبل ان کے تجارت پیشہ اجداد کو حضرت شمس الدین گردیزیؒ نے کلمہ پڑھایا تھا۔ بساط خانے کے کاروبار کی غرض سے بعد شاہجہاں دہلی پہنچے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے چار پانچ سال بعد انگریزوں نے انکے محلے سے انہیں بیدخل کر کے اس جگہ ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا۔ انہوں نے احاطہ کاٹے صاحب، پھانک حبش خاں اور حویلی حسام الدین حیدر میں اپنے گھر بنائے۔

چوکیدار نے پھانک کا دروازہ کھولا۔ جن بی بہت آہستہ آہستہ چلتی گئی گونچانہ میں کوہلیں۔ ایک ڈیوڑھی کی کٹڑی کھڑکھڑائی کہ گلی کا کتا دوڑ پڑا۔ دہل کر اٹھے پاؤں بویں کچھ دور جا کر ایک تنگ و تاریک کوچے میں قدم رکھا۔ ایک شاندار دروازہ دکھائی دیا۔ میٹر ہی پر جا کر دستک دی۔ آواز لگائی۔ ”تبیخ خاک پاک کی۔“

نجیب زادیوں کا ان دلوں سے یہ معمول۔ وہ برقع سر پہے جس کا قدم تلک ہے طول۔ اور انکے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ ہے اصول۔ کہ خاک پاک کی تبیخ ہے جو بیجے مول۔ سودا کی دلی سے داغ کی دلی تک شہر آشوب مسلسل ہے۔ اور دنوازا بانو بیگم بھی لواصلہ نجیب زادی ہی تھیں۔



پریوں کا کھولہ

جمعرات کے روز فقیر بھانت بھانت کی صدائیں لگاتے۔ نوابن ڈیوڑھی میں جا کر کسی کو آٹے کی چٹکی دیتی، کسی کو پیسہ، ٹکے۔ پانی۔ چھدام۔ کوڑی۔ جو جسکا مقرر اور مقدر ہوتا۔ خالی کے مہینے میں ایک جمعرات کنڈی کھڑکی۔ نوابن نے باہر جھانکا۔ میلا برقعہ اوڑھے ایک بڑی بی در میں کھڑی تھیں۔ ایک ہاتھ میں اگر بنٹی کے بندل دوسرے میں چوڑن کی شیشیوں کا تھیلا۔ کلانی میں سبجوں کے رنگ برنگے ٹچھے۔ گویا سرتاپا ایک کوچہ گرد جتن ان سے پوچھے بغیر نوابن نے پلٹ کر آواز دی ”بیوی۔ جتن بی آتی ہیں مکے مدینے سے“

شیخ عبدالواسط کا چھوٹا پوتا صبح سے بخار میں پڑا بھٹن رہا تھا۔ تیمارداری میں مصروف دادی نے جواب دیا ”کہدے برکت ہے۔ پھر آئیں“

”اے ہے بھابی جتن ہیں۔ منع نہ کرو۔ گناہ ہوگا۔ اے نوابن۔ بلالے“ نند نے باور چھانے میں سے پکارا۔

جتن گزرگاہ سے نکلتی صحن میں آئیں۔ سہ درے میں پہنچ کر سبجیوں والا ہاتھ پھر سگنل کی طرح سامنے کر دیا۔ بولی کچھ نہیں۔ اب وہ بولتی بہت کم تھیں۔

”السلام علیکم۔ بیٹھے“ شیخ جی کی بہن نے تپاک سے کہا۔

”وعلیکم السلام“ پیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ دوپٹے سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

سرخ و سفید رنگت، کھڑے نقشے والی ان جیسی مصیبت زدہ قبول صورت عورتوں سے شہر ٹپڑا تھا۔ گو غدر کو چھٹیس، سینتیس برس ہونے آئے۔

جن بی نے اپنی ایک سوانح حیات گھڑ رکھی تھی جو بوقت ضرورت پُرساں حال کو سنا دیتی تھیں نہ بھی سناتیں تو لوگ سمجھ لیتے کہ ایسی ہی کوئی بتا رہی ہوگی۔ سارا ملک ہی اتنی بڑی ٹریڈی بن چکا تھا۔

”بوا کہاں سے آئیں۔“ شیخ جی کی بیوی نے پوچھا۔ جتن بی نے قصہ شروع کیا۔ باپ کا قلعہ سے تعلق تھا۔ سنہ ستاون میں مارے گئے۔ شوہر کے ساتھ جج کو گئیں۔ ہاں وہ چل بسے۔ نہ آل نہ اولاد۔ اللہ کی ذات کا سہارا۔ ایک کٹورہ پانی پلوا دو۔ حاجی کی خدمت ثواب۔ نوابین نے پانی کے کٹورے کے ساتھ ایک صحنک میں تھوڑا سا سالن اور ڈلیا میں رکھ کر ایک روٹی ادب سے پیش کی۔ جتن بی نے تکلف کیا۔ سالن ذرا سا چکھا۔ پانی پی کر نوابین کو دعائیں دی۔ بیویوں نے ایک ایک تسبیح چُن کر آنکھوں سے لگائی۔ ہدیہ نذر کیا۔ انہیں نے بتایا سات بار حج کر چکی ہیں شیخانی نے انکے ہاتھ جوڑے۔ ایک پُہنچا ادھ جلا دیکھ کر پوچھا ”اُونی۔ اب سے دُور یہ کیا ہوا تھا مغلائی بی؟“

”جدہ کے راستے میں آگ بوت پر کھانا پکانے کے لیے آنکھیں دہکار ہی تھیں۔ روٹی کی صدی پر چنگاری ایسی پڑی شعلے بھڑک اٹھے۔ جہاز کے فرنگی ڈاکٹر نے علاج کیا۔ پروردگار کا کرم تھا ورنہ جل کر کوتلہ ہو گئی ہوتی۔“

جس اللہ کی بندی نے سات بار حج کیا ہو وہ ایسے سفید جھوٹ بولے۔ مگر وہ عظیم و خیر میری ہر مجبوری سے واقف ہے۔ شاید معاف ہی کر دے۔ سامنے نگاہ کی۔ دھوپ چھتوں پر سے اتر رہی تھی۔ با وضو تھیں۔ کٹورے کے بقیہ پانی سے کھلی کی۔ فرش پر برقعہ بچھا کر عصر کے لیے کھڑی ہونے والی تھیں کہ شیخ جی کی بہن لپک کر مصلے لے آئیں۔

جب یہ سلام پھیر چکیں شیخانی نے آواز دی ”اے جتن بی نوٹ صبح سے بنجار میں پھنک رہا ہے۔ بہتیری دوائیں پلائیں۔ ذرا کچھ پڑھ کر پھونک تو دیجیو۔“

یہ فوراً بند کرنی چھلکی جھکی لڑے کے سر ہانے پہنچیں۔ دعائیں پڑھیں۔ پانی دم کر کے پلایا۔ قرآن شریف کی ہوا دی۔ اے لو۔ مغرب تک چھو کرے کا بخار کم ہو گیا۔ گھر بھر جین بی کا معتقد۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے تسبیحوں کو واپس بائیں ہاتھ کی کھونٹی پر لٹکایا۔ چلنے کے لیے اٹھیں۔ شیخانی نے پوچھا۔ ”کہاں رہو ہو۔۔۔“

”آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر“

”اے تو یہیں رہ جاؤ نا۔ اپنا گھر سمجھو۔ لونڈیوں کو کلام مجید پڑھا دینا“

جین بی نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ذرا ہچکچا کر بولیں ”تو میں اپنی گڈری لے آؤں۔ چٹکی قبر سے۔۔۔“

”کل لے آنا اب رات کو کہاں جاتی پھوگی۔ اری نوابن چمکو۔ کھانا نکال“

برقعہ اتار کپڑے پر۔ چھوٹی بہو نے پاندان آگے سر کایا۔ نوابن بٹاچہ لیکر آئی۔ اب انھوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ لگتا تھا کسی دن کی بھو کی تھیں۔ دکھایا۔

مغلانی بی۔

آٹھ برس عربستان یا سب سر کر کے مغلانی بی عربی داں ہو چکی تھیں۔ فارسی اردو میں پہلے سے برق کشیدہ کاری سوزن کاری طباحتی میں طاق۔ خوش الحان لغت خواں۔ محلے میں جہاں مولود شریف ہو جھن کے لیے نیو تہ موجود۔ مگر انھوں نے کہہ رکھا تھا اس گھر سے قدم نہ نکالیں گی سو بیویاں لغت خوانی سننے انکی شیخ جی کے ہاں آجائیں محرموں میں دس دن مغلانی بی نے شہادت نامہ پڑھا۔ محلے والیاں چپ چاپ بھی سنا کرتیں۔ عشرے کی صبح صحن میں دیغ کاڑ کر بڑی بہو نے کھچڑا گھونٹا۔ دیغ پر کلاوہ بندھا۔ کھچڑا اور دودھ کا شربت کورے دسترخوان پر چڑا گیا۔ مغلانی بی نے ”اماموں کی نیاز“ دی۔ نواب فاطمہ کو اپنے گھر کی اعزاداری یاد تھی۔ جو اس پھیکے بے رنگ محرم سے خاصی مختلف اور بہت شور شرابے کی ہوا کرتی تھی۔ شیخ عبدالواسط کے ہاں عشرے کے روز سب روزہ رکھتے۔ اس مرتبہ نواب فاطمہ

بول پڑی۔ ”ہماری اماں تو اسے فاقہ کہتی تھیں۔ چار بج توڑا کریں تھے“ وہ اتنی غیر اہم ہستی تھی کہ گوٹے والوں کے ہاں کسی نے آج تک یہ بھی نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ وضو کرتے ہوئے پاؤں پہلے دھوتی ہے۔ اب جا کر اتنے برسوں بعد شیخ عبدالباسط کی بیوی کو پتہ چلا کہ نوابن رافضیوں کی اولاد ہے۔ چپ رہیں۔ وسیع المشرب ججن بی کے دغظوں سے مستفید ہو چکی تھیں۔ دل میں انھیں کے الفاظ دہرائے۔ ”وُاسب اللہ کے بندے اور ایک رسول پاک کی امت ہیں۔“

محلے والیاں ججن بی کو مغلائی جی یا آتو جی بھی یکارتیں۔ چورن کے علاوہ دیگر شریف سے ترکی اور عرب دوا دارو کے چند نسخے لیتی آتی تھیں۔ مرحوم نیم حکیم میاں کی صحبت میں نیم حکیم بنی ہو چکی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی مستورات دم درود دوا علاج معاہدے کے لیے آنے لگیں۔

ڈیوڑھی کے مقابل والی صفحی میں ججن بی اپنا کھٹ کھلا رے بیٹھی رہتیں۔ سرہانے طاق میں بڑی روٹی۔ دینی رسالے۔ تلے دانی۔ سرے دانی۔ دواؤں کی شیشیاں۔ کھولے کے نیچے پیٹی۔ درمیں نماز کی چوکی۔ دن بھر گھونگٹ کاڑھے اہل خانہ کے مسئلے مسائل لڑائی جھگڑے طے کیا کرتیں۔ عصر مغرب کے درمیان غوثیہ اور نوابن دوپٹیاں سر پہ سلیقے سے پیٹ جزدان سنبھالے حاضر ہوتیں۔ محلے کی چند بیچیاں بغدادی قاعدے اور سپارے لیکر آجاتیں۔ عربی داں آتو جی تیسوں کلام ناظرہ کے بجائے سمجھا سمجھا کر پڑھاتیں۔ سچ ہے کوئی گریز کالج اس وقت موجود نہ تھا تو ججن بی اس میں پروفیسر بن سکتی تھیں۔ اتنی قابل تھیں دکھیا۔

مکتب کے بعد مغرب عشاء کے درمیان محلے والیوں کی دوا دارو کرتیں اسی وقت نوابن کو کام کاج سے فرصت ملتی وہ غوثیہ اور ملائی جی کی ننھی شاگردوں کے ساتھ آنگن میں کھیل کودتیں وسیع ڈیوڑھی میں ایک شکستہ پالکی پڑمی ہوتی تھی۔ اور چند خالی کریٹ جن میں بساط خانے کا سامان بھی ملکتہ کی بندرگاہوں سے شیخ عبدالباسط اینڈ سنز کے ہاں آتا تھا۔ اسی نیم تاریک گزرگاہ میں پہنچ کر کھار ہانک

لگاتے — سواری اتر والو۔ نواب فاطمہ، غوثیہ اور مکتب کی بچیاں آنکھ چولی کھیلتے ہوئے اکثر اس ٹوٹی پھوٹی پینس یا کسی کریٹ یا مغلانی بی کی کسی الارمندی خالی ڈولی میں جا چھپتی۔

تیرہ تیزی کی ایک شام بعد اذان مغرب آسمان کی گلرنگ وسعتوں سے سپید اور سرمئی کبوتر اپنی چھتریوں پر لوٹ رہے تھے، تنگیں چھتوں پر واپس اتاری جا رہی تھیں، کہا چلا آتے سواری اتر والو۔

حسب معمول نوابن نے دروازے کی اوٹ سے جواب دیا ”بیوی آجائے پردہ ہے“ ایک سفید شٹل کاک برقعہ جھپاک سے اندر متوسط اندام نو وارد نے نقاب اٹھاتے بغیر سرگھا کر گرویش کا جائزہ لیا۔ گھر کی بیویاں وضو نماز میں مشغول تھیں۔ مغلانی بی اپنی صحنی میں نیت باندھنے والی تھیں کہ برقعہ پوش انکی طرف پسکی۔ قریب جا کر چپکے سے کچھ کہا۔ مغلانی بی نے ایک مندری کی جانب اشارہ کیا۔

نوابن پان کی ڈھولی لیکر ادھر سے گزری تو وہ دیک سی گئی۔

حسن بی کے پاس اب رقم رقم کی مستورات آنے لگی تھیں۔ بہت سی سمجھتی تھیں کہ ملائی جی عامل بھی ہیں۔ نظربد، آسیب، مسان کا اتار کر دینگے۔ اس امید پر وہ بے چاریاں چپکے چپکے اپنے دکھڑے رویا کرتیں۔

یہ بیوی کھڑی ڈولی آئی تھیں۔ برقعے میں سے صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اٹھ کر ڈیوڑھی میں پہنیں۔ کہا راند راتے۔ غائب۔

تیرہ تیزی کی گئی گئی وہ اجنبی عورت مدار کے مہینے میں ایک شام پھر وارد ہوئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ لیکن مجال ہے جو چہرے سے نقاب اٹھاتی ہو۔

تیسری بار جب آئی جاڑوں کا زمانہ تھا۔ مغرب عشر کے درمیان گھر والیاں شب دیگ کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ کھڑے پر اکڑوں بیٹھ کر دوچار بھگو نے

مانجنے کے بعد نوابن بھویوں کے سنگ آنکھ پھولی میں جُٹ گئی۔ سارے لوگ بیاں آنکھ کے کونوں کھدروں میں غائب ہو چکی تھیں۔ غوثیہ انکو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ نوابن دوڑ کر سنان ڈیوڑھی میں پہنچی۔ انھیں نقاب پوش بیوی کی ڈولی کا پردہ اٹھا کر اسکے اندر بیٹھ گئی۔

کھار باہر منتظر تھے۔ قدموں کی آہٹ اور کھٹولی کے چرچرانے سے سمجھے بیوی آگئیں۔ بیوی کا حکم تھا جوں ہی سوار ہوں جھٹ اندر آ جاؤ۔ انھوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔

ایک تالیے کے لیے نوابن کو گمان ہوا۔ دوڑ کیوں نے کھیل کھیل میں ڈولی اٹھالی ہے۔ ابھی دھم سے دایس رکھ دینگی۔ مگر اے لو۔ وہ تو باہر نکل گئی۔ کھار ہوا کے گھمڑے پر سوار۔ نوابن کی سٹی گم۔

ڈولی گلی گھوٹ خانہ سے ہوتی بڑیا میں پہنچی۔ نوابن نے پردے میں سے جھانکا۔ گھگھکی بندھ گئی۔ کھار دن کو روکنا چاہا۔ لیکن آواز غائب۔ جب سے وہ مرزا سبط احمد کے مکان سے نانگے پہ بیٹھ کر شیخ عبدالباسط کے ہاں آئی تھی پچھلے چھ سال میں اس گھر سے بہت کم باہر نکلی تھی۔ چھوٹی تنھی تو بیویاں سودا سلف منگوانے گلی کی دوکان پر بھیج دیتی تھیں۔ اب چار برس سے وہ پردے میں بیٹھی تھی۔ ان سب کے ساتھ ہر سال سلطان جی نی سترہویں میں البتہ ہوا آتی تھی۔ اور ساون میں مہرولی۔ جہاں قطب صاحب کی امرتوں میں ہنڈولے پر پینگیس بڑھاتی کن سڑی غوثیہ کے ساتھ اپنی سڑیلی آوازیں ”جھولا کین نے ڈالوری امریاں“ الاپا کرتی۔

— بیویاں اس سے ”گڑا رہی ہنڈولا میرے بابل کے گھر“ اور ”نیلی سی گھوڑی

پاتلی“ بھی بار بار گواتیں۔

گلی قاسم جان کا کنڈر۔ کٹھہ عالم بیگ۔ کوچہ رحمن۔

بارہ درمی شیر افکن تک پہنچتے پہنچتے نوابن کو بازار کی پہچان نہ رہی۔ اتنی دور وہ کبھی نہ آئی تھی۔ اب وہ محلہ چرخہ والاں سے گزر رہے تھے۔ کوچہ بی بی گوہر سمجھیے

رہ گیا۔ گلی کا استھان کا موڑ آیا۔ اسکے بعد ایک چوڑی سڑک۔ گیس کے ہنڈوں سے روشناس، بازار درودیہ دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں۔ چند ایک میں سے چھن چھن کی آواز آرہی تھی۔ سنا تھا پچھل پائیاں چھن چھن کر کے چلتی ہیں۔ دہشت بڑھتی گئی۔ کہار ایک بڑے پھاٹک لے اندر پہنچ کر بولے "اثریے۔ بی صاحبہ۔"

دوبارہ آواز دی۔ نواب فاطمہ چُپ۔ کہاروں نے پردہ اٹھایا۔ اندر ایک نو عمر لڑکی۔ چاند سیا چہرہ۔ پیٹی پھٹی آنکھیں۔ میلے کپڑے۔ بے اوسان۔

"اے چھیدو یہ کیا معاملہ ہے۔ بی صاحب کہاں رہ گئیں؟ کیوں رسی؟ بانی جی نہ آئیں؟ تو کون ہے؟"

نوابن چُپ۔

بنواری کہار نے آواز دی "شیراتی بھائی"

جما پٹواری کے چوتھرے پر سے ایک کرخندار اتر کر پھاٹک میں آیا۔ چھیدو لال انگوچھے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "اوپر جا کر خبر دو۔ بی صاحب یہاں سے تو بھلی چنگی گئی تھیں۔ کسی حکیمنی کے دھورے۔ وہاں سے اس لمٹیا کو بھیجا ہے۔ اسی منہ سے پھوٹ"

کرخندار پکا ہوا کوٹھے پر گیا۔ ابیلی گٹنی کو بلالایا۔ ابیلی ذات کی ناتن۔ بلحاظ پیشہ دلالہ اور اب عرصے سے مہر و جان کی گرل فرائیڈے۔ چاؤڑی میں مشہور تھا۔ کہ اسکا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ چھیدو نے قہقہہ دہرایا۔ نوابن پھسپھسرو نے لگی۔

"ارے لوگو غضب ہو گیا۔ ارے سنو۔ کوئی سن جاؤ۔ چھیدو بنواری کیا کہتے ہیں؟ ابیلی سر پر دو ہنتر مار کر چلائی۔" ارے بیوی کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا "گلی کے اوباش تماش بین پھاٹک میں جمع ہو گئے۔ پل کی پل میں چاؤڑی بازار میں اڑ گئی بی مہر و دوالانے کسی شیدسی حکیمنی کے ہاں گئی تھیں۔ وہیں چل بسیں حکیمنی کے گھر سے سناؤنی آئی ہے۔

تین سازندے دھپ دھپ کرتے اوپر سے اترے۔ روتی بکھرتی نوابن کو

پکڑ کر چوبارے پر لے گئے۔ اس وقت اچانک نواب فاطمہ کو احساس ہوا کہ نہ برقعہ نہ ڈلائی وہ کھلے منہ بے پردہ، مردوں کے ہجوم میں گھری کھڑی ہے۔ اس انکشاف سے سرتاپا لرزی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

سازندے اسے لال کمرے میں لے گئے تھے۔ رونے کی آواز سن کر مہر کی لڑکی شموغ خانے سے نکل آئی۔ الیسی نے نوابین کو آگے دھکیلا۔ ”اری منہ سے پھوٹ۔ بیوی کیسی ہیں؟ ارے بول کیا گونگے کا گڑ کھایا ہے کجنت“

نوابین کو دہشت نے آن دلوچا کہ جب واپس گئی عبدالباسط گوٹے والے دھڑیا اڑا دینگے۔ ہڈیوں کا سُرمہ بن جائے گا۔ ایک بار انہوں نے ممدو کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ سارا محلہ انکے غصے سے کانپتا تھا۔

”اری بول پچھل پیری ڈوبی اجاڑ صورت تجھے ٹوکا لگاؤں“ شموغ نے ایک طمانچہ رسید کیا۔ ”منہ میں گھنگھنیاں بھرے کھڑی ہے۔ قظامہ۔ منحوس۔ بول۔ خدا نخواستہ کیا ہوا؟“

نوابین سات آٹھ سال کی عمر سے مصیبتیں سہتے سہتے اعصاب زدہ ہو چکی تھیں۔ بات بے بات رو پڑتی تھیں اب توقیامت کا سامنا تھا۔ ہسٹریا کا سادورہ پڑ گیا جبری طرح کچکھانے لگی۔

شموغ نے ایک اور دھپ جڑی۔

”نگوڑی کو شاید جاڑا بخار چڑھ رہا ہے۔ اے بی ذرا دم لینے دو کیوں مارو ہو۔“ شموغ کی نیکدل بھاوج نے پردے کے پیچھے سے جھانک کر کہا۔

دسمبر کا مہینہ۔ باہر پالا گر رہا تھا۔ معاً نوابین کو غش آگیا۔ دھڑام سے قالین پر گر پڑی۔ جیسے ممدو کو مارا تھا مجھے بھی ماریں گے۔ ممدو کے خیال نے لرزہ لاری کر دیا۔ اس پاگل گندے غلیظ چھو کرے سے جس کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے، جو خننا کر بولتا ہے، جو بکرے کی طرح بے عقل ہے۔ وہ ظالم لوگ وہ رحم لوگ اس سے میری شادی کرنے والے ہیں۔ اگلے مہینے ساری دنیا ستم گروں

سے پڑھتی۔ ساری دنیا یزیدی لشکر تھی۔ سارے جہان میں اشتقیا کا بول بالا تھا۔ وہ تمام مناظر اس کے ذہن میں کوندے۔ مرزا سبط احمد جنہوں نے اسکی گڑیوں کی پٹاری میں چند پرانے کپڑے ٹھونس کے بطور بے دام کی کینز گوٹے والوں کے ہاں نہال دیا تھا۔ کیسا کیسا روئی گڑ گڑا کر دعائیں مانگیں۔ پچھلے چھ برس سے ان لوگوں کے ہاں کو لہو کے پیل کی طرح جھٹی ہوئی تھی۔ بغیر تخواہ۔ صرف دوا ٹھنیاں بطور عیدی شیخ جی سال میں دو مرتبہ اُسے دیتے تھے۔ اب تک اسکے پاس پورے چھ روپے جمع ہو گئے ہوتے لیکن غوثیہ اس سے اُدھار مانگ کر کبھی لوٹاتی ہی نہیں تھی۔

گھر کے مرد زیادہ تر باہر والے مکان میں رہتے۔ کھانا بھی وہیں کھاتے۔ سوتے بھی وہیں۔ کبھی کبھار ندر آجاتے۔ ابھی چند روز قبل کی بات تھی۔ بڑے شیخ جی جب زنان خانے میں آئے۔ بیوی سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ اس گفتگو سے نوابن نے پہلی بار اندازہ لگایا کہ مرزا سبط احمد اسکی اتنی بڑی جائیداد ہرپ کر کے جیلا بادکن جا بسے۔

لیکن اسکی طرف سے مقدمہ لڑنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ اسکے پاس اس جائیداد کی ملکیت کا کوئی ثبوت موجود تھا۔ شیخ عبدالبا سبط پرانے پھٹے میں پاؤں اڑانے کے قائل نہ تھے۔ تہجد گزار پر سبز گار آدمی تھے۔ پیشانی پر گٹا۔ جماعت سے وہ بچکانہ ادا کریں۔ اشراق و چاشت وہ پڑھیں۔ لیکن یتیم کے طرفدار بھی نہ تھے۔ درد مندی کے دو بول کہنے دلچسپ وہ سالہ زندگی میں اسے بہت کم ملے تھے۔ دراصل ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی بھی نہیں ملا تھا۔ اور غوثیہ کی بے حس سونے سے لدی بھینس جیسی ماں نے اس کے لئے پھٹے پرانے بادلے کا سرخ دوپٹہ نکال رکھا تھا۔ خستہ گنگا جمی کبرن پٹھے والا جسے اُٹھا کر وہ اُسے ممد و کی دلہن بنائیں گی۔

پڑوس کی مسجد کے کٹھ ملا نے ایک بار جمعہ کے وعظ میں زوجہ کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ عورت ذات انسان نہیں۔ مرد سے کمتر درجے کی مخلوق ہے۔ ناقص العقل۔ اسوجہ سے اسکا دین بھی ناقص ہے۔ وعظ صحن میں صاف

سنائی دیتا تھا اور گوٹے والوں کی مستورات سر ڈھانپ کر بڑی عقیدت سے سنا کرتی تھیں ”اے ہم عورت ذات کیا جانیں“ ان سب کا تکیہ کلام تھا۔ نواہن بھی اب تک یقین کرتی رہی تھی کہ وہ انسان سے کم درجے کی مخلوق ہے۔ اس وقت قالین پر لیٹے لیٹے اچانک اس نے طے کیا۔ میں انسان ہوں۔ بھیڑ بکری سگائے بھینس کی طرح کوئی شے نہیں ہوں۔

کروٹ بدل کر لیٹے لیٹے اس نے اپنے ہاتھوں پر غور سے نظر ڈالی اور فیصلہ کر لیا۔ میں انسان ہوں۔ حیوان نہیں ہوں۔ انسان۔ لڑکی اُسے لگا جیسے کسی نے اپنا نرم سا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ بسکیاں لیتے لیتے اسکی آنکھ لگ گئی۔ شمو کی خداترس بھاوج پردہ کروا کر لال کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے ریشمی لحاف اڑھایا آنکھیں منگوا کر قریب رکھی اور گرم دودھ لانے باورچی خانے چلی گئی۔

برابر کے کمرے میں شمو کے بین جاری تھے۔ شور سے نواہن کی آنکھ کھل گئی۔ ”ہائے اماں جانی مجھ کس پر چھوڑ گیتیں ہائے ابھی تمہارے مرنے کے دن تھے؟ اور کتنا منع کیا جب وہ دیوانی خالہ واپس آنے کو تیار نہیں نہ ملنا چاہے ہے تو تم کیوں اس کے پاس دوڑی دوڑی جاؤ ہو ٹوکا دو۔ ارے اسی غیبانی ملائی نے چورن میں ملا کر کچھ کھلا نہ دیا ہو۔ ہماری تو وہ دشمن ہو رہی ہے۔ ڈائین۔ خدانے تمہو بڑے پر جھلسا بنگا کر صورت بھی ڈائین کی کر دی ارے اسی ہپونے اماں کو۔“

”توبہ کرو بیٹا۔ سگی بہن سگی بہن کی قاتل ہوگی؟“ ایک مردانی آواز۔

”استاد جی آپ کیا جانیں۔ آپ تو ہمارے یہاں ابھی آئے ہیں۔ یہ چالیس کے پیٹھے میں تھیں جب تائب ہوئیں۔ کیوں؟ چہرہ جھلس گیا تھا۔ مجبوری کا نام صبر۔ پھر اماں کے پیچھے پڑ گئیں تم بھی توبہ کر لو۔ میں پوچھتی ہوں کا ہے سے توبہ کر لو؟ ہم ڈاکے ڈالتے ہیں؟ قتل کرتے ہیں؟ جراثیم پیشہ ہیں؟ ہم نے راگ ریت کو زندہ

رکھا ہے گانا ناچ ہمارے دم قدم سے قائم ہے۔ بڑے بڑے استادوں کا نام ہم روشن کرتے ہیں۔ اپنی مرضی سے آزادی سے رہتے ہیں۔ بھیڑ بکری گائے بھینس کی طرح جینا نہیں چاہتے۔ بے دام لونڈیوں کی طرح ساری عمر کھانا پکاؤ۔ بچے پالومیاں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ طلاق کی تلوار سر پر لٹکتی رہے۔ میاں سوتن لے آویں۔

ساس ننہیں جوتیاں ماریں اُف نہ کرو۔ نا صاحب ہمیں گرہستوں کی یلچڑ زندگی نہیں چاہیے۔ ذرا اسی گھر میں دیکھ لو چوق کے ادھر ہمارے بھائی صاحب نے نکاحی بیوی کی کیا گت بنا رکھی ہے۔ دال میں نمک زیادہ ہوا اور وہ چلائے ابھی ایک دو تین کدوں کا۔ اور وہ سر جھکائے سنتی رہتی ہے غریب نا صاحب۔ ہم کاہے سے توبہ کریں۔ ایں؟ تو استاد جی یہ خالہ جانی ہماری دشمن ہو گئیں۔ ایک سپر فوڈ نے ایک کھترے نیم حکیم سے دو بولوں پڑھوا دئے۔ حج کر کے آئیں تو گلی گلی تسبیح چورن بچنے لگیں۔ اماں کو پتہ چلا کسی پنجابی سوداگر کے ہاں آتو جی بن گئی ہیں مطلب کرتی ہیں۔ یہ محبت کی ماری علاج معالجے کے بہانے پتہ معلوم کر کے انکے ہاں پہنچیں۔ وہ اسی رکھائی سے ملیں اب انکو یہ ڈرائلگ تھا کہ راز فاش نہ ہو جائے اگر سوداگروں کو معلوم ہوا کہ یہی وہ مشہور دلنواز دلی والی ہیں یا ہوا کرتی تھیں تو آفت آجائے گی۔

”مگر صاحب ہماری والدہ کہاں مانتی ہیں۔ آج پھر گئیں۔ جی ماندہ تھا۔ میں نے کہا ٹمٹم بیچھ کر انگریز ڈاکٹر بلواو۔ بولیں نہیں آپا سے مل آؤں انکی مکہ شریف والی دوا سے اچھی ہو جاؤنگی۔“

چند لمحوں قبل مہر و گھر پہنچی تھی۔ لال کمرے میں داخل ہوئی۔ نور نظر کے بین کالوں میں پڑے بے اختیار ہنسنے لگی۔ شمو بھاگی بھاگی آئی ماں سے پیٹ گئی۔ مہرونے لاڈ سے کہا: ”توبہ ہے نیچی۔ کیا کھرام پچا رکھا ہے۔ خواہی خنواہی۔ مجھے واپس آنے میں ذرا دیر کیا لگی تم لوگ بولا گئے۔ اور یہ لحاف میں کون ڈھیر ہے؟ یہ سونے کی جگہ ہے؟ وہاں انکی چھوکری نوابن چمت ہو گئی۔ انکے ہاں پیٹس پڑی ہے۔“

جوان جہان لڑکی بھاگ گئی۔“

ابیلی دودھ کا پیالہ لے کر آئی۔ نوابن کو سہارا دیکر اٹھایا۔ وہ متوحش لگا ہوا
سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مہروا سے دیکھ کر سٹ پٹائی۔ پیالہ اُسے تھماتے ہوئے
پیار سے کہا۔ ”اے نوابن چمکو۔ کرموں جلی تو یہاں کیسے پہنچ گئی۔“ میں نے ڈیوڑھی
میں جا کر دیکھا ڈولی نہ کہار۔ جسمی ماتھا ٹھنکا تھا۔ ممدو دوسری ڈولی لایا۔ اندر نوابن
نوابن کی پکار پڑی تھی۔ سودا گروں کے کھانے کا وقت۔ بی نوابن غائب۔ بتا تو ہسی
وہاں سے کیوں بھاگ آئی کیا تو وہاں بہت دکھی ہے۔ وہاں سے نکلنا چاہتی ہے؟“
نوابن کی ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ جو نہ ہاں تھا نہ نہیں۔ پھر بولی
”میاں تو آنکھ پھولی کھیلنے کھیلنے ڈولی میں چھپ گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔
کہار اندر آئے۔ ڈولی لے بھاگے۔ سمجھے آپ ہیں“

”یا منظر العجائب۔ چراغ گل اور لونڈیا غائب“ استاد جی نے کہا۔
”میں نے استاد جی چھیدواؤ ورنواری سے کہہ رکھا تھا۔ جوں ہی ڈولی میں میٹھوں
وہ اسے اٹھا کر چلتے بنیں۔ میری تو اس گھر جاتے روح فنا ہوتی ہے۔ کہیں بے چاری
آپا بیگماں کا راز نہ فاش ہو جائے“

”اے تو گئی ہی کیوں تھیں۔ ٹمٹم بھیج کر بلوائیتیں“ شمنو نے ناک پر انگلی رکھی۔
”انہوں نے یہاں قدم رکھنے کی قسم جو کھا رکھی ہے۔“

اس اثنا میں نوابن کو گرم گرم دودھ پی کر آرام ملا۔ گرمی اور راحت اور سکون
کے انوکھے احساس نے غلبہ کیا اور آنکھ لگ گئی۔

سردیوں کا موسم۔ دس بجے آدھی رات معلوم ہو رہی تھی۔ شہر کے دور رئیس
رائے زدہ کیلاش نرائن ماتھرا درخان بہادر برکت اللہ فوجی ٹھیکیدار تشریف لائے۔
صدر نشین ہوئے۔ ابیلی نے کنٹراور گلاس سامنے رکھے۔ اٹام اور اسکاچ پیش
کی۔ جو کشمیری گیٹ کے پارسی کی دوکان سے اسی روز آئی تھی۔ مہر و فوراً

بنت بناؤ کر، انکے پاس آن بیٹھیں۔ دونوں وضعدار صاحبان مہر و سہ کلام غالباً سننے آجایا کرتے تھے۔ انھیں خوش نہ آیا کہ ایک چھوکری وہیں فرش پر پڑی بے جبر سو رہی ہے۔ ”بی صاحبہ یہ کون علت ہے؟“ رائے زادہ صاحب نے پوچھا۔
 ”اے علت سی علت؟“ مہرونے افسانہ شب زمستان گوش گزار کرنے کے بعد مشورہ طلب کیا۔ ”یہ ناگہانی امر ہے۔ آدھی رات کو واپس بھیجتی ہوں سوداگر بچے پوچھیں گے کنواری جوان پردہ نشین لڑکی کہاں گئی تھی۔ اتنی دیر کہاں رہی۔ کیا بتلائے گی۔ بتلاتی ہے تو میری بیڑی بہن سابق بیگماں جان حال حاجیہ ٹلائی صاحبہ کا پردہ فاش ہوتا ہے۔“

دونوں اصحاب حقہ کڑکڑانے میں مشغول رہے رائے زادہ صاحب کچھ دیر بعد بولے۔ ”بائی صاحبہ ہونی اپنی بنسی بجا چکی۔ ورنہ وہ تمہاری پالکی میں کاہے کو چھپتی۔“
 ”رائے صاحب وہ تو کہتی ہے ہمیشہ ہی آنکھ مچولی کیلئے۔“
 ”ہاں۔ مگر یہ تمہاری ڈولی تھی۔ پریوں کا کھٹولہ۔“
 ”ساری زندگی ناگہانی حادثات کا سلسلہ ہے؟“ تھر و پھر فلسفہ پر اتریں۔ ان پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت ہی نے انکو خراب کیا۔ پھر پوچھا۔ ”بتلائیے اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔“

رائے زدہ گورنمنٹ کالج لاہور اور خان بہادر علیگڈھ کے گریجویٹ تھے۔
 برکت اللہ صاحب کو علم جفر سے بھی شغف تھا۔ کچھ سوچ کر بولے ”اس کا نام؟“
 ”یتہ نہیں۔ وہاں سب اُسے نوابن پکارتے ہیں۔“
 ”ہوں۔ توں بادی ہے۔ ہوائی اڑنے اڑانے والا۔“
 ”اسی یئے یہ اڑ کر یہاں آگئی“ مہرونے ہنس کر پوچھا۔ ”چھوڑیے میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔“

”نہ مانیے“ انہوں نے فوراً جیب سے نوٹ بک نکال کر حساب جوڑنا شروع کیا۔ ”صحیح نام معلوم ہونا ضروری ہے جب عقل کام نہیں کرتی تو موڈرن فلسفہ دھرارہ جاتا ہے۔ انسان پھر اپنے بزرگوں کے علوم میں پناہ لیتا ہے۔ طرفہ واردات ہے۔ مگر پورا نام معلوم ہونا چاہیئے۔ فال نکال رہا ہوں۔

مہر و لڑکا کو بھول جفر میں لگ گئیں۔ اچھا ہمارا بتائیے کیا ہوگا؟“
 ”یہی ہو گا جو ہو رہا ہے۔“ جلدی جلدی حساب لگایا۔ بولے ”م آتشیں حرف ہے۔ آپ تو۔۔۔“

”اے نوج۔ دور پار چھائیں پھوئیں۔ آتشیں حرف ہو سیری دشمن کا۔ صاحب آپ کا ایسا بھیا نک واقعہ ہو چکا ہے۔ اب آتش و آتش کا نام نہ لیجئے۔ دال کیا آتشیں حرف تھا جو وہ جل گئیں۔۔۔“

”دال خاکی ہے۔ خاک ر اور عاجزی پر دلالت کرتا ہے۔ تو دیکھئے سچ مچ

فقیری لے لی“

مہر کو پھر نوآبن یا د آئی۔ جو سامنے لحاف میں پٹی بے خبر سو رہی تھی۔
 ”صاحب مجھے تو اب اس چھو کری کی فکر ہے“

”فکر کا ہے کی۔ اگر اس کا کوئی پُرسان حال نہیں اور صورت کی اچھی ہے اپنی مملوکہ بنا لیجئے گا“ رائے زادہ کی لاش نرائن نے جواب دیا۔ ”فقط تین سو نو چیاں چند آبائی مہ لقاے دکن کے گویا اسٹاف پر تھیں۔ آپ مہ لقاے دلی ہیں اس شیت پر لڑکی سے آغاز کیجئے!“

”توبہ ہے رائے صاحب۔ آپ مجھے کیا پیشہ ورنائیکہ سمجھتے ہیں؟ میں بھی ایک شریف زادی۔ دو فغا مہر و لڑکی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

دونوں صاحبان متعجب نظر آئے۔ رائے صاحب نے گھبرا کر کہا معاف کیجئے گا ہمیں معلوم نہ تھا۔ چند منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ مہر و نے گلو ریاں بنا کر پیش کیں۔ کچھ دیر سوچائیں پھر بولیں۔۔۔ ”سنہ ستاؤن میں طغرل بیگ کی سر سے

جب نکلے، دنوآز اور مہر کو کون جانتا تھا۔ اتنے عرصے اس ستارے عیوب نے پردہ داری کی۔ آج اس وقت آپکے فقرے پر منہ سے نکل گیا۔ مگر اب کیا مصافحہ ہے پرانی باتیں ہیں۔ ہمالیوں کا مقبرہ۔ عرب سرانے۔ طفل بیگ کی سرانے — ہم جیسی ہزاروں پر کیا کیا گزری۔ غدر کو لوگ بھول بھال گئے۔“ چند الفاظ میں اپنا قصہ سنایا۔

”ع جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا۔“ رائے زادہ نے ایک آہ سرد کی۔ مہر و سر جھکا کر پان بنانے لگیں۔

”بھائی برکت اللہ“ رائے زادہ کی لاش نہ راتیں کچھ دیر کے سکوت کے بعد بولے۔ ”مشنریوں نے کتنی شامت زدہ لڑکیوں کو بازار میں بیٹھنے سے پچایا۔ نصیب کی بات ہے کہ انھیں منوری کشمیرن ملیں کسی بائبل ٹھونکتی میم کے ہاتھ نہ لگیں۔“ ”اے نوج۔ احاطے کے عیسائی بنتے میرے دشمن۔“ مہر نے چمک کر کہا۔ ”ہمارے ہاں قسمت کی ماری بچیوں کے غمخوار کون ہیں۔؟ میرے شکار۔ نائیکائیں۔ عبرت! مشنری اسپرٹ کا مالک نہ مولوی نہ پنڈت۔“ فورے پر پادری سے مناظرے کرنے کو البتہ دونوں مستعد۔ معاف کرنا بھائی برکت اللہ۔ کھری بات کہتا ہوں۔“ کم سخن خان بہادر شگ گڑ گڑا کیے۔

آتشدان پہ رکھے جرم کلاک نے گیارہ بجائے۔

”نادر چیز ہے“ رائے زادہ نے اظہار خیال کیا۔

”اماں منوری کی والدہ کو لارڈ لیک کے کسی افسر نے دیا تھا“

”واہ“ رائے زادہ نے قہقہہ لگایا۔ ”جب سارا کشور ہند گنگھڑا اور تلوار کی

جھنکار سے گونج رہا تھا۔ ادھر اس کلاک نے گجر بجایا ادھر کرنیل صاحب انوری کشمیرن کے ڈیرے سے برآمد ہوئے کسی ہندوستانی بادشاہ کا تیاپانچہ کرنے نکلے۔“

”اماں منوری بتلاتی تھیں۔ بیگم سمرو بھی ایک کشمیری رقاصہ تھیں۔ اور چھوٹی

بیگم بھی۔“ نواب شمس الدین والی۔ اور چودھری فتح محمد عبدالغیر الدین حیدر کے لکھنؤ کے افسانے سناتے تھے۔“

”اں صاحب۔ دلی اور لکھنؤ کی زنان کشامر۔ اہم تو افسوس آپکو انھیں کے
زمرے میں شامل سمجھائیے“

مہرونے ایک مرمیں یونانی مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ تقدیر کی دیسی ہے
نا۔ آپکو بتایا تھا اماں منورزی کرنل ہیرٹ کے بی بی خانے میں بہت دنوں رہی تھیں۔
دلایت لوٹتے وقت وہ اس طرح کی بہت سی خوبصورت چیزیں انکو دے گیا تھا۔
کافی تو میرے شیطان بچوں نے توڑ ڈالیں۔ چاندی کی منی سی لکھنشی سیٹھ ترلوک چند
کسی دیوالی پر شمو کے لیے آئے تھے۔ میں نے گھر میں نہیں رکھی کہ ست پرستی
ہے۔ ہستی پکھا وحی کو دیدی۔“ مہرونے اولڈ ٹام کی چسکی لگا کر کہا۔
”مورتی گھر میں رکھئے نہ رکھئے لکھنشی جی آپ پر یونہی مہربان ہیں“ رائے زادہ
صاحب ہنس کر بولے۔ چند منٹ سکوت طاری رہا۔ پھر انھوں نے کہا۔

”محمد شاہی بزرگوں کو گزرے بھی سو سال ہونے آئے۔ بلکہ زیادہ۔ لیکن پون
سہی قبل کا آصف جاہی حیدر آباد اس کے عجائب و غرائب کا تذکرہ ہم والد
مرحوم سے سُن چکے ہیں۔ ہمارے دادا جی مہاراجہ چند دلال کے درباری مراسلہ
نویس ہو کر دکن چلے گئے تھے۔ چند بابائی اس زمانے میں ایک مجرمے کا ایک ہزار لیتی تھیں۔
رائے زادہ نے اولڈ ٹام کے گلاس پر نظریں جمادیں۔ گویا یہ تقاضے میں
اتر آئی ہوں۔ کلاک ٹک کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ملول آواز میں کہا۔
”دلی کی ان خواجہ زادیوں کو طوائف الملوکی نے طوائف بنایا۔ آپکو غدرنے
افسوس۔ ہماری سوسائٹی تے مہرو صاحب۔ شریف ایجوکیٹڈ لڑیاں پیدا نہ
کیں۔ البتہ تعلیم یافتہ ارباب نشاط۔۔۔ بہات۔۔۔“

مہرونے اپنا بلوریں جام گنگا جمنی طشت میں رکھ کر طنزورہ سنبھال لیا تھا۔ رکھیا۔
وہ رائے زدہ صاحب کی باتیں اس طرح مبہوت ہو کر سنا کرتی تھیں۔

”چند بابائی کی آفت زدہ ماں بہنوں کی دستگیری بھگتوں نے کی تھی۔ آپکی دھاڑیوں
نے دونوں قومیں ردِ خلائق۔ آڑے وقت میں وہی لوگ کام آتے۔ نہ ملا نہ پندے“

کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسے ایک جنگ میں شکست دے کر حیدر آباد لوٹتے ہیں۔ جشن مناتے ہیں چند! بانی کو ملے لقا کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔ جاگیر۔ نوبت۔ منصب۔ افسوس۔ پہلے دکھن نے چاند سلطانہ پیدا کی تھی افسوس کہ اب چندا بانی — جوئی کی محو شاہی طوائف نوربانی سے زیادہ شان و شوکت رکھتی تھی۔

”لیکن صاحب وہ عورت تھی کیتائے روزگار۔ نیزہ باز۔ تیر انداز۔ شہسوار۔ علم دوست۔ رُو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ۔ کہنے لگی

ع دیکھو کھجور تویار بجلس تمام رقص — محفل میں ناچتے تاجتے اپنا قلمی دیوان اٹھا کر
کئی کپتان میلکم کے حوالے کیا۔ وہ ننھو انڈیا آفس لندن میں داخل دفتر۔ مرزا نوشہ کی پیشبرد
تھی۔ ع سر پہ مراجب کف آج بکسے تیغ۔ اور اپنے ہم عصر اودھ کے نواب آصف الدولہ
کی زمین میں ہلال مہ نو کو کم دیکھتے ہیں۔ میاں یہ جو ابرو کا خم — اور ہر غزل کے
مقطع میں مولاعلیٰ کی منقبت — ہمارے دادا جی نے اپنی بیاض میں نقل کر رکھی تھیں۔
مگر بھائی برکت اللہ —

”اگر پردے کی بو ہو تو نہ اتنا لکھ پڑھ پاتی نہ اسکی قابلیت کو اتنا سراہا جاتا۔
آج بھی مہر و صاحب اردو میگزینوں میں آپ جیسی دلرباؤں ہی کی غزلیں چھپتی ہیں“
”راتے صاحب۔ اب اور زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ یہ سوسائٹی اور اس کے قوانین
میں نے نہیں بنائے۔ اور سن لیجئے خان بہادر صاحب چندا بانی کتنی عالم فاضل تھیں۔
آپ صاحبان عورت کو ناقص العقل کہتے ہیں۔ ہائے ہائے۔ جس امت کی بی بی فاطمہ
شفاعت کی سفارش فرمائیں گی۔ اسکے طبقہ نسوان کی یہ درگت۔“ مہرونے آہ بھری
اور پاندان اپنی طرف کھینچا ”لفظ حرفہ اور علامہ بھی عورتوں کیلئے بطور دشنام
استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کا پڑھا لکھا ہونا اتنی معیوب بات ہے!“

برکت اللہ صاحب اب بھی چپ رہے۔ انکو مہر و جیسی ذہین عورتوں سے چڑ
تھی۔ مگر اپنے گھر کی ان پڑھ متورات میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر سہفتے یہیں آجاتے تھے اور
مہر و اور راتے زادہ کے مباحثے خاموشی سے سنا کرتے تھے۔

” مہرو صاحب۔ ضروری نہیں کہ چنڈا بانی جیسی عالم بننے کے لیے بالا خانہ کی عالم آراء بنا جائے۔“

” بمعانی کی تلاش نرائن۔ یہ دستور تو بھارت ورش میں قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اب خان بہادر نے بات کی۔“ پرانے زمانے کی ویشاؤں کے لیے چونسٹھ گنٹوں کا جاننا لازمی تقایا نہیں؟“

” درست۔ لیکن میں آج کے اہل مفند کو یہی تو سمجھانا چاہتا ہوں۔ مملکت بمبئی مدراس میں آج ایک سے ایک لائق نیٹولیڈیاں موجود ہیں بے پردہ اور تعلیم یافتہ ہونے کے لیے بے عزت ہونا ضروری نہیں ہم فخر یہ یہ کہتے ہیں کہ روساء اپنے لڑکوں کو آداب و تہذیب سیکھنے اعلیٰ درجے کے بالا خانوں پر بھیجتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیوں؟ کیوں نہیں ہماری مائیں بہنیں ایسی ایجوکیٹڈ کہ خود اپنے لڑکوں کی تربیت کر سکیں؟ انگلستان میں لارڈ لوگ اپنی اولاد کو تھیر میں ناچنے والیوں کے ہاں تربیت کے لیے بھیجتے ہیں؟ اس اتوار کو۔“ وہ مہرو سے مخاطب ہوئے۔

” طاؤن ہاں میں میرا لیکچر ہے۔ آئیے گا۔“

” بسر و چشم۔“

رائے زادہ اور مہرو جان کے چہرے گیس کی روشنی میں زرد نظر آرہے تھے۔ ملول۔ پشیمان۔ متفکر۔

” واقعات پر ہمارا قابو نہیں رائے صاحب۔“ مہرو نے آہستہ سے کہا۔

” کبھی بھی نہیں تقا۔ لیکن انسان نے کوشش تو برابر کی۔ ڈارون کہتا ہے۔“

” کیلاش نرائن۔ تم تو بن گئے ہو ریفارمر۔“ برکت اللہ صاحب نے قطع کلام

کیا۔ ”تم اپنا کام کئے جاؤ۔ سوشل ریفارم۔ بی مہرو کا منصب نہیں۔ انھیں گانا

سنانے دو۔ سر سید احمد خان ہمارا برا بھلا خوب سمجھتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو خود

ایک زمانہ مدر علیگڈھ میں قائم کر دیتے۔ کچھ تو وجہ ہوگی جو وہ لڑکیوں کو اسکول

بھیجنے کے خلاف ہیں۔“

۱) اچھا بھئی۔ یہ آپ لوگوں کا قومی معاملہ ہے ہم کچھ نہ کہیں گے۔ مگر اپنے آرٹیکل لکھنے کے لیے پردہ سسٹم کے متعلق ہم نے بھی بہت اسٹڈی کیا ہے۔ کاتھولک قوم اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ ہم یہ تو بھی جانتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اس موجودہ رسم سے کوئی کنکشن نہیں۔ تاریخ کی ایک سے ایک مستند کتابیں ہم نے کھنگال ڈالیں۔ سید امیر علی کی کتاب ابھی لندن سے چھپ کر آئی ہے۔ جی۔۔۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔ سننے مہر و صاحب۔ ایک خلیفہ تھا۔ ولید۔ پرلے درجے کا عیاش۔ اس کے دور میں شہر بغداد ساری دنیا کی زنان بازاری سے بھر گیا۔ تو شرفاء نے اپنی عورتوں کے لیے پردہ لازم کر دیا۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ آج بھی جو نیو پرنس حد سے زیادہ بد معاش لنگکا ہوتا ہے اسکی دہشت میں اسکی رعایا اپنی بہو بیٹوں کو بالکل دم نخوت رکھتی ہے۔

”اپہن پر آپ لوگوں نے سات سو برس حکومت کی۔ وہاں پردہ تھا؟ اجی بالکل نہیں تھا۔ وہاں کی محمدن بیبیاں کھلے منہ ہر چیز میں شامل ہوتی تھیں۔ باقی یورپین عورتوں کی طرح۔ اور اس وقت کے یورپ کی ساری عورتوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ جلسے جلوس۔ ناچ گانا۔ اسکول کالج“

”شریف زادیاں ناچتی گاتی تھیں؟“ مہر و نے حیرت سے سوال کیا۔

”رقص و سرود گبیوں کے کھاتے میں یہیں ڈالا گیا ہے۔ مشرق میں جیہی تو فرنگی ہماری سوسائٹی کو تعجب سے دیکھتا ہے۔ ہمارے سوشل قانون اسکی سمجھ میں نہیں آتے مہر و صاحب ایک تازہ ولایت انگریز استاد نے گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھ سے پوچھا تھا۔ کیا تملوگ اپنی لیڈیز کو فطرتاً اتنا آوارہ اور بد معاش سمجھتے ہو جو انکو اتنا گھونٹ کر رکھتے ہو کہ باہر نکلیں اور بھاگیں۔ کسی نامحرم کی نظر ان پر پڑی اور وہ ہوئیں برباد“

”لا حول ولا قوۃ۔“ برکت اللہ صاحب نے آزر دگی سے کہا۔

”جی ہاں۔ لا حول ولا قوۃ۔“

”سھائی کیلاش نراتن۔ پردہ عزت کی نشانی ہے ناموس کا ضامن“

”سبحان اللہ! تو یہ لاکھوں کروڑوں عزیز محمدن عورتیں بازاروں میں سودا سلف بیچتی پھر رہی ہیں کر گھوں پر بیٹھی ہیں کھیتوں میں کام کر رہی ہیں انکی کوئی عزت نہیں؟ سب آوارہ ہیں؟ آپکے مولوی صاحبان انکے لیے فتوے کیوں نہیں صادر کرتے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ کر دیں انھیں اسلام سے خارج کہ کھلے منہ پھرتی ہیں۔ قوم اجلاف قوم ارزال!“ مہرونے طنز کی۔ ”عزت محض نجیوں کی اجارہ داری ہے۔“

”مہرجان! عزت بے عزتی سارے پیمانے گردش میں ہیں۔ پیہم گردش۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے رنگ محفل بدل گیا۔ کل تک فرنگی ہماری پوشاک پہنتا تھا۔ ہماری زبان بولتا تھا۔ آج ہماری تذلیل کرتا ہے“

چند منٹ کے سکوت کے بعد کیلاش نرائن نے اولڈ ٹام کی بوتل اٹھالی۔ اسے غور سے دیکھا۔ آہ بھری۔ ”ہائے۔ غالب خستہ۔! واقعی انکے بغیر کون سے کام بند ہیں! ہمارے تاؤ جی مرحوم کہا کرتے تھے۔ مرزا نوشہ کے بعد دیلی میں رہے تو کیا رہے وہ بھی حیدر آباد جا بے“ رائے زادہ صاحب اب بہت افسردہ ہو چکے تھے۔

”سنا ہے چند بابائی مہ لقا لاکھوں روپیہ چھوڑ کر مرے“ مہرونے کہا۔
 ”لاکھوں۔؟ پورا ایک کروڑ۔“ لاکھوں تو زندگی میں خیرات کر گئی تھیں۔ مرنے کے بعد مقبرے پر عرس ہونے لگا۔ آپ مہ لقاے دیلی ہیں آپ بھی کچھ کار خیر فرمائیے“
 ”مثلاً۔؟“

”ایک زنانہ یتیم خانہ قائم کیجئے اس میں اس بڑکی کو داخل کیجئے جہاں وہ تعلیم حاصل کرے۔ بجائے اسکے کہ کوٹھ پر تعلیم لے۔!“

مہرو اپنی کنجوسی کے لیے مشہور تھیں۔ رائے زادہ نے پھر کہا: ”کیوں صاحب؟“
 ”میرے کھولے ہوئے یتیم خانے کو لوگ قبحہ خانہ نہ کہیں گے؟“

گھوریاں بنائیں۔ چند منٹ کے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولیں۔

”رائے صاحب۔ ہم نے کم از کم اپنے باپ دادا کا نام رسوا نہ کیا۔ آپا بیگماں اب چوڑن والی جتن کہلاتی ہیں وہ ستارعیوب اب تک انکی پردہ داری کر رہا ہے۔ خیر آپا کا معاملہ تو اب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا والوں سے انھوں نے اپنا کیس واپس لے لیا۔ پراس معصوم بچی کے لیے قدرت کو کیا منظور ہے۔ پردہ داری یا پردہ دری؟“

سنہرے فرشتوں والے جرمن کلاک نے گررر گررر شروع کی۔ کیس کی لائین مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ دونوں حضرات اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہرو انکو زینے تک پہنچانے گئیں۔ چند لمحوں بعد نیچے سڑک پر سے انکی بگمیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ مہرو دروازے پر ہاتھ ٹیکے کھڑی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ مانوس آوازیں رات کی گہرائی میں ڈوب گئیں۔

جاگتے رہو۔ گشت کا چوکیدار چلا رہا تھا۔

فضل مولا اللہ والی اللہ مالک۔ بیچ خواجہ کی دیگ میں مولا مالک۔ اندھیرے میں کسی مجذوب نے نعرہ لگایا۔ لال کمرے میں واپس آکر مہرو نے سوچا نواب فاطمہ کے لیے کھانا نکلو اتیں۔ مگر وہ اٹلسی لحاف میں لپٹی بے خبر سو رہی تھی۔

صبح نوبے کے قریب اپنے پیوند لگے برقعے میں ملفوف مغلائی بی بی لٹرے گھسٹتی تسبیح ہزار دانہ جھلاتی زینے پر نمودار ہوئیں کواڑ کی اوٹ سے پکارا۔ مہرو اد مہرو چھوٹی بہن اس وقت سو کے اٹھی نہیں۔ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی صحن میں آئیں۔

مغلائی بی بی حلق پھاڑ کر چلائیں۔ ”کہاں ہے۔ ادھر تو آ میرے سامنے چھتسی۔“
 ”ہیں ہیں۔ آپا۔ ذرا آہستہ سارا بازار سن رہا ہے۔“
 ”شفیل۔ قٹا۔ نواہن کو اغوا کر لاتی۔ دقا۔ اری کبھے ذرا خوف خدا نہیں۔“
 ”خدا سے تو تم ڈرو آپا۔ توبہ توبہ۔“

”اری جرم ہی — سوداگروں کے ہاں پیس پڑی ہے۔ بلا اس اچھا مال چھٹکا کو۔ اور یاد رکھ مہرو کی بچی۔ حرفتی۔ اگر تو نے اس شتا کو چھپا دیا۔ کچھری چڑھو گی۔ برتن داروں سے نکلواؤں گی۔ یہ برٹش کا راج ہے سمجھی؟“

”آپا۔ دُند نہ مچاؤ۔“

”چپ چنڈالنی۔ لوصاحب۔ یہ اندھیر دیکھو۔ ایک اجنبی جُروا دوا دارو کے بہانے میرے پاس آئے اور انکے گھر کے جوان جہان لوکرانی کو اٹھوا کے غارت غول۔ ہائے ہائے اب تو مجھ نگوڑی کا بھانڈا بھی کیسا پھوٹا۔ ہے۔ کیا اندھی تقدیر لکے پیدا ہوتی تھی۔ جاؤ پوٹ دکھن۔۔۔ وہی کرم کے لچھن۔۔۔“

خالہ کی یہ پرانی رٹ اتنے برسوں بعد دوبارہ کان میں پڑی۔ شمو اور شدو بے اختیار ہنس پڑے۔ وہ چلا یا کیس۔ برسوں بعد آرام چین کی زندگی ان نیکدل بساٹیوں کے ہاں ملی تھی۔ مگر مجھ بندی کو تو اپنے لکھے پورے کرنے ہیں۔ نوابن۔ ادو نوابن۔ ادھر تو آجھاڑو پیٹی — ہڑدا بیگنی — تجھ پر علی کی سنوار۔۔۔“

نوابن کی آنکھ پرستان میں کھلی اڈا اٹلسی لحاف۔ نیچے فیروزی رنگ کا ریشمی تُرکی قالین۔ اسکے نیچے یہ موٹا گھٹا۔ خود کشمیری شال میں پارسل کی طرح لپٹی ادھر نفیس طشت میں دھری انگٹھی۔ اونچے دروازوں پر دلائی مشجر کے پردے ایک طباقے میں گلاب کی کلیوں کا ڈھیر۔ طاقچوں میں گلاب پاش اور غود سوز۔ سبز تابدانوں سے چھتی آفتاب کی نارنجی شعاعیں ایک ننھی سی مرمرین دلائی موڑتی کو دمکار ہی تھیں۔ نواب فاطمہ مسحور ہو کر تقدیر کی دیہی کو دیکھتی رہی۔ دھوپ کے چوڑے راستے میں رنگ برنگے چمکیلے ذرہ پراں تھے۔ نیلگوں کمرہ نیم غنودگی میں نوابن کو پریوں کا جل محل معلوم ہوا ہر چیز جس میں تیرتی سی پھر رہی تھی۔ عنابی محل کی جھالروالے آئینہ پر ایک سنہرا منقش کلاک رکھا تھا۔ اس کی محراب پر بیٹھ دو ننھے ننھے سنہرے فرشتوں نے پربلا کر نفیریاں سبھالیں۔ اس کرامت نے نوابن کو

بھونچکا کر دیا۔ نو کا گرجا۔ عین اسوقت ملائی جی کی کرازی آواز سنائی دی جو اسے گالیاں کو سننے دیکر باہر بلا رہی تھیں۔

وہ یہاں کیسے آن پہنچیں؟ جل محل کا طلسم منتشر ہو گیا۔ گھبرا کے کھڑی ہوئی۔ اپنے آپے پر نگاہ کی۔ یاد آیا۔ رات جب سردی سے لرز رہی تھی مہرو کی بہو نے اسے اڑھادی تھی۔ ایسی ملائم نفیس گرم چادر۔ اسے جسم سے علیحدہ کرنے کو جی نہیں چاہا۔ اسوقت بھی بہت سردی تھی۔ شال اتار کر دوبارہ اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی۔ باہر آئی۔

مہرو کا چھیل چھیلانہ جوان لڑکا شد و برمی ٹنگی باندھے چھینٹ کی بندھی پر نقرتی تعویذ چھاتا، کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ نوابن کو دیکھ کر آنکھیں مچکائیں اور ماں سے بولا۔ ”اماں رات جب میں حقہ تازہ کرنے اندر گیا تھا راتے زادہ صاحب کسی مہلقا کا قصہ سن رہے تھے۔ تم نے بھی یہ حور لقا خوب پھانسی۔ جو۔“

مہلقا اور حور لقا کبوتریوں کی اقسام تھیں۔ بھائی کا فقرہ سن کر شمو نے ستائشی قبہ قہہ لگایا۔ وہ بھی جتن بی کا تماشا دیکھنے اپنی خواب گاہ سے نکل آئی تھی۔ مہرو نے اپنی نالائق اولاد کو آتش بارنگاہوں سے گھورا۔ وہ صحن کی دھوپ میں مونڈھا ڈالے بیٹھی تھیں۔ نوابن سے بولیں۔ ”آپا کو کتھا سنا دے۔“

نوابن نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

جتن بی نے زینے کی لینڈنگ پر برقعہ بچھاتے بچھاتے رک کر اپنا ماتھا کوٹا۔

”ہئے ہئے نواب فاطمہ۔ اُجڑی۔ ازل کی بد نصیب۔ پیاروں پیٹی۔ چل واپس۔“

ہرچہ بادا باد۔ پر شیخ جی نہ تجھے نہ مجھ بد بخت کو اب اپنی دہلیز نہ لانگنے دینگے۔“

”جب تم بھی جانو ہو کہ تمہارا دہاں بُرا حشر ہو گا تو کیوں جارہی ہو اوکھلی میں

سردینے رک جاؤ یہیں دونوں۔ رہو آرام سے“ مہرو نے کہا۔

”اس لونڈیا کے لیے برقعہ منگا۔“ جتن بی نے ڈپٹ کر حکم دیا۔

بوقت ضرورت مہرو اپنی پردہ نشین بہو کا برقعہ استعمال کرتی تھیں۔

گھبراہٹ اور جلدی میں نوابن نے کاہی رنگ کی اس کار چوٹی شال کے اوپر
برقعہ ڈال لیا۔ اور مغلائی بی کے ساتھ سیڑھیاں اتریں۔ پانکی حویلی حسام الدین حیدر
کی سمت روانہ ہوئی۔

شیخ عبدالباسط اور انکے بیٹے بھیجتے ابھی صدر بازار اپنی دوکان پر نہیں گئے تھے
مکان کے بیرونی چبوترے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اہل محلہ جمع تھے۔ علی الصبح برادری
کے ایک پھیری والے کے ذریعے انکو سارا واقعہ معلوم ہو چکا تھا۔ خیر و مہرو کے ہاں
پیمک لیس پچک پینے جایا کرتا تھا۔ مہرو کو پردے میں بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ کل
شام اس گلی میں پہنچیں بے دھیانی میں پاؤں ڈولی کے غلاف سے باہر نکال لیے۔
خیر و تنبوی کی دوکان پر کھڑا تھا۔ خوردہ فروش تھا۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز نظر میں
رکھتا تھا۔ پانچ اندر سمیٹنے کے لیے ہاتھ برآمد ہوا تو ہیرے کی انگوٹھی کلائی میں جبرمن
سلور کی وہی چوڑیاں جو ایک روز قبل مہرو بانی نے اس سے خریدی تھیں سارے
دلی شہر میں یہ نئی وضع کی دلالتی چوڑیاں سب سے پہلے اس نے مہرو جان کے
ہاں بچیں تھیں۔ انکی ہیرے کی انگوٹھی بھی پہچانتا تھا۔ انکے سازندوں نے اسے یہ
بھی بتا رکھا تھا کہ بڑی بہن دنو از حج کرائیں اور اب شہر میں کسی جگہ ملائی گیری
کر رہی ہیں۔ دو اور دو چار۔ سارا معاملہ صاف۔

نوابن اور مغلائی بی جوں ہی واپس پہنچیں۔ شیخ عبدالباسط کا پہلوان نما بھتیجا
عبدالخالق آگے بڑھ کر لڑکی پر جھپٹا۔ ایک زوردار تھپڑ قلماقی۔ رات کہاں گزاری
— بول — مال زادی — — دوسرا تھپڑ نوابن مار سے بچنے کے لیے
جھمک کر دھری ہو گئی۔ عبدالخالق نے اسکی شال کھینچی جو برقعے سے نکل کر نیچے
گھسٹ رہی تھی۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں حرام کی کمائی۔ بول۔ کس تیرے یار نے
یہ دیا تحفہ — لچی زمانے بھر کی — حرام الدھر — بڑے آبا۔ اس شہدن کو

آپ نے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔“

”اجی مجھے تو یہ صدمہ ہے میری بچی غوثیہ برسوں اس بد ذات کی صحبت

میں رہی۔“

”بس بھائی جان۔ اب اس بات کو زبان پر نہ لائے۔ آپ بھی بغیر سوچے سمجھے“

اب عبدالباسط گرجے۔ ”بڑبی بی آپ نے سال بھر ہم کو بڑے دھوکے میں رکھا

بڑا جل دیا ہم لوگوں کو۔“

”نُونُو چو ہے کھا کر۔“

”چور چوری سے جائے۔“

”علامہ۔“

”حرفہ۔“ حاضرین کے ریمارک۔

”اس بیجائی کا جواب نہیں گشتی۔ کیسے شکوہ شکلی، واپس آن پہنچی۔ دلائل سمیت“

”آپکی چھوٹی بہن مہرو جان آپ سے ملے آیا کی چاڈری سے نکل کر ہمارے

زنان خانے میں در آتی تھی۔ غضب خدا کا۔ اس نوٹڈیا کو درغلا کر اپنے کو سٹھے پر

لے گئی اب آپ کیا چاہتی ہیں بائی جی“

”ہم دونوں کا سامان باہر منگوا دیں“ جن بی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

”ماشا اللہ۔ یہ بات آپ نے سمجھداری کی کمری۔ جی ہاں۔ پس اب ہمیں بخشنے۔

ابے اولمڈے۔۔۔ ممدو کے بچے۔۔۔ ابے منہ کیا تک رہا ہے۔ شکر کر بھونڈو بخش۔

کدی اس حرفہ نوابن سے تیرا نکاح ہو گیا ہوتا۔ عید کے چاند۔۔۔ بچ گیا بے“

شکر الحمد للہ کہ میں بھی کیا خوب بچی۔ قربان جاؤں صدقے جاؤں اس کلیسا ز

حقیقی کی قدرت کے۔۔۔ نواب فاطمہ نے گلی میں کھڑے کھڑے آسمان پر نظر

ڈالی اور سر جھکا لیا۔

راں کے ساتھ ممدو کے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کے بھی کچھ سہانے خواب تھے۔

جودہ نوابن کے متعلق دیکھا کرتا تھا۔ سر نہ ہوڑا تے ناک سینکتا اندر گیا۔ شیخ عبدالباسط

کی بیوی نے ڈیوڑھی میں آکر حجنّ بی اور نوابن کا حقیراٹاٹا باہر پھینکنا شروع کیا۔ پوٹلیاں۔ بوئیں۔ بوسیدہ دریوں میں پیٹ کر انکے بسترے لٹھکاتے گئے۔ پھر تیلے داناں باہر آن گئیں۔ سرے دانی۔ پندینا۔ نوابن کی سُرخ ٹیاری۔

سرپوش پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ چبوترے پر کھٹ سے گرنے ہی اسیں سے نکل کر نوابن کی گڑیاں، گنتی کے چند کپڑے، نقلی موتیوں کے ہار اور کانچ کی چوڑیاں گلی میں بکھر گئیں۔ وہ جھک کر انکو چننے لگی۔ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتی جاتی۔ ناک سنکتی۔ دوسرے ہاتھ سے بالوں کی لیٹس چہرے سے ہٹا کر گڑیاں اور کپڑے بٹورتی۔ برقعہ اوڑھے اوڑھے چیزیں سمٹنا مشکل تھا۔ بنجیالی میں نقاب اٹھالی مجمع بڑے اشتیاق سے اسے گھورنے لگا۔

”اجازت ہو تو اندر جا کر اپنی کتابیں لے آؤں“ حجنّ بی نے گلی میں سے آواز دی۔

”وہیں کھڑی رہیے۔ بھیج دی جائیں گی۔“ اندر سے شیخ جی کی بہن کا جواب ملا۔ انہوں نے لال کتاب اور دینی رسالوں کا بستہ احتیاط اور ادب کے ساتھ کواٹر کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر ممدو کو دیا۔ اس نے سوں سوں روتے سنکتے اسی تکریم سے لاکر کتابیں حجنّ کو پیش کیں۔

سب سے آخر میں نواب فاطمہ کا مٹنا سا میلہ برقعہ باہر آن گرا۔ اور ایک گڑیا۔



دیکھو کھیلین دھمال خواجہ معین الدینؒ

شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے مکان کا چرچا تا صدر دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ ججن بی اور نواب فاطمہ نے سارا سامان جین جین کر گلی کے کنارے رکھا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ لوگ قہقہے لگاتے فقرے کہتے اپنے اپنے کام پر روانہ ہوئے۔ ججن بی پنجابی بھاٹک تک جا کر یکہ لائیں۔ بالکل خاموش تھیں نوابین متوقع رہی، دعائیں مانگ رہی تھی، کہ وہ ہنسو کے گھر واپس جائیں گی۔ وہ کیا پرستانی طلسمانی مقام تھا۔ لوگ کیا چین کی بنی بجاتے تھے۔ مگر ججن بی نے ایکے والے سے کہا۔ ”بیٹا۔ اسٹیشن چلیو۔“

جب وہ سولہ سالہ دنوازا بانو بیگم تھیں منوری کے رتھ پر بیٹھ کر شہر خرابی کے بعد دلی لوٹی تھیں۔ اس وقت شاہجہاں آباد مرحوم کی تجہیز و تدفین ہو رہی تھی۔ ادھر نوابشاہرہا ادھر وہ ایک متحرک اور موبائل پینے میں جوان ہوئیں۔ نگہ مبر، پالکی، نالکی، بوچھے، تاجان ٹٹم، کوچ، ہاتھی، برسوں ان کی سواری میں رہے۔ دھویں کی گاڑی کے خس پوش دوسرے درجوں اور والیان ریاست کی اسپیشل ٹرینوں میں طویل مسافتیں انھوں نے طے کیں۔ پھر وہ تھرڈ کلاس میں بمبئی اور عرب حاجیوں سے بھری اگن بوٹ پر جدہ گئیں۔ عرب و عراق میں انھوں نے سارا بانوں کے نغمے سنتے اونٹوں کے کجاوے پر ہلتے ڈولتے لمبے لمبے سفر کئے۔ ارے دنوازا بانو بیگم عرف بیگم آل کشمیرن عرف ججن بی یا مغلائی بی سے زیادہ تجربہ کار سیاح کون ہوگا بھلا۔

جبون یا ترا انھوں نے بھانت بھانت کی غیر مرئی ٹرانسپورٹ پر بھی طے کی تھی۔ منوری کے رتھ کیل گویا ہم آج کے سیاہ بھیسنے۔ جو چھن چھن کرتے تیز تیز دوڑتے انکو

اخلاقی ہلاکت کی طرف لے گئے۔ کبھی سرسوتی کے پوتر راج ہنس کہ منوری کے گھر پہ ہی انھوں نے شعر و ادب اور شناستریہ سنگیت اور رقص کی تعلیم حاصل کی۔ کبھی لکشنی کی سواری کا اُن کو کہ عیاش امیر زادوں کو اُن کو بنا کر اپنا اُس سیدھا کیا۔

آخر میں تیز رفتار جہاز ایس۔ ایس ایگل گویا دُشمن کا گر رُجھو پاپ کے پاتال سے نکال کر دھرم کی سورگ پر لے گیا۔

مگر بے چاری نوابین۔ اسے بچپن میں ماں باپ کے ساتھ لکھنؤ اور آگرے جانا دھندلا سیاد تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ریلوے اسٹیشن اور ریل گاڑی آج پہلی بار دیکھی۔ جتن بی نے صدری کی جیب سے چند سکے نکال کر تھوڑا کلاس کے دو ٹکٹ خریدے۔ اب وہ حمیر شریف جا رہی ہیں۔

ٹرین شام کو چلتی تھی۔ دن بھر وہ زمانہ تھوڑا کلاس وٹینگ روم میں بیٹھی لبیک یا خواجہؔ — لبیک یا خواجہؔ کا ورد کرتی رہیں۔ بھوک لگی تو نوابین کو لیکر باہر نکلیں۔ خوئے والے سے خرید کر نان کباب کھائے۔ کٹہ میں پانی پیا۔ واپس آئیں۔

وٹینگ روم خالی پڑا تھا۔ پنجابی کر سپین آیا بڑے سپر برانڈاز ہیں ادھر سے ادھر گزر جاتی — جتن بی نماز ظہر کے لئے اٹھی ہی تھیں کہ سر منڈی جوان ہندو بنگالی دھواؤں کا ایک تافلہ اندر آیا۔ وہ بقیہ عمر کسی آشرم میں گزارنے کے لئے بنگال سے ہر دو ای بھی جا رہی تھیں۔ ایک بے حاسین کسں بیوہ پر جتن بی کی نگاہ پڑی۔ دل میں سوچیں شاید یہ ہر دو ار میں زیادہ دیر نہ ٹکے۔ آشرم سے فرار ہو جاتے اور چند سال بعد ویشیا مشہور ہو۔ رَم جتنی سمجھی جائے۔ چلتے پھرتے کی اولاد — یا اگلے چالیس پچاس برس ہر دو ار کے دھوا آشرم میں مقید رہ کر ایک روز گنگا کنارے پھونک دی جاتے۔

الغظمتہ اللہ۔ تیمم کر کے فرش پر برقعہ پچھایا اور نیت باندھ لی۔ ایک مشنری گوری میم صاحب اندر آ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اردو ہندی کتابچے بیگ میں سے نکالنے لگی۔ نوابین نے موقع غنیمت جانا۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ سیدھی مہر کے گھر جائے گی۔

جالی کے کوڑا کھول پلیٹ فارم پر پہنچی۔ جہاں دوسری سبز بانات سے منڈھی ڈوبیاں
ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ کہا رستورات کوٹرین کے زنا نہ ڈیوں تک لے جانے کیلئے
مستعد بیٹھے تھے۔ مسافروں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ گھبرا کر پھر ویٹنگ روم میں آگئی۔
انگریز مشنری اسے دیکھ کر ہمت افزا اور پرامید انداز میں مسکرائی۔ نواب فاطمہ نے
ہونٹ پچکالیے۔ بڑی پکی مسلمان تھی۔

جنّ بی سلام پھر کراٹھیں۔ برقعہ جھاڑا۔ اسے طویل کوچ پر پھیلا کر دروازہ میں رکھیں۔
موندلیں۔ نواب ہمت کر کے پھراٹھی۔ بڑی بی نے فوراً ہنکارا بھرا۔ ”کہاں چلیں —“
نواب دروازے میں پہنچ چکی تھی۔ گھبرا کر بولی ”قدیمچے پر —“
”قدیمچہ باہر دھرا ہے ہر آمدے میں ہشتا۔ حرافہ۔ ادھر آ کر بیٹھ ورنہ ٹانگیں توڑ
دوں گی —“
نواب فاطمہ آسمان سے گر کر بھوریں اٹک چکی تھی۔

سلطان الہند کے دربار کے عظیم الشان پھاٹک پر نوبت اور نقارہ بج رہا تھا۔
سُن کر چی لڑتا تھا۔ تھر تھرا کا پتی توبہ تارا کرتی آنسو بہاتی جنّ بی صحن میں داخل ہوئیں۔ روضے
پر حاضری دینے کے بعد ایک عمارت کے بآئدے میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ اس جگہ پہلے سے بہت سی
لاوارث عورتیں اور بھکاریں اپنے اپنے اڈے جمائے بیٹھی تھیں۔

جنّ بی نے سامان قرینے سے رکھنا شروع کیا۔ دھک سی رہ گئیں۔ نسخوں کا
بستہ اور دواؤں کی پیٹی گوٹے والوں کے ہاں دلی میں رہ گئی تھی۔ سوچا تھا یہاں درگاہ
شریف میں اسی طرح چورن بیچ کر خرچ چلائیں گی۔ کھانا لنگر سے۔ اب وہ سچ مچ بھکاریوں
کی طرح دونوں وقت کا کھانا لنگر سے کھانے لگیں۔ جس روز آستانہ مبارک پہنچی ہیں
اس کے دوسرے دن ہی بمبئی کے کسی سیٹھ کی منت پوری ہوئی تھی۔ چھوٹی دیگ کے

نیچے منوں لکڑیاں جلائی گئیں۔ نوابن ایک طرف کھڑی جیزت سے دیکھا کی۔ دوپوری آٹا دیگ میں ڈالا گیا۔ پھر پانی۔ ایک اور آدمی نے سیڑھی چڑھ کر چار بوری شکر انڈیلی۔ پورے بتیس سیر گھی۔ چار بوری چاول۔ ڈھیروں نمک۔ بلدی۔ تھوہارے۔ ناریل۔ نماز عصر کے بعد سے دس بجے رات تک پکی۔ پھر اسے ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ فجر کے وقت دیگ لٹی۔ ایک آدمی اندر کودا۔ بالٹی بھر بھر دلیہ صحن کے پکے فرش پر پھینکا گیا۔ دوسرے خدام اسے غریبوں اور بھنگاریوں میں بانٹنے لگے۔

ہندوؤں کا آستانہ زمانے بھر کے سنائے ہوئے انسانوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ جن بی یہاں اب یونانی ادویہ اور چوڑن کوٹنے سپینے کی مصروفیت سے آزاد تھیں۔ دن رات عبادت میں جٹ گئیں۔ یا قوال پتوں کے وجد آفریں نغمے سنا کرتیں۔

پھاگن کی رت آئی۔ ایک روز ملک کے ایک نامی گرامی استاد حاضری دینے کے بعد سب دستور خواجہ کی بارگاہ میں اپنی موسیقی کا نذرانہ پیش کرنے میں مصروف تھے۔ جن بی چہرے پہ نقاب ڈال، رنگتی رنگتی صحن میں پہنچیں ایک طرف کو بیٹھ گئیں، استاد نے الاپنا شروع کیا۔ دیکھو دھمال کھیلیں خواجہ معین الدین۔

مدتوں بعد پکا کاٹنا سننے کو ملتا تھا بے اختیار خود بھی زیر لب سنگت کرنے لگیں۔ دیکھو دھمال کھیلیں خواجہ معین الدین۔ سلطان المشاخ۔ خواجہ فرید گنج شکر۔ ایسی رت آئی۔ ایسی رت۔

گانا ختم ہوا۔ جن بی کو خبر نہ پڑی اپنی دھن میں الاپے گئیں۔ اب وہ بہار کا ایک اد خیال گنگنا رہی تھیں۔ کھیلے دھمار۔ حجت نجام الدین کے سنگ کھیلے دھمار۔ نزدیک بیٹھے ایک سارنگیے نے کان کھڑے کیے۔ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ کچھ سامعین نے انکی طرف دیکھا۔ ہڑبڑا کر اٹھیں اور تیزی سے اپنے برآمدے کی طرف بڑھ گئیں۔ لیکن اب ان کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ دیوار کے سہارے بیٹھی چپکے چپکے بے حد نیچے منوں میں اپنی موسیقی کا نذرانہ خواجہ کو پیش کرنی سہیں۔ سلطان الہند کے دربار

میں حاضر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے درباری گویے حاجی سبحان کا دھر پد جوگت میں گنگنائیں۔ پرتھمان اللہ۔ جن رچو نور پاک۔ نبی جی پر رکھ ایمان۔ اے سبحان۔ کبھی آدھی رات کو لٹے لٹے درباری میں ”پیاپا یوانمول“ چھیڑ دیتیں۔ کہت کبیر۔ آئند بھیو ہے۔ پیاپا یوانمول۔ گھونگٹ کے پٹ کھول۔

خواجہ کی جو کن کو اپنے انمول پیامل گئے تھے۔ نواب فاطمہ کے گھونگٹ کے پٹ دوسرے انداز سے کھلے۔

دن بھر منہ پر نقاب ڈاٹے ڈاٹے اسکادم بولا گیا۔ گوٹے والوں کے گھردم بھسکی مہلت نہ ملتی تھی یہاں مستقل بیکاری اور فرصت نے طرح طرح کے منصوبے بنانے پر آمادہ کیا۔ چند روز بعد نقاب الٹ کر وسیع احاطے کے چکر لگانے لگی۔

جتنی خیرات نہیں لیتی تھیں۔ پیٹ بھرنے کیلئے لنگر کافی تھا۔ کپڑے چکٹ ہو گئے۔

نوابن نے کہا۔ ”آؤ جی۔ تیل صابن خریدنے کے لئے کچھ پیسہ کوڑی چاہیئے۔“

جو نقدی پاس تھی وہ دتی سے یہاں تک آنے میں خرچ ہو چکی تھی۔ جواب دیا۔

”خالی پانی میں پھینچ لا۔“

”خالی پانی سے میل نکل جائے گا؟“

”اچھا۔ میں کچھ بند و بست کرتی ہوں۔ چل نماز پڑھ۔ اذان ہو رہی ہے۔“

جتنی بی میراں جی کے چاند جمیر وارد ہوئی تھیں۔ خواجہ جی کا مہینہ آیا عرس کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ نظام دکن اور دوسرے نوابوں مہاراجوں کی طرف سے بیش قیمت چڑھاوے چڑھنے والے تھے۔ پیرزادے انتظامات میں مصروف۔ بھکاریوں کی ابھی سے چاندی۔

میراٹھوں اور ڈومینوں کی ٹولیاں سنگی جالی کے پیچھے شہزادی جہاں آرا بیگم کی

عبادت کا وہ میں بیٹھ کر گائیں ، ریالابا آیا — اے میرا خواجہ بنا آیا — جیڈر کا پوت آیا — زسٹرائر کا پایا آیا — جن بی ان پردہ نشینوں کے پاس جا بیٹھتیں اور خوب لہک لہک گائیں — ”تصویر مصطفیٰ کی — تنویر مرتضیٰ کی — مرا خواجہ بنا آیا —“ انھیں بیل بھی ملنے لگی ، اللہ نے بیل صابن کا انتظام کر دیا ۔

درگاہ شریف سے کچھ فاصلے پر بازار حسن تھا ۔ جمعرات کے روز کسبیاں حاضری دیتیں ۔ نواب فاطمہ ان کے زرق برق کپڑوں اور گہنوں کو رشک سے دیکھا کرتی ۔ اپنے میلے لباس ، الجھے بال اور ننگے پیروں پر نظر ڈال کر شرم سے کٹ کٹ جاتی ۔ لوگ اسے بھی منگتی سمجھنے لگے تھے ۔ ایک سیاہ فام ہٹاکٹا نوجوان بھکاری رنگ برنگے منکوں کی مالائیں لوہے کے کڑے اور پیروں کا تاج پہنے پھانگ کے قریب ایک کونے میں بیٹھا اپنی لال لال آنکھوں سے نوابین کو گھورا کرتا ۔ وہ بہت مالدار تھا ۔ اور بیچلر ۔ ایسے گداگر والدین جنکی نوعمر بن بیابہی لڑکیاں چکٹ برقعے اوڑھے یا کھلے منہ ، کٹورے سامنے رکھے انکے پہلو میں بیٹھی رہتی تھیں ، اکثر سوچتے : کاؤ بآشاہ نجانی نے کس قسمت والی کے لئے ”رقعہ“ بھیجے گا ۔ بوجہ وہ بھینکر چرسی تو جا کر ایک روز جن بی کی پریر و بھانجی کا رشتہ مانگ آیا ۔

جن بی چھو کر کی طرف سے از حد فکر مند تھیں ۔ وہ نوابین کو امرتسر سے آنے والی کنجریوں کی ایک ٹولی کے پیچھے پیچھے چلتے دیکھ چکی تھیں ۔ انکو یہ بھی یاد تھا کہ نواب فاطمہ دلی ریلوے اسٹیشن کے زنانہ ویٹنگ روم سے فرار ہونے کے لیے پرتول چکی تھی ۔ انھوں نے بھینگے بھینسے کاؤ بآشاہ کا پیغام فوراً منظور کر لیا ۔

اس روز جب نوابین لنگر سے کھانا لے کر اپنے ٹھکانے پر پہنچی جن بی نے کہا : شستا ! وہ سوداگر بچے تجھے ٹھیک پہچانے تھے ۔ تو بے ہی ہوائی دیدہ ۔ ساری درگاہ میں کد کڑے

لگائی پھر رہی تھی۔ اب بزرگیاں نہ پہنچنے لگی۔

”آ تو جی میں تو۔“

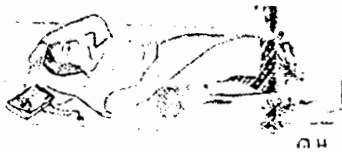
”ٹھہر تو سہی خیمہ رہ۔ اسی جمعے کو دو بول پڑھوائی ہوں۔“

”کس سے۔“

”اسی کا لو بادشاہ سے اور کس سے۔ کیا مرکی کا شہزادہ تجھے بیاہنے آئے گا۔“

”اللہ کرے ملانی تم پر بجلی گرے۔ ڈھائی گھڑی کی آئے۔ ڈھڈو۔ تم کھڑے سے گر پڑو اور پٹ سے دم نکل جائے۔ عباس علمدار کا علم تم پہ لٹے۔ سپو۔“ نوابن نے پوری جان سے لرزتے ہوئے دانت پیس کر جواب دیا۔

ججن بی ساید شک گئی تھیں۔ انھوں نے نوابن کی بدتمیزی کا مطلق نوٹس نہ لیا۔ کھانا کھا، کٹی کمر، دیوار سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ نیم کے تنکے سے خلل کرنے لگیں۔ سامنے کے چھتتا نیم کی بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا برآمد سے میں آرہی تھی۔ چند منٹ بعد ٹانگیں پا رک کر فرش پر بیٹیں اور سنانے لگیں۔



اڑھائی دن کا جھونپڑا

نوابن نے آنسو بونچھے۔ کچھ دیر سوچا کی پہلا کام تو یہ کہ ماہن تیل خریدوں۔ کپڑے دھوؤں۔ ایسی ٹھننی بنی رہی تو کاٹو باٹا جیسے بھک منگے ہی رقعے بھیجیں گے۔ جنّ بی کو بیل کے چوپیسے ملتے تھے وہ اس کی شادی کے لئے جوڑ رہی تھیں۔

کانی آلود گھڑے سے پانی نکال کر کٹورہ دھویا۔ میلا برقعہ اوڑھ کٹورہ ہاتھ میں لے بڑے پھانک پر جا بیٹھی۔ آج وہ پہلی بار بھیک مانگنے جا رہی تھی۔

طرح طرح کی صدائیں لگا کر مانگنے کے فن لطیف سے ناواقف تھی۔ چپکی بیٹھی رہی ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ کٹورے میں فقط ایک ٹکڑا جو کسی مارواڑی نے گرایا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے نقاب الٹ دی۔ آدھ گھنٹے کے اندر کٹورے میں کوڑی چھرام پائی اور ٹکوں کا انبار لگ گیا۔ اتنے میں بازار کی ایک عشوہ طراز مغنیہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ جلو میں اس کے سپردانی اور نوچیاں۔ نوابن نے گلگھیا کر پیالہ اس کے سامنے بڑھایا۔

”خواجہ کے نام پر ایک ڈبل۔“

راحت بائی اجیر والی نے ٹھٹھک کر اس پر نظر ڈالی۔ ایک نوخیزمہ حبیب۔ اور ہاتھ میں کاسہ گدائی۔ اس نے درد مندی سے پوچھا —

”ارے کیا تیرے ماں باپ بھی یہیں ہیں؟“

”مر گئے۔“

”یہیں کے بھکاری تھے؟“

گلرخ بانو بیگم عرف نواب فاطمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ مرحوم مرزا دلدار علی برلاس

دلی کے مشہور عطر فروش اشکبار آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو انکی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔

سروم دکھم دکھم — مہا تما بدھ نے انکشاف کیا تھا۔ گریہ زندگی کی بنیادی حقیقت ہے سیراب کشتہ نشد —؟ نہ۔ کس آتش نداد —؟ ہنسی، مسرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ چوں شد۔؟ شہید شد۔ کجا —؟ دشت ماریہ۔

ساری دنیا دشت ماریہ تھی۔ ساری زندگی زندانِ شام میں، جناب سیکینہ کی ایک حقیر کنیز — ان کی جوتیوں کی خاک — کیا ہمیشہ اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتی رہوں گی؟

”تو تو یہاں اکیلی رہتی ہے؟“

راحت بانی کی آواز نے اسے چونکایا۔

”نہیں۔ ایک ہوتی ہیں۔ دفاقتہ۔ جن بی۔ ان کے ساتھ۔“

”ہمارے ہاں چلے گی؟ نوکری کرے گی؟ اوپر کا کام۔“

”بڑی بی نہیں جانے دیں گی۔“

”تھ سے بھیک منگوائی ہیں؟“

”نہ۔ مگر اپنے پاس سے ہلنے نہیں دیتیں۔“

”شادی بیاہ طے کر دیا ہے؟“

نوابن نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کس سے؟“

”ایک بھکاری ہے۔ کالو بادشاہ —“ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

”اللہ غنی۔ تجھ جیسی خور لقا کا نکاح اس مکروہ منگتے سے — کیا وہ جن بی پلگا گئی ہیں؟“

”جی ہاں۔ کچھ بٹرن سی ہو گئی ہیں۔ ابھی۔ ابھی۔ حال میں۔ پہلے ایسی نہیں تھیں جب سے

انہیں دلی کے گوتے والوں کے گھر سے نکالا گیا ہے ان کا کلیجہ الٹ گیا —“

”چل۔ ادھر آکر بات کر۔“ راحت بانی نے دھیرے سے کہا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ طایفے کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

مصنوعی طور پر گھگھیا کر خیرات مانگتی جاتی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔

اس رات نوابن درگاہ شریف سے بھاگ گئی۔ اپنی سُرُج پٹاری ساتھ لیتی گئی۔ راحت بانی نے اپنا پتہ بتلادیا تھا۔ اماوس کی اس رات جب درگاہ شریف کے پیڑ سرسرا رہے تھے اور سارے میں سوتا پڑا تھا کسی ریاست سے آئی ہوئی کوئی مظلوم بیگم صاحبہ جن کو نواب نے طلاق دیدی تھی، اس کمرے میں جہاں شہزادی جہاں آرا بیگم عبادت کرتی تھی، جانماز پر بیٹھی نفیس پڑھ رہی تھیں۔ نوابن دبے پاؤں قریب سے گزری۔ جی چاہا سنگی جالی کے نزدیک جا کر دیکھ کیسی لگتی ہیں۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ پھانک پر پہنچی۔ سارے بھگ مٹکے اپنے اپنے ٹھکانوں پر مچوخاب تھے۔

بازار میں اُترتی۔ دور دیہ دکانیں بند۔ تنور سنان۔ ایک موٹی نلکٹی نے اپنی نارنجی آنکھوں سے اسے گھورا۔ اسے تین سال قبل کی وہ رات یاد آئی جب غوثیہ نے اسے بتلایا تھا کہ مدد سے اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ گوٹے والوں کے گھر کے کنوین میں کود پڑے گی۔

غور سے دیکھتی، ڈرتی، سہمتی، پٹاری سر پر اٹھائے مکھن لال حلوائی کی دوکان پر پہنچی جس کے اوپر راحت بانی کا چو بارہ تھا۔ پہلو کے تاریک زینے میں داخل ہوئی اندھیرے میں زور کی ٹھوکر لگی۔ انگوٹھے میں چوٹ آئی۔ برفعہ اتار کر پٹاری میں ٹھونس۔ بمشکل سیر پڑھیاں چڑھی۔ راحت کے کمرے پر پہنچ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ پہلے مہزو دیوانے سے پچی۔ اب چرسی مسٹنڈے کاٹوسے۔

”قدرت کے کرشمے نرا لے رہے ہیں۔“ راحت بانی نے اس سے کہا۔

جنّ بی نے صبح اٹھ کر دیکھا۔ نوابن مع پٹاری غائب۔ دو سال قبل وہ لونڈا سلطان جی میں ابن بطوطہ کی سرائے سے ان کا اندوختہ لے کر فوجیکر بیوا تھا۔

نماز فجر کے بعد احاطے میں تلاش کروایا۔ کاتوبا شانے اپنے چیلے چانٹے چاروں طرف دوڑائے۔ عرس شریف کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں ایک نقاب پوش لڑکی کو ڈھونڈنا کارے دارد۔ جن بی خود اس کی تلاش میں نکلیں۔ ان کی آنکھوں میں تیزی سے پانی اتر رہا تھا۔ لالٹنی کے سہارے ٹوٹل ٹوٹل کر چلتی پھرتی پھر آکر اپنی شطرنجی پر بیٹھ گئیں۔ حریف انکومات دے کر فرار ہو چکا تھا۔ دیوار کے کنارے بچے اور چند برتن اسی طرح قرینے سے چنے ہوئے تھے۔ نوابن کی لال پٹاری کی جگہ خالی تھی۔

اب وہ پھر اکیلے رہ گئیں تھیں۔ تسبیح نکال کر اللہ اللہ کرنے لگیں۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔

راحت بانی نے نوابن کو چند روز اپنے ہاں چھپائے رکھا۔ ریشمیں جوڑے سلوائے۔ نئے کپڑے اس نے برسوں سے نہ پہنے تھے۔ پرانا گودڑا بھیجے سے نیچے پھینکنے کے بعد نواب فاطمہ نے اپنی گڑیاں پٹاری کی تہہ میں احتیاط سے رکھیں۔ ان کے اوپر نئے ملبوسات۔ جسے کے دن ساٹن کا نیا نکور جوڑا پہنا۔ راحت نے لکھ بند ملازم ساتھ کیا۔ ایک پردہ دار شکرم میں سوار کر کے اپنی خالہ زاد بہن گجرا کے ہاں جے پور روانہ کر دیا۔

شکرم مدار دروازے کی طرف سے نکلی۔ پھر اڑھائی دن کا بھونپڑا نظر آیا جو ایک بادشاہ نے نبویا تھا۔ پل پل پھن پھن دنیا کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور اللہ بڑا بے نیاز ہے۔

حب عادت شدید استہزا سے ہونٹ لٹکائے، اشرف الملوقات سے حد درجہ بیزار نظر آنے والا کلیت پسند روائی آؤٹ ایک حیران پریشان مہبوت اور تنہا لڑکی کو گاڑی میں بٹھالے ایک انجانی منزل کی طرف لیے جا رہا تھا۔







(۱۲)

مس نواب بانی آف جے پور

ہنسے استاد مبارک علی خاں۔ تان رس خاں۔ حدو خاں۔ بہرام خاں۔ کلن خاں
 سی بڑے فنکار کا نام لیجئے وہ سر آمد راجہ ہائے ہندوستان ہز بانی نس مہاراجہ جے پور
 کے گنی جن خانے کو رونق بخش رہا تھا۔ نامی کتھک اور گویے چاند پول بازار میں گجر بانی کی
 چھو کریوں کو بتاتے تھے۔ پانچ چھ برس کے اندر اندر پری رُود اور خوش آواز نواب بانی کے
 لئے دور دور سے کچھڑی آنے لگی اس کے علاوہ نو چند کی کامیلہ بکیر شریف۔ بسنت کامیلہ
 ریاست کپور تھلہ۔ بینظیر کامیلہ، دار سردور راہپور۔ نواب بانی آج یہاں کل وہاں دیکھتے
 دیکھتے بیسویں صدی آگئی۔ ۱۹۰۰ء میں پرنس ایڈورڈ طویل انتظار کے بعد سربراہ آئے
 سلطنت ہوئے۔ انڈین ایمپائر میں دھوم کے جشن مناتے گئے۔ ایک میوزک کانفرنس
 لاہور میں منعقد ہوئی۔ نواب بانی مدعو کی گئیں۔ لاہور میں ان کا جی بہت لگا۔ اتنا بار وفاق
 فیشن ایل شہر۔ شاندار طرؤں نو کیلی مونچھوں والے کٹیدہ قامت دریا دلی روسا۔ اور
 جاگیر دار۔ زندہ دل عوام محفلوں میں اور داتا کے دربار میں نواب بانی شاہی محلے والیوں
 سے ملیں۔ وہ لوگ زیادہ تر بیگم کہلاتی تھیں۔ ارشاد بیگم۔ سردار بیگم۔ ممتاز بیگم۔
 لاہور میں نواب بانی بھی نواب بیگم کہلانے لگیں۔ اسی نام سے مشہور ہوئیں۔

شاہ ایڈورڈ کی تاجپوشی شہ ثابت ہوئی۔ جے پور لوٹیں ایک عقل کے اندھے کا ٹھٹھا واڑی
 رئیس گانا سننے تشریف لائے۔ یہ نوعمر دربار صاحب باپ کے مرتے ہی گل پھڑے
 اڑانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ انکی سوگدہاشی با ایک جے پوری سردار کی اکلونی بی بی نہیں
 رام گنج بازار میں ایک وسیع ویلی باپ نے انکو دھیر میں دی تھی۔ وہ مقفل رہتی تھی۔

دربار صاحب جے پورا کراسی میں ٹھہرے۔ نواب بیگم پر ایسے عاشق ہوئے کہ جیلی انکے نام لکھ دی۔ کاٹھیا واڑ واپس گئے۔ اس کے بعد پیرس۔ وہاں پہنچتے ہی بذریعہ موٹر کار جہان فانی سے کوچ فرمایا۔

نواب بیگم نے جیلی میں ٹھاٹھ باٹ سے رہنا شروع کیا۔ گانے میں راجستھانی مانڈا نکلی خصوصیت تھی۔ فونو گراف ریکارڈوں کے خاکی پیکٹ پر جو فونو گراف ان کا چھپتا تھا اس میں بڑی بانگی نظر آتیں۔ ناک میں لونگ۔ گلے میں ٹھٹھہ۔ ساری پر بروچ کی جگہ تنغے۔ جوان کو میوزک کانفرنسوں میں ملے تھے۔ نواب بیگم جے پور والی۔ کئی بار ارادہ کیا مہر کو خط لکھیں۔ وقت نہ ملا۔ جن بی کو خط لکھنے یا جا کر ان سے ملنے کی سمیت نہ پاتی تھیں۔

کئی سال بعد اپنے طاغیے کے ساتھ چادر چڑھانے اجمیر شریف گئیں۔ اس برآمدے کے پاس سے گزر رہا جہاں برسوں قبل وہ اور جن بی اپنا اپنا زاد راہ اٹھاتے دلی سے آن کر اتریں تھیں۔ اسی درمیں جن بی کی شطرنج کی جگہ ایک شکستہ سوزنی بھی دکھلائی دی۔ اس پر موجود ایک نابینا بھکارن زائرین کو لگاتار اور بے تکان دعائیں دے رہی تھی۔ ”یہاں کوئی جن بی بیٹھا کرتی تھیں؟“ نواب بیگم نے ٹھٹھک کر دریافت کیا۔ ”ہاں بانی صاحب۔“ ایک اپاہج فقیر نے برآمدے کے دوسرے کونے سے جواب دیا ”اندھی ہو گئی تھیں ان کی بھانجی تھی کہ کون تھی وہ بھاگ گئی۔ اس کے بعد سے وہ باولی سی بھی ہو گئیں تھیں۔ موتیا بند نے غریب کی آنکھیں پٹ کر دیں۔ پچھلے سال ہی مرے۔ بڑی تکلیف میں تھیں۔ ہر طرح سے معذور۔ اللہ نے مشکل آسان کی۔ اے بانی صاحب۔ غریب نواز کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔ اللہ تمہیں اور دے گا۔ بہت دے گا۔“

نواب بیگم چند منٹ غم صم کھڑی رہیں۔ پہلے جن بی کے انجام پر آنسو بہائے پھر بھکاری کی دعا پر غور کیا۔ اللہ تمہیں اور دے گا۔ ایک بار انھوں نے راحت بانی سے

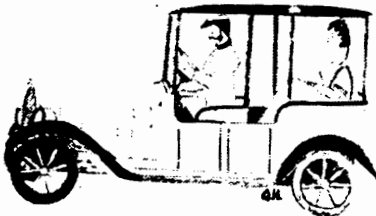
پوچھا تھا کہ اولیاء کے مزاروں پر گانے والیوں کا ہجوم ان بزرگان دین کی بے ادبی نہیں ہے؟
 جواباً راحت بانی نے ایک حکایت سنائی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ایک
 کلال نے درخواست کی اس کے کاروبار میں برکت کی دعا فرمادیں۔ حضرت محبوبؒ الہی نے
 ایک پرچی اس کو لکھ دی جسے وہ تعویذ جان کر لے گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دلی کا متمول ترین کلال
 بن گیا۔ حضرت محبوبؒ الہی نے اس پرچی پر محض اتنا لکھا تھا۔ خدایا تیرے کچھ بندے شراب
 تو پیئے ہی رہیں گے۔ تو وہ اسی کلال کی دکان سے کیوں نہ پیئیں۔
 یہ حکایت سن کر نواب بیگم کو اپنی نئی طرز زندگی کے متعلق کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا۔

لیکن جتنی لائٹھی ٹیکتی پھر آکھڑی ہوئیں۔ مرحومہ کہا کرتی تھیں۔
 ”زندگی میں بہت بھیانک وقت آئے۔ سرائے فطرل بیگ کی شب محشر کے آگے
 سب بیچ۔ وہ قتل کی رات تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں کی شہادت کی رات سارے رشتے
 ناتوں کا انقطاع۔ ایک پورے عہد کی ہلاکت۔ کہتے ہیں سمندر گاتے گاتے جل کر راکھ ہونے
 کے بعد اسی راکھ سے پھر زندہ ہوتا ہے۔ سارا ہندوستان اپنے بلبے اور راکھ میں دب کر
 اس میں سے دوبارہ نمودار ہوا تھا مگر بدلا ہوا۔ اس کی موسیقی کے سر مختلف ہو چکے تھے کیا کپ
 انسان بدل گئے تھے“ جتنی بڑی عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ تعلیم یافتہ بیوی تھیں۔

ایک بار بتلایا۔ نواب بیگم سیڑھی پر رومال پٹھا کر بیٹھ گئیں اور سوچا کیں ایک بار
 بتلایا انھوں نے کہ جب میں خود سمنڈ کی طرح گاتے گاتے جل جانے کے بعد دوبارہ جی
 اٹھی تو بہ کی اور ایک بڑی رقم سید احمد خان کو ان کے مدرسے کے لئے بھجوا دی۔ بہت سی
 گانے والیوں نے چنہ بھیجا تھا۔ ہم سب رذیل، شریف عزیز امیر اپنی قوم کی شکست اور
 ہندوستان کی تباہی سے دل گرفتہ تھے۔ بہت سے لوگ خصوصاً کٹھ ملا سید کے مخالف بھی
 تھے مگر ہم ان کے خیر خواہ تھے۔ پھر ہم نے سنا کہ سید نے ہمارے چند سے سے کالج کے لورڈنگ
 ہاؤس کے بیت الخلا بنوا دیے! بلا سے۔ اے بی ہمارا روپیہ قوم کے کسی کام تو آیا۔ یہ کہہ کر

جن بی خوب سنہی تھیں۔ ایک مرتبہ پولیس — کہتے ہیں جنات دو طرح کے خلق ہوتے ہیں نیک جن آگ سے۔ بد دھویں سے۔ تو پھنوس ہندوستان میں جو آگ لگی تھی اسکے دھویں سے بھانت بھانت کے کیشف جن پیدا ہوئے۔ نفاق اور تعصب اور نفرتوں کے جن۔ — وہ ہر طرف منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کہا۔ ہمیشہ یاد رکھیو۔ بنو گنہگاروں کو جہنم کا دروغہ مطمحہ ہوٹری کی بھجیا پکا پکا کر کھلایا کرے گا۔ آپ زقوم پینے کو ملے گا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بڑبڑائیں۔ ”ایک عزیز الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے اس کے کفن دفن کے لئے کچھ رقم درکار ہے۔“ وہ خود جن کی سنی ان سنی کر کے فرار کی ترکیبیں سوچا کرتیں۔

”بائی صاحب اللہ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔ اللہ تم کو اور دے گا۔ — بہت دے گا۔“ اپنا بیچ فقیر لٹا کیا۔ نامینا بھکارن فوٹو گراف کے ریکارڈ کے مانند اپنی دعائیں دہرا رہی تھی۔ نواب سیکم سیڑھی سے اٹھیں۔ پھانک کی طرف روانہ ہوتیں۔ گداگروں کا ہجوم ان کے تعاقب میں لپکا۔ نواب سیکم کے استاد جی سب کو ریزکاری بانٹتے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ درگاہ شریف کا زینہ اتر کر باہر آئیں جہاں وردی پوش شو فرارو ڈومیلر موٹر کار ان کی منتظر تھی۔



پورٹریٹ آف اے ناچ گزل

یہ ڈیملر موٹر کار نواب بگیم کے لئے ٹھاکر مہیشور سنگھ جی صاحب خاص طور پر ولایت سے لے کر آئے تھے۔ اس کچھواہا شیناوت سردار کی جاگیر بہت چھوٹی اور دل بہت بڑا تھا۔ اپنے مہاراجہ کی طرف سے، جس کے وہ باجگذار تھے، چنور، پالکی، تعظیم اور لوازمہ کا استحقاق رکھتے تھے۔ اجداد مغلیہ منصب دار رہ چکے تھے۔ اپنی اونچی شان نبھانے کے لیے محدود آمدنی کے باوجود شاہ خرچ — بازوق تھے اور دھرماتما۔ ایک دور افتادہ بادیے کے وسط میں سرخ پہاڑی پر ان کے ٹھکانے میں سال کے بارہ بیٹے پوجا پاٹ تیج تہوار راگ رنگ کا سلسلہ جاری رہتا۔ پہاڑی کی ڈھال پر ستیلا دیوی کی قدیم چھتیاں استادہ تھیں۔ چیت کرشن اشٹی کے روز ستیلا دیوی تخت ٹال پر پورے لوازمے کے ساتھ نکالی جاتیں۔ دیوی کے علاوہ ٹھاکر صاحب مہاراجگان جے پور کے مانند ام جین کے بھگت تھے۔ دسویں مہرم کو ان کا جگمگانا تعزیه گشت پر نکلتا۔ تین ٹھکرانیاں ویشنو تھیں۔ ہاشورا تری کے علاوہ جنم اشٹی دھوم سے منائی جاتی۔ ٹھاکر صاحب میوا سکول اجیر کے تعلیم یافتہ اور انگلینڈ رٹرنڈ آدمی تھے مصوری کی پرکھ درثے میں پائی تھی۔ مورث اعلیٰ تقیور سیکری کے تصویر خانے کے محافظ دستے کے افسر رہے تھے۔

راجپوتانہ کے بیشتر ٹھاکروں کے ”ٹھکانوں“ میں ان کے خاندانی ورثے کی مینا توری تصاویر کے ایسے بے اب تک موجود تھے جن کی خبر بیوک جیسے فرنگی پارکھوں کو اب تک نہ پڑی تھی۔ ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کے خاندانی بے میں عہد اکبر و جہانگیر کی متعدد تصاویر محفوظ تھیں۔ جن کو ٹھاکر صاحب اپنا اہم ترین اثاثہ سمجھتے تھے۔ بہت کم

خوش نصیب ایسے تھے جن کے سامنے وہ بسنتہ کھولا جاتا۔

ٹھاکر صاحب کا دوسرا اگر انقدر اثاثہ وہ نامور گائیک اور بین کار تھے جو ٹھکانے کے چھوٹے سے دربار سے منسلک تھے نواب بیگم جیسی حسین اور نامی مطربہ بھی ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کی تنخواہ دار ملازم تھیں۔ علاقے کی ایک نیلگوں جھیل کے کنارے استاد سترھویں صدی کی ایک بارہ درمی مرمت کروا کر نواب بیگم کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ عظیم المرتبت متعل شہزادے شہزادیاں مع لاؤشکر شکار کھیلنے آگرے سے اس طرف آتے تو اس بارہ درمی میں ٹھاکر صاحب کے پُرکھوں کے مہمان ہوتے۔ نواب بانی مستقل طور پر جیسور میں رہتی تھیں۔ سال میں چند بار تہواروں اور نجی تقاریب کے مواقع پر گانے کے لیے مدعو کی جاتیں اور اس بارہ درمی میں قیام کرتیں۔ ٹھاکر صاحب کا ٹھکانہ ریاست جے پور سے دور ایک اور جواڑے میں واقع تھا۔ ڈیملر ہنز اسی مسافت کے لیے خریدی گئی تھی۔ ورنہ جے پور شہر کے اندر نواب بیگم اپنی میلاروفٹن استعمال کرنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

کاٹھیاواڑ کے احمق اور آنجنابی دربار صاحب کی عنایت کردہ حویلی جتنی عالی شان تھی نواب بیگم اسی ٹیم ٹام سے اس میں فروکش تھیں۔ لائف اسٹائل ارباب نشاط والا نہ تھا۔ نہ نائیک نہ میر شکار۔ ٹھاکر صاحب کا ”کھلے جُڑے“ کی ملازم تھیں کہ دوسرے روسا رکھی محفلوں میں گاسکتی تھیں لیکن فن زرگری سے ناواقف تھیں اور کھ لٹ گویا اپنے مربی ٹھاکر مہیشور سنگھ کی ناؤ پر سوار۔ ان کی بھی آمدنی کم اور اخراجات وافر۔ درجن بھر ملازمین۔ شو فر۔ خاناساں۔ اس کا میٹ جو مشالچی (یعنی مشعلچی) کہلاتا تھا۔ خدمت گار۔ آیا۔ چھوکر ابوائے“ مہری۔ کوچبان۔ سائیس۔ مالی۔ دھوبی۔ جمعدار۔ ان کے علاوہ استاد جی۔ سارنگیہ۔ طباطبائی۔ سارا اسٹاف دو منزلہ شاگرد پیشے میں رہتا تھا۔

کابل اتنی کہ ہل کے پانی نہ پتیں۔ پاؤں آگے بڑھائیں۔ مہری پیک کر گرگابیاں پہناتی۔ آیا بالوں میں برش کرتی۔ سارے طور طریقے رانیوں نواب زادیوں والے اپنا رکھے تھے۔ ایک بار اپنی ہمراز اور وفادار گوانی آیا فلو مینا ڈی کو سٹا سے کہا تھا۔ فلو میں نے سات آٹھ برس کی عمر سے اتنی شدید مشقت کی ہے کہ غریبوں اور کسانوں کے بچوں نے بھی ایسی کٹھن زندگی نہ گزاری ہوگی۔ اب میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔

نواب بیگم غیر بھی تھیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر معلوم کروائیں کسی نادار ماں باپ کی لڑکی کا بیاہ ہونے والا ہے۔ سرخ بادلے کے بھاری سالہ ٹکے دوپٹے بنوا رکھے تھے۔ جو وہ نقدی کے ساتھ شادی سے ایک روز قبل لڑکی کے باپ کو بھجوا دیا کرتی تھیں۔

دلی دربار کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اخبارات اس کی خبروں سے پُر تھے۔ ٹھاکر صاحب بھی مع نواب بیگم دلی جانے والے تھے۔

اسی زمانے میں انڈین پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کا کرنل چارلس ڈالٹن راجپوتانہ کا دورہ کرنا ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کے ٹھکانے پر پہنچا وہ دلی دربار کے اخراجات کیلئے والیان ریاست سے بھاری رقمیں وصول کرنے کی غرض سے وارد ہوا تھا۔ سارے راجا نواب اپنی اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے خزانے لٹائے دے رہے تھے۔ لیکن بذریعہ موٹر کار و شوار گزار ریگستانی علاقہ طے کر کے ٹھاکر صاحب کی گڑھی تک پہنچنے میں کرنل کا مدعا کچھ اور تھا۔

چارلس ڈالٹن مغل راجپوت مصوری کا پارکھ تھا۔ وہ برٹش میوزیم اور انٹیا آفس لائبریری اور اوکسفرڈ اور کیمرج کے کتب خانوں میں اس موضوع کا وسیع مطالعہ کر چکا تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن کے انڈین سیکشن کی مجلس مشاورت کا رکن تھا۔ ہندوستان میں جب اسے اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی والیان ریاست کے موروثی ذخیرے ملاحظہ کرنے ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ وہ نادر تصاویر اس کی تذکر کرتے رہتے

کرنل ان فنی نوادر کو فوراً وطن عزیز کے عجائب خانوں کے لیے روانہ کر دیتا۔ اور ان کے متعلق آرٹ کے برطانوی رسالوں میں مضامین لکھتا۔

برسات کی وجہ سے صحرا اچانک سرسبز ہو چکا تھا۔ نواب بیگم جنم اشٹی کے جشن ”اس لیلہ“ میں گانے کے لیے جے پور سے آئی ہوئی تھیں اور بارہ درمی میں مقیم تھیں۔ ریس دھاریوں کی ایک نامی ٹولی لکھنؤ سے بلوائی گئی تھی۔ گڑھی میں۔ پید چل پہل تھی۔ جو دھپور سے کرنل ڈالٹن کا تار پہنچ چکا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے نواب بیگم کا خدشہ نگار اور انگریزی ”خانساں بھی جے پور سے بلوایا تھا۔

مہیشور سنگھ جی بہت چھوٹے جاگیردار تھے اور یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ٹھاکر صاحب ان نول گڑھ، ڈوگی، سیوار، دیوک وغیرہ کی طرح انہیں بھی دلی دربار میں شرکت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ مگر کیا پتہ۔ کرنل خوش ہو جائے اور گورنر جنرل کے ایجنٹ برائے راجپوتانہ سر ایلیٹ کابلون سے ان کی سفارش کر دے۔ وہ جلوس میں شامل نہ ہو سکیں تو کسی کارڈن پارٹی میں شاہ جارج اور ملکہ میری سے ہاتھ ملانے ہی کا شرف حاصل ہو جائے۔ کرنل ڈالٹن کو خوش کرنے کا ایک طریقہ مہیشور سنگھ جی کو معلوم تھا۔

نواب بیگم۔؟

جی نہیں۔ نادر منلیہ نصاویر۔

ٹھاکر صاحب نے اپنا اہم ترین بستہ تجوری سے نکالا۔ اس میں وہ مینا تو محفوظ تھے جو فتح پور سیکری میں ان کے جد امجد کو اکبر اعظم نے بے نفس نفیس عنایت کیے تھے۔ نصاویر اپنے دیوان خانے کی وسطی مرمرین میز پر پھیل کر انھوں نے کرنل کے انتظار میں گھڑیاں کی سوئیوں پر نگاہ جمادی۔

کرنل ڈالٹن تیسرے پہر کے قریب پہنچا۔ وہ ٹھاکر صاحب سے ایک مرتبہ بیکانیر میں ملا تھا۔ باہتی کا حافظہ رکھتا تھا۔ کسی نے سرسری طور پر اس سے مہیشور سنگھ جی کی کنفل

تصاویر کا تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ آج وہ گڑھی پر وارد ہو رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے چند ناقہ سوار قبضے کے بوسیدہ پھانک پر تعینات کر دیے تھے۔ کرنل نے بے پرواہی سے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں واپس لوٹایا اور ڈرائیور کو جھیل کی سمت مڑنے کا حکم دیا۔
دراصل کرنل ڈالٹن کو سنگ سرخ کی وہ بارہ درمی دور سے نظر آگئی تھی۔ دوہین لگا کر دیکھا تو نعل راجپوت طرز تعمیر کا نہایت دل کش نمونہ ثابت ہوئی۔ اپنے ساتھ بیٹھے نوجوان بلجین فوٹو گرافر آندرے رینال سے کہا۔

“LET’S HAVE A DEKKO.”

یہ فقرہ اپریل انگریزوں کی اپنی ریختہ یعنی انگلش اردو کچڑی کی اصطلاحات اور جملوں میں شامل تھا۔ لیکن آندرے رینال بلجیم سے آیا تھا اور چند رنگریں رہتا تھا اور HOBSON-JOBSON کا علم نہ رکھتا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے کرنل کو دیکھا۔

چارلس ڈالٹن دور بین میں منہک ہو چکا تھا۔

یہ نوجوان بلجین فوٹو گرافر بھی دلی دربار کے سلسلے میں اپنا گھوڑا دوڑانے میں مشغول تھا۔ اسے بریکز سے ہندوستان آئے ڈھائی تین سال ہوئے تھے۔ وہ کلکتہ کا ایک فیشن ایبل پورٹریٹ فوٹو گرافر بننا چاہتا تھا۔ مگر گھوڑ دوڑ اور جوئے کی لت کی وجہ سے اپنا کاروبار بھجایا تھا اور چند رنگر کے ایک فرانسیسی فوٹو گرافر کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ اب وہ شملہ پہنچا تھا اور کرنل ڈالٹن سے درخواست کی تھی کہ دلی دربار کے سرکاری فوٹو گرافروں کے زمرے میں اس کا نام بھی درج کر لیا جائے۔

شملہ کلب کی بار پر ایک شام کرنل ڈالٹن نے دفعتاً اس سے کہا: نوجوان آدمی! میں پرسوں راجپوتانہ جا رہا ہوں وہ ملک فوٹو گرافروں کے لیے جنت ہے۔ اگر تم چاہو تو میرے ہمراہ وہاں چلو۔ علاوہ ازیں میں چاہوں گا کہ چند نعل راجپوت تصاویر کے فوٹو بھی تم سے بنواؤں :-

موسیو رینال نے کرنل ڈالٹن سے تعلقات بڑھانے کے اس سنہرے موقع کو مضبوطی

سے کپڑا۔ چنانچہ وہ اس دشوار گزار سفر میں برطانوی افسر کے ہمراہ کاب یا ہم موٹر تھا۔

ڈرامہ بور نے فورڈ بارہ دری سے کچھ فاصلے پر روکی۔ چپڑاسی نے اتر کر پھلا اور اوزہ کھولا۔ پہلے کرنل چارلس ڈالٹن اور اس کے بی۔ موسیو آندرے رینال سفید سولا ہیٹ اور گازی سے برآمد ہوئے۔ دوسری موٹر کا راسباب اور فوٹو گرافی کے لوازمات سے لدی دھول اڑاتی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

بونی وارنٹلوار قبض اور آب رواں کے دوپٹے میں ملبوس نواب بانی بال بھڑائے بادلوں کے نیچے شہ نشین میں کھڑی تھیں اور بے فکری سے ایک لمبا کار ریاض کر رہی تھیں۔ کرنل نے دور بین لگائی اور ٹھٹھک گیا۔ ”بانی جو د — !“ اس نے دوہرین آندرے رینال کو تھام دی۔ آندرے نے شہ نشین کا نظارہ کیا اور دھبی سی سیٹی بجائی۔ ”کیا تم کو ایسا نہیں لگتا نوجوان آدمی کہ ایک مغل راجپوت تصویر کا ادجینل منظر ہمارے سامنے موجود ہے؟ بارہ دری — آسمان پر کالی گھٹا۔ اور سفید پرندے۔ شہ نشین میں نغمہ سرا حسینہ۔“

کرنل کی بات آندرے کے پلے نہ پڑی۔

”راگ مالا تصاویر میں“ کرنل نہایت جوش سے بولتا رہا ”اس منظر کا عنوان، لمبا رہو سکتا تھا۔“

آندرے نے پھر سر ہلایا۔ ہم اہل یورپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ انگریز قوم ایک شکی قوم ہے۔ وہ جو کہادت ہے۔ ”باڈلے کئے اور انگریز لوگ دھوپ میں گھوما کرتے ہیں!“ سولا ہیٹ اوڑھے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں اپنے ملک برطانیہ کی عظمت کی خاطر سرگرداں اور انڈین آرٹ کا محقق کرنل ڈالٹن کیا ایک مثالی شکی انگریز بدلتا نہیں تھا؟ آندرے نے مسکرا کر دریافت کیا ”سر۔ یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟“

” غالباً کوئی ناچ گرل یہ کرنل نے جانکاری سے جواب دیا ” ٹھاکر صاحب کی رانیاں بے پردہ نہیں کھڑی ہوں گی۔ یا ہم کو دیکھتے ہی فوراً اندر چلی جاتیں۔ آؤ گڑھی چلتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی اجازت سے شام کو آکر اس بارہ دری کے طرز تعمیر کا مطالعہ کریں گے۔“

بڑھا کرنل تیز تیز قدم رکھتا موٹر کار کی سمت چلا گیا۔ آندرے نے ٹھٹھک کر نواب بیگم پر نظر ڈالی اور مسکرایا۔ ناچ گرل! — اولاً — لا — لا —

نواب بیگم اس منظر سے محفوظ ہوئی — دوفرنگی نفر ہونٹوں کی طرح منہ کھولے اسے تک رہے تھے۔ بڑھا تو یقیناً وہی کرنل تھا بانکا فرنگی شاید اس کا اسسٹنٹ۔ آندرے نے یورپین انداز میں کندھے اچکائے اور نواب بیگم کو دیک کر کہا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔ شوفر نے ہارن بجایا۔ آندرے دوڑتا ہوا کار میں جا بیٹھا۔

کرنل اور فوٹو گرافر نے تین روز گز بھی میں قیام کیا۔ ٹھاکر مہینو سنگھ جی نے چار نادر منسل تصاویر پر کرنل کو مذہم کیں۔ کرنل نے ٹھاکر کو دئی دربار کے لیے مدعو کیا۔ اور آندرے کو حکم دیا کہ ناچ گرل نواب بانی کا پورٹریٹ بنا کر ٹھاکر صاحب کو کلکتے سے بھیجے۔ آندرے نے یہ کمیشن خوشی منظور کیا۔

فوٹو سیشن بارہ دری میں منعقد ہوا۔ سولہ نگہار کیے ٹھاکر کے عنایت کردہ قدیم علیہ زیورات سے بنی تھنی نواب بیگم کوچ پر بٹھی۔ آندرے نے کیمرا اسٹینڈ پر جما کر نہایت انہماک سے اس کی تصویریں کھینچیں۔ ”ان میں سے BEST پوزیشن کر کے ہم تم کو بھیجے گا“ کلکتہ میں رہ کر اسے ٹوٹی پھوٹی گورا شاہی اردو آگئی تھی۔ نواب بانی و انگیزی کی شہد فی الحال اتنی HOBSON-JOBSON کافی تھی۔

(۱۳) روشن چوکی

”حضرت اکبر نے —“ بوڑھے رائے زادہ کیلاش نرائن ماتھریان کی پیکہ نبھالنے کے لیے منہ چھت گیری کی طرف کر کے بولے ” ۱۹۰۳ کے دہائی دربار میں صاحب ڈیوک کناٹ کو دیکھا تو آنسو بہائے۔ ۱۹۱۱ کا دہائی دربار کہیں زیادہ عبرتناک ہے۔ کیوں بی مہروں وہ گلوپیاں بنانے میں مصروف تھیں۔ رائے صاحب ہتھے رہے۔“ ملکہ میری لندن سے چلنے لگیں تو بیگم مرشد آباد نے زنانہ بند کی جانب سے ان کو ایک عدد ایڈریس پیش کیا۔ والدہ سراج الدولہ کی روح کیسی اس روز ٹپتی ہوگی؟“

”رائے صاحب کس کس کی روح کس کس بات پر ٹپے گی۔“ مہروں نے جواب دیا۔ نواب بیگم ڈلی کاٹ رہی تھیں۔ وہ سب مہروں کے لال کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تھے۔ چاندنی کے فرش اور مسندوں کے علاوہ ایک کونے میں ڈرائینگ روم بنا یا جا چکا تھا۔ وسطی میز پر تازہ اردو اخبارات اور دربار کے متعلق بالخصوص مضامینوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نواب بیگم اور مہیشور سنگھ جی لال قلعے کی گارڈن پارٹی سے سیدھے یہاں وارد ہوئے تھے۔ شہر نفریوں اور ولایتی بینڈ باجے کی دھنوں سے گونج رہا تھا۔ آتش بازی چھٹ رہی تھی۔ روشن چوکیاں چاؤڑی سے گذرتی چاندنی چوک جاری بھیں رائے صاحب اٹھ کر چھپے پر گئے۔ چند منٹ بعد واپس آکر بولے۔ ہر روشن چوکی پر سازندوں کے بھیں میں ایک ایک آدمی سی۔ آئی۔ ڈی کا ضرور موجود ہوگا۔ بنگالیوں کے ڈر سے

ہر بزم طرب میں غم کا سی۔ آئی۔ ڈی تو بھیں بدل کر چھپا رہا ہے۔ مہروں نے :
انداز میں سوچا۔ اللہ کے کرم سے پڑھے لکھوں کی صحبت اب تک بیکسر تھی۔ بے چارے

خان بہادر برکت اللہ پچھلے سال اللہ کے گھر گئے۔ اب رائے زادہ کی تلاش مانٹر کا دم ایسا ویسا غنیمت تھا؟ بڑھاپے میں ذرا غینسلے ہو گئے تھے۔ اور تملک اور گوکھلے کے جھگت بن چکے تھے۔ اب وہ برا فروختہ آواز میں فرما رہے تھے ”ہمارے راجہ نوابوں نے جھجک جھجک کر اپنی تلواریں اس سارے جارج پنجم کے قدموں میں رکھیں۔ ہمیں تو فقط ایک آدمی پسند آیا۔ کوئی عدل کا بے چارہ سلطان لایج۔ یہ سب منخرے نواب راجہ مرغ زریں بنے میروں زیور لادے بادشاہ اور ملک کے قدموں میں لوٹے جارہے تھے یہ عرب نفر۔ سلطان لایج۔ اس کا ملک ممبئی پرینڈنسی میں شامل کر لیا گیا ہے مگر صاحب وہ عرب میں نہیں آتا۔ جناب عالی۔ تہہ بند باندھے سادا چونوہ پہنے سر اٹھائے کیا نام کر سیدھا چلتا ہوا آیا بادشاہ سلامت کو السلام علیکم کہنے کے مارا میرے بشیر نے اور فوراً واپس۔ یہ بے خود داری۔ نہ کہ سب سسرے آداب تسلیمات کو نشانات بجالاتے اودھ موئے ہوئے جارہے ہیں“

مہرو نے ابرو کے اشارے سے رائے زادہ کو روکنا چاہا اور ٹھا کر صاحب کا پورا تعارف کرایا۔ رائے صاحب۔ آپ ٹھا کر مہیشور سنگھ جی ہیں۔ دربار میں شرکت کے لیے راجپوتانہ سے تشریف لائے ہیں۔

”ارماں معاف کرنا ٹھا کر صاحب۔ رائے زادہ نے بے تکلفی سے ارشاد کیا۔ ہم صاف بات کہنے کے عادی ہیں۔“

ٹھا کر صاحب خاموش رہے۔ مہرو نے نواب بیگم کی طرف اشارہ کیا۔ رائے صاحب آپ ان کو پہچانتے ہیں؟

”ان کو کون نہیں پہچانتا۔“

”وہ سترہ اٹھارہ سال قبل، کرات، یاد ہے؟۔ یہی دسمبر جنوری کا زمانہ تھا

یہ میری ڈولی پر بیٹھ کر غلطی سے یہاں پہنچ گئی تھیں۔“

”خوب یاد ہے اسی رومی قالین پر تحائف اوڑھے پڑی سو رہی تھیں۔ ہونی شنی۔“

”تو بس، مہیشور سنگھ جی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔“ یہ بھی ایک شنی امر

تھا کہ راجپوت سردار فرنگی سمرٹ کے قدموں میں اپنی تلواریں رکھیں۔ مغلوں کے قدور میں بھی تو رکھی تھیں۔“

”کیوں رائے صاحب ہوئے لا جواب؟“ نواب بیگم بے تکلفی سے بولیں۔

”آپ تو کنگز و پرنسز فرما ہوں گے۔“ رائے صاحب نے پوچھا۔
”راجگان راجپوتانہ کے کیمپ میں۔“

”جی نہیں کشمیری گیٹ۔ ہوٹل میں آج اس طرف آتے ہوئے ایک مہاجن مکان پر بادشاہ سلامت کی وہ تصویر دیکھی جو برقی قلموں سے بنائی گئی ہے۔“ ٹھاکر۔
اس انداز سے جواب دیا گویا تم دلی والے بھی ہم راجپوتوں سے کم ٹوڈی نہیں۔

”ڈیڑھ سو نواب راجے۔ سائٹ سو جاگیر دار۔ جلوس تھا کہ شیطان کی آنت۔ میں تو کھڑے کھڑے تھک گئی۔“ مہر کی نواسی، شمو کی لڑکی چھتو نے اٹھلا کر کہا۔ وہ اسی وقت کمرے میں آئی تھی۔

”تم نے کہاں سے دیکھا؟“ نواب بیگم نے دریافت کیا۔

”ٹاؤن ہال کی چھت پر سے۔“ چھتو نے جواب دیا اور بام پہ جا کر روشن چوکیو کا نظارہ کرنے لگی۔

”آپ نے ان کو دربار لائٹ ریلوے کی سیر کرائی؟“ رائے زادہ نے ٹھاکر۔ دریافت کیا۔

”صاحب ہم کو آج کل قطعی فرصت نہیں۔ انہیں ان کی مہر و خالہ کے سپرد کر دیا جو چاہیں دکھلا لائیں۔ ہم تو آپ کی دلی میں پر دوسی ہیں۔“

”اس ریلوے کی تیاری کے لئے مہاراجہ نے پورے بھی تو کثیر رقم دی ہے۔“

”رائے صاحب، ہمیشہ سنگھ جی نے منانت سے کہا: اس میں تعجب کی کیا بات باجندا روں کا یہی کام ہے۔ امپریل مغلوں کے درباروں اور تقریبوں کے لیے بھی

ہمارے پڑھے اس طرح حاضر ہوتے تھے۔ رہے آپ لوگ تو ہم نے سنا ہے آپکے بزرگ نو دلی کے آخری تلاش بادشاہوں کو قرضہ دیا کرتے تھے۔“

”وہ ہم نہیں۔ دلی کا ایک اور گھرانہ ہے۔ بنیوں کا۔ ہمارے بزرگ تو قلعے میں محض مٹی منصدی تھے۔ بنی نوابن کل دربار لائٹ ریلوے پر سارے جشن کی سیر کر آؤ۔“
 نیس ہزاری سے ہر پانچ منٹ پر چھوٹی ہے۔ رستے میں اٹھارہ اسٹیشن بنائے گئے ہیں ایک سے ایک خوب صورت۔ انھوں نے ایک اخبار اٹھایا۔ اس کی سرخیاں اور خبریں پڑھ کر سنائی شروع کیں۔

”کشور ہند کے نامور علمائے دین، اور مہانتوں نے کل حضور ملک معظم کی خدمت میں بربان عربی و سنسکرت قصائد پیش کیے۔“

”مشاعرہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر اقبال نے پنڈت جرمون دنا تر یہ کیفی کا قصیدہ بہاریہ بہترین قرار دیا۔“

”۔ بنگال کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے اس مبارک موقع کے لیے ایک نثرانہ بربان بنگالی رقم کیا۔ ترانے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: جن گن من ادھنائیک جے ہے بھارت بھاگیہ ودھانا۔ ناظرین۔ مادر ہند کی خوش نصیبی سے آج ہم۔“
 لائے صاحب نے اخبار رکھ کر نواب بیگم کو مخاطب کیا۔ ”کیوں صاحب۔ ع۔“
 ”جنابی کے گھاٹ کو دیکھا؟“

”جی ہاں۔ تو میں اور رسالے دیکھے۔ بینڈ بجانے والے دیکھے۔ کل بادشاہی میلے میں گئے۔ زیریں قلعہ وہاں سب سے اونچے لاٹ کوکل دیکھا۔ بادشاہ سلامت اور ملک آج۔“

چھٹونے بالکنی سے واپس آکر بڑی ادا سے بات کی۔ ”ننا، ہم تو مینڈھوں کی اور ہاتھیوں کی لڑائی دیکھیں گے۔ مہر کس۔ تھیٹر۔ انگریزی بائیسکوپ۔ کلکتہ کی میموں کا زندہ ناچ۔“

”میں نہیں یوریشین چھوکر یاں،“ ٹھاکر ہمشور سنگھ نے حقارت سے کہا۔

”سنا ہے جو کچھ آج کل ہو رہا ہے۔ اس کا بھی بائیسکوپ بن گیا ہے وہ دکھلایا جاوے گا۔ کوئی یورپین فوٹو گرافر آیا ہوا ہے کلکتہ سے۔ رینال صاحب کر کے۔ وہ بھی ایسا کیمرہ لایا ہے جو چلتی پھرتی تصویریں کھینچ لیتا ہے۔“ مہر بولی۔ اور چھو کو ابرو سے اشارہ کیا کہ فریے سے ایک طرف کو بیٹھے۔

”یہ رینال صاحب۔“ ٹھاکر مہیشور سنگھ نے فخریہ کہا۔ ”میرے ہاں آچکا ہے۔ بگڑی پہ نواب بانی کا فوٹو بھی اسنے کھینچا۔“

”اوہو۔ ماشا اللہ۔“ راتے صاحب بولے۔ پھر ایک بات تصویر اخبار اٹھایا۔ ”ہمیں تو صاحب بیگم بھوپال سب سے شاندار لگیں۔ نیلے برقعے پہ پیروں کا تاج پہنے۔ ہمارے خان بہادر صاحب مرحوم آج زندہ ہوتے بھائی برکت اللہ۔ تو خوش ہوتے کہ بیگم صاحبہ نے اپنا پردہ ترک نہ کیا۔ سلطان لایج کی طرح وہ بھی کسی کے رعب میں نہیں آئیں صاحب۔ اوہو یہ خبر سنئے۔ مہارانی صاحبہ پٹیلہ نے زنانہ ہند کی جانب سے حضور مکہ معظمہ کو زیورات پیش کئے۔ بس ہم سے وال بیٹھے کڑھا کرتے ہیں۔ بوڑھے ہو گئے مرنے ایک آدوہم ہم بھی جا کر پھینک آئے۔“ اخبار پھینک کر وہ اپنی جریب فرش پر کھٹکھٹانے لگے۔

ٹھاکر صاحب نے چہرہ اونچا کر کے بالکنی پر نگاہیں جمادیں یہ کاسیتھ بڈھایا خبطی ہے یا خود سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی۔ اب یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ توقف کے بعد ماتھر صاحب بولے۔ ”جان شاناران دولت برطانیہ کے اس جشن میں بس شاید بی مہر و بی ہماری ہم خیال و مہربان ہیں۔ دیرینہ غم خوار۔ جب ہم اس چہل پہل میں مغل شہزادوں شہزادیوں کو بھیک مانگتے دیکھتے ہیں دل خون ہوتا ہے۔ آج آئے تو دیکھا بی مہر و بی اخبارات سامنے پھیلانے بیٹھی رو رہی ہیں۔ ہم نے پوچھا خیریت؟ بولیں رائے صاحب۔“ غدر میں لڑنے والے خاکبوسوں کی فوج کے تئیں چالیں گورے اور کالی پلٹن کے آٹھ دہائی ابھی قیامت کے بورے سیٹھ کو زندہ ہیں۔ کل صبح ان کا جلوس نکلتا تھا۔ ان بوڑھے پوسہ پنشنیے فوجیوں کو بادشاہ کے حضور میں تمنغہ پہنائے گئے۔ یہ تصویریں دیکھیں تو دل پہ

ایک گھونہ سا لگا۔ کیا پتہ جن ظالموں نے سرائے طفعل بیگ میں میرے کنبے کو ٹھونان ہی میں سے رہے ہوں۔“

”سرائے طفعل بیگ - ؟“ ٹھاکر صاحب نے پوچھا۔

”اجی چھوڑیے۔ پرانی خبر ہے۔ آج کی نیوز—سینے۔“

مانٹر صاحب نے طنزیہ انداز سے پھر ایک اخبار اٹھایا۔

”مسٹر الما لطیفی آئی۔ سی۔ ایس انچارج انڈین پریس کمیٹ کو مسٹر محمد علی جوہر اڈوکیٹر کامریڈ نے وزنا کیولر اخبار نویسوں کی طرف سے ایک تقری فی سیڈ پیش کیا —، ٹھاکر صاحب ہمارا ایک بھتیجا بھی انگلینڈ سے آئی۔ سی۔ ایس بن کر آیا ہے۔ وہ بھی بنگالیوں کو منفرد اور باغی گردانتا ہے۔“

آتشدان پر رکھے منوہی کے قدیم جرمن کلاک نے گھر در گھر در شروع کی۔

”کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں“ مہر نے دوپٹے سے آنکھیں پونھیں۔

”نوابن۔ تم تو قلعے کی گارڈن پارٹی میں ہو آئیں۔ مبارک ہو۔“

”ٹھاکر صاحب نے مجھے جو نیر رانی ظاہر کر کے دعوتی کارڈ حاصل کیا۔ کرنل ڈالٹن

جو آیا تھا گڑھی پر۔ اس کے ذریعے“ نواب بیگم نے آہستہ سے کہا۔

”ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔ وہ وقت یاد ہے۔ جب اسی دلی شہر میں نوابن چھوڑی

کو ذلیل کر کے گوٹے والوں نے اپنے گھر سے نکالا تھا۔“

”ہاں مہر و خالہ، مگر کچنی بن کے یہ عزت ملی تو کیا ملی“ نواب بیگم نے نیچی آواز میں

جواب دیا۔ اور سیاہ سنباب کاروسی اوور کوٹ کوچ پر سے اٹھایا۔ جرمن کلاک کے

مکینیکل فرشتوں نے دس کا گجر بجانے کے لیے اپنی نیفیریاں سنبھالیں۔

میرا ختم امول تھا

دلی دربار کی گھسان میں آندرے سے ملاقات ناممکن تھی۔ قلعے کی گاڑوں پارٹی میں سارے فرنگی فوٹو گرافر ایک سی شکلوں کے دکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شاید آندرے تھا کہ دیوان خاص کی ایک بُرجی میں بندر کی طرح بیٹھا تصویریں کھینچنے میں مصروف تھا۔ نواب بانی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں اور وہ نیچے کو درمچ میں غائب ہو گیا۔

جے پور واپس پہنچیں۔ چند سہفتے بعد چندرنگر سے ایک پارسل آیا۔ فلو مینا نے بڑے اشتیاق سے کھولا اور چلائی۔ ”میم صاحب تمہارا فوٹو۔“

نواب سیکم دالان سے اٹھ کر بھاگی بھاگی صحن میں آئیں۔ ”اوہو میم صاحب۔ فلو مینا نے باجھیں کھلا کر کہا۔“ یہ صاحب تمہارے LOVE میں پڑ گیا ہے۔ LOOK, LOOK کیا بیوٹی فُل پینٹ کیا ہے تمہارے کو۔“

”دیکھیں۔ دیکھیں۔“ نواب سیکم نے پورٹریٹ سنبھال کر ہاتھ میں اٹھایا۔ ”تم کو ایک دم ملکہ نور جہاں کے موافک بنا دیا۔ باپ رے۔“ اس نے دفعتی بیٹی اور پیچھے لکھا فوٹو گرافر کا نام پڑھا۔

JACQUES CORBIN

CHANDRANAGORE

”آندرے صاحب بولا تھا وہ اسی فرنج صاحب کے اسٹوڈیو میں نوکر ہے۔ فلو مینا نے کہا۔“ اس کا ایک دم بڑھیا فریم بنانا مانگتا۔ بالکل جیسے سپلیں میں مہارانی لوگ کے فوٹو

”فریم ہم دیکھتا تھا۔ ہم بر وڈر سپلیں کے اندر جا کر تانا تھا جب ہمارا POOR —“

”فلو مینا۔“ نواب بانی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”دیکھو شاید ٹھاکر صاحب تشریف لائے ہیں۔“

فلومینا باہر لپکی۔ نواب بانی نے تصویر دیوان خانے کے منٹیل پیس پر سجائی۔ دیکھ دیکھ کر مسرور ہو اکیں۔ آندرے نے کہا تھا کہ وہ اس تصویر کو لندن اور پیرس کے رسالوں میں چھپوانے کے لئے بھیجے گا۔ بعنوان ”پورٹریٹ آف اے ناچ گرل“۔
فلومینا نے کھڑکی میں بھانکا میم صاحب گڑھی سے انوپ سنگھ آئے تھے۔ بوئے بٹھا کر صاحب کل آئے گا۔ بوئے تمہارے کو گھر تک پہنچانا لگتا۔ بوئے۔“

نور ظہور کا وقت۔ چڑیلوں کی چپکار سے چین گونج رہا تھا۔ دالان میں نماز پڑھ کر نواب بیگم نے چائے پی۔ انڈوری استاد جی اور سازندے آندر آئے۔ درمی پر اپنی جگہ سنبھالی۔ طنزورے کے سٹر ملائے گئے۔ مطبخ میں کھا: اپکنا شروع ہوا۔ مالی ہزارہ لیے سامنے سے گذرا۔ شاگرد پیشے میں خدمت گار کی بیوی زور سے سہنی۔ گلابی فراک پہنے سیاہ فام فلومینا ڈی کو سٹا صحن میں استری کے کویلے دھکا رہی تھی۔

طنزورہ سنبھالتے ہوئے نواب بیگم نے اپنے اس وسیع کارخانے پر نظر ڈالی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ برسوں انھوں نے دوسروں کے دسترخوان کی جھوٹن سے پیٹ بھرا۔ اب ساہا سال سے پالن ہارنے ان کو اس لائق کر رکھا تھا کہ اس کے چند بندوں کی رزق کا وسیلہ بنیں۔

دستور کے مطابق حمد و نعت سے ریاض شروع ہوا۔ طبلمی نے جھتیاں بجائی۔ نواب بیگم نے بھبر کا خیال چھڑا۔ تو اب یاد کر لے بندے — اپنے اللہ کو — جو کچھ بھلا ہوئے تیرا بٹھا کر ہمیشہ ور سنگھ جی بھانگ میں نمودار ہوئے۔

نواب بیگم کافی رہیں — لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ — کلمہ نبی جی کا پڑھ لے —
تو اب یاد کر لے —

بٹھا کر صاحب آہستہ آہستہ چلتے دالان میں پہنچے۔ سر جھکا کر کھڑے سنا کیے — تو اب یاد کر لے بندے اپنے اللہ کو۔

خیال ختم ہوا۔ نواب بیگم اور سازندوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ ٹھاکر تخت کے نزدیک آرام کر سی پر بیٹھے۔ دوسری منزل کے کمرے ان کے قیام کے لیے مخصوص تھے۔ چڑھواں داڑھیوں والے ملازم اپنے آقا کا دلائمی ٹرنک، بستر بند اور پوچا کے سامان کی پیٹی اٹھائے زینے کی سمت چلے گئے۔ رسوئیا اپنی ٹوکریاں سنبھالے ایک رسوئی گھر کی طرف بڑھا۔ جو ٹھاکر صاحب کے لئے مقفل رہتا تھا۔

مہیشور سنگھ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ سوموار کی صبح۔ دور نزدیک کے شوالوں سے گھنٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے زیر ب شیوجی کی اپاسنا میں مشغول ہو گئے۔
کرا لم مہاکال۔ کرا لم کرپالم۔

ایک بار انھوں نے نواب بیگم کو سمجھایا تھا۔ بھیانک۔ دُر درشتی شو مہاکال سنسا کر ختم کر دیتا ہے۔

جاپ ختم کر کے آنکھیں کھولیں۔ پریشان سے نظر آرہے تھے۔ استاد جی نے اب نواب بیگم سے گانے کے لئے کہا۔ ٹھاکر صاحب کبیر کے دلدادہ تھے۔ نواب بیگم نے ایک آدھ کبیر بانی گنگنا کر ایک جھڑی۔ رات گنوائی سوئے کے۔ دن گنویا کھائے۔ ہیراجنم امول تھا بد لے جائے ہیراجنم۔ ہیراجنم امول تھا۔

ٹھاکر صاحب جھوماکے۔ بھجن ختم ہوا تو چونکے گھڑی دیکھی۔ نواب بیگم نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ وہ فرشی سلام کر کے رخصت ہوئے۔ ٹھاکر صاحب نے کہا: ”ہم اشنان کر کے ابھی آتے ہیں نواب بانی تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے“ استاد جی ڈیوڑھی تک پہنچ چکے تھے۔ انھیں پکارا وہ الٹے پاؤں لوٹے۔ فرمایا۔ ”خاں صاحب۔ چند راوتی کے بیاہ میں آپ کو ہمارے دربار کا نام روشن کرنا ہے۔ بانی جی کی ایسی تیاری کروائیے۔“
”حکم“ استاد جی نے دست بستہ عرض کی۔

”ہمیشہ دلبر سجان مبارک باشد!“ طبلے پر تھاپ دیکر نواب بیگم خوشدلی سے گنگنائیں لیکن ٹھاکر صاحب بہت متفکر نظر آتے تھے۔ کرسی پر سے اٹھے۔ ہم اشنان کرائیں۔ انھوں نے دہرایا اور آہستہ آہستہ چلتے زینے کی طرف مڑ گئے۔

استاد جی نے سوالیہ نظروں سے نواب بیگم کو دیکھا اور پھر واپس گئے۔ نواب بیگم اپنی خوابگاہ میں آکر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئیں۔ فلو مینا استری شدہ ساریاں الماری میں رکھ رہی تھی پلٹ کر مالکن کو مخاطب کیا۔

”میم صاحب! کانوں تک باچھیں پھیل گئیں سیاہ چہرے میں سفید دانت جھلملائے۔ بڑی بڑی آنکھیں چھت کی طرف گھما کر۔“ بھنوری بانی کا ویڈنگ میں ٹھا کر صاحب میرے کو سچا گولڈ کا گھڑیاں دے گا نا؟ انوپ سنگھ بولنا گیارہ توپ کا سیلوٹ والا اسٹیٹ کا پرنس ہے۔ باپ رے گیارہ توپ۔ اپنا ٹھا کر صاحب کے واسطے تو ایک پٹاخہ بھی نہیں جھٹھتا۔“

”جُب فلو مینا۔“

”ایسا بڑا مہاراجہ کا چھوکر اپنا بھنوری بانی سے سادی بنائے گا ڈیم لگی کرل۔ بٹ ویری بیوٹی فُل گرل میم صاحب۔ ہم تو اس کو گرہی کے اندر جا کر دیکھا ہے۔“

”جبھی تو سات پردوں میں سے اس کی خبر باہر پہنچ گئی۔“ نواب بیگم نے کہا۔

”بیوٹی فُل تو تم بھی بے میم صاحب پن لکی نہیں ہے۔“ فلو مینا نے زبان دانتوں تلے داب کر بات بدلی۔ ”پرنس کو اس کا فوٹو دکھلایا ہوگا۔“

نواب بیگم کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے تھے۔ فلو مینا ایک محافظ فرشتہ تھی لیکن اسکے قدم مضبوطی سے دھرتی پر جمے ہوئے تھے۔ جب نواب بیگم اُنچی اُڑانیں بھرنے لگتیں۔ وہ کوئی بات ایسی کہہ کر فوراً ان کو حقیقت کی سطح پر واپس اتاریتی تھی۔ نواب بیگم نے معطر رومال سے آنکھیں خشک کر جواب دیا۔ ”ہاں۔ دلی گنگنروے کیمپ پر راجہ لوگوں نے بات طے کروائی۔ مجھے تو ٹھا کر صاحب نے ابھی بتایا پلے روز جب آئے تھے۔“

”ہم جانتا ہے۔ ٹراؤنکرو بولو۔ مانی سور بولو۔ اینڈ۔ کو لہا پور۔ جام نگر بولو۔“

بڑودہ بولو۔ اتنا بڑا بڑا پرنس لوگ کے لیے یوڈراج کا بات آیا۔ پن اپنا چندرا ووتی جی۔

گرب آدمی کا بیٹی۔ اس کے بھاگ۔ انوپ سنگھ لوے پرنس اینڈ پرنس یورپ۔

راجستھان کے ٹھاکر جاگیر داروں کا بڑا بڑا کنوڑی ہنھلا بھنوری جی چھوٹا کنوڑی کہلاتا ہے۔ اسی طرح بڑی ننھلی اور چھوٹی بیٹیاں کنوڑی بانی بھنوری بانی اور کنوڑی بانی۔ اہل بمبئی کی زبان میں گھڑی۔

میں ہنی مون منائے گا۔ ہزبائی نس کا ایک بنگلہ انگلینڈ میں بھی ہے — باپ رے —
 نواب بانی بے دھیانی سے عطر کی شیشیاں سنگھار میز کی سطح پر ادھر ادھر سرکایا کیں
 کپڑے تہہ کرتے ہوئے فلو مینا نے بات جاری رکھی — ”پن اپنا — پوٹ بھائی وہ نوا
 کا ٹھیا داڑی ڈرائیو رہے نا میم صاحب وہ میرے کو بولا ابھی انگلینڈ ونگلینڈ تو سمجھے — پہلے
 بیاہ تو ہو جانے دو — اور بھی کیا کیا بول رہا تھا —“
 ”بڑا نمک حرام ہے۔ اپنے آقا کے خلاف بکتا ہے“ نواب سگیم نے غصے سے کہا۔

”باہر کا آدمی ہے بانی۔ نوا آدمی ہے۔ بولا اس نے ٹھا کر صاحب سے پگھار مانگی۔ چار مہینا
 سے اس کو پگھار نہیں ملی۔ ٹھا کر صاحب بو بے ابھی نہیں پھر دے گا۔ پوٹ بھائی تاؤ کھا گیا۔
 بوتا ہے ایسا خالی پیلی شان کائے کو مارتا۔ کرنل صاحب آیا اس کے لئے اُدھار دلی گیا تب
 اُدھار گڑھی کا اکھا جیز گروی رکھ چکا ہے۔ جانے کب سے ایسا چل رہا ہے میم صاحب۔ اپن
 لوگ کو ابی مالوم ہوا۔ اُدھرجب کنوری بانی کا سادی بنایا تھا۔ وہ تو گو الیر کا ایک معمولی سردار
 تھا۔ ابی بھنوری بانی کا سادی تو اتنے بڑے راجکمار سے ہوتا۔ اس کے لئے ہمارا اولڈ مین
 کیا کریگا —؟ کتنا سُود بھر بلا ہے اس نے اب تک —“
 نواب سگیم خاموش بیٹھی سنتی رہیں۔

”میم صاحب جھوٹا شان کائے کو مارنے کا —؟“

امیروں کے معاملات یہ دو ٹوکے کی کرستان آیا کیا سمجھے۔ نواب سگیم نے خفیف سی
 حقارت کے ساتھ سوچا۔ فلو مینا نے کمرے کے دروازے بند کیے اور سنگھار میز کے قریب
 آکر سرگوشی میں بولی ”ایک بات بولوں —؟ ٹھا کر صاحب بڑا UNLUCKY ہے۔
 تین تین ٹھکرانیاں تینوں سے چھو کر ایک نہیں۔ پانچ پانچ چھو کر ی“

”تو پھر۔؟“

”بات سنو۔ ابھی پانچ چھو کر ی میں سے ایک کی سادی بنایا دوسری کے لیے —“
 ”پچھلے حرم میں میں نے کہا جناب عباس سے بھنوری بانی کے لیے منت مان لیجئے۔
 امام حسین سے تو وہ مان ہی چکے تھے۔ میں نے کہا جناب عباس کی طبیعت میں عجلت پسندی

بہت تھی وہ جلدی کام کر دیتے ہیں۔ تو دیکھو سال کے اندر اندر اتنا بڑھیا رشتہ۔“
 ”میں صاحب ہمارا بات سنو۔“ فلومینا بچی آواز میں مضر رہی۔ ”ٹھکرانی لوگ تم سے بہت
 خُسن کھاتا۔“

”تعجب کی کون سی بات ہے؟“ نواب بیگم نے اُلٹا کر پوچھا۔
 ”سنو۔ ٹھکرانی لوگ بولتا مغل ٹائیم کا اتنا دالینہ ٹھا کرنے وہ کچنی کو دیدیا۔ ابھی چار
 چھو کمری کا شادی بنانا ہے۔“
 ”ارے فلومینا۔“ نواب بیگم نے بے پرواہی سے کہا۔ ”ٹھا کر کے یاس بہت دالینہ ہے

سیروں۔“
 ”ہاں پَن اس کو چار چھو کمری کا میرج بنانا ہے۔ THEN —؛ بانی۔ تم بھی ذرا
 اپنا کھانے پینے میں ہوشیاری رکھو۔ کوئی چیز ٹھا کر کا سرورٹ لوگ تم کو کھانے کو دے کہ گڑھی
 سے آیا ہے۔ بالکل نہیں کھانے کا — تمہارے کو بول دیا ہے۔ ٹھکرانی لوگ تمہارا دشمن ہو رہا
 ہے۔“
 ”فلومینا —“ باہر سے رسوئیے نے پکارا۔

ہیرا جہم امول تھا۔ امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ کوڑی بدلے جائے۔
 کھرج میں گنگنا نے ہمیشہ سونگہ زینہ۔ ترے بیشتر شیو شاکت ٹھا کروں کی طرح گوشت خور
 تھے۔ دالان میں پہنچ کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ رسوئیے نے میز سامنے رکھ کے کچری کا
 گوشت اور سانگرمی کا ساگ پیش کیا۔

”نواب بانی۔“ انھوں نے آواز دی۔
 نواب بیگم کمرے سے برآمد ہوئیں۔ فلومینا کی گفتگو کو شاگردیشی کی گپ سمجھ کر نظر انداز کر
 چکی تھیں۔ زیورات کے سلسلے میں ٹھکرانیوں کے ”خُسن“ والی بات البتہ کھٹک رہی تھی۔
 تخت پر گاؤٹیکے سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ بھٹوری بانی کی ماں اس رسوئیے کے ذریعے توڑ ہریلا
 اچار مجھے بھجوائے گی نہیں۔ فلومینا کی نصیحت پر ہنسی آئی۔

ٹھا کر صاحب چپ چاپ بھونکتے رہے۔ راجپوت رسو عیا گرم گرم پوری لیے سارے صحن کو ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے عبور کر کے والان میں آنا تھا۔ اور پھر فوراً اسی رفتار سے رسوئی گھر واپس جاتا تھا۔

دوسرا ملازم چچماتی حلیمی اور گڈوی لے کر حاضر ہوا۔ ہاتھ دھو کر کُلا کرنے کے بعد مونچھوں پر تولیہ پھیرتے ہوئے پھر کہا۔ ”نواب بانی“
”حضور۔ دیوان خانے میں تشریف لے چلیے۔“

ٹھا کر صاحب اٹھے۔ نواب بانی نے پیچھے سے جا کر دیوان خانے کے دروازے بھیڑے۔ برقی روشنی جلائی۔ رینال کی بنائی ہوئی تصویر چمک اٹھی۔
ٹھا کرنے پور ٹریٹ پر نظر ڈالی۔

”واہ — واہ — بہت خوب“ انھوں نے ذرا بے دھیانی سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ حرف مدعا زبان پر لاتے بے طرح ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر مختصراً اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا۔ کچھ دیر قبل فلو مینا کی گفتگو سُننے کے باوجود نواب سیکم کو انکی اس زبوں حالی کا اندازہ نہ تھا۔ بھونچکی رہ گئیں۔

ٹھا کر صاحب نے کہا۔ بھنوری بانی کے جلسے کے بعد مجبوراً انہیں اپنے سنگیت کاروں کو علیحدہ کرنا پڑے گا۔

”سرکار میں تو آپ سے ایک کوڑی کی بھی طلبگار نہیں۔ آپ کا دیا کھاتی ہوں۔“
مہیشور سنگھ سے ہمدردی کے جوش میں وہ بھول گئیں کہ اس ملازمت سے علیحدگی کے بعد انکے ہاں بھی یہ اللہ تلے نہیں رہیں گے۔

”سرکار کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میری طرف سے خاطر جمع رکھیے۔“
”ہمیں معلوم ہے نواب بانی“ ٹھا کر شیروانی کی جیب سے گول گھڑی نکالتے ہوئے بولے۔ ”تم بڑی عالی ظرف عورت ہو۔ نجائے کوٹھے پر کیسے — خیر بہ تو تمہارے کرموں

کا پھل ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے اگلے جنم میں تم ایک شریف گھرسنار کی مالکن بیابھنا ستوتی
کا جیون بتاؤ گی۔“

نواب بیگم کے دل پر بڑی کڑی چوٹ لگی۔ پٹ پٹ آنسو بہانے لگیں
”افسوس تمہارا دل دکھایا۔“ انھوں نے گہرا کر کہا۔

نواب بیگم نے آنسو پونچھے۔ سوچنے لگیں کس طرح اس نیک طہنیت تنگ حال آدمی کی
مدد کریں جس نے اپنے بھلے دونوں میں انہیں مالا مال کر دیا تھا۔ راجپوت دی ہوئی مجبیت
دائیں نہیں لینا۔ ٹھا کر کے عطا کردہ مغلیہ زیورات کسی بہانے انھیں لوٹانے کی ہمت نہ تھی
”نواب بانی“ ٹھا کر صاحب بولے ”اپنی فضول خرچی کی وجہ سے تم بھی مقروض رہتی ہو
یہ تمہارا سا ہو کا رجو ہے۔ چھوٹی ٹوپوٹ والا گردھاری لال رنجیوڑ مل۔ اس کے سود کی
شرح بھلا کتنی ہے؟ ہمیں سر دست تنگ کے لئے محض پچاس ہزار نقد کی کمی پڑ رہی ہے
باقی ساری تیاری مکمل ہے۔ اس سے سود کی شرح کم کروادو۔“

”حکم۔ ابھی بلاتی ہوں۔ موٹو مل کو۔“ دروازے میں جا کر فلو مینا کو پکارا۔

”ڈرائیور کو بولو سیٹھ گردھاری لال کو لے کر آئے۔ فوراً سے پیشتر۔“

”یس مہم صاحب۔“ فلو مینا ڈیوڑھی کی سمت بھاگی۔

”کھلے گئے پانی۔“ پچاس ہزار روپے کی کیا حقیقت ہے۔ گردھاری لال بھی بھلا
آدمی ہے۔“ نواب بیگم نے شیر لونگ کی طرف دایں آئے ہوئے کہا۔
”بھولی بانی! سود فور بھلا آدمی۔؟ اسی لئے تمہارے مذہب میں سود حرام ہے۔“

تھا کرنے کشمیری کر دھت کے کشن سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سفید بڑی
بڑی لوکیلی مونچھوں والے وجیہہ اور شاندار سورج بنسی راجپوت۔ نواب بیگم نے۔
راہو رانجیل کو آزاد کیا۔ انکے پرکھ اکبر اور جہانگیر کے دربار میں اسی طرح بیٹھتے ہوں گے
خیر۔ وہاں صوفہ تو ہو گا نہیں۔ بھرے رہتے ہوں گے۔ دست بستہ۔ دیوان خاص میں۔

بے چارہ لڑکی کا باپ - لڑکیوں کا باپ ہونا سچ مچ بڑی بد قسمتی ہے — اکریہ ہم
مغلوں کا زمانہ ہوتا۔ اتنی فکر ان دکھیا کو کا ہے کو ہوتی جہیز شاہی دربار سے عطا ہو جاتا — یا
ایک پالکی انکی گھر میں شہنشاہ کے محل جانے کے لئے علیحدہ رکھی ہوتی۔ چند راوی اس میں
بٹھال کر آگے بھیج دی جاتی۔ مغل شہزادوں کی ماں بنتی —

اگرہ یاد کیا تو نہیال کا خیال آیا آنسو پھرا منڈے۔ اسپ تخیل گلی شاہ تارا، دلی،
کی جانب موڑا۔ اگر بازندہ ہوتے۔ مرزا دلدار علی برلاس۔ اور میری شادی ہونے والی ہوتی
کسی نواب زادے سے اعلیٰ مرتبت سمدھی سے نکرتے۔ جہیز کی فراہمی کی خاطر
اسی طرح پریشان ہوتے میرے آبا — میری شادی — آبا میرے بیاہ کے انتظامات
میں مصروف میرے آبا میرے بیاہ کے انتظامات — ٹپ ٹپ آنسو —

پردہ نشین بھنوری بانی گڑھی میں مایوں بیٹھی ہے۔ چوٹی کے دایان ریاست —
پارات میں آرہے ہیں اور فرض کر دکھا کر پچاس ہزار مہمانہ کر پایا۔ شادی میں لگی دیر۔ اور
یو دراج کو لے اڑی مڑا و نکور کی راجکاری — تو چند راوی کیا گڑھی کی خندق میں کوڈ
جائے گی — نہیں نہیں — میں ایسا نہیں ہونے دوں گی —
آنسو کھل بھل رواں تھے جب ڈبیلر کا ہارن پھانگ پر بجا۔

ٹھا کر صاحب نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ صدر دروازے سے چھوٹی چوڑا لے
سیٹھ گردھاری لال رنچھوڑ مل کنوڑیا اپنے بستے سمیت فٹ بال کی طرح لڑھکتے صحن میں
داخل ہوئے۔ نواب سگیم کو یاد آیا یہ ڈبیلر بھی ٹھا کر مہینور سنگھ ہی نے عنایت کی تھی۔

دوسری شام فلو مینا نے نواب سگیم کے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا: ہمیں صبا
یہ نرم نے بہت EGOISH بات کیا۔ اپنا بلڈنگ کا گارنٹی پر ٹھا کر کو پیسہ نہیں دلوانا مانگتا۔
— ٹھا کر نہیں مانتا تھا۔ اپنا اکھا مغل پنڈیٹنگ کا گارنٹی میں دینے کو تیار تھا۔ تم ہی نے خدا کیا
باہر سے ہم سب سن رہا تھا۔

”فلو مینا۔ ٹھا کر صاحب جلد از جلد اصل مع سودا داکر دیں گے۔ خالی خولی کارنٹی میں میرا کیا بگڑا؟“

”میم صاحب۔ اگر وہ رقم اولڈ مین ٹائیم پر نہیں دیا تو سیٹھ اکھا بلڈنگ کر کی کر دے گا۔“

”اکھا نہیں۔ ہاٹ۔ آدھی جوبلی تو پھر بھی میرے پاس باقی رہے گی۔“ نواب بیگم نے بے فکر سی سے قہقہہ لگایا۔

”لائبریری کے سامنے لکھا پڑھی ہوا۔ میم صاحب تم اس بات کو جو کہ سمجھتا؟“

”ارے فلو مینا کی بچی کیا رات کے وقت بدشگونی کر رہی ہے۔ کالی مولیٰ بھینس۔“

چڑھیل۔ بھاگ — بھاگ جا یہاں سے۔“ نواب بیگم نے جھلا کر سسزہیڑایا۔ اور آئینے میں عکس جمال ملاحظہ کرنے لگیں۔ خدا نہ خواستہ — شیطان کے کان بہرے — تھو تھو — اگر کچھ گڑبڑ ہوئی اس رہن نامے کے سلسلے میں — گردھاری لال میری آواز اور رنگ روپ تو قرتی نہیں کر سکتا۔ اتنا ہی پھر سیداکر لونگی۔ اللہ اور دے گا — ایسے آرٹے وقت میں ٹھا کر کی مدد نہ کرتی؟

بلبل کی آواز پر چونک کر دریچے میں گئیں۔ ”اے لورات کی راگنی ابھی سے الاپ رہی ہو؟“

پڑوسیوں کی بلبل اطمینان سے گائے گئی۔

نواب بیگم نے منہسکر پکارا۔ ”اے بی۔ تم عنذیب ہزار داستان تو نہیں —؟“



پری تھیم

چند راوتی جی کی شادی میں نواب بیگم نے پوری تیاری سے گایا اور ٹھاکر مہیشور سنگھ کے دربار کا نام روشن کیا۔ باپ کا دیوالہ نکال کر بھنوری بانی اپنے پرنس کے ساتھ سہنی مون کیلئے ییو پ سدھاری۔ نواب بیگم جے پور واپس آکر اپنے معمولات میں مصروف ہوئیں۔ صبح کو رماض دوپہر کو قیلولہ۔ شام کو ڈیملر موٹر کار یا میلارڈ فٹن پر ہوا خوری۔ بیاہ کے جلسے کے بعد ٹھاکر کی بارہ درمی کو روتے دھوتے خیر باد کہہ آئی تھیں۔ مجرے آمدنی کا واحد ذریعہ رہ گئے مہاراجہ کو الیار کے برادر خورو بھیا گنپت راؤ نے رامپور سے ہارمونیم کو فروغ دیا تھا گھر گھر عطائیوں کی محفلیں سمجھنے لگی تھیں۔ کبھی کے مقابلے میں عطائی میدان میں آرہے تھے۔ مجرے کے بجائے فونو گراف۔ مہیشور سنگھ جی کی ملازمت کے خاتمے نے حالات بدل دیے۔ نواب بیگم نے خدمت گار مہر می، مشعلی اور ڈرائیور کو ایک ایک ماہ کا نوٹس دیا۔ استاد جی سے کہا ڈیملر کو اوپر اخراجات میں تخفیف کی دوسری سبلیں سوچنے لگیں۔

چند راوتی کے بیاہ کو تین چار ماہ گز گئے نواب بیگم کے لئے کہیں سے سانی نہیں آئی۔ ایک روز دن چڑھے دالان میں چپ چاپ بیٹھی پان بنا رہی تھیں کہ ٹھاکر صاحب وارد ہوئے۔ ”آج جے پور میں بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ چند منٹ کے لئے تمہاری خیریت معلوم کرنے آگئے آرام کر کرسی پر بیٹھے۔ چند لمحوں بعد بلولے۔ ”نواب بانی۔ تم نے ہمارے لئے بہت کیا۔ تم بہت بھلی عورت ہو۔“

برآمدے کے نیچے کیاری میں تیز سُرُخ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ بلبل گلاب کی ٹہنی پر آن بیٹھی۔ ٹھاکر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اڑی نہیں۔ اسی طرح بیٹھی چبھکتی رہی۔ ”تو خالص ایرائی بلبل معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کیسے آگئی؟ انھوں نے حیرت سے پوچھا۔“

”پرندے اڑ کر کہاں سے کہاں چلے جاتے ہیں۔ حضور۔“ نواب بیگم نے جواب دیا ”یہ بلبل ہے؟ میں سمجھی کوئیل ہوگی۔ مجھے اڑتے پرندوں کو پہچان نہیں۔“

دفعتاً ٹھاکر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ گیارہ بجے ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ تھا۔ انھیں رخصت کر کے پشمرودہ سی تخت پر لیٹ رہیں۔ ایک بجے خاصہ تناول کیا۔ اپنے کمرے میں جا لیٹیں۔ بے مصرف بے کار زندگی۔ شام کو پانچ بجے برآمدے میں آکر چائے پی رہیں تھیں کہ وہ بلبل پھر شاخ گل پر آن بیٹھی اور یکسانیت سے گانا شروع کر دیا۔

پڑوس میں فیروزے کے ایرانی تاجر آن کر بسے تھے۔ اسے پنجرے میں بند کر کے اپنے ہمراہ اصفہان سے لائے تھے۔ اس کے تھوڑے سے پر کاٹ دئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ نیچا نیچا اڑتی پھدکتی نواب بانی کے صحن چمن میں آجاتی تھی۔

”ہلوسٹرٹرائٹ انگیل۔“ فلو مینا نے چار دانی لاتے ہوئے اسے آواز دی ”ہم جمہ۔ یہ ہمارا بہن ہے۔ اپنا سینٹ فرانسس اف ارسنسی سب چڑیا لوگ کو اپنا بہن بھائی بولتا تھا، اکھا جانور لوگ کو اپنا سگا والا بولتا تھا“

”ایسا۔۔۔؟“ نواب بانی نے بے دھیانی سے کہا اور سوچیں گجر بانی کے ہاں ہو آئیں۔ گجر بانی عرصے سے مغلوں چڑی تھیں انکی بیٹیاں نواب بانی کی شہرت اور کامیابی سے بے طرح جلتی تھیں اور فلو مینا کی اطلاع کے مطابق انکے خلاف جادو ٹونے کرواتی رہتی تھیں۔ نواب بانی بڑی نمک حلال اور احسان ماننے والی خاتون تھیں جو انکے ساتھ بدی کرتا اسے پانی پی پی کر کوستیں ”لعت“، تکلیہ کلام۔ جو نیکی کرتا اس کی ہمیشہ ممنون احسان رہتی تھیں۔ گجر بانی کے ہاں کی تعلیم و تربیت نے انکی زندگی بنائی تھی۔ لڑکیوں کی پر خاش کے باوجود وہ مہینے میں ایک آدھ بار انکے ہاں مزاج پرسی کے لیے ہوا آتی تھیں۔ دوسری محسنہ راحت بانی جب تک زندہ رہیں ان سے ملنے اکثر اجمیر جایا کیں۔

چائے ختم کر کے اٹھنے ہی والی تھیں کہ بلبل کی آواز نے پھر متوجہ کیا۔ وہ بڑی مستقل مزاجی سے گائے جا رہی تھی۔

”کو ابولے تو سمجھ میں بھی آئے کہ بھی کوئی ہمان آنے والا ہے۔ یہ نگوڑی بلبل کیوں

چلائے جا رہی ہے۔ انھوں نے فلو مینا سے کہا۔ ”اچھا ڈرائیور کو بولو غائب نہ ہو جائے۔ چاند پول بازار جانا ہے۔“ معاہدہ آیا۔ ڈرائیور تو اب غائب ہونے والا ہے۔ یہ گاڑی گھوڑا موٹر سب بہار چنید روزہ ہے۔ آنکھیں ڈبڈبائیں۔ گرگابی میں پاؤں ڈال کر ڈریسنگ روم روم کی سمت جا رہی تھیں کہ فلو مینا بھاگی بھاگی آئی۔ ”بائی۔ ابائی۔“ باہر وہ صاحب آیا ہے۔ وہی فوٹو والا رینال صاحب۔ ہر بائی نس کی موٹر کار پر آیا ہے۔ تم بولا تھا گوڈ ایک ڈور بند کرتا ہے تو ستر ڈور کھولتا ہے۔ ادھر ٹھکا کر گیا ادھر وہ آیا۔

”ایسا۔؟“ نواب سلیم مسکرائیں۔ دل ڈوب سا گیا۔ وہ خوش مزاج خوش شکل سیکرٹا سنا جوان پھر آمو جو ہوا تھا۔ ستر اسی برس پہلے کا زمانہ ہوتا اصغری اور منواری کشمیرن والے اور یہ پوربین ایک معمولی فوٹو گرافر کے بجائے ہوتا ایک دولت مند تاجر فوجی ایڈوائزر۔ پلاننگ یا کسی ہندوستانی فرمانروا کی فوج کا جنرل۔ اور وہ خود ایک ڈیرے دارنی۔ تو وہ بخوشی اسکی کمپاؤنڈ میں بنے ”بنی خانے“ میں اپنی عمر گزار دیتیں۔ مگر یہ ۱۸۱۲ء کے بجائے ۱۹۱۲ء تھا۔ وقت بدل چکا تھا۔

”گول کمرے میں بٹھلاؤ میں ابھی آتی ہوں۔“ فوراً ڈریسنگ روم میں گئیں۔ گجر بائی کی بیٹیوں کو جلانے کے لئے نیا بنا رسی جوڑا پہننے والی تھیں۔ جو چند راوتی کے سیاہ میں ملا تھا اب رینال صاحب کی خاطر انھوں نے ”ایڈوٹیٹ انگریزی فیشن“ مناسب جانا۔ بھاری بھالہ دار بلاؤز۔ لکڑی کے ہیل کی سُرخی و سیاہ جارجٹ کی ساری پاریسی وضع سے باندھی۔ جوڑا کھول کر بال شانوں پہ بکھرائے۔ بنگالوں کی طرح۔ سینٹ کی شیشی نکالنے کے لیے سنگھار میز کی ایک دراز کھولی تو اس کے کونے میں پڑے ہیرے کے پری ہم جیک ٹھے۔ نکال کر وہ بھی پہن لیے۔ تیار ہو کر باہر آئیں۔ دالان سے گزرتے ہوئے ہاتھ بڑھا پئے کپاری میں کھلا ایک سُرخی گلاب توڑا۔ اسے کان کے پیچھے اڑس، اونچی ایڑی کے نوکیلے لائٹی جوتوں پر کھٹ کھٹ کرنی گول کمرے میں پہنچیں۔

آندرے جوزف رینال صوفے پر ٹیکا جڑ پی رہا تھا۔ فوراً تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ پچھلی با

یہ نیٹوناچ گرل ایک مغل پرنس لگی تھی۔ آج اسپنیش چپسی ڈانس سرخم کر کے مصافحہ کیا۔ اور نواب بیگم کے فروکش ہونے کے بعد خود بیٹھا۔

ہم نیٹو رئیسوں کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ درباروں میں کھڑے ہو کر گاتے ہیں۔ حضور سرکار کہہ کر ان کو مخاطب کرتے ہیں۔ آج تک کوئی نیٹو خلیفہ نواب بیگم کیلئے کرسی چھوڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ نہایت ممنویت کے ساتھ بولیں: ”سلام آندرے صاحب جے پور کیسے آنا ہوا؟“

”ہنر بانی نس کے فوٹو گراف —“ آندرے نے گویا رت کر کے بنایا ٹھس خردماغ انگریزوں کے برخلاف یہ یورپین لوگ کتنے چوچال اور بے تکلف ہیں۔ اور اچھے خاصے کتھک۔ کیا بھاؤ بتاتے ہیں۔

”مبارک ہو۔“

”منگ سی۔“

”ہم نے آپ کو دلی میں دیکھا تھا۔ ریڈ فورٹ کی کارڈن پارٹی میں — آپ ایک برجی پر چڑھا ہوا تھا —“ نواب بیگم ہنسیں۔

”اوہ —“ آندرے بھی ہنسا — مہمان اور میزبان چند منٹ تک ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اردو میں گفتگو کرتے رہے۔ فلو مینا چائے کا بندوبست کرتی ہوئی آئی تو اسے مزید ترجمانی کے لئے روک لیا۔ فلو مینا ڈمی کو شاکی گواہی بمبیا انگریزی گوئیگر انگلش تو نہ تھی البتہ بقدر ضرورت کافی۔

خدمت گارنفرنی ٹی سیٹ میں بڑھیا دار جلنگ ٹی لے کر داخل ہوا۔

آندرے محویت اور دلچسپی کے ساتھ اپنی میزبان کو رتی ڈال کی طرز معاشرت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ حسین خاتون ماہر فن بھی تھی۔ دولت مند اور باذوق بھی۔ آندرے رینال اپنی پورٹریٹ فوٹو گرافی کی بزنس کلکتے میں اب تک نہ جمایا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ نواب بیگم جیسی خود مختار متمول اور جذباتی عورت سے اس کی دوستی کا آمد ثابت ہوگی۔ پچھلی مرتبہ ٹھاکر مہیشور سنگھ کے ہاں فوٹو سیشن کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ نواب بیگم اس سے

دوبارہ ملاقات ناپسند نہ کرے گی۔ اتنے دنوں بعد آج پھر یہ مطربہ — مسرور و مضطرب نظر آئی اس کے ننھے منے گھنگر وڈ والے ہیرے کے کڑے پھن پھن کرتے تو بہت اچھا لگتا۔
 آندرے ریاست کے مہمان خانے میں مقیم تھا۔ رائیل فیملی کے پورٹریٹ بنانے کا کمیشن ختم ہوتے ہی نواب بیگم کی دعوت پر انکے ہاں منتقل ہو گیا۔

نواب بیگم کے نیم دیسی نیم برطانوی کولونیل طرز رہائش نے برٹن کے پٹی بورڈ وا آندرے رینال کو بہت متاثر کیا۔ صبح بید ٹی۔ نو بجے چھوٹا حاضری۔ (نواب بیگم اکثر سوچتی تھیں کہ جب عباس کی حاضری فرنگیوں کا بریکفا سٹ کس طرح بن گئی، کئی کورس کا لچ۔ شام کو ہائی ٹی۔
 (HIGH TEA)۔ رات کو بڑھیا ڈنر۔ نواب بیگم اتنی عالی دماغ تھیں کہ ایک بوھرے ملک التبار کریم علی جاپان والا کے ذریعے اپنے ڈنر سیٹ پر انگور کے حلقے میں ”نواب بیگم اف جے پور“ کا طغریٰ تک چھپوا منگوایا تھا۔

ایک روز فٹن بھیج کر نواب بیگم نے سیٹھ گردھاری لال رنچھوڑ مل کنوڑیا اور انکے پارٹنر پرشونم داس جھا ویر کی کو پھر بلوایا۔ جھا ویر کی کے ہاتھ وہ ہیرے کے پری چم فروخت کرنا چاہتی تھیں تاکہ آندرے کلکتے جاتے ہی فوٹو گرافی کی بزنس جما سکے۔ ٹھا کر مہیشور سنگھ کی تباہی کے متعلق جے پور میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ جھا ویر کی صورت حال فوراً بھانپ گیا۔ بانی جی کی ملازمت ختم ہو گئی۔ عمر ڈھل رہی ہے۔ خود اس صاحب پر عاشق ہو گئی ہیں۔ آمدنی بہت کم ہے۔ اپنے کہنے بیچ بیچ کر اس چالو گورے کو کھلا رہی ہیں۔ جھا ویر کی کاٹن ایکسیچنج کی طرح اس بازار کا اتار چڑھاؤ پہچانتا تھا۔ نواب بانی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس نے پری چم کے دام بہت کم لگائے پیچھے کھڑی فلو مینا نے آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ نواب بیگم نے جگمگائی توڑی اپنے پرس میں رکھ لی۔

جھا ویر کی کو معلوم تھا کہ فوٹو گرافر رینال یہیں مقیم ہے۔ وہ اپنے ساتھ چند کیمیا لایا تھا۔ بولا صاحب لوگ کو مغل راجپوت نوادر کی بہت تلاش رہتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ آندرے نے وہ پسند نہیں کئے۔ بے حد ہنگے تھے۔

تب جھادیری نے آتش دان پر رکھے رئیس پور ٹریٹ کی طرف اشارہ کیا: ”بانی جی آپ اس فوٹو کا کیس کیوں نہیں بنوا لیتیں؟ ہمارا آرٹسٹ اس کو یہو بہو ہاتھی دانت پر بنا دے گا۔ واجب قیمت پر“ پھر اس نے آندرے کو مخاطب کیا: ”صاحب — بانی جی کو تم وہ برتھ ڈے پریذنٹ دینا مانگتا — کیا؟“

نواب بیگم مسکرائیں۔ اب تک وہ خود ہی صاحب کو پریذنٹ پر پریذنٹ دیے جا رہی تھیں۔ انھوں نے خود ایک فرنیچر فیوم کے علاوہ انکو کچھ نہ دیا تھا — مگر یہ معاملہ لین دین کا نہیں عشق کا تھا —

ہفتہ بھر میں پرشوتم داس جھادیری کی مینا کاری ورکشاپ میں ملازم مغل نژاد مصوٰر مرزا فاروق احمد جے پوری نے اپنے موروثی فن کا نمونہ بنا کر پیش کر دیا۔ ہاتھی دانت پر بنے نواب بیگم کے مینا توڑ کو آندرے نے اپنے کارپٹ بیگ میں رکھا۔ نواب بیگم نے چپکے سے الماس کے پری چھم اس کے سوٹ کیس میں ڈال دیئے۔

چلتے وقت وہ کہتا گیا اپنا اسٹوڈیو سیٹ اپ کر لوں پھر تم بھی چند رنگر آجانا۔

چندرنگر سے بہت دن بعد ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس کا خط آیا۔ نواب بیگم نے فوراً فلو مینا سے جواب لکھوایا۔ وہ ایک مصروف لالہ بالی سانو جو ان تھا اور مہینوں بعد اس کا مختصر پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ نواب بانی اب بے حد فکرمند تھیں۔ مگر چلتے وقت اس نے جو جملہ کہا تھا میں اپنا اسٹوڈیو سیٹ اپ کر لوں پھر تم بھی شاندرنگر آجانا۔ یہ ایک نہایت امید افزا جملہ تھا — بھلا کوئی کیوں کسی کو اپنے ہاں بلاتا ہے۔ کیوں فلو مینا —؟ ”برو بڑے بٹ جب تم رینال میم صاحب بن جائے گا میرے کو بھی بلجیم لے جانا اچھا لگتا نہیں تو بابا کی دیکھ بھال کون کرے گا —؟“

نواب بیگم کو بچی کا نام عندلیب بانو بیگم رکھنا اچھا لگتا کیونکہ بڑوس ببل متواتر ان کے

باغیچے میں آیا کی اور مسلسل گاتی رہی۔ لمبل تھی یا شامایا کلدُم۔ نواب بیگم کو اڑتے پرندوں کی پہچان نہ تھی۔ مگر شربتی آنکھوں اور بھورے بالوں والی بچی بہر حال عندلیب تھی۔ شہر کے ایک پارسی فوٹو گرافر سے بچی کی تصویر کھینچو کر آندے کو بھیجی۔

خلاف معمول بواپسی ڈاک جواب آیا۔ فلو مینا نے ترجمہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں تم کو اب کلکتہ آجانا چاہیے مگر جب تک میں شیل نہ ہو جاؤں۔ ایسا ممکن نہیں۔ میں اب تک اپنا اسٹوڈیو نہیں کھول سکا۔ کلکتہ مہنگا شہر ہے دوکان کے لئے بہت سرمایہ درکار ہے۔ البتہ چند رنگ میں ایک بوڑھا فرانسیسی جس کے اسٹوڈیو میں ملازم ہوں اپنا اسٹاک، اسٹوڈیو گڈول ہر چیز فروخت کر کے فرانس واپس جانا چاہتا ہے۔ اس سارے اثاثے کی قیمت اس نے محض چالیس ہزار لگائی ہے جو واجب بلکہ سستی ہے۔ لیکن اتنی بڑی رقم میرے بس کی بات نہیں۔ تم جس عیش و آرام کی عادی ہو اور نہ نائیٹ اینگیل جن آسانشوں کی مستحق ہے وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں اپنے کاروبار کو دو مالک ہوں۔ کیونکہ میں ہرگز نہ چاہوں گا کہ تمہاری دولت اور آمدنی پر تکیہ کروں۔ کوئی ایشیا ملک یا یورپین غیرت مند مرد ایسی صورت حال قبول نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں میرے ماں باپ جو ملک بلجیم کے شہر برسلز میں رہتے ہیں قدامت پسند رومن کیتھولک ہیں وہ یہ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ میں نے ہندوستان آکر ایک یٹو محمدن ڈانسنگ گرل سے شادی کر لی بہمارے چند نوجوانوں نے بلجیم کو نگویں افریقی لڑکیوں سے بیاہ کئے ہیں مگر وہ ہماری اپنی کولونی ہے۔ اور وہ لڑکیاں عیسائی۔ تم بھی پسند نہ کرو گی کہ اپنا مذہب تبدیل کرو۔ لہذا ان حالات میں بہتر یہی ہو گا کہ ہم کوئی فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ گو میں یقیناً یہ چاہوں گا کہ میری لڑکی ماڈ کلیسا کے پستے سے محروم نہ رہے اور ایک کورتی زال کے ہاں پرورش نہ پائے۔

آخری جملے پہ نواب بیگم تلملا کر رہ گئیں۔ سوچتے سوچتے حیران ہو گئیں۔ بڑی کُسن بنی تھی۔ اگر وہ شادی کے لئے تیار ہو بھی گیا تو مرنے مر جاؤں گی نہ خود کمرشان بنوں نہ لڑکی کو بننے دوں۔ مٹا ایک ترکیب سمجھائی دی۔

پیسہ — پیسہ — ہر مصیبت کا حل پیسہ۔ چالیس ہزار۔ آندیسے رینال کو چالیس ہزار چاہیے۔ بہرے کے پری جیم اس کے حوالے کیے۔ چلو۔ بلا سے۔ اس چھو کرمی کا باپ ہے۔ شادی کر لے۔ چھو کرمی کی زندگی سنو رہائے گی۔ صاحب کی بیٹی کہلائے گی۔ چالیس ہزار وہ اسٹوڈیو خرید لے۔ احسان مند ہو کر کلکتہ بلا لے۔ سنا ہے اب عدالت میں جا کر سیاہ کرنے لگے ہیں تم اپنے مذہب پر قائم ہم اپنے۔ کیلنٹ بڑا سکون محسوس ہوا مولانا نے راہ سجدی۔ عندلیب کی فکر میں مزید بچت شروع کی۔ ڈیمکر اور فنٹ گھوڑا بکوا کر پچھلے قرضے معود ادا کئے۔ سوائے باورچی اور فلو مینا کے سارے ملازمین علیحدہ کیے۔ گردھاری لال کو بلوانے کے لئے نہ ڈیمکر باقی تھی نہ فنٹ۔ تانگے پر آئے اور کر ایہ نواب بانی سے دلوا یا۔ گلابی رنگ کی جوہلی مردانہ اور زنانہ حصوں میں اس طرح منقسم تھی کہ دونوں کو ایک سنگی جالی دار راہداری نے ایک دوسرے سے ملتی کر رکھا تھا۔ بیرونی حصہ دو سال قبل مہیشو سنگھ کو دینے کے لیے مبلغ پچاس ہزار روپیہ میں رہن رکھ چکی تھیں۔ اس کا سود در سود ٹھا کر صاحب ادا کر رہے تھے۔ شرائط کے مطابق دو سال بعد اصل رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں مہاجن اس حصے کی قرضی کردانے کا مختار تھا۔

تانگے پر سے وہ وکیل صاحب بھی اترے جنہوں نے کاٹھیا داڑی بیوقوف دربار صاحب کی موجودگی میں انکے حکم سے اسی دیوان خانے کی اسی ونیشن کوچ پر بیٹھ کر اس جوہلی کو نواب بانی کے نام منتقل کیا تھا۔ دو سال قبل انھوں نے جوہلی کے نصف حصہ کا رہن نامہ تیار کیا تھا۔ آج زنان خانہ، شاگرد پیشہ اصطل اور شتر خانہ رہن رکھ کر مبلغ چالیس ہزار روپیہ گردھاری لال سے نواب بیگم کو دلوا یا۔ اب سود در سود کی رقم لڑخیز تھی مگر نواب بانی کا دل کہہ رہا تھا کہ آندرے کا کاروبار جلد چمک جائے گا۔ اس نے بتلایا تھا کہ بوڑھا فرانسس زاک کو رہیں کلکتہ۔ چند رنگر کا نامی فوٹو گرافر ہے۔ شملہ دہلی لاہور رنگ بلایا جاتا ہے وائسرائے کمانڈر انچیف گورنر بنگال، انکی لیڈیاں اور والیان ریاست سبھی اس سے اپنے پورٹریٹ بنواتے ہیں ایک دوکان خریدنے کے بعد یہ رقم ادا کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ چند روز بعد چالیس ہزار کا بینک ڈرافٹ آندرے کو روانہ کیا۔ اصل خیر سے تو چند رنگر پہنچنے کی

منت مانی۔ ساتھ ہی عندلیب کے عقیقہ کی تقریب منعقد کی۔ چاند پول بازار کی سہیلیوں نے گلگٹے تلے عرصے بعد راگ رنگ کی محفل جمی۔ رت جگہ منایا گیا۔ صبح منہ اندھیرے لگی کے چالیس چراغ تھالی میں رکھ کر نواب بیگم بھولیوں کے ساتھ کافی بجاتی مسجد کا طاق بھرنے گئیں۔ گردھاری لال اور وکیل صاحب کو بلا کر انھوں نے بقیہ جو بلی اتوار کے روز رہن رکھی تھی جب فلو مینا کئی گھنٹے کے لئے چرچ جاتی تھی۔ انکو ڈرتھا کہ ٹوڑی پھر کوئی بدشگونی نہ کرے مثلاً یہ کہ بانی تمہارا منک پھر ملا ہے۔ تمہارا بیجا خلاص — اکھا بلدنگ گردی۔

اتوار کے روز گردھاری لال قانونی کاغذات پر دستخط کروا کے اپنے گھر گیا۔ چند گھنٹے کے اندر اندر مہیضہ سے فضا کی۔ بڑھا نسبتاً شریف آدمی تھا۔ گو بے انتہا بیٹو — سنگا کہ جو کے ہی میں اس کا دم نکلا۔ لڑکا خور دسال تھا۔ چھوٹا بھائی بیرکانیر سے اگر گدی پر بیٹھا۔ وہ معاملے کا سخت مشہور تھا۔ اب تو اللہ ہی خیر کرے۔ نواب بیگم کے دل کو سیکھے لگ گئے۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمروں کمروں گھومتیں اور سامان آرائش کو چھو چھو کر دیکھتیں۔ جیسے بہت جلد اس سے بھی ہاتھ دھونے والی ہوں۔ دربار صاحب انجہانی سبھی سجائی جو بلی بخش گئے تھے۔ عنابی نعل کے سنہری ڈوریوں والے پردے۔ بڑھیا قالین اور دریاں۔ دیشین طرز کا فرنیچر۔ عندلیب گھنگر و لگے رنگین گجراتی پنگوڑے میں بڑی غاؤں غاؤں کیا کرتی۔ نواب بانی سے زیادہ فلو مینا اس پر جان چھڑکتی تھی گھر میں اب دو ملازم رہ گئے تھے۔ باہر خانساں جی اندر فلو مینا۔ دیکھتے دیکھتے نواب بانی کی ”ریاست“ پر زوال آگیا تھا۔

چند رنگر سے بنک ڈرافٹ کی رسید آچکی تھی۔ شکریے کا خط ندارد۔ ایک روز ٹھا کر مہیشور سنگھ کا گھنگر و بجا تا سانڈنی سوار آخری تنکالے کروا دہوا جس نے اوٹنی کی کمر توڑی — ٹھا کر صاحب کا گڑھی میں دیہانت ہو گیا۔ چند راوتی کی شادی کے بعد ڈیڑھ سال کے اندر تیسرا ہارٹ اٹیک۔ بال بال توان کا قرضے میں بندھ چکا تھا۔

سورگباشی آخری بار جب آئے تھے کہہ رہے تھے کہ اس شور اترمی پر یا تر کے واسطے مالوہ جانے والے ہیں وہاں ایک گھنے بن کے بچوں بیچ بھیروجی کا مندر تھا۔ وہ شیوہی اور درگا بھوانی کے پرستار تھے۔ دکھیا کہا کرتے تھے۔ شوہا کال ہے۔ تمہارے پیغمبر صاحب کی بھی ایک حدیث ہے کہ خدا صاحب زمانہ ہے۔ اس لئے زمانے کو بُرا نہ کہو۔ ٹھاکر صاحب جیسے شائستہ گیان دھیان والے اور وضعدار آدمی اب کہاں — انکی موت کی خبر سے نواب بیگم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی غش آگیا۔ ساندنی سوار بیغا مرنے اسے صدمے پر محمول کیا۔ فلو مینا نے دال بانی اور باجری کی کھینچ سے اس کی تواضع کی۔ دوڑی دوڑی واپس آئی۔ مالکن پر لونڈر چھڑکا۔ پانی پلایا۔ جب خواص ذرا بجا ہوئے تو کہنے لگی ”میم صاحب ہم تم کو پہلے ہی بولا تھا۔ اولدین دوسال کے اندر ڈبہ گول کیا تو تم کیا کرے گا۔ ارے اب ہم لوگ رستے پہ کھڑا ہوگا۔ وہ نواسیٹھ بڑا ظلمی مشہور ہے۔ ہم لوگ کونکال باہر کرے گا۔ بٹک ڈرافٹ فلو مینا ہی نے رجسٹری کیا تھا — محض اینڈی بابا کی خاطر — مگر اس چار سو بیس موالی نے ڈکار تک نہ لی۔ باٹلی کا وقت تھا بھوئے میں پڑی عندلیب زور سے رونی۔ فلو مینا دودھ گرم کرنے باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

نواب بیگم ہڑبڑا کر مسند سے اٹھیں۔ وضو کیا۔ نفل پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔ سجدے میں گر کر زار و قطار روئیں۔ اب انکی لاج خدا کے ہاتھ میں تھی۔

فلو مینا نے بچی کو دودھ پلایا بنا سنوار کر پریکبولیٹر میں بٹھالا۔ باہر خانسا ماں جی کو دے آئی۔ خود بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی۔ سیاہ جالی کا اسکارف سر پر ڈالا۔ سینسٹ فرانسس اس کی مورتی کے سامنے شمع روشن کی۔ کوکئی میں جلدی جلدی بُدبائی ہوئی نازا۔ ہم سب مورکھ جانور ایک دوسرے کا سگدالا ہے۔ ہولی فادر ہمارے لئے دُعا کرنا لگتا۔ چھوٹا اینڈی بابا کے لئے دُعا کرو۔ اس کی بے وقوف ماں کے لئے دُعا کرو۔ ہولی فادر — آدھی رات کو نواب بیگم سچن میں گئیں۔ گھپ اندھیرے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر بال بکھرائے۔ فریادی ماتم کیا — اسے کل کے مددگار مدد کے لئے آؤ۔ فریاد کو پہنچو۔

استاد جی اور سارنگی نواز ماموں بھانجے چھٹی لے کر اپنے وطن اندور گئے ہوئے تھے۔
 انیسویں صدی کے پہلے برطرف کر چکی تھیں کہ ہر وقت بینک میں رہنے لگا تھا۔ شاگرد پیشے
 میں اب محض خانہ سالماں جی تھے۔ جوہلی کی بجلی منزل میں دو خوشزدہ عورتیں۔ بالائی منزل کے
 کمرے بند پڑے تھے۔ دوپہر کے سنائے میں اور رات کے وقت لق ووق عمارت بھائیوں
 بھائیوں کرتی۔

کنڈی کھڑکی اور نواب بیگم دلیس کہ فرق امین آگیا۔ کبھی سوچیں شہر میں ڈونڈی پٹے
 گی۔ نواب بانی کی جوہلی کا نیلام — دیواروں پر اشتہار لگیں گے۔ اخباروں میں سرخیاں
 — ایک کسی کی ناعاقبت اندیشی کا عبرتناک نتیجہ۔ افسانے بھی لکھیں گے۔ ایک طوائف کا
 حسرتناک انجام۔ اور کیا جگہ ہنسائی ہوگی۔ اللہ اللہ۔ وہ خدمت گار۔ شو فر۔ ذاتی کریٹ
 کے برتن۔ ڈیمسٹر فٹن۔ سارا کر و فرغایب —

عندلیب سبز قدم ہے۔ توبہ توبہ۔ عندلیب کا ہے کوئٹوس ہونے لگی گجر بانی کی بد ذات
 لڑکیاں! مجھے سہفت نظری کی نظر لگ گئی۔ دشمنوں نے کھواپس کے ذریعے مجھ پر عمل کروادیا۔
 قلوبینا یہاں سے بھاگ چلو۔

کہاں۔

کلمتہ اور کہاں۔

اخباروں میں سرخیاں — نواب بیگم کی پراسرار گمشدگی۔ بیٹھ کر دھاری لال کنوڑیا
 کو دھوکہ دے کر فرار۔

ایک رات خواب میں کیا دیکھتی ہیں۔ دروازے پر نیلام کا اشتہار لگ گیا ہے۔ ڈنکا
 بج رہا ہے۔ لوگ جمع ہیں۔ وہ خود لال پٹاری سر پہ اٹھائے سڑک کے کنارے کھڑی ہیں۔
 برقعہ اوڑھے تسبیح ہزار دانہ بھلاتی جن بی ساتھ موجود ہیں۔ صبح چار بجے کا خواب تھا۔ ہیبت زدہ
 ہو کر اٹھیں۔ قلوبینا کو جگایا جو عندلیب کے پالنے کے قریب غالیچے پر سو رہی تھی۔ اسے خواب سنایا
 اس نے فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ دن بھر پریشان رہیں۔ دوسری رات پھر خواب میں دیکھا
 کہ شکستہ برقعہ اوڑھے تسبیحیں بیچ رہی ہیں۔ اندھی جن بی لاٹھی ٹیکتی ساتھ ساتھ رینگ رہی ہیں

تیسری رات خواب میں اجیر کی درگاہ شریف نظر آئی۔ پیکھا وچ پر دھما۔ کوئی استاد الاپ رہے تھے۔ جن کا چہرہ انڈے کی طرح صاف سیاٹ تھا۔ نہ آنکھ نہ ناک نہ منہ۔ اور اس انڈے میں سے آواز نکل رہی تھی۔ دیکھو کھیلےں دھمال خواجہ معین الدینؒ۔ دیکھو کھیلےں دھمال خواجہ معین الدینؒ۔ اب ایسی رُت آئی۔ ایسی رُت آئی۔ دہشت سے دل دھڑکنے لگا آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر پانی پیا۔

اب روز صبح بیڈ ٹی پیش کرتے ہوئے فلو مینا پریشانی سے پوچھتی — ”میم صاحب آج کوئی سینا گرا؟“

دو سال کی مدت چند روز بعد پوری ہونے والی تھی۔ نواب بیگم نے نیک سرشت خانساں جی کو محرم راز بنایا۔ انھوں نے کہا آپ کیوں اتنی پریشان ہیں۔ خدا کا دیا اتنا گھنا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ خدا نخواستہ سیٹھ اگر کچھ چیں پٹاخ کرے تین چار چیز الگ کر کے۔ ”اور چھو کرمی کے لئے کیا باقی بچے گا۔ زیور بھی الگ کر دوں۔ واہ خانساں جی بڑی اچھی صلاح دی آپ نے۔“ نواب بیگم اب بے انتہا چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ بات بے بات عندلیب کو مسارتی پیٹتی رہتیں۔ وہ ڈیڑھ سال کی جان سہم کر فلو مینا کے گھیر دار فرار کے پیچھے پھپ جاتی۔

ایک روز صبح آندڑے کوتا رہجھوایا۔ اور سینگ میں جُٹ گئیں۔ کچھ سامان چپکے سے خانساں جی کے ذریعے فروخت کر دیا۔ چند وقیعہ زیورات آہنی ٹرنک میں مقفل کر کے اس پر نادِ علی کا حصار کیا۔ خانساں جی نے لوگوں سے کہا بانی جی بمبئی جا رہی ہیں اکثر اس طرح دُور نزدیک جایا کرتیں تھیں اور بہت ساز و سامان کے ساتھ جاتی تھیں کسی کو شک نہ ہوا۔ کرائے کی دو بند گاڑیاں منگوائیں ایک میں خانساں جی مع اسباب دوسری میں نواب بیگم۔ فلو مینا۔ عندلیب۔ مقابل کی سیٹ پر عندلیب کا فولڈنگ پریمبولیٹر اور نواب بیگم کی لال پیٹاری۔

آٹھ سال کے سن میں مرحوم ماں باپ کے گھر سے نکل کر سبط احمد کے ہاں گئی تھیں

توانکی گڑبڑوں اور کپڑوں سے بھری یہ سُرخ پٹاری ساتھ تھی۔ وہاں سے یہ شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے گھر آئی۔ پھر اجیر شریف۔ درگاہ سے راحت بانی کے چوبارے۔ اجیر سے گجر بانی کے ہاں جے پور۔ بالاخر انکی ذاتی توہلی میں منتقل ہوئی۔ پچھلے دس سال سے وہ بحفاظت انکے ڈرائیگ روم کی الماری کے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ اب ایک اور جادہ پیمانی پر نکلی۔ قدیم عبرانیوں کے آرکٹ۔ صندوق سکیئنہ۔ کی طرح۔

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ خریدے۔ پولس کے سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا سمجھیں سمن لے کر انکی تلاش میں آئے ہیں۔

وہ انکے نکل گئے۔ مگر یہ ہڑ بڑا کر فوراً ایک زنانہ انٹرکلاس میں گھس گئیں۔ قلیوں کی مدد سے خانساں نے مشکل اسباب چڑھایا۔ وہ بے چارے پلیٹ فارم پر کھڑے آنسو بہایا کیے ٹرین چل دی۔

دلی پر گاڑی بدلی۔ جنگ چھڑ چکی تھی۔ ساری ریلیں فوجیوں سے لدی ہوئی گز رہی تھیں اس بھڑ بھڑ کے میں فلو مینا اور شیر خوار بچی اور بے تحاشا سامان کے ساتھ کلکتے والی ٹرین میں زنانہ ڈبہ ڈھونڈتی پھرتی۔ جب ایک مرغیوں کے ٹاپے جیسے کپڑے میں جگہ ملی اللہ کا شکر ادا کیا۔

دھواں اُگلتی چھک چھک کرتی ٹرین روانہ ہوئی۔ اب تک آرام آسائش سے سو کرنے کی عادی تھیں بمشکل ایک کونے میں کھڑکی کے قریب ٹھنس کر بیٹھیں۔ شور مچاتی مارواڑوں کا دھاڑا شاید کچھ میلے جا رہا تھا۔ عندلیب کو گود میں سنبھالے فلو مینا حفاظت کے خیال سے صندوق زبورات والے ٹرنک پر چڑھ بیٹھی۔ اور کوئی میں AVE MARIA کا ورد شروع کیا۔ آدھی رات گزر گئی تب جا کر نواب بیگم کے حواس ٹھکانے ہوئے۔ ایک الاپ گنگنا نا چاہا۔ اتنے دنوں سے گانے بجانے کا ہوش کہاں تھا۔ اب ایک بار پھر دھک سے رہ گئیں۔ آواز غائب۔ چونکلی وہ بے سُرمی۔ اب تک انھوں نے فلو مینا کے اس نظریے پر یقین کرنا نہ چاہا تھا کہ گجر بانی کی سیٹوں نے پان میں سیندور کھلا دیا ہے یا جادو کر دیا ہے۔ نزلہ کھانسی کی وجہ سے

گلا پڑ ہی جاتا ہے۔ بہت کھانسیں کھنکھاریں مگر جو آواز نکلی وہ بھدی اور کخت۔
اب انھوں نے انتہائی لاچاری کے ساتھ چپکے چپکے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔
پھر سوچا کلکتے میں ایک سے ایک قابل ڈاکٹر موجود ہے۔ آندے سے علاج کروادے گا۔
روتے روتے آنکھ لگ گئی۔

گاڑی ہوڑہ اسٹیشن پہنچی۔ آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ بے شمار وادی پوش
گورے فوجی۔ آندے سے ندارد۔

علی علیٰ کرتی پلیٹ فارم پر اتریں تین گھنٹے تک ٹرنک پر بیٹھ کر انتظار کیا۔ فلو میسن
عند لیب کو بھلانے میں جٹی رہی۔ آخر تھک ہار کر اٹھیں باہر جا کر گھوڑا گاڑی کی۔ کوچیان
سے کہا ”چندرنگر چلو۔“

وہ منس پڑا ”بہت دور ہے سیکم صاحب کل لاری سے چلی جائیے گا۔ ہوٹل چلی چلیے“
کلکتے سے ناواقف تھیں۔ ایک دفعہ ہفتہ بھر کے لیے آئی تھیں۔ اور یہاں صرف
گوہر جان کو جانتی تھیں۔ ان سے بھی ایک دوبارہ ملاقات ہوتی تھی۔

لیکن اب وہ مادام رینال کی حیثیت سے شریفانہ زندگی کا آغاز کرنے جا رہی
تھیں گوہر جان کے ہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہونا تھا۔ گاڑی بان نے برقعہ پوش
کے قیمتی اسباب ولایتی فراک میں ملبوس گوری چٹی پٹی اور کریمین آیا پر نظر ڈال کر دریافت
کیا۔ ”کہاں۔ گرینڈ ہوٹل؟“ گرینڈ کے متعلق سن چکی تھیں بہت مہنگا ولایتی ہوٹل ہے کسی
ایسی ہوٹل پر لے چلو۔“ فرض کیجئے تین چار دن تک آندے سے کاپتہ نہ چلا۔ ممکن ہے وہ
کلکتہ سے باہر ہو۔ اتنے عرصے میں گرینڈ ورینڈ میں تو کھال اڈھڑ جائے گی۔

کوچیان نے انکو تو سیر حیت پور روڈ کے ایک معمولی ہوٹل پر جاتا رہا۔
دوسرے روز علی الصبح پتے پوچھتی پوچھتی ٹرام کے ذریعے پھر ہوڑہ پہنچیں۔ وہاں چند رنگر
کے لئے ”موٹر بس“ پکڑی۔

شہر کے بازار میں داخل ہوتے ہی ”زاک کو رہیں۔ فوٹو گرافر“ کا اسٹوڈیو۔ اندر گئیں۔

بوڑھا فرانسیسی میز کے پیچھے بیٹھا چند سیفٹے پرانا ایک فرنیچر روزنامہ پڑھنے میں محو تھا۔
آہٹ پر سر اٹھایا۔ فوراً تعظیماً کھڑا ہوا۔ نواب بیگم نے سوال کیا — ”آندرے صاحب؟ کدھر
ہے؟ آئی ایم وائیٹ۔“

”وائٹ —؟“ موسیو کو رہیں نے تعجب سے دہرایا۔

”آئی ایم انڈیا — وائیٹ — انڈیا — انڈین وائیٹ —“

”پلیز —؟“

”نو — نو — انڈین وائیٹ — مسٹر آندرے —“

”او — مادر دیو —“ فرانسیسی نے سر تھام لیا۔ ”کم ہیر سیت داؤن مائی دیو —“

وہ ایک اسٹول پر ٹیک گئیں۔ پرس میں سے نکال کر پاسنگ شو جلایا۔ بوڑھا تار گیا۔

یہ وہی ناچ گریں تھی جسکا آندرے نے وہ شاندار پورٹریٹ بنایا تھا۔ بد معاش اس بے چاری
کو کیسا جھل دیا۔ افسوس۔ بنگالی اسٹنٹ کو آواز دی ”کیفے۔“

”وی۔ موسیو۔“ بنگالی نوجوان ڈاکر روم سے نمودار ہوا — چند منٹ بعد سیاہ فرانسیسی

کانی بنا کر لایا۔ موسیو کو رہیں اٹھا۔ ایک الماری سے برانڈی آتے پنولین نکالی۔ فرنیچر دستور

کے مطابق سیاہ کانی میں تھوڑی سی کوئی ایک ملائی۔ پیالی نو وارد عورت کو پیش کی۔

نواب بیگم کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ لرزاں ہاتھوں سے پیالی اٹھائی۔ ایک گھونٹ بھرا۔

جھجھکتے ہوئے چند الفاظ میں سارا واقعہ بتایا۔ بنگالی اسٹنٹ فرنیچر میں موسیو کو بتاتا گیا۔

بڈھے نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”وہ لڑکا — وہ شربت بد معاش لڑکا — یہاں سے

جا چکا ہے شیر سی۔ تم کو معلوم ہے یورپ میں لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اعلان جنگ ہوتے ہی وہ لمجیم

روانہ ہو گیا۔ وہ فوجی فوٹو گرافر کی حیثیت سے محاذ پر جانا چاہتا تھا۔ اس وقت فرانس کی کسی

خندق میں بیٹھا ہو گا۔ یا شاید اننگ مارا جا چکا ہو — مادر دیو —“ بڈھے نے صلیب کا

نشان بنایا۔ بنگالی اسٹنٹ نے ترجمانی کی۔

”میں نے — میں نے اسے چالیس ہزار کا بنک ڈرافٹ —“ نواب بیگم کی آواز ڈوب گئی۔ آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگے۔

”مون دیو —“ بڈھا انگنت بدنداں رہ گیا۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک زبردست رقم کلکتہ ریس کورس پر جیتی ہے — ژاک پوت — یونو — ژاک پوت —“

”جیک پوٹ —“ جنگالی نوجوان نے نواب بیگم کو سمجھایا۔
موسیو کوتریں کہتا رہا۔ ”وہ ریس کا عادی تھا۔ اسی مارے ہمیشہ پریشان حال رہتا تھا۔ وہ بڑا چالاک لڑکا تھا۔ تمہارے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کے لئے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پھر وہ رقم بھی ریس میں ہار گیا۔ یکشت۔ کیونکہ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے وہ ساری پونجی ”ڈائمنڈ کون“ پر گنوا دی ہے۔ ڈائمنڈ پر خیال آتا ہے۔ اسے ایک جوڑی ڈائمنڈ BANGLES بھی شاید تم ہی نے دیے ہوں گے۔ انہیں بھی کھاپی کر برابر کیا — خدا اسے معاف کرے میری بچی۔ اس نے ہمیں بہت بڑی دعا دی۔“

آٹھ سالہ نواب فاطمہ کو اس کے ولی مرزا سبط احمد بھیانک دھوکہ دے چکے تھے۔ مگر اب پچیس سال کی عمر میں اس نے خود فریب کھایا محض ایک محفوظ باعزت مستقبل کی موہوم امید پر۔ دوسرا سگریٹ — اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کے لئے زور زور سے کش لیے ژاک کوتریں کے سفید سر کے عین اوپر ایک طاق میں گنوا ری مربیم استادہ تھیں تاج بنے ہاتھ جوڑے۔ سر جھکاتے افسردگی سے مینظر دیکھ رہی تھیں۔ دیواروں پر بھانت بھانت کی تصاویر دبیراں تھیں فریج کو لونیل افسر نارنگی کے شگوفے سفید باریک وتیل اوڑھے انیس دہنیں کلکتے کے ہوٹلوں میں کیڑے ناچنے والی ”ہاف کاسٹ“ یوریشین قاصدیں۔ فرسٹ کمیونین کے لئے ”دولہا“ اور ”دلہن“ بنے ننھے فرانسیسی بچے اور ”ہمارا لارڈ جن کے دلوں میں اترنے والا تھا۔“

نواب بیگم نے آبش ٹرے میں سگریٹ بٹھایا تب انکی نظر ہاتھی دانت کے اس کیڑے پر گئی ایک الماری میں مہارانی کوچ بہار اور ایک اینگلو برمن جینہ کی تصاویر کے درمیان ”نمایاں طور پر سجا ہوا تھا۔“

”کجخت اسے بھی چھوڑ گیا۔ لعنت۔“ بھرائی ہوئی آوار میں کہا۔

بوڑھے ژاک نے ندامت سے سر جھکا لیا گویا آندھے کے کہنے پن کا خود دے دار تھا
”بعض نوجوان بہت ہی نامعقول ثابت ہوتے ہیں۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا۔“

نواب فاطمہ پیدائشی پلک متنی تھیں اور محکمہ قضا و قدر نے افراط گریہ کیلئے انوار
اقسام کے مواقع انھیں ہمیشہ فراہم کیے۔ اب پرس میں سے ننھی عندلیب کی تصویر نکال
ہوئے آنسوؤں کی جھڑی۔ ”میری بچی اور آیا کلکتے کے ایک سڑیل سے ہوٹل میز
ایکلی پڑی ہیں۔ میرا راقیمتی اثاثہ بھی وہیں رکھا ہے۔ خدا کے بھروسے پر۔“

”اب تم کیا کرو گی؟ تم تو جیسا تم نے بنایا ہے پور میں اپنی کشتیاں جلا آئیر
”اب میں وہی کروں گی۔“ نواب بانی نے قہوہ ختم کر کے اٹھتے ہوئے یکلخت بڑ
منصوبہ آواز میں جواب دیا۔ ”جو جے پور میں کرنی تھی۔ اور عندلیب کے بڑے ہونے
انتظار کروں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میرا ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔
تمہارے ساتھ ہو۔“

بوڑھے فرانسیسی نے نواب بیگم کو دوکان کے برآمدے تک پہنچایا۔ اچانک اسے
یاد آیا۔ دوڑا ہوا اندر گیا۔ وہ کمیولا کر نواب بیگم کو پیش کیا۔ ”یہ تمہاری چیز ہے۔ لے جاؤ۔“





(۱۷)

ماہ و سال عند لیب

عند لیب باؤنیم بنت موسیو آندے جوزف رینال۔ باشندہ شہر برسلز صیغ پتہ نامعلوم۔ غالباً معرفت فریچ فورن لیمین۔ الجیریا۔ شمالی افریقہ

”بیٹا منصور۔ اگر تم کسی سے یہ سوال کرو اس کے والد کہاں ہیں اور وہ جواب دے سکے تو تم یقیناً سمجھو گے کہ وہ شخص مذاق کر رہا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں یہی جواب دیتی تھی۔ ساری برٹش ایمپائر میں لندن کے بعد سب سے زیادہ شاندار اور بارونٹی کرسمس سین کلکتہ کا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فلومینا اور ماما کے ساتھ پارک اسٹریٹ میں بڑے دن کی چہل پہل دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک دوکان کے سامنے موسیو تراک کو رخ میں مل گئے۔ ماما کو پہچان کر ہیٹ اتاری سلام کیا۔ ماما اس پہلے روز کے بعد نہ پھر کبھی ان سے ملی تھیں نہ فون کیا تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ موسیو نے پوچھا آندے کی کچھ خبر معلوم ہے؟ ماما نے نفی میں سر ہلایا۔ کہنے لگے۔ دس سال بعد اس نے پہلی بار کرسمس کارڈ بھیجا ہے۔ شاید فریچ فورن لیمین جو آئن کر لی ہے۔ کارڈ پر الجیریا کے ٹکٹ اور ٹمبکٹو کی مہر پڑی تھی۔ مجھ سے پوچھا۔ جانتی ہو۔ ٹمبکٹو کہاں ہے؟“

”اس وقت کوئی کیا ایصال کی رہی ہوں گی۔ لوریو کا نوٹس میں اپنی کلاس کی وہیں ترین طالب علم بھی جاتی تھی۔ فوراً بتایا۔ مسکرا کر بولے۔ بس یہ ہیں۔ صبح کے وسط میں، پھر وائیٹ ویز سے گڑیا اور چو کلیٹ خرید کر دی۔ اور اپنے راستے چلے گئے۔ ماما نے پولس کے چند سپاہیوں کو آنے دیکھ کر فوراً چہرے پر نقاب ڈال لی۔“

اس ہم لوگ کلکتہ میں عجیب بے تکی اندوہناک زندگی گزار رہے تھے۔ مہاجس روز سے کلکتہ پہنچی تھیں ان کو مستقل یہ دھڑکا تھا کہ ان کے نام وارنٹ گرفتاری آتا ہوگا۔ نوے ہزار اصل مح سود و رسو کی دہشت نے ان کا خون خشک کر رکھا تھا۔ بال قبل از وقت سفید ہو چے۔ رنگ روپ کھلا گیا۔ آواز تو پہلے ہی غائب ہو چکی تھی پھر بھی ان جیسی نامی گرامی مطربہ کا کلکتہ میں گناہ اور روپوش رہنا ناممکن تھا۔ چند روز سے جب لوٹ کر آئیں اس کے دوسرے روز یہ المناک قافلہ گوہر جان کے گھر پہنچا۔

”آنٹ گوہر ایک لیجنڈری رستی تھیں بکروڑ پتی اور بار سوخ۔ انھوں نے مہاجس معاملات اپنے ہاتھ میں لیے۔ زیور بنک میں رکھوایا۔ اب سوال یہ تھا کہ مہاجس کہاں اور روزی روٹی کا وسیلہ کیا ہو۔ اعلیٰ درجے کی طوائفیں بہو بازار میں رستی تھیں معمولی سونا گاچی، سینہ ور یہ پٹی اور ناخدا مسجد کے علاقے میں اور جانے کہاں کہاں۔ آنٹ گوہر نے مہاجس کو بتایا کہ یہ مسجد جہازیوں نے پہلے کبھی یہاں بنوائی تھی۔ ان کی وجہ سے اس علاقے میں طوائفیں بھی آباد ہو گئی تھیں۔ مہاجس ایک زانی کی طرح اپنی حویلی میں رہ چکی تھیں۔ ریڈ لائیٹ ایریا کے تصور سے لرزیں۔ نہ وہ کبھی اس طرح بازار میں بٹھی تھیں۔ لیکن پہلے کی طرح محض بطور کلاسیکل سنگر گنڈر بسر اب ناممکن تھی۔ آواز اگر باقی بھی ہوتی تو گانا بجانا شروع کرنے میں افشائے راز کا خطرہ تھا۔ خیر اب تو بانس ہی نہ رہا جو بانسری بچے انھوں نے روتے ہوئے آنٹ گوہر سے کہا۔ یہ سب باتیں جب میں بڑی ہونی تو فلو مینا مجھے بتایا کرتی تھی۔

”آنٹ گوہر نے ایک بڑھیا باعزت علاقے میں رہن اسٹریٹ پر ایک یہودی تاجر کے مکان کی دوسری منزل ان کو کرائے پر دلوا دی۔ وہ اپنے عالی مرتبت ہندوستانی مرہٹوں سے مہاجس کا تعارف کروا سکتی تھیں مگر اس صورت میں بھی بھید کھل جاتا۔ آنٹ گوہر کے پرستاروں میں دولت مند یورپین، ایرانی، ارمنی

ہودی بھی شاں ہے۔ ان میں سے چند ایک سے ملاقات کرادی بوقت ضرورت
 ڈرھے مریضوں کی نرس کمپنیں بننے کے لیے تھوڑی سی نرسنگ اور انجکشن
 فانا بھی سیکھا۔ نہایت جزوری سے گذر بسر کرنے لگیں۔ جب کبھی بگھی کی جھللیاں
 لرا کے رات کے وقت کہیں جاتیں تو فلوینا مجھ سے کہتی۔ اینڈی بابا۔ تمہارا ماما
 اطر کے پاس گیا ہے۔

”جیتیت ایک کالی میم فلوینا کو اس بات پر سجدناز تھا کہ میں نصف پوین
 فی۔ اس نے شروع سے میرا نام آندرے اور عند کیب کے وزن پر ولایتی نمسا
 AND رکھ لیا تھا۔

”وہ بتلاتی تھی کہ ماما جے پور میں بے انتہا فضول خرچ تھیں مگر میں نے جب
 سے ہوش نبھالا ان کو پائی پائی کا حساب جوڑتے دیکھا۔ دراصل روپے پیسے کے
 مالے میں بچپن سے لے کر اب تک تا بڑ توڑ اتنی زبردست چوٹیں کھانے کے بعد
 ن کو دولت کا ہوکا ہو گیا تھا۔ اب ان کا واحد مقصد حیات یہ تھا کہ مجھے ایک
 ہرفن رقاصہ بنا کر ان تمام نقصانات کی تلافی کریں جو اب تک ان کو سہنے پڑے۔

”ساڑھے چار سال کی عمر سے مجھے کتھک سکھایا گیا۔ فلوینا کے ساتھ رکشا پڑھی
 لرا ایک بنارسی گروچی کے گھر جاتی۔ اس وقت شہر کی سڑکوں پر سے گذرنا بہت
 چھانگتا۔ رکشا والا گھنٹی بجاتا تیز تیز دوڑتا۔ برابر سے ٹن ٹن کرتی ٹرامیں گذرتیں اور
 وچی چھتوں والی موٹریں۔ رنگا رنگ ٹریفک۔ بڈل کلاس بنگالی عورتیں سڑکوں پر
 ۔۔ کم نظر آتیں اس وقت بنگالی ہندو عورتیں بھی بہت کم باہر نکلتی تھیں
 وریشین لڑکیاں البتہ بہت دکھلائی دیتیں۔ کلکتہ ہندوستان کی یوریشین کمیونٹی
 گویا ہیڈ کوارٹر تھا۔ گوہر جان بھی میری طرح یوریشین تھیں۔

”پانچ سال کی عمر میں آنٹ گوہر کے اصرار پر مانے یہودی مالک مکان کے ذریعے مجھے لورٹھوکانونٹ میں داخل کروادیا۔ داخلے کے رجسٹر میں میرا نام اینڈی رینال اور باپ کا ”آندرے جوزف رینال“ حال مقیم برسلز“ لکھوایا گیا کوئی مشکوک بات نہ تھی بہت سے اینگلو انڈین بچے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے لورٹھوہاؤس بہت بھایا۔ ناچ سیکھنے میں دل نہ لگتا۔

”اب میں کتھک سکھلانے والے مہاراج کے ہاں بلبل تھی (عندلیب گروجی کو مشکل لگتا تھا) اسکول میں اینڈی۔ ذرا بڑی ہوئی تو یہ دو غلاین کھلنے لگا۔

”یہ شاید ۱۹۲۳ یا ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے۔ بچے پورے نہ کوئی سمن آیا نہ وارنٹ۔ عجیب بات تھی۔ ممانے اسے معجزے پر محمول کیا تھا اب ان کی دہشت کچھ کم ہو گئی تھی۔ یکطرفہ کارروائی کے بعد مرنی دھر کنوڑیا کب کا اس حویلی پر قابض ہو چکا ہو گا۔ یہ سوچ کر انھوں نے صبر کر لیا تھا کہ کم از کم جگ ہنسائی سے بچیں۔ اب وہ بے پردہ باہر نکلنے لگی تھیں۔

”اپنے ایک یمین مرنی کے ساتھ بمبئی گئیں۔ میں بھی ساتھ تھی۔ فلوینا بھی ایک روز ہم چوپاٹی سے گزر رہے تھے وکٹوریہ گاڑی میں۔ سمندر کے کنارے بڑا مجمع نظر آیا۔ گاڑی والے نے کہا ”بی اماں جنت کو سدھاریں۔ تعزیتی جلسہ ہے۔“

”بی اماں کا انتقال ہو گیا؟“ ممانے دہرایا اور فوراً آنسو بہانے لگیں۔ اپنی نئی کنبوسی کے باوجود وہ خلافت فٹڈ میں بھی چندہ دے چکی تھیں۔ وکٹوریہ رکوائی میں اوپر کوچ کس پر جا بیٹھی۔ سب صاف نظر آ رہا تھا۔ کوچوان نے بتایا۔ ایسٹج پر وہ گاندھی جی بیٹھے ہیں۔ انھوں نے بی اماں کے جنازے کو کندھا بھی دیا تھا۔ بے پر نے۔ وہ سی۔ آر۔ واس ہیں۔ ادھر موتی محل نہرو ہیں۔ سروجنی نائیڈو تقریر کر رہی ہیں میں نے ان سب پر حقارت کی نظر ڈالی۔ یہ سب لوگ، میں نے کوچوان سے کہا،

ہمارے دشمن ہیں۔ اسکول میں ہندوستانی لیڈروں کے متعلق انگریز اور اینگلو انڈین لڑکیاں یہی کہتی تھیں کہ چوان نے چونک کر میرے سہرے بالوں کو ٹوٹس کیا اور خاموش ہو گیا۔

”اس کے دو تین برس بعد کا ایک قصہ سناؤں۔“
”اچھا اب باقی پھر۔“

”ایک ڈچ یہودی تاجر کو ماما کے ایک شناسا کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ کام چلاؤ نرسنگ سے بھی واقف ہیں۔ وہ بوڑھا آدمی سا تھا ایسٹ ایشیا کے دورے پر نکل رہا تھا اور دل کا مریض تھا۔ اس نے ماما سے معلوم کروایا۔ بطور نرس کمپنیں ساتھ جانے کے لئے فوراً تیار ہو گئیں۔ چنانچہ ہم لوگ سیاحت پر نکلے۔ ماما فلومینا۔ میں اور وہ ڈچ مین۔“
”پہلے پھر اس گئے۔ وہاں سے کولمبو۔ رنگون۔ سنگاپور۔ اس دورے میں میں نے برٹش ایمپائر کے رومانس کا نظارہ کیا۔ لائیڈز آف لندن اور طامس ٹگک کے دفتر۔ بی۔ اینڈ۔ او۔ کے جہاز۔ کونویل کلب۔ بنگلے۔ پلانٹرز کی گارڈن پارٹیاں۔ ”یورپینز اوٹلی“ کلبوں میں ماما اور فلومینا نہیں جاسکتی تھیں۔ میں بحیثیت یوریشین مزے سے اس ڈچ مین کے ساتھ چلی جاتی۔ اور وہاں بیٹھ کر ٹوب آس کریم کھاتی۔ میں چاہتی تھی لوگ مجھے ایک نیٹو ناچ گرل کمی اولاد کے بجائے یورپین لڑکی سمجھیں۔ ماما اور میری ذہنی دیناؤں میں کتنا فرق تھا اس کا اندازہ مجھے رنگون جا کر ہوا۔“

اچانک عندلیب بانو الاپنے لگیں۔ ”میرے پیارے رنگون۔ وہاں سے کیا بے ٹیلی فون۔“ منصور نے ایک بار پھر اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ لیکن پھلے تین روز سے انھوں نے نواب بانی کی داستان مختصراً اس کو سنا نا شروع کی تھی اور اب منبر بیگ اور ان کے غیر متوقع پرفلمی گیت اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے

لگے تھے۔ ماضی جادو کی طرح سر چڑھ کر لوٹا ہے۔

عندلیب بانو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ہنس پڑیں۔ ”یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میرا اسکاٹش بوائے فرینڈ ۱۹۴۲ میں برا فرنٹ پر گیا رنگون سے اس کا ٹیلی فون کبھی نہ آیا۔ خیر۔ تو میں کہاں تک پہنچی تھی؟“
 ”۱۹۲۶۔ آپ رنگون گئیں۔“
 ”ہاں۔ کولمبو سے رنگون۔“

”مما کہنے لگیں۔ میں جہاں پناہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گی۔ میں نے پوچھا کون جہاں پناہ؟ زور سے چلائیں؛ حضرت بہادر شاہ اور کون۔“

”ایک روز اس متولی سے چوبلی دو منزلہ مکان کئی زیارت کے لیے پہنچیں جہاں بادشاہ کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ بولیں ہائے ہائے دکھیا کو دس روپے روز خرچے کے لیے دیتے تھے حرام زادے۔ لعنت۔ میں سمجھ گئی انگریزوں کو گالیاں دے رہی ہیں۔ مجھے بہت برا لگا۔ میں نے منہ پھلایا۔ میں اسکول میں ہسٹری پڑھ رہی تھی اور ‘SEPOY MUTINY’، بلیک ہول وغیرہ سب ازبر تھا۔“

”مگر ماما کی ہسٹری دوسری تھی۔ وہ ان کے دل پر ان کے خون دل سے لکھی گئی تھی۔ اس وقت میں نہ ماما کو سمجھ سکی نہ ان کے آنسوؤں کی قیمت پہچان پائی۔ رونا تو ان کی عادت ہی تھی۔ اور لعنت تیکہ کلام۔“

”پھر ہم بادشاہ کے مزار پر گئے۔ وہاں ان کے پڑ پڑتے شہزادہ سکندر نجف نہایت خستہ حال، مجاور بنے بیٹھے تھے۔ ایک آدمی نذر نیاز کی روٹیاں لایا۔ وہ نوش کرنے میں مشغول ہو گئے۔ ماما نے بچشم پر ہم ان کو صاحبِ عالم کہہ کر مخاطب کیا اور نذر پیش کی۔ مجھے بیباختہ ہنسی آگئی۔“

”تب ماما نے پلٹ کر ایک زوردار تھپڑ مجھے رسید کیا۔ میں بھونچکی رہ گئی۔ ماما

دو کوب تو ہمیشہ کرتی رہتی تھیں مگر اتنی طاقت اور جوش سے کبھی نہ مارتھا۔
 ”میں بچنا کر ٹہلتی ہوئی جا کے ایک جنگل سے ٹک گئی۔ فلومینا منہ اٹھائے سیر کا
 درخت ملاحظہ کر رہی تھی۔ جو سبکی کے مزار کے سرھانے کھڑا تھا۔
 ”یہ جنت کا درخت ہے۔ مزار پر اگر تیاں سلگاتے ہوئے ایک برمی مسلمان
 نے فلومینا کو مخاطب کیا۔

”ایسا؟ اس نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ بڑی انگریز پرست عورت تھی مگر
 اس وقت وہ بھی متاثر نظر آرہی تھی۔

”ممانے مزار کے تعویذ پر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں ٹکا کر فاتحہ اور دعائیں پڑھیں۔
 فلومینا نے بھو اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ممانے میری کے چند پتے قبر پر سے
 جن کتر کا اپنے پرس میں رکھ لیے۔ اپنے بوریہ نشین ”صاحبِ عالم“ کے سامنے کوئرش
 بجا لاکر رخصت ہوئیں۔ واپسی میں راستے بھر ظفر کی المناک غزلیں اپنی بے سُرِی آواز
 میں گنگنایا کیں۔ وہ میری ولادت کے کچھ عرصے بعد ہی بے پور میں اپنی آواز کھو چکی تھیں۔
 شاید راحت بائی کی لڑکیوں نے پان میں سیندور کھلادیا تھا۔ یا کیا۔ کلکتہ پہنچ کر ایک
 روز شدید ڈپریشن کے عالم میں اپنے قونو گراف ریکارڈ چکنا چور کر دیے تھے۔ دوکانوں
 پر شاید ان کے ریکارڈ ملتے تھے لیکن فلومینا کو حکم دے رکھا تھا۔ خبردار جو میرا کوئی تو آخرید
 کر اس گھر میں لائی۔ لہذا مجھے ان کی سابقہ شان و شوکت کے افسانوں کی طرح یہ بھی
 یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایک ماہر فن گائیکہ رہ چکی تھیں۔ دراصل ممانے کسی گریڈ ٹریڈی
 کا سا کردار تھیں مگر مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا۔

”چنانچہ سرمہ درگلو نواب بیگم ظفر کے اشعار گنگناتی رہیں اور میں ان کے غیر متوقع
 تھپڑ کے غم و غصے سے تلملایا کی۔

”میرے اور ممانے کے درمیان زیرِ دست ٹنشن کا آغاز چند روز قبل کلکتہ ہی میں ہو چکا تھا۔
 میں چودھویں سال میں پڑھ رہی تھی۔ اور مصائب کی وجہ سے پچی پنچوٹ ہو چکی تھی۔

”ٹین ایگز کی فطری بناوت کے علاوہ یہ عقل بھی آگئی تھی کہ مجھے کس قسم کی ٹریننگ دے رہی ہیں۔ اس زمانے میں شریف زادیاں ناچ نہیں سکتی تھیں یہ محض ارباب نشاط اور کلکتہ میں یوریشین طوائفوں کا فن سمجھا جاتا تھا۔ آئٹ گوہر کے منع کرنے کے باوجود مائے مجھے ایک خاموش فلم کے گروپ ڈانس میں بھرتی کروا دیا کیونکہ اس کے پیسے اچھے مل رہے تھے یہ اطلاع کہ ایک ایسی فلم میں ناچ رہی رہی ہوں کالونٹ کی مدر سپریر کو مل گئی انھوں نے ماسے جواب طلب کیا۔ مائے فوراً اسکول سے میرا نام کٹوا دیا۔ میں اپنے جونیئر کمبرج کے امتحان کی تیاری میں بے طرح مشغول تھی۔ ایک روز حسب معمول یونیفارم پہن، بستہ سنبھال اسکول جانے کے لیے زینے سے نیچے اتری رکشا والا نثار د۔ اس وقت ممدروازہ پر آئیں اور آواز دی۔ بس بیوی آج سے تمہارا اسکول القسط۔ اب اپنی اوقات پر آؤ۔

”میرا خون خشک ہو گیا۔ ان کا منہ تلکنے لگی۔ سرد آواز میں بولیں۔ اپنے توڑے پنجنہ کرو اٹا اللہ پہلے فجرے کی سانی آگئی ہے۔

”میرے اوپر بجلی سی گری۔ والدہ کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ کشادہ چوٹی زینے کی بیٹنگ پر دونوں ہاتھ رکھے مجھے گھور رہی تھیں ان کے پیچھے لینڈنگ پر بیہودی لینڈ لارڈ کا گریڈ فادر کلکاک کالے بھوت کی طرح دانت نکوسے کھڑا تھا۔ دروازے میں فلوئینا کا پریشان چہرہ نظر آیا۔ نیچے جو دروازہ تھا وہ لوریٹو کی سمت جانے والے راستے پر کھد ہوا تھا۔ اوپر نواب بائی ٹائیکہ مسلط تھی۔ اس کے عقب میں میری ہمدرد مگر بے بس فلوئینا۔ میں زینے کے وسط میں دو دنیاؤں کے درمیان معلق۔ بیتہ پھینک کر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ممدو دھم دھم کرتی اتریں ہانہہ کپڑ کر کھینچا۔ چل اوپر سیڑھی طرح حرامزادی ورنہ ساری بس صاحبی نکال دوں گی۔ ایک تھپڑ۔ میں وہیں چل گئی۔ فلوئینا۔ فلوئینا۔ میں نے چیخ چیخ کر مایاں می گرفت سے آزاد ہونا چاہا۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئیں کمرے میں مقفل کر دیا۔ فلوئینا کی خوشامد پر رات گئے

نالہ لھولا۔ اسے جد ہی ممانے سنگاپور وغیرہ کے دورے پر نکلنا طے کیا تا کہ میرا جی بہل جائے۔ ماما کے بجائے محبت کی پتلی فلومینا کو زیادہ چاہتی تھی اب اپنی ماں سے باقاعدہ نفرت سی کرنے لگی۔

”میرے اور ماما کے درمیان یہ سرد جنگ ایک رات عروج پر پہنچ گئی۔ سنگاپور میں۔“

”جہاں آپ نے بیٹیوں کے سرخ دروازوں والے گھر دیکھے تھے۔“

”ہاں۔ اے بیٹا تمہیں کیسے معلوم؟“

”اس شام آپ کھڑکی میں سے عبیر کو بتلا رہی تھیں جب میں اپنے آلات لینے واپس آ پہنچا تھا۔“

”راہیٹ۔ تو سنگاپور میں مشہور انگریزی ہوٹل رنفلز میں ٹھہرے جس میں سمرسٹ نام نے اپنے ناول لکھے تھے۔ وہ ہوٹل انٹرنیشنل طوائفوں کا ڈاکا بھی تھا۔ مشرق و مغرب کی حسین ترین چھوکریاں وہاں منڈلائی نظر آتی تھیں۔“

”اُسی دور کے شنگھائی اور ہانگ کانگ کی طرح۔“

”ہاں۔ سنو تو۔ رات کو ماما ڈائننگ ہال سے لوٹیں۔ اب تک وہ کام چلاؤ انگریزی بولنے لگی تھیں۔ میرے اور فلومینا کے کمرے میں توبہ تلا کرتی داخل ہوئیں۔ توبہ تو بیعت۔

THIS HOTEL FULL OF LOOSE WOMAN

I DON'T LIKE LOOSE WOMAN

”میں نے پلٹ کر تلخی سے سوال کیا۔“

AND WHO DO YOU THINK YOU ARE ?

”ماما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نجائے کیوں مجھے مارنے پٹینے کے بجائے چُپ رہیں فلومینا نے ان کا کوٹ اٹھا کر وارڈروب میں ڈانگا۔ پلٹ کر ایک لمحے کے لیے ساکت رہی پھر پتلی کی طرح دبے پاؤں چلتی میرے قریب آئی اور میرے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید

کیا۔ میری قوت گویائی سلب ہوگئی۔ غلامیٰ نے مجھے بے انتہا لاڈ پیار سے یالا تھا۔ اور
پر جان چھڑکتی تھی۔

”اب اس نے کمرے میں گشت کرتے ہوئے آتش بار آواز میں کہنا شروع کیا۔
”لک بیو۔ مس سپیریہ۔ تم اپنی اینجل مدر کو کیا بولا؟ پھر سے بولو۔ تم اپنی ماما سے ماچھی
انگو۔ سوری بولو۔ سوری بولو۔ تمہارا مدر تمہارے واسطے کیا کیا مصیبت اٹھایا۔ کیسا
ٹرل دیکھا۔ تم اس کو LOOSE WOMAN بولتا؟ تم کو مالوم تم کو BEST اسکول میں
بیچنے واسطے تم کو LUXURY میں رکھنے واسطے وہ جبر جتی ایسا لائف LEAD کرتا۔

”میری پیدائش سے پہلے کون سی لائف لیڈ کر رہی تھیں؟ میں نے پھر کس سوال کیا۔
”شرٹ اپ یونانی گرل۔ وہ جو کچھ کیا مجبوری کیا۔ ہم تم کو کتنے بار ان کا اسٹوری
بتایا۔ اینڈ یہ تمہاری FATE میں لکھیلا تھا کہ تم ان کے ہاں جنم لو۔ ہم بے عقل
جانور لوگ ہے۔ ہمارے کو مالوم اچ نہیں ہمارا HEAVENLY FATHER ہمارے
کیا سوچتا۔ کیا کرتا۔ اچانک وہ آنسو بہانے لگی۔ بڑا بڑا بات نہیں کرنا مانگتا میرا بچہ۔
جب ہم بنیڈرہ بویمے کے ORPHANGE سے شادی بنا کر اپنا الفرڈ کے سنگ
جے پور گیا تھا الفرڈ و مہاراجہ کا ہیڈنگ تھا۔ ہم بھی بڑی شان مازتا تھا۔ اپنے کو پورچکیز
میم صاحب بولتا تھا۔ اپنے کو پورچکیز میم صاحب بولتا تھا۔ ہمارا گریٹ گریڈ فادر بھی
پورچکیز وائٹ مین تھا۔ BUT? THEN? میرا الفرڈ و جوان مر گیا۔ میرا دونوں بی بی مر گیا
میرے کو آیا گیری کرنا پڑا۔ پھر؟ THEN؟
”بڑا بول کبھی نہیں بولنا مانگتا۔ اینڈ می بابا۔ گوڈ کو بھی سوری بولو۔ ماما کو بھی
سوری بولو۔

”مجھے آج تک غلامیٰ ڈی کوٹسا کی یہ تقریر لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ مگر میں گوڈ سے
بغاوت شروع کر چکی تھی چاروں طرف اتنی بے انصافیاں اور مظالم دیکھنے کے بعد ایک

شفیق و کریم، منصف عادل، جبیر و بصیر قادر مطلق کا وجود سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج تک نہیں آیا۔

”بیسک صاحب۔ کھانا لگ گیا۔“ بہادر نے دروازے میں جھانک کر آواز دی۔
 ”آؤ۔“ عندلیب بانو کی شربت پی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے تھے۔
 ”عینہ کا انتظار تھوڑا اور کر لیں۔“

”اس نے فون کیا تھا شام تک آئے گی۔ سیریرین کیس ہے۔ چلو تم کو یہ قصہ سنا کر آج ختم کروں۔ اس وقت فلوینا یاد آگئی۔ اپنی رفیقہ القلب ماں کے رُخسار کے طور پر خاصی غیر جذباتی خاتون ہوں مگر اس وقت جی بھر آیا“

پنج کے دوران عندلیب بانو نے کہانی جاری رکھی: رنگون میں مزارِ ظفر پر جانے کا قصہ سنایا تھا نا؟ اس طرح کا ایک دردناک واقعہ کلکتہ میں پیش آیا۔
 ”ہم لوگوں کو — لوگ موتی کی مچھلی نوش کرو۔ بڑی خوش نصیبی کی علامت ہے۔“
 ”اسی کا تو شاہان اودھ نے اپنا طفر بنایا تھا۔ آپ بھی تو لیجئے۔“
 ”تاکہ خوش نصیب ہو جاؤں۔؟ بابا بابا۔ ہاں تو ہم لوگوں کو سنگاپور وغیرہ سے لوٹے چند روز ہوئے تھے کہ دلی سے مہرو خالہ مع شمو خالہ اور نواسی چھتو آ پہنچیں۔“
 ”ٹھیک چاہئے۔ میں ذرا ورک آؤٹ کر لوں۔ مہرو خالہ اس روز آپ نے بتایا تھا۔
 دلتوا عرف جتن بنی کی بہن۔ مگر شمو یا د نہیں رہیں اور چھتو۔“
 ”ان کی لڑکی اور نواسی اور بیٹا شدرو۔“

”آپ نے یہ داستان مجھے بالکل شارٹ سینڈ میں سنائی ہے۔“
 ”اے تو بیٹا کیا میں بوتان خیال گوش گذار کر رہی ہوں اور قبنا مجھے نما اور فلوینا نے بتایا وہی دہرا رہی ہوں۔ تفصیلات مجھے بھی نہیں معلوم۔ اپنی تو تم کو ہر قطر سنا رہی ہوں — ہاں تو یہ دلی والیاں آئی تھیں۔ عالی جاہ نواب بہادر مرشد آباد

کے ہاں ایک جلسے میں گانے گاتا تو محض چھنو کو تھا۔ ماں نانی اور ماموں ہمراہ آئے تھے۔ مہر و خالہ اور شمو خالہ کو کبھی کبھار خط لکھتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ کلکتہ پہنچتے ہی دوسرے روز ملنے آئیں۔ مہر و خالہ آن بان والی تورہ بیٹی بیوی تھیں۔ بتاتی تھیں غدر کے وقت چھ برس کی بچی تھیں۔ اب پچھتر سال کی رہی ہوں گی مگر مضبوط کاٹھی کی کھری منحل زادی۔ کڑی کمان کے تیر جیسی چال۔ عمر سے دس سال کم لگیں۔ اودھی محل کا تنگ پانجامہ۔ فلائین کی قمیص۔ کشمیری شال۔ ناک میں ہیرے کی بڑی سی لونگ۔ مہا کی طرح بارعب شخصیت۔ شمو جانے کس چٹقنات کی اولاد تھی۔ اس میں عایانہ پن تھا جھنوجان تیز طرار۔ بڑی شکل۔ دیکھو تیسری پڑھی تنک پہنچ کر وہ — مرزا عثمان بیگ غائب ہو گئے۔

”عالی جاہ کے جلسے کے بعد ایک روز آئیں مہر و خالہ تو کہنے لگیں۔ جلسے میں حضرت جانِ عالم کے ایک پوتے سے معلوم ہوا کہ حضرت بہادر شاہ کے ایک قیمتی پیر پڑ پوتے شہزادہ بیدار تخت برائے آگئے ہیں۔ دیکھا کونگون میں آٹھ روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ اپنے نانا کے ساتھ میٹا برج کے ایک بوسیدہ کمرے میں مقیم ہیں۔ وہ حضرت جانِ عالم کے پوتے بتلا رہے تھے کہ صاحبِ عالم کے والدین کی جوانمردی کے بعد گورنمنٹ نے ان کا مکان ضبط کر لیا۔ ایک ڈبہ تھا اس میں بڑی بڑی کنجیاں تھیں۔ منحل دینیوں کی — کنجیاں حضرت بہادر شاہ ساتھ لے گئے تھے۔ دینے یہیں رہ گئے۔ برا کے انگریز حکام نے وہ کنجیاں بھی چھین لیں۔ حضرت بادشاہ سلامت کا کلام، کتابیں ہر چیز برباد کی۔ دس ماہ کے نواسے کو لے کر ان کے نانا یہاں آگئے تھے۔ کلکتے میں گورنمنٹ نے ان کی پنشن سولہ روپے مہینہ مقرر کی۔ سبے غضب۔ مہر و خالہ نے کہا۔ ارے چنگیز کی اولاد کہلاتے ہم تھے۔ چنگیز ہلاک کی ذریت تو یہ ہیں حرام الدہر فرنگی۔

”مہا بولیں۔ جناب عباس کا علم ٹوٹے۔ ان پیارے بیٹوں پر۔ اے مہر و خالہ

میں توجب بھی لاٹ صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گذرتی ہوں یہی دعا مانگتی ہوں۔
”میں ان دونوں کے اس مکالمے پر زیر لب مسکرائی۔

”خیر تو دوسرے روز ہم لوگ دو کاڑیوں پر لد کر شیا برج پہنچے۔ مہرو خالہ حبیبی خیس خاتون خور و سال شہزادہ بیدار بخت کو چند اشرفیاں نذر کرنے لے گئی تھیں میں اور چھتو، ماما، شمو خالہ اور مہرو خالہ کے مقابلہ کی سیٹ پر بیٹھے۔ کوچ کبس پر مہرو خالہ کا مہر بیٹا شدتو خالہ جواب چاؤڑی کا چودہری تھا۔ دھاڑیوں کا سردار چودہری فتنے کا جانشین۔

چنانچہ بیدخل مغلوں کا یہ قافلہ اپنے بیدخل بادشاہ کی بیدخل اولاد کی خدمت میں حاضری دینے جا رہا تھا۔ مہرو خالہ غدر کے قصے سناتی رہیں۔ سرائے طفول بیگ میں ان کے خاندان کا قتل۔ جننا کی ریتی اور کوتوالی کے چبوترے پر ہزاروں لمانوں کو پھانسی۔ یا گولیوں کی باڑھ یا توپ کے منہ سے باندھ کر اڑایا جاتا۔ بادشاہ ملکہ اور شہزادہ جواں بخت کی رنگون جلا وطنی۔

”پھر مہرو خالہ بولیں۔ عالی جاہ کے ہاں کل وہ اودھ کے شہزادے بتلا رہے تھے کہ جب حضرت سلطان عالم نے موتیوں سے بھرا ہوا اتھال نذر کرنا چاہا۔ ان بد معاش انگریزوں نے وہ بھی قبول نہ کرنے دیا۔

”یہ دیکھنا بچہ شہزادہ بیدار بخت شہزادہ جواں بخت کا پوتا ہے۔ ہائے کس مصیبت میں پڑا ہے بے چارہ۔ لعنت۔ لعنت۔ ماما نے دہرایا۔

”میں ان دونوں کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ یہ لوگ سب مغل ایمپائر کے مجاور تھے، ادھر شیا برج والا۔ یہ کنگڈم ان اودھ کے راونے اور مرثیہ خواں۔ ٹالی گنج میں ٹیپو سلطان کی اولاد سلطنت خداداد میسور کی نوحہ گر۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر مرشد آباد والے اپنی عظمت رفتہ پر آہیں بھر رہے تھے۔ اس گھوڑا گاڑی میں ماما اور مہرو خالہ آبدیدہ شمو خالہ مغموم۔ لیکن چھتو تو یامس ۱۹۲۶ء بے پردہ۔

ہوئی ہے اسیں۔ اور یہ تو بتائیے مہر و خالہ میں ہسٹری پڑھی ہے۔ لورڈیو ہاؤس میں۔ اس نام سے میرے دل پر چھری سی چل گئی مگر مضبوطی سے بولے گئی۔ دلی کو تو دراصل نادر شاہ اور احمد شاہ نے تاراج کیا تھا۔

”۱۸۳۰ء میں۔۔۔ میں کہتی رہی۔ جب لارڈ ایک نے قبضہ کیا اسکے بعد سے تو دلی پھر سے بسی۔ اور اس نے ترقی کی۔ ماما خود بتاتی ہیں کہ انکے دادا پر دادا شاہی خوشبو ساز تھے۔ انکی عطر کی دوکان چاندنی چوک میں تھی۔ اور وہ ولایتی پرفیوم منگوانے لگے تھے۔ دوکان پر انگریزی میں بورڈ لگا دیا تھا اپنے نام کا۔ غدر سے پچیس تین سال پہلے۔۔۔ ہمارا پشتینی کارخانہ بھی تو گرد سی میں برباد ہوا۔ ماما نے ٹھنڈی سانس بھری۔ آباد کیا دوبارہ اپنی ساکھ تھوڑی سی جما پائے تھے کہ خود چل بسے۔۔۔

”ان کجھت مرزا سبط احمد کا کچھ پتہ نہ چلا جنھوں نے تمہاری جائیداد ہڑپ کی تھی؟ مہر و خالہ نے دریافت کیا۔

”مرزا سبط احمد سے گفتگو ماما کی بے پوری حویلی کے رہن وغیرہ کے قصے کی طرف منتقل ہو گئی۔ میں نے اب شد و ناموں کو مخاطب کیا۔ جو دسترخوان کے کونے پر بیٹھے تندی سے کھانے میں مصروف تھے۔ ان کی اماں مہر و ٹانٹھی تھیں یہ کمزور اور بہرے بھی ہو گئے تھے۔ مگر میں اپنی بات کسی کو سنانا چاہتی تھی۔ کوئی میری بات سننے کو تیار نہ تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔۔۔ شد و ماموں۔

”انھوں نے کان کے پیچھے ہاتھ رکھا۔

”سینے۔ سلاطین زادے جو تھے۔۔۔“

”سلاطین زادے۔۔۔؟ ہاں ہاں۔۔۔ کہو شاہ عالم کی اولاد تھے۔ شاہی

خاندان کے سب لوگ سلاطین کہلائیں تھے۔ کیا ہوا۔؟ غدر سے پہلے ہی افغانوں اور مرہٹوں نے پلٹھین نکال دیا تھا۔ اور روھیلے تھے یا قہر الہی اللہ بخشے ماموں جی بتایا کرتے تھے۔ کپتانی کی سرکار کو دلی ٹھیکے پر دیدی گئی تھی کہ اسکا انتظام

کرو۔ حضرت بادشاہ سلامت کو خود اپنی اور ان دو ہزار سلاطین کی کفالت کے لیے بارہ لاکھ سالانہ ملتا تھا۔ قلعے کے بھاری خرچے۔ سلاطینوں کی عادتیں بگڑی ہوئی — زیادہ تر تو بٹیا بہت تنگ دست تھے۔ قلعے سے باہر رہنے لگے تھے۔

”مرزا بھورے تو بڑی شان سے قلعے میں رہتے تھے۔ ہمارے کا حضرت ان کے مرض بیگی تھے۔ مہرو نے جے پور والی بات ادھوری چھوڑ کر اپنے بیٹے شندو کو مخاطب کیا۔

”آپ لوگ یہ شاہی خاندان شاہی خاندان لال قلعہ لال قلعہ کب تک رٹے جائیں گی؟ میں نے بھنا کر جواب دیا۔ محض اس لیے کہ ایک ناکارہ آدمی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس سے اتنی ہمدردی۔ جن کڑوروں غریبوں کے کنبے صدیوں سے مفلس چلے آ رہے ہیں ان پر ترس نہیں آتا؟ محض کسی شاہی گھرانے سے رشتہ داری سُرخاب کا پر لگا دیتی ہے آدمی میں؟

”وہی سُرخاب کا پر لگا دیتی ہے صاحبزادی جو تم سمجھتی ہو تمہاری بیٹھ میں لگا ہے کیونکہ تم ایک یورپین کی اولاد ہو۔ ایک گورے ٹھگ کی۔ چلتے پھرتے کی اولاد۔ رم جی کتیا۔

”میں لا جواب شرم سے پانی پانی۔ مہرودلی کی شایستہ طوائف تھیں۔ مہاراجہ اس یہودہ گوئی سے جزبہ ہوئیں۔ میری سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو غصے سے پھر کر پھر اپنی بات دہرائی۔ آپ کی چہیتی دلی کو ایرانیوں نے اجاڑا تھا۔ افغانوں اور درویشوں نے غارت کیا تھا۔ وہ لوگ کیا کافر مشرک فرنگی تھے؟ آپ ہی لوگوں کے ہم مذہب تھے۔ ہم لوگوں کے ہم مذہب؟ مہرود خالہ نے ناک پہ انگلی رکھ کر دہرایا۔ اور تیرا کو۔

سامندھب ہے چھو کر سی؟
”میرا؟ میرا کوئی مذہب نہیں۔

”سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
”اور نہ میں آپ لوگوں کا پیشہ اختیار کرونگی۔“

”فرنگی خون کا اثر۔ سمو خالہ نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فیصلہ صادر کیا۔
”اے ہے تو فرنگی خون تو نگوڑی گو تہر میں بھی ہے دیکھو کیسے پیالہ پی کر ڈیرے دار
بنی چلی جاتی دلایت۔ یا رہتی پیموں کی طرح۔ نہیں صاحب۔ لکھنؤ کی ڈیرہ داروں
نے اسے اپنا ہم پلہ نہ سمجھا تو بے چاری نے نوا پچو کی خوشامد کی۔
”ننا آپ بھی تو پیدائشی ڈیرے دار نہیں تھیں۔ آپ نے بھی پیالہ پیا تھا۔؟
چھٹو نے دلچسپی سے پوچھا۔“

”نہیں میرے چاند۔ مہر و خالہ نے نواسی کو جواب دیا۔ اماں منوری نے آپا
بیگماں مرحومہ کو اور مجھے اپنی بیٹیاں بنا کر پالا تھا۔ ہمیں خود بخود وہ حیثیت مل گئی۔
”اب میں نے نوٹس کیا کہ مہر و خالہ کی آواز میں خفیف سے غرور کی جھلک آگئی
تھی۔ اب تک اپنے کھرے شریف مغلیہ حسب نسب کو رو رہی تھیں۔ انسان بھی کیا
چوں چوں کا مرتبہ ہے۔“

”پیالہ پی کر ڈیرے دار کیسے بنتے ہیں۔؟ چھٹو نے اٹھلا کر پوچھا۔
”مہر و خالہ نے بتلایا گوہر نے نوا پچو کے ہاں برادری کی دعوت کی۔
”ضیافت کے بعد پیالہ بھر شربت پہلے نوا پچو کی بھانجیوں نے پھر ان دونوں بھانجیوں
بہنوں نے۔ پھر ساری طوائفوں نے باری باری چکھا۔
”آخر میں اسے گوہر نے نوش کیا اور گویا آنریری ڈیرے دار بن گئیں۔ ڈیرے دار
کے لیے بیٹا شرط تھی کہ سات پشتوں تک اسمیں حلالی کوئی نہ ہو۔“
”یہ بڑے فخر کی بات تھی۔؟“ منصور نے پوچھا۔
”ہر سوسائٹی کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ جب مہر و خالہ نے یہ قصہ سنا یا میرا بھی

یہی ری ایکشن ہوا۔ میں نے طیش میں آکر کہا۔ شرم نہ آئی آنت کو ہر کو۔
 ”پیشہ ور عورتوں کا جھوٹا شربت ایسے پی گئیں کہ سات پشت کی حرامی کہلائیں۔
 غصے کے مارے میرا برا حال۔ میں تو انکو بہت معقول پڑھی لکھی خاتون سمجھتی تھی بیسے
 اندر بہت دنوں سے جو لاداسا ابل رہا تھا اب وہ سطح پر آچکا تھا۔ میں نے دسترخوان پر سے
 اٹھتے ہوئے اعلان کیا آپ سب کان کھول کر سن لیجئے۔ نہ میں آپکا دین قبول کرتی ہوں
 نہ آپکا خدا۔ نہ آپکا پیشہ۔

”میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ چکر اکر گر پڑی۔ ممانے مجھے زور کر تپھڑ لگایا تھا۔ پھر
 لاتوں گھونسوں کی بارش۔ فلو، مہر واد و رشتہ خالہ ماکو نہ روکتیں تو شاید اس روز کی مار
 سے جانبر نہ ہویا تی“

”جوبنگالی ہندو“ غذیب بانو نے دوسری شام داستان آگے بڑھائی ”پچھلی دو
 صدیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کی حیثیت سے بے تحاشا دولت کما چکے تھے۔
 انہوں نے زمینداریاں خرید لی تھیں۔ انکے خاندان کلکتہ کے مرچنٹ پرنس کہلاتے تھے۔
 انہوں نے مرحوم دُبار مرشد آباد کی تہذیب اور طور طریقے اختیار کر رکھے تھے۔
 ”ایک مرچنٹ پرنس نے میرے پہلے جلے کا خرچ اٹھانے کی پیشکش کی۔ ممانے
 انتظامات میں بے طرح مصروف ہو گئیں۔ وہ مجھے بازار کا ایک مولوی صاحب سے
 اردو فارسی بھی پڑھوا رہی تھیں۔

”برآمدے میں درزی بیٹھ چکا تھا۔ زرق برق پوشاکیں تیار کی جا رہی تھیں۔

”رقص کے مردانہ اور زنانہ اصل لباس جو اس وقت تک رائج تھے آج کے کتھک
 ڈریس سے مختلف تھے۔ رقا صبر کا پاجامہ پہنتے تھے۔ مشروع کا۔ گونا بنت لگا۔ انگرکھا

آربانے کا۔ بوٹی دار۔ بالوں میں بچ کی مانگ۔ پٹے۔ دوپٹے کا کرؤس۔ لڑکیوں کی پشتوں کے نیچے بڑکا پاجامہ۔ استانیچا کہ اڑھائی سیر گھنگر کی جوڑی نظر نہ آوے۔ آڑا پاجامہ رائج نہ تھا۔ گھنگر و موری کے اوپر نہیں باندھے جاتے تھے۔ پنڈلیاں ہولہان ہوجاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا جب تک گھنگر و گوشت نہ کھالیں مہارت حاصل نہیں ہوگی۔“

”افوہ۔“ منصور نے کہا۔

”اس سارے بکھیڑے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ طبلہ بجا۔ لہرا شروع ہوا۔ جسم سادھا۔ بھنوس چلیں۔“ اچانک عنذلیب بانو پھر گنگنا نے لگیں: ”کہاں جاگے ساری رات نیناں کسمبری رنگ ہو گئے۔ ایک تو تلنگوا۔ تلنگوا کا پہرہ۔“

دو جے ٹھاڑے جمعدار۔

”میں مقصوری سیکھانا چاہتی تھی۔ کہاں ٹرزا اور کانٹیل کہاں دو جے ٹھاڑے جمعدار۔ گت نکلے اڈھا۔ تال کہروا۔“

”لیکن مسز بیگ یہ تو بہت عظیم آرٹ ہے۔“

”ہوگا۔ ایک روز جلسے کے لیے گھر پر پریکٹس کر رہی تھی ماما کی ایک سہیلی بولیں

نام ٹیلن ہی رہے گا؟ ممانے کہا۔ اور کیا۔

”وہ بولیں اگر یہ بابو کے ٹیلن خانے سے اڑ گئی تو ٹیلن نہ بیٹھ جائے گا؟“

”اے نوج خدا نہ کرے جو میری لڑکی نکلے۔ ممانے چمک کر جواب دیا۔

”شر فار میں اگر لڑکی ماں باپ کے گھر سے نکل کر آوارہ ہو جائے اسے بھاگ جانا کہتے

ہیں۔ طوائفوں کے ہاں الٹا حساب تھا۔ لڑکی نکاح کر لے یا کسی کے گھر بیٹھ جائے تو نہایت

تاسف سے کہا جاتا تھا فلاں کی لڑکی بھاگ گئی۔“

”امی ذرا مختصر کیجئے۔ ابھی ہم لوگوں کو کلنک بھی جانا ہے۔“ عسبرین نے الجھ کر

یاد دلایا۔

”مجھے بڑھاپے کا ANECDOTAGE ہو گیا ہے۔ بھلا میں کہاں تک پہنچی تھی؟“

”نرت سے آپکی روح فنا۔“

”ناقدین فنِ روسا کے سامنے ناچنے کے خیال سے لرزہ چڑھ رہا تھا۔ اس دور کے چند امراء بھی کتھک کے ماہر تھے۔ رامپور کے نواب رضا علی خاں کتھک کے استاد تھے۔“

”واجد علی شاہ کی روایت!“

”ہاں۔ اور مجرے کا جوائیٹی کیٹ محمد شاہ رنگیلے کے دور سے چلا آ رہا تھا اور مجھے مجھے سکھلا رہی تھیں۔ وہ یاد نہیں رہتا تھا۔ یہ ہندوستانی فلموں میں جو SO-CALLED مجرے کے vulgar سین تم دیکھتے ہو آج سے پچاس سال قبل تک مجرے قطعی مختلف اور انتہائی شائستگی کی محفل ہوتی تھی۔ گانوالیاں اپنے معزز سامعین اور بڑے والیان ریاست کے سامنے پان نہیں کھا سکتی تھیں۔ چہرہ ایک طرف کر کے بیٹھہ منہ میں رکھتی تھیں۔ پانی بھی اجازت حاصل کر کے پیتی تھیں۔ نہایت شرعی قسم کا لباس پہننا پڑتا تھا۔ پوری طرح پردے دار۔ نہایت رکھ رکھاؤ اور تہذیب کا پیر تکلف ماحول ہوتا تھا۔ اور کیسے کیسے اہل کمال اس زمانے میں موجود تھے۔ لکھنؤ کی نوابوں کا لکناوت کا بکارت دین کی شاگرد۔ بے پناہ کبر و ناچستی تھیں۔ کون ایسے کی نارجھا اچھم پانی بھرے۔“

”شعبہ مہاراج کس نے حلیم سے مارا نجا را مجھے، شیر طریقے سے بتاتے تھے۔“

”ایسے ماحول میں تو میرا DEBUT ہونے والا تھا۔ دہشت کے مارے راتوں کی نیندیں حرام۔ کبھی سوچتی جو فلو میٹ کہتی ہے میری قسمت ہی میں لکھا تھا اور نہ نواب بانی کے ہاں کیوں جنم لیتی۔ لیکن مجھے یہ قسمت والی بات لغو معلوم ہوتی تھی۔ ان دنوں کلکتہ میں سوویٹ یونین اور سوشلسٹ انقلاب کا بہت چرچا تھا۔ ٹیگور شاید روس ہو آئے تھے یا جانے والے تھے۔ یاد نہیں۔ بولشویزم کا تذکرہ اخباروں میں

چھتارہتا تھا وہ زیادہ پلے نہ پڑتا۔ مگر اتنا سمجھ میں آگیا تھا کہ انسان ایک ان دیکھی مفروضہ اور خیالی آسمانی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنی جدوجہد سے حالات بدل سکتا ہے اور EXPLOIT کیے جانے سے بچ سکتا ہے۔

”لیکن میں اتنی کمسن تھی۔ کیا کر سکتی تھی۔ جلسے سے دور و زقبل رات کو سونے کیلئے لیٹی تو اچانک ایک راہ فرار سوچھ گئی۔ بہت ہی DESPERATE ترکیب تھی مگر اس نا تجربہ کار اور کچی عمر میں وہی ایک راستہ دکھلائی دیا۔

”صاحب پرسوں میں کہاں تک پہنچی تھی؟“

”آپ کو ایک راہ فرار۔“

”ہاں تو میں گجروں اٹھ بیٹھی۔ ماما اور فلو مینا دونوں اپنے اپنے کمروں میں غافل سو رہی تھیں۔ میں نے روشنی جلانے بغیر فرارک پہنا ہیڈ لگائی۔ پرس اٹھایا۔ دیے پاؤں زینہ اتر کر رین اسٹریٹ میں آئی۔ کچھ دور تک دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ ایک رکشا ملا۔ بیڑی اوڑھ لکھا۔

”چند رنگر پچیس میل دور تھا۔ موٹر لاپنج ایک جیٹی پر پہنچی۔ سامنے فرانسیسی پرچم لہرا رہا تھا۔ کانوٹ کار راستہ پوچھ کر پیدل روانہ ہوئی۔ ایک مہربان فرانسیسی نے اپنی موٹر کار روک کر لفٹ دی۔ سینٹ جوزف اف کلونی کی درسگاہ پر جاتا رہا۔

”اندر گئی۔ یہاں ہر طرف فرنچ بولی جا رہی تھی۔ اپنے ان دیکھے باپ کی کلچر کی ایک جھلک نے مضطرب کیا۔ ایک نو عمر نر اپنے دائر کے مطابق سیاہ بادے کے ڈھیلے آستینوں میں ہاتھ چھپائے سر جھکائے دیوار کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ مجسم عجز وانکسار آگے بڑھ کر اس سے بات کی۔ وہ انگریزی سے ناواقف تھی۔ تو ریڈیو میں پڑھی ہوئی ابتدائی فرنچ کے ذریعے سمجھایا۔

چند رنگر کے ایک باشندے موسیو آندر سے رینال کی لڑکی ہوں۔ وہ فرنچ فورن لینین میں شامل ہو گئے

اور صدمے سے بڑھال تھی۔ ایک فادر نے اسکول کے ڈہینگ ہال میں لے جا کر لچکھلایا۔ پھر موٹر میں بٹھال کر کلکتے روانہ ہوا۔ میں راستے بھر خاموش رہی۔ ان لوگوں کی غدار کی پریچ و تاب کھارہی تھی۔ وہ ایک مظلوم گوری لڑکی کو اس نیٹوانڈین غلاط میں واپس پھینکنے جا رہے تھے۔

”اسٹریٹ پر پہنچ کر فادر نے میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ رپن اسٹریٹ کے موٹر پر اتارا۔ میں نے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ دینی رسالے اور راہبات کی سوانح حیات کوڑے کے ڈھول میں پھینک دی۔ چوکیٹ کا ڈبہ نہیں پھینکا۔

”اب تم تو بن گئے ہو CAPTIVE AUDIENCE آج ایک اور تصویر بھی دیکھ لو۔ وہ منصور کو اپنے اسٹوڈیو میں لے گئیں۔ دیوار کے سہارے کھڑے چند کینوس سرکاتے۔ ایک بڑا فوٹو گراف نمودار ہوا۔ پشتوا میں ملبوس ایک پری بیکر کتھک کی ”آند“ کا پوز بنائے، بڑے شوخ تبسم کے ساتھ کیمبرے کو دیکھ رہی تھی۔

”پورٹریٹ اف اے ناچ گرل II

”یا — ڈیمیز فورن لیجین کی ایک رکن۔“ وہ اسٹول پر ٹپک گئیں۔

”ایک روز ہم لوگ فرنیچ فورن لیجین کے متعلق ایک خاموش فلم دیکھ کر آ رہے تھے۔ یوجین پیٹرمن کے ساتھ۔ تو اس نے کہا تھا دنیا بھر کی مصیبت زدہ عورتیں ایک قسم کی ڈیمیز فورن لیجین میں بھرتی ہو جاتی ہیں۔ اپنے نام بدل لیتی ہیں۔ انکی شخصیتیں ماحول تبدیل کر دیتا ہے۔

”مما جا پانی جا رجٹ کی نیلی ساری پہنے بند جو تول پر کھٹر کھٹر کرتی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہم چورنگھی سے گزر رہے تھے۔ میں اپنی ماں سے متنفر تھی۔ اس وقت ترس اگیا۔ یوجین ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے سوچا۔ معصوم شریف زادی نواب فاطمہ کیسی رہی ہوگی۔ کیا سے کیا بن گئیں۔ پھر

بھی کتنی بہادر کیسی امید پرست۔ سمجھ میں آنے نہ آتے۔ فریچ فورن لیجین کے متعلق ایک فلم نہیں چھوڑتیں۔ محض اس موسوم، احمقانہ توقع پر کہ شاید کسی سین میں موسیو آندرے رینال دکھلائی دے جائیں۔

”یو جین نے بتلایا تھا ان فلموں کی شمالی افریقہ میں لوکیشن شٹنگ ہوتی ہے۔“
 ”یوں بھی اس کو لو نیل دور میں فریچ فورن لیجین ایک بڑی روٹینک چیز سمجھی جاتی تھی۔
 دراصل، ہما، فلو مینا اور میں — تین مضطرب دکھی رومان پرست روجین تھیں۔ نگلش اور اردو بایسکوپ دیکھنا ہمارا محبوب مشغلہ — یو جین — عرف اندرا دیوی بھی ہمیں فری پاس بھجواتی رہتی تھی وہی رُوسی لڑکی جسکا نوٹو گراف ڈرائنگ روم میں رکھا ہے۔ آٹ گوبر کے ہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“

”وہ عجیب زمانے تھے۔ مہر منیر چودھرائیں لکھنؤ کے نام سے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ یہودی نژاد گوبر جان کی مجالس محرم کے تھے چاندی کی طشتروں سمیت تقسیم کیے جاتے تھے۔ اور گوبر ہی نے مجھے ’ولایتی ناچ‘ سکھوایا — جو اس زمانے میں کلکتہ اسٹیج پر بہت مقبول تھا۔“



(۱۸)

ولایتی چکر

”چلبے والی ملکہ —“

”ایک اور پری چیم سے نکلی — پٹاری سے!“

”— بہترین بھاؤ بتاتی تھی۔ اس کی سوتیلی بہن جَدَن —“

”سوتیلی —؛ میرا مطلب ہے — میرا خیال تھا کہ اس سوسائٹی میں سب ایک

دوسرے کے نصف بہن بھائی۔ مطلب ماں ایک اور — یعنی کہ —“

”ملکہ اور جَدَن ایک سپردائی بلبلہ نواز کی بیٹیاں تھیں۔ گوہر نے جَدَن کو گروم کیا۔“

”سپردائی سر مختصر نوٹ —“

”تم کو ایک موڈرن باشعور انسان سمجھا تھا۔ نکلے تم بھی شیخ عبدالباسط گولے والے۔“

”استغفر اللہ آپ تو خفا ہو گئیں۔ اچھا ملکہ اور جَدَن —“

”ایک سپردائی کی لڑکیاں تھیں —“

”وہی تو پوچھ رہا تھا۔ سپردائی کیا —“

”پاتروں کے ایک گاؤں چلبلا، ضلع الہ آباد کے ایک سپردا —“

”وہی تو پوچھ —“

”تم ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے ہاں ذات بندیاں کیں۔ بے مثال فنکاروں کو

’میراثی‘، پکار کر حقیر سمجھا۔“

”میدیلول یورپ میں بھی تماشا گروں کو ٹاٹ باہر سمجھا جاتا تھا۔ اب ہم اعلیٰ

سرکاری اعزازات —“

”اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تم اس کی شادی ایک ماہر فن گوئیے سے کر دیتے؟“
 ”پچاس ساٹھ سال میں تو پرانے تعصبات اور رویتے مٹ نہیں سکتے اچھا سپردا۔“
 ”اس ذات بند سماج میں خود ان کے ہاں زبردست کاسٹ سسٹم موجود تھا۔“
 ”بس تو آپ خود ہی سوچیے۔“

”بلند پایہ گویوں اور منت کڑوں کا طبقہ علیحدہ تھا۔ بلنورہ بند میراثی برتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی عورتیں سخت پردے میں۔“
 ”سٹریٹنگ۔ لٹلڈ۔ سپردا۔“

”گلنے والیوں کے سازندے۔ اکثر ان کی لڑکیاں بھی پروفیشن میں شامل۔“
 ”آئی۔ سی۔ واقعی یہ بھی ایک علم دریا ہے۔ اب جڈن بائی اور جلیلی ملکہ بتائیے۔“
 ”جلیلی والی۔ جب بیگیا جان کے باپ جگنو خاں کچن۔“
 ”کچن سمجھاتی چلیے۔“

”تمہارا رویہ تمسخر کا ہے۔ کیونکہ تم زندگی کے بازار سے ناواقف ہو۔ ہٹاؤ۔“
 ”پلیز۔ گوہر جان تو رہی جاتی ہیں۔“

”نیو فونی کی باتیں جو کیے جا رہے ہو۔ گوہر کی ماں دوسری ملکہ جان تھیں۔ بنارس۔
 دراصل ارمنی۔ بنارس میں کسی انگریز کے ہاں آیا گیری کرتی تھیں۔ وہ شخص گوہر کا باپ
 بنا تو ماں بیٹی کو بے سہارا چھوڑ کر غائب۔ ملکہ بے چاری ایک ارمنی نائیکہ کے ہتھے چڑھ گئیں
 ناچ گانا سیکھا۔ اور اکیڈمک اردو فارسی جو اعلیٰ کورٹی زن کے لیے لازمی تھی۔ شعر کہنے
 لگیں۔ استاد نہایت ٹپکل رہے ہونگے۔ حکیم ہو صاحب ہلال بنارس۔ کاشی میں رہیں
 پھر کلکتہ آگئیں۔ وہاں یوریشین، یہودی، ارمنی اونچی طوائفوں کی کثرت تھی لیکن ملکہ جان
 کی دھوم مچ گئی۔ اصلاً ارمنی یہودی تھیں۔ یوروپین لباس پہنتیں۔ میم صاحب کہلاتی
 تھیں۔ سید ذہین اور ٹیلنڈ سیلف میڈ کریوومن۔ مسکراؤ مت۔“ سٹریٹنگ ذرا جوش
 سے اٹھ کر اندر گئیں ایک خستہ کتاب پڑھتی واپس آئیں۔ ”کلکتہ میں ٹیپو سلطان کے
 پڑپوتے پرنس ابراہیم شاہ رسا انکے ایک سرپرست تھے۔“

”طاؤس درباب آخر!“ منہور نے آہ بھری۔

”نہیں۔ موسیقی رزم و بزم کا جزو تھی۔ ٹیپو کی فوج کے مارچنگ سونگ کوئی ہنڈول میں باندھا گیا تھا کوئی جنگلہ۔ بھیرو۔ سارنگ۔ گوری کلیان۔ پرنس ابراہیم شاہ ہی نے انٹ گوہر کو بتلایا تھا۔ ایک فوجی ترانہ تھا۔ ملک ہندوستان کا دیں میں وہی سلطان ہے۔ غرق جس کی آبِ خنجر میں فرنگستان ہے!“

”واہ۔!“

”اور غزلیں آہستہ قدم۔ جلد قدم۔ طلوع صبح۔ وقت شام۔ وقت طنبور دوم کوچ۔ اور جانے کیا کیا لیکن تم نے پھر میری بات کاٹی۔ خیر تو ۱۸۸۶ء میں یہ مخزنِ آفتِ ملکہ چھپا۔ اکثر شعر نہایت ادق سے لکھا حسابِ خلق کا جو کلک مرگ سے۔ تھا حرفِ کن سے رابطہ روز شمار کا۔ اور۔ خیر یہ تو آسان ہے۔ عجب حکمت سے خاکِ لامکاں بنیاد میں ڈالی۔ بنایا جب خدا کے قصد نے ایواں رسالت کا۔ یہ لو۔ خمیر گرہ کن تھا موجدِ زقار کا جوہر۔ اور سنو۔ چشمِ قناں نقشہ عینِ الیقین ہے صادق کا۔ کسی سراج نے لکھا ہے۔ دیکھو ہے زیبِ محفل مشکل خیالِ ملکہ! اب شہزادہ ابراہیم شاہ کی تقریظِ ملاحظہ ہو:۔ جہانگیر نہیں مگر افسانہ ہے مجنوں نہیں مگر دیرانہ ہے۔ جالینوس نہیں مگر سرزمینِ طوس ہے۔ ناسخ نہیں مگر دیوان ہے۔ میر تقی میر نہیں مگر ذکر ہے۔ نور جہاں نہیں۔ زیب النساء نہیں۔ یہ کارخانہ الہی ہے یہاں جو ہے سوئے عدم راہی ہے۔ مولفہ کو ایک عورت ہے مگر رفعتِ مضامین فصاحت و بلاغت اور سنو آگے۔ صاحبِ دیوان تو ماشا اللہ اور معاذ اللہ۔ انکی ادائیں انکی وفائیں۔“

”یہ ٹیپو سلطان کے پڑپوتے بھی سبحان اللہ۔“

”داغ کے مشہور شاگردوں نے تازنخیں نکالیں۔ ان گنت۔ آج بندے

سے کئی حسن پرستوں نے کہا۔ ملکہ کشور بیداد کا چہرہ کہے۔ عارض انور جاناں کے لیے ہے زیبا۔ معنی آیتِ الشمس کا جلو اکھپے۔ فکر سے زندہ کیے مردہ خیالات بہت۔ ذہنِ ملکہ کو بھی اعجازِ میسما کہیے۔ جسکے چھپنے کا خدائی میں چما ہے اک شور۔ میم صاحب کا وہ دیوان آلو کھا کیے۔

”مہاراج یو دراج بیر برٹھا کر ہرشن سنگھ والی ریاست کشن کوٹ :- بدین نوید
کہ دیوان ملکہ شد مطبوع — مہاراجہ پیدمانند سنگھ بہادر افسر والی ریاست نیلی دھڑک پور
ضلع بھاگلپور :- سنے جب کچھ مضامین ذہن بولا طبیعت علم غایب پر ہے حاضر صفات
اوج معنی کیا بیاں ہوں۔ زبان بلبل سدرہ ہے قاصر۔

”ایک شاگرد آغ :- نقطہ کو اختر فلک کہیے۔ سطر کو خط کہتاں کہیے۔ میں نے
استاد سے اجازت لی۔ حکم نافذ ہوا کہ ہاں، کہیے اسکی تاریخ ہے قیامت کی۔ سخن فتنہ جہان
”بے حساب ارباب نشاط کی تاریخیں۔ بی بیجو صاحبہ پری، طوائف یہودن -
بی بی منجو صاحبہ مشتری طوائف لکھنؤی۔ خورشید جان دہلوی صاحب دیوان -
بی بی شیریں جان شیریں طوائف لکھنؤی۔“

”یعنی طوائف نام کے آگے اس طرح لکھا جاتا تھا جیسے ڈینیٹ یا وکیل!“
”مکھن جان صاحبہ متوطن گیا۔ پردہ غیب میں پنہاں تھا جو سال ہجری۔ کان میں
آگئی ناگاہ۔ فغان ملکہ۔ یہ جلد آنت گہرنے ماکو دی تھی وہ اسکا ایک شعر اکثر دہرائیں
سے اس درجہ خوشخرام چلا کاروان عمر۔ میدان حشر طے ہوں تنو ایک راہ میں۔ دیوان ملکہ
کا دوسرا واحد نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے،

”کلکتہ ہندوستانی میوزک کا گرٹھ بن چکا تھا۔ لکھنؤ اور بنارس کا رنگ غالب
ملکہ بنارسی نے ہولیاں ٹھمریاں دادرے ایسے بنائے آج تلک گائے جاتے ہیں۔
دستور کے مطابق استھانی پوربی یا اودھی میں انترہ فارسی۔ ناہین کرت بات گریات
جات بیابا کہ ملکہ بیقرارم۔ وغیرہ اور بھری گلری موری ڈھرکانی شام۔“

”ملکہ بنارسی مشہور شاعرہ تھیں۔ نامی گائیکہ اور کمپوزر۔
”مگر طوائفوں کے سماج میں بھی کاسٹ موجود تھی۔ چنانچہ گوہر جان جب کالکا
بندادین سے کتھک کی تعلیم لینے لکھنؤ گئیں کیونکہ بے چاری محض فرسٹ جزیشن غیر
حلالی تھیں۔ لہذا انھوں نے پیالہ پی کر۔“

”جی ہاں۔ آپ بتا چکی ہیں۔ مجھے یہ واقعہ بہت اندوہناک معلوم ہوا۔ ایک ذہین طبع

پڑھی لکھی لڑکی اپنی قابلیت اور فنکاری کی بدولت کوئی بہتر مقام حاصل نہیں کر سکتی تھی ؟ ”
 ” آج سے اسی نوے برس پہلے ؟ ہرگز نہیں ۔ اور جڈن کی لڑکی نے آج کل کے
 زمانے میں جو مرتبہ سوسائٹی میں حاصل کیا وہ ایک منفرد واقعہ ہے ۔“
 ” بالکل منفرد بھی نہیں ہے ۔“

” بہر حال ۔ آئٹ گوہر اپنی اس زندگی سے بے حد مطمئن تھیں اور اس سے لطف اندوز
 ہوتی تھیں ۔ آؤ تازہ ہوا میں چلیں ۔“

وہ باہر آکر لان پر پڑی سفید کرسیوں پہ بیٹھ گئے ۔ عینیں باورچی خانے کی سمت سے
 آتی دکھلائی دی ۔ گویا بن دیوی کی طرح درختوں کے جھرمٹ سے نمودار ہوئی ۔ منصور
 نے سوچا ۔ بن دیوی جس کی جھلک جھٹ پٹے وقت دکھلائی دے جاتی ہے ۔ بن دیوی
 جسے انسانوں سے ڈر لگتا ہے ۔

” مغرب میں ” عنذیب بالو نے سلسلہ کلام جاری رکھا ” اس وقت مادام میلبا وغیرہ
 افسانوی ہستیاں شو بزنس میں تھیں گوہر ان کی ٹکڑ کی تھیں ” LARGER-THAN-LIFE “
 ” کم اوڈن امی ۔ آغا حشر انڈین شیکسپیر ۔ گوہر جان انڈین مادام میلبا !“
 عینیں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔

” کیپ کو ایٹ ۔ تم کیا جانو تم نے آئٹ گوہر کو دیکھا ہی کہاں ۔“
 ” ماما ! میں پہلی بار ان سے ملیں بمبئی میں ۔ آئٹ گوہر نے ٹاؤن ہال کے کرسی
 چیرٹی شو میں گایا تھا ۔ سرفروز شاہ مہتہ نے ایسٹ پراکران کی سجد تعریف کی ۔ جو ابا انہوں
 نے بڑھیا انگریزی میں یورپین میوزک پر ایک تقریر کر ڈالی ۔ وہ عربی داں بھی تھیں ۔ کیونکہ
 کلکتہ میں بغدادی یہودی تاجروں کی کثرت تھی اور وہ لوگ ہندوستانی موسیقی کے بہت
 دلدادہ تھے ۔ اچھا جب ایک ایرلنی ان کا GIGOLO تھا فرقر فارسی اڑاتیں ۔ وہ بنگالی
 فرنج انگریزی گانے خوب گاتی تھیں ۔ شاندار اور مدتیخ الما لوی PRIMA DONNA
 معلوم ہوتی تھیں ۔ گھنگریاے چو کلیٹ براؤن بالوں کی الٹی چوٹی ۔ چوڑی دارپا بجامہ

” جب وہ گاتی تھیں والیان ریاست ان کے اوپر سے جاہرات نچھاور کرتے ۔

انکی تو آیا تک ہمیشہ بنارس سائیاں باندھتی تھی۔ سونے کا خا صدان لیے انکے پیچھے چلتی ۔
انکے طبیبی میرے کی انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ بچپن میں میں اکثر انکے ڈرائنگ روم کے ایک کو
میں بیٹھی رہتی جب وہ روساء کو گانا سنا تی تھیں۔ سامعین بڑے بڑے چیک کاٹ کر ان کو
دیتے ۔ جب وہ باہر جاتی تھیں مسلح باڈمی گارڈ ساتھ ہوتے۔ “
” ہوں ہوں “ منصور نے امریکن اسٹائل ہنکارا بھرا۔

” دھرم تلے میں انکی کوٹھی کے پھاٹک پر دو سنگی شیر بنے ہوئے تھے۔ خود بھی شیرنی سی
لگتی تھیں۔ دنگ۔ شاندار۔

” حامد علی خاں نواب رامپور ان کے بڑے قدر دان تھے وہ محل کے اندر بھی بلاتی جاتے
تھیں بیگمات ان کی دلچسپ گفتگو بڑے شوق سے سنتیں ۔

” ہربائی نس فاروقی بیگم صاحبہ پٹھان تھیں۔ گوہر کی دلیری بہت سراہنیں۔ شاہ
پرنس اف ویلنریا ڈیوک اف کنٹا یا انہیں بہر حال وہ لنگڑے شہزادے کہلاتے تھے۔
رامپور آئے۔ ایوننگ گاؤن اور میرے جڑے موزے پہنکر گوہر نے انکے ساتھ بال روم
رقص کیا۔ اسی محل میں جواب رضا لائبریری ہے۔

” نواب حامد علی خاں نے انگلش پرنس کے لیے ایک پلے اسٹیج کروایا۔ گوہر میر وین
ہربائی نس کہا کرتے تھے کیا کروں گوہر تم موٹی بہت ہو ورنہ تم پر عاشق ہو جاتا۔ ایک با
نواب صاحب نے گوہر ڈے منایا۔ سوتوار پیسے ٹکٹ۔ ستر ہزار روپیہ لیکر کلکتہ لوٹیں۔
” انکا ایک فیورٹ دائرہ جسے وہ نرت سے گاتی تھیں۔ سناؤں۔ ہر چہی نگاہوں
کی بر چھی۔ جگر پہ ماری۔ لگی ایسی کاری، ارے ہم نے ملانی جو نظر آنکھوں سے ۔ “

حسین بخش کافی لار ہے تھے۔ چونک کر خاموش ہو گئیں۔

” اس روز “ غنبریں نے ٹپکے سے منصور کو مخاطب کیا ” رینڈیلنسی میں ہم لوگ ہندو
کے تضادات کی بات کر رہے تھے۔ امی بھی مجموعہ اضا د ہیں۔ گوہر جان اف کیل کٹا کو آئیڈیلا
کرتی ہیں اور سو ویٹ خلا باز لڑکیوں کو بھی۔ “

انہوں نے سن لیا۔ معاً جی جی اینگلو انڈین ایجنے میں ڈانٹا "پائپ ڈاؤن" چینی چمپاکے پتوں سے پھسل کر بارش کی چند بوندیں ان کے سفید بالوں پر گر گئیں۔
 "مس صاحب میں آئو گوتہر کو اس لیے ایڈمائر کرتی تھی کہ وہ انڈینڈنٹ اور سیما صفت تھیں اور یہ ان کے ولایتی خون کا اثر تھا۔"

"خالص ہندوستانی عورتیں انڈینڈنٹ نہیں ہوتیں؟" غبر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
 "آپ کو تو اپنے ولایتی خون کا COMPLEX ہے۔ شکر ہے کم از کم میں نہیں ہوں کسی قسم کی
 "MIXED BREED"

"ہاں ہاں۔ سید زادی۔ تمہیں کوئی کو مپلیکس بھلا کا ہے گوہر نے لگا۔" عندلیب بانو نے چمک کر جواب دیا۔
 وہ تینوں دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے۔

"کلکتے کے عوام بھی انکی بخونی کی وجہ سے انکی بہت عزت کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ سے اعلانیہ نافرمانی کا طرح طرح سے اظہار کرتیں۔ چوراسے پر تبتی سرخ ہوئی یہ اپنی موٹر کار میں زن سے نکل گئیں۔ انگریز پولیس کمشنر انکی اس قسم کی حرکتوں سے عاجز آگیا تھا۔ آٹے دن جرمانے ہوا کرتے۔ گورنرنگال کے فینیسی ڈریس بال میں خود بھی بھیس بدل کر پہنچ گئیں۔ چند والیان ریاست نے اعتراض کیا۔ گوہر نے انھیں اپنی محفلوں میں آنے کی منہا ہی کر دی۔"

"سننے کی بڑی نمائش میں اللہ آباد گئیں۔ اکبر نے کہا ہے خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے ہوا۔ چنانچہ ایک ایرانی سے نکاح کر لیا۔ اکبر نے فوراً ارشاد کیا ہے مرد خلیج فارس کیسویں جس کے کالے۔ گوہر نے آب اپنی کر دی جسے حوالے۔ اس واقعے کو شاعر سانچے میں کیسے ڈھالے۔ سعدی کا ہاں یہ مصرع لجنوں میں لا کے گالے۔ ہرگز حسد نہ بردم بامنبصے دمالے۔ اِلا

برآں کہ وارد باد لبرے۔ ارے وہ آغا صاحب ابھی ابھی میرے تصور میں آگئے۔ عباس نام تھا نہایت شکیل۔ ہر وقت مالا پھیرا کرتے۔ ایسا لگا جیسے اپنی تسبیح عقیق : اس پردے کے پیچھے سے نکل آئینگے۔ انہوں نے گوہر کو بہت دکھ دیا۔
 ”ان سے علیحدگی کے بعد بہت سے جگ لوائے اور گئے۔“

”جگ لوز سے متعلق ولایتی نادلوں ہی میں پڑھا تھا۔ امریکہ میں ایک انڈین پرنس ملے۔ وہ خود ایک۔ مگر وہ گوہر کے زمانے کے تو نہ رہے ہونگے۔“

”ان بے چاری کو تو مرے بھی آدھی صدی گزر گئی۔“
 ”وہ اتنے قدیم نہیں تھے مگر اولڈ ولڈ کرٹسی اور چارم کے پتلے۔ سنا۔“
 حال ہی میں انکو مافیا والوں نے چلتا کیا۔ یعنی یہ پروفیشن اور مافیا! ڈیڈلی کوئی نیشن اچھا اور بتلائیے۔“

”اب ایک سینار جگ لوز پر بھی ہوگا؟“ عجب نے کوفت سے پوچھا۔

”تم چپ رہو جی۔ آپ فرمائیے۔“

”علیکڈھ میں انکا بھرتھا۔“

”ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں؟ گڈ ہینونز۔“

”ڈونٹ بی ڈانٹ۔ ضلع کے ایک رئیس کے ہاں۔ بہت زیادہ شوخی سے نہ نہ کر رہی تھیں۔ آگرے کی نامی گرامی گائیکہ زہرہ بانی بھی موجود تھیں۔ بڑی رکھ رکھا والی۔ قتالہ عالم کے عشوے انہیں خوش نہ آئے۔ تنبیہ نہ کرتیں مگر جلسے کے بعد اس آفت جاں نے بانی صاحبہ کی سادگی اور سنجیدگی پر فقرہ کسا۔ انہوں نے کہا۔ بیوہ محض موسیقی میرا ذریعہ معاش ہے۔“

”حساس اور خود دار بھی بہت تھیں۔ اس روز سے حسن فروشی ترک کی۔ باغیہ مزاج کی وجہ سے خرید و فروخت کا قانون البتہ اُلٹ دیا۔“

”اسی زمانے میں وہ وائسرائے والا مشہور واقعہ ہوا۔ آٹ گوہر اپنی چوکرٹی پر دلا چکر میں ہوا کھار ہی تھیں برابر ان کا نیا جگ لوبرا جمان تھا۔ چو بدار پیہ۔“

ہڑا تھا۔ کرسمس سیزن تھا۔ وائسرائے شاید لارڈ ریڈنگ کی چوکیداری سامنے سے آرہی تھی۔ قریب آئی تو گوہر جان نے نیم قد ہو کر لاٹ صاحب کو دوش کیا۔ جواباً لاٹ صاحب نے بھی زپ اتار کر سلام کا جواب دیا۔ گاڑی ذرا آگے نکلی تو ایک اے۔ ڈی۔ سی نے کہا۔ یو ایکسلنی پ نے یہ کیا غضب کیا۔ وہ عورت تو اس شہر کی مشہور طوائف ہے۔

”وائسرائے بہت بھنپا آیا۔ دوسرے روز غیر معمولی سرکاری گزٹ کی رو سے ممانعت کر دی گئی جب تک وائسرائے یا گورنر پبلک میں خود کسی ہندوستانی کو مخاطب نہ کرے کوئی نیٹو wish نہیں کر سکتا۔ اس بات پر اخباروں میں ایک سیاسی مباحثہ شروع ہوا۔ ایک انگریزی اخبار نے لکھا کہ کلکتہ کی طوائفیں عرصے سے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ ۱۸۴۵ء میں کلکتہ کے اخباروں میں انگریز مراسلہ نگار شاکی رہتے تھے کہ اسٹریٹ پر نیٹو ناچ گرلز گھمیں پر ہوا فوری کے لیے نکلتی ہیں ان کی ممانعت کی جاتے۔ اور آج تک وہی حال ہے۔ وغیرہ وغیرہ ” پھر بھی اس عہد کے طائفے گوہر نے بہت عزت حاصل کی تھی۔ دلیان ریاست کے درباروں میں انکو کرسی ملتی تھی۔ بڑی AWARE بیوی تھیں۔ ان کے ڈرائنگ روم ب طرح طرح کے اخبار رکھے رہتے تھے۔ کلکتہ کے سردار و سیٹھوں کا عبرانی اخبار جو عربی رسم الخط میں کلکتہ کے بغدادی یہودیوں کے لیے چھپتا تھا وہ بھی پڑھتی تھیں۔ کلکتہ کا فارسی اخبار جل آلتین۔ شہر کے ارمی اور انگریزی اخبار سب میں نے انھیں پڑھتے دیکھا۔ ان کے جہاں سے میں انگریزی فلمی رسالے مانگ لایا کرتی تھی۔ نیویارک کا ٹوڈیز ویلی۔ لندن کا ایسکوپ اور پکچر شو اور ڈرامہ۔ انکا آخری جگ لو۔“

”یہ ایک افسانے کا عنوان ہو سکتا ہے۔ آخری جگ لو۔“

”چنی لال۔ سوداگر بچہ۔ دیوالیہ ہوا تو زیور ساٹھ ہزار میں گروی رکھ کر اسکی مدد کی۔ ہانگی ساری دولت اور جائیداد ہڑپ کر گیا۔ یعنی ایک اور کلاسیک پٹرن۔ نواب بانی چال باز کے جہاں سے میں آکر تباہ و برباد کلکتہ پہنچیں اسوقت گوہر جان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ چند سال بعد انکا وہی حشر ہوا۔ مطلب یہ کہ بکوتب بھی گھٹا۔ خرید و تب بھی۔“

”کامل مساوات کی دعویٰ دانتی عورت کا روم میٹ جب غائب ہوتا ہے عموماً

خانہ داری کے بل وہی چکاتی ہے۔ اولاد بھی اسی کے ذمے۔ ملکہ ارمنی کو انگریز نے دھوکا دیا۔ انکی بیٹی گوہر کو ہندوستانی اور نواب بانی کو بلجین نے۔ ان تینوں میں اور باعزت، جدید ترین مغربی عورت کی سچویشن میں مجھے تو کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اخلاقیات کے محض پیمانے بدل گئے ہیں۔“

”اسی مولویانہ منطق کی وجہ سے یہاں عورتیں جائیز آزادی حاصل نہیں کسپاتیں،“
 ”جائیز و ناجائیز بھی اضافی اصطلاحات ہیں“

”جب حکومت نے چوگرٹی پر سواری کی ممانعت کی گوہر نے کلکتہ ہی چھوڑ دیا۔“
 ”اس زمانے کا کلکتہ نہایت FASCINATING رہا ہوگا۔“

”ایسا دلایسا۔“ غنڈیبا بانو نے ایک آہ بھری۔ ”شہر سے باہر امرار کے گارڈن ہاؤس۔ ویلنزی کے علاقے میں ان کے عالی شان مکانات۔ پارک اسٹریٹ پر نواب بہادر مرشد آباد کا محل۔ ٹالی گنج میں میپو سلطان کی اولاد۔ بمبؤ و لا میں نواب مظفر جنگ کی۔“
 ”امی سوشلسٹ ہیں“ عنبر نے پھر چپکے سے منصور کے کان میں کہا۔

”شام کے وقت لوگ باگ اپنی اپنی گیمیتوں اور موٹر کاروں میں ولایتی چکر کے چکر لگاتے۔ باغ کے وسط میں انگریزی مینڈ بجا کرتا۔ کلکتہ بڑا انٹرنیشنل قسم کا شہر تھا۔ چائینا ٹاؤن کے چینی۔ تھیٹر اسٹریٹ کے یہودی۔ کولوٹو اور ارمنی ٹولہ کے ارمنی۔ فری اسکول اسٹریٹ کے اینگلو انڈین۔ ان کی حسین لڑکیاں۔ یہ کچھ قانون قدرت ہے۔ کہ مخلوط النسل اولاد عموماً زیادہ حسین ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہی یوریشین لڑکیاں ان دنوں خاموش فلموں کی ہیروئن ہوا کرتی تھیں۔

”وہ رڈولف ویلنٹو کا دور تھا۔ ایک ہینڈ سم پنجابی نوجوان ولایتی فلموں میں کام کر کے مشرق کارڈولف ویلنٹو کہلانے لگا تھا۔ شیخ افتخار الرسول۔“

”اے لیجئے۔ آپ نے پٹاری میں سے ایک اور گڈا نکالا!“

”یہ حضرت قانون پڑھنے ملتان سے لندن گئے تھے۔ بیرسٹر بننے کے بعد انگلش فلموں

بس کام کرنے لگے۔ گارڈن اف اللہ شیمڈواف دی حرم شہر زاد سرپنٹ اف دی ٹائل میں
 لے یہ سب فلمیں یو جینی کے ساتھ جا کر دیکھیں۔ وہ رقا ص بھی تھے۔ اودے شنکر سے
 برسوں پہلے انھوں نے بوڈاپسٹ وی آنا وغیرہ میں ہندوستانی رقص پیش کئے۔ لیکن
 ٹوبزنس کی شہرت چند روزہ ہوتی ہے۔ آج کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔

” شاید ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ شیخ صاحب انگلستان میں ایک انڈین ٹاکی بنا رہے
 تھے۔ لالہ رخ۔ اس کے لیے یو جینی نے مجھ سے کہا۔“

” ارے پھر آپ کیوں نہ گئیں؟“

” ممائی حراست! سترہ سالہ اور نابالغ! ایک دفعہ چند رنگر بھاگنے کا نتیجہ دیکھ چکی
 تھی۔ پھر بھی راتوں کو جاگ جاگ کر بہت منصوبے بناتے۔ بندرگاہ پہنچ کر جہاز پر چڑھ
 جاؤں۔ پھر طرح طرح کی خوفناک ممکنات کا خیال آتا۔ بردہ فروشوں کے ہاتھ پڑ گئی تو وہ
 ٹرل ایسٹ میں اتار لیں گے یا شنگھائی پہنچا دیں گے۔ اگلے سال رینی اسبتھ عرف بیتا دیو
 ایک فلم ایکٹرس تھی وہ انگلستان گئی۔ مس بلبلی اسی طرح تھیٹر میں سہیلیوں کے ناچ اور
 سو کو ناچائیں۔ یہی ذریعہ آمدنی تھا۔ دوسری اینگلو انڈین رقاصوں کی طرح۔ مس بنسن،
 مس ڈورین عرف مس منجری وغیرہ۔ میرا نام بھی اشتہاروں میں چمپتا؛ مس اینڈی رینال
 عرف مس بلبلی جی چاہتا تھا کٹر کی سے کو در خود کشی کر لوں۔“

” ذہنی فرار کا واحد راستہ بائیسکوپ تھا۔ اور وہ اداکار خالص بردمانس۔ گریٹا گاربو۔
 پولائیٹکسی۔ نورما ٹالیج۔ کلارا بو۔ للین گیش۔“

” اگر آپ ٹودی ایکٹرس بن جاتیں تو آپ کی زندگی کچھ مختلف ہوتی؟“

” پتہ نہیں۔ مگر میں ہر قیمت پر مماکے چنگل سے آزاد ہو کر یوریشین ڈانسز کے اس سرکٹ
 سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ انہیں دنوں غالباً ۱۹۳۲ء میں ایک اردو سالے میں اشتہار دیکھا۔
 اے۔ آر۔ کاردار کی طرف سے۔ انہوں نے ایک ٹاکی فلم کمپنی لاہور میں قائم کی تھی۔
 ” اس اشتہار کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں۔“

’تجربہ کار حسین اور چالاک ایکٹرسوں کی ضرورت

’تجربہ کار لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ ایک سو سے پانچ سو ماہوار تک،
’میں نے فوراً درخواست بھیجی والدہ نے وہ خط پکڑ لیا اور مجھے خوب مارا۔

’انہیں دنوں ۱۹۲۰-۳۱ میں سر دجینی نائیڈ و عطیہ فیضی کملا دیوی چٹوپادھیائ
وغیرہ اخبارات میں بیان دے رہی تھیں کہ شریف لڑکیوں کو فلموں میں کام کرنا چاہیے
میں تو شریف بھی نہ تھی مگر ماں کو یقین تھا ایک بار لاہور یا بمبئی گئی اور ان کی گرفت سے نکلی۔
’سلسلہ میں لاہور میں ایک فلم بن رہی تھی۔ اس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی
فلم کا نام افغان شہزادہ اناؤنس ہوا تھا۔ خواجہ حسن نظامی اس کے ڈائلاگ رائٹر تھے!
کلکتے میں ’THE FATAL NIGHT‘ بن رہی تھی مکالمہ نویس مولانا ابوالکلام آزاد!‘

’نوکلڈنگ۔‘

’اور وہ خاموش فلم۔ ڈارک اینجل۔ اے تھیٹف ان پیراڈائیز۔ ڈینرٹ برائیڈ
سیرینیڈ۔ ڈون جواں۔ بولتی فلموں میں ایسا کرٹی۔ برودوے میلڈمی الوماٹ دی ساؤتھیز
راپورٹا۔ ہندوستانی خاموش فلمیں: اندرا دیوی کی عمرتی دلیر۔ سلو خیا کی انارکلی۔
دفعۃً وہ منس پڑیں۔ ’گلوریاسوان سن۔ ویلما بنکی۔‘ شیخ افتخار الرسول۔ !!

”WHERE ARE THE SNOWS OF YESTERYEAR?”

’حسین بخش نے دروازے میں سے جھانکا۔

’اگلے تین چار روز میں میں تم کو باقی داستان بھی سُنا دوں گی،‘ کرسی پر سے اٹھتے
ہوئے بولیں ”میں نے تم سے کہا تھا۔ مہربات صحیح، بلا کم و کاست ہونی چاہیے۔“

لیکن ڈاکٹر منصور کا شعری کے ذہن میں ایک بات کھٹک رہی تھی۔

’غبر ڈاکٹر دہس، بیگ کہلاتی ہے تو عندلیب بانو نے کچھ دیر قبل اسے اتنے طنز
سے ”سید زادی“ کہہ کر یوں مخاطب کیا۔‘

(۱۹)

پھول والی گلی

”آج میں جین بخش کو ساتھ لے کر چوک گئی تھی عنبر کے BIG BOX کے لئے چکن کی ساریاں وغیرہ خریدنے“

”بگ بوکس؟“

”HOPE CHEST“

”—؟“

”نہیں جانتے؟ مغرب میں لڑکیاں اپنے ٹروسو کے لیے جو چیزیں خرید خرید کر ایک صندوق میں جمع کرتی جاتی ہیں وہ ہوپ چیسٹ کہلاتا ہے۔ میں برسوں سے عنبر کے لئے۔“

”اوہ۔“

”دکھلاؤں۔“

دوسرے اتوار کو منصور ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسنر بیگ کی باقیماندہ رام کہانی سُنانے کے لئے سہمہ تن گوش تھا۔ اب وہ یہ کہانی سُنانا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کر رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئیں اور بلاسٹک کے بیگ لا کر دیوان پر پھیلا دیئے چکن کی ایک بیش قیمت ساری نکالی ”دیکھو سلی گار دیں جو بڑے میاں ملے تھے ان جیسے خستہ حال و شیقہ داروں اور دیوالیہ نوابوں کی بیویاں اور بیٹیاں یہ لاجواب چکن کاڑھتی ہیں۔ انتہائی معمولی اجرت پر۔ دولتمند کا روبرو ساری سارا منافع خود وصول کرتے ہیں۔“

”ایک ایرکنڈیشنڈ دکان کی کھڑکی میں ایک سجد بوڑھا لاغر سوزن کا راتکھ کے بالکل قریب لے جا کر چکن کاڑھنے میں مہمک تھا۔ میں نے سفید براق گدی لیے پر ہر امان سیدٹھ سے پوچھا آپ ان بزرگ کے لئے عینک کیوں نہیں بنوا دیتے۔ اس نے سیفکرمی

سے تہقہ لگا کر جواب دیا۔ بگیم صاحب۔ یہ پرانے چاؤل ہیں۔ سینک بغیر ہی کام چلا لیتے ہیں۔
مجھے اتنا غصہ آیا کچھ خریدے بنا اٹھ کر باہر آگئی۔
”جاندی بازار میں آگے بڑھی۔ پھول والی گلی تک پہنچی۔ معاوہ پچپن برس قبل کا
زمانہ آنکھوں میں پھر گیا۔ صاف ستھری گلیاں۔ دوکاندار، خریدار معطر۔ ہر دوکان سے خوشبو
کی بیٹیں آتی تھیں۔

”حسین بخش بھوتوں کے رکھوالے، گریک کوئس کی طرح ساتھ ساتھ چل رہے تھے حضور وہ
اس سامنے والے کوٹھے پر بیٹن رہتی تھیں۔ محرم میں انکا اپنا تعزیہ نکلتا تھا۔ بال کھولے
ننگے پاؤں نوحہ پڑھتی ہوتی جاتی تھیں۔ ادھر جلی خورشید — وہی جو کنکوے بازی کی استاد
تھیں۔ مہلقا اور زہرہ اس طرف رہتی تھیں۔ اور اللہ رکھی۔

”ادھر خواجہ عزیز لکھنوی کی محفل رہے — ابا عزیز منزل میں بانو بیٹا کے دادا کے
ہاں کھانا لکاتے تھے — چیلے آپ کو بانو بیٹا سے ملو انہیں؛ اللہ رکھی نے ذکر کیا تھا کہ وہ
اس محفل کی شادیوں میں گاکھی تھیں۔ خاقانی ہند کی زندگی میں یہ خیابان شیراز سمجھی جاتی تھی
لیکن میں تجاہل عارفانہ سے یہ سب سنا کی۔ اگر میں بے چارے حسین بخش کو بتلاتی تھی کہ پچپن
برس قبل میں خود اس پھول والی گلی میں ان گانے والیوں کی مہمان کی حیثیت سے آچکی
ہوں یقیناً بے چارے کا SHOCK کے مارے دم نکل جاتا۔“

”آپ رپن اسٹریٹ کلکتہ سے یہاں —؟“ منصور نے تعجب سے پوچھا۔

”ایسا ہوا کہ آئنٹ گوہر نیوا لفریڈ کی چیف ایکڑس تھیں۔ انھوں نے مجھے کورس گریڈز
میں بھرتی کر دیا تھا۔ کمپنی تماشا دکھانے لکھنؤ آئی۔ مجھے بھی آنا پڑا۔ مہما ساتھ نہیں آئی تھیں
مگر انکے بجائے گوہر جان مجھ پر کڑی نگرانی رکھتی تھیں۔ کہیں بھاگ نہ جاؤں۔“
”اگر وہ اتنی باشعور خاتون تھیں وہ بھی کیوں چاہتی تھیں کہ آپ اس زندگی کو ترک
نہ کریں؟“

”انکا کہنا تھا کہ اس ہندوستانی سوسائٹی میں مجھے عزت نہ ملے گی۔ بعد کے تجربے
سے ثابت ہوا کہ انکا قول غلط نہ تھا۔“

”مسز بیگ محض ہندوستانی سوسائٹی ہی کیوں۔ ہر فدا امت پرست سماج کے رویے
کیاں رہے ہیں۔ کنگ ایڈورڈ کو تو محض ایک مطلقہ کی وجہ سے تخت چھوڑنا پڑا تھا۔ آج
بھی کوئین ایلزبتھ کیا کسی ایکڑس کو بہو بنالیں گی؟“

”تم میں نے محسوس کیا ہے ESTABLISHMENT کے طرفدار ہو۔“

”ہرگز نہیں۔ لیکن وہی عادت ہے۔ معاملات کو انکے صحیح تناظر میں۔۔۔۔۔“
”خیر۔ چوک کا قصہ سنو۔ آج میں نے دیکھا کہ چوک کی رونق کا وہی سماں تھا۔ صرافوں
کے ہاں چاندی کے ننھے منے علم اور نیچے اسی طرح بک رہے تھے۔ گل فروش بھی موجود
تھے۔ اندر پچیدار گلیاں اسی طرح آباد تھیں۔ فرق محض یہ تھا کہ بالاخانوں سے طوائفیں
غائب ہو چکی تھیں انکی جگہ عام عزت دار شہری بسے ہوئے تھے۔ نیچے بازار میں بے پردہ
ہندو مسلمان خواتین کے غول۔ جو خریداری کرتی پھر رہی تھیں۔ اس وقت اس علاقے
کے شرفاء کی بیگمات پردے سے منڈھی پالکیوں میں نکلا کرتی تھیں۔“

”حسین کی مسجد کے نزدیک اصغر علی محمد علی کی جٹا بلڈنگ نظر آئی۔ حسین بخش فوراً
بولے۔ حضور اس جگہ پر نہواں پتو اکا بڑا عالیشان مکان تھا۔ جو انھوں نے کسی نواب سے
خریدا تھا۔ حضور وہ آپ کے کلکتے میں ایک گوتہر جان ہوا کرتی تھیں۔ آغا میر کی ڈیوڑھی
پر جن نواب صاحب کے ہاں ہمارے چچا ملازم تھے وہ بھی انکے بڑے قدردان تھے۔
انکا ایک نام لیوا اب بھی زندہ ہے۔ قریب ہی ایک گلی میں رہتا ہے بُری حالت میں۔
”میں چونک پڑی۔ اور حسین بخش کی فائل ہو گئی۔ واقعی شہر خیر و تھے۔“

”پھر بولے چلیے آپ کو مرزا محمد عسکری کے مکان پر لے چلیں جہاں میر انشاء آن کر
ٹھہرے تھے۔ مرزا محمد عسکری کی پہلی بہو ایک یورپین لیڈی تھیں۔ وہ وارثی فقیر بن گئیں۔
مرزا صاحب مرحوم کے ایک پوتے یہاں بینک کے بڑے افسر ہیں۔“

”چلیے آپ کو انکی والدہ اور بیگم سے ملو ادیس۔ انکے ہاں ہمارے چھوٹے چچا
کھانا پکاتے تھے۔ بادشاہ پسند دال انکی مشہور تھی۔“

”میں نے کہا حسین بخش میں ان تمام پرانے گھرانوں سے ملتی پھری جہاں آپ کے

بزرگوں نے فن طباطخی کے جوہر دکھلائے تو یہیں سویرا ہو جائے گا۔ میں گوہر جان کے ایڈمائیرر سے ملنا چاہتی تھی۔ کہا چلیے ان بڑے میاں سے مل آئیں۔

”میری اس فرمائش پر انکو تعجب ہوا۔ کہاں جائیے گا اندر گلی کوچوں میں — میں نے فوراً بات بنائی کہ مجھے کلکتے کے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں کوئی کلکتے والا نہیں ملتا۔ بادل ناخواستہ ہمراہ چلے۔ پھول والی گلی سے نکل کر کوچہ میرانیس میں مُڑ گئے۔ کچھ دور جا کر ایک ڈیوڑھی پُڑھٹھکے۔ اندر گئے پھر مجھے بلایا۔

”ڈیوڑھی میں ایک مفلوج و محدور بوڑھا کھاٹ پر پڑا تھا چیتھروں میں پٹا۔ حسین بخش نے چلا کر اس سے کہا یہ کلکتے کی بیگم صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔“
”کلکتہ — میں نے بھی چلا کر کہا — جہاں گوہر جان رہتی تھیں۔ وہ فوراً کھڑ بیٹھا بولا۔ گوہر جان کیسی ہیں؟ خیریت سے ہیں؟

”میرادل دکھا۔ اس بے چارے کا خیال تھا وہ اب تک زندہ ہیں۔ میں نے جواب دیا ہاں خیریت سے ہیں آپ کو سلام کہلوا یا ہے۔

”وعلیکم السلام۔ اس نے طمانیت سے جواب دیا۔ بڑی نیک دل بیوی ہیں۔ ہم جیسے غریبوں کو یاد رکھتی ہیں۔

”میں نے کہا آپ کلکتہ میں کب تک تھے؟ کہنے لگا بیگم صاحبہ میں گارڈن رینج میں مستری تھا۔ گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ گوہر جان کے نانک دیکھا کرتا تھا۔ میری کیا حیثیت تھی کہ انکے گھر پہ جا کر گانا سنتا۔ بس ایک دفعہ ہمت کر کے پہنچ گیا تھا۔ انکے بیرے نے گول کمرے میں بٹھایا۔ لیمونبڈ کا گلاس لا کر دیا۔ بولا آج شام کو محفل ہے۔ تم بھی باہر بیٹھ کر سُن لینا۔ اس طرح بس ایک مرتبہ انکا گانا سُنا۔

”اب آپ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کہنے لگا۔ کیا کروں بیٹی کوئی ہے نہیں جو خیال رکھتی۔ بیٹا ہو ساتھ نہیں رکھتے۔ ان پجaroں نے اپنی ڈیوڑھی میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ دس روپیے انکو دے کر بیڑھیاں اتر آئی۔ میرانیس کے مکان کے سامنے گد رسی تو خیال آیا واہ

— دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت تو انہیں نے پہچانی تھی —
 ”یہ آج صبح کا ذکر ہے۔ جب میں نے اس جہان رفتنی و گذشتنی میں آخری سانسیں
 لینے، گوہر جان کے شاید آخری مداح کو دیکھا۔ لیکن میں بات کر رہی تھی اس زمانے
 کی جب میں یہاں نیوآلفریڈ کے ساتھ آئی تھی —

”رفاہ عام کلب کے سامنے میڈنر کھیٹر کا منڈوہ بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر مٹی کا
 اونچا پلیٹ فارم چوٹی والوں کا درجہ کہلاتا تھا۔ شاید خوبصورت بلا دکھلایا گیا تھا۔ گوہر جان
 برسوں پہلے بندادین سے ناچ سیکھنے لکھنؤ آچکی تھیں۔ اُسی مرتبہ جب پیالہ پی کر
 ڈیسرے دارینی تھیں۔ اس بار انھوں نے ایک کوٹھی کرائے پر لے رکھی تھی۔ شام کو ہوا خوری
 کے لئے ٹمٹم پر نکلتیں۔ بھیر جی روڈ تھا قلال کے پل پر بندادین کا مکان تھا۔ جب
 فٹن سامنے سے گذرتی وہ اترتی اپنے گرو کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک کر آگے جاتیں۔ بندادین
 کے والد درگاپر شاد واجد علی شاہ کے استاد تھے۔ جب جان عالم میٹا برج گئے ہیں اہوقت
 بندادین شاید بارہ سال کے رہے ہوں گے۔ بچو ابھی انہیں کی شاگر و تھیں۔“
 وہ گلگنا نے لگیں ”کون ایسے کی نار۔ جھما بھم پانی بھرے —“

کچھ دیر بعد پھر بات شروع کی ”ایک روز آئنٹ گوہر کے ساتھ ہوا خوری کیلئے
 چھاؤنی کی طرف گئی۔ راستے میں یوٹیوکانونٹ کا بورڈ نظر آیا۔ اسی کے سٹر اسکول ٹو ریڈ
 ہاؤس کلکتہ میں میں نے پڑھا تھا۔ حلق میں کوئی چیز سی آن اٹھی۔ میں اپنی بد قسمتی پر متحیر
 فٹن میں جیب چاپ بیٹھی رہی۔ ایک دن گوہر جان سیر کے لئے نکلیں تو لا مارٹینر گریلز
 اسکول راستے میں پڑا۔ نیلے یونی فارم پہنے سفید قام اور اکا دکا سانولی لڑکیاں بیفکری
 سے سبزے پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے آنسو ضبط کر کے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
 سکندر باغ کا چکر لگا کر گاڑی چوک روانہ ہو گئی۔

”اُس روز چاندی بازار اور پھول والی گلی میں معمول سے زیادہ چہل پہل نظر آئی۔
 اور خوبصورت چوپہلوں کے ریل پیل۔ وہ نوچندی جمعات کا دن تھا۔ ہم لوگ اللہ رکھی کے

ہاں پہنچے۔ وہاں بھی بسنت کے میلے میں جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔
 ”تب مجھے ایک بڑی خوفناک بات معلوم ہوئی۔ چوک کی نوجویں کی ساری تعلیم و
 تربیت آج کے دن کے لئے کی جاتی تھی۔ یعنی ہر سال جو لڑکیاں گویا گریجویشن کر چکی ہوتیں
 انکو بسنت کے میلے میں گویا انکے کانکیشن کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ عہد سعادت علیخان
 سے یہ رسم چلی آرہی تھی شیعہ طوائفیں چوٹیوں پر درگاہ حضرت عباسؑ کے میلے میں جاتیں۔
 سنی درگاہ شاہ مینا صاحب کے میلے۔

”روسائے کرام چاندی بازار میں اپنے اپنے رستوگیوں کی دکانوں پر آن کر بیٹھ جاتے
 ”مہرے چوپہلے اٹھائے سامنے سے گذرتے۔ نوچیاں بڑی اداسے انکو آداب تسلیم
 عرض کرتی نکل جاتیں۔ انکی نائیکاؤں کے میشرکار پہلے سے ان دکانوں میں موجود رہتے۔
 جو لڑکی جس رئیس کو بھا جاتی وہ اپنا مصاحب خاص میلے کی طرف دوڑا دیتا اس موقع
 پر یہ لوگ اپنی جو بلیاں جائیدادیں رستوگیوں کے ہاں رہن رکھ دیتے تھے۔
 ”ہندو امیر زادے بھی چوپہلوں کی اس پریڈ کے ملاحظے کے لئے موجود رہتے۔
 لیکن وہ ان اہل اسلام کے سامنے ٹک نہیں پاتے تھے۔ اتنے احمق نہ تھے۔“
 ”جب میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ میں نے بھی یہ نظارے دیکھے ہیں۔“

مسفر بیک صوفے سے اٹھیں۔

”گوہر جان کیا ہوئیں؟“ منصور نے انکے ساتھ ڈائیننگ روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔
 ”بڑا حشر۔ وہ بے چاری ایک NYMPHO خاتون تھیں۔ آخری جگ لوچی لال
 نے چونا لگا دیا۔ خوب ٹوٹا کنکال ہو گئیں۔ شاید مہاراجہ بڑودہ نے ترس کھا کر اپنے ہاں
 بلوایا۔ چارپانچ سو ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ سنا ہے بھارت بھی زائل ہو گئی تھی۔ جب مریں تو
 گمنام تھیں اور تنہا۔ انکی والدہ ملکہ جان بنارسی کا ایک شعر ہے۔
 ”وہ گور غریباں پہ آئے تو بولے یہ جنگل ہمارے بسائے ہوئے ہیں۔“

(۲۰)

نیک پروین

”بعض سترہ سال کلکتہ کے ایک بڑے کاروباری، امباپرشاد کی ملازمت میں مجھے
 اپن اسٹریٹ سے ٹالی گنج منتقل ہونا پڑا۔ تنخواہ۔ ہزار روپے ماہوار۔ موٹر۔ بنگلہ۔
 ”عالمی کسادبازاری کا زمانہ۔ امریکن کروڑپتیوں کی خودکشی کی خبریں چھپ رہی تھیں اس
 وقت۔ ہزار روپے ماہانہ بہت بڑی رقم تھی۔ ممانہاں اور میرا غم وغصے سے بُرا حال۔
 ”لیکن امباپرشاد ایک معقول انسان ثابت ہوئے۔ جس طرح کے قصے مماراجستھان والے
 ٹھاکرہمشہور سنگھ کی نیکی کے سناتی تھیں۔ امباپرشاد بھی اسی قسم کے وضعار اور شریف آدمی
 تھے۔ ان پڑھ میوئی نیم پردے میں رہتی تھیں۔ نہایت مذہبی اور چھوٹے خاتون۔ امباپرشاد
 گوشت خور تھے۔ ان کے برتن بھانڈے بھی الگ کر دیے تھے۔ وہ اپنے گھر میں مہانوں کی
 طرح بسر کرتے لڑکے لڑکیاں جوان ہو چکے تھے۔ سیٹھ جی جوٹ کے کاروباری تھے۔ لکھنؤ
 کے کاسیہ انکے دادا جان عالم کے متوسلین میں شامل تھے۔ بادشاہ کے ہمراہ کلکتہ آئے تھے۔
 امباپرشاد بھی پرانی لکھنؤی روایت کے پیدمہذب اور نفیس الطبع شاعر آدمی تھے۔ احقر
 تخلص کرتے تھے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ماہر فن مغنیہ یا رقاصہ ان سے وابستہ رہتی تھی۔ اب
 ہفتے میں ایک دوبار وہ اپنے ٹالی گنج والے بنگلے پر آ جایا کرتے۔ پرانے لکھنؤی ٹاپ
 آدمی۔ مگر مہر رہتے تھے کہ جب ان کے ساتھ باہر جاؤں ہمیشہ انگریزی لباس پہنوں۔ تاکہ
 وہ ایک بلونڈ چھو کری کے ساتھ دلایتی چکر اور ریس کورس پر نظر آئیں۔

”جس سال ٹالی گنج پہنچی۔ انھیں رائے بہادر کا خطاب مل گیا مجھے بھاگوان
 سمجھنے لگے اب وہ ٹرف کلب میں میرا تعارف باقاعدہ جو نیر رائی کی حیثیت سے کرداتے

” مجھ پر ایک ادب دھن سوار ہوئی۔ کسی طرح کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کر لوں پھر ایف۔ اے۔ بی اے۔ مہار اور امباپر شاد کی غلامی سے آزاد ہو کر اسکول پڑھاؤں۔ یہ خیال کبھی نہ آیا کہ ببل دی ڈانس کو اسکول کی ملازمت کہاں ملے گی؟

” تعلیم سے میرا شدید شغف دیکھ کر امباپر شاد نے اخباروں میں ٹیوٹر کی ضرورت مشترک کی۔ کئی نوجوان آئے۔ رائے بہادر نے انہیں ریجنٹ کر دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ سید زادہ قابل اعتبار معلوم ہوا۔ چالیس روپے ماہوار پر دو گھنٹہ روزانہ انٹرنس کے امتحان کی تیاری کروانے کے لیے مقرر کیا۔

” سید شکور حسین سنجیدہ۔ خوش قیافہ۔ مہذب۔ یعنی ایسا نوجوان جسے کوئی بھی مڈل کلاس شریف زادی برضا و رغبت بختیت خاوند قبول کر سکتی تھی۔ مگر میں نہ مڈل کلاس شریف زادی۔ نہ وہ میرا خواستگار۔ بات بنے تو کیسے۔

” بیٹے منصور۔ میرے منصوبوں میں بڑی درائی تھی۔ چند رنگر جا کر نن بن جاؤں۔ منصوبہ فیل۔ انگلستان جا کر لالہ رخ فلم میں ایکٹنگ کروں منصوبہ فیل۔ لاہور جا کر لے۔ آر۔ کاردار کی فلم کمپنی جوائن کروں۔ منصوبہ فیل۔

” اب تازہ ترین نہایت روٹینک اور آئیڈیلٹک پلان یہ تھا کہ سید شکور حسین نے شادی کر کے پتی دوتا ہاؤس والیف بنوں وہ تلاش روزگار کے لیے کلکتہ آیا ہوا تھا والد مشرقی۔ یوپی کے کسی ضلع میں نائب تحصیل دار تھے۔ میں نے فوراً ایک مسلم مڈل کلاس گھرانے کا تصور کیا جس کا ایک اصول پرست نوجوان بطور قومی خدمت ستم رسیدہ نواب فاطمہ عرف نواب بیگم کی شامت زدہ لڑکی عندلیب بانو عرف ببل دی ڈانس کو معاشرے میں واپس لائے گا۔ وغیرہ۔

” پچھلی مرتبہ فرار کے موقع پر درجن میری سے امداد طلب کی تھی۔

” یہ مسلم سماج کا معاملہ تھا۔ سوچا ماما کے بزرگان دین کو ٹرائی کروں۔ چنانچہ یا علی یا علی کا در شروع کیا۔

” لیکن نہ درجن میری پر اعتقاد تھا نہ ماما کے مذہب پر۔

”اب پڑھنے میں جی نہ لگتا۔ صبح سے شام تک سوچا کرتی ماسٹر صاحب سے کس طرح کہوں۔ جو ہوم ورک وہ دیں وہ نہ کروں۔ ایک روز انھوں نے مجھے بلا کر کہا رانی صاحب۔ رائے بہادر صاحب نے فرمایا تھا آپکو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ غالباً انکی خوش فہمی تھی۔ لیکن آپ نے دل لگا کر نہ پڑھا تو انکو کیا جواب دوں گا وہ سمجھیں گے پڑھانے کے بجائے بیٹھا آپ سے باتیں کرتا ہوں۔ مجھے ہر طرف کر دیں گے۔ یہی چالیس روپے میری کلہم آمدنی ہے۔

”ایک روز خوش خوش آئے۔ بولے۔ مجھے رائٹرز بلڈنگ میں کلرکی مل گئی ہے۔ ستر روپے ماہوار۔ ڈیپارٹمنٹل امتحان کے ذریعے ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ میں رائے بہادر صاحب سے عرض کروں گا۔ صبح کے بجائے شام کے وقت آجایا کروں۔

”میں نے فوراً ایک اور پلان بنایا۔ ہاں اب وہ بولشویزم وغیرہ دماغ میں بھر چکی تھی۔ انٹرنس پاس کر کے میں بھی ملازمت کروں گی۔ شادی کے بعد دونوں کامیڈ مل کر ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں حصہ لیں گے۔ جنگ آزادی میں شامل ہونگے۔

”بولشویزم کی وجہ سے پرانے PRO-BRITISH خیالات اور اپنے نصف یورپین خون پر ناز کرنے کا رویہ بھی زائل ہو رہا تھا۔ میری اس نئی کاپیلٹ کا ذمہ دار ایک انقلابی بنگالی آرٹسٹ پروڈیپ مکرجی تھا۔ رائے بہادر صاحب نے میرا مصوری کا شوق دیکھ کر چند ماہ سے اسے بھی لگالیا تھا۔ تیسرے پہر کو وہ آکریٹیننگ سکھاتا۔“

”چند رنگر کا نوٹ جانے کا خیال آپکو کبھی نہ آیا؟ بالغ ہونے کے بعد“

”نہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔ میں رائے بہادر کے فلیٹ سے بھاگ کر یا انکو بتا کر کسی روز بھی چند رنگر جاسکتی تھی۔ اگر میں ان سے کہتی کہ میں اس قسم کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تو وہ اتنے شریف تھے خلاف مرضی ہرگز نہ روکتے۔ یوریشین طبقے کو بہت سی ملاقات حاصل تھیں۔ میں اینگلو انڈین ایسوسی ایشن کو بھی CONTACT کر سکتی تھی۔ آسان ترین بات یہ تھی کہ برٹش انڈیا سے بھاگ کر چند رنگر پہنچ جاتی۔

کانونٹ والے ماما کے چنگل سے بچانے کے لیے بلجیم روانہ کر دیتے میرا آبائی وطن“
 ”آپ کا آبائی وطن دراصل مغلوں کی دلی تھی۔“ منصور نے کہا۔ ”موسیورینال
 آپ کے لیے محض ایک نام تھے ایک تصویر جو آپ کی سنگھار منظر پر رکھی رہتی تھی۔
 اپنی والدہ — نواب فاطمہ سے جدا کر دی جاتیں۔ موسیورینال آپ کو اپنے ہمراہ بلجیم لے جاتے
 جہاں برسلز میں آپ کی پرورش آپ کی بلجیمن دادی اور پھوپھیوں نے کی ہوتی تو آپ ایک
 رومن کیتھولک بلجیمن لڑکی ہوتیں۔ جس کے لیے ہندوستان اور اردو زبان اور کتھک ناچ
 بے معنی تھے۔“

”درست“ عندلیب بانو نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور میں
 فرانس یا بلجیم کے کسی چرچ میں جا کر عبادت کرتی اور پٹی بورڈ ہاؤس وائف ہوتی۔
 ”لیکن بھیا اگر حالات بدستور ناسازگار رہتے تو مجھے وہاں بھی برسلز یا پیرس یا لندن یا
 برلن میں اسٹریٹ واکر ہی بننا پڑتا۔
 ”زندگی کی گاڑی اندھا دھند سپر یاں بدلتی ہے۔ کوئی اس کا انجن ڈرائیور نہیں ہے۔
 سب معاملہ اندھا دھند ہے۔“

”شکو حسین صاحب اب شام کے پانچ سے سات تک پڑھانے لگے۔ تیسرے پہر کو چار
 سے پانچ پر دیپ مکر جی کے میوشن کا وقت تھا۔ مگر اس ایک گھنٹے میں وہ واٹر کلر پینٹنگ کم
 سکھاتا۔ بھاشن زیادہ دیتا۔ وہ کہتا۔ تم CAPITALIST سوسائٹی کا VICTIM ہے۔
 تم کو ایک پونجی پتی EXPLOIT کر رہا ہے۔ تم کو اپنی شکتی کے بل پر سماج کو بدلنا ہو گا۔“

”میں نے اس کو اپنا ہمارا بنایا۔ شکور صاحب!
 ”TYPICAL بنگالی رومان پرست نوجوان — آنکھوں میں چمک آگئی۔ بولا بلبل —
 ڈرتا کیوں ہے؟ ہمت کر کے آج ہی اس کو بول دو۔ کل ہم تم سے پوچھے گا تم اسکو کیا بولا۔
 ”دوسری شام جب ماسٹر صاحب وارد ہوئے تو اس سے پہلے کہ میں پر دیپ کی رٹائی

ہوئی تقریر سماج کے مظالم کے بارے میں شروع کروں انہوں نے کہا آج کیس کی نظم پڑھانی ہے۔ بہت مشکل نظم ہے۔

” کون سی والی؟ میں نے پوچھا۔

” ODE TO BULBUL JAN — انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

” مجھے ان کی بات بہت کھلی اور میں دفعتاً رو پڑی۔ میں بے لکڑا کیا عزت تھی ان کی نظروں میں۔ مگر پردیپ مکر جی نے کہا تھا۔ شکور حسین OLD MORALITY کا بڑا بورژوا آدمی ہے۔ پہلے اس کو ایجوکیٹ کرنا پڑے گا۔

” ماسٹر صاحب بہت گھبرائے۔ رائے بہادر کی دولت و اقتدار سے بہت مرعوب تھے۔ اس وجہ سے مجھ سے نہایت شائستگی سے پیش آتے تھے۔ اس وقت ذرا بے تکلف ہو گئے تھے۔ میں نے کتاب کھولی۔ بولے۔ ہم پندرہ دن کی رخصت پر گھر جا رہے ہیں۔ رائے بہادر صاحب سے بھی اجازت لے لی ہے۔

” کہاں کا قصد ہے؟ میں نے پوچھا۔

” وطن جب سے سرکاری نوکری ملی۔ بہتے والہ بن منہ میں کہ شادی کر لیں۔ ہمیں کلکتہ شہر میں خورد و نوش کی بہت تکلیف ہے۔ بیڑی آجائے گی تو کھانا چاء ڈھنگ کا ملے گا۔

” پھر پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مگر یہ بھی خیال آیا کہ بیوی ان کے لیے بھی باورچن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹیکل LOWER MIDDLE CLASS رویہ۔“

” ایل۔ ایم۔ سی۔ ” منصور نے لقمہ دیا۔

” رائٹ۔ ایل۔ ایم۔ سی۔ اسی۔ یو۔ پی۔ ایم۔“

منصور ہنس پڑا ” آپ نے تو مجھے بھی مات کر دیا۔ مطلب؟“

” لودر مڈل کلاس ایسٹرن یوپی مسلم۔! اچھا مگر پردیپ مکر جی کہہ گیا تھا کہ میں شکور حسین جیسے لوگوں ہی کی تربیت کرنی ہے۔“

” خود مکر جی کے متعلق آپ کی کیا رائے تھی؟ وہ تو مجھے شکور حسین سے کہیں زیادہ معقول معلوم ہو رہا ہے۔“

” تھا۔ بے حد معقول۔ مگر وہ 1920's کا تربیت یافتہ کیوسلٹ تھا۔ اس زمانہ کے روس کی گلاس آف واسٹریوری کا مداح۔ لیکن میں خواہ شکور حسین ہی سہی سیکور

چاہتی تھی اور زندگی گزارنے کا SOCIAL SANCTION

” احترام اور سماجی اجازت کی شدید آرزو اس لیے تھی کہ آنکھ ایک بے عزت ماحول میں کھولی تھی۔ یہ احساس اب تک ہے۔

” قصہ کوتاہ۔ ماسٹر صاحب کی متوقع شادی کی اطلاع سے میں برق زدہ سی رہ گئی والدہ کی طرح پلک منتنی نہیں تھی لیکن اس وقت دوبارہ روپڑی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے التجا کی ماسٹر صاحب۔ مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔ میں آپکے لیے بڑا اچھا کھانا پکایا کروں گی۔ بالکل آپ کی نوکرانی بن کر رہوں گی۔ بالکل نوکرانی۔ مجھ سے شادی کر لیجئے۔ اب ماسٹر صاحب ہونٹوں کی طرح میرا منہ تکتے لگے۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ کیا کہہ رہی ہوں لیکن میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔ بس مجھے یہاں سے نکال لے جائیے۔ بے شرم، بایسکوپ دیکھے تھے اور نیواں فریڈ کٹانکوں کی رہبر سیل ان کا اثر تھا کیا کہ مجھ جیسی میم جت اور یہ دہیات اور تھیرٹیکل پوز اور ڈائلاگ۔

” اس زمانے میں ایک گرافون ریکارڈ نہایت مقبول تھا۔ بلبل ناشاد نے کچھ اس طرح فریاد کی۔ تو ماسٹر صاحب تو گم صم بیٹھے رہ گئے۔ نہ وہ مجھ پر عاشق تھے نہ اس قسم کی میلو ڈریسٹک عزمداشت کے متوقع۔ اور امبا پر شاد جیسے مقتدر آدمی کی منظور نظر کو بھگا لے جاؤ ہنسی کھیل نہ تھا۔ عاشق ہوتے تو دوسری بات تھی۔ سر پہ کفن باندھ کر اڑا لے جاتے۔ سوچتے ہوں گے بڑے پھنسے۔

” سرمایہ دار سماج کی بے انصافی اور مظالم کے متعلق جو نکتے پردیپ نے ذہن نشین کرائے تھے سب بھول گئی۔ ماسٹر صاحب کے سامنے نہایت خجل، قابلِ رحم افسوس ناک حالت میں بیٹھی آنسو بہایا کی۔ اس وقت خیال آیا۔ پردیپ کو روک لیا ہوتا وہی میری طرف سے بات کر لیتا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ چلو بھی اب باقی کل ۷ غنڈیباں بانو نے گھڑی دیکھی ” ذرا مانتا بدل کی دوکان پر ہو آؤں۔ امین آباد۔“

”کلائیکس پر پہنچ کر پرانے داستان کو بھی یہی تکنیک استعمال کرتے تھے۔“ منصور نے الجھ کر کہا۔ عنبریں اپنا بیگ اٹھائے کر بے میں آئی۔ عنذیب بانو دوسرے دروازے سے باہر گئیں۔ عنبریں نے کہا: ”باقی میں سنا دوں گی۔“ مخقر کر کے۔ ورنہ امیٰ تو یہ الف لیلہ جانے کب تک جاری رکھیں گی۔ نہ معلوم کیوں تمکو یہ ہیر قطیر سنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنے یا نانی اماں کے بارے میں آج تک کسی کو ایک لفظ نہیں بتایا۔ نہ اسکی ضرورت ہے۔ یہاں وہ زیادہ تر لوگوں سے بات ہی نہیں کرتیں چہ جائیکہ انھیں آتم کتھاسنا میں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ ستری بہتری رہی ہیں۔“

عنذیب بانو شاپنگ بیگ سمجھالے باہر جانے کے لیے کمرے سے گزریں۔ تلخی سے بولیں۔ میں یہ کتھا ڈاکٹر منصور کو اس لیے سنارہی ہوں کہ یہ صاحبزادے تم میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کو تمہارے متعلق پوری جانکاری ہونی چاہیے۔“

”امی جان۔“ عنبریں نے نرمی سے کہا۔ ”سید شکور حسین کو آپ کے متعلق پوری جانکاری تھی۔ پھر کیا ہوا۔؟ کوئی فرق پڑا۔؟“

عنذیب بانو کار میں بیٹھیں اور پھٹاٹک سے باہر نکل گئیں۔

منصور نے سگریٹ جلایا۔ دریچے کے سامنے چڑیاں چھپہارہی تھیں۔ باغ میں سے رام سروپ اور رم کلیا کی تکرار کی آواز آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد عنبریں نے کہا۔ ”کوفت ہو رہی ہے اب آگے کے واقعات کیسے سناؤں۔“

”سننا کر ختم کرو۔“

”اچھا اُس نے ایک گہری سانس لیکر کہا شروع کیا۔“ قصہ مخقر۔ سید شکور حسین کو ترس آگیا۔ فلو مینا کہا کرتی تھی اینڈ ڈی بابا اس وقت ہیرے کا پورا سیٹ پہنے ہوئے تھیں۔ اس سیٹ نے ماسٹر صاحب کو آمادہ کیا۔ میرا خیال ہے یہ فلو کی زیادتی تھی۔ بہر حال چند روز بعد موقع محل دیکھ کر ماسٹر صاحب نے خود امبا پر شاد سے بات کی۔ ان جیسی درجنوں ناچ گرنرز بلکہ

تو فیصدی فرنگی خون والیاں آپ کو مل جائیں گی۔ مس بلبُل اس طرز زندگی کو ترک کرنا چاہتی ہیں۔ آپکے بلبُل خانے سے رہائی کی آرزو مند ہیں۔

”امبا پرشاد نے پوچھا۔ میرے ہاں آنے سے قبل انھوں نے اس طرز زندگی کو کیوں نہ ترک کیا؟ سید صاحب نے کہا۔ اس وقت ان کو موقع نہ ملا تھا۔ کم عمر تھیں اور ماں سے ڈرتی تھیں۔“

”سید شکور حسین اس وقت کچھ خدمت اسلام بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ یعنی ایک مسلمان لڑکی کو ہندو کی ملازمت سے علیحدہ کر کے اس سے نکاح کرنے میں ثواب دارین مفسر تھالیکن بعد میں وہ چڑیل فلو مینا ہمیشہ وہی بات رٹے جاتی تھی۔

”خیر تو امبا پرشاد خلاف امید راضی ہو گئے۔ نیک سرشت آدمی تھے۔ بولے۔ ٹھیک ہے۔ لے جاؤ۔ ان سے کہا اگر تمہارا یہ گھر ہستی کا تجربہ کامیاب ثابت نہ ہو تو واپس آجانا۔ یہ بنگلہ تمہارے لیے مقفل رہے گا۔ انھوں نے جواب دیا۔ اب میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔“

”اچھا نواب بیگم کو ہوا نہیں لگنے دی۔ بے چارے امبا پرشاد بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ ان ہی کی موٹر میں عندلیب بانو بیگم سید شکور حسین کے ساتھ ناخدا مسجد پہنچیں۔ برائے عقد۔ جانے سے قبل وہ سارا زیور جو امبا پرشاد نے انکو دیا تھا واپس کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا گدھے پن کی باتیں مت کرو۔ ہم دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔ بالکل یہی بات ٹھاکر مہیشور سنگھ نواب بیگم سے کہتے اگر وہ ان کے زیور واپس کرنا چاہتیں۔“

”اگلے دقتوں کے لوگ!“

”ہاں مگر سید شکور حسین نے بھی عندلیب بانو سے کہا وہ ان کا ایک پیسہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ ان کے گھر پہنچتے ہی انھوں نے وہ ہیرے کا سیٹ اتار دیا۔ معمولی سوئی ساری پہن کر آغا حشر کی نیک پروین بن گئیں۔ ان کا باقی زیور بنک میں محفوظ تھا۔“

”اب کو تو لوہ کے اس تنگ و تاریک مکان میں محصور ہو کر چوہا جھونکنے میں مصروف ہوئیں۔ شروع کے چند روز یہ نئی گھریلو زندگی بہت روٹینک لگی مگر کھانا کبھی پکا یا نہیں تھا۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہاتھ برباد ہو گئے۔ کبھی سالن جل جاتا کبھی چپاتیاں۔ خاوندناک بھجوں چڑھانے لگے۔ خود بہت جلد عاجز آ گئیں۔

”نواب بیگم کو جب معلوم ہوا کہ ان کی لڑکی بھاگ گئی۔ انہوں نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ عاق کر دوں گی۔ ساری دولت یتیم خانے کو دے جاؤں گی۔ فلویتا ہراتوار کو کو لو ٹوڑا کر تی تھی۔ وہ سب قصے سناتی۔“

”پر دیکھ ملکہ جی سے کبھی ملاقات ہوئی؟“

”تو بہ کر و سخت پردہ۔“

”شکور حسین کا برتاؤ کیا تھا؟“

”بہت خراب۔ شروع شروع میں ٹھیک رہے۔ پھر اٹھے بیٹھے طعنہ بازی عورت میرے گلے پڑ گئی۔ عذاب جان ہو گئی۔ وغیرہ۔ بیوی خاموش۔ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکی تھیں۔ ٹھیک چھ مہینے بعد شکور صاحب اسی لڑکی کو جس سے ان کی نسبت طے ہوئی تھی۔ وطن جا کر بیاہ لائے۔ امی بتاتی ہیں وہ کپڑے دھو کر صحن کی الگنی پر پھیلا رہی تھیں۔ شوہر یہ کہہ کر گئے تھے کہ والدین سے ملنے جا رہے ہیں۔ باہر گھوڑا گاڑی آکر رکی۔ یہ خوش ہوئیں کہ آگئے۔ وہ حضرت ایک برقعہ پوش کو لیکر اترے۔ اندر آکر کہا لو بھی تہہاں بہن ہیں۔ ہماری نئی بی بی۔ دونوں بل جل کر رہو۔ اگر ایک نے بھی چپیں پٹاخ کی تو دونوں کو کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا۔“

”اللہ اکبر۔ یہ تو پرانے اصلاحی ناولوں والا نقشہ معلوم ہو رہا ہے! یہ کب کی بات ہے؟“

”۱۹۳۴ء! لیکن منظور بہت سے سماجی رویے اب تک کہاں بدلے ہیں؟“

”ابھی آپ کا نزول اجلال نہیں ہوا۔“

”بتاتی ہوں۔ یوپی سے آئی ہوئی سوتن نے حسب توقع امی کا ناک میں دم کر دیا۔ لڑائی جھگڑے۔ شوہر سے شکایتیں۔ امی صبح کو سوکر اٹھتیں تو انکے تکیے کے نیچے سے تعویذ اور پڑیاں نکلتیں۔ ایک دن پلنگ سرکایا تو ایک پائے کے تلے سے ایک پتلا برآمد ہوا جس میں سوتیاں چھبی ہوئی تھیں۔ امی اس الہلا کو کوڑے کے ٹین میں پھینکتی رہیں

”سوت۔ محلے کی ایک بڑھیا کے ذریعے ٹونے ٹونکے کر دار ہی تھی۔ اب امی کو یہ

فکر ہو گئی وہ لڑکی اسی جہالت میں کچھ عرصے بعد کوئی زہر دہر کھلا کر انکے متوقع بیٹے کا کام نہ تمام کر دے۔

”فلومینا ہر سفتے پابندی کے ساتھ امی سے ملنے آیا کرتی تھی۔ متوقع ولادت کی اطلاع نواب بیگم کو دے چکی تھی۔ سید صاحب نے بیوی کو زنا نہ ڈفرن ہسپتال کے جنرل میسنری وارڈ میں داخل کر دیا۔ وہیں میں پیدا ہوئی۔ فلومینا غریب موجود تھی۔ اس نے فوراً اسٹریبلڈنگ جاکر بابا کو اطلاع دی پھر اکرامی کو بتلایا کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بولے۔ لاجول ولا قوۃ۔ لڑکا ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ کچھ عیب چھپ جاتا کچھ کی جانی سے کون شادی کرے گا۔

”مجھے دیکھنے بھی نہیں آئے۔ نواب بیگم بھی نہیں آئیں۔ فلومینا نے امی سے کہا۔ اینڈری بابا ہم ماتھ جوڑتا ہے۔ ضد چھوڑو بانی کے گھر چلی چلو۔ اسپتال سے سیدھی رپن اسٹریٹ چلو آج ہی۔ امی نے کہا۔ نہیں میں نے جان بوجھ کر گھر سے تن کی زندگی اختیار کی تھی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ ایک عام ہندوستانی عورت کی گھریلو زندگی BED OF ROSES نہیں۔ بس کم و بیش کا فرق ہوتا ہے۔ اور اگر شوہر کی آمدنی کم ہو اور وہ بد مزاج بھی ہو اور بیوی کو وہ سماجی HANDICAP حاصل ہو جو میرا ہے اور شوہر سوت بھی لاجچکا ہو۔ تو سبحان اللہ۔ آلام و مصائب کا نسخہ مکمل ہے MY CUP BRIMMETH OVER

”بہتر حالات کی توقع ہی نہیں کرنی چاہیے۔

» دراصل امی بے خودار تھیں۔ اور اپنے کیے کو نباہ رہی تھیں۔

» چند روز بعد وہ گھوڑا کٹاری میں سوار ہو کر ڈفرن ہسپتال سے خود ہی گھر آگئیں۔ شوہر ایک بار بھی ہسپتال نہیں گئے۔ اب وہ مجھے بھی پالیتیں اور کھانا بھی پکاتیں۔ ستون دن بھر پلنگ پر چڑھی گڑھو فون سناتی۔ یا ان پر حکم چلاتی۔ طرح طرح سے ذلیل کرتی۔ اگلی شاید ازیت پسند ہو گئی تھیں۔ ساری تکلیفیں چپ چاپ برداشت کرتی رہیں۔

» انکو صرف ایک ہی شوق تھا۔ سینما۔ ایک اسکول ٹیچر پڑوسن منر گھوش سے

دوستی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ شوہر کی اجازت سے کبھی کبھار پکچر دیکھ آتیں۔ مینی شو تاکہ وقت پر لوٹ کر کھانا تیار کر سکیں۔

”میری ولادت کے بعد سے نہیں جاپانی تھیں میں شاید چھ سات مہینے کی ہو چکی تھی۔ جب ایک روز فلو مینا نے آتے کیساتھ ہی چپکے سے کہا۔ اینڈی بابا۔ گل حمید کا نیا پکچر آیا ہے۔ باغی سیاہی۔ اس میں اپنا اینیٹ میم صاحب بھی ہے۔ آرزو کر کے۔ ہم ایمر بابا کو سنبھال لے گا۔ تم گھوش میم صاحب کے ساتھ پکچر دیکھ آؤ۔ تمہارے کو تمھوڑا BREAK مانگتا —

”بائی دی وے — میرا نام عنبریں رائے بہادر امبا پرشاد ہی نے رکھا تھا۔ فلو مینا نے انکو ہسپتال سے ٹیلی فون کر دیا تھا۔ انھوں نے فوراً یہ نام تجویز کیا۔ بڑے بڑی بری آدمی تھے۔ بے چارے فلو مینا نے اس کو AMBER کر دیا تھا۔

”شکور صاحب نے اس نام پر کوئی رائے نہیں دی؟“ منصور نے پوچھا۔

”وہ قطعی بے نیاز تھے — خیر تو اب بے چاری امی نے کہا۔ میں ماسٹر صاحب سے پوچھے بغیر کیسے جاسکتی ہوں۔ وہ اب تک انکو ماسٹر صاحب کہتی تھیں۔ فلو مینا غصے سے بولی۔ اینڈی بابا۔ اب تمھوڑا ہمّت سے کام لو۔ تم بھی تمھوڑا باغی سیاہ بن جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہارا دم گھونٹ کر مار ڈالے گا۔

”امی بھی اب تک اس قدر عاجز آچکی تھیں کہ شوہر کی بغیر اجازت سینما جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ سوت اس وقت محلے کی جادو ٹونے والی بڑھیا سے کھسک پڑیں مشغول تھی۔ فلو مینا بھاگی بھاگی پڑوسن مسز گھوش کے ہاں گئی۔

”انھوں نے کہا۔ ہم باغی سیاہی دو ٹائم دیکھ آ یا ہے۔ بے بی کو ہم رکھ لے گا تم اپنی میم صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔

”ابا اس وقت آفس سے نہیں لوٹے تھے۔

”رات کے سارے نویں امی اور فلومینا سینا ہاں سے نکلیں۔ امی نے نقاب بھی الٹ رکھی تھی۔ اتفاق سے بھیڑ میں امبا پر شاد کا ڈرائیور نظر آ گیا۔ وہ انکی کار لیکر کہیں جا رہا تھا۔ روک کر امی سے کہا چلیے آپکو گھر پیوڑ آؤں۔

”چنانچہ امی اور فلومینا امبا پر شاد کی کرسیوں میں سوار ہو کر گھر پہنچیں۔ امی نے ڈرائیور سے کہا کار گلی سے باہر ہی روک لے۔

”عین اس وقت آبا آگئے۔

”شاید کھانا کھا کر سگریٹ خریدنے نکلے تھے۔ پینوڑی کی دوکان کی طرف سے آرہے تھے۔ انہوں نے امی اور فلومینا کو گھر سے دُور امبا پر شاد کی کار سے اترتے دیکھا۔

”اب گلی میں آگے آگے امی اور فلومینا، دم بخود۔ پیچھے پیچھے آبا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی قیامت برپا کر دی۔ گالیاں۔ تھپڑ۔ گھونسنے۔ لات۔ اس خشنی فلومینا اس دلائل کے ساتھ امبا پر شاد کے ہاں جانے کا سلسلہ کب سے جاری ہے۔؟ پھر ایک تھپڑ۔ میں تمہیں اسی وقت طلاق دیتا ہوں۔ جہنم رسید ہو۔ پھر ایک گھونسنہ۔ فلومینا نے امی کو بچایا اور کس کر ایک جھانپڑ موصوف کے رخسار پر رسید کیا۔ وہ چکر اگئے۔ فلومینا اب کو کتنی اور پر تلگالی میں گالیاں دیتی ماسٹر صاحب پر پل پڑی۔ نہایت مضبوط، لیم شمیم دیونی سسی عورت۔ آبا دھان پان۔ پلنگ پر گر کر بازوؤں سے چہرہ بچایا۔ دوسری بیوی نے چیخ پکار مچائی۔ اینڈی بابا اپنا سامان باندھو۔ فلومینا نے امی کو حکم دیا اور ان کی سوتن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک دھپ اسے لگائی۔ گالیاں انگ بیلڈی دُوسن۔ ہمارا بچپسہ لوگ کو جان سے مارنے کے لیے جادو کی پڑیا منگاتا تھا۔ ہم پولیس میں رپٹ لکھا دے گا مانوم۔ امی نے ہاتھ جوڑے کہ اب بس کرے اور باہر جا کر گاڑی لائے۔

”آبا فلومینا کے زرد کوب سے حواس باختہ بیٹھے تھے۔ امی نے اب ان کی پرواہ نہیں کی۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پولیس کے نام پر انکی دوسری بیوی

جواب انکی واحد میوی تھی، سہم کر دوسرے کمرے میں جا کھسی۔
 ”امی کو کھٹ سے طلاق مل چکی تھی لہذا انکھوں نے اپنی چوٹوں کی پرواہ ہی نہیں
 کی جلدی جلدی اپنی چیزیں سیٹھنے لگیں۔ سید صاحب چُپ بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔
 ”امی بتلاتی ہیں کہ جب ابا طلاق طلاق دھاڑے فلو مینا خوشی کے آنسو بہانے
 لگی۔ امی بھی کھل اٹھیں۔ مگر فوراً ہی ابا نے امی کی ٹھکانی شروع کر دی۔

”بہر حال اب تو امی چھٹکارا پا چکی تھیں۔“
 ”محض یہ ایک موقع تھا جب حنفی اسٹائل طلاق نہایت کارآمد اور بر محل ثابت ہوئی۔“
 منصور نے بے اختیار ہنستے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”ہاں اور وہ خوش خوش سپکنگ میں مصروف تھیں۔ اس دوران میں مسز گھوش
 پیسج پکار سنکر صحن کی دیوار پر سے جھانک رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر امی کو اچانک میں یاد آئی
 بھاگی بھاگی فوراً پڑوسن کے گھر پہنچیں۔ جاتے جاتے اپنا برقعہ گلی میں پھینکتی گئیں۔ مسز گھوش
 کے گھر سے میری ٹوکری اٹھائی۔ فلو مینا گاڑی پر آتی نظر آئی۔ امی کہہ رہی تھیں بالکل کویتن
 وکٹوریہ کی طرح بڑے فاتحانہ انداز سے کوچ میں بیٹھی تھی۔

”چند ماہ قبل شکور صاحب نے اپنی دوسری بیوی کے چند معمولی سے زیور اور امی کا
 بچہ قیمتی ہیروں کا سیٹ صند وچے میں رکھ کے اپنی ذاتی الماری میں مقفل کر دیا تھا
 جب یہ لوگ گاڑی میں سوار ہو کر کو لو لو کہ سے نکلیں رپن اسٹریٹ کے راستے میں فلو مینا کو
 اچانک وہ بیرے یاد آئے۔

”امی نے کہا لعنت بھیجو — DAMN HER — DAMN THEM
 ”فلو مینا نے دہرایا — DAMN HER — بٹ یہ ڈائمنڈ اس جادو گر نی BITCH
 کی قیمت کا تھا۔ — BLOODY BITCH

”امی نے جواب دیا۔ GOD BLESS THE BITCH
 ”بٹ اینڈی بابا اس کا جادو ٹونا پکا تھا۔ تم کو گھر سے نکال دیا۔

”امی خوب نہیں۔ بویس فلو مینا۔ DON'T TALK NONSENSE

”وہ بولی اوہ نو اینڈی بابا۔ جے پور میں گجر بانی کا چھو کری لوگ بانی کے خلاف کام کروایا دیکھو بانی پر کتنی مصیبت پڑی گھر سے بے گھر ہوا۔ جویلی ہاتھ سے گئی۔ منہ چھپا کر بے پور سے بھاگا۔ صاحب دھوکہ دے کر بھاگ گیا۔ کلکتہ اگر ہاؤس کو کتنا مشکل ٹائم دیکھنا پڑا۔ بابا۔ یہ ورلڈ ایک بھیانک جنگل ہے۔ اس میں رہنے والا ہم لوگ بے عقل جانور لوگ ہے۔ دوسرا جانور لوگ اگر چالاک ہو تو بے عقل جانور کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اونٹنی گوڈ سب جانتا والا ہے۔

”امی بتاتی ہیں کہ فلو مینا اسی طرح اپنا ذاتی فلسفہ بیان کرتی گئی جھلیلیوں والی بند گاڑی خوابیدہ شہر کی سنان روشن سڑکوں پر سے گزرتی رہی۔ گھوڑوں کے ٹاپ کے علاوہ مکمل ستانہ۔ سڑک کی روشنیاں جھلیلیوں میں سے چھن کر فلو مینا کے سیاہ فام چہرے پر پڑتیں تو وہ بڑی پراسرار معلوم ہوتی۔ ہزاروں برس پرانی روح۔ ٹینگ والے اجتماعی لاشعور کی مفسر۔

”ادھر امی اپنی بائیس سالہ زندگی کے انقلابات پر حیرت زدہ بیٹھی تھیں۔ ریپن ٹیٹ اگئی۔ فلو مینا نے اوپر جا کر خوابیدہ نواب بانی کو جگایا۔ بانی گوڈ کو تھینک یو بولو۔ اینڈی بابا اگیا۔ ایمیر بابا اگیا۔ دوسری صبح ہی سے میرے لیے ایک آسامی کرسمین NANNY کا انتظام کیا گیا۔ نواب بیگم امی سے جدائی اور ان کی شادی کے صدمہ سے نڈھال تھیں۔ صحت بھی بگڑ چکی تھی۔ اب وہ امی کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لہذا جب امی نے ان سے کہا — محض اس شرط پر ان کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں کہ وہ انکو پرانی زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں گی نہ تو اسی جب بڑی ہوگی اسے اس لائن کی ٹریننگ دینے کی کوشش کریں گی۔ نواب بانی یہودی مالک مکان کی دوکان میں ساجھے دار بن چکی تھیں۔ خامی آمدنی تھی۔

”امی نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ٹیائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھا۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر ایک اسکالرش فرم میں درخواست روانہ کی۔ وہاں اسٹنو گرافر کا کام مل

گیا۔ یورپین درکنگ گزل کی وضع اختیار کر کے کلاؤ اسٹریٹ جانے لگیں پہلے روز جب دفتر سے خوش خوش لوٹیں ہیٹ اتار کر فلو مینا کو دیتے ہوئے کہا آج زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو ایک کارآمد، باعزت اور خود مختار ہستی محسوس کر رہی ہوں۔

” دفتر کے اسکاٹ نوجوانوں کے ساتھ شام کو یکچرخ جاتیں گریٹ ایسٹرن جاکر بال روم ڈانس کرتیں۔ فریو میں چارپیتیں اپنی اس نئی من بھاتی زندگی سے بے حد مطمئن تھیں۔ نواب بیگم کو ایک اجنبی لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک یورپین آفس گزل جو گویا بطور انکی PAYING GUEST گھر میں مقیم تھی۔ امی اپنی چھپیل سالہ زندگی میں اب تک لوٹو ہاؤس کی ایک یوریشین طالب علم، تھیر کی یوریشین رقاصہ ”مس بلبل“، ایک ہندو رئیس کی پابند اور ایک ایل۔ ایم۔ سی مسلمان ہاؤس وائف اہلیہ شکور حسین بن چکی تھیں۔ اور اب ایک بار پھر اینڈی آرینال تھیں۔ کلاؤ اسٹریٹ پر ایک ٹوٹ کی فرم میں کام کرنے والی اینگلوانڈین سکرپٹری — حیرت انگیز بات تھی نا —؟

” جب سکند ورنڈ وار چھڑی۔ امی نے طے کیا (WAC) جو آئن کر کے فرنٹ پر چلی جاتیں۔ نانی اور فلو مینا اور ایک عدد آسامی آیا تو مجھے پال ہی رہی تھیں۔ امی کو میری زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ اپنے آپ میں لگن تھیں۔ بے چاری کو زندگی میں پہلی بار اپنی من مانی کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ اپنی اس نئی آزادی پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔ ایک روز یونیفارم لیکرائیں اسے پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئیں۔ فلو کہتی تھی کہ بے حد اسماٹ لگیں۔ لیکن فوج میں بھرتی ہونے کی بات پر نانی اور فلو مینا دونوں نے بہت رونا پٹنا مچایا۔ امی نے پلٹ کر کہا۔ جب مک نیل صاحب سے شادی کر کے اسکاٹ لینڈ چلی جاؤں گی۔ تب تم لوگ کیا کرو گی؟ لڑائی ختم ہوتے ہی ہم لوگ شادی کر لیں گے۔

” نواب بیگم یہ سن کر پھر دم بخود رہ گئیں۔ مگر لڑکی بہر حال انکے ہاتھوں سے کب کی نکل چکی تھی۔

”ان کا اسکاٹش بوائے فرنیڈ جو انکے سیکشن کا انچارج تھا، رائیل ایر فورس میں شامل ہو کر فرنٹ پر چلا گیا تھا۔ امی بقراری سے اس کے خطوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ شاید وہ زنانہ امدادی فوج بھی اسی امید پر جو این کرنا چاہتی تھیں کہ اس طرح ممکن ہے کسی محاذ پر وہ مل جائے۔“

”قطع کلام ہوتا ہے عنبر۔“ منصور نے کہا۔ ”امبا پرشاد صاحب سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہوئی؟“

”امبا پرشاد کو معلوم ہو گیا تھا کہ امی طلاق لیکر نواب بیگم کے ہاں واپس آچکی ہیں۔ میری پہلی سالگرہ پر گڑیاں کھلونے کپڑے اور منے منے سچے زیورات بھجوائے۔ یہ تو لونڈیا کا جہیز معلوم ہو رہا ہے۔ اچھا خاصا نواب بیگم نے کہا۔ لیکن امی نے فون کر کے ان پچارے سکا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ شاید تین چار سال بعد ہی امبا پرشاد کا انتقال ہو گیا بہت ہی بڑھیا آدمی رہے ہونگے بے چارے۔“

”پانچ برس کی عمر میں میں بھی لوریو کا نوٹ میں داخل کر دی گئی۔ نو دس سال کی تھی جب نانائی اماں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ رشتہ میں بہت شاندار بیوی تھیں۔ جیسی تم نے ان کی وہ تصویر دیکھی ہے۔ کیمو والی۔ بالکل ویسی ہی تھیں۔ بوڑھی ہو چکی تھیں مگر اب بھی بہت حسین تھیں۔“

”کیسے میں؟“

”چہرے کا کینسر۔ ایسا دلکش چہرہ اور سارا گل گیا تھا۔“

”ایک روز میں ہسپتال گئی نواب بیگم پر ایسویٹ وارڈ میں بستر مرگ پر پڑی۔ کسی لکھنوی شاعر کا شعر پڑھ رہی تھیں۔“

آیا ہوں جان دے کے، دم آئے تو ظلم کر

اے قبرا بھی یہ کون محل ہے فشار کا

غنودگی طاری ہوئی تو دہرانے لگیں۔۔ ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں

انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے کفن و دفن کے لیے اجازت درکار ہے۔ مجھے ڈر سالگامی سے پوچھا کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے برآمدے میں لے گئیں۔ اور بولیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہاری گریہ دنیا سے جانے والی ہیں۔ قاعدہ ہے کہ مرتے وقت انسان کو پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ تمہاری گریہ نے ایک بار بتلایا تھا کہ جتن بی جنکی وجہ سے انکی زندگی کا رخ بدلا ایک زمانے میں دنوازدلی والی کہلاتی تھیں اور مشہور سنگرتھیں۔ آج سے سینسٹ ستر سال پہلے وہ کسی دیسی ریاست میں بلانی گئی تھیں اس اسٹیٹ کے نواب بھی شاہانِ اودھ کی طرح موت سے ڈرتے تھے۔ اور جانشین کے دربار میں اس کے باپ کی موت ان الفاظ میں اناؤنس کی جاتی تھی جو اس وقت گزرتی دہرا رہی ہیں۔

” لیکن موت ایک کیمیکل ایکشن ہے۔ اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ قاعدہ ہے ہر پرانی چیز بوسیدہ ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کا جسم بھی موٹر کی طرح ایک مشین ہے۔ تمہاری گریہ تو بہت پرانی مشین ہیں۔ اس لیے اب اس مشین کا کام چھوڑنے کا وقت آگیا ہے۔“

” میں کمرے میں واپس گئی۔ اب نواب بیگم کو غنودگی کے عالم میں ایک اور رٹ لگ گئی تھی اور وہ تھوڑی بھجیا۔ تھوڑی بھجیا۔ دہرائے جارہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اس بار امی ذرا پریشان ہوئیں سمجھ میں نہ آیا کہ انکی ماما کیا کہہ رہی ہیں۔“

” نانی نے آنکھیں کھولیں بے نوری آنکھیں جو پانی پانی ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کہا۔ عندیہ۔ کسی مولوی کو بلاؤ۔ کسی جناب کو بلاؤ۔“

” امی کسی جناب یعنی شیعہ مولانا کی تلاش میں فوراً باہر گئیں۔ بہرہ دیر بعد ایک لاکھل مولوی دستیاب ہو سکے۔ ہسپتال کے قریب کی کسی مسجد کے ملاجی۔ رات ہو چکی تھی اور نانی اماں تھوڑے کا ساگ۔ تھوڑے کا ساگ رٹے جارہی تھیں۔“

” امی نے مولوی صاحب سے پوچھا۔ میری والدہ کیا کہہ رہی ہیں؟ اگر کوئی آخری خواہش ہو ان کی تو پوری کر دی جائے۔“

” پندرہ تیس سال قبل امی بطور بلبل دی ڈانسر مشہور رہ چکی تھیں وہ انکی شکل

پہچانتے تھے۔ مولوی صاحب بھی پہچان گئے۔ عجیب چیز تھے۔ پلٹ کر بولے آخری خواہش! اجی میم صاحب وہ تو ابھی جہنم میں پوری ہوئی جاتی ہے۔ تھوہڑ کا ساگ اہل دوزخ کو زبردستی کھلایا جائے گا۔ یہ ابھی سے مانگ رہی ہیں۔

”امی طیش سے لال پیلی ہو گئیں۔ مولوی صاحب بولے۔ توبہ۔ توبہ۔ ان کا چہرہ سارا گل چکا ہے۔ اکثر زنان فاحشہ کامرنے سے قبل جسم کا کوئی حصہ سرکل جانا ہے۔ فلو مینا کمرے میں موجود تھی۔ مولوی صاحب کو مارنے دوڑی۔ امی نے بھی اپنی چھتری اٹھائی اور ایک اینگلوانڈین گالی دے کر ملاجی کی طرف بڑھیں۔

GET OUT YOU BLEEDING HE-GOAT. DROP DEAD.

مولوی صاحب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میں نے دہل کر روناشروع کر دیا۔ اس بڑبونگ میں نانی کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔ اس اثنائیں ان کا دم نکل گیا۔ بے چاری نواب فاطمہ عرف نواب بیگم کو آخری وقت نہ کلمہ نصیب ہوا نہ لیسین شریف۔

”تمہارا یہ خالص مذہبی ری ایکشن ہے۔“ منصور نے تعجب سے کہا۔

”ہاں۔ نواب بیگم حد سے زیادہ مذہب پرست تھیں۔ انکے ری ایکشن میں امی بے دین ہو گئیں۔ امی کی بے دینی کے ری ایکشن میں بہت پابند مذہب ہوں۔ اور شاید تھوڑی سی MYSTICAL بھی۔“

”شکور صاحب سے کبھی تمہاری ملاقات ہوئی؟“

”بالکل نہیں۔ طلاق دے کر گھر سے نکالتے وقت انھوں نے امی سے کہا تھا ان کو یقین نہیں کہ لڑکی انھیں کی ہے۔ امی نے جواب دیا تھا بہت ٹھیک اب اس لڑکی کو بالکل CLAIM نہ کیجئے گا۔“ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ انکے آخری الفاظ تھے۔

”چنانچہ جب میں پانچ سال کی ہوئی لوریٹو ہاؤس کے کنڈرگارٹن میں میسرانام محض عنبریں بیگم لکھایا گیا۔ باپ کا نام مسٹر بیگ۔ اپنے نانامرزا دلدار علی بیگ عطر فروش کا نام امی کے ذہن میں محفوظ تھا۔ لہذا ہمارا گویا خاندانی نام بیگ ہو گیا۔ بعد میں امی خود کو مسز بیگ کہلوانے لگیں۔ نام۔۔۔ عزت کا پاسپورٹ ہے۔“ عنبریں خاموش ہو گئی۔

کچھ وقفے کے بعد منصور نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”عمر ایک بات بتاؤں۔ میڈیاں
ہے تمہارے والد صاحب بقید حیات ہیں۔ میں امریکہ سے واپسی میں کراچی رکھا تھا وہاں۔“
”ہو سکتا ہے“ غبریں نے بات کاٹی۔ ”وہ وہاں بہت بڑے آدمی ہوں گے۔“

امیر کبیر۔ عائشان کو بھی بنوالی ہوگی۔ اولاد بڈل ایسٹ میں۔۔۔
”بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے شاید کراچی جم خانہ میں اسی نام کے ایک
بزرگوار سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پارٹیشن کے وقت وہ کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ وہاں
سے کراچی۔ ڈپارٹمنٹل پروموشن کے ذریعے اونچے سرکاری عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔
رائٹ۔ میں ان سے ملا ہوں، ہاتھی کا حافظہ رکھتا ہوں بھائی۔ تمہارے آباد وہاں موجود ہیں“
”میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا“

”رائٹ تمہاری امی کے لیے موسیو آندرے جوزف رینال ایک بے معنی نام رہا۔
تمہارے لیے سید شکور حسین“
”بے چاری فلو مینا کہا کرتی تھی۔۔۔“
”فلو مینا کا کیا ہوا؟“

”ہوتا کیا۔ مرگئی۔ لمبی عمر پائی۔ چھیالیس سال۔ نواب بیگم سے بھی دس گیارہ سال
بڑی تھی۔ ان کی وفات کے دس سال بعد مری۔ ۱۹۵۵ء میں پورے پچاس برس ان ماں
بیٹیوں کی خدمت کی۔ بیوہ ہو کر بے پور میں آیا گیری شروغ کی تھی۔ اور کیا وفادار پیاری
عورت تھی۔ فرشتہ خصلت۔ امی اسے TEASE کیا کرتی تھیں۔ فلو مینا اب تم
SAINTHOOD کے لیے APPLY کر دو۔ تمہارے لیے HALO اور WINGS کا
آسمان کے کارخانے میں آرڈر دیا جا چکا ہے۔ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ امی نے اس کی
دیکھ بھال کے لیے ایک آیا رکھ لی تھی۔ مرنے سے ایک دن پہلے امی سے کہہ رہی تھی۔
اینڈی بابا۔ وہ ٹھاکر ہیشور سنگھ مہاکال بن کی یا تر کو جاتے جاتے خود اکال بن چلا گیا تھا نا۔
سالانہ زندگی مہاکال بن ہے۔ اس کے بچوں بیچ مہاکال بھیرو کا مور تی رکھا ہے۔ بھیرو سب

چیز کو خلاص کرنا مانگتا۔ یہ گھورانہ دھیرا جنگل ہے۔ اس میں ہم لوگ سب بیوقوف جانور لوگ کی طرح گھوم رہا ہے۔ ONLY GOD ALMIGHTY سب جانتا والا ہے۔ پھر اس نے امی سے کہا دیکھو اینڈ سی بابا بابا ایمر بابا اپنا ایم بی بی ایس پاس کر لے تم ایک دم اسکاٹ لینڈ کا ٹکٹ کٹاؤ۔ میرے کو لپکاؤ شو اس ہے مک نیل صاحب تمکو وہاں مل جائے گا۔

”امی نے جل کر جواب دیا۔ ماما کو موسیو آندرے رینال چند رنگر میں مل گئے تھے۔ جو مجھے مک نیل اسکاٹ لینڈ میں مل جائے گا۔ فلو مینا۔“

YOU ARE AN INCORRIGIBLE ROMANTIC.

”اس نے تکیے سے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ضرور ملے گا۔ ہم اوپر جا کر تمہارے لیے بڑے زور سے PRAYER کرے گا۔ بس آج کل میں اوپر جانے والا ہے۔“

”امی رونے لگیں۔ میں بھی خوب روتی۔ فلو مینا نے اسی رات سوتے میں انتقال کیا۔ نواب بیگم کے برعکس اس کی بڑی پرسکون موت تھی۔ چونکہ اس نے زندگی سے کوئی توقعات ہی نہیں رکھی تھیں۔“

امی کو اپنی والدہ کی موت کا زیادہ رنج نہیں ہوا تھا فلو مینا کے مرنے پر وہ روتے روتے بچا ل ہو گئیں۔ میرا بھی بُرا حال۔ سیاہ فراک پہن کر چہرے پر سیاہ ماتمی VEIL لگائے شیشے کی تابوت گاڑی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی کیتھولک قبرستان گئیں۔ اس کے لیے چرچ میں بڑا شاندار REQUIEM MASS کروایا۔ پھول لیکر اکثر قبرستان جاتی رہیں۔ اپنی والدہ کی قبر پر مسلمانوں کے قبرستان شاذ و نادر ہی جاتی تھیں۔ مجھ سے کہا فلو مینا مر گئی۔ ہندوستان سے ہمارا LINK ختم اب چلو ولایت۔ دراصل وہ آزادی کے فوراً بعد جانا چاہتی تھیں۔ کلکتہ کے سارے اینگلو انڈین جا رہے تھے۔ مگر بوڑھی بے سہارا فلو مینا کی وجہ سے نہیں گئی تھیں۔ جوں ہی میں نے ایم بی بی ایس کیا امی نے روانگی کی تیاری —“

”وہ اسکاٹلینڈ اور مسٹر مک نیل کی کیا بات تھی؟“

”وہ ایک اینگس مک نیل ان کا بوائے فرینڈ تھا نا جو کلائیو اسٹریٹ کی جھوٹ فرم میں انکے سیکشن کا انچارج تھا۔ اس سے شادی طے کر لی تھی۔ مگر وہ سکیڈورلڈ وار چھڑتے ہی ایر فورس میں بھرتی ہو کر ویسٹرن فرنٹ پر چلا گیا“

”فرسٹ ورلڈ وار کے مویلو آندرے رینال کی طرح“

”نہیں۔ میرے نانا جان آندرے رینال تو کوئی عام سے SWINDLER تھے جو ایک بیوقوف ہندوستانی ناچ گرل سے چالیس ہزار روپیہ اور ہیرے کے پر سی چھم ٹھگ کر بلجیم بھاگ گئے تھے۔ اینگس مک نیل ایک معقول پر خلوص نوجوان تھا۔ مگر پہلے وہ یورپین محاذ پر بھیجا گیا اور برابر وہاں سے خط لکھتا رہا۔ پھر۔ برا۔

”ایک سبج امی نے اسٹیشنیں کھولا تو REPORTED MISSING کی فہرست میں فلائیٹ لفٹینٹ اینگس مک نیل کا نام بھی موجود۔ دن بھر اپنا کمرہ بند کر کے روتی رہیں۔ عزت کا پاپا سپورٹ پھر انکے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ فلو مینا نے دلجوئی کی کہ بہت سے REPORTED MISSING زندہ بچ جاتے ہیں۔ مک نیل صاحب ضرور واپس آئے گا۔

”دنیا امید پر قائم — امی ہی کی خاطر میں نے لندن کے بجائے اوڈنبرامیڈیکل کالج میں داخلے کا ارادہ کیا۔ آزادی کے بعد امی کی اسکاٹش فرم کے جنرل منیجر مسٹر ڈگلز میکلوڈ اوڈنبرا واپس جا چکے تھے۔ میں نے انکو خط لکھا کہ کوشش کر کے میرا داخلہ میڈیکل کالج میں کرا دیں۔ چنانچہ مجھے وہاں جگہ مل گئی۔ اسکاٹلینڈ پہنچ کر بھی امی نے مک نیل کی تلاش بے سود سمجھی۔ اوڈنبرا کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ہزار ہا مک نیل تھے۔ میں نے چند ایک کو فون کیا۔ کسی کو فلائیٹ لفٹینٹ مک نیل کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ برسا کی جنگ کو خاصی مدت گزر چکی تھی۔

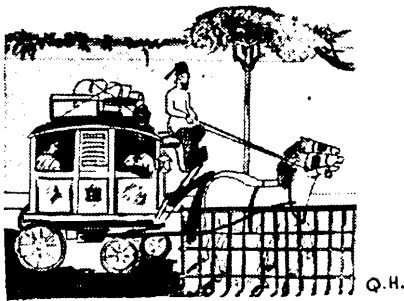
”چھیڑوں میں ہم لوگ سیر کے لیے یورپ گئے۔ اسٹینڈ پہنچتے ہی اب میں نے

آندرے رینال کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ برسلز کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کھنگالی۔ اسیں سیکرٹوں رینال۔ تمک کریہ کوشش بھی چھوڑ دی۔ لیکن امی بار بار بلجیم جاتی رہیں۔“

منصور نے اپنا خود اور گوگلز اٹھائے۔

”کل شام ضرور آنا۔ امی تمہاری دعوت کا انتظام کرنے ابھی بھاگی بھاگی امین آباد گئی ہیں۔“
 ”کل کیا خاص بات ہے بھئی؟“

”مائنٹننس کل کے افتتاح کا CELEBRATION۔“ عنبر نے شگفتگی سے جواب دیا
 ”اتفاق سے کل وہ مہینہ اور تاریخ بھی ہے جب امی اور فلو مینا مع یوزر ٹوولی کی ٹوکری کو لوٹو۔
 سے پرن اسٹریٹ واپس گئی تھیں۔ فلو مینا بتاتی تھی اس نے امی سے کہا تھا اینڈری بابا
 بالکل اسی مافک تمہارا باسکٹ بیکر گھوڑا گاڑی میں تمہاری ماما کے ساتھ ہم اسی بلڈی کیل کٹا
 کی روڈ پر تھا جب بانی جے پور سے دھکے کھانے ادھر آیا تھا۔“



(۲۱)

تارے والی کوٹھی

”افوہ۔ آج تو آپ نے واقعی بڑا اہتمام کیا ہے۔“ منصور نے دروازے سے جھانک کر جھلملاتی ڈنر ٹیبل پر نظر دوڑائی۔
 ”اؤ کچھ دیر اسٹوڈیو میں بیٹھیں۔ وہاں اس وقت دروازے کھولو تو بڑی خوشگوار ہوا گرمی کی طرف سے آتی ہے۔ بالکل فرح بخش۔“

لیکن اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی مسز بیگ نے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے گرا دیے۔ ایک الماری سے اسکاچ و ہسکی کی چند بوتلیں نکال کر میز پر رکھیں۔ منصور تعجب سے انکی یہ غیر متوقع کاروائیاں دیکھتا رہا۔ عنبریں ناگواری کے ساتھ ایک مصری پوف پر ٹک گئی۔ منصور نے پنکھا چلایا۔

”کیا پسند کرو گے؟ ROYAL SALUTE BAGPIPER CLAYMORE“

دو جام بھرے۔

منصور نے عنبر پر متفکر اچھتی سی نظر ڈالی۔

غذیب بالونے قہقہہ لگایا۔

”مولانا بخاری! اطمینان رکھو۔ عنبریں بی بی بڑی پر ہنر گار سید زادی ہیں۔ میرا کیا ہے میں تو ہوں ہی ایک آوارہ یوریشین ریٹائرڈ ڈانسر۔“
 ”امی!۔“

”ہاف کاسٹ۔ TRAMP جب دل بہت گھبراتے۔ اس جگہ یہ شغل اسٹوڈیو کے دروازے بند کر کے۔ کہیں حسین بخش نہ دیکھ لیں۔ وہ مجھے کلکتہ کی بڑی بیگم

صاحب سمجھتے ہیں۔ اور بہادر دیکھ پاوے تو سارے محلے میں پھونک آوے۔ عزت —
 عزت! عزت کی بڑی دھن ہے مجھ بندی کو — TO MASHA HEALTH CLUB!

TO AMBER AND MANSOOR'S FUTURE HAPPINESS!!

”چیرز“ منصور نے اپنا جام اٹھایا۔

منسز بیگ کلاس پہ کلاس چڑھائے گئیں۔ ”آہا۔ کلیان!“

شیلف میں سے تلاش کر کے فیض کا ایک ٹیپ نکالا اسے لگا کر چند لمحوں تک سنا
 پھر ساغر اٹھا کر بولیں۔ ”پوسٹ مینوں کے نام! جو میرے لیے کبھی کوئی خط نہ لاتے
 عبد الباسطوں کے نام۔۔۔! ہمیشہ شنگھوں کے نام۔ آندرے رینالوں کے نام —
 شکور حسینوں کے نام۔! ”رُوسی انداز میں کلاس فرش پر پڑخ کر توڑا۔
 بل کھاتی اٹھیں اور بانہیں پھیلا کر سر جھیمے ڈال، چمٹ کو تکتے لگیں۔
 گویا ایذا ڈورا ڈنکن۔ گوہراف کیل کٹا۔ یوحین پیٹرسن عرف اندرا دیوی۔

انسان کی سب سے بڑی بد قسمتی اس وقت ہے جب وہ دوسروں کو مضحکہ خیز
 لگنے لگے۔ ”منصور“ غبن نے چپکے سے التجا کی۔ ”اُمی پر ہنسنا نہیں۔“
 ”استغفر اللہ غبن۔ آئی انڈر اسٹینڈ۔“

”نو یو ڈونٹ“

”دشت تنہائی ڈھونڈ لاؤں؟“ گنگنائی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

”اُمی کی ٹریجڈی — RIDICULOUS لگتی ہوں تو انہیں معاف کر دینا۔“

واپس آئیں ”نہیں ملا۔“

دریچے کا پٹ کھسکایا۔ ”آہا۔ ایسی تاروں بھری کالی رات — آکاش گنگا کیسی
 جھلملا رہی ہے۔ مشرق کی پراسرار سیاہ راتوں کی پُرفسوں کہکشاں —! ہا ہا ہا۔ یہ سب

قسمتوں کے ستارے ہیں؟ ہندو کرم کا پھل کہہ کر بچ گئے۔ تم بتاؤ مولانا۔
 ”یہ تو چند ازلی سوالات ہیں میم“
 ”اماں ازلی بھی دیکھ لیا دورین سے۔ اٹوہ۔ زحل کیساتھ نظر آتا ہے۔ اتنا۔
 دُور۔ اور اتنا تنہا۔“

”ٹیپو سلطان کی ہیٹ لگاتے۔“
 ”ایں۔؟“

”جی ہاں مسزینگ۔ ایک صاحب رصد گاہ سے اسے دیکھ کر کہنے لگے اسکی رنگ تو بالکل ٹیپو سلطان کی ہیٹ معلوم ہوتی ہے!“
 ”ہا ہا۔۔۔ دیری گڈ۔۔۔ دورین سے ہر ستارہ کتنا اکیلا دکھلائی دیتا ہے اور ایسا بے چارہ سائنچر انسانوں کی تقدیروں کو بھلا کیا متاثر کرے گا؟“

ڈائینگ روم میں داخل ہو کر وہ میز کے سرے پر کھڑی ہو گئیں۔ ”خواتین و۔۔۔
 ”اُمّی بیٹھ جاتیے۔ حسین بخش۔“
 ”ہا ہا ہا ڈاکٹر صاحب۔ ہم لوگ دلی والے ہیں۔ حسین بخش سے نہیں ڈرتے۔
 ہم چاول پہلے کھاتے ہیں بریانی نوش کیجئے۔ دہرہ دون کا باس متی مینال کوٹھی
 چوک، کا زعفران۔ اٹا وے کا گھی۔ انگلش چائنا۔ رشن سلور۔ گوان فرنیچر۔
 نواب جان کی امر کہانی زندہ باد۔“

”منصور۔ پورا امی از کو امیٹ ڈرنک۔ تم کو معلوم ہے یہ برسوں کلکتے کی اسکاٹش
 فرم سکرپٹری رہیں جو بیس سال سے ڈاکٹر ہوں۔ اور یہ ساز و سامان میں نے اپنے
 نوبل پرفیشن کی حق حلال کمائی سے۔۔۔“ اسکی آواز حلق میں اٹک گئی۔ چہرہ
 سُرخ ہو گیا۔ اب اسے اپنی ناممکن قسم کی والدہ کو معاف کرتے رہنا مشکل معلوم
 ہو رہا تھا۔ ”اُمّی ہمیشہ تمہارے سامنے میری توہین کرتی ہیں۔ جانے وہ مجھ سے کس چیز
 کا بدلہ لینا چاہتی ہیں؟“

منصور اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ عنبریں نے آنسو خشک کیے۔

عذیب بانواب ان دونوں کو گھور رہی تھیں: ”بھاگ ان بردہ فروشوں سے“ انھوں نے ڈپٹ کر بیٹی کو مخاطب کیا۔

”میم۔ ہمارے ہاں لوگ طوائفوں سے شادیاں کرتے ہیں ان کو عزت بھی ملتی ہے۔ کوئی الکا بائیکاٹ نہیں کرتا۔ آپ نے خواہ مخواہ اس مسئلے کو اپنے لیے ایک بکھڑا بنا لیا ہے۔ اللہ بھول جائے یہ قصہ۔ آئیے اس لمحے سے ہم یہ طکریں کنو اب بیگم کبھی کہیں سی نہیں۔“

حسین بخش گرم چپاتیاں لیکر اندر آتے۔ انگریزوں کے زمانے ٹرینڈ خانساں کی حیثیت سے صاحب میم صاحب کوگ کی کیفیات و معاملات سے چشم پوشی کی اور دبے پاؤں واپس گئے۔

مسز بیگ اپنی کہے گئیں۔ ”پچھلے زمانے کے نحاسوں میں مولشی اور لونڈی غلام ایک ساتھ بکا کرتے تھے۔ مولانا — یوں تو مارکیٹ میں تمہارا بھاء بھی بہت چڑھا ہوا ہے۔ آج یہاں ڈنر اڑا رہے ہو کل وہاں۔“

”آئی بگ یور پارڈن“ منصور نے بھٹنا کر جواب دیا۔

خاموشی - عنبریں شرم سے کٹی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اب کھانا زہر مار کر رہا ہے اور جلد از جلد یہاں سے بھاگنا چاہتا ہے۔

آج بہت بُرے پھنسے۔ عذیب بانو ایک بڑی سی سفید مٹری کی طرح بیٹھی جالا بنتی جا رہی ہیں۔ خود اس جالے سے چمٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جو دوسری مٹریاں انکے لیے بن گئیں۔ اپنے تلخ تجربات کی بنا پر عذیب بیگ اینٹی مسلم، اینٹی انڈین بنیں۔

اگر انکی زندگی خوشگوار گزری ہوتی۔ مسلمان شوہر اچھا ثابت ہوتا۔ یا کسی بہتر آدمی سے انکی شادی ہو جاتی۔

جہاں ممکنات بیکراں لیکن ہم حقیقتوں میں محصور۔
اولیائے کرام کا ارشاد ہے کہ جو لوگ سماج کی تلچھٹ کہلاتے ہیں انکے دکھ درد جان
دان سے محبت کرنے لگو گے۔
عندلیب بیگ سماج کی تلچھٹ تھیں؟ نفیس، متھن، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔

وہ حکین کاٹنے میں مصروف تھیں بیلخت چھرا اٹھا کر مہمان سے مطالبہ کیا۔
”سنہ سینتالیس میں تم کتنے بڑے تھے؟“

”جی — جی اسکول میں پڑھتا تھا“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔
”یاد ہے اخباروں میں مغویہ لڑکیوں کے ہولناک حالات۔ گھردالوں کا واپس لینے سے
انکار EXTREME SITUATIONS میں بھی عورت کی حیثیت سکندری بے عزتی ہوئی گویا
اسکے مردوں کی۔“

”آپ کو مسلم سماج میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ لیکن یتیموں اور یتیم خانوں اور مساکین
کی امداد کے احکام کا سبق ایسا گھٹی میں پڑا ہے ہم لوگوں کی غریب سے غریب مسلمان فوراً
مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔“

”پھر —؟“

”جی مجھے تو یہ یاد ہے کہ الجمیعت وغیرہ میں اپیلیں چھپا کر تھیں کہ مسلم نوجوان اپنے
فرقہ کی مغویہ لڑکیوں سے شادیاں کر لیں۔“

”پھر — کیں؟“

”بے شمار نے۔“

”ارے واہ — واہ بے بانگی کے مرغے!“
”آئی جان — پلیر —“ غنبر پھر آنکھوں سے موتی پرونے لگی۔

”نی میں چھم چھم رونیاں — میں چھم چھم — اب میں چپ رہونگی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دھس داور پیدا۔ بابا۔ سنو غفور کا شغرا نٹا غفیل — عالمگیر سفاکی کا پہلا نشانہ ہمیشہ رتاں تے کڑیاں۔ پوسٹ دار جرمنی۔ جاپان۔ اٹلی۔ ویت نام۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ کشیتوں کے پشتے لگ گئے۔ ایک روسی بھگیتا کلکتے آیا تھا سفید روسی لڑکیاں خاموش ہندوستانی فلموں میں نچاتا تھا۔ سرجی گرنوف“

”ہولی ووڈ میں ناچتیں تو آپ انلو قابل رحم نہ سمجھتیں“، عنبر نے آنسو پونچھ کر بحث کی۔
 ”KEEP YOUR GOB SHUT“ اسکی والدہ خالص جی جی آواز میں چلا تیں۔
 منصور نے ترمی سے کہا: ”ساری دنیا میں لاتعداد عورتیں ایسی بھی ہیں جو مجبور ری کے بجائے شوقیہ۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ عطائی کسبیوں کو سیدخل کر رہی ہیں ہرے“

”اچھا وہ راحت بائی گجرا بائی کیا ہوئیں۔ اور مہر و خالہ؟“
 ”مہر و خالہ —؟ برا حشر۔ علاج کے لیے پٹنے جا رہی تھیں۔ شد و ماموں کے ساتھ۔
 چلتی ٹرین پر ڈاکوؤں کا حملہ۔ ماں بیٹے۔ دونوں —“ عندلیب بانو نے اپنی گردن پر انگلی سے
 گویا چھری پھیری۔ سارا زیور لوٹ کر لے گئے ڈکیت۔
 ”زیور پٹنے کیوں لے جا رہی تھیں؟“

”کہیں شہو بائی انکی میٹاں پر قبضہ نہ کرے۔ بنک کے بجائے صندوق چھپر کھٹ تلے
 چھپائے رکھتی تھیں۔ اکتوبر سنہ سینتالیس میں شموغ آل اولاد دلی سے اڑ چھو“، عندلیب بانو
 نے دائیں ہاتھ سے ہوائی جہاز کے ٹیک آف کازرت کیا۔ ”چاہنے والے اسپیشل طیاروں پر
 اڑا لے گئے۔ پرانے قلعے میں پڑے کنبوں کی حق تلفی کر کے گجرا بائی کی ایک نواسی انگلینڈ
 میں لیڈی اف دی مینر بن گئیں۔“
 ”اوہو۔۔۔“

”اسکے امیر خاوند نے انگلستان میں ایک لارڈ کا کاسل خرید رکھا ہے۔ اولاد کیمبرج میں رہ رہی ہے۔“ عندلیب بانو نے گویا شورٹ ہینڈ میں بات ختم کر کے نیپکن سے چہرہ خشک کیا۔

”چاند پول بازار سے کیمبرج ڈیم گڈ — آپ جیسی ترقی پسند کو تو ان کی مدگی سنور نے پر خوش ہونا چاہیئے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ منصور نے کہا۔
 ”میں کب کہتی ہوں بُری بات ہے۔ اگر ہماری اصلیت بھی یہاں کھل جاتے۔
 ن کہیں گے چاند پول بازار سے ادنبرا — ڈیم گڈ — بڑی خوشی کی بات۔“

”اُمی جان تو اس صورت حال میں آخر مجھے کیا کرنا چاہیئے خود کشی؟“
 انہوں نے چھری میسر پڑتی۔

”خود کشی کریں تمہارے دشمن۔ مرتے وقت ماکو یہ GUILT کیوں رہا کہ
 وہ سیدھی دوزخ میں جاتینگے جہاں تھوٹر — مرزا سبط احمد — شیخ عبدالباسط۔
 اندر سے رینال — وہ کینے کیوں نہ تھوڑیں تھوٹر کی بھجیا؟ کہاروں کی غلطی
 سے انکورات بھر مہر دے کوٹھے پر رکنا پڑا۔ انہیں جو تپے بار کر گھر سے نکال
 دیا۔ اور بالا خانہ ہی آباد کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اصل گنہ گار شیخ عبدالباسط ہیں یا
 نوابن چھو کرے؟ حضرت مولانا منصور احمد بخاری — مسلم معاشرے کا ایسا بصرم
 روئیہ کیوں؟“

”وہی بلی گار دولے نواب صاحب کی بات یاد آتی ہے کہ اپنے معاشرے
 کے بزرگوں کو مطعون کرنے سے پہلے ذرا انکے حالات پر دھیان دھر لیجئے۔“
 ”بولو جی۔ گئی جن کا ہے یہ دھروں دھیان —؟“

”گزشتہ نسلوں کے سماجی رویوں کا ذرا فراخ دلی سے تجزیہ کیجئے تو شاید تنہی
 نلنی محسوس نہ ہو۔ آپکو ایک بات بتاؤں۔“ منصور نے کرسی پر پہلو بدلا — ”عرض
 کیا تھا نا میرے ازبک پردادا مسجد فقیوری میں مولوی ہو گئے تھے۔ مولوی نذیر احمد

کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انکار و زناچہ ابا کے پاس موجود تھا۔ وہ میں نے پڑھا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ایک مرتبہ دلی کے چیف کمشنر کلارک نے ایک گرلز اسکول قائم کرنے کی تجویز دلی کے مقتدر مسلمانوں کے سامنے رکھی۔ انھوں نے مسترد کر دی۔ غدر سے قبل پردے کی اتنی شدت نہیں تھی۔ لیکن سنہ ستاون کے بعد مسلم سماج کی تباہی اور DEMORALISATION اور کر سپین مشنریوں کا خوف۔۔۔ آپکوان مصائب کا کیا اندازہ ہے۔؟ ایام غدر میں مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھانجا بھتیجا، بڑھا جوان لنگڑا لولاجو ہاتھ آیا اس سے کر دیں تاکہ وہ بے عزت ہونے سے بچ سکیں۔ میری پرنائی کا ایمر جنسی نکاح اسی طرح کیا گیا تھا۔ ان گنت لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ اسکی یاد مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ خود آپکی دلتواڑ اور مہر و قتل عام کے بعد چاٹری جاپہنچیں رائٹ۔؟ اسیوجہ سے مسز بیگ مسلمانوں کے ہاں غدر کے بعد اتنا شدید پردہ رائج ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے چیف کمشنر کو جواب دیا کہ مسلمان اپنی نوعمر لڑکیوں کو ایک منٹ کے لیے اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے کو تیار نہیں چنانچہ مدرسہ بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

”علاوہ ازیں۔۔۔ نوابین کے معاملے میں شیخ عبدالباسط کے اتنے شدید رسی ایکشن کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ڈپٹی کمشنر کلارک کو یہی بات سمجھائی تھی کہ اکیلی لڑکی گھر سے جاتی ہے اسکول۔ اور وہاں یا کہیں ادیارا رستے میں اسکے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے۔۔۔“

”ریپ“

”جی۔ یا فرض کیجئے وہ خود کسی چکر میں پڑ جاتی ہے تو اسکی سزا از روئے شرع بہت سخت ہے۔“

”اب دُرے لگتے ہی لڑکی مر جاتے گی۔ سخت جان ہوئی تو زندہ درگور۔“

موشل آؤٹ کاسٹ - دونوں صورتیں بھیانک۔

”اچھا غدر کے بعد انگریزی قانون لاگو ہو چکا تھا لہذا ADULTERY کے مقدمے کے لیے کچہری۔ اس رسوائی کا سامنا کرنے کے بجائے لڑکی کو زہر دینا بہتر۔ تو آپ ملاحظہ فرمائیے۔ گھر سے نکلنے۔۔۔ اسکول بھیجنے میں لرزہ خیز ممکنات اور انکے نتائج کا خوف شکست خوردہ مسلمانوں کے دلوں میں اسوقت بیٹھا ہوا تھا۔ انکے ڈیلیما پر غور فرمائیے۔“

”یہ کب کا واقعہ رہا ہوگا۔؟ لیجئے میں درک آؤٹ کرتا ہوں۔ کل غبر نے بتلایا کہ بعمر اڑسٹھ سال ۱۹۲۵ء میں نواب بیگم کا انتقال ہوا۔ اور چودہ سال کی عمر میں وہ شیخ عبدالباسط کے گھر سے نکالی گئیں۔ تو سمجھئے یہ لگ بھگ ۱۸۹۲ء کا واقعہ رہا ہوگا۔“ آپ ۱۸۹۲ء میں ایک اوسط ذہن کے قدامت پرست دلی والے مسلمان سے یہ سطرچ توقع کرتی ہیں کہ انکی نوعمر ملازمہ جو چاؤڑی کے ایک بالا خانے پر رات گزار کر ایک قیمتی شال اوڑھے گھر لوٹتی ہے وہ اسے واپس لے لیں گے؟ جبکہ چوٹن سال بعد نئی روشنی کے ان گنت ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں نے اپنی مغویہ عورتوں کو واپس نہیں لیا؟ آپکے ہاں کٹ گلاس بہت نفیس ہے۔“

”دی آنا میں خریدا تھا۔ پیسہ ہو تو کیا نہیں خریدا جاسکتا۔ کٹ گلاس کی کیا حقیقت۔“

”جی ہاں۔ یہ تو بڑی OBVIOUS سی بات ہے۔“

”تم بھی پیسے کی اہمیت کے قائل ہو؟“

”پیشہ۔ پیشہ۔۔۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”ایک حد تک۔۔۔ کون نہیں ہے؟ میرا بچپن اتنا افلاس زدہ گزرا کہ جیھی طے کر لیا تھا۔ ڈاکٹر بن کر خوب کمادوں گا۔“

”ڈاکٹر ہی کیوں۔ بزنس مین کیوں نہیں؟“

” وہ - ایسا ہوا بیگم صاحبہ کہ ہمارے محلے میں ایک بچہ دو لہند ڈاکٹر کا تھا۔ رات کو میں اسکول کا ہوم ورک کرنے انکے مطب کی خوب روشن سیڑھی جا بیٹھتا تھا۔ کھنوں نے مجھے اندر آکر پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پھر میں کے ایک کونے میں لیمپ کے نیچے براجتا۔ جب ہی مجھے ڈاکٹری سے بھی شغف پہ ہوا۔ انہی مرحوم نے میرا داخلہ علیگڑھ میں کروایا۔ سنہ ستالیس کے فسادوں بے چارے مارے گئے۔“

دریچے کے باہر کسی کی آواز آئی۔
 ”کون ہے؟“ عنبریں نے پوچھا۔
 سفید رومال میں بندھا کٹورہ دان ہاتھ میں لیے حسین بخش اندر آئے۔
 ”نہیں بیٹیا۔ بخشو بھائی کے ہاں آج نذر تھی ہمارا حصہ لے کر آئے تھے۔“
 ”اوہ۔ بخشو۔ ابن انارکلی۔!“ مسز بیگ بولیں۔

”بخشو تو انارکلی کے ہیرو ہوا کرتے تھے نہ کہ فرزند۔“ منصور نے کہا۔
 ”بخشو نہیں۔ بخشو۔!“ عنبریں نے تصحیح کی۔

”یہ شہزادے نہیں۔ غلام زادے ہیں۔ غلام ابن غلام ابن غلام۔ تمہارا اس سرمایہ دار سوسائٹی نے ان گننام و شیعہ دار جیسے شہزادوں کا بھی پلتھین نکا دیا۔ غلام تو خیر غلام ہیں ہی۔“ مسز بیگ نے ایک گہری سانس لی۔ ”تمہارا اس نستعلیق دوست کا کبنا نام ہے عنبر۔؟“

”رفعت آرا بیگم“

”ہاں۔ رفعت آرا بیگم۔ ضلع ہردوئی کے کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی۔ ایہ روز آئیں۔ میں بیلی گار دسے ایکیج بنا کر لوٹی تھی۔ کہنے لگیں کسی ویک اینڈ پر یہ تشریف لاکر تصویریں بناتے۔ ہمارے موٹا اعلیٰ نواب صدر جہاں کا مقبر

بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔ پہاڑی اور شاہ آباد میں ان کنت عمارتیں ہیں مغل پیریڈ کی۔ دادا صدر جہاں اکبر کے وزیر اعظم تھے۔ انکے مقبرے میں ستون بے شمار ہیں۔ چھت نذر د۔ کہتے ہیں راتوں رات جنات روضے پر چھت ڈال رہے تھے لیکن صبح منہ اندھیرے وقت سے پہلے کینزوں نے چمکی چلا دی۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر غائب۔ ”میں نے کہا اے پٹیا تو جنات دوسری رات کو آجاتے وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس نے آواز دی۔ انارکلی!۔۔۔ میں نے دل میں کہا یہ بی بی تو بہت تاریخی ہیں۔ اکبر اعظم اور انارکلی سے کم بات نہیں کرتیں غرارہ پہنے ایک بوڑھی ملازمہ کار سے اتری عفت آرا ریگم کا پاندان سنبھالے۔ پھر باہر جا بیٹھی۔ میں نے کہا پٹیا تمہاری تو نوکرانی بھی نہایت افسانوی ہے بولی ہماری پرانی کینز ہے۔

”کینز۔۔۔ میں نے تجب سے دہرایا۔ بولی جی ہاں۔ ہمارے یہاں کینز میں غلام تو اب تک خریدے جاتے تھے۔ آزادی سے قبل تک۔ میں نے پوچھا انھیں بیٹا کون تھا۔ کہنے لگی غریب کسان اور کون۔ کہنے لگی۔ بیٹس آنے اور ڈلیا بھر کو دودن فی ٹرکی روکا قیمت مقرر تھی۔ پشت در پشت ہمارے ہاں کام کرتے تھے۔ بلا تنخواہ؟ میں نے پوچھا۔ بولی بالکل۔ عمر پٹے میں تنخواہ کیسنی۔ بس روٹی کپڑا۔ غلاموں سے کینزوں کے بیاہ کر دیے جاتے۔ جمیز دیا جاتا۔

”میں نے جمیز کی تفصیل پوچھی۔ بولی بہت کچھ۔ چاندی کے گہنے۔۔۔ بجلیاں۔ ڈھولنا۔ چندن ہار۔ طوق۔ کنٹھ سری۔ چمن چوڑی یا پیری چیم۔ چکن کے کرتے۔ مشروع کے سیدھے پانچامے۔ تن زیب کالال دوپٹہ پیلے آنچل والا۔۔۔ پاؤں میں ملکیت جوتی۔ بالی پتے اور نتھ سونے کی دی جاتی تھی۔ اتنا جمیز کینزوں کو ملتا تھا۔ میں نے کہا ہاں اور کیا چاہیے۔ بولی۔ ہمارے ہاں کی چند کینز ہیں تو اب تک زندہ تھیں۔ دل سہار۔ پھول کھلی۔ حسن بہار۔ دل آفر۔ مین سکھ۔ یہ انارکلی اب بھی جیتی ہیں۔ ہماری دادی کی رادھا کینز افیمچی تھی۔ ایک نیولہ پاں رکھا تھا۔ کنویں کی منڈیر پر پڑی رہتی تھی۔ ایک دن اسی کنویں میں گر کے مر گئی۔ ایک اور تھی۔

گوراکنیز۔ وہ چکی پیستے دھان کوٹتے متواتر بڑبڑایا کرتی تھی۔ بولتی کبھی نہیں تھی۔ جد
زمینداری ختم ہوئی کنیز غلام آزاد ہو گئے۔ انکو زمینیں دے دی گئیں کھیتی کرے
لگے۔ جو وفادار تھے انھوں نے ہماری ڈیوڑھیاں نہ چھوڑیں۔

”انارکلی بھی انھیں وفاداروں میں سے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ کہنے لگی جی ہاں
لیکن انکا بیٹا بخشو لکھنؤ آگیا رکشا چلاتا ہے۔ کلارکس آودھ کے پھاٹک پر اپن
رکشا کھڑی کرتا ہے۔ میں اس سے کہتی جاؤں گی جب ضرورت ہو بلوایجیے۔
بے زبان ہے کرائے پر جھگڑتا نہیں“

”میں کلکتے میں پلٹی بڑھی مجھے علم نہ تھا کہ کو دوں کیا شے ہے۔ رفعت آرا بیگ
نے بتلایا۔ ایک حقیر قسم کا چاول۔ اگر گھوں میں مل جائے۔ امیروں کے ہاں
انکو چن کر پھینک دیتے ہیں۔ عزیز غریبا سے کھاتے تھے۔

”سواروپہ اور ڈلیا بھر کو دوں۔! سمجھے مولانا۔ آج قانونی اور غیر قانونی
TENDER بھی بدل گئے ہیں۔ خریدار بھی مختلف“

”شاب“ بہادر نے گیلری کے دروازے میں سے جھانکا ”شہوار بٹیا کا
فون — پری محل“

”پوچھو کیا بات ہے“ غنبر نے کہا۔

”وہ بولتی ہیں ششدر کی طبیعت کھراب ہے۔ ڈاکٹر شاب کو زلدی بھیجو“

”منصور میز سے اٹھا۔ چند سیکنڈ بعد گیلری میں سے اسکی آواز سنائی دی۔

”کیا ہوا —؟ ارے۔ اوہو — اچھا۔ ابھی آتا ہوں۔ ہاں ہاں۔ فوراً گھبراؤ

مت بھئی۔ ابھی پہنچتا ہوں — RELAX“

وہ کھانے کمرے میں واپس آیا ”سوری مسز بیگ — غنبر — نگار خانم

اچانک بیمار — شاید ENGINE کا کچھ گھپلا ہے“

”تم ہارٹ اسپیشلسٹ تو ہو نہیں“ غنبر سرد آواز۔

”انکا پرسنل فریشین تو ہوں بھی۔ کیا میرا فرض نہیں کہ فوراً جاؤں۔“
 AND THANKS FOR THE اچھا گڈ نائٹ
 اب بمبئی سے واپسی پر “ LOVELY DINNE

عنبریں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کمرے میں سناٹا۔ عنذیب بانو ذرا لڑکھا کر اٹھیں۔
 اب کمرے کی شمعوں پر چھوٹکیں مارنے لگیں۔ شمعیں ایک ایک کر کے بجھتی گئیں۔
 دار کا سوئس کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔

”کیسا بھاگا“ کچھ دیر بعد عنبریں نے کہا۔
 ”جب تمہاری کال آتی ہے تم سارے کام چھوڑ کر اسی طرح نہیں دوڑتے؟“
 نربیگ نے آہستہ سے جواب دیا۔

”جیسے آنے اور ڈلیا بھر کودوں! — LEGAL TENDER اور ILLEGAL اور بدل گئے ہیں۔ آج پوری شام میں آپ نے ایک پتے کی بات کہی !
 اصل مشاعرہ! آپ کو معلوم ہے یہ لوگ کتنے امیر ہیں؟ اور پتہ ہے ڈاکٹر کا شغری کا
 اتنی فلسفہ کیا ہے؟ حصول کامیابی۔ نرسنگ ہوم کے لیے ہلکان ہوا۔ اب بلتھ کلب
 کے لیے سرگاڑی پیر پہنیے۔ کامیابی اور دولت کے امریکن فلسفے کا پسکا
 نیل۔ یاد ہے ابھی ابھی اس نے کیا کہا تھا؟ پچپن میں اتنا افلاس دیکھا۔“
 ”وہ تو زبردستوں کا مذاق اڑاتا ہے“

”سب دکھا دے کی باتیں ہیں امی جان۔ اور جب لڑکی بے تحاشا دو تہمتوں پر
 حسین اور کم عمر — اور اعلیٰ نسب —“

”عنبر ڈیر۔ تم خواہ مخواہ شکلی —“ مسز بیگ کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

”کیپ کو ایٹ امی — عمر بھر آپ محرائے لیان کی SPHINX کی طرح
 ش رہیں۔ اب آپ کو یہ کتنا بکھانے کے لیے کس حکیم نے کہا تھا؟ لگاتار۔
 بھی وہ آئے وہی گراموفون — اس نے تو نواب بیگم کی تصویر کے متعلق

کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ اٹا کوئی مغل شہزادی سمجھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔“

چانک اس نے میز پر مٹک مارا۔

”عنبر—!“

”ایک امیر کبیر شریف زادی۔ ایک یوریشین ڈانس کی اولاد۔ ہا ہا ہا۔
گیہوں کے دالوں میں آکر کودوں مل جائے تو اسے چُن کر الگ کر دیتے ہیں۔“
دوسرا مٹک۔

”عنبر ہوش میں آؤ۔ تم پھر سٹرککل ہو رہی ہو۔“

”کودوں۔“

تیسرا مٹک۔

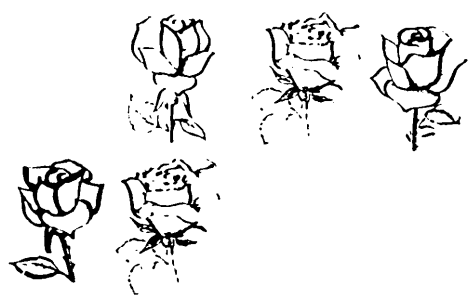
ایک گلاس سبرک کر چھن سے نیچے گرا۔

بہادر فوراً اندر آکر کانچ کے ٹکڑے چُھنے میں مصروف ہو گیا۔

عزراٹھ کراپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ عنذیب بیگ نے دیچے کے پردے برابر کرنے سے قبل حسب عادت باہر نظر ڈالی آسمان پر تاروں کی روشن ندی اسی طرح بہہ رہی تھی۔ سارا باغ معطر تھا۔ گویا نہایت رومنیٹک رات۔ کلکتے میں وہ کیا نظم مولوی صاحب نے یاد کرائی تھی۔ خدا کی قدرت کے ہیں نظارے — زمیں پہ پھول آسمان پہ تارے۔

آکاش گنگا ہے کہ جھللائے جا رہی ہے۔ لامتناہی۔ افلاک کے تاریک فاصلوں میں
جانے کہاں جا کر گرتی ہے۔

دُرون ذات کی تارے والی کوٹھی میں دُورین سامنے آئی تو بھاگ گیا —
الغ بیگ سمرقندی۔





(۲۲)

پریمی محل

بخشور کشا والا اپنی سواری بلرام پور ہسپتال سے لارہا تھا۔ لال باغ کی سڑکوں پر پہنچ کر گڑ بڑا گیا۔ بڑے میاں صحیح پتہ ہی نہیں بتا پا رہے ”اندھیرے میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ بڑے میاں نے جھنجھلا کر کہا ”سڑکوں کے نام بدل گئے ہیں۔ کالی داس تلسی داس۔۔۔ اسی قسم کا کچھ نام ہے بھائی“

”ابھی تو ہم بالیسی مارگ کا چکر لگا کر لوٹے ہیں۔“
 ”ارے بھئی پہلے وہ رٹلیج روڈ تھی نا۔۔۔ اس کے آگے۔ ہمارے حواس باختہ ہیں۔ اس کوٹھی کے پھاٹک پر املاس کا بیڑ کھڑا ہے۔۔۔ وہ رہا۔۔۔“
 بخشور کشا ایک پھاٹک کے قریب لے گیا۔

”کون؟“ چوکیدار لٹکا را۔

بڑے میاں جس انداز سے رکشا میں بیٹھے تھے معلوم ہوتا تھا فٹن اور موٹر کار کی سواری کے عادی رہے ہیں۔ ”بڑی خانم۔“ انھوں نے گویا پاس ورڈ دیا۔
 ”سلام۔ نواب صاحب“ چوکیدار بولا۔

برساتی میں پہنچ کر نواب صاحب نے شام سنگھ سے کہا ”چھوٹی خانم۔“
 شام سنگھ اندر گیا۔ بخشور نے رکشا لے جا کر ایک تاریک گوشے میں کھڑی کر دی۔
 نواب صاحب سیٹ پر بیٹھ دربان کا انتظار کرتے رہے۔

ایک موٹر سائیکل گھر گھڑاتی ہوئی آئی۔

ڈاکٹر کا شغری۔ وہ سیدھے ڈاکٹر عنبریں بیگ کے مکان واقع روربنک روڈ سے آرہے تھے اور صاحبزادیوں کے دولت کدے تک فاصلہ انھوں نے ریکارڈ ٹائم میں طے کیا تھا۔ ٹیلی فون پر شہوار خانم نے کہا تھا باجی پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ایسی ایمرجنسی میں بحیثیت ایک فرض شناس ڈاکٹر منصور کا شغری اپنے مرلیضوں کے ہاں عطار دکی رفتار سے وارد ہوتے تھے۔

ایک قدم برساتی میں۔ دوسرا سیڑھی پر تیسرا برآمدے میں۔ آبشار والے کمرے سے گذرتے اندر گئے۔

دولوں بہنیں بی۔ وی۔ لاؤج میں چرمی آرام کرسیوں پر نیم دراز خوش گبیوں میں مصروف تھیں۔ نگار خانم بے حد صحت مند نظر آرہی تھیں۔ اور خشک میوے سے شغل کر رہی تھیں منصور کے قدموں کی مانوس چاپ پر کان لگا کر شہوار نے فوراً دایاں ہاتھ پھیلایا۔ ”بجی لائیے ایک عدد دہرا پتہ نکالیے۔ میں جیت گئی شرط آپ سے کہا تھا اگر فون کروں گی کہ بجیا سخت بیمار ہیں ڈاکٹر منصور اڑے چلے آئیں گے۔ چاہے آدھی رات کو بلائیے۔ ابھی تو سو ادس ہی بجایا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب لاؤج میں داخل ہوئے۔ شہوار فوراً بولی۔ ”وہ۔ جنون کا کیسیٹ آگیا ڈاکٹر صاحب۔ میں نے سوچا یوں تو آپ آنے کے نہیں باجی کی علالت کا بہانہ۔“

ڈاکٹر منصور دنگ رہ گئے۔ رومال سے چہرہ پونچھ کر آہستہ سے کہا۔ ”یہ آپ نے اچھی بات نہیں کی۔“

”ALL WORK AND NO PLAY MAKES JACK A DULL BOY“

نگار خانم بولیں ”اتنے مصروف آدمی۔ کچھ دیکھنے بھی کبھی نہیں جاتے۔ ہم نے سوچا اسی بہانے۔“

”یہ آپ نے بالکل اچھی بات نہیں کی۔“ منصور نے دہرایا۔

”میں نے تو شہوار کو سمجھایا تھا۔ یہ بہانہ نہ کرو۔ مگر اس کا بچپنا ہے۔ آپ کو کلنگ

فون کیا — پھر آپ کے فلیٹ فون کیا پھر یاد آیا شام کو تو آپ اکثر اپنی پارٹنر ڈاکٹر ٹرن کے گھر پہ ہی پائے جاتے ہیں —“

اس اشنا میں شہوار خانم ویڈیو پر جنون شروع کر چکی تھیں۔

”نوش کیجئے“ نگار خانم نے خشک میوؤں کی پلیٹ پیش کی۔ ”یہ کابلی بادام آج صبح ہی دلی سے آئے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپیہ کلو۔ افغانستان کی جنگ کی وجہ سے اتنے گراں —“

بھئی نفیسہ علی کیا حسین لڑکی ہے۔ اس پکچر کی شوٹنگ جب ملیج آباد میں ہوئی تھی ہم لوگ دیکھنے گئے تھے۔ ششی کپور شانہ اعظمی، نصیر الدین شاہ جلیقہ کپور، عصمت چغتائی سب سے ملے — ڈاکٹر صاحب — یہ اخروٹ تو نوش کیجئے۔ آپ نے اپنی پارٹنر خوب منتخب کیں —“

”جی۔ شارڈ اکھنہ عنبر تین بیگ دونوں بے حد لائق اور نفیس خواتین ہیں۔ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہے؟“ منصور نے دکھائی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کھنہ سے تو ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر ڈاکٹر بیگ —“ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نگار خانم نے کہا ”وہ — ایسا ہے — ایسا ہے ڈاکٹر صاحب کہ ہم ایک قدامت پرست جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں P's سے میل جول معیوب سمجھا جاتا ہے —“

”P —“ منصور نے بلڈ پریشر کے آلے کی پیٹی نگار خانم کے بازو پر باندھتے ہوئے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

”جی۔ آپ جانتے ہیں نا — P —“ شہوارے GIGGLE کرنا شروع کیا۔

”PEA — یعنی مٹر —؟“

”جی نہیں — P — P —“ کھی کھی کھی — قہ — قہ —“

شہوار کی ہنسی — نگار خانم کا قہقہہ۔

”P —“ نہیں جانتے؟ —! PROS —“ شہوار نے وضاحت کی۔

”PROS AND CONS“ —“ منصور نے پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی۔ آپ کے امریکہ میں انھیں کیا کہتے ہیں؟ ارے ROS بھئی۔“

”اوہ۔ آئی سی۔“ ڈاکٹر منصور نے انتہائی آزر دگی اور تعجب سے دونوں بہنوں پر نظر ڈالی۔

”آجکل آزادی کا زمانہ ہے۔ شہوار۔ ذرا پیکر کی آواز کم کر دو۔ آجکل آزادی کا زمانہ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سب نے شرافت کی نقابیں اوڑھ لی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر بیگ اور انکی ماں کے بارے میں معلوم نہیں؟ وہ تو کیسے ہمارے منجھلے بھیا بال بال بچ گئے۔ پچھلے سال یہ ڈاکٹر ٹنی ولایت سے لوٹی۔ منجھلے بھیا سے نینی ناں میں ملاقات ہوئی بھیا نے گھرا کر ہم لوگوں سے بہت تعریف کی۔ ہم نے کہا حسب دستور پیغام دینے سے قبل ہڈی بوٹی تو معلوم کر والو۔“

”آپ کے بھائی صاحب ORTHOPAEDICIAN ہیں۔“

”جی۔“ وہ کیا چیز۔“ نگار خانم نے پوچھا۔ پھر بولیں ”بڑی چھان بین سے تھوڑا سا پتہ چلا۔ اصل میں ماں بیٹیاں مدّتوں فارن میں رہیں اس وجہ سے انکے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں کسی کلکتے والے کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر ٹنی کی ماں بھی P تھی اور نانی بھی۔“ شکر کہ ہم بیوں کے خاندان سے بچ گئے۔ ورنہ کیا تھڑی تھڑی ہوتی۔ آپ کا تو کچھ اس قسم کا ارادہ نہیں۔“

غصے کی وجہ سے ڈاکٹر منصور کو خود اپنا بلڈ پریشر بڑھتا محسوس ہوا۔ ترشی سے جواب

دیا۔ ”میں اپنے ذاتی معاملات DISCUSS کرنا پسند نہیں کرتا۔“

”کم آؤں۔ آپ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں جیسے میں نے منجھلے بھیا کے متعلق آپ کو بتلایا اسی طرح پوچھ بھی لیا۔ لیجئے پسینہ کھائیے۔ یہ بھی بے حد ہنگے ملے ہیں۔ منجھلے بھیا کو دراصل یہ سودا ہو گیا ہے کہ گھر میں ایک ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ بیوی ڈاکٹر ہو۔ ایک میڈیٹری ہو۔ اسکے لئے بنوادیں۔ اپنی نگرانی میں چلائے۔ بہنوئی ڈاکٹر ہوا سے تو پچاس بیڈ کانرنگ ہو۔ بنوادیں۔ ان کے لئے معمولی بات ہے بفضل خدا۔“

”جی۔ ماشا اللہ۔“

”آجکل دو چیزوں سے زبردست آمدنی ہے۔ ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم۔ ایک پرائیوٹ اسکول۔“

کھٹ — ڈاکٹر نے کیس بند کیا۔ نگار خانم کو انکے بلڈ پریشر کی اطلاع دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”نرسنگ ہوم تو خیر آپ کا اپنا ہی موجود ہے۔ مگر ساجھے کا ہے — آپ اپنی پھٹ پھٹی پر آئے ہیں؟“ باجی پھر گویا ہوئیں۔

”جی —“

”منجھلے بھیمانے فیسیٹ کی ایجنسی لے لی ہے۔ آپ ایک گاڑی منتخب کر لیں۔ پے منٹ کی کوئی جلدی نہیں۔ ہوتا رہے گا۔“

شہوار بجیا کی بھونڈی باتوں سے نادم ہو رہی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب کے مستقبل کے سارے انتظامات آپ کو آج شام ہی مکمل کرنے ہیں؟ انھیں یکچہرہ دیکھنے دیجئے۔“ اس نے ”جنون“ کی آواز تیز کی۔ نفیسہ علی کا کلوزپ دیکھ کر نگار خانم بولیں۔ ”اس عمر میں شہوار بالکل ایسی ہی لگا کرتی تھی۔“

”تو اب میں کون ایسی ANCIENT ہو گئی ہوں۔“

باجی واقعی سٹھپاتی جا رہی ہیں۔

منصور نے شہوار پر نگاہ ڈالی۔ آج شام وہ گلابی غرارے کے جوڑے میں واقعی نہایت دکش اور حسین نظر آرہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ پھر بلوری صوفے پر بیٹھ گیا۔

شام سنگھ حاضر ہوا۔

”بیٹا۔ وہ کتابوں والے بڑے میاں بڑی دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔“

”اس وقت؟ بولو کل صبح آئیں۔“ نگار خانم نے جواب دیا۔

”کہہ رہے ہیں انکا لڑکا بہت بیمار ہے۔ کچھ پیسے فوراً چاہئیں۔“

”ان غریب لوگوں کا ہمیشہ یہی رونا رہتا ہے۔ آج بیوی بیمار ہے۔ کل لڑکا بیمار ہے۔ شہوار ذرا جا کر دیکھنا۔ ستوپچا سٹ دے کر رخصت کر دو۔ روز آکر سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔“
 یہ نگار خانم نامورنا ولست بہت ہی بدعورت ہے۔ منصور نے طے کیا۔ اور پھراٹھا۔
 ”میں جا کر بڑے میاں سے معلوم کرتا ہوں۔ انکے لڑکے کو کیا مرض ہے۔ اس کے علاج کی کوشش کروں گا۔ تھرڈ ورلڈ میں۔ بی۔ بی۔“

”کہاں جا رہے ہیں بیٹھے۔“ نگار خانم نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”لڑکے کو ہم نے بلرام پو ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ ان بڑے میاں کو جب آتے ہیں ستوپچا سٹ دیدیتے ہیں۔ آپ کس کس کی مدد کیجئے گا۔ یہاں ہر شخص یہی رونا روتا ہے کہ میرا حال پتلا ہے۔ بیٹھے۔“ نگار خانم نے انکا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھال دیا۔

منصور نے پھر پوچھا۔ ”یہ بڑے میاں کتب فروش ہیں؟ ابھی آپکے دربان نے۔“
 ”جلد ساز۔ ہمارا کتب خانہ ابھی پردھان پور سے منتقل ہوا ہے۔ چند خسنہ قلمی نسخوں کی جلد بندی ان سے کروانی تھی۔ تبھی سے یہ ہمارے پیچھے پڑ گئے۔“ شہوار نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔

اب بسنتی مہری اندرائی۔ ”بڑی بیٹا۔ چھوٹے بھیا کا پھون آوا ہے۔ مسکت سے۔“

”ادھو۔ معاف کیجئے گا ابھی آئی۔ مسقط سے ٹرنک کال۔“ نگار خانم بھی اٹھ کر مرقع زینے کی سمت لپکیں۔

منصور پھر ویڈیو کی طرف متوجہ ہوا۔ ”۱۵۵ کی ایک سچی کہانی۔ ایک یوریشین ماں اور انگریز باپ کی لڑکی سے ایک پٹھان زمیندار کے جٹوں خیر عشق کی داستان۔“
 نگار خانم نے چند ورق قبل اس بکچر کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مخصوص میلوڈ ری میٹنگ ٹائل میں اسے بتلایا تھا۔

تھبیٹر۔ نگار خانم کے ہاں بھی تھبیٹر کی فراوانی ہے۔ عندلیب بانو کے ہاں بھی۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔ کہ

بے چاری سرنریگ کے لئے ایک نامعلوم طریقے سے میرے رویے میں فرق آگیا ہے۔ پہلے میں اپنی ماں یا خالہ یا کسی اور بزرگ عزیزہ کی طرح انکا بے انتہا احترام کرتا تھا۔ اب وہ بات کیوں نہیں رہی؟ کیا میں بھی واقعی بنیادی طور پر شیخ عبدالباسط گولے والے کا وارث ہوں؟ سارا قساد جانکاری کا ہے۔ اودیا بڑی نعمت ہے۔

وہ اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ بالائی منزل پر دونوں بہنیں مسقط سے طویل گفتگو میں مصروف تھیں۔ کسی انسان کے پس منظر میں کوئی غیر معمولی سانحہ پنہاں ہو۔ اس کے کسی قریبی عزیز نے خودکشی کر لی ہو یا کسی کو قتل کر کے پھانسی چڑھا ہو یا اس کی کوئی عزیزہ اغوا کر لی گئی ہو۔ تو اس سانحے کی ایک غیر معلوم پرچھائیں سی اس بالکل غیر متعلق انسان کی شخصیت پر پڑ جاتی ہے۔ اگر دوسروں کو اس کے متعلق معلوم ہو جائے۔ اب بے چاری عین میں یہ حقیقت — کہ اس کی نانی کا نام نواب بانی تھا۔ ماں کا ”بلبل دمی ڈانسر“ — محض اس وجہ سے عین میں اب مجھے پہلے سے ذرا مختلف معلوم ہونی ہے کاش وہ لال پٹاری بند رہنی — اسے محسوس ہوا دریچے میں سے کوئی بھیانک سی ریچھ نما شے اندر جھانک رہی ہے۔ ذرا خائف ہو کر وہ پیچھے ہٹا۔ وہ شاگرد پیٹھے والا سبز پوش خطی باہر دانت نکو سے کھڑا تھا۔ ایلس ان ونڈر لینڈ کی CHESHIRE CAT کی طرح اندھیرے میں صرف اس کی مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔

باہر کا راکر کی شہوار کے بڑے بھائی ہلدوانی سے واپس آگئے تھے۔

”بھاگ جا بے —“ پاگل دریچے پر دنگ دے کر اتہستہ بولا۔ ”بھاگ جا

— ورنہ پھنسا اس اندر جال میں“ وہ ایک قہقہہ لگا کر CHESHIRE CAT

کی طرح تاریکی میں تحلیل ہونا شروع ہوا۔

شہوار خانم اور انکے پیچھے سنبھتی مہری کافی کے ٹرے لئے لاؤنچ میں آئیں

پیچھے پیچھے قبلانی بہادر۔ رنگ برنگی اشیائے آرائش اور روشنیاں انتہائی
میش قیمت بلوریں فرنیچر پر منعکس تھیں۔ رنگ کے اندر رنگ۔ پرچھائيوں کے اندر
پرچھائیاں۔ اندر جال کا طلسم۔

”بجیا کے نئے ناول کا۔“ شہوار نے کافی بناتے ہوئے منصور کو مخاطب کیا۔
”جشن اجرا ہونے والا ہے۔“
”مبارک ہو۔“

”سارے اردو اور انگلش پریس والوں کے صبح سے شام تک فون آتے رہتے
ہیں۔ حالانکہ بجیا تو پبلٹی بالکل پسند نہیں کرتیں۔ مجبوراً انٹر ویو دینے ہی پڑتے ہیں۔“
”بیشک۔“

”آج بھی ایک اردو اڈیٹر نے ٹیلی فون کیا تھا۔ باجی کے متعلق اسپیشل نمبر کالنے
پر مصر ہیں۔ کل صبح آئیں گے۔ وہ باجی کے احباب سے بھی مضمون لکھوا رہے ہیں۔
یوٹو HUMAN ANGLE باجی بحیثیت ایک پر خلوص دوست آپ بھی کچھ لکھ دیجیے۔“
”میں۔۔۔ مجھے معاف رکھیے۔ اچھا۔ اب اجازت؟“ کافی کا ایک گھونٹ
بھر کر منصور کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔ کچھ تو ضرور لکھیے۔ چند الفاظ۔ یا نہنتی پیغام رسالے کے لیے۔“
آپ بھی ایک معروف شخصیت ہیں۔ اور باجی کے ذاتی معالج۔“

”بھئی شہوار۔ میں ان چکرؤں میں نہیں پڑتا۔ نہ مجھے لکھنا دکھنا آتا ہے۔“
”اچھا انگریزی ہی میں چند الفاظ۔“ کل صبح اس اخبار کے اڈیٹر صاحب
باجی کو انٹر ویو کرنے آ رہے ہیں۔ ان سے کہوں گی آپ کو فون کر لیں۔“

دوسری صبح، دس بجے، حضرت زراغ دہلوی، جناب بطیموس اور جناب یفا تئوس

پنی سائیکلوں سے اترے۔ شام سنگھ نے انکو آبشار والے کمرے میں پہنچایا۔

ایوان نشست کے مصنوعی پہاڑی نما مینٹل پیس سے ایک مصنوعی آبشار جاری تھا۔ جس کا پانی ایک پوشیدہ نالی کے ذریعے پائیں باغ میں جا گرتا تھا۔ کمرے کے وسط میں فوارہ۔ شیشے کی چھت میں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔
”یہ کمرہ اگر نفاست سے سجایا جاتا تو بہت خوبصورت ہوتا۔ اب تو بالکل فخریچر کا نوروم۔“ حضرت زاغ نے اظہار خیال کیا۔

”بھائی خاموش رہیے۔“ جناب بطلیموس نے آہستہ سے کہا۔
”صاحب انکی فیکٹری میں نوکری آپ کے لڑکے کو ملی ہے۔ خاموش میں رہوں۔“
زاغ نے جواب دیا۔ ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے ایک سنہرے گھوڑے کو چھوا۔ اور بولے
”رو میں ہے خوش عمر کہاں دیکھتے تھے۔ نہ ہاتھ پاؤں میں ہے نہ پاؤں۔“
”زاغ صاحب بگلا گئے ہیں۔“ لیفٹننٹ بولے۔
”حق کو ہمیشہ پاگل کہلاتا ہے۔“ انھوں نے سقراط کے مجھے پراگلی رکھی۔“ پورے
فمرے میں یہی ایک معقول چیز نظر آئی۔ غلطی سے خرید لی ہوگی۔ آئیے حضرات ہم۔ یہاں
باندھی جی کے تین بندروں کی طرح بیٹھ جائیں۔ نہ کچھ دیکھیں۔ نہ سنیں۔ نہ بولیں۔“
”اہل ثروت سے اتنا تنفر آپ کے احساس کمتری کا غماز ہے۔“ بطلیموس
نے کہا۔ وہ تینوں ایک طویل سنہرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ٹیپ ریکارڈر سامنے منقش کافی
ٹیبل پر رکھا۔ مصنوعی جھرنے کی آواز سنتے رہے۔

”صدائے آبشاراں از اطاق شاہوار آمد۔“ زاغ دہلوی نے فرمایا۔

صاحبزادی شہوار خانم ہوا کے جھونکے کی طرح اندرائیں فرہنسیسی ”اویسم“ سے
معطر۔ آداب عرض کرنے کے بعد تینوں صم بکرم بیٹھے رہے۔ انکی بد تہذیبی پر جزبہز ہوتیں
”اڈیٹر صاحب تشریف نہیں لائے؟“ انھوں نے ایک مرصع اسٹول پر ٹکتے

ہوئے اس انداز میں دریافت کیا جو اپنے سے سماجی طور پر کم تر انسانوں کے لیے مخصوص رکھتی تھیں۔ یہ بے چارے مننی مسکین سے صحافی۔ انھیں زیادہ سر چڑھانے کی یوں بھی ضرورت نہیں۔ فوراً بے تکلفی پر اتر آئیں گے۔ دراصل ہمارے مڈل کلاس مردوں کو اب تک بے پردہ آزاد خود مختار خواتین سے بات کرنے کی نہ عادت ہے نہ سلیقہ۔ اگر ذرا دوستانہ انداز میں بات کی فوراً مغالطے میں مبتلا۔ ہمارے ہاں بیشتر لوگ اب تک مخلوط سوسائٹی کے عادی نہیں۔ لیکن بجایا حکم کہ اردو پریس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آؤ۔ میں اردو رائٹر ہوں۔ میرا تعلق اردو پریس سے ہے۔ شہوار مصر تھیں کہ جشن اجراء کے متعلق ایک پریس کانفرنس کلاکس آؤدھ میں کی جائے۔ اس میں انگلش کے نیشنل روزناموں ٹائمز آف انڈیا، اسٹیشن، ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس وغیرہ کے اسمارٹ، پائپ پیسے ہوئے نمائندے مدعو ہوں۔ نہ کہ یہ ٹٹ پوئجیے اردو والے۔

”جی۔ اڈیٹر صاحب نہیں آسکے اپنے بجائے ہم تینوں کو بھیجا ہے“ بطلموس نے جواب دیا اور زآغ دہلوی پر متفکر نظر ڈالی جو نہایت انہماک سے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر DOODLING کر رہے تھے۔ ”نگار خانم اردو فکشن کی لیتا پوار“ بطلموس نے کاغذ ان سے چھینا اور پھاڑ کر اپنے بریف کیس میں چھپا دیا۔

”آج صبح نگار صاحبہ نے اڈیٹر صاحب کی یاد دہانی کی تھی کہ انٹرویو کے لئے منتظر ہیں۔“ زآغ صاحب نے فرمایا۔

”پہلے آپ صاحبان کا تعارف ہو جائے۔“ شہوار خانم بھی رکھائی سے بولیں۔
 ”خاکسار کا فلمی نام بطلموس ہے۔ مزاحیہ کالم لکھتے ہیں۔ آپ جناب یقنا تو س ہیں۔ یہ بھی انکا فرضی نام ہے۔“
 ”جی۔ اتنا تو میں سمجھ سکتی ہوں کسی شخص کا نام سید یقنا تو س جین تو ہو نہیں سکتا۔“ بطلموس اور یقنا تو س نے تو صیفی قہقہہ لگایا۔ شہوار خانم سنجیدہ رہیں۔

”ہم فیچر لکھتے ہیں۔ زآغ صاحب سنڈے اڈیشن کے لئے مزاحیہ سیاسی غزلیں“
بطلیموس نے عرض کیا۔

”اڈیٹر صاحب نے کہلوا یا ہے کہ آپ نے جشن اجراء کے لئے جو تاریخ طے کی ہے اس کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیجئے کیونکہ اس ہفتے چیف منسٹر صاحب اور دوسرے وی۔ آئی۔ پی۔ لکھنؤ سے باہر ہوں گے۔ علاوہ ازیں جس قسم کا شاندار اپیشل نمبر نگار صاحبہ چھپوانا چاہتی ہیں اس کی تیاری میں بھی دیر لگے گی۔“
”باجی اپیشل نمبر چھپوانا چاہتی ہیں؟ خود آپ کے اڈیٹر۔“

”میڈم۔ ہم پریس کے آدمی ہیں۔ ہم سے کیا پردہ؟“ زآغ صاحب نے فرمایا

یہ شخص بہت ہی بیڈھب تھا۔ بے نکا شہوار خانم کا پارہ تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ باجی کی نصیحت یاد کر کے خاموش رہیں۔ سرد مہری سے پوچھا: ”اپوائٹمنٹ آپ کے اڈیٹر سے تھا۔ وہ کیوں نہیں آئے۔“

”انہوں نے فرمایا نگار خانم عصمت چغتائی تو ہیں نہیں جو انکو انٹرویو کرنے میں خود جاؤں۔“ زآغ صاحب بولے۔ شہوار کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا بطلیموس او پھنا تو اس نے زآغ صاحب کو گھور کے دیکھا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔
”اڈیٹر صاحب کو یاد دلاد دیجئے گا ہماری فیکٹیوں کے سارے اشتہار آپ کے اخبار کو دیے جاتے ہیں۔“ صاحبزادی شہوار نے ایسی بریلی آواز میں جواب دیا جو سیدھی قطب شمالی سے آرہی تھی۔

”بھائی زآغ آج آپ نے ہم دونوں کو نوکری سے نکلوانے کا بندوبست اچھا کیا۔“ بطلیموس نے رنجیدگی سے بات کی۔
”زہر ہلاہل کو کہا جائے قلاقند؟“

”خاموش رہتے۔“

میں بھی خاموشی کی سازش میں شامل ہو جاؤں۔ جی ہاں شہوار خانم اپنے بھائی کی فیکٹریوں کا رعب ڈال رہی تھیں۔

”ایک ناول نویس کی فیکٹری تو بڑی بہن چلا رہی ہیں۔ انکے ہر ناول پر پھینچا چاہیے لگا رہا خانم پروڈکٹس۔“

”زاع صاحب اب آپ خود ایک اخبار نکالیں۔ اسکا نام رکھیے صورِ اسرافیل“ بطلموس نے ترشی سے جواب دیا۔

وہ تینوں امتاس کے نیچے رکھی سائیکلوں کی طرف بڑھے۔

اپنی بائیکل کا تالہ کھولتے ہوئے بطلموس نے سر اٹھا کر درخت کو دیکھا۔ اور افسردگی سے بولے۔ ”اللہ غنی۔ آج سے چالیس بیالیس سال قبل ہم اس پٹر کی چھاؤں میں سائیکل کھڑی کیا کرتے تھے۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہم آج بھی اسی امتاس کے نیچے کھڑے سائیکل۔“

”یہ خاندان تو دو سال قبل ہی یہاں منتقل ہوا ہے۔“ پفناؤس نے کہا۔ ”پہلے تو یہ لاپلازمیں رہتے تھے۔“

”ہم آئندہ کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں ایک زرد رنگ کی کوٹھی تھی۔ اس میں دو بہنیں رہتی تھیں۔ لال بیبیاں۔ ہم جو بلی کالج میں پڑھتے تھے۔ انٹر میڈیٹ میں۔ ٹیوشن کرنے یہاں آتے تھے۔ وہ دونوں ہم سے اردو پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن بہت ذہین تھی۔ تیز و طرار۔ اردو بھی بہت صاف بولتی تھی۔ نور ماڈریک۔“

(۲۳)

لال بی بی

نور ماورین ڈریک۔ باپ کا نام: جارج نورمن ڈریک۔ سابق ملٹ چیکر ایسٹ انڈین ریلوے
ماکن لال باغ۔ لکھنؤ۔

لال باغ لکھنؤ میں جو سڑک حضرت گنج جاتی ہے اس کے نگر پر چند کابڑیں ایک
قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں لال بیبیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا۔ دوسری
جنگ عظیم کا زمانہ — ٹرینیں کھچی کھچ بھری ہوئی چل رہی تھیں۔ برج اور ٹینس کے
مشہور کھلاڑی کنور دلا د علی خان عرف دلتن میاں کے بچا ٹھا کر جو اد علی تعلقدار دھاپنور
— اللہ بخشے سیدھے سادے پیٹو جنٹلمین بہت کم سفر کرتے تھے اور انگریزوں سے
گھبراتے تھے۔ ایک روز کانپور سے لکھنؤ واپس آرہے تھے۔ ٹرین چھٹنے سے چند
منٹ قبل کانپور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ ہر سکند اور فرسٹ کلاس میں گورے فوجی۔
اُن سے بچنے کے لئے ایک انٹر کلاس میں گھسے۔ اس میں بے شمار کالین۔ انگریزوں
سے بچنے کے لئے یہ صعوبت اٹھانی تھی دیکھا تو یہاں بھی ایک عدد میم موجود۔ راجہ صاحب
کے شو قین بھتیجے دلتن جو برٹش اور امریکن فلمی رسالے منگواتے تھے ان میں چھپنے
والی ولایتی ایکٹریسوں کی ایسی۔ ہند کی دار فراک سر پر ہند کی دار بگڑی نما اسکارف۔
ساتھ ایک بے حد شیر پانچ سالہ بچہ کھڑکی میں بیٹھی ایک گورے ٹامی سے باتیں کر رہی
تھی جو باہر پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اور اسے پہنچانے آیا تھا۔ ٹھا کر جو اد علی فوجی
عہدوں کے نشانات سے ناواقف تھے۔ انکے لئے ہر گور اور دی پوش بڑا افسر تھا۔
انکو میم کے بالکل برابر جگہ ملی۔ دم بخود بیٹھے افسوس کرتے رہے کہ رش کی وجہ سے

بے چاری کو انٹر کلاس میں سفر کرنا پڑا۔ جوں ہی ٹرین چلی میم کا بچہ انکی طرف متوجہ ہو اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ ان سے چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ انکی ململ کی نفیس دوپٹی ٹوٹی اتار کر خود اوڑھی اور جوتوں سمیت گود میں چڑھ کر کودنے لگا۔ میم اس کے ڈانٹنے کے بجائے اطمینان سے ”فوٹو پلے“ پڑھتی رہی جو گورے سارجنٹ نے اسے وہیلرز سے خرید کر دیا تھا۔

میم کا رتن میرانڈا کی نئی فلم ”ڈاؤن ارجینٹنا دے“ کی کہانی ملاحظہ کر رہی تھیں اس کے لڑکے نے راجہ جو اد علی کی طلائی جیبی گھڑی مع طلائی زنجیر جیب سے گھسیٹ لی۔ اور اسے پھر کی طرح گھمانے لگا۔ تب ماں نے گھڑی اس کے ہاتھ سے لے کر ٹھا کر صاحب کو دی۔ ایک نظر ان پر ڈال کر بڑے اخلاق سے معذرت چاہی۔ ”ٹھا کر صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔ کارڈ نکال کر دیا۔“ راجہ جو اد علی خاں آف دھان پور۔“ میم نے اُسے پڑھا اور زیادہ اخلاق سے باتیں کرنے لگی۔ بڑی ملنسار عورت تھی۔ کاش ہر انگریز ایسا ہوتا چودھری صاحب نے دل میں سوچا۔ اتنے میں سیٹ سے اٹھتے ہوئے ایک مسافر کا پاؤں میم کے پاؤں پر پڑ گیا۔ وہ بے حد تیز آواز میں چلائی۔ ”یو بلڈی انڈین آر یو بلو اتینڈ“ بلڈی فول بروک مائی بلڈی لو۔“

”بلڈی“ اس کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔

لکھنؤ آگیا۔ میم نے ٹھا کر صاحب کو اپنا کارڈ دیا۔ اور بولی کسی روز ضرور آئیے گا۔ کیسی خوش اخلاق فرنگن تھی۔ وہ اور اس کا بد تمیز لڑکا اسٹیشن سے باہر تا نگہ اسٹینڈ پر بھی نظر آئے میم نے دُور سے ٹھا کر صاحب کو بائی بائی کیا۔

چند روز بعد مرسس ویک آیا۔ جو برطانوی دور کے لکھنؤ میں بڑا چہل پہل کا زما ہوتا تھا۔ راجہ جو اد علی خان اپنی پرانی ڈوڑج پر حضرت گنج سے گزر رہے تھے خیال آ

میم صاحب کو سیزن کی مبارکباد دیتے چلیں۔ بے چاری نے بڑے اخلاق سے مدعو کیا تھا۔ گاڑی روک کر اس بے سودہ بچے کے لئے ایک قیمتی ولایتی کھلونا خریدا اور لال باغ کا رخ کیا۔ ہلیئر بلڈنگ کے نگر پر پہونچ کر ایک تنبولی سے پوچھا: ”کیوں میاں! یہاں صاحب لوگ کس طرف رہتا ہے؟“ جیب سے میم کا دیا ہوا وزٹنگ کارڈ نکالا۔ ”بس نور مادیک“ اور پناڑی کو کوٹھی کا نمبر بتلایا۔

”جی ہاں سمجھ گئے۔ بہت صاحب لوگ ادھر آتا ہے۔ وہ سامنے جائیے۔ جس بنگلے میں امتلاس کا پیڑ کھڑا ہے۔“

”کو کا پوچھت ہیں؟“ ایک راہ گیر نے ٹھٹک کر سوال کیا۔

”ایک ٹھولال بی بی کا پوچھت ہیں۔ یہاں اور کو کا پوچھیہیں۔“

”کون سی والی لال بی بی؟ ڈورا میم صاحب؟“

”نہیں نور امس صاحب۔“

”ارے وہی سامنے تو بنگلہ ہے۔“ راہ گیر نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

”لال بی بی“ کا مطلب چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حیر ہوگا۔ آگے

بڑھے۔ کمرس کی وجہ سے ہر کاٹج کا برآمدہ کا غندی رہنوں غباروں اور چمکیلے اسٹار اوں ڈیوڈ سے آراستہ۔ ولایتی موسیقی کی آواز ہر گھر سے آرہی تھی۔

ڈوج امتلاس والی کوٹھی کے پھاٹک میں لے گئے۔ برآمدے میں ایک

بوڑھا انگریز آرام کرسی پر نیم دراز پائیر پڑھ رہا تھا۔ پیر کا مگ تپانی پر دھرا تھا۔

ایک لبریڈور فرش پر خوابیدہ راجہ صاحب نے حلق صاف کر کے کہا ”گڈ مورننگ سر۔“

”میری کمرس!“

بڈھے نے گاڑی اندر آتی دیکھ لی تھی۔ اخبار منہ کے سامنے سے مٹا، مسکرایا

اور پوچھا: ”ہلو کس سے ملنا مانگتا؟“

”بس ڈریک سر۔“

”نور مادیکیلی؟“

راجہ صاحب نے گھبرا کر پھر کارڈ نکالا ”نور ماڈریک سر۔ ٹرین میں ملی تھیں۔
ہم نے کہا بابا لوگ کو بڑا دن دیش کر آویں۔“

”اوہ۔۔۔ کم ایلونگ۔“ بڈھا جو شکل سے بس ڈریک کا باپ معلوم ہوتا تھا
راجہ صاحب کو ایک نفیس ڈرائنگ روم میں بٹھا کر غائب ہو گیا۔ مکرے کے ایک کونے
میں اونچی سچی سجانی کرسی بڑی استاد تھی۔ آتش دان پر کرسی کا رڈ۔ دیواروں
پر گرٹیا گارڈو کلا رگ گیل اور ڈوڈو تھی لیور کی تصاویر۔ ایک کالی چیمبیشن عورت بھاڑن
ہاتھ میں لئے اندر آئی جو بعد میں ٹھا کر صاحب کو معلوم ہوا کہ بڈھے کی بیوی اور مس نورما
ڈریک کی ماں تھی۔ وہ اس عورت کو آیا سمجھے۔ اب تعلق دارانہ تحکم سے فرمایا۔ ”راجہ صاحب
دھان پور۔ ٹرین میں ملے تھے بس صاحب کو سلام بولو۔“

”بس راجہ صاحب۔“ چیمبیشن نے مرعوب ہو کر جواب دیا۔ ”بس صاحب ابھی آتا
ہے۔“ باہر چلی گئی۔ دفعتاً خیال آیا اگر یہ مس ڈریک ہیں تو وہ بچہ ان کا لڑکا کیسے ہے۔
خیر ہوگا۔

چودھری جو ادلی بیٹھے اکتا یا کتے۔ صوفے کے نیچے اخبار کا ایک پرزہ پڑا ہوا تھا۔
اس میں شاید کوئی امریکن فوجی کرسی کا تحفہ پیٹ کر لایا ہوگا لاس اینجلس کے کسی اخبار
کا ذرا سا ٹکڑا۔ ٹھا کر صاحب نے اٹھا کر وہی پڑھ ڈالا۔۔۔ سی۔ بی۔ ایس۔ ”بلونڈی
’بگ ٹاؤن‘ شوز۔ ایڈورڈ جی روینسن۔ لوکل ڈرافٹ بورڈ۔ ٹامس ماسٹر سنگر۔ نیگر
روحانی نغمے اور ’ڈرنک ٹوٹی اونلی دو دائن آئیز‘ کیری می بیک ٹو اولڈ ویجینی۔
کلیرنس سیل۔ ۶۴۲۵ سن سیٹ بولار۔ کورنڈیف، ایسٹ۔ وی آنا ساج ۸ سینٹ

تبھی پردہ سر کا اور گلابی ساٹن کے ولایتی فرغل میں ملبوس۔ منہم۔ اد
معتصر میں ڈریک داخل ہوئیں۔ ٹھا کر صاحب کا کسی گوری چمڑی والے سے اس
گھر پہ ملنے کا اتفاق کم ہوا تھا۔ نہ انکو یہ معلوم تھا کہ کوئی شریف اور شائستہ انگریز خاتو
ہاؤس کوٹ پہن کر کسی اجنبی سے ملاقات نہیں کرے گی۔

نورما ڈریک انکے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹھا کر صاحب نے کہا ”بابا کیا ہے۔ ہم اس کے لئے یہ معمولی سا کمریس پرینٹ —“

”اوہاؤ نائس آف یو — تھینک یو —“ راجہ صاحب۔ مگر جارج بابا تو کل اسکول چلا گیا۔ بارلو گنج۔ مسوری — آپ کیا پیسے گا؟ کوئی ایک —؟“

”مس صاحب ہم محمدن آدمی ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ بس آپ کو بڑے دن کا سلام کرنے چلے آئے تھے۔“ نورما ڈریک زور سے سنہی۔ سمجھ گئی لرہیں۔

باہر نکلے۔ اسی وقت ایک سرمئی شیوا کر رکی۔ اودھ چیف کورٹ کا ایک انگریز جج برآمد ہوا۔ ٹھا کر جو ادلی اُسے پہچان گئے۔ دل میں سوچنے اپر کلاس لوگ ہیں۔ انگریز ہائی کورٹ جج ملنے آیا ہے۔

جج نے ذرا ترش روئی سے ان پر نگاہ ڈالی اور سر اٹھائے تاک کی سیدھ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

چند ماہ بعد راجہ جو ادلی نے کلکٹر لکھنؤ اور یس ٹویس لائیڈ کی دعوت پر جھاؤنی میں فوجی دلخوش سبھا کی ایک تقریب میں شرکت فرمائی تو وہاں یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ مس نورما ڈریک اونچا لہنگا اور شیشے کے کام کی چولی پہنے ماتھے پر نگھاڑی اور بورسجائے ایک پنڈال کے نیچے ناچ رہی تھی۔ نام اس کا مس نرملا دیوی اناؤنس کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور گوری چھو کر ی نے ہندوستانی ناچ دکھایا۔ اس کا اسٹیج کا نام شیلادیوی اور اصل نام وئی فریڈ کلیٹن تھا۔ وہ بھی لال باغ کی ایک لال بی بی تھی بے چارے راجہ صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لال بیبیاں کلکتے کی یہودی رقاصہ مس سٹیٹن اور یو ریشین رادھارانی اور ڈورین عرف مس مہجری اور اینڈی رینال عرف مس ٹبل کی روایت کی یادگار تھیں۔ اور انکے کہنے شاہی کے زمانے سے لکھنؤ میں رہتے آئے تھے۔ ٹھا کر جو ادلی کو اپنے اوپر بے حد غصہ آیا۔ اس روز کیسے پو قوف بنے۔

چودھری جو اد علی جتنے بھولے اور نیک تھے۔ انکے مرحوم چھوٹے بھائی کا لڑکا دلتن اتنا ہی شاطر اور حرفوں کا بنا۔ — چودھری صاحب بے چارے کی بیوی بچے مرچکے تھے چھوٹے سے تعلقے دھان پور کے مالک تھے۔ اس کی ڈھائی تین ہزار ماہوار کی آمدنی میں فراغت سے گزر کرتے تھے۔ جاہلنگ روڈ پر رہتے تھے اور فارسی ادب اور صوفیائے کرام کی ملفوظات کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ یا اپنے اکلوتے بیٹے اور وارث دلتن صاحب کی تعلیم و تربیت کی ناکام کوشش میں —

اگر آپ کو ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے اور چارمنگ راسکل کی صحیح اور دلکش تصویر دکھینی منظور ہے تو کسی شام بھی چھتر منزل کلب یا دلکش کلب جا کر کنور دلشاد علی خان آف دھان پور سے ملنا چاہیے۔ یہ نوجوان شخص اس وقت تک لا مارٹنز لکھنؤ سے انسٹریڈیٹ نہیں کر پایا تھا۔ البتہ تاش کا ماہر تھا۔ بیٹہ اچھا بچا تھا۔ اصغر علی محمد علی دالے حاجی اصفیٰ خاں کے ساتھ اسکیٹنگ کرتا تھا۔ اپنے تایا کو بہت مانتا تھا۔ ان کا ادب کرتا تھا۔ اور انکو چونا لگانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

اس روز بڑے باپ فوجی دلخوش سبھا کے جلسے سے لوٹ کر آئے تو بہت ملول معلوم ہو رہے تھے۔ خداوندیہ تیر سے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ دیوان خانے میں آکر اپنی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بیٹے سے دریافت کیا (جس کی اس ڈپارٹمنٹ سے واقفیت کا انھیں تھوڑا سا علم تھا) —

”کیوں میاں یہ لال بیبیاں کون چیز ہیں؟“

”بڑے آبا آپ معلوم کر کے کیا کیجئے گا۔ مخرب الاخلاق شے ہیں۔“

”ہاں مگر اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ گوری بھیج اور بے تحاشا پاؤ ڈرسرخی ممکن

ہے اس وجہ سے عوام نے انکو لال بی بی کہنا شروع کر دیا ہو۔“

”عین ممکن ہے۔“ بیٹے نے مختصر جواب دیا۔ لیکن بڑے باپ اسکا لڑائی

— ان کو ٹوہ لگ گئی تھی۔ عینک لگائی۔ اٹھ کر ایک الماری سے تین ضخیم فرہنگیں

اُتاریں مگر کھولے بغیر واپس رکھ دیں۔ اپنی جگہ پر آن بیٹھے۔

”بھیا پُرانی اردو میں —“

دلن بھیا اس وقت اپنی بدوق صاف کرنے کے بعد ایک امریکن ٹوڈی میگزین میں سویٹر گرل لانا ٹرنر کے متعلق مضمون پڑھ رہے تھے۔ بے دھیانی سے سنا کتے۔ بڑے ابا فرما رہے تھے۔ ”مستورات قرآن شریف کو لال کتاب کہتی تھیں۔ اسی طرح لال خیمہ، لال کمرہ، لال ڈگی مطلب اہم۔ مگر لال بی بی۔ شاید اس وجہ سے کہ لال باغ میں رہتی ہیں؟ — جان کمپنی کے زمانے میں بی بی انگلش میڈیٹرونٹ کو بھی کہتے تھے اور کم حیثیت انگریز عورت کو بھی۔ اونچے درجے کی میم بڑائی بی کہلاتی تھی انگریز لوگ ہندوستانی طوائفوں کو بھی بی بی کہتے تھے۔“

”جی بڑے ابا۔ ہم نے سنا ہے کہ لال بی بیسیوں کا طبقہ جان کمپنی کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ اور رم جینیوں کو گولے RUM JOHNNY پکارتے تھے!“

”اور بھلا لال باغ نام کیوں پڑا؟ کہ وہاں لال بیگی رہتے تھے؟“

”بڑے ابا۔ ہم ذرا گون وِدی وِند دیکھ آویں؟ پچھلی بار میں کر دی تھی۔“

دلن بھیا کی آسٹن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ بڑے ابا بے چارے ٹھٹھہ گڑگڑاتے، لال بی بی کی وجہ تسمیہ پر غور کرنے میں منہمک رہے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔

چند سال بعد ٹھاکر جوا دلی بھی مع تعلقہ دھان پور گون وِدی وِند ہو گئے۔ راجہ صاحب نے رحلت کی۔ دھان پور ”بولیشن آف زمینداری“ میں غائب ہوا۔ رہ گئے دلن بھیا جو بونڈز فروخت کر کے، اپنے رہیسا نہ مشاغل میں مصروف رہے۔ گرمیوں میں بوٹا کلب نئی تال۔ جاڑوں میں پتھر منزل کلب لکھنؤ۔ شکار کیلئے ترائی۔ بڑے باپ کی وفات کے چند ماہ بعد اپنی جیگو آرپر (جو ولایت واپس جانے والے ایک انگریز سولین سے خریدی تھی) حضرت گنج سے گزر رہے تھے انکو سابق امبرولور راج کا انور اعظم نظر آیا۔ جو اپنی نیلی کار ہراڑا جا رہا تھا۔ اس کے

ساتھ پُرور وڈ لال باغ والی ایک لال بی بی کو تین روز بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی ہیٹ لگا رکھی تھی۔ جس پر رنگ برنگے مصنوعی پھول چسپاں تھے۔ اس سرخ ہیٹ پر نظر پڑتے ہی معادلن میاں کے ذہن میں آیا۔ لال بی بی اسکارٹ دومن کا ترجمہ رہا ہوگا۔ یا ایک زمانے میں انکے مکانوں پر شاید سرخ لالیٹین رکھی جاتی ہو۔ عقدہ حل ہو گیا۔

اسٹریٹنگ دھیل کو چلے دیا۔ مڑ کر گھر جائیں اور بڑے آبا کو بتائیں کہ لال بی بی کے معنی معلوم ہو گئے۔ اسی لمحے دل پر چوٹ سی پڑی۔ بڑے آبا تو ملکِ خاک بسا چکے۔

جائینگ روڈ کی کوٹھی دھان پور کے مکانات فروخت کیے۔ مرحوم راجہ جواہری کاکتب خانہ کباڑی کے ہاتھ بیچا۔ تر کے کا بیسہ اور بونڈ کی قیمت جلد از جلد بخیر و خوبی اڑا کر نوجوان راجہ صاحب دھان پور نے یروٹ لے۔ ”صاحبزادہ دلشاد علی خان آف دھان پور“ کے وزٹینگ کارڈ چھپوائے۔ پاکستان میں راجہ اور ٹھاکر کے موروثی خطاب سے شاید لوگ کنفیوز ہوتے۔ ایک سہانی صبح لکھنؤ کو خیر باد کہا اور بذریعہ ٹرین لاہور پہنچے۔ اس کے بعد دنیائے دُنی میں حوصلہ آزمائی کیلئے نکلے۔ سوائے اپنی وٹ اور چارم کوئی اثاثہ نہ رکھتے تھے۔
تاش کی مہارت ان کا سب سے بڑا حربہ تھا۔



نورماہ خانم

جس وقت وکٹوریہ جہاز نے بلیر ڈزیز بمبئی سے لنکرا اٹھایا اور سٹ کلاس میں بھانت بھانت کے ہندوستانی طلباء بھرے ہوئے تھے۔ اسی مجمع میں کلکتے کی ڈاکٹر اے۔ بیگ بھی شامل تھیں جو اڈنبرا میڈیکل کالج جا رہی تھیں۔ منراے بیگ انکے ہمراہ تھیں۔ متمول پارسی خوجے بوہرے اور غیر ملکی فرسٹ کلاس میں ٹہلتے پھر رہے تھے۔ بندرگاہ کراچی سے بھی پاکستانی طلباء و طالبات زیادہ تر اور سٹ کلاس میں سوار ہوتیں۔ اعلیٰ فوجی اور سولین افسروں، پاکستانی پارسیوں متمول خوجوں بوہروں نے فرسٹ کلاس کا رخ کیا۔ درجہ اول کی فہرست میں صاحبزادہ دلشاد علی خاں کا اسم گرامی شامل تھا۔ اور سٹ کلاس میں ایک اینگلو پاکستانی عورت بھی موجود تھی بحر پیمادوں کی فہرست میں اسکات نام نورماہ خانم درج تھا۔ وہ عموماً الگ تھلگ ایک ڈیک چیر پر بیٹھی انگریزی جاسوسی اور رومانی ناول پڑھتی رہتی۔

صاحبزادہ دلشاد علی خان عدل پہونچتے پہونچتے فرسٹ اور اور سٹ کلاس کی ہر قومیت اور ہر عمر کی خواتین میں یکساں طور پر مقبول ہو گئے۔ وہ آرام کریسوں پر چپ چاپ بیٹھی مغرب خواتین سے انکی مختلف النوع علالتوں پر تبادلہ خیالات کرتے انکے نانی پوتوں کی تصویروں دیکھتے۔ نوجوان خواتین کو انکے ڈریس سنس اور اسمارٹ نس اور خوبصورتی پر مبارکباد دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مغربی بوڑھوں اور نوجوانوں سے انکی دلچسپی کی گفتگو کرتے۔ بچوں کو تاش اور جادو کے کھیل دکھاتے اڑیس سالہ صاحبزادہ صاحب اپنی کپٹی کے گرے بالوں اور دجہیہ شخصیت کی وجہ سے مہین لاؤنگ

جمع میں ممتاز نظر آسکتے تھے۔ لائیڈ ٹرسٹینو کے اس اطالوی جہاز پر ان کی ہر دلعزیزی باعثِ تعجب نہ تھی۔

عدن پہنچنے سے دو روز قبل صاحبزادہ صاحب کی نورماہ خانم سے ملاقات فرسٹ کلاس بار پر ایک ایسی رومان پرورشام ہوئی جب آسمان اور سمندر پر پونم کا چاند جگمگا رہا تھا۔ اور مسافر لینڈ ڈارنل کی چند سال پرانی فلم ”FOR EVER AMBER“ دیکھ کر واپس آچکے تھے۔

نورماہ خانم ٹورسٹ کلاس کی مسافر تھی لیکن ایک پاکستانی فوجی بزنس مین کی دعوت پر اوپر فرسٹ کلاس بار پر آئی ہوتی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اپنی جہاں دیدہ نظروں سے بھانپا کہ یہ اینگلو انڈین یا اینگلو پاکستانی ڈرگ باراں دیدہ ان سے چند سال بڑی لیکن انھیں کی طرح ہارڈ بوائیڈ اور سخت جان ہے۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ اسے پہلے کہیں دیکھ چکے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے فوجی سے بات چیت شروع کی۔ پھر اس خاتون سے پوچھا ”کیا آپ لاہور جم خانہ اکثر جاتی ہیں؟ شاید میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے۔“

نورماہ خانم کو اس OPENING GIMMICK کی حاجت نہیں تھی۔ مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ اور انکے اگلے MOVE کی منتظر رہی۔ صاحبزادہ صاحب سوچا کہ کیا نئی سے پُر بوتل روشن سی ہوئی دفعتاً بڑے ابا مرحوم یاد آئے۔

اللہ جنت نصیب کرے یہ بڑے ابا مرحوم والی لال بی بی تھی۔ کمال ہے کہاں سے کہاں —! بارمیڈ نے ان کا دوسرا گلاس کیا نئی سے بھرا۔ اور ان کو وہ پورا منظر یاد آیا۔ گیارہ سال قبل کا حضرت گنج ۱۹۴۵ء کی شام جشنِ فتح کی چہل پہل اور ہجوم۔ دکن میاں اپنے دوست کنور سینڈھی کے ساتھ انڈیا کافی ہاؤس سے نکل رہے تھے ایک موسیقار دوست مدن موہن دروازہ پر مل گیا۔ بولا۔ بار دیکھو

وہ نورما ڈریک جا رہی ہے۔ وہی جو نرملا دیوی کے نام سے ناپتی ہے۔ پٹھو مہاراج کی شاگرد رہ چکی ہے۔

نورما ڈریک زرد جا ربٹ کی ساری میں ملبوس، بھورے سیدھے بال۔ معمولی شکل۔ ایک گورے کارپول کا بازو تھامے برآمدے میں سے گزر رہی تھی۔ دکن میاں سے لگا ہوں چارہوئیں تو پرفوشیل انداز سے مسکراتی۔

کنور دلشاد علی خان جو بیگمات راجکار یوں اور صاحبزادیوں کی سوسائٹی کے عادی اور سیلک میں ایک عام اینگلو انڈین رفاہ پر نظر ڈالنا کبر شان سمجھتے تھے بے نیازی سے ٹہلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بے چارے بڑے باپ مرحوم اس لڑکی کو بڑی مہم صاحب سمجھ کر اس کے گھر گئے تھے اگلے وقتوں کے لوگ اتنے بھولے ہو کر تے تھے۔

وہ نورما ڈریک عرف نرملا دیوی جو اس شام حضرت گنج کے ایک برآمدے سے گزر رہی تھی۔ بحیثیت نورماہ خانم تر بوزی شنیل کے شلوار ٹوٹ میں ملبوس اس وقت وکٹوریہ جہاز کی بار پر موجود تھی۔ اب بھی وہ سامنے سے گزر رہی رہی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔

”اگر لاہور میں نہیں تو میں نے یقیناً آپ کو لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ حضرت گنج میں۔ آپ لال باغ میں تو نہیں رہتی تھیں؟“

نورماہ خانم پھر مسکراتی۔ اب اسے اس دلکش اجنبی کو اپنے متعلق کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کی اپنی پرانی دنیا سے نکل کر سطح سمندر پر اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ اس وقت دونوں پاکستانی تھے۔

”مختصر دنیا ہے۔“ نورماہ خانم نے معنی خیز ہنس کے ساتھ جواب دیا۔

”اور بڑی شہریر۔ آپ پاکستان کب آئیں؟“

”سینتالیس میں۔ پارٹیشن سے ذرا قبل۔ مجھے لاہور میں پنجولی فلمز نے اپنی ایک پکچر میں ڈانس کرنے کے لئے بلایا تھا میں وہیں تھی۔ شوٹنگ چل رہی تھی۔ جب پارٹیشن

ہو گیا اور وہ سب مار کاٹ۔ راستے بند ہو گئے۔ میری ایک کزن فلیٹیز ہوٹل لاہور میں
گایا کرتی تھی۔ شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو۔ مشہور سنگر تھی۔ بمبئی کے تاج میں بھی
گایا کرتی تھی۔ لیلیٰ مارک — اس نے مجھ سے کہا یہیں پاکستان میں رہ جاؤ۔ یہاں
انٹریٹن منٹ انڈسٹری بالکل INFANCY میں ہے۔ ترقی کی بہت گنجائش ہے۔
”اور یوں بھی آپ جانتے ہیں انڈیا میں ہم لوگوں کی کمیونٹی کے لئے CHANCES

بہت کم ہیں YOU KNOW THESE BLOODY INDIANS THEY HATE OUR GUTS ہم انگریز لوگوں کے لئے اب ہندو بیویوں کے انڈیا میں
گنجائش کہاں تھی۔“

راجہ دلشاد علی خان زیر لب مسکرائے۔ ان کو یاد آیا بڑے ابا مرحوم نے بتلایا
تھا کہ ”بلڈی“ ”اینڈ اول“ AND ALL مس نور ماڈریک کا تکیہ کلام تھا۔
بے چارے چودھری صاحب مرحوم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ایک چی چی اینگلو
تکیہ کلام ہے۔

اپنے میزبان خوجے کو بالکل نظر انداز کر کے نور ماہہ خانم اسی کی خریدی ہوئی
کیا تہی نوش کرتے ہوئے صاحبزادہ صاحب کو قصہ سناتی رہیں۔ ”میرے پاپا کی دو
سال قبل وفات ہو چکی تھی۔“

”اور آپکی والدہ —؛ میرے انکل ان سے بھی آپ کے ہاں ملے تھے۔“
نور ماہہ خانم ہچکچائیں۔ ”وہ میری ماں نہیں آیا تھی جس نے ہمیں پالا تھا۔ میری
ماں بیور کا کشیش تھیں۔ ہمارے بچپن میں مر گئی تھیں۔ اس بے چاری آیا کا بھی
انتقال ہو گیا۔“

”آئی۔ سی۔“ صاحبزادہ صاحب نے سر ہلایا۔ ہم سب کو اپنی اپنی نسل
پر تر اور خالص ثابت کرنے کا کس قدر سودا ہے۔ اور گورے رنگ کی کتنی اہمیت۔
ان بے چارے قابل رحم اینگلو انڈین لوگوں ہی کو کیوں مطعون کیا جاتے۔ بڑے ابا مرحوم
فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ خالص سورج و لشی راجپوت ہیں۔

نورماہ خانم بولتی رہیں۔ ”میں نے اپنی چھوٹی بہن سیلی کو بھی لاہور بلالیا۔ مگر میں نے جلد بازی سے کام لیا۔ لال باغ والی کو بھی فروخت کر کے جانا چاہیے تھا۔ کوٹھی اتنی بڑی نہیں تھی مگر اس کا کمپاؤنڈ کتنا وسیع تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا باہر سے۔“

”آپ کی ذاتی کوٹھی تھی؟“

”جی ہاں پاپا نے خریدی تھی۔ سیلی کے لاہور جاتے ہی کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا۔“

”اور آپ کا لڑکا۔۔۔۔۔؟“

”آپ کو میرے لڑکے کے بارے میں بھی معلوم ہے؟“

”آئی ایم سوری۔ میں نوزی نہیں ہوں۔ دراصل میرے چچا مرحوم نے بتلایا تھا کہ ٹرین میں اس بچے ہی سے انکی دوستی ہو گئی تھی۔ اور وہ اسی کیلئے کرسمس پریذینٹ لیکر آپ کے یہاں گئے تھے۔ میرے چچا ایک نہایت بھولے پاک باطن انسان تھے۔“

اچانک نورماہ خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

خوجے نے جو کچھوے کی طرح گردن جھکائے بارہ بیٹھا تھا مکنیکل انداز سے رومال پیش کیا نورماہ خانم نے جلدی سے آنسو خشک کئے۔ تھری کاسٹریکٹ جلا لیا۔

”آئی ایم سوری“ صاحبزادہ صاحب نے رنجیدہ آواز میں دہرایا۔

”جارج بارہ سال کا ہو گیا تھا۔ اسے لارنس اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ نتھیا گلی میں ایک روز گھوڑے سے گرا۔ سر میں چوٹ آئی۔ مجھے طوفانوں کے بھیڑے کھانے کیلئے اکیلا چھوڑ گیا۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔“ نورماہ خانم نے پھر آنکھیں خشک کیں۔

ادھی رات چاروں طرف سمندر۔ اوپر مغموں تنہا چاند۔ بار سنسان ہو چکی تھی۔ اداس آنکھوں والی اطالوی میڈیکلاس سمیٹ رہی تھی۔ اس نے ان بحری مسافروں کے دوران ایسی پر فضا اداس راتوں میں ان گنت مسافروں کی ان گنت المناک داستانیں اس خوش فضا عرشے پر سنی تھیں۔

”بطور رقاصہ نرملا دیوی پاکستان میں نہ چلتا لہذا پروڈیوسر لو نے نورماہ خانم کو دیا۔“

”سمنریک اور ڈاکٹر بیگ — ہیتہ ہیں۔ کلکتے سے آئی ہیں۔ سب سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ماں بوٹ ڈیک پر جا کر تصویریں بنایا کرتی ہیں بیٹی موٹی موٹی میڈیکل کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ کیا تم ان سے ملنا چاہو گے؟“
 ”غالباً نہیں۔“

”ہاں بیکار ہو گا۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت زیادہ دولت مند نہیں معلوم ہوتی دوسرے وہ تمہارا ٹائپ نہیں۔“

بات یوں تھی کہ سونیز تک پہنچتے پہنچتے نورماہ خانم اور صاحبزادہ دلشاد علی آف دھان پور ایک فلم کے خاموش بنزنس پارٹنر بن چکے تھے — نورماہ امیر کبیر مسافروں سے دوستی بڑھاتیں انکو گھیر گھار کر صاحبزادہ صاحب کی کارڈ پارٹیوں میں شامل کرتیں۔ راجہ دلشاد علی ماہر فن کار ڈشار پرتھے۔

نورماہ خانم انکو بتلا چکی تھیں کہ وہ ہمیشہ کیلئے لندن جا رہی ہیں جہاں انکی چھوٹی بہن سیلی ڈریک پہلے سے پہنچ چکی ہے۔ ایک اسٹریٹن یہودی پارٹنر کے ساتھ سوہو ہیں اس نے ایک مساج بار لکھولا ہے اور ایک اسٹوڈیو جس میں لوگ اپنے اپنے کمرے لاکر لڑکیوں کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ کئی فری لانس گوری اور افریقی لڑکیاں سیلی اور ہنری کے اسٹوڈیو اور مساج پارٹنر سے منسلک ہیں۔ نورماہ خانم لندن جا کر اس بیحد منفعت بخش کاروبار کی دیکھ بھال میں اپنی بہن کا ہاتھ بٹائیں گی۔

صاحبزادہ دلشاد علی خان نے پاپ پیتے پیتے اسے اسیمک پرھا دیا مگر GENOA پہنچتے وقت انھوں نے نورماہ خانم سے کہا: ”اگر تم چاہو تو میرے ساتھ امریکہ بھی چل سکتی ہو۔ میں عموماً کوئین ایلزبتھ یا کوئن میری پر لندن سے نیویارک جاتے اور آتے ہوئے OPERATE کرتا ہوں۔“

نورماہ خانم نے وعدہ کیا کہ اس آفر پر غور کرینگے لیکن انھوں نے اس خوش گوار

بحری سفر کے دوران یہ بھی بخوبی نوٹس کر لیا تھا کہ انکے ساتھ معاشقے کے علاوہ صاحبزادہ صاحب خالص کاروباری انداز میں گونہایت رکھ رکھاؤ اور شائستگی کیساتھ معمر امریکن اور یورپین خواتین کیساتھ بھی وقت گزارتے تھے۔ فرسٹ کلاس میں متعدد امریکن کروڑپتی بیوائیں سفر کر رہی تھیں۔ جو حسب دستور شوہروں کی چھوڑی ہوئی بے اندازہ دولت خرچ کرنے کیلئے دنیا کی سیاحت پر نکلی تھیں۔

”ہم لوگوں کو۔۔۔“ نورماہ خانم نے جینووا میں جہاز سے اترتے ہوئے صاحبزادہ دلشاد علی خاں سے کہا۔ ”لکھنؤ کے عوام لال لال بی بی کہتے تھے۔ تم جیسے لوگوں کو کیا پکارا جائے؟“

”لال میاں۔۔۔“ انہوں نے سگریٹ سمندریں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔



یہ قصہ ایک نوجوان برطانوی اسکالر کی نظر میں

میری ماں ایک اینگلو انڈین (یا اینگلو پاکستانی) رفاہیہ ہے۔ میرا باپ ایک انڈین (یا پاکستانی) کارڈ شارپر اور پروفیشنل جگ لوسر سے انٹرنیشنل جیٹ سیٹ کا قرب حاصل ہے ایک ریٹائرڈ ہولی وڈ ایکٹریس کے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے اس کا تذکرہ ہیڈ آہو پراپے کالم میں کر چکی ہے۔ وہ زیادہ وقت یورپ اور امریکہ کے درمیان فضائی سفر کرتے ہوئے گزارتا ہے۔ گو بحری سفر اور لکٹری لائنز کے خاتمے نے اسکی بزنس کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مگر وہ متعلقہ کاروباروں میں مصروف ہو گیا اگرچہ ہم اسے بین الاقوامی انڈر ورلڈ کا بادشاہ نہیں کہہ سکتے البتہ وہ ایک خاصہ کامیاب اور سید چارمنگ انسان ہے۔

میری ماں ایک ریٹائرڈ ٹارٹ کے بجائے ایک سنجیدہ ہاؤس وائیف معلوم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے اس جزیرے کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم دلوائی۔ اور اس چیز کا خیال رکھا کہ میں اپنے باپ کے نقش قدم پر نہ چلوں۔

میرا ایک بھائی تھا یعنی نصف برادر۔ اس کا باپ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا کوئی انگریز میجر تھا۔ جو لکھنؤ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ میرا وہ بھائی جارج بعمر بارہ سال بمقام کوہ مری گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اور اپنی بے چاری ماں کی دنیا اندھیر کر گیا۔ اس حادثے کے چھ سال بعد نو دہاہ خانم کی ملاقات صاحبزادہ دشا علی خاں سے اطالوی جہاز کوئریہ پر ہوتی اور میں عالم وجود میں آیا۔

میرے والدین ایک دوسرے کے بہترین اور پر خلوص دوست ہیں۔ انھوں نے

آج تک ایک دوسرے سے شادی نہیں کی۔ وہ دونوں اپنے آپ کو آزاد پرندے پکارنے کے شوقین ہیں۔

میری والدہ نورما ڈریک پہلے لکھنؤ (انڈیا) میں سرملا دیوی اور لاہور (پاکستان) میں نورما خانم کہلاتیں۔ اب لندن (انگلستان) میں پھر نورما ڈریک ہو گئی ہیں۔ اسی شہر سے انکے COCKNEY مزدور پیشہ دادا محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میٹر بھرتی ہو کر سندوستان گئے تھے۔ اور وہاں ایک ”ہاٹ کاسٹ“ لڑکی سے شادی کر گئی تھی۔ مئی کی ماں شاہجہاں پوریشن کی پروردہ ایک نیپوٹیم لڑکی تھی جسکے ہندو ماں باپ ذات کے کہا کرتے تھے۔ ایسے لوگ شمالی ہند میں بنظر حقارت ”احاطے کے عیسائی“ کہلاتے ہیں۔ بحیثیت ایک کلچرل اینتھروپولوجسٹ جب میں نے والدہ کے خاندان کی تحقیق شروع کی، بچہ جزیرہ ہوتیوں کیونکہ انکی محبوب فینٹسی یہ ہے کہ انکی عالی نسب انگریز ماں کی موت کے بعد انکو اس کالی عورت نے پالا تھا۔ ہم اپنی ویش فل تھکننگ کے ہاتھوں خاصے محبوبہ اور بے بس رہتے ہیں اور ایسے قابل رحم ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو معاف کرتے رہنا چاہیے۔

مئی کی ایک بھوپھی سرکس میں کام کرتی تھیں۔ دوسری تاج محل ہوٹل ممبئی کے پچھواڑے جو پُر اسرار گلیاں ہیں۔ ان میں مقیم رہیں۔ وہ بھی لاپتہ ہیں۔ مئی کے مطابق شاید وہ کولابہ سے وائٹ لین منتقل ہو گئی تھیں۔ مئی کے والد ریلوے میں ملازم تھے جو کٹمر اور محکمہ ڈاک کی طرح اینگلو انڈین نو جوانوں کے لئے سرکار کا مخصوص محکمہ تھے۔ مئی کا کہنا ہے کہ انکے والد خاصے نامعلوم بزرگ تھے جنکو غبن کے جرم میں سروس نکال دیا گیا تھا۔ گو جرم ان پر ثابت نہ ہو سکا تھا۔ انھوں نے اس روپے سے لالہ با کی لال بیبیوں کے محلے میں کوٹھی خرید لی تھی۔ اور اپنی دونوں لڑکیوں کو بڑے اطمینان سے لالہ بی بی یعنی اسکا آرٹ و دمن بنا دیا تھا تاکہ خود محنت کئے بغیر آرام سے رہیں۔ یہی اس زندگی پر معترض نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ اس میں عیش و آرام تفریح اور پیسہ وافر

میری آئٹ سیلی جو پارٹینن سے قبل لکھنؤ میں ڈانس سرٹیا دیو کی کہلاتی تھیں لاہور سے لندن آکر پہلے ایک سستے ناچ گھر میں ٹیکسی ڈانس بھرتی ہوئیں۔ پھر ایک سینما گھر میں نلٹ بیچے اس کے بعد کچھ عرصہ کمپیڈی میں اسٹریٹ ڈانسر بھی رہیں۔ مگر بقول انکے یہ بہت مشکل زندگی تھی انکے بس کا روگ نہ تھا۔ بہت جلد ایک یوہین یہودی کی پارٹنرشپ میں مساج پارلر اور اسٹوڈیو کھولا۔ اس کے اشتہار اس قسم کے کاروبار کے دستور کے مطابق پریچوں پر لکھ لکھ کر تمباکو فروشوں کی دکانوں پر لگائے۔

SALLY'S MASSAGE PARLOUR AND HENRI'S STUDIO FOR ARTISTIC PHOTOGRAPHS

کاروبار خوب چلا۔ یہ دو لفٹن رپورٹ کی اشاعت سے قبل کا زمانہ تھا۔ انہی دنوں نور ماڈریک لاہور سے آکر بہن کی بزنس میں شریک ہوئیں۔ پچھلے چند سال سے انہوں نے ایک ایسکورٹ سروس بھی قائم کر لی ہے۔ اس میں متعدد ہندوستانی پاکستانی لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ جنکے والدین راجہ صدی قبل یہاں آگئے تھے اور وہ یہیں پیدا ہوئیں یا بہت کمسنی میں ان قدامت پرست ممالک سے یہاں آئیں میرے والد ایسکورٹ سروس کے ایک ڈائریکٹر ہیں۔

مجھ میں اپنے والدین کی دلچسپ اور رنگین روایات کی تقلید کرنے یا انکو آگے بڑھانے کی توفیق کیوں نہ ہوئی؟۔ میں اپنے نانا کی پیروی بھی کر سکتا ہوں۔ مگر میرے کون سے انگلش کوکینی ڈریک یا اودھ کے مسلم راجپوت پرکھ میں ادب فلسفہ شاعری اور مختلف خرافات کے جراثیم موجود تھے جنہوں نے میرے اندر غور کیا؟ اٹھارہ سال کی عمر سے میری نظائیں انگلستان امریکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے معیاری رسالوں میں چھپ رہی ہیں۔ میری تیسویں سال گھر سے ایک ماہ قبل میری نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے مئی مجھ پر بے حد نازاں ہیں۔ میری کتاب پر انکے جتنے ریویو چھپے ہیں۔ (ٹائمز لٹری می سیلینٹ سمیت) مئی نے انکے تراشے ڈیڈی کو نیویارک بھیجے۔ میں نے انکو کتاب روانہ کی۔

مگر معلوم ہوا کہ اس وقت انٹرپول مغرب کے چھ ممالک میں میرے پیارے قبلہ و کعبہ کے تعاقب میں ہے اور وہ شاید ساؤتھ امریکہ میں کہیں روپوش ہیں۔ گڈ اولڈ ڈیڈ! مجھے یقین ہے۔ وہ جلد پھر سطح پر نمودار ہونگے اور ہم لندن کے کسی پب میں ممی اور میرے مجبر العقول والد — ساتھ بیٹھ کر میری ادبی کامیابی کا جشن منائینگے۔ مجھے اور میری والدہ اور خالہ ستم بینوں کو خوشی ہے کہ ڈیڈ نے اس مرتبہ لمبا ہاتھ مارا۔ ڈیڈ کو ہمیشہ یہ افسوس رہا کہ وہ آدھی زندگی اس لائن میں گزارنے کے باوجود اب تک BIG TIME پر نہیں پہنچ پائے — میں امید کرتا ہوں کہ غیر قانونی منشیات کی خفیہ فروشی میں اب ڈیڈ اپنے خواب پورے کر سکیں گے۔

میرے والدین AMORAL ہیں۔ اور میں خود کو ان سے مختلف سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے یہ میرا حسن ظن ہو۔ مگر میں اپنے والدین کے متعلق کوئی اخلاقی فیصلے صادر نہیں کرتا۔ انہوں نے اپنی اپنی زندگی اپنے حالات اور اپنے طبعی رجحانات کے مطابق گزاری ہیں محض یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ ان حالات کے عمرانی اسباب کیا تھے۔

ہندوستان کے چند شاعروں نے جو انگریزی میں لکھتے ہیں اور ”انڈیا بنگلیں“ کہلاتے ہیں اور خود کو ان ادیبوں سے برتر سمجھتے ہیں جو اپنی مادری یا نیٹو زبانوں میں لکھتے ہیں (مجھے ایک کانفرنس کیلئے مدعو کیا ہے میں برٹش کونسل کی طرف سے ہندوستان آیا ہوں، آجکل اپنی رُوٹس ROOTS اور اپنی بیک گراؤنڈ کی تلاش عصری ادبی فیژن ہے۔ میں اپنی ماں کی NON-BACKGROUND کی تلاش اور مطالعے کی غرض سے لکھنؤ بھی جاؤنگا۔

گھر سے روانگی کے وقت میری ماں نے مسافروں کی حفاظت کرنے والے سینٹر گارڈ کا تعویذ مجھے پہنا دیا تھا۔ روم کے ایک کارڈینل نے خود بلیس کر کے یہ چارم ممی کو دیا ہے۔ مگر دنیا پاگلوں کے جم و کرم پر زندہ ہے۔ ممکن ہے راستے میں سہوائی قزاق نمودار ہوں

اور مجھے موت کے ایئرپورٹ پر اتار دیں۔ اس صورت میں یہ میرا ذاتی روزنامہ اگر بچ رہا تھا تو چھپ جائے گا۔ لہذا یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ اشاعت کے لئے نہیں ہے کیسویں ہنگامہ میں بشرط حیات شاید چھپوا دوں۔ ایک طویل مدت گزرنے کے بعد ”شرمنگ اسکینڈل“ ”دلچسپ تاریخی واقعات“ میں تبدیل ہو جاتے ہیں مستقبل میں اگر میں ایک سجد اہم لٹری ہستی بن گیا تو میرے والدین اور انکی قابل اعتراض زندگیاں ادبی مورخین کیلئے ”گہری معنویت“ اختیار کر لیں گی۔ ماہرین نفسیات اور ثقافتی شخصیت کو انکی زندگیوں کی روشنی میں پرکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرے مرحوم اور نادیدہ نصف برادر بھارج نے سرہنری لارنس کے قائم کیے ہوئے اسکول پہلے شملہ (انڈیا) اور پھر ممبئی (پاکستان) میں پڑھا تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا ممی نے اسکی کتابیں اور کھلونے مجھے دیے جو وہ مانتا کی ماری اپنے ساتھ انگلستان لینی آئی تھیں۔ ان کتابوں میں بچوں کی ایک ”بک اف نالج“ بھی تھی جو ۱۹۳۵ء کے لندن میں چھپی تھی اور جس کے سرورق پر بنے اطفال عالم کے رنگ برنگے جلوس میں انگریز بچے سب سے آگے آگے دکھلائے گئے تھے گویا ماسٹر لیں۔ انکے پیچھے باقی یورپین۔ آخر میں ننھے مٹے چینی۔ جاپانی۔ لاسکیمو۔ عرب۔ پگڑیاں باندھے کالے ہندوستانی۔ اور حلقہ بگوش حبشی۔ گویا حضرات الارض۔

میں آئٹ سیلی کو دیکھتا جو کالی تھیں۔ ممی گوری۔ سمجھ میں نہ آتا۔ ایک بار حال سے پوچھا! انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھتا کر رہ گئیں۔ اگر آزاد ہندوستان میں ہوتیں۔ ممکن ہے بطور ”شرمیتی سرتیا دیوی“ کھٹک ڈانسر، اس نئے معاشرے میں انکو عزت بھی ملتی۔

سارے گھیلے کیا محض تاریخی پولش پیدا کرتی ہے؟

انگلستان میں نسلی فسادات شروع ہوتے۔ ممی مجھے خالص انگریز بنانے پر تل گئیں

جو میں بنا۔

گو میری ماں اور خالہ کا ”بھوانی جکشن“ والا ”جی جی اینگلوانڈین“ لہجہ اب تک نہیں بدلا

پتہ چلا۔ بنگالی جی جی بہت کہتے ہیں۔ کیل کٹا یوریشین ”جی جی“ کہتا تھا۔
 آج سے دو سو سال قبل HICKY کے بنگال گزٹ میں ایک اشتہار چھپتا
 تھا۔ ”جی جی جس لوگوں کے لیے سننے آتے تھے۔“
 جی جی۔ ہندو کا سٹ سسٹم پر اعتراض کرتے تھے۔ بلوچن راسکل اپنے وفادار
 جاں نثار سہم مذہب آدھی گوری قوم کو بلوچن آؤٹ کاسٹ بنادیا۔! بلڈی ہل۔ کیوں؟

”آئی ٹوڈ یو مین۔ بلوچن کنوئکس۔“ بوڑھے یوریشین اسکول ماسٹر نے جواب دیا۔
 میں نے ٹیپ ریکارڈ چلایا۔ مسٹر اینڈریو جونز آزادی کے کئی سال بعد ”ایلا بیٹ“ سے ریٹائر
 ہو کر آئے تھے۔ سیسی ڈی ٹیچڈ مکان کے پھانک پر بوڑھا لگا رکھا تھا۔ ”نہنی تال“
 ”اوہ۔۔۔ نہنی ٹھول۔“ مئی نے آنکھیں نیم واکیں۔

بد قسمی سے یہاں مسٹر جونز کو ایک دو لہندہ پاکستانی کے ہاں ہاؤس میڈیٹنا پڑا تھا۔ وہ
 اس وقت ڈیوٹی پر پارک لین گئی ہوئی تھیں۔ انکے پڑوسی بوئے گوان سیاہ فام مسٹر ڈی سلوا
 تشریف لائے۔ وہ زیادہ خوش قسمت رہے تھے۔ انکی لڑکی بی۔ اے۔ اے۔ سی میں ایر ہوٹس
 تھی۔ ”بلیک ازیونی فل“ نیا نعرہ ہے (حالانکہ پکی بلیٹنگ کے زمانے میں میری آئنٹ سیلی
 کو بہت محتاط رہنا پڑا تھا)۔

میں مسٹر جونز اور مسٹر ڈی سلوا کے بچے بنو رہا تھا۔
 ”پروفیسر بگنر۔ نو۔۔۔“ مسٹر ڈی سلوا کے موتی جیسے دانت بھلا تھے۔
 مسٹر جونز نے ہم لوگوں کی خاطر ”ڈول بیٹ اینڈ کری“ ڈنر تیار کیا تھا۔ وہ کھلے جارہے تھے
 مدتوں بعد انہیں کوئی ایسا شخص جو انکی گفتگو کو اہم سمجھ کر خاص طور پر ملاقات کرنے آئے۔
 ”بلوچن کنوئکس اینڈ اول مین۔“ انہوں نے دھکی میٹ کرتے ہوئے کہا۔ نشے کی
 ترنگ میں وہ مئی سے اپنی اینگلو انڈین اردو بولنے لگے۔ ”تمہارا چھوٹا پوچھتا۔ کیوں؟“
 میں نے درخواست کی اس طرح بولتے رہیں مطلب مئی سے بعد میں پوچھ لوں گا۔
 ”ارڈو؟ ہندوستانی؟ نیو لنگو۔ ایہہ۔۔۔“

”یس سر—کیری اؤن—“
 ”اسکاریکا روڈ بنائے گا پروفیسر مگنہر؟“ مسٹر ڈی سلوانے دریافت کیا۔ سب مہمی سمیت بیچہ مسرور تھے۔

”آہ—یوروپین لوگ پہلے اردو کو بھی مَور بولتا۔ انڈین محمدن لوگ کو بھی مَور بولتا تھا۔ ایسٹویدرا اسکلز—“

”مسٹر جونسن زیادہ اینٹی برٹش ہوتے گئے۔“ ”ہوم“ اگر انہیں شدید مالی اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”ہندو کو جھٹو بولتا تھا۔ اگنورٹ باسٹروڈز—مسلمان کو مَور—پھی—ہم لوگ کو ہاف کاسٹ۔ ایسٹ انڈین—“

”دیری فنی—ہوائے—ہم ویسٹ انڈیا میں رہتا تھا۔ ہمارے کو ایسٹ انڈین بولتا تھا۔ دیری فنی۔“ ”مسٹر ڈی سلوا اتنا ہنسے کہ انکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔“ ”اگنورٹ بلڈی سوائنڈ سو۔“

مہی اردو اور انگلش منغلات کی ماہر ہیں۔ لیکن اسوقت اپنے شایستہ ”پکا انگلش مین“ بیٹے کی موجودگی میں گالی گلوچ انہیں خوش نہ آئی۔ خاموش بیٹھی دھسکی پیاکیں۔

”ارے ویسٹ انڈین کیسے بولتا۔ ویسٹ انڈیز تو اُدھر تھا—وہ سائیڈ میں انکے باپنے اصلی امریکن کو انڈین بنا دیا تھا۔ تو ہم لوگ کو ایسٹ انڈین بولنا ہی مانگتا—“

”مسٹر جونسن نے اٹھ کر باد آدم کے زمانے کا ریکارڈ لگا دیا جو وہ یقیناً اپنے ساتھ ”ایلا بیٹ“ سے لائے تھے۔ مہی سے ناچنے کی درخواست کی۔ وہ اٹھ کر انکے ساتھ نوکس ٹروٹ کرنے لگیں۔ یقیناً یہ لوگ چالیس سال قبل کے ”لک ناؤ“ اور ”ایلا بیٹ“ میں واپس پہنچ چکے تھے۔

”کچھ دیر بعد میں نے اپنا سوال دہرایا—“ ”مسٹر جونسن—انگریزوں نے انڈیا کی دوغلی نسل کے ساتھ ایسا سوتیللا پن کیوں—“

انہوں نے چٹکی بجائی—”پیشہ—بلڈی پیشہ—ادھر نیپلین دُنا۔ مچائے

ہوئے ادھر انڈیا میں یہ بارڈورکنگ انٹلی جنٹ ہاف بریڈچیا یا جانا ہے۔ خرگوش کے موافق۔
انڈیا میں اگر ہاف بریڈ ایسے ہی آگو بڑھتا گیا تو انگلینڈ سے آنے والا اینگ مین کیا کرینگا
تمہارا سر — لک ادھر ساؤتھ امریکہ میں کیا ہوا۔
"ایکدم گڑبڑ گھٹا لا۔" مسٹر ڈی سلوا بولے۔

"ملا تو لوگ لوکل لوگ سے مسکوٹ کر کے اسپنیش حاکم لوگ کو — بولا گٹ آؤٹ —
آؤٹ کر دیا — دیر فور کمپنی کا کورٹ آف ڈائریکٹرز اسی سٹی آف لندن سے ایک فائیل
کیل کٹا دیسیج کرتا ہے۔ ارجنٹ۔ ۱۹۵۰ میں۔ کیا بولتا ہے کہ آج سے انگلش فادر اور نیٹو مدر کا
بتیا لوگ آرمی اینڈ سیول اونچے جو ب کے لیے ان فٹ۔ گورنر جنرل کیل کٹا سے فائیل پر لکھا اسپن۔
ایکشن ٹیکن — اب وہ گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں میں آنے نہیں سکتا۔ انکا کلب، محلہ،
چرچ — سب الگ — چھوٹا موٹا جو ب انکے لیے ریزرو — ڈیر فور ٹو ہنڈرڈ ایرز سے ہم
لوگ آرمی سارجنٹ۔ پوسٹ آفس کلرک۔ اسکول ماسٹر۔ نرس — ٹو ہنڈرڈ ایرز۔"

"چی — چی — بڑا ظلم کیا ہم لوگ کے ساتھ — سو اٹن — "ممی کو شاید پہلی
مرتبہ اس ظلم کا احساس ہوا۔ اب وہ آنسو بہانے لگیں۔

"جب تم تک لکھے گا ہمارا نام اسمیں ضرور ڈالنا نورمن بوائے۔"

"میرا بھی فل نیم — فل نیم — فرانس زویویر ماریو فرینڈ برڈی سلوا —
نو — ہ نائس لیڈ — نو — مسٹر جوننر — ؟"

"یس یس مسٹر ڈی سلوا — ٹین ڈرنک ٹو ہنڈرڈ سس ایز این آؤتھرائنڈ اول
فورسی ازا سے جولی گڈ فیلو — فورسی ازا — ہی ازا آوا دن بچہ —"

چنانچہ چی چی مس لوگوں کے لیے سستے آئینے!

اب میں نے کمپنی کے عہدار آخری مغلوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔

میرے نیوز پیپر آفس کی ایک اینگلو انڈین اسٹوگرافرنے اپنے ماموں مسٹر جونسز کا پتہ بتلایا۔
 ما۔ برطانیہ کے جانے مانے سلیور ایکسپریٹ مسٹر چارلس گریگ سے ایک پب میں اتفاقیہ ملاقات
 ہو گئی۔ وہ شاہ عالم ثانی کے گریٹ گریٹ گریٹ گریٹ گریٹ نکلے — ماں کی طرف سے۔
 فاتح مغل مفتوح راجپوت سنڈروم؟ اسی دیک اینڈ پروفیسر ریڈول اسپیرز
 سے اس علم دوست فارسی داں یوریشین اسٹوگریسی کے بانیوں کی فہرست حاصل کی۔
 جنرل اور سیکم فیض النساء پامر۔ کرنل دیگم کرک پیٹرک۔ میجر حیدر ہرسی۔ جنرل حمید ہکنڈ —
 کرنل ولیم کارڈنر۔

مگر اس زمانے کے عالی مرتبت مسلمان اتنے آزاد خیال تھے کہ اپنی لڑکیوں کی شادیاں
 — یا یہ کہ کلاس ایک تھی۔ اور ان صاحبانِ عالیشان نے مغل تمدن کیوں اپنایا؟
 کہ غالب تمدن تھا۔

مئی کو بتلایا ایک ادبی کانفرنس کے لیے انڈیا جا رہا ہوں۔
 ”انڈیا ڈسٹ از بھارت —“ انہوں نے ناگواری سے کہا۔ ”وہاں اب کیا رکھا ہے؟“
 ”کیا تم نہیں چاہو گی کہ لال باغ لکھنؤ میں تمہاری کوٹھی دیکھ کر آؤں۔ کس حال میں ہے۔
 اپنی اسٹائل کا طرز تعمیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور کیتھولک قبرستان میں تمہارے پاپا کی قبر پر پھول۔
 دفعتاً وہ رونے لگیں۔

”میرا بچہ گھوڑا گلی بھی جانا۔ پاکستان۔ جارج کی قبر بھی —“
 مئی نے چلتے وقت یہ بھی کہا تھا بار لو گنج مسوری ضرور جاؤں جہاں ریلوے والوں
 کے بچوں کے اسکول میں ان دونوں بہنوں نے اپنا معصوم بچپن گزارا تھا۔
 مسوری میں مئی ایک ہس اسکول کو جانتی تھیں انکا پتہ بتایا۔

مسٹر جیمز اسکول بار لو گنج مسوری میں پولیٹری فارمنگ کرتے ہیں۔ انکا ہمنام اسکاٹ مورٹ
 اعلیٰ اٹھارہویں صدی ہندوستان کا نقشہ بدلنے میں مصروف رہا تھا۔ مسٹر جیمز اسکول ضلع مرزا پور

کے ایک ٹھاکر زمیندار کی لڑکی — اور ان دونوں کا نام اور بیٹا جنرل جیمز اسکزنر جو ایک وسیع حرم رکھتا تھا بلند شہر میں قلعہ وجاگیر۔ چاندنی چوک دلی میں ٹاؤن ہاؤس فارسی میں خط و کتابت اسی اولاد میں چھوڑیں۔

صاحبان تازہ ولایت اس دلچسپ مغل یورپین معاشرے کو عجوبہ سمجھنے لگے تھے

۱۸۳۵ء میں سرطاس مشکاف کی بیٹی لیڈی کلائیو پہلی :-

”آج ضعیف العمر جنرل اسکزنر مع اپنی بیگم ملنے آئے۔ سافوے ہیں۔ مگر خود کو انگریز سمجھتے ہیں۔

اس خاندان کے مذہب کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا“

اس بوڑھے جنگی گھوڑے کی بہو منرا لکزنڈرا اسکزنر نے لیڈی سیلی کو اپنے عالیشان گارڈن ہاؤس میں سپانوپر ایک عدد دلالتی گانا سنایا جو ”انکھے عجیب وغریب لہجے“ کی وجہ سے مہمان خاتون کے پلٹے نہ پڑا۔ البتہ معاصرین کے مقبول میوزک ہال گیت ”ولی کنز اور ڈائنا“ کی دھن پہچانی۔

میں دہلی میں ایک اردو داں انڈو اینگلیکین شاعر کے ساتھ کشمیری گیٹ کا علاقہ گھوم رہا تھا جب جنرل اسکزنر کا بنوایا ہوا سینٹ جیمز چرچ نظر آیا۔ اسکے اجاڑے احاطے میں کسی پنجابی کا رو باہی کی شادی کا پنڈال سجایا جا رہا تھا۔ سرطاس مشکاف بنگال سول سروس کی قبر پر ایک باجے والا اکڑوں بیٹھا اپنی کلارنٹ کی کھونٹیاں کسنے میں محو تھا۔ اسکزنر گورستان کے ایک مقبرے پر فارسی اور اردو کتبے نظر آئے۔ صلیب اور مرمرین فرشتے کے نیچے ”ہو العزیز الرحیم — جو اردو داں دوست نے پڑھ کر بتایا کہ خدا کا نام لکھنے کا اسلامی طریقہ ہے۔

عجیب وغریب لہجے میں ”ولی کنز اور ڈائنا“ الا اپنے والی اس ”کدبانوئے لکزنڈرا اسکزنر“ کا نام اہلیں اور خطاب سردار مہو تھا۔ وہ ”بہر نجات بطریق عیسوی“ دفن کی گئی — شاید مسلمان رہی ہوگی۔ اور اسکے شوہر نے کہ سکنڈر تخلص کرتا تھا، اردو میں ایک قطعہ کندہ کروایا تھا۔

اس کنبے کے مسلمان افراد گورستان نظام الدین اولیاء میں مدفون ہیں۔ جس اسکزنر

لڑکی سے ممی واقف تھیں ہانسی حصار میں انکی جاگیر تھی۔ مسلمان دادی خاندان
 لوہارو سے تعلق رکھتی تھیں۔ مسوری میں سینئر مسٹر اسکزنڈر پریٹیٹھ سٹک گڑا گڑایا
 کرتے تھے شیعہ کے ہندو مسلم فسادات سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ خودکشی کر لی۔
 اس قسم کے لوگ تاریخ کے LEFT-OVERS ہیں۔

بیشتر عورتوں کی طرح ممی ایک جذباتی خاتون ہیں اپنے بچپن کی یادگار، کوٹ تیلوں میں
 ملبوس ایک مسخرہ حبشی گڈا بھی سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے یہ ”گوئی دُؤگ“ انگریز بچیوں کے گڑا گھر
 کا ایک لازمی جزو ہوا کرتا تھا wog ”ویٹر نائید ڈاؤرنٹیل جنٹلمین“ کا مخفف تھا مغربی ایشیا
 اور شمالی افریقہ کے مجاہدین آزادی ”محمدن فنائنگ“ کہلاتے ہندوستان کے کھد پو ش
 قوم پرستوں کا ”بھوانی جنگشن“ میں جان ماسٹرز نے مذاق اڑایا۔ خود اینگلو انڈین
 تھا لیکن میری طرح اپنے آپ کو انگریز مشہور کر رکھا تھا۔

ممی مسوری کی ایک ہم سبق گارڈنر لڑکی کا ذکر بھی کرتی ہیں جس کا باپ انجن ڈرائیور تھا۔

لونگ اسٹن مینر نیویارک کے کرنل لونگ اسٹن اس شہر کے آبادکاروں میں شامل
 تھے۔ وہ پونے دواکھ ایکڑ زمین دریا سے ہڈسن کے کنارے بسنے والے ریڈ انڈین قبائل سے
 چھین کر اپنی چودہ بیٹوں کے لیے بے اندازہ دولت کا انتظام بھی کر گئے تھے۔ انکی بیٹی نے ایک
 آئرش نژاد برٹش کیپٹن ویلنٹائن گارڈنر سے شادی کی۔ ویلنٹائن کا بھائی انگلینڈ کا
 نامور ایڈمرل ایلن لارڈ گارڈنر جہان نو کی بحری جنگوں میں فرانس اور ہسپانیہ کے خلاف
 برطانوی فتوحات کے پھر پھر سے اڑاتا پھرتا تھا۔

کولونیل امریکہ نے مدر کنٹری کے خلاف پرچم لہرائے۔ برطانوی شکست کے بعد
 کیپٹن ویلنٹائن گارڈنر اور امریکن امیرزادی کا نو عمر بیٹا دلیم اس نئی باط پروار دہوا
 جسکی بازی انگلستان نے جیت لی تھی۔

جان کہنی نے کیٹین ولیم گارڈنر کو بسلسلہ ریشہ دوانی بطور اپنی نواب کھبایت کے دربار میں بھیجا۔ یہ حسین رونیکس کے جو نوابزادی پر عاشق ہوا۔ باپ سے شادی کا مطالبہ کیا۔ یہ ۱۷۹۶ء کا واقعہ ہے۔ گجراتی نواب نے مجبوراً قاضی بلو اکرم ۱۳ سالہ منظور النساء بیگم کا نکاح ۲۶ سالہ کپتان ولیم سے پڑھوایا۔ بنشپ اف کلکتہ نے از روئے کلیسائے انگلستان اس سنجوگ کو جائز قرار دیا!

منر گارڈنر اندر، پونا اور جے پور کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دلی پہنچیں جسے ۱۸۰۱ء میں لارڈ لیک فتح کر چکے تھے۔ پنشن یافتہ اکبر شاہ ثانی نے منظور النساء کو اپنی بیٹی بنایا۔ انکی بہن نھور النساء بیگم کا شوہر میجر ہرسی ضلع بدایوں میں اپنی جاگیر پر راجتا تھا۔ میجر ولیم گارڈنر نے کمایوں فتح کر کے ہندوستان کا پہلا اہل سیشن الموطہ آباد کیا۔ اپنی فوج گارڈنر ہؤرس کے لیے ضلع ایٹھ میں کالی ندی کے کنارے چھاؤنی چھاتی تاکہ اسکے گھوڑے باسانی پانی پیا کریں۔ ماں کی طرف سے نیویارک کی کثیر لونگ اسٹن جائیداد شریک تھا۔ اودھ میں اس نے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے ایک چکے دار کی حیثیت سے مال بیوا۔ اپنی پوتی سوژن کا بیاہ مغلیہ تنرک و احتشام کے ساتھ سلیمان شکوہ شہزادے کے بیٹے انجم شکوہ سے لکھنؤ میں رچایا۔

اب سلیمان شکوہ۔ اکبر شاہ ثانی کا حقیقی برادر خرد۔ شاہ اودھ کا وظیفہ خوار۔ اسکی ایک بیگم نے اسکے درباری گوئیے مان خاں کی پریرد پچی گودی تھی۔ شہزادہ اسے اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتا تھا۔ شہزادی قمرچہر۔ اسکا عقد اپنے بیٹھے شاہزادہ سلیم ابن اکبر شاہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے عیاش شوہر سے ناخوش لکھنؤ میں رہتی تھی۔ مرزا سلیم بھی اپنے جلاوطن جوانمرگ بھائی مرزا جہانگیر کے مانند ایٹنی برٹش تھا۔ چنانچہ لارڈ مکاف نے اسکے بجائے اسکے سوتیلے مرزاں مرزا شاعر بھائی کو برائے نام تخت پر بٹھایا اور قمرچہر رنگون میں مرتیں۔

لیکن انکی زندگی ایک اور رخ اختیار کرنے والی تھی جسکا انکو پتہ نہ تھا۔ بطور آوارہ

اپنے راستوں کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ ذہانت جبلت سے مات کھاتی ہے۔

۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ سلیمان شکوہ سے کہا قمرچہر کو بھی حرم میں بھیج دیں تو آپ کے وظیفے میں پانچ ہزار مہینے کا اضافہ۔ شہزادے کے غضبناک انکار پر اودھنریش نے قمرچہر سگیم ایک کنشی کے ذریعے اٹھوالی۔ سلیمان شکوہ نے انگلش رینڈنٹ مقیم بیلی گارڈ سے فریاد کی۔ قمرچہر واپس منگوائی گئیں۔ انکے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر شہزادے نے اپنے سمبھی کنرل ولیم گارڈن کو اٹیسے سے بلوایا۔ وہ مرد میدان لکھنؤ اگر باپ بیٹی کو اپنے علاقے پر لے گیا۔

کنڑی ہاؤس کا سنگ میں ولیم اور منظور النساء کے نور بصر جیمز اس ماد پیکر پر عاشق ہوئے۔

خوشرو۔ نیم دلایتی، شوہلرس۔ جیمز گارڈن کی معیت اور اس انگلش چھاؤنی میں قیام نے غالباً قمرچہر کو اس سیکورٹی کا احساس دلایا تو قلعہ معلیٰ اور لکھنؤ دونوں جگہ مفقود تھی۔

ہندوستانی مصوری اور گیتوں کی رادھا بھنگی اندھیاری راتوں میں اغیار کی نظروں سے بچتی کہنیا سے ملنے کالی ندی کے تھ پر جایا کرتی ہیں۔

سلیمان شکوہ نے اس پری کو یہاں بھی اس کے بیڈ جیمز میں قید کر دیا۔ لیکن ایک تاریک اور طوفانی رات وہ چند مکھی اپنے نٹور کے ساتھ الور فرار ہوئی۔ نالایتی فرزند کی اس حرکت سے بوڑھا کنرل شاہ دلی اور اپنے ہمان پناہ گزین بادشاہ زادے کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہا۔ اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا۔

(پریشان حال بے خانماں سلیمان شکوہ اگرے چلے گئے۔ دس برس بعد وہیں مرے۔ ڈھلتی دھوب میں زندگی کا ٹی۔ نصف النہار کے آفتاب نے آخری پناہ دی۔ اپنے جدِ اکبر کے مقبرے میں دفن کیے گئے۔)

جیمز اور قمر چہرہ دو سال تک مارے مارے پھرے۔ تب جیمز نے خٹکیں باپ کا دل نرم کرنے کے لیے ایک نائک رچا۔ وہ بوڑھا سورا مو پھوں سے چنگاریاں اڑاتا ذاتی بجرے کو ناڈ پر سوار مٹھر اسے گزر رہا تھا۔ یہ لارڈ کوکوار کاتانی ساحل پر پہنچا۔ جنبا میں کو دگیا۔ کشتی بند پہنچنے کی کوشش کی۔ ڈوبنے لگے۔ باپ نے ہڑ بڑا کر پانی سے نکالا۔ کاسکینج لوٹ کر قمر چہرہ کو شہزادہ سلیم سے طلاق دلوائی پھو کرے کے ساتھ اسلامی نکاح پڑھوایا۔

قمر چہرہ محرم میں لکھنؤ جا کر ایک لاکھ روپے سالانہ کی اعزاداری کیا کیں، بیٹے انکے سلیمان شکوہ گارڈنر قنا باپ دادا کی طرح عیسائی رہے مگر چار بیویاں بھی رکھتے تھے اور لکھ لٹ یعنی خالص مسلم وضع کے رئیس تھے۔

دراصل صحیح معنوں میں ایک رومینٹک معاشرہ تھا۔ ۱۸۵۶ء اندوسلم فیوڈل تہذیب کی شکست کا سال ہے۔ غدر کے بعد روکھی بھیک کی وکٹورین اخلاقیات اور عیسائیت کے فروغ نے برطانوی ہند میں ایک کٹر نسو سائیٹی کی بنا ڈالی۔ اس تبدیلی کا اثر گارڈنر میں نظر آتا ہے کہ حضرت قنا کے اگلی پیڑھوں میں محض جوشیلے مشنری پیدا ہوئے۔ یہ رپورٹ صاحبان گرج گرج کر گنہ گاروں کو عذاب جہنم سے خردار کرنے والے ہم عصر امریکن پروٹسٹنٹ پادریوں سے کتنے قریب اور اپنے دلچسپ، مہم پسند، ”زندگی سے وسیع تر“ بزرگوں کے مقابلہ میں کس قدر بے رنگ اور منحنی سے معلوم ہوتے ہونگے۔

لیکن اس گزرے ہوئے مغلیہ زمانے کا اثر اس حد تک اب بھی باقی تھا کہ یہ حضرت اپنے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے میں اپنے اردو کلام کی بیاضیں تھامے لکھتے تھے شہزادہ انجم شکوہ اور سوزن گارڈنر کی بیٹی آخر زمانی بیگم یعنی شاہ عالم ثانی کی سگی پڑپوتی باضابطہ عیسائی ہو گئیں۔ اپنے ایک کزن ایلن سے شادی کی۔

جرمن سر دھنہ اور فرینچ کوئیل (علیگڈھ) کی طرح کاسکینج بھی ایک افسانہ رہا ہوگا ”بیگم کے کیتھڈرل“ کے بعد ایٹے کا ارادہ کر رہا تھا جب نئی دہلی میں ایک ڈنر پر الہ آباد بائیکورٹ

کے ایک مسلمان جج صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پروگرام کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی گارڈنر کا سنگین میں بسب موجود نہیں۔ انکے سولیلین والد ۱۹۳۷ء تک اس مقام کے حاکم پرکھتے تھے۔ اسوقت ایک نہایت وجہہ لوکل مفلوک الحال انگریز بطور موٹر ڈرائیو ایئر میں انکے ہاں ملازم تھا۔ اسکا نام ولیم تھا اور وہ ایک مسکین سا آدمی تھا اور اکثر انکے باغ میں مالی کی مدد کرتا تھا اور مٹی کے ٹوکے سے سر پر رکھ کر ڈھویا کرتا تھا۔

ایک نیشنل انگریزی روزنامے کے ریڈیڈنٹ اڈیٹر کے ڈرائیونگ روم میں، اُس رات، ”دور وژن“ پر ایک برہمن رقاصہ ادا شرا، مغل پوٹریٹ غالب کے اشعار کتھک نرتیہ میں پیش کر رہی تھیں۔ لیکن مجھے گارڈنرز نے پریشان کر رکھا تھا۔ ڈنر کے بعد جج صاحب سے پھر کہا۔ چند سکندرسوچ کر انہوں نے دو گھنٹوں کا پتہ بتایا جو اسی ضلع کے باشندے ہیں۔ ان میں سے ایک کنبہ دہلی میں مقیم ہے دوسرا ڈسٹرکٹ ایئر کے ایک مشہور مسلم سینٹ کی سٹرائٹن سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو میں نے دہلی میں رہنے والے صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے بھی اسی سٹرائٹن کا پتہ دیا اور یہ بھی کہ قمر چہراں مقدس بزرگ کی معتقد تھیں موجودہ کسٹوڈین کا سولیلین لڑکا فلاں جگہ تعینات ہے۔ فلاں محکمے میں۔

آگرہ۔ ہوٹل کلا ریس شیراز کی ”مغل لاؤنج“ سے تاج نظر آتا ہے۔ بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہم دفعتاً ایک کیمرا آڈیو ریکورڈ میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہ عظیم مغل بھی بہت نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ آخری مغل بہت دُور جن میں سے ایک سلیمان شکوہ تھا اور اسکی بے پالک لڑکی قمر چہرا گارڈنر۔ بنت استادمان خاں کلاؤنٹ۔ زوال سلطنت تیموریہ کی علامت۔ برکیفا سٹ کھاتے مغربی سیاحوں کے چھری کانٹوں کے مدھم شور میں ریسٹوران کے فلوئڈیجر سے ایسے کا راستہ دریافت کیا۔

”ایئر۔۔۔“ وہ متعجب نظر آیا۔ ”ڈاکوؤں کے متعلق ٹیلی ویژن فلم۔۔۔ بی بی سی؟“
 ”نہیں“ میں خاموش ہو گیا، ایک غیر معروف تاریخی ہستی قمر چہرا کی تلاش۔۔۔ بتاؤں تو لوگ مجھے سنگی سمجھیں گے۔

ایک کمرشل فائدہ۔۔۔ میں بھی انڈیا کے لیے اہل برطانیہ کے موجودہ قومی نوٹیلجیا کو
کنیشن کروں۔۔۔ قمرچہرا اور جیمز گارڈنر بیگم سمر و۔۔۔ میڈوز ٹیلر۔ کرنل سلیمین اور انکے ٹھکانوں کے
بارے میں ایک ٹی وی سیریل کا ڈول ڈالوں۔

لیکن مجھے تاریخ کی اس ہٹری اور ہٹافزکس (۲) کی جستجو ہے جو سامنے جون کی دھوپ
میں تیرتے تاج کی پچھائیں سی معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے گرفت —
مصافحے کے لیے ایک ہاتھ سامنے آیا۔ پھر آواز: ”مسٹر نورمن ڈریک؟“
میں نے چونک کر پلیٹ پر سے سر اونچا کیا۔

شرائین سے تعلق رکھنے والے جس نوعمر سولین کو اگرچہ پہنچتے ہی فون کیا تھا وہ جیب لپک کر گیا تھا۔

ایٹھ پہنچ کر ضلع ہیڈ کوارٹر سے میرے نئے دوست نے ایک اور افسر کو ساتھ لیا۔ ایک
”تحصیل“ سے ”تھیلڈار“ کو جیب پر سبھالا۔ ایک دور افتادہ اجاڑے موضع میں داخل ہو کر
ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے رکے۔ یہ گارڈنر برادران کی تین شاخوں میں سے ایک
کی کنٹری سیدٹ رہی تھی۔ اب اس کھنڈر میں محض دو کمرے رہائش کے قابل باقی تھے۔

دو گارڈنر بھائی ایک کمرے میں نظر آئے۔ ایک پلنگ پر لیٹا ٹائیٹ آف انڈیا پڑھ رہا تھا۔
ہندوستانی پوشاک میں ملبوس انکی نوعمر لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ جو ہمیں دیکھتے ہی فوراً اچلی گئیں
اور کھنڈر سے گذرتی ایک ملحقہ مکان میں غائب ہوتی دکھلائی دیں۔

میں متحیر ہوا۔ منظور انسار بیگم اور قمرچہر کی مسلم تہذیبی روایت کا اتنا دیرپا اثر۔
اضلاع میں انڈین بیوروکریسی کا رعب داب اور اسکی MYSTIQUE مجھے مغلیہ اور
برطانوی عہد کی یادگار معلوم ہوئی۔

میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ انہوں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ ایک بھائی فوراً اٹھا۔
الماری سے انگلش اسٹوکرسی کے نسب نامے ڈیبرے کا تازہ ترین اڈیشن نکال کر ایک صفحہ
کھولا۔ اس پر ان دونوں بھائیوں کے نام درج تھے۔

میں نے کتاب انکے ہاتھ سے لیکر ان اور اق پر نگاہ دوڑائی۔ صوفیہ شکوہ۔ فلاں۔ فلاں۔ فلاں۔
 فلاں۔ والی کاؤٹنس اف ہارڈین۔ فلاں فلاں۔ رینڈیڈنس : دی اوک لینڈز۔ کنٹر بری۔
 کلب : یونائیڈڈ سنٹس۔ گارڈز۔
 ”یہ شہزادہ انجم شکوہ کی کرسیچین لڑکی جین اختر زمانی والی شاخ ہے“ ایک بھائی نے
 مطلع کیا۔ وہ دونوں ہماری خاطر مدارات میں مصروف ہو چکے تھے۔

پرفضا کنٹر بری۔ پھولوں سے بھرے مرغزار۔ اونچے درختوں میں گھبراہ روئی کنٹری ہاؤس
 اعلیٰ ترین کلب۔ یہ گرد آلود گاؤں۔ بے رنگ دلو پیمانہ۔ دو سید مختلف دینا میں تھیں۔ شاید
 یہ موسم کا اثر بھی تھا مجھ پر اسی طاری ہوتی گئی فیرس کے سفید یونیفارم میں ملبوس ایک گارڈز
 خاتون برآمدے میں سے گذر گئیں ۱۷۹۵ والا سرکاری فیصلہ بھی اتنا دیر پا۔
 دور آم کے باغ میں کوئل کوک رہی تھی۔

”کرنل ولیم گارڈنز“ ایک میزبان کی آواز آئی۔ ”ایک لاکھ درخت لگوائے تھے کہ اگلی
 بیڑھیاں نکلی نکل جائیں تو بھی ایک لاکھ سالانہ کی آمدنی۔
 ”سب آسٹریلیا جا بے۔ وہ بھی دراصل۔ کرنل کو کیا پتہ تھا محض ڈیڑھ سو سال بعد
 ملک انکی قوم کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دیکھا جائے تو راج کی مدت خاصی مختصر رہی۔

عمرانی تفتیش و جستجو۔ سرحدوں میں چھپی تاریخی حقیقتیں انسانوں کی کہانیاں ہیں
 انکا اچانک سامنا جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے میری اداسی بڑھتی گئی۔ ان خلیق بھائیوں سے
 رحمت ہو کر باہر نکلا۔ ہوا میں خشکی آچلی تھی۔
 آخری بار اس کھنڈر پر نظر ڈالی۔ بھلا زندگی میں دوبارہ یہاں کیوں آؤنگا۔

جیپ شاہراہ پر آگئی۔ دونوں طرف حد نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ زمین۔ زمین۔

زمین۔ انسانوں کو کتنی زمین چاہیے؟ شاید ٹالسٹائی نے سوال کیا تھا۔ کتنی — ہارنل لوگکسٹن اور اسکی قوم کی ”ریڈ انڈین“ زمین۔ گارڈنر کی قوم کی ”بلیک انڈین“ زمین۔ اسرائیلیوں کی مقبوضہ عرب زمین۔ اور اب اس دیس کی آزاد دھرتی کا منافع بالآخر کس کو پہنچ رہا ہے؟

جمہوریہ ہند کے عالمانِ ضلع کو انکے مقامات پر پہنچاتے ہوئے میرے رہبر دوست نے کہا — قمر چہر، جیمز گارڈنر اور انکے فرزند سلیمان شکوہ گارڈنر قضا ہمارے مقدس بزرگ کے معتقد تھے۔ انڈین ہولی مین! ہمارے دیوت میں ہولی مین نہیں ہوتے۔ کیتھولک چرچ میں بھی اولیاء کا سلسلہ اس طرح نہیں چلا۔ دوست کے ہمراہ اسکے گھر یعنی اس شرائین پر جا سکتا تھا۔ لیکن نہیں گیا۔ مسلم شرائینز کی تحقیق و مشاہدات کا باب نہیں کھول سکتا۔ فرصت نہ دلچپی۔

مغل انگریزی داں ہوتے گارڈنرز وغیرہ کو wogs بکارتے — مطلب لٹ ہوتا۔ — ویسٹرن اور نیڈلر ڈھنڈھ! میڈیول اسپین کے عیسائیوں جیسے۔

اسی طرح کا معاملہ اسپین و پرتگال میں پیش آیا تھا۔ مگر وہاں بنو و شمشیر ساری مسلم آبادی کو رومن کیتھولک بنا لیا گیا۔ گو وہ اب تک تمدنی لحاظ سے خاصے مورش چلے آ رہے ہیں۔

فاتح انگریز بھی تمام ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی کر سکتے تھے لیکن وہ انیسویں صدی تھی۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان سے قبل مسلمان فاتحین بھی ساری آبادی کو بنو و شمشیر کلمہ پڑھا سکتے تھے۔ انہوں نے قرون وسطیٰ میں بھی ایسا نہیں کیا۔

میر انیادوست اپنی درگاہ کی طرف جانے والی سڑک پر سے جیپ موٹر مجھے آگاہ پہنچانے کے لئے شاہراہ پر لے آیا۔ راستے میں اس نے کہا — گریٹ گرینڈ فادر نے گرینڈ پا کو بتلایا تھا کہ قمر چہر ہاتھی پر بیٹھ کر اور چاندی کی کھڑاویں پہن کر درگاہ پر آتی تھیں۔ مقدس بزرگ کو پاپا تھتی تھیں۔ انکی خواہیں چمڑے کے دستانے پہنے رہتی تھیں انکے ہاتھوں پر باز کی نسل کے چھوٹے برنڈ بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ پرند تتری کہلاتے ہیں۔ —

”قمر چہر ملکہ زمانی بیگم چیتے کا شکار بھی کھیتی تھیں زمینداری کا سارا انتظام خود کرتی تھیں۔“

ل کی تجارت شروع کی تھی۔ اولڈ کورٹ ہاؤس کلکتہ میں اسکا دفتر قائم کیا تھا۔ مسٹر برائین سلیمان شکوہ گارڈن نے کہا۔ ہم لوگ سابق امپریل جم خانہ حال دہلی جم خانہ کے ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”کرسچین انگلش خاندان کا اصرار جس میں انکی شادی ہوئی تھی، میں نے اظہار خیال کیا۔“
 ”جی نہیں۔ مغلیہ شہزادیوں کی روایت“ انڈیا نگلین شاعر نے جواب دیا: ”میں سمجھتا ہوں
 من“ اس نے پائپ سلگاتے ہوئے ابرو اٹھا کر کہا: ”تم کو مشرق کے متعلق اپنے تصورات بدلنے
 ہتیں“

میں خاموش رہا۔ میز پر عمر گنتی ہے۔ محض پچیس سال۔ لیکن ایک بوڑھی دنیا اور بوسیدہ
 ناشرے کے تخلیق کردہ ایکیج میرے ذہن میں ابھی سے پختہ ہو چکے ہیں۔ مثلاً — مسلمان
 رتوں کی ادنیٰ حیثیت۔ اسلام میں عورت کا کمتر درجہ — وغیرہ۔ ان تصورات کو مڈل ایسٹ
 خبروں سے مزید تقویت ملتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا — اینگلو انڈین طبقہ بھی تو غلط ایج
 شکار ہے۔ محض چند کبیرے ڈانسرز کی بدولت۔ دوسرے فرقوں میں پیشہ و عزتیں نہیں ہوتیں؟

”نورمن بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو جاتا ہے“ ایک دوست نے کہا۔

”شاعر —“ دوسرے مہمان نے جواب دیا۔

سلیمان شکوہ صاحب مسکرائے۔ انکے ہاں شاعری کا سلسلہ بہت طویل رہا تھا۔
 ضلع ایٹھ کے ان دو بھائیوں نے دہلی میں مقیم دو قرابت داروں کے ایڈریس مجھے
 یے تھے۔ اس کلب کے ممبر میرے اڈیٹر دوست نے ہم سب کو یہاں لنچ پر مدعو کر رکھا تھا۔
 کی صفدر جنگ لین میں موسم گرما کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ کچھ دور صفدر جنگ روڈ پر
 یراعظم انڈا گاندھی اپنی کوٹھی میں فروکش تھیں۔ انکے بزرگوں کو شہنشاہ فرخ سیر نیپاک
 نہر کے کنارے زمین دی تھی۔ اور فاصلے پر محمد شاہی امیر، دوسرا نواب اودھ صفدر جنگ
 مقبرے میں خوابیدہ تھا۔ مغلوں کا شاہجہاں آباد۔ لیٹنر کی نئی دہلی۔ سونتر بھارت کی
 جدھانی! شہروں اور انسانوں کی شخصیت یکساں ہے۔ اس پر پیاز کے سے پرت چڑھتے

رہتے ہیں۔ اگر انکو اتارنا شروع کیجئے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

میں پھر دونوں گارڈز کی طرف متوجہ ہوا۔ ایسے والوں کی طرح کے دوسا دھارن بہن نیک سے لوگ۔ مرزا مرنج۔ مسٹر ریگی گارڈز شکلاً اینگلو انڈین تھے۔ اردو سے بھی ناواقف طویل عرصہ یورپ اور مڈل ایسٹ میں گزار کر لوٹے تھے۔

”میں دو مہینے وکٹر اسکز کے ہاں رہا۔ بلاسپور ضلع بلند شہر۔ اب سڈنی جا رہا ہوں“
”وکٹر اسکز اجڑا اسکز کے قلعے میں رہتے ہونگے۔“ میں نے مسرور ہو کر پوچھا۔

ریگی صاحب کو ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی کہنے لگے ”قلعہ؟ توکب کا ٹوٹ پھوٹ چکا۔ سکندر صاحب کا کوٹ!“
”آپ کو اپنے بچپن کا کاسٹل یاد ہے؟“

”جی ہاں۔ اونچے چار عین پیل پائے۔ دیواروں پر سبھی تلواریں۔ اور دادی جو کرسی پر تھیں لیکن ہمیشہ غرارہ پہنتی تھیں۔“
گورارہ میں نے فوراً جوٹ ڈاؤن کیا۔ ”مسلم ڈریس۔“

اوبرائن سلیمان شکوہ شگفتہ مزاج۔ تعلق اور کھلتی رنگت کے ہندوستانی وہ کہہ رہے تھے۔ ”لڑکپن میں ہم نے اپنے خاندانی علموں کے سامنے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ جب تک ہمارا امام باڑہ مقفل نہ ہوا۔“

محترم اور امام باڑے کا مطلب چند روز قبل نوٹ کر چکا تھا اسلئے سننے میں مصروف رہا۔
”تو سال تک ہمارے ماں مسلمانوں میں شادیاں ہوئیں۔“

”اس قسم کا دوڑ گا طرز حیات ممکن ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اس زمانے میں زندگیاں اتنی پیچیدہ نہیں تھیں رواداری بھی تھی ایمیلیا سلطان۔ بنت مرزا اکبر حسین میری والدہ تھیں۔“

”اوبرائن صاحب! ہم قمر چہرہ ملکہ زمانی بیگم سے کافی دور نکل آئے۔“ میں نے انہیں یاد دلایا۔ ”آپ نے تو وہ امام باڑہ ہی بند کر دیا! ذرا واپس چلیے۔“

”ابھی انکے بہت نزدیک میں سنتے جائیے۔ انکے اکلوتے بیٹے سلیمان شکوہ گارڈز فٹا لی بڑے غیر معمولی قسم کے انسان تھے صوفی منش مناصحاب۔ ساری دولت احباب اور جہتمدوں پر لٹا دی۔ وصعدار۔ ہمیشہ پالکی میں سفر کیا۔ حرم بھی رکھتے تھے اور نامی طوائفوں کے سرپرست بھی تھے“

”واہ۔“ جرنلسٹ دوست نے توصیفاً سربلایا۔

”بیر ایڈمرل لارڈ فرانسس گارڈز کی پوتی، کیتھرین جارجینا انکی کر سچین بیوی تھیں۔“
 ”ایام غدر میں سلیمان شکوہ گارڈز فٹا نے روپیے پیسے اور ہتھیاروں سے باغیوں کی مدد۔ جب پسیہ ختم ہو گیا۔ لندن اور کلکتے کی جائیداد بیچ ڈالی۔ انگریزوں سے جان بچانے کے لیے بگڑھ اور درگاہ مارہرہ شریف میں چھپے رہے۔ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی کے وجود ریزوں سے میل جول ترک کر دیا۔ آخر دم تک ان سے ملاقات نہیں کی۔ ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔ انکے بیٹے فلیکس گارڈز فلک بیرے والد تھے“۔ سلیمان شکوہ صاحب خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا: ”کاسنگ میں منظور النساء بیگم کا امام باڑہ کرنل ولیم گارڈز بنوایا تھا۔ وہ ایک بار محرم کے لیے لکھنؤ گئیں وزیراعظم منظم الدولہ نے حسن باغ ٹھہرایا دیا انہوں نے جس دھوم کی اعزاز داری کی وہ لوگوں کو برسوں یاد رہی۔ اس بہو کے سنگ سرخ کے حمام بارہ دری مقبرے اب کھنڈر ہو چکے۔

”میرے دادا مناصحاب کی بہت ساری بیگمات میں ایک بے انتہا حسین ایرانی اور اہل خانم انکی مجلس راکی مختار کل تھیں۔ میرے بچپن تک زندہ رہیں ایام محرم ہم بچوں کو فقیر بناتی تھیں۔ اعزاز داری انہوں نے جاری رکھی۔ بیرہ گارڈز کو بیٹی یا تھا۔ آئنٹ سیرہ پکی مشنری تھیں لیکن امام باڑے کی دیکھ رکھ بڑے خیال سے تھیں۔

”دادی راحیل خانم کے انتقال کے بعد شاید ۱۹۳۷ء میں وہ سونے چاندی کے صریحیں جھاڑناؤس شمعدان وغیرہ سب امام باڑہ شہید ثالث اگر بھجوا دیے

گئے۔۔ لے جانے سے قبل باقاعدہ الوداعی مجلس ہوئی۔ ایک سو پچیس سال تلک یہ عالیشان امام باڑہ اور اسکا نوبت خانہ آباد رہا تھا۔

سامنے بیٹھے گاؤں کی آواز کس فاصلے سے آرہی ہے۔ میں نور من ڈریک سوہ ہوں۔ وہ کیسے انوکھے، روادار عیسائی اور مشنری تھے جنکے ہاں سو اسو سال تک محکا نثار ہجا، یہ وسیع القبلی اور رچاؤ کس تمدن کی دین تھی؟ شاہان اودھ اور مغلوں کی۔

”کرنل ولیم گارڈنر کے خزانے کی ناکام کھوج میں والد مرحوم نے ہمارے اس بڑے امام باڑے کا تہ خانہ کھدوا ڈالا تھا۔ اسی رات ایک سفید پوش بزرگ انکے خواب میں آئے اور بولے۔ ایللی مجھ نہ ستاؤ۔ صبح انہوں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ اس جگہ ایک مرمی مزار بنوایا۔ ہر جمعرات کو اس پر چادریں چڑھنے لگیں۔ ایک انجیر کا درخت دہا خود بخود اگ آیا۔

”پندرہ بیس سال قبل میں کاسنگ ہی میں رہتا تھا۔ کرنل ولیم کے شکریوں کی اولاد وہاں دیہات میں آباد ہے۔ ایک روز ان میں سے ایک شخص، لال خاں میواتی، گاؤ کے ایک ہندو بھگت یا سیانے کے ہمراہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ صاحب۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ملکہ بیگم کے مزار کے نزدیک فرش میں ایک کندہ گڑا ہوا۔ دینہ اسکے نیچے ملے گا۔

”میں اپنی والدہ کو بتلائے بغیر چپکے سے ان دونوں کے ساتھ اپنی پردادی اور پردا کے مقبرے پر پہنچا۔ مقفل دروازہ کھول کر اندر گیا۔ قمر چہر کا سر ہانہ کعبے کے رخ پر تھا اسکے قریب مرمی فرش میں واقعی ایک آہنی کندہ نظر آیا۔ ہم تینوں نے اسے پکڑ کر تختہ اٹھایا تو نیچے تہ خانہ۔ اسکے اندر سے گرم ہوا کا تیز بھبکا نکلا۔ بزرگوں سے اس بے ادب کے لیے خدا سے معافی مانگتا سیڑھیاں اتر اترسات فیٹ کی گہرائی میں خزانہ وغیرہ تو نہ

البتہ لالٹین کی روشنی قمرچہرہ ملکہ بیگم کی کھوپڑی اور ہڈیوں پر پڑی۔ ایک ٹانگ کی ہڈی بھر بھری راکھ سی ہو چکی تھی۔ لحد کے برابر دیوار میں ایک کھڑکی دکھلائی دی جو انکے شوہر جیمز کی قبر میں کھلتی تھی۔

”قمرچہرہ جواں سال مر میں تھیں۔ تب مجھے علم ہوا کہ انکے خاوند نے یہ مقبرہ مغلیہ طرز کا بنوایا تھا جس میں مصنوعی مزار اور اصل تہ خانے میں تعمیر کیے جاتے تھے۔ بیگم کی وفات کے کچھ عرصے بعد ۱۸۴۵ء میں انہوں نے بھی رحلت کی اور وصیت کے مطابق اپنی مسیحی اور بیوی کی اسلامی قبروں کی درمیانی دیوار میں ایک دریچہ رکھوا گئے۔“

”انکی ماں منظور النساء بیگم کی قبر کی طرح ملکہ بیگم کے مزار پر بھی ہر جمعرات کو قرآن خوانی ہوا کی۔

”لالٹین کی روشنی میں نواب قمرچہرہ کے استخوان پھر چمکے۔“

”وہ لکھنؤ دہلی اور آگرہ تین شہروں کی حسین ترین بیگم کہلاتی تھیں۔“

”ادھر آگرہ لال خاں میواتی کے کہنے پر میں نے غلہ خیرات کیا۔“

”قمرچہرہ جس قدر خوبصورت اور ذہین تھیں اتنی ہی شکی، بے رحم اور ظالم۔ ایک باندی نے انکو پلٹ کر جواب دیدیا تھا تو وہ چھڑی لیکر اسکی زبان کاٹنے کی تیاری میں مصروف تھیں جب عین وقت پر انکے شوہر نے آن کر انہیں روکا۔ دو خواصوں کو جیمز گارڈنر سے ہنستے بولتے پایا تو دونوں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا انکی لاشیں امام باڑے کے تہ خانے میں گر وادیں۔ جب میرے والد نے دھینے کی تلاش میں تہ خانہ کھلوا یا تو ڈوڈھا نچے برآمد ہوئے۔“

ماضی کے دھینے میں، نور و مانی شاعر نور من ڈریک قمرچہرہ کو آئیڈیلایز کر رہا تھا۔

مابعد التواریخ کی جستجو اور شناخت میں محو تھا کہ اچانک تاریخ کی مظہریت میرے سامنے آگئی۔ مقتول کینزوں کے پنجر۔ اب مجھے حال میں واپس آنا چاہیے۔

”انجم شکوہ کے داماد ایلن یکے کیوں رنگنے لگے تھے؟“ کچھ دیر بعد میں نے دریافت کیا۔
 ”۱۸۸۲ء میں تیسرے بیرن کا انتقال ہوا۔ انکے واحد نرسہ وارث تھے۔ کاسنگ کی
 جائیداد بیچ کر لندن پہنچے۔ اپنے موروثی خطاب کا دعوے کیا۔ حکومت کا جواب
 ملا آپکی ہندوستانی شاخ میں بے ضابطہ شادیاں بہت ہوئیں لہذا خطاب منسوخ۔ ڈریک
 صاحب۔ کیا وہ نسل پرست گورنمنٹ ایک ہاٹ کاسٹ شخص کو لارڈ بنا دیتی؟
 ”بے نیل و مرام اور قلاش واپس آئے۔ بازار میں یکے رنگنے لگے۔
 ”آخری لارڈ گارڈنر کی نواسی البتہ لیڈی اردن کہلائیں وائسرائے ہند کی بیوی۔“

”فریڈم ایٹ مڈنائٹ“ کافر بیچ یہودی مصنف لاپتیر مسکراتا ہوا سامنے سے گذرا۔
 ”اکثر آیا کرتا ہے۔“ جرنلٹ دوست نے کہا۔ ”اس کتاب کے لیے اس کے اسٹاف نے
 اتناٹنوں میٹرل جمع کر لیا تھا کہ اسی کی بنیاد پر نہر و جناح وغیرہ کے متعلق دو تین بیٹ بسلر اور
 لکھنے والا ہے۔“

”اچھا وہ موٹر ڈرائیور ایم۔ سلیمان شکوہ صاحب میرے سوال کا جواب دینے میں مصروف
 تھے۔“ نہیں۔ وہ گارڈنر نہیں تھا۔ کوئی انگریز تھا۔ ایک ہر جین عورت کے ساتھ
 رہتا تھا۔ لہذا انگریزوں نے اسے ٹاٹ باہر کر رکھا تھا۔ زیدی صاحب کے ٹرانسفر
 بعد ادریس لوئیس لائیڈ انکی جگہ آئے۔ وہ اسکا شو فر نہیں رہا۔“

ادریس لوئیس لائیڈ۔ فوراً میرے تصور میں مئی کے الیم کی وہ تصویر آگئی۔ لہنگا چولی پہنے
 ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ فوجی دلخوش بھلا۔ دلکشا گارڈن ۱۹۴۲ء۔
 ”ادریس لوئیس لائیڈ۔“ میں نے دہرایا۔

”جی ہاں۔ غالباً یہودی انگریز تھا۔ لارڈ ریڈنگ کی طرح۔ اس زمانے میں یہودی اپنی
 یہودیت کو چھپاتے تھے۔ اپنے ادیبین کو مستقل پوشیدہ رکھنا نہایت مہر آزاں ہوتا ہوگا۔“
 ”کیا آپ لوگوں کو کبھی اس بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟“ میں نے یکلخت ذرا ترشی سے
 پوچھا۔ ”تنقہ کا بحران“ ایک جدید اصطلاح ہے۔

”بالکل کرنا پڑا۔ ان سب کو زبردست کومپلکس تھا۔ وہ دراصل کون ہیں۔ انکی مونگر کہاں باہر مٹا صاحب نے اس سوال کو حل کر لیا تھا“

دن ڈھل رہا تھا۔ پھانک پر پہنچ کر دونوں گارڈز کو خدا حافظ کہا۔ چند لمحوں تک میں برائین سیلمان شکوہ گارڈز کو راستہ پار کرتے دیکھا کیا۔ ۱۹۸۲ء کی دہائی میں شہزادہ سیلمان شکوہ اور چہرہ بگیم کے ایک غیر معروف نام لیا۔ راجدھانی کی بھیڑ میں کھوجانے والا ایک چہرہ — میں اڈیٹر دوست کی کار کی طرف بڑھا۔ جم خانہ کے پرسکون باغ میں ایک نور بے نیازی سے گردن اٹھائے، خراماں خراماں، سامنے سے گذر گیا۔

لکھنؤ۔ ممی کی کوٹھی دیکھنے کو نہ ملی۔ اسکی جگہ پری محل کھڑا ہے۔
پانیر اخبار میں یہ اطلاع چھپ گئی ہے کہ ہونہار نوجوان انگلش پوسٹ مسٹر فورسٹن
ریک ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد چند روز کیلئے لکھنؤ آئے ہوتے ہیں۔ شاید
وہ لوگ یہ خبر پڑھ چکے تھے۔ جب میں نے فون کیا۔ ایک خاتون نے بات کی ان کا
SING-SONG انڈین لہجہ دلچسپ لگا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ وہی نامور انگریز شاعر فون
کر رہا ہے وہ بہت اکسائیمڈ معلوم ہوئیں۔ اور بن بن کر انگریزی بولنے لگیں۔

— محض اتنا کہا کہ میں ایک موڈرن ہندوستانی کنبے سے ملنا چاہتا ہوں، یہ حقیقت
لیبرٹن کونسل والوں سے بھی اپنی اس فوٹو، ش کا اظہار کیا تھا۔ اب اس کنبے سے ظاہر
یہ نہ کہنا چاہتا تھا کہ سیتیش برس قبل جولال بی بی یہاں رہتی تھی اس کا فوراً نظر ہوں۔

جس وقت میں وہاں وارد ہوا اسی لمحے وہ گھر پہنچی تھی۔

وہ باقی کے ہودج سے نہیں اتری۔ ایک اسپورٹس کار سے چھلانگ لگائی میں اسکی

شکل دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ بیاختہ اسکے پیروں پر نگاہ کی۔ اس نے چاندی کی کھڑاویں نہیں پہنی تھیں۔ بلکہ نہایت بھدے بوٹ بگھسی ہوئی جیننٹر۔ میک اپ سے عاری چہرہ ”ہائے“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بیفکری سے کہا۔

اسکا نام پرتی بیگم ہے اور وہ پرتی محل میں رہتی ہے اور وہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیا آیا مگر چرابیسی ہی رہی ہوں گی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے لئے اتنے زبردست لہجے کا انتظام کرینگے مینہ بار خاتون ایک اردو رائیٹر ہیں وہ فضول سے رومانی ناول لکھتی ہیں جو بے حد بکتے ہیں۔ انکا بھائی اونچے کاروباری ہیں۔ لہجے بالکل انگلش تھا (حالانکہ میں ہندوستانی مسلم دست خوان خواہشمند تھا) جو اعلیٰ درجے کے خاندانوں نے تیار کیا تھا۔ میزبانوں نے شاید مجھ پر میلکم مگر جے کے اس مقولے کی صحت ثابت کرنی چاہی تھی کہ پکا انگریز برآدن صاحبوں کے روپ میں اب صرف ہندوستان میں موجود ہے۔ مہمانوں میں چند اعلیٰ سویلین فوجی شامل تھے۔ ملک پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ۔ چھاؤنی کے چند اعلیٰ فوجی افسر سینڈھرسٹ ٹائپ۔ ناولسٹ خاتون کی بھتیجی پرتی بیگم ڈوڈشاک اسکول مسوری۔ اولڈ میڈ پھوپھیاں نیوسٹر ناولسٹ چنٹ اور چھوٹی اپنی عمر کے لحاظ سے چلی۔ جو اپنے فیملی ڈاکٹر منصور کا شعری کے گر منڈلا رہی تھیں۔ یہ سمجھا قبول صورت شخص اس صورت حال سے گھبرا رہا تھا۔ مگر اس خوش شکل خاتون سے فلرٹ کرنے میں بھی مصروف تھا۔

میں نے پرتی بیگم کو انگریزوں کے قبرستان چلنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز سہم لوگ مال روڈ کی طرف اس وسیع پکھر سک شہر خوشاں۔ پہونچے۔ گرینڈ فادر ڈریک کی قبر آسانی سے مل گئی۔

نام نظر آ رہا تھا۔ باقی عبارت پر گرجی ہوئی تھی۔ میرے اندر ایک شریہ بھجنا جاگا۔

پرتی بیگم نے اچک کر پڑھنا شروع کیا۔ ”جارج فورمن ڈریک“

”سرز و جرڈریک کی لائن“ میں نے ذرا بے نیازی سے کہا۔
 ”گوئی! سرز و جرڈریک — یو۔ پی کے گورنر تھے؟“
 ”نہیں بھئی بہت پہلے۔ سراج الدولہ کے عہد میں — گورنر فورٹ ولیم کالج۔“
 ”جیپرز! تیری بیگم نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔ مرعوب و محور۔“
 ”مگر میں نسب پرستی کا سخت مخالف ہوں۔ اسکا ذکر کبھی نہیں کرتا۔“ میں نے اپنے
 باپ والی چارمنگ مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلتی محسوس کی — ”معاذ پرستش
 ہوا کہ میں بھی اپنے نانا اور ماں باپ سے مختلف نہیں۔ فرق محض اس چیز کا ہے کہ مجھے
 زندگی میں ان سے بہتر مواقع
 لیکن میرے والد تو چاندی کا چھپنہ میں لیے پیدا ہوئے تھے۔ سارے مواقع انھیں
 میسر تھے پھر بھی انہوں نے غلط راہیں اختیار کیں کیونکہ انتخاب انکا اپنا تھا۔

ہندوستانی ”سین“ کے بارے میں دو دیا دھرنی پال اور وید مہتہ کی طرح بھی لکھا
 جاسکتا ہے، ”آندرے مارلو کی طرح بھی۔ میں محض اپنی والدہ کی کمیونٹی کے متعلق حقائق قلمبند
 کروں گا۔ والد کے کثیر الجہت مسلم ورثے بھیکانہ ہوں۔ انسان کتنا کچھ جان سکتا ہے۔ شاید
 گیتا میں سری کرشن نے کہا ہے سمنڈ کے جس حصے میں خود کو موجود پاتے ہو اسی سے واقف
 ہو جاؤ تو غنیمت ہے۔

ہمارے مغرب میں باغی نوجوانوں کی اصطلاحات بسرعت بدلتی رہتی ہیں۔
 آؤٹ سائیڈرز کی جگہ ڈرویپ آؤٹ آگئے۔ سین اور ٹرپ کا زور رہا۔ پہلے زمانے میں
 ایک ہارٹ وغیرہ مشک بزرگ اپنی روحانیت کے بل پر افلاک کی خبر لاتے تھے۔
 اہل کیلی فورینا نے ذات کا سفر ایل ایس ڈی کی لہروں پر طے کیا۔ جہاں مغرب
 ان دنوں ہندو اور بدھٹ ٹرپ بھی نہایت مقبول ہے، ادھر مڈل ایسٹ، پاکستان اور
 (یہاں بھی)، اسلامی بنیاد پرست ٹرپ بہت رش لے رہا ہے۔ میں ان دنوں چونکہ

یوریشین ٹرپ پہ ہوں ایک روز پری بگیم کے ساتھ لکھنؤ امیر الدولہ پبلک لائبریری میں
براؤزنگ کرتے ہوئے کلکتہ کا پرنگالی نثر ادبہنری ڈیروزیو ڈسکور کیا۔ جو انرگ شاعر،
جزنلسٹ۔ وطن پرست۔ رومینٹک۔ سر جینی نائیڈوکا پیشرو۔ جو وقت اسکے انگریزی داں
نیٹوبنگالی معاصرین مغرب کی بلخار سے متاثر اور مرعوب تھے وہ ملک کی غلامی پر
آنسو بہاتا تھا۔ ”سنو پری! وہ دلدار نامی ایک کشمیری ناچ گرل سے کیا کہہ رہا ہے۔“

پری بگیم ناچ گرل نہیں۔ ڈسکو کی ماہر ہے۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

THE HEART ETERNALLY IS BLEST WHERE HOPE

ETERNAL SPRINGS THEN HUSH THY SORROWS ALL TO REST

WE'LL TREAD THE COURT OF KINGS

LIKE BIRDS FROM LAND TO LAND WE'LL RANGE

AND WITH OUR SWEET SITAR

۱۹۸۲ء کی غیر جذباتی پری بگیم ہنس پڑی۔ ”یہ حضرت غیب دان بھی تھے!“
”ہاں طیارے پہ میرے سہسرا ستاروں خواں مع اپنے تار حسب مہول کسی مغربی
دورے سے ہندوستان واپس آرہے تھے۔“ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

OUR HEARTS THE SAME THOUGH THE WORLD MAY CHANGE

WE'LL LIVE AND LOVE, DILDAR.

میں نے کتاب بند کر دی۔ پری بگیم نے متفکر ہو کر گھڑی دیکھی۔ ”اب گھر جاؤں۔“
”اگر آج رات تم میرے ساتھ گھومنے چلی گئیں تو کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ بھونچکی سی نظر آئی۔“ رات کو گھومنے؟ یعنی —؟“
”یہی۔ میرے جائے قیام پر چلکر ڈنر۔ اسکے بعد — کافی وغیرہ۔“
”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تمہارے گھر والے بہت خفا ہونگے؟“

”محض خفا۔۔۔؟“

دریچوں سے آتی ڈھلتی دھوپ میں نصیر الدین حیدر کا اسٹیچو دمک رہا تھا، اوجسہ چہرہ
”تم نے کوئی ڈرگ چکھی ہے؟“

”میں نے تو نہیں مگر کالجوں میں اسکا فیشن چل پڑا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ سنا ہے
”نہیں۔۔۔ میں نے جواب دیا“ آؤ تمہیں گھر پہنچا دوں۔“

مہاراجہ محمود آباد کے قد آدم روغنی پور ٹریٹ کے نیچے سے گذرتے ہم باہر آتے
قیصر باغ کی زرد خستہ عمارتیں پیلی دھوپ میں اور زیادہ اداس نظر آرہی تھیں۔ لکھنؤ روکو کو۔
مغلیہ طرز تعمیر کے منزل کا نمایندہ۔ زوال پذیر شفق آلود تمدن ہمیشہ بڑا نظر فریب ہوتا ہے
نصیر الدین حیدر جنرل گارڈن اور تھر چہر کا لکھنؤ۔ ۱۸۲۷ میں دُور کلکتے میں بیٹھا ہنری ڈیروزیو
اسی زوال پر آنسو بہا رہا تھا۔

”ہمارے ہاں بھی تو ایفونی ہوا کرتے تھے۔ پری سگیم نے کہا۔ وہ ابھی تک منشیات
کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کارا سٹارٹ کرتے ہوئے اچانک بولی۔“ پتہ ہے میری شادی ہونے
والی ہے۔“

”اوہو۔ مبارک ہو۔“

”ڈیم۔۔۔ مبارک۔۔۔! ہل۔۔۔!“

”کیوں؟“

”وہ لوگ ڈیڈ کی طرح کاروباری لوگ ہیں کروڑ پتی۔ دارُھی والے۔ حاجی۔ لڑکا سناور
میں پڑھ چکا ہے مگر وہ بھی حاجی۔ بور۔ مجھے ذرا پسند نہیں۔“
”تو انکار کر دو۔“

”وہ لوگ ڈیڈ لے بڑس پارٹنر ہیں۔“

لال باغ پہنچ کر ہم لوگ ایک پرانی عمارت کے سامنے سے گزرے۔ ”اس جہلی میں۔“
 پری بیگم نے کہا ”سیکیمات اودھ تہتی تھیں۔ وہی۔۔۔ وارن ہیننگز والا قصبہ۔“ اوہ۔۔۔
 میں نے اشتیاق سے سر باہر نکالا۔ ایک گریز کا لہج کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ کیلے کے پتوں سے سجے
 پھانک پر ایک مین، چھر پری سی خاتون چند لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اندر دو رویہ لڑکیاں
 سڑک پر پولیس کا بندوبست۔

”آداب باجی بیگم۔“ پری نے کار کی رفتار ڈھیمی کر کے انھیں سلام کیا۔ ”یہ پرنسپل
 ہیں۔ آج یہاں یونین منسٹراف ایجوکیشن آنے والی ہیں کوئی کلچرل پروگرام ہے۔“
 ”کلچرل پروگرام“ جہاں سوئم کی مخصوص و مرغوب اصطلاح ہے۔ میں مسکرایا۔ ہم لوگ
 آگے بڑھ کر پری محل پہنچے۔

اس فیئر می کا سل کے اندر ٹی وی لاؤنج میں دونوں پھوپھیاں ویڈیو کے سامنے
 اس طرح براجمان تھیں گویا جاگدگیاں اپنی جادو کی ڈیجی کے سامنے بیٹھی کھد کچھ پکا رہی ہوں۔
 انکا افغان ہاؤنڈ قبلائی بہادر مرمریں فرش پر ڈٹا گویا انکی سازش میں شامل تھا۔ میں
 نے پلکیں جھپکیں۔

خزانہ قسم کی بڑی پھوپھی نے مجھے سیکھی نگاہ سے دیکھا۔ مجھے کیلنٹ عجیب سے خوف نے
 آدبوجا۔ جنرل اسکرمز کی راجپوت ماں نے اس غم میں خود کشی کر لی تھی کہ اسکا فرنگی شوہر اپنی لڑکیوں
 کو اسکول بھیج رہا تھا۔ وہ تو دو سو سال قبل کی بات تھی حال ہی میں انگلستان میں رہنے
 والے ایک بسکھ نے اپنی لڑکی کو اسوجہ سے قتل کر دیا کہ وہ انگریز لڑکوں کے ساتھ ڈیننگ
 کرنے لگی تھی۔ یہ لوگ بہت موڈرن بنتے ہیں مگر یہ بھی مجھے اور پری بیگم دونوں کو مار ڈالیں گے
 کیلنٹ مجھے منہسی آگئی۔ انگلستان اور انڈیا کے کتب خانوں میں کمپنی کے عہد کی
 کتابیں، اور کرنل میڈوز ٹیلر اور کرنل سلیمین کی تصانیف پڑھتے پڑھتے شاید میرا دماغ ضرورت
 سے زیادہ فعال ہو گیا ہے۔ چند ماہ میں میرا یہ حال ہوا۔ یورپ تو مشرق کے متعلق چار سو سال
 سے طرح طرح کی خرافات پڑھ رہا ہے۔

محض خرافات؟

اور جو ابھی ایک شہزادی اور اس کے دوست کے سر قلم کر دیے؟

بڑی پھوپھی نے نہایت اخلاق سے بدھ کی شام ڈنر کی دعوت دی — مغربیوں
دوستی یہاں اسٹیشن سہل ہے۔ محض گوری چڑی کیوجہ سے میری اس قدر آوجھگٹ!

پھر اسٹرپوٹائیپ اور ایج — کیا معلوم یہ پھوپھیاں نہایت نارمل خواتین ہوں۔
ہر محل انکے بھائیوں نے بالکل جائز کمائی سے تعمیر کیا ہو۔ ہر برنس مین بے ایمان نہیں
اس آئینہ خانے میں جہاں ہر چیز ترہی نظر آ رہی ہے، اپنے ذہن کو آئینے کی طرح صاف
ہوں — یہی تو کیتھولک مسٹک بھی کہتے ہیں — میں نے دریچے سے باہر نظر ڈالی — کچھ
صلے پر حضرت عیسیٰ کے نئے فلک بوس رومن کیتھولک کیتھدرل کی سرخ صلیب سیاہ آسمان
ن لعل بدشتاں کے مانند درخشاں تھی۔

کل اتوار ہے۔ صبح سویرے ماتس میں جانا ہے۔ ہوٹل واپس جا کر سونا چاہیے۔

نوجوان ذہن پرستوں کی ایک محفل۔ میزبان ایک امیر زادہ کہ ایک شوقیہ ڈرامہ گروپ
سرپرست ہے۔ یہ منڈلی سائیپانوں میں جمع ہو کر ڈراموں کی جگہ لکڑی کے ڈبے، ایکٹ میز
ٹیلج کرتی ہے۔ ہاؤکیوٹ! پری بیگم نے ذرا کینے پن سے کہا۔ اسکا ”آؤٹ ڈور“ حلقہ مختلف ہے۔
مجھے اس لڑکے کی کوٹھی پر اتار کر نہیں کھیلنے چلی گئی۔

DEN میں ہرے ڈرنکس سرور کر رہے تھے۔ آرٹ قلم کی لڑکیاں لڑکے چٹائیوں پر
ہے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کھادی سلک سے مجلد ”جدید ہندوستانی حیات“
سے لبریز انڈو اینگلیکن نظمیں کے مجموعے مغربی مصنفین کی کتابیں۔ دیواروں پر مغربی پوسٹر۔
نک موٹیف کی ایک عریض موڈرن پینٹنگ۔

پر جوش گفتگو۔

”کی گائے یار۔ بس مڈنائٹس چلڈرن والا۔“
”میرے انکل وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ بانی کار گئے تھے۔“

”نون وائیلنٹ کنٹری! چیزس کرائیٹ۔!!“

”ٹرائی بس مسٹر ڈریک۔ میری اکیسویں سالگرہ پریڈی کا تحفہ۔“ میزبان کا چھوٹا بھائی
”ہرے سنی۔ فری براؤن اینڈ ٹوٹنی وون۔ ایو مسٹر ڈریک۔ فری وائیٹ اینڈ
”ٹوٹنیٹ فائیو۔!“

“WASP”

”وہ کیا چیز ہے میٹا۔؟“ ایک اور نوجوان کا سوال۔

”ویسٹرن اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ۔ کائنات کی سب سے زیادہ برنجو غلط مخلوق۔“

بارہ سو سال سے دنیا کو جیب میں ڈالے گھوم رہے ہیں۔“

”ویسٹرن اینگلو سیکسن کیتھولک۔“ میں نے اپنے متعلق تصحیح کی۔

”او۔ کے۔ او۔ کے۔ چیزس کرائسٹ۔ چار سو سال سے۔“

”میرے انکل وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ آل مائی چیزس۔“

ایسے میں وہ اینگلو انڈین کرسچین بھائی عادتاً اللہ تعالیٰ ماشا اللہ انشا اللہ کہہ رہے تھے

کندھے سے جھولا لٹکائے ایک اور نوجوان کا داخلہ۔ ایک طویل کاغذ پیش کیا۔ سب نے
باری باری اس پر دستخط کیے۔ واپس جانے لگا مجھے دیکھ کر ٹھٹھا کا۔

”ایچ۔ ایم۔ رائٹس کے خلاف ہمارا احتجاج۔ یہ خط۔ انگلش پریس میں چھپے گا۔“
”اس سے کیا ہوگا۔؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”میں تو آمرزمزس کے خلاف بھی کسی خط
چھپوا چکا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی محسوس کی۔

”موجودہ رائیس کے خلاف شہر کے آٹھ سینئر انٹلیجنٹس کے دستخطوں والا خط توکل ہی انگلش سپریمز میں آگیا ہے۔“
 ”ہاؤنائس“ میری سمجھ میں نہ آیا اور کیا ہوں۔

”کلچر“ کی طرح ”انٹلیجنٹس“ اس خط ارض کا ایک مرغوب لفظ ہے۔ آل انڈیا انٹلیجنٹس کانفرنس بنگ مسلم انٹلیجنٹس کانگریس۔ انٹلیجنٹس فورم۔
 میں نے پوچھا۔ ”یہ شہر یہاں سے کتنی دور ہے۔ جہاں یہ۔ ایچ۔ ایم۔“
 ”بے حساب مار کاٹ۔“

”میں قنچی سے کاٹتا نہیں۔ شونی دھاگے سے جوڑتا ہوں۔“

”ڈیم گڈیار۔ یکس نے کہا ہے؟“

”ایک شونی سینٹ۔ میڈیول ڈیلی“

”ایلی منٹری ہیومنزم یار۔ ایک کونے سے آواز آئی۔“

”چلو اسکا پوسٹر بناتے ہیں۔ ڈیم گڈ سلوگن“

”ایلی منٹری سلوگن یار۔ سارے مذہب ایک رامتہ دکھاتے ہیں۔ سب انسان

ایک ہیں۔ بوگس۔ مٹر ڈریک۔ آپ بتائیے کیا موسک ٹمپل چرچ ایک

دوسرے سے جڑ سکتے ہیں؟ ناممکن۔ ایسٹون اسپنڈرنے کہا ہے۔ کہ یہ حقیقت

کہ ہر آدمی کی ایک آنکھ۔ دونائیں۔ سوری۔ دو آنکھیں ایک ناک دو

کان ہیں اسکا یہ مطلب نہیں کہ میں اور چا پانی ایک ہیں۔؟ آخری تجزیے میں

ڈریک صاحب۔۔۔ سب الگ الگ ہیں۔ رائیٹ۔؟

”اس آخری تجزیے کے بعد تم سالے ہم سب کو آخری نیوکلیئر دھماکے تک بہت

جلد پہنچا دو گے۔ شاہانش۔“

”شو۔ شو۔ شو۔“

لڑکیوں نے نعرہ لگایا

سب نے ملکر اس چھوکرے کو دوڑا دیا۔
نائیس کڈز۔ انکے دل صحیح جگہ پر ہیں۔

پری محل میں ڈنر پر میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔

میز پر بین الاقوامی سیاست کا ذکر چھڑا۔ صاحب خانہ بار بار مجھے مخاطب کرتے
آپ انگریز لوگ — آپ کی انگلش قوم —
جی چاہا انکو بتلا دوں کہ میرے والد اودھ کے ایک سابق تعلقدار ہیں۔ مگر
اس میں دو قباحتیں ہیں: —

(الف) والد محترم کا نام کسی روز بھی بسلسلہ انٹرپول ہندوستان کے انگلش پریس
میں چھپ سکتا ہے۔

(ب) ہندوستانی باپ کی اولاد کی حیثیت سے انکے لئے میری شخصیت کا وہ بحر فوراً
زائل ہو جائیگا جو ایک ”انگلش پوٹیٹ“ میں مضمر ہے۔

بال بال بچا —

اس عجیب و غریب ڈرائنگ روم میں پری کے والد اور چچا اس آبشار کے نزدیک
بیٹھے ایک اعلیٰ سرکاری افسر سے باتیں کر رہے تھے کمرے کے دوسرے حصے میں ایک
پنجابی انڈسٹریسٹ نے تاش کے کھیل دکھانے شروع کئے۔ میں اس گروہ میں موجود تھا
کارڈ شارننگ کا تذکرہ نکلاتین چار مہمانوں نے کارڈ شارپرز سے اپنے اپنے این کاؤ
کے قصے سنائے۔ پرسی بیگم کے فیملی ڈاکٹر منصور کا شعری نے کہا ”صاحب جب میں
بوسٹن میں کام کرتا تھا ایک حیرت انگیز پاکستانی کارڈ شارپر سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک
کر وڈیٹی ”بوسٹن برہمن“ بیوہ کے ہاں مقیم تھے۔ معلوم ہوا مامہر فن۔ —“

میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کا شغریٰ نے اپنا بیان جاری رکھا: ”وہ حضرت دراصل اسی شہر لکھنؤ کے باشندے تھے۔ کسی تعلقدار کے بیٹے۔ صاحبزادہ صاحب آف دھان پور۔ خوب چیز تھے۔ سجد دلچسپ فن گفتگو کے ماہر۔“

پری خانم کی چھوٹی بھوپھی شہوار ڈاکٹر کے نزدیک کشن چیر پر پوز بنائے بیٹھی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے ڈاکٹر اچانک بار بار اچھٹی سی نظر ڈال کر مجھے دیکھ رہا ہے۔ گویا راجہ دشا علی خان آف دھان پور کی ایک جھلک میرے چہرے میں اُسے نظر آگئی ہو۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں کل ہی دلی جاؤں۔ وہاں سے لندن۔ پری بیگم نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد انگلستان کا ایک چکر لگائے گی۔

لیکن جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہوتی وہ یہ کہ جب ڈاکٹر کا شغریٰ مس شہوار خانم کو میرے والد کا قصہ سنا رہے تھے کہ وہ آزادی کے کچھ عرصے بعد پاکستان چلے گئے تھے تب سے مغربی ممالک میں ٹھکی وغیرہ کرتے پھر رہے ہیں۔ مافیا سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور یہ کہ شاید مافیا والوں ہی نے انکو قید حیات سے آزاد کر دیا ہے۔ یہ آخری جملہ سن کر تو میں بے اختیار کہنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہیں مگر شہوار خانم نے لاپرواہی سے کہا ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ ہمارے کزن تھے، ہمیشہ کے GOOD-FOR-NOTHING۔“

مجھے پری خانم نے یہ تو بتلایا تھا کہ یہ لوگ بھی پہلے جاگیردار تھے۔ مگر یہ عجیب و غریب اتفاق ہوا۔ گویا یہ سب میرے رشتے دار ہیں۔ اب پہلی فلائیٹ سے برطانیہ واپس او قمر چہر! افسوس کہ میں جیمز گارڈن جیسا لانا نہیں۔ باقی باقی پری بیگم!

(۲۶)

گھر گھوڑا نچاس مول

کوٹھی ایک بنگالی نے بنوائی لہذا الاموالہ اسمیں ایک تالاب بھی موجود تھا۔ حسین بختر نے اس کے کنارے بطخیں پال رکھی تھیں۔ جب وہ انکو دانہ ڈالتے وہ موٹی موٹی بطخیں قین قین کرتی ایک ساتھ ان کی سمت لپکتیں۔ اسوقت وہ عندلیب بانو کو کم عقاب عورتیں معلوم ہوتیں۔ بیوقوف خواتین اور بطخوں میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے بطخ کو SILLY GOOSE کہتے ہیں۔ میں بھی ایک سلی گوز ہوں۔

پھر وہ اسٹوڈیو کے دریچے میں کھڑے کھڑے آسمان کا جائزہ لیتیں ان گندہ پرندے — جو سائبریا سے چلتے ہیں اور راہ میں جبلی طور پر اپنے اسٹیشنوں پہ رکتے منزل پر پہنچ جاتے ہیں یا آندھی چلتی ہے تو راستہ بھول کر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔ عینک لگا کر وہ سفید سائبرین سارس اور قاز اور بگلے اور سنس میں تفریق کر۔ کی کوشش کرتیں مگر اڑتے پرندوں کی انہیں پہچان نہ تھی۔

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ منصور بھی سے واپس آکر صرف ایک بار ملنے آیا ہے وہ مآشا ہیلتھ کلب قائم کرنے اور MADISON AVENUE نیویارک کے اصول پر اس کی سیسٹی کروانے میں مصروف ہے مگر فون پر بھی خیریت نہیں پوچھ سکتا

اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال، دانشور بھی اپنے قدیم، لاشعوری تعصبات حصار کو نہیں توڑ پاتے کسی نے کہا ہے — ہندوستان کے ہر بچن ہی ہندو دنیا واحد اچھوت فرقہ نہیں۔ یہودی۔ عرب۔ شیعہ۔ سنی۔ ہندو۔ مسلمان۔ بہائی۔ نیگرو۔ طوائفیں — سب تعصبات کا شکار ہیں۔ تعصبات ذہن میں جا گریں،

ہیں پھر رفتہ رفتہ سائیکی میں سرایت کرتے ہیں۔ نسلوں کی جبلت میں شامل ہو جاتے ہیں۔
پزندوں کی طرح ہم سب اپنی اپنی جبلت کے پابند ہیں۔ جس کے آگے منطق ہتھیار
ڈال دیتی ہے۔

چنانچہ راستباز می اور ایماندار می بھی غلط ہے۔ نقیہ صحیح۔ انسان جبلی طور پر
جھوٹ بول کر اپنا دفاع کرتا ہے۔ اپنے آپ کو خطرے سے بچاتا ہے۔ او۔ کے۔
مگر میں نہیں مان سکتی کہ منصور جیسا سمجھدار جہان دیدہ آدمی عنبر جیسی نیک لڑکی سے
محض اسلئے بد دل ہو جائے گا کہ اسکی ماں اور نانی کو عرصہ دراز قبل بحالت مجبوری۔
لیکن انسانی دماغ ایک قطعی ناقابل اعتبار شے ہے۔ انسان کسی بھی وجہ سے
آپ سے آپ بالکل بدل جاتا ہے۔

او۔ کے۔ اور کیا یہ بہتر نہ ہو کہ میں نے عنبر کی اصلیت آشکار کی تو اس شخص کی
ذہنیت واضح ہو گئی ؟

عندلیب بانو درپچہ بند کر کے شراب کی الماری کھولتیں۔ فرانسیسی اور اسکاچ
بوتلوں کے لیبلوں پر پچھپے سنہ غور سے پڑھتیں۔ — VINTAGE YEAR — فلاں —
سنہ فلاں۔ جو شراب جتنی پرانی ہوتی ہی بڑھیا اور نادر سمجھی جاتی ہے۔ VINTAGE
میں بھی ہوں مگر ناکارہ۔ فضول۔ ABSURD — چپ رہی تو برسوں چپ رہی بولنے
پہ آئی تو متواتر بولتی چلی گئی۔ ستر برس جنگل میں گزار دو سرے جانوروں سے کچھ نہ سیکھا۔
نہ لومڑی سے چالاک نہ بھیر ٹنی سے فونخواری نہ ہتھنی سے کینہ رہی وہی سلی گوز۔

وہ مے ناب سے غم غلط کرنا شروع کرتیں۔ بھری دو پہروں کا طویل سناٹا۔
: میں اپنے کلنک میں جین بخش، رام سوپ اور رم کلیا شاگردیشے میں محو خواب۔
ہتادرم گشت کے لئے باہر چلا جاتا۔ وہ اپنے تصویر خانے میں بیٹھی پرانی تصویریں
دیکھا کرتیں۔ وہ پورٹریٹ جو بنگالی مرجنٹ پرنس کی لگان باڑی میں بنایا گیا تھا۔ وہ تصویر
جو ولایتی چکر میں ہوا خوری کرتے ہوئے امبا پرشاد نے ایک فوٹو گرافر سے اتروائی

SNAPSHOT ۵۵ حوٹا پر جانے سے قبل وکٹوریہ میموریل کے باغ میں
پائبلٹ افسر اینگلس مک نیل نے کھینچا۔

پرندوں کو اپنا راستہ معلوم ہے۔ دنیا کی بیشتر مخلوق اپنی اپنی منزل پر پہنچ جاتی
ہے۔ الامیرے —

شہر کی الماری کے نیچے خانے میں رکھے پرانے ریکارڈ لٹتی پلٹتی۔ اس امید
پر کہ شاید نواب بیگم کا کوئی پرانا "توا" ہاتھ آجائے۔ انکو اچھی طرح معلوم تھا کہ نواب بیگم
جے پور سے کلکتے پہنچتے ہی اپنے سارے ریکارڈ چکنا چور کر چکی تھیں مگر ہمیشہ عندلیب
بانو کو یہ آس رہتی کہ شاید ایک آدھ فلو مینا نے بچا لیا ہو اور وہ اس انبار میں مل
جائے۔ نواب بانی کے ریکارڈ کے بجائے ایک غزل ہاتھ لگتی جسے ماما بار بار بجا کرتی
تھیں — کیا جہاں برباد گو وہ سرسبز د مبار تھا — فراموش شدہ ماسٹر محمد اسلم
کی گانی ہوئی۔ وہ ٹھٹھک کر سوچنے لگتیں — ماما کی حسین محرومی انگلیوں نے یہ ریکارڈ
چھوئے تھے — وہ انگلیاں مدین گزریں خاک ہو گئیں۔ وہ اپنی انگلیوں کو غور سے
دیکھتیں۔ بہت جلد یہ انگلیاں بھی کیڑوں کی غذا بنیں گی۔ نہیں صاحب — میں وصیت
کر جاؤں گی میری لاش کو الیکٹرک کریم ٹوریم کے سپرد کیا جائے۔ دہشت طاری ہوئی
پھر ریکارڈوں کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔ مس دلاری۔ زہرہ بانی۔ عنایت بانی ڈھیر ڈوالی
انور بانی اف اگرہ۔ وہ مسکراتیں۔ یہ سب اپنی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ انکے سامنے
کسی عزت کا ڈھونگ نہیں رچانا پڑتا تھا۔ بہو۔ مجید۔ بندو۔

ڈرامہ لیلے انجنوں کے قسط وار توے نکلے چلے آتے۔ اور مزید غزلیں۔ کہ وہ
شوخی جس گھر میں مہمان ہوگا — ماسٹر اعجاز علی۔ اس ڈھب سے جھلک اپنی اس
شوخی نے دکھلائی — پیار و قوال۔ غم جدا، رنج جدا، درد جدا دیتے ہیں —
مس زہرہ جان — میرے درد جگر کی خبر ہی نہیں — مس گوہر جان اف کلکتہ —
ایک بار انھوں نے گوہر جان کا ریکارڈ ریڈیو گرام پر لگایا۔ ایک پھنسی گھسی ہوئی
آواز نکلی — میرے درد جگر کی خبر ہی نہیں — میرے — گویا ایک بھوتنی

بھوت کال کے اندھے کنویں میں بیٹھی خنخار رہی ہو — گوہر کی آواز ریکارڈنگی تیرتی
ابھرتی سیاہ ہروں میں بھی معدوم ہو چکی۔

لیکن کسی چیز کے باقی رہنے کی ضرورت کیا ہے؟ ریکارڈ الماری میں واپس
رکھ کر وہ دوبارہ بیگ پائپر کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔

شام کو عنبر کلنک سے گھر آتی تو ماں سے بات نہیں کرتی تھی۔ بات کر دو کاٹنے
کو دوڑتی — نرسنگ ہوم میں کام کی زیادتی کی وجہ سے شاید اسکا نروس بریک ڈاؤن
ہوتا جا رہا تھا۔

چند روز قبل وہ تین چار بلیاں تھیلے میں رکھ کر کہیں سے لے آئی تھی۔ اور
اناؤنس کیا تھا۔ میں اب بلیاں پالوں گی۔ قاعدہ ہے OLD MAIDS بلیاں
پال لیتی ہیں۔

وہ بلیاں اب بطنوں کے پیچھے پڑ گئیں تھیں۔ تالاب کے کنارے دن بھر ہنگامہ
بپا رہتا۔ جس روز بہادر نواب بیگم کی تصویر اور دوسری قیمتی چیزیں چُر کر بھاگا اس
روز سے منس بیگ نے اسٹوڈیو میں محصور ہو کر دن دن بھر مینا شروع کر دیا۔ آنکھوں
کے نیچے حلقے پڑ گئے۔ ایک شام انھوں نے خود ہی PIZZA تیار کر کے منصور کو فون کیا۔
— اسکے ملازم نے اطلاع دی۔ بیگم صاحبہ وہ کوئی انگریز شاعر ولایت سے آیا
ہے۔ اسکا ڈنر ہے شہوار بیٹا کے گھر۔ صاحبہ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ پری محل۔

ایک اتوار کی صبح وہ برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں کہ موٹر سائیکل آکر
رکی۔ گوگلز اور خود اتار کر منصور بیڑھیاں چڑھا۔

”تمہارا نام لکھو میں فلائنگ ڈاکٹر پڑ جائے گا — یا فلیش گورڈن —“
عندلیب بانو نے مصنوعی شگفتگی سے کہا اور سنہری زنجیر میں آویزاں عینک اتاری۔
”مزاج عالی بخیر —“

”فاتین۔ تھینک یو۔“

”کیا پچھلے دنوں طبیعت ٹھیک نہیں رہی؟“ ڈاکٹر نے مسز بیگ کے چہرے سے بھانپ کر پوچھا۔

”ہاں۔ ایسے ہی ذرا۔۔۔ بقول شخصے حرج مرج تو لگا ہی رہتا ہے۔ ضیعفی خود ایک لاعلاج مرض ہے۔۔۔ بیٹا۔۔۔“ وہ اخلاقاً نہیں۔ ”مگر تم بہت دنوں میں راستہ بھولے۔ کیا پھر بھی چلے گئے تھے؟“

”جی نہیں۔ وہ۔۔۔ لکھنؤ میں ایک برطانوی شاعر آیا ہوا تھا۔ نگار خانم تقریباً روزانہ اسکے لیے کوئی نہ کوئی پروگرام کرتی رہیں۔ ڈنر۔ چاء۔ پکنک۔ وغیرہ۔ مصرتھیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ بمبئی تو میں ابکی بار شاید ایک ماہ کے لئے جا رہا ہوں۔“

”اوہو۔۔۔“

”جی بہت سے کام جمع ہو گئے ہیں۔۔۔ SAUNA کے لئے دوسرا الیمپ خریدنا ہے۔ ایک یوگا ایکسپریٹ تلاش کروں گا۔ شارڈا کا خیال ہے کہ ساتھ ہی ایک اعلیٰ درجے کا بیوٹی پارلر بھی کھول دیا جائے۔ جڑی بوٹیوں والا۔“

”اس لائن میں تم لوگ سیکم حین سے مقابلہ نہیں کر پاؤ گے۔“

”مقابلے کے بغیر جیے تو کیا جیے۔“

”تم زندگی کی دوڑ میں بہت آگے جاؤ گے پہلے میرا خیال تھا کہ خاصے سبکدوش سے انسان ہو۔ اچھا وہ برطانوی شاعر ابھی ہے یا چلا گیا؟ نوٹن ڈریک؟“

”جی۔ کل گیا۔“

”پائیر میں اسکا انٹرویو پڑھا تھا۔ اسکی ایک نظم بھی چھپی تھی۔ ایک ایمپائر کا گورستان۔ لکھنؤ کے انگریزی مقابر میں چند لمبے۔ بڑی اداس خیال انگریز نظم تھی۔ مگر بھئی۔ قبرستان تو ظاہر ہے اداس ہی کرتے ہیں۔ مسرور تو کر نہیں سکتے۔ اچھا تمہارے لیے کافی بنا لاؤں۔“

”آپ زحمت نہ کیجئے۔ بہادر کہاں ہے۔؟ ذرا سگریٹ لا دیتا۔“

”بہادر چوری کر کے بھاگ گیا۔“

”چوری —؟“

”ہاں۔ بھئی۔ ہمارے ہاں چوری ہو گئی۔“

”ارے۔ کب —؟“ عمر نے ذکر ہی نہیں کیا کلنک میں اس سے روز ملاقات

ہوتی ہے۔“

”اسے بتانا یاد نہیں رہا ہوگا۔“

”انٹرا بڑا واقعہ ہو گیا اور اسے بتانا یاد نہیں رہا! بہت نقصان تو نہیں ہوا —؟“

”بیٹا — وہ — یاد ہے اس شام جب تم نے ممکا وہ CAMEO دیکھ کر پوچھا

تھا کہ سید قیمتی ہوگا کہاں سے خریدا؟ کس کی تصویر ہے — وغیرہ۔ یاد ہے —؟“

”جی ہاں۔ قطعی۔“

”بہادر اس وقت کمرے میں آیا تھا۔ کافی کی ٹرے لے جانے۔ اس نے شاید غور

سے یہ بات سنی کہ یہ سید قیمتی تصویر ہے۔ بہت مہنگی خریدی ہوگی — بہر حال۔ اتنے

دونوں وہ شاید موقعے کی تلاش میں رہا — اس اتوار کی صبح جب ہم لوگ سو کر اٹھے تو گھر

میں صفایا۔ ڈرائینگ روم کے ڈیکوریشن PIECES — کھانے کمرے کا سلور —

سب غائب۔ سب سے زیادہ دکھ مجھے ماما کی تصویر کا ہے صدمہ سے میری جان نکل گئی۔

کیسی بھی تھیں میری ماں تھیں۔ اور انکی یہ تصویر میرے لئے انکی بڑی پیاری اور ناد

یادگار تھی۔“

منصور نے فوراً اندھا کر ڈرائینگ اور ڈرائینگ روم کا چکر لگایا۔ دونوں کمرے

خالی خالی سے نظر آئے۔ براہِ آمد سے میں واپس آ کر پوچھا —

”آپ نے پولیس کو اطلاع کی؟“

”بیکار — پولیس آئی۔ ایف۔ آئی۔ آر لکھوایا — کچھ نہیں ہوا وہ سارا سامان

تو اب تک نجاس میں بک رہا گیا ہوگا۔“

”میں ابھی تقشیش شروع کر داتا ہوں۔ ایس۔ ایس۔ پی میرا دوست ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انھوں نے عین سے کہا ہم تہا در کیلئے ناکہ بندی کروا رہے ہیں۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ میاں لاکھوں کا مال چلا جاتا ہے۔ ڈاکو پکڑے نہیں جاتے۔ ہمارا تو کچھ ایسا بہت زیادہ قیمتی سامان گیا بھی نہیں۔ سو اس تصویر کے۔ چاندی کی زیادہ قیمتی چیزیں مقفل رکھتی ہوں زیور بنک میں ہیں۔ یہ آرائش کی چیزیں میں نے یورپ مڈل ایسٹ وغیرہ میں جمع کی تھیں۔ پھر بھی خریدی جاسکتی ہیں۔ لیکن بے چاری ماما کی تصویر کہاں سے آئیگی۔“

”میں ابھی خود بخاس جاتا ہوں۔ ایک ایک کباڑی اور نیلام گھر میں تلاش کرونگا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔“

”کوشش کر دیکھو گئی ہوئی چیز واپس نہیں ملتی۔“

”میں ابھی بخاس جا رہا ہوں۔ شام کو آکر بتاؤنگا۔ وہ موٹر بائیک پر بیٹھکر ہوا ہو گیا۔ عندلیب بانو نے رسالہ ”سوسائٹی“ کی ورق گردانی شروع کر دی۔

چارپانچ دن تک بخاس میں تصویر کی ناکام تلاش کے بعد ڈاکٹر منصور کا شغری چند روز کیلئے بمبئی چلے گئے۔ وہاں کے مشہور عالم چوڑا بازار میں کیمبو کی جستجو بھی اس مرتبہ انکے پروگرام میں شامل تھی ہلیتھ کلب کے لئے مطلوبہ سامان خرید کے منصور کی تلاش میں ناکام رہ کر لکھنؤ واپس آئے۔ گھر پر صاحبزادی شہوار کے ٹیلی فونی پیغامات کا انبار رکھا ملا۔ ڈاکٹر منصور مال ایونیو پر ایک بیچلر فلیٹ میں رہتے تھے۔ عمارت کی مالکن انکی پنجابی لینڈ لیڈی راکھی بہن بن چکی تھیں۔ اور انکے سارے پیغامات اور ڈاک بڑی احتیاط سے رکھتی تھیں۔ مسنر پدما بھنڈاری کو اپنے اس متوسط العمر بیچلر کرائے دار اور دھرم بھائی کے نجی معاملات سے از حد دلچسپی تھی بھائی صاحب معمولی شکل والی سیدھی سادی لیڈی ڈاکٹر امبر سے بیاہ کرینگے یا اس کو وڑپتی کی اسمارٹ اور سند رہن شہوار سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس اتوار کو ڈاکٹر منصور

ایرپورٹ سے گھر پہنچے ہی تھے کہ گیلری میں سے مسٹر بھنڈاری کی آواز آئی۔ ”نستے جی۔ بھائی صاحب۔ وہ آپ کی شہوارجی کے ہاں آپکا بڑا بھتیجا رہ رہا ہے۔ کوئی فکشن ہے۔ پچیس ہزار روپے آچکے ہیں۔“

صاحبزادی نگار خانم کے گھر پر اس طرح انتظامات ہو رہے تھے گویا کسی کی شادی ہے۔ شاید انکے منجھلے بھتیجا کی بات کہیں طے ہو گئی ہو۔ یا ممکن ہے شہوار۔ یا انکی بھتیجی پر سی خانم۔ ابھی تین بیواہ اس گھر میں باقی تھیں۔ نگار خانم کو شامل کر دو چار۔ آبشار والے کمرے میں داخل ہو کر نظر دوڑائی۔ اب وہ مدراس میں بنی کسی فابریکا میں سالہ فلم کا سیٹ معلوم ہو رہا تھا۔ ایرپورٹ لاؤنج یا کسی فرم کے رپشن روم کی طرح صوفے دیواروں کے ساتھ ساتھ نصب کئے گئے تھے۔ سفید پلاسٹک کے ٹکلیوں والے عظیم الجثہ گلوب سفید منقش پلاسٹک کی مصنوعی چھت سے لٹک کر فرش تک آ رہے تھے اچانک روشن ہو گئے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ صاحبزادی شہوار خانم۔

”ویکم ہوم لمبا غوط لگایا سونا لمپ خرید لائے ہندوستان میں بنا ہوا خریدا ہے؟“
ایرپورٹ کرتے۔ اچھا آپکے پیچھے ہم نے انٹریر ڈیکور بیڑ بلوایا تھا۔ وحیدہ رحمن، ہیتما، دھرمیندر، امجد خاں وغیرہ سب کے گھر اسی نے سجائے ہیں دیکھیے یہ کمرہ کتنا بڑھیا ڈیکوریت کیا ہے اس نے۔ تین لاکھ صرف اس کمرے پر خرچ ہوا۔
منصور خاموش رہا۔

’دراصل بات یہ ہے کہ۔ ہم لوگ دو سال قبل اس کو تھی میں آئے۔ مطلب وہ پرانی کوٹھی بھتیانے خریدی تھی دقیا نوسی سی۔ کسی زمانے میں کسی انگریز کی ملکیت تھی۔ اسے گرا کر یہ نئی عمارت بنوائی۔ فلورز کیلئے بہترین سنگ مرمر جبل پور سے منگوایا خیال تھا منجھلے بھتیجا کی بات کہیں پکی ہو جائے تو اس سے پہلے ڈیکوریشن مکمل کر والیں وہ کہیں طے ہی نہیں ہو پاتی۔ آپکو باجی نے بنایا تھا نا منجھلے بھتیجا کو وہ آپکی پارٹنر ڈاکٹر نی پسند آتی تھی مگر وہ ایک P کی لڑکی نکلی۔“

شہوار خانم کے منہ سے دوبارہ یہ واہیات جملہ سن کر ایک بار پھر منصور کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ”یہ آبشار والا منیٹل میں بھی اب مکمل ہو گیا ہے۔“ شہوار نے قطب مینار کے نمونے کا نفرتی لیپ اور چاند نما گلوب جلایا۔ چاند کے نیچے دیوار پر بنی بارلیف کی برپوش پہاڑی چمک اٹھی۔ دوسرا سوچ دبا یا۔ پہاڑی کا آبشار جاری ہو گیا۔ ”یہ درخت ابھی لگایا گیا ہے،“ تبسرا سوچ۔ ایک نقلی درخت پر بیٹھی پلاسٹک کی چڑیاں سُریلی آواز میں چہچہانے لگیں۔

شہوار نے فخریہ منصور کو دیکھا۔ ”ہے ناشانداز چیز!“

الہہ العالمین۔ تم لوگوں کو VULGARITY کا پریم ویس رکھو اور بد مذاتی کا پدم بھوشن ملنا چاہیے۔ منصور نے دل میں کہا۔ چپ رہا۔ شہوار نے سوپ آسٹون کا تاج محل روشن کیا۔ ”یہ پورے تیس ہزار میں خریدا ہے۔“ یہ اطلاع دینے کے بعد اس نے پہاڑی نما منیٹل میں کی چوٹیوں پر سے ایک ایک چیز اٹھا کر دکھلانی مشروع کی۔ باریک بلوری ہرن، پلاسٹراف پیرس کا بودھی ستوپم پانی اور کھجور اہو کی مکتوب نویس عورت۔

اس وقت منصور کی نظر نواب سلیم کی تصویر پر پڑی جو بلند ترین چوٹی پر بڑے ممتاز انداز میں سجائی گئی تھی۔

”ارے یہ تصویر تم کو کہاں سے ملی۔“ آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہی تصویر تھی۔ پھر پوچھا۔ ”تمہیں کہاں سے ملی۔“

”ملتی کہاں سے۔“ یہ ہماری دادی حضرت کی تصویر ہے۔“ شہوار نے بے پروائی سے جواب دیا اور پچلی چوٹی سے ایک مٹا سا جیڈ کا بُدھا اٹھا کر منصور کو دکھلانا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے اپنی جگہ پر جم کر بھونچکی آواز میں دہرایا۔ ”تمہاری دادی۔“

”جی ہاں!“

”مگر یہ تصویر تو میں نے تمہارے ہاں پہلے نہیں دیکھی۔“

”دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہمارا سارا قیمتی سامان جاگیر — مطلب — سابق جاگیر پر — پردھان پور پولیس میں مقفل تھا — گزشتہ ماہ جب یہاں آرائش کا کام شروع ہوا منجملے بھیا نے مسلح پیادے بھیج کر منگوائیں سب چیزیں موروثی کتب خانے سمیت — کئی ٹرک بھر کے سامان آیا۔ بہت لمبا فاصلہ اور خطرناک علاقہ ہے۔ بابا مستقیم بمسلم اور پھولن دیوی سب اسی راستے پر OPERATE کرتے ہیں۔“

”اچھا — پردھان پور اتنی دور ہے —؟“

”ہاں بھی پرانی سنٹرل انڈیا ایجنسی میں تھا۔ اب مدھیہ پردیش میں شامل کیا جا چکا ہے کب کا، بس پولیس ہمارے پاس باقی بچا تھا۔ وہ گھنڈر ہو گیا۔ یہ سامان کتب خانہ وغیرہ وہیں موجود تھا۔ سید سامان اب تک برباد ہو چکا ہے۔“ صاحبزادی شہوار خانم نے جیڈ کے بڈھا کو ہتھیلی پر رکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا ”مہا تہا بڈھ ٹھیک کہہ گئے تھے کہ سب مایا ہے۔ بہت پانی۔ آپکو تو معلوم ہی ہے ہمارے فیوڈل طبقے پر کتنی بڑی تباہی آئی آزادی کے بعد۔“

”تو آپ کو پریوی پرس تو ملا ہوگا۔“

”نہیں صاحب — اسکا بہت لمبا قصہ ہے۔ چھوڑیے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ بیٹوں نے بزنس کر کے حالت سنبھال لی۔“

”میں یہ کہیوں دیکھ سکتا ہوں —“

”کیا چیز —؟“

”یہی کہیوں —“

”اوہ — ضرور سنا ہے۔ ہمارے دادا حضرت نے خاص طور پر ایک مشہور منصور سے بنوائی تھی۔ لیجئے۔“

منصور نے کہیوں ہتھیلی پر رکھ کر ”قطب مینار“ کی روشنی میں غور سے دیکھا، اور کنفیوز ہوا۔ بالکل وہی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ جانے کیا جکر تھا۔ گویا اسرار دربار پردھان پور تصویر کو پلٹا۔ پشت پر مرقوم، ہر ہائی نس دی نواب کیم صاحبہ آف پردھان پور۔

منصور نے آنکھیں ملیں۔ عبارت دوبارہ بڑے غور سے پڑھی۔

ہربائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور
زبردست انکشاف، ”نواب بیگم“ کے شروع میں ”ہربائی نس دی“ اور آخر میں ”صاحبہ
آف پردھان پور“ تازہ اضافہ تھا۔ مگر تقریباً اسی قسم کے قلم اور روشنائی میں۔
”تری شانِ جلّ جلالہ“۔

”جی۔۔۔؟“

”کمال ہے صاحب۔۔۔“

”جی۔۔۔؟“

”کمال ہے۔“ منصور نے مسکرا کر دہرایا: ”آپ نے یہ نادر فیملی ایرلوم منگوا کر

داتی بہت اچھا کیا۔“

”جی پچھلے تین تینتیس سال میں پردھان پور میں رکھے رکھے بہت سی قدیم خاندانی
تصاویر برباد ہو گئیں۔ کل آپکو کتب خانہ بھی دکھلاؤنگی۔ اس میں مصوٰرِ مخطوطے
بھی موجود ہیں۔ ہمارے بزرگوں کو نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس جزیلشن میں
تینوں بیٹے تو کاروبار میں لگ گئے باجی البتہ خاندان کی پرانی روایات کی تجدید کر رہی
ہیں۔ لائبریری اور باجی کی اسٹڈی میں ابھی کام ہو رہا ہے۔ فرسٹ فلوئر پر مکمل ہو جائیگا
تو دکھلاؤنگی۔“

”چھوٹی بیٹا۔۔۔“ بسنتی مہری نے کھلے کنول نما دروازے میں آکر کہا ”مستی جی

بلاوت ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ اصل میں باجی کے قارئین کے اصرار پر انکے بیٹسویں ناول کی
رسم اجراء ذرا دھوم سے منانے کا پروگرام ہے۔ اسی لئے ہم نے سوچا تقریب سے قبل
گھر کی آرائش مکمل کر لی جاوے۔ معاف کیجئے۔ ابھی آتی ہوں۔ میرے بیڈروم میں
کام ہو رہا ہے۔ ذرا کاریگروں کو سمجھا آؤں۔ دیواروں پر گدیے والی گلابی ساٹن لگوا رہی
ہوں۔ آپکو کون سا رنگ پسند ہے؟ ابھی آئی۔۔۔“

شہوار کے جاتے ہی منصور مصنوعی درخت کی شاخ پر ٹکے نئی وضع کے ٹیل فون کے پاس پہونچا۔ نمبروں کے بٹن دبائے۔

”ہلو—ہلو—“ عنبریں کی آواز آئی۔

منصور نے آہستہ سے کہا ”عنبر تمہاری قبلہ نانی جان کے ایڈونچر ابھی ختم نہیں ہوئے۔“
”کیا مطلب؟“

”وہ یہاں موجود ہیں۔ برونیٹے سسٹرز کے بھیانک ڈرائیونگ روم میں۔“

”ہائیں—کس طرح—؟“

”سمپل مائی ڈیر لیڈی واٹسن۔ نجاس میں پک رہی ہونگی۔ انھیں بھی خرید لائیں۔“

—نواب سگیم اب ہر ہائی لنس دی نواب سگیم اف پردھان پور بن گئی ہیں۔“

”نوکیڈنگ—؟“

”ان ذہین خواتین نے انکے نام کے دائیں بائیں ان الفاظ کا اضافہ کر لیا ہے۔“

مگر یار میں بڑی الجھن میں ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے—یعنی ایک سجدہ REMOTE

POSSIBILITY ہو سکتی ہے—کہ واقعی تمہاری نانی نے اپنی طوفانی زندگی کے

کسی دور میں کسی نواب صاحب ہر ہائی لنس آف پردھان پور سے عقد کر لیا ہو—

اور یہ کیمپو اس کیمپو کی جو تمہارے پاس تھا اس کی نقل ہو—جوان نواب صاحب نے

بنوائی ہو۔ بحیثیت شرک ہو منر مجھے ان تمام ممکنات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ذرا اپنی

امی سے پوچھو کیا انکی ممانے کسی نواب پردھان پور سے نکاح کر لیا تھا؟“

دوسرے سرے پر عنبریں نے با آواز بلند سوال دہرایا۔

”ہرگز نہیں۔“ عنذ گیب بانو کی آواز آئی۔

”ہرگز نہیں۔“ عنبریں نے دہرایا۔

”توبات صاف ہے۔ جوں ہی میں نے یہ تصویر انکے انتہائی بے ٹیکے منٹل میں

پر رکھی دیکھی میں ان سے کہنے ہی والا تھا کہ اسے میرے ہاتھ بیچ دو یا یہ کہ چور کا

دارنٹ نکلا ہوا ہے۔ مال مسروقہ کے خریدار کی حیثیت سے وہ بھی پکڑی جائیگی۔
 ”میں یہ سب کہنے ہی والا تھا کہ شہوار نے نواب بیگم کو اپنی جدہ DECLARE کر دیا
 لہذا مجھے خاموش رہنا پڑا۔“

”جدہ؟“ شہوار خانم جدہ جا رہی ہیں؟ ذرا زور سے بولو۔ تمہاری آواز صاف
 نہیں آرہی۔“

ارے یا ر جدہ۔ جد کی بیوی۔ اس پر یاد آیا کہ جدہ میں اماں جوا کا مزار ہے۔
 بچہ طویل اسی وجہ سے وہ شہر جدہ۔“

”اماں جوا۔“ اماں جوا کا کیا ذکر تھا۔؟
 ”اماں یا ر۔“

”صاف آواز نہیں آرہی لائین میں بہت گڑبڑ ہے۔ تم نے ان سے کہا کیوں
 نہیں کہ وہ تصویر ہماری ہے۔ کہاں کہاں تو تم اُسے ڈھونڈ آئے۔ نجاس اور
 جتنی کاچور بازار۔“

”ہاں صاحب۔ گھر گھوڑا نجاس مول۔“
 ”گھوڑا۔“ کیسا گھوڑا۔ منصور زور سے بولو۔ تم نے ان سے کہا کیوں نہیں۔“
 ”اماں کیسے کہتا۔ ایک معقول لڑکی۔ اتنا بڑا سفید جھوٹ بول رہی ہو اور میں اسے
 جھٹ سے بتا دوں کہ اس کا جھوٹ کھل گیا تو اسے شرمندگی نہ ہوگی؟ غبرن رہی ہو۔؟“
 ”ہاں ہاں اب لائین صاف ہے۔“

”غبرن یا ر اس ٹیلی فون کے اوپر کی ٹہنی پر پلاسٹک کی رنگ رنگی چڑیاں بیٹھی ہوئی
 ہیں جو گاتی بھی ہیں۔“

”نو کڈنگ۔“

یہ پول کھلنے کے بعد شہوار خانم کی طرف سے جوا چانک میرے رویے میں تبدیلی
 آگئی ہے۔ کیا میری آواز ہی میں غبرن نے اسے محسوس کر لیا؟ عندلیب بانو نے اپنا پول
 خود کھولا تھا کیونکہ وہ زندگی کے انتخابات کے سامنے میں خود کو آزاد سمجھتی ہیں۔ مگر اپنے

پنے آپ کو اور اپنی ماں کو حالات کا شکا بھی تصور کرتی ہیں اور ایک شہیدانہ انداز اپنے غلطی رکھتی ہیں۔ مگر شہوار نے اس قدر لالچنی اور بے کار بھوٹ کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا اس لڑکی کی قوت متینہ ضرورت سے زیادہ ہے؟ بڑی بہن نے اپنے تخیل کو ناول نویسی میں استعمال کر لیا ہے۔ یہ محض فنیٹی بنانے میں مصروف ہے۔ وہ فون بند کرنے والا تھا۔ عینبر کی آواز آئی۔ ڈاکٹر چنگ شاؤ لو پو۔ وہ معاہدہ بنائش معلوم ہو رہی تھی۔

رائی عینبر۔

”بولو۔ ملک عینبر۔“

”تم نے انکے تعلقے کا کیا نام بتایا؟“

”پر دھان پور۔“

”اس پر ایک گھنٹی سی جی میرے ذہن میں۔“

”بولو مائی ڈیر میں واسٹن۔“

”ڈکٹوریہ جہاز پر جب ہم ولایت جا رہے تھے۔ ایک صاحبزادہ صاحب اف دھان پور مارے ہم سفر تھے زبردست کارڈ شارپر۔ انہوں نے ایک پاکستانی فلمی ڈائریہ لوزنٹام سے ساتھ ہم اپ کر لیا تھا۔ GENOA پہنچنے سے قبل جہاز ہی پر ایک بار پکڑے جانے سے لباں بچے۔“

”عینبر۔ میں ان ذات شریف سے واقف ہوں۔ اب سیدھا گھر جا رہا ہوں۔ ہاں سے فون کرونگا۔ تم دس بجے کے بعد لوگ کرلو۔ رائیٹ۔؟ میں بہت عکا ہوا ہوں۔ بھئی سے دلی رات کی فلائیٹ سے پہونچا۔ وہاں سے صبح آٹھ بجے کا جہاز پکڑ لکھنؤ آیا۔ دن بھر میں بہت سا کام بیٹھایا۔ پدمابہن جی پیجھے پڑ گئیں کہ فوراً انکار جی کے ل جائیے۔ چنانچہ یہاں پہونچا۔ باقی بات گھر سے کرونگا۔ ہاں صاحبزادہ صاحب تھان پور اور نگار خانم کے پر دھان پور سے میرے ذہن میں بھی گھنٹی جی ہے۔“

ڈاکٹر عینبرس بیگ نے فوراً ریسورٹ لکھ دیا اور دیچے سے باہر نظر ڈالی جہاں

کاغذی گلاب اور مغلیہ گلاب مکان سے چھنتی روشنی میں مقیموں کی طرح روشن تھے۔
 کی طرح یعنی جب تک اس نے نگار خانم کے پاؤں جانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اسی طے
 زبانی یا فون پر اپنی ساری مصروفیات کی رپورٹ دیا کرتا تھا۔ اب شاید وہ پھر واپس
 آ رہا تھا۔

مال ایونیو واپس پہنچ کر اس نے پھر فون کیا۔
 ”لیڈی ایمر آف ایبرڈین۔“ فون تیکے پر رکھ کر اس نے بات شروع کی
 ”مجھے بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔ لہذا فوراً بتاؤ۔“ وہ صاحبزادہ صاحب اف دھان
 کے نام پر کیا گھنٹی بجی تھی۔“

”بس کچھ بجی سی تھی۔ تم بتاؤ ڈاکٹر نوہ۔“
 ”بھئی میرا تو خیال یہ ہے کہ پچھلے دنوں وہ انگریز۔“ میرا خیال ہے کہ اب
 انڈین چھو کر ہے۔ بہر حال انگریز کہلاتا ہے۔ وہ یہاں آیا تھا۔ شہزادی درش
 کے ہاں۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ایک رات انکے ہاں ڈنر کے بعد کچھ کارڈ شارپرز کا
 نکلا۔ میں نے صاحبزادہ صاحب اف پر دھان پور کا نام لیا تو وہ لڑکا چونک
 گیا۔ اور میں نے جو غور سے دیکھا تو شکل ان بزرگوار سے کچھ ملتی جلتی معلوم ہوئی۔“

“WOW! THE PLOT THICKENS AND THE MYSTERY DEEPENS!”

”بالکل۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ جب میں نے کہا میں پوسٹن میں انکا معا
 رہا تھا۔ اور مافیا والے شاید انکا رشتہ حیات منقطع کر چکے ہیں تو شہوار نے بالکل
 BY THE WAY سرسری طور پر کہا اچھا۔ وہ ہمارے ایک کزن تھے

GOOD-FOR-NOTHING.

”تو صاحبزادہ دلشاد علی خان اف دھان پور صاحبزادی شہوار خانم اف
 پر دھان پور کے کزن نکلتے اہم نکتہ اچھا خانم عنبریں کل شام کیلئے بڑھیا ZZA

اب مجھے رات بھر خواب ہیں وہ آبشار اور چڑیاں نظر آئیں گی۔ گڈ نائٹ

”امی۔ امی جان۔“ رسیور رکھ کر عنبر تیر کی طرح اسٹوڈیو کے دروازے پر
نچی اور زور زور سے دھمک دینے لگی۔

منسبریک نے شراب کی الماری بند کر کے دروازہ کھولا۔ ”کیا بات ہے کیوں غل
بارہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“
”امی۔ شہوار خاتم بھی EXPOSE ہو گئیں۔ منصور واپس آ رہا ہے“
اندر جا کر وہ ایک کرسی پر دم سے بیٹھ گئی۔

بچھوڑے تالاب کے کنارے حُسنِ بخش نے شاید دانہ پھینکا تھا۔ بطخیں قُب
بُن کرتی بے پناہ شور مچا رہی تھیں۔
”بلیاں۔ کہاں ہیں بلیاں۔ سب کبجھتوں کو ابھی باہر لیجا کر پھینکتی ہوں۔“
”بلیو۔ بلیو۔“ اس نے دریچے میں جا کر چلانا شروع کیا۔

“CALM DOWN AMBER, TAKE IT EASY. RELAX.”

منسبریک نے جلدی سے الماری کھول کر کاپٹوز کی گولی نکالی۔



اندر جال

عرف

اسرارِ دربارِ پردہانِ پور

”رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھے۔ نہ ہاتھ پاؤں میں ہے نہ پاؤں رُکار میں۔“ حضرت زراغ دہلوی نے آبشار والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فرمایا تینوں صوفیہ پر بیٹھ کر مصنوعی آبشار ملاحظہ کرنے لگے۔ شہوار خانم کمرے میں داخل ہوئیں۔ صحافیوں سے کافی فاصلے پر رکھی ایک کرسی پر ٹکیں اور پوچھا۔ ”آعاجاں کی تعریف۔“

”محترمہ آپ ہم تینوں سے چند روز قبل اسی کمرے میں اسی جگہ شرفِ ملاقات حاصل کر چکی ہیں۔“ زراغ صاحب نے ہنسنے لگا کر کہا۔ ”خاکسار زراغ دہلوی، مزاحیہ غزلیں بلیغہ مزاحیہ کالم۔ پینا توئس مدیرِ ادبی ایڈیٹن۔ کل نگار صاحبہ نے ہمارے دفتر کو کیا تھا کہ جشنِ اجراء کی نئی تاریخ مقرر کر لی گئی ہے۔ ہمارا اسپیشل نمبر اسی روز ہمانو تقسیم کیا جائے گا۔ موصوفہ نے آج صبح دس بجے کا وقت دیا تھا فوٹو سیشن کے لئے۔“ فوٹو سیشن۔“ اس میں تو باجی چاہتی ہیں کہ میں بھی شریک ہوں جیسے وہ مجھ باتیں کر رہی ہیں۔ میرے ساتھ پھول سجا رہی ہیں گلدان میں۔ ہمارے نئے امریکن کچن میں کھانا پکا رہی ہیں۔ وغیرہ۔ آپ فوٹو گرافر ساتھ لائے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

شہوار نے ہائوس ٹیلی فون کا لمبیور اٹھایا۔ ”باجی یہ اخبار والے آگئے ہیں۔“ انھوں اس طرح کہا گویا سبزی ترکاری بیچنے والے آگئے ہیں۔ ”آپ انکو انٹر ویو دیجئے۔“ ہیرڈ لمبر کے ہاں حضرت گنج ہواؤں۔ یہ لوگ میری تصویریں بھی کھینچنے کو کہہ رہے۔ ”یہ تو آپ نے خود ہی فرمایا ہے ہم نے نہیں کہا۔“ زراغ صاحب نے بات کاٹی۔

”نہیں تم انٹرویو کے وقت موجود رہو۔ بال خود بنالو“ نگار خانم نے اوپر سے جواب دیا۔
 ”اچھا بجیا کون سی ساری پہنوں؟ یا پوڑی دارز؟ تصویریں تو کمر میں ہوں گی نا؟“
 ”ہمارا خیال تھا ایک رائیٹر کا انٹرویو کرنے آئے ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوا ایتھامانی اور
 تہ امان کی تصویریں کھینچنے والی ہیں“ زراغ صاحب گویا ہوئے مگر اس وقت تک
 ارفون بند کر کے دوڑتی ہوئی اوپر جا چکی تھیں۔
 ایک ملازم چائے کی ٹرے لے کر آیا اور ڈن ہل اور مارلبرو کے پیکیٹ۔

کچھ دیر بعد نگار خانم کمرے میں داخل ہوئیں تینوں اسی طرح بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔
 رخام سر پرستانہ انداز میں مسکرائیں۔ چھوٹی ٹہن احمق سے جو ان بے چاروں سے چڑھاتی
 ،۔ ان سے بنائے رکھنی چاہیئے۔ اگر خلاف لکھنے پر آگئے تو تو اہ مخواہ کا قصہ۔
 قریب کی کرسی پر بیٹھنے ہوئے اخلاق سے کہا ”مزاج شریف۔ میں تو بھی بالکل نہیں
 تھی کہ میرا اسپیشل نمبر نکلے۔ مگر آپ لوگ مہر ہیں۔ روز آپکے ایڈیٹر کا فون آجاتا ہے“
 ”مگر آپ تو خود متواتر چیف ایڈیٹر کو —“ بطلموس نے اپنے پاؤں سے زراغ صاحب
 دس دبا یا گروہ بولتے رہے ”فون کرتی رہتی ہیں کہ اسپیشل نمبر نکلائیے اس کی
 اعت کا پورا خرچہ میں دوں گی۔ بھائی بطلموس صاحب آپ میرے پاؤں کا انگوٹھا کیوں
 رہے ہیں؟ — میڈم یہ لاگت کا تخمینہ ایڈیٹر صاحب نے بھجوا یا ہے“
 ”زراغ صاحب ہمیں بات کرنے دیجئے۔“ بطلموس نے کہا۔
 ”پچاس ہزار —“ مصنفہ نے کاغذ دیکھ کر پوچھا۔

”جی آپ تمام تصاویر رنگین چاہتی ہیں۔ آرٹ پیپر۔ ہر صفحے پر آرٹ ورک۔ پھر آپکے جو
 سٹاپ لکھوائے جائیں گے انکے لئے مضمون نگار حضرات بھاری معاوضہ طلب کر رہے
 ہیں“ زراغ صاحب نے جواب دیا۔

”اوپر چلیئے۔ تصاویر کتب خانے میں کھینچو لیجئے گا“ نگار خانم نے اٹھتے ہوئے کہا —
 لوگوں نے چائے پی کچھ کھایا نہیں؟ شریف لائیے“

گرینڈ امیٹر کیس پہ انکی قیادت کرنی تینوں کو دوسری منزل پر اپنے کتب خانے لے گئیں۔ چند بڑھئی ایک طرف اکڑوں بیٹھے بیڑیاں پیٹتے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ”تم لوگ اب تھپی کرو۔ جاؤ۔ بٹلموس صاحب یہ ہمارا کتب خانہ پردھان پور۔ ابھی پہونچا ہے۔ الماریاں وغیرہ تیار کی جا رہی ہیں۔“

اخبار نویسوں نے عربی فارسی اردو کی نادر کتابوں اور قلمی نسخوں کا جائزہ لیا۔ ”ہمارا موروثی ذخیرہ ہے۔“

”جی ہاں — جی ہاں —“ بٹلموس نے مرعوب آوازیں کہا۔
 ”خاتمہ ریاست کے بعد ہم لوگ کتب خانے کو پردھان پور سے یہاں منتقل نہ کر سکتے تھے کیونکہ کسی قانونی پیچیدگی کی وجہ سے گورنمنٹ نے سپلیس مقفل کر دیا تھا۔“
 شہوار خانم اندر آئیں اور بڑی بہن کے منہ سے بات چھین کر بولیں ”در اصل ایسا کہ ہمارے ایک کزن صاحبزادہ صاحب اف دھان پور پاکستان چلے گئے تھے اس سے کسٹوڈین نے ہمیں بہت تنگ کیا۔“

اس دوران میں پفناٹوس نے نہایت مستعدی سے نوٹ لینے شروع کر دیے تھے۔ اور ٹیپ ریکارڈ بھی چالو تھا۔

”کسٹوڈین نے صاحب بہت ہی ناک میں دم کیا — وہ سردار ٹیل کا زمانہ تھا اب جانے۔“ شہوار خانم نے دبیز چرنی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”میر خیر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ باجی بتاتی ہیں۔ باجی بھی خیر اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ انہ نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ان کزن کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے گورنمنٹ اف انڈیا نے سپلیس پر تالا ڈال دیا۔ اب لڑا کیجئے مقدمے۔“

”صاحبزادہ صاحب —؟“
 ”دھان پور — پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں سے امریکہ۔ وہیں وفات پا گیا نام بتایا۔“ صاحبزادہ صاحب دھان پور —؟
 ”دھان پور اور پردھان پور تو م جاگیریں تھیں جیسے یہاں محمود آباد اور۔“

پفناؤس نے جان کاری سے سر ہلایا (وہ خود سینا پور کے رہنے والے تھے) اور تیزی سے لکھا کئے۔

”پھر کسٹوڈین سے پیلیس کس طرح بحال ہوا؟“ زآغ صاحب نے دریافت کیا۔
 ”لمبا قصہ ہے پڑھنے والوں کو اس میں کیا دلچسپی ہوگی؟“
 ”قارئین اپنے پسندیدہ مصنف کے ذاتی زندگی کی تفصیلات جانتا چاہتے ہیں اور یہ علم دوست حضرات کے لئے بالخصوص باعث دلچسپی ہوگا کہ کس طرح اتنا نایاب کتب خانہ برباد ہونے سے بچ رہا۔“ پفناؤس نے عرض کیا۔

”تکیہ کلام معاف یہ ذخیرہ بھی سینکڑوں برس میں جمع ہوا ہوگا“ زآغ صاحب نے کہا
 ”روم ایک دن میں نہیں جلاتھا۔“

”جوابات کی بے تکی۔ قطع کلام معاف اور روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔“
 بطلمیوس نے آہستہ سے کہا ”نگار صاحبہ ہم کو ایسے دردناک واقعات معلوم ہیں کہ تباہ حال روساء کو محض دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اپنے آبائی کتب خانے اور نوادہ کوڑیوں کے مول بیچنے پڑے۔“ پفناؤس نے کہا۔
 ”جی اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا کتب خانہ بچ رہا۔“

”اچھا نگار صاحبہ آپ کے کچھ حالات زندگی۔“

”اجی میرے کیا حالات۔“

”انکسار کی ضرورت نہیں۔ قارئین جانتا چاہیں گے۔ سنہ پیدائش۔“
 ”۱۹۳۵ء۔“

زآغ صاحب نے منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے اُچھوٹا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں۔ اُچھوٹ گیا۔ ایک گلاس پانی منگوادیجئے۔“
 شہوار نے گھنٹی بجائی۔

”جی۔ سنہ پیدائش ۱۹۴۵ء“ پفنا توُس نے سنجیدگی سے دہرایا۔ ”تعلیم —“

”اعلیٰ —“

”والدین —“

”محرّم نواب صاحب پردھان پور و سکیم صاحبہ جنت مکانی۔“

”کھیلیں دھمال خواجہ معین الدین“ — دیکھو کھیلیں دھمال خواجہ معین الدین۔“
نیچے شاگردیشے سے فلک شکاف نعرہ بلند ہو رہا تھا۔
”کون گارہا ہے؟“ زآغ نے کان کھڑے کئے۔

”ایک مجذوب ہیں۔ نیچے رہتے ہیں احاطے میں۔“

”اور عزیز واقارب —“ پفنا توُس کے سوالات جاری رہے۔

”بس اللہ رکھے تین بھائی ہیں۔“

”کھیلیں دھمال خواجہ“ کھیلیں دھمال —“

”شہوار! ایک تو ترکھانوں کی کھٹ کھٹ اور ایک یہ باباجی نے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ دریکے بند کردو — جی بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی شادیاں سوچ چکی ہیں۔ چھوٹا بھائی مع اہل و عیال مسقط میں ہے۔ منجھلے والے نے نیننی تال میں سیب کے اور چسپڑ لگائے ہیں فیکڑیوں کے علاوہ مڈل ایسٹ گوشت پسلائی —“

”جی مگر آپ اپنے متعلق —“

”میں ناول نویسی کے علاوہ چند قدیم شعراء پر مضامین لکھ رہی ہوں۔ ارادہ ہے۔“

پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر ڈالوں۔“

”پڑھنے والوں کو تعجب ہے کہ آپ کو وہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں جو اننگ محققین کی نظروں سے اوجھل تھیں —“

”اسی کتب خانے کی بدولت جواب تک مدھیہ پردیش کے گھنے جنگل میں پھپھے

پردھان پور پبلیس میں پوشیدہ تھا۔“

”نگار صاحبہ چند حاسدوں نے اڑادی ہے کہ آپ نے کسی ضرورت مند افلاس زدہ

عالم کے غیر مطبوعہ مضامین خرید لئے ہیں۔“ زارغ نے کہا۔
 ”جی، چلیے تنقیدی مضامین میں نے خرید لئے۔ یہ پینتیس^{۵۳} عدد ناول — یہ بھی میر
 نے کسی سے لکھوائے یا خریدے ہیں؟“

”جی ہاں۔ یہ واقعی کمال ہے،“ زارغ دہلوی نے فرمایا۔ ”نگار صاحبہ کیا میں یہ کہہ
 سکتا ہوں ممتاز شیریں مرحومہ کے بعد آپ پہلی خاتون نقاد ہیں جس نے مردوں کے کان کاٹے“
 ”زارغ صاحب۔ یہ کان کاٹنا وغیرہ شرفاء کی زبان نہیں۔ مجھے انٹرویو کرنے دیجئے“
 پفنا توُس نے بگڑ کر کہا۔

”میں محض اتنا اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ تنقید کے میدان میں کب کو دیں —
 میرا مطلب ہے کب قدم رنجہ فرمایا یعنی آپ کا پہلا مضمون کب —“
 ”زارغ صاحب آپ ذرا نیچے جا کر انتظار کیجئے —“ بطلیہ توُس دانت پیس کر اہستہ سے
 — ”آؤٹ — آؤٹ —“

زارغ صاحب ڈن ہل کا پیکٹ جیب میں ڈال کر فوراً اُٹھے۔ اطمینان سے سر جھکائے
 نیچے چلے گئے۔

”بطلوُمیاں،“ نگار خانم نے ممنونیت سے کہا ”بعض جیڑ قنات لوگ پیدا نشی بد تمیز
 ہوتے ہیں۔ مہمان سمجھ کر میں نے بہت طرح دی۔ مجھے معلوم ہے حاسدوں نے میرے خلاف
 سرکوشی کی ہم شرور کر رکھی ہے کہ میں پیسے دے کر مضمون اپنے نام سے چھپوا رہی ہوں۔
 اور اپنی تعریفیں بھی۔ مگر یہ میرا HANDICAP ہے۔ بطلوُمیاں میری دولت اور سماجی
 پوزیشن میرا ہینڈ می کیپ ہے“

”باجی جان مخالفین کی بہتات اور اس قسم کی کریمہ افواہیں آپ کی مقبولیت اور
 کامیابی کی دلیل ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب“ بطلوُمیاں نے کہا۔
 ”ہاں صاحب۔ جلنے والے دور وٹی اور کھالیں“ پفنا توُس بولے۔ ”بہار آمد

نگار آمد نگار آمد قرار آمد۔ صدائے آبشاراں از اطاق شاہوار آمد“
 ”کیا بات پیدا کی ہے“ بطلوُمیاں نے ہاتھ اٹھا کر داد دی ”جشن نگار خانم کے بجائے

تقریب کا عنوان ہی کیوں نہ رکھا جائے۔ بہار آمد نگار آمد۔ نگار خانم کا طرز نگارش تو اپیشل نمبر کے پہلے حصے کا عنوان ہو گا۔ تصویریں فیچر کا عنوان کیا ہو۔؟

”اس نو بہار ناز کو۔۔۔“ پفنا توُس نے کاغذ پر لکھا۔ بطلمیوس نے اس کے نیچے اضافہ کیا ”ز آغ کی طرح ہم آپ کو بھی چلنا کر دیں گے“

شیام سنگھ نیچے سے فوٹو گرافر لے کر آیا۔ دوسرے ملازم نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا۔

”جو تصویریں الہم میں موجود ہیں ان میں سے بھی منتخب کر لو اور چند خاندانی تصویریں نیچے سے لے آؤ۔۔۔“ فیملی گروپ وغیرہ۔۔۔ نگار خانم نے شہوار سے کہا۔

فوٹو گرافر نے روشنیاں ایڈجسٹ کیں۔ نگار خانم ایک بگ شیلف کے سامنے ایک قلمی نسخہ ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئیں۔ فوٹو سیشن شروع ہوا۔

تھوڑی دیر بعد شہوار تیار ہو کر آئیں۔ بسنتی مہری الہم اٹھائے ساتھ ساتھ تھی۔ شہوار نے نواب بیگم کا کیمرہ احتیاط سے میز پر رکھا۔

”یہ لیجئے۔ یہ ہماری دادی حضرت خلد آشیانی کی نادر روزگار تصویر ہے۔ اسے بھی کلر میں چھاپیے۔۔۔ CAPTION میں لکھ کر دیتی ہوں“

بطلمیوس اور پفنا توُس کیمرہ کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہوئے۔ اب وہ نگار اور شہوار سے واقعی بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔

شہوار نے لکھنا شروع کیا ”نامور ناول نگار نگار خانم۔۔۔ نہیں ٹھہریئے۔۔۔ نامور ناول نویس نگار خانم کی دادی ہر ہائی ٹس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور خلد آشیانی۔۔۔ یہ پردھان پور کے بعد خلد آشیانی ٹھیک نہیں بیٹھ رہا ہے۔ علیا حضرت نواب بیگم صاحبہ خلد آشیانی آف پردھان۔۔۔“

”لایئے مجھے دیجئے۔ یہ CAPTION وغیرہ لکھنے کا کام مجھ پر چھوڑیئے۔ بطلمیوس نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”جشن کی صدارت کے لئے کسی منتری وغیرہ کو بلا جانیگا؟“

نواب بیگم کا کیمرہ لفافے میں رکھتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔

”جی منتری وغیرہ ہمارے گھر پر آئیں گے اور ڈنر بھی میری طرف سے کلا کس اودھ میں ہوگا۔ اس کا آپ کے رسالے سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ آپ جن چندیدہ ادیبوں کو دوسرے شہروں سے مدعو کرنا چاہیں انکی فہرست بنا دیجئے۔ ہوائی جہاز سے آمد و رفت کا کرایہ کلا کس اودھ میں قیام و طعام میری جانب سے۔ اس سلسلے میں بڑے بھیا کے سکرٹری کو فون کر لیجئے گا۔“

”جشن کے ساتھ ایک عدد مشاعرہ اور شب افسانہ بھی رکھ لیجئے“ پفنا تو س نے کہا۔
 ”بے شک۔ بے شک۔ اس کا پروگرام آپ مرتب کر دیجئے۔ شہوار چلو اب تم میرے ساتھ آکر اس دیوان پر بیٹھو۔ تصویریں کھنچو ایئے۔ بطلو میاں۔“
 ”پردھان پور پلیس کی تصویریں اور آپ کے دادا حضرت اور والد مرحوم نواب صاحب کے فوٹو گراف بھی مل جاتے تو فیچر مکمل ہو جاتا“

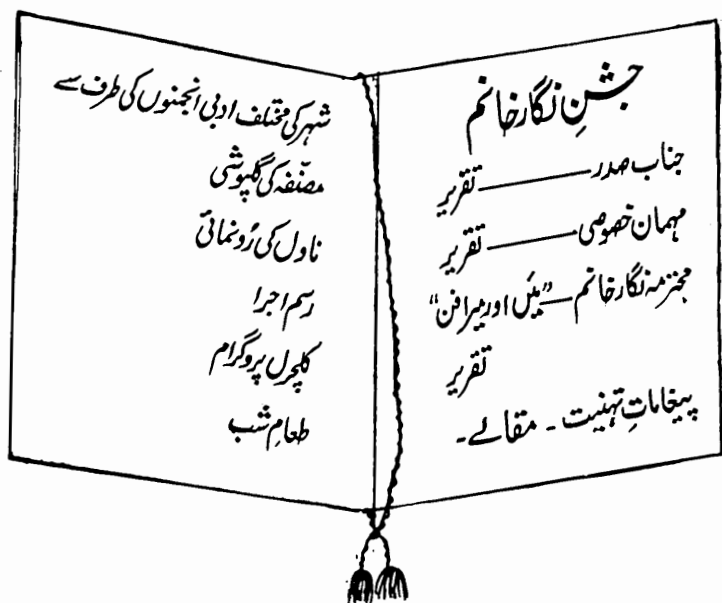
”بطلو میاں جتنا میٹر بل آپ کو دیا گیا ہے اسی کالے آؤٹ بنو ایئے باقی تصاویر تلاش کرنے کی کوشش کروں گی۔ ہمارا آدھا سامان ابھی تک سینکڑوں میل دور مدھیہ پردیش کے اس علاقے میں پڑا ہے جہاں ریل بھی نہیں جاتی۔“ نگار خانم بولیں۔
 ”خطرناک ڈاکوؤں سے پُر گھنے جنگل اور دشوار گزار گھاٹیاں“ شہوار نے کہنا شروع کیا۔ ”ابنک دہاں کجلی بن میں شیر اور جیتے موجود ہیں۔ ہمارا اپنا علاقہ شیر اور بارہ سنگھ کے لئے مشہور تھا۔ ہمارے کزن اور نامور شکاری صاحبزادہ صاحب آف دھان پور“
 پفنا تو س تندہی سے نوٹ لیتے رہے۔

نیچے باغ کی ایک سنگی بیچ پر متمکن زاغ ڈن پل پہ ڈن پل چھوٹے جارہے تھے گمنام نواب صاحب رکشا پر بیٹھے پھاٹک میں داخل ہوئے۔
 ”آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت زاغ صاحب سوچ رہے تھے۔ بطلو تو س اور اور پفنا تو س دونوں دونوں ہنوں کی چالپوسی میں مصروف ہیں۔ خوشامدی ٹٹو۔ بھاڑے کے ٹٹو۔ ٹٹو خوشامدی کیوں کہا جاتا ہے۔ کس کی خوشامد کرتا ہے بے چارہ

نہایت مسکین غیور جانور ہے۔ ان بڑے میاں کی طرح۔ جانے کون ہیں۔ ان سے انکا نام پتہ پوچھ کر انکو شرمندہ نہیں کروں گا۔ رکشا سے اتر کر نواب صاحب نے شام سنگھ کو آواز دی۔ پھر حضرت زارع کو مخاطب کیا۔ ”میاں عنایت ہوگی اندر بڑی بیٹا سے کہلو دیجئے ابھی ابھی ڈاکٹر نے کہا ہے لڑکے کا گردہ فوراً بدلو ایسے۔ بڑی بیٹا نے ارشاد کیا تھا آج کچھ رقم عنایت کرینگے۔“ نواب صاحب بے حد سراسیمہ نظر آتے تھے۔ زارع نے سراٹھا کر دیکھا بٹلموس ولفناٹوس سامنے کھڑے تھے۔ بٹلموس نے ولفناٹوس سے کہا۔

”بھائی ولفناٹوس شخصیت پر مضمون لکھنے کے لئے پوائنٹنگار خانم خاموشی کے ساتھ حاجت مندوں کی امداد۔ وغیرہ۔“

”رسالے کا کام اتنا بڑھایا۔“ ولفناٹوس نے جواب دیا۔ ”نگار صاحبہ نے یہ دعوت نامہ چھپنے کو دیا ہے۔ تاریخ بھی مقرر کر لی ہے۔ ۴۴ جنوری ۱۹۳۵ء۔“



میرا شہر کا محل

ساؤتھ ہیرد
۲۳ نومبر ۱۹۸۲ء

میری پیاری نگار خانم

اس بے تکلفی کیلئے معذرت خواہ نہیں آپکا ابن عم ہوں۔ میرے لڑکے کنو بہزاد علی خان عرف نور من ڈریک نے ہندوستان سے واپس آکر بتلایا کہ لکھنؤ میں اسے چند گمشدہ رشتہ دار ملے — یعنی آپ لوگ۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ میری عزیزہ میں بھی یہ علم نہ رکھتا تھا کہ میرے کچھ اعزہ اس جہان فانی میں ابھی بقید حیات ہیں۔ میرے مرحوم والد اور مرحوم تایا نے بھی کچھ تذکرہ نہیں کیا وجہ اس کی غالباً وہی زمینداری کے جھگڑے رہے ہونگے۔ جو ہر فیوڈل مسلم گھرانے کے نفاق اور بربادی کا باعث ہوئے۔ مزید برآں ہمارا تعلق دھان پور (جو میں اعتراف کروں گا کہ بہت معمولی چھوٹا سا تعلقہ تھا) آپکی بڑی ریاست پردھان پور سے سینکڑوں میل کی دوری پر واقع تھا۔ ہم اودھ میں تھے آپ شاید سی۔ پی میں۔ ہم دلی تم آگرے۔ تو کیسے بچے گی بانسری۔

الغرض یہ نیرنگ زمانہ ہے کہ میں آپکا ایک قریبی عزیز آپکا ابن عم عرصہ دراز شہر نیویارک میں گزارنے کے بعد اب شہر لندن میں رہتا ہوں۔ اپنی سابق گرل فرینڈ اور موجودہ بزنس پارٹنر مس نورما ڈریک عرف نورما خانم (جو میرے لڑکے راجکار بہزاد علی خان عرف نور من ڈریک کی ماں بھی ہیں) اور انکی بہن سیلی ڈریک عرف سرتینا دیوی کے ساتھ ایک البکورٹ سروس چلاتا ہوں۔ اور آپ لوگوں سے اب تک ناواقف تھا۔ اور آپ سے بھی شاکی ہوں کہ آپ نے کبھی ہماری خبر نہ لی۔

ہم لوگوں کا دفتر سوسہویں ہے۔ مکان ساؤتھ ہیرو میں۔ میرا اور نوڑماہ خانم کا بیٹا ہم لوگوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا۔ اسکی دلچسپیاں ذہنی قسم کی ہیں جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں۔ علاوہ شاعری کرنے کے وہ فلیٹ اسٹریٹ کے ایک اخبار میں سب اڈیٹر ہے شہر میں رہتا ہے۔

آپ کی پیاری بھتیجی پری بیگم جسے عرصہ تین ماہ کا ہوا آپ پیارے لوگوں نے لغرض اعلیٰ تعلیم لندن بھیجا تھا۔ میرے بیٹے کے ساتھ مقیم ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کی ”رُوم میٹ“ یا — LIVE-IN-FRIEND

اس نے آپ لوگوں کو ظاہر ہے اسی لئے اطلاع نہیں دی کہ آپ قدامت پرست ہندوستانی اس پیاری بچی کے موجودہ سماجی و اخلاقی نظریات سے متفق نہ ہونگے۔

یہ بھی کیا حسن اتفاق ہے (جبنا سوچتا ہوں کارخانہ قدرت کے ایڈمنسٹریشن پر حیرت ہوتی ہے) کہ میرا لڑکا برٹش کونسل کے زیر اہتمام انڈیا جاتا ہے۔ لکھنؤ پہنچتا ہے آپ کو فون کرتا ہے کیونکہ ایک موڈرن ہندوستانی خاندان کے طرز رہائش کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے (کلچرل اینتھروپولوجی اور سوسیولوجی اس بچے کا کیمبرج میں مضمون تھا)۔ بطور ایک ادیب آپ کو وزٹنگ مغربی اہل قلم سے ملاقات کرنا پسند ہے۔ اسے اپنے اپنے دوت خانے پر اکثر مدعو کرتی ہیں۔ وہاں ایک طرف تو اس کی ملاقات آپ کی بھتیجی سے ہوتی ہے (خیر وہ تو آجکل کے نوجوانوں کی دنیا ہی جدا گانہ ہے اسے ہم آپ پھلی تانتی دلائے ہند سمجھ سکتے)۔ مگر جو اہم بات ہے وہ یہ کہ آپ کے ہاں ایک ڈنر کے دوران بات سے بات نکلتی ہے اور کوئی ڈاکٹر منصور صاحب اس ناچیز فدی کا تذکرہ فرماتے ہیں اور میرا نام سنکر آپ کی ہمیشہ خور دے پر واہی سے سرسری طور پر کہتی ہیں کہ وہ ہمارے کزن تھے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی اطلاع میرے متعلق صحیح نہیں تھی۔ انہوں نے سنا تھا کہ میرا انتقال یُرملال ہو گیا۔ مگر جیسا کہ اس عریضے سے ثابت ہو گا میں بفضل الہی ابھی

زندہ سلامت ہوں اور اس تھیرا اور دلچسپ جہان رنگ دلو سے کوچ کرنے کی ابھی قطعی جلدی نہیں۔

میرے نور نظر نے اس وقت آپ لوگوں پر یہ منکشف نہیں کیا کہ وہ اس ہیچمدان کا تحت جگر ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر منصور کا شعری (موصوف امریکہ کے شہر پوسٹن میں میرے معالج تھے۔ مجھے خوب یاد ہیں) اور شہوار صاحبہ نے میرے متعلق زیادہ توصیفی کلمات استعمال نہیں کئے تھے۔ اس صورت حال میں اگر وہ بے چارہ لڑکا یہ انکشاف کرتا کہ یہ دونوں اس کے والد محترم کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں تو آپ سوچ سکتی ہیں کہ اسکی میزبان شہوار خانم اور میرے سابق معالج ڈاکٹر کا شعری کو کتنی ندامت ہوتی۔ لہذا خاموش رہا پھر بھری بزم میں راز کی بات کیسے کہتا۔

اس وجہ سے بھی خاموش رہا کہ وہ بطور ایک انگریز شاعر نورمن ڈریک ہندوستان گیا تھا اور اسی نام سے یہاں اسے شہرت ملتی جا رہی ہے اپنے دو تہائی ایشین بچے کا نام میں نے بہزاد علی خان اور اسکی اینگلو انڈین ماں نے نورمن ڈریک رکھا۔ لہذا نسل پرست برطانیہ میں وہ بطور نورمن ڈریک ہی کیوں نہ مشہور ہوتا۔ جیسے شو بزنس میں نصف گجراتی کرشنا بھان جی بن گنگز لے!

نورمن نے مجھے وہ تھاویر دکھلائی جو آپکے دولت خانے پر آپ سب کے ساتھ کھینچیں۔ ان میں آپ بھی موجود ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی تھاویر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسم بائسٹی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ دیا ر مغرب میں گزارنے کے بعد اب اپنی کلچر شدت سے یاد آتی ہے اور آپ سے بڑھ کر اپنے تمدن کا دلاویز نمائندہ اور کون ہوگا۔

معاف کیجئے گا ادھی عمر پچھم میں بسر کرنے کی وجہ سے میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں نہ بات کو گھما پھر کر کہنا جانتا ہوں جو اہل مشرق کی خصوصیت ہے۔ صاف بات کرنے کا

عادی ہوں۔ میری پیاری بنتِ عم — واقعہ یہ ہے کہ جب آپ کی تصاویر دکھی ہیں اور نورمن بچے نے آپکے اخلاق اور دیگر اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا ہے اکثر آپکے متعلق سوچتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کروں۔

نورمن راوی ہے کہ شہزادہ ری بی نے جس وقت صرف ایک جملہ میرے متعلق کہا — ”ہمارے کزن تھے — ہمیشہ کے گڈ فورٹیننگ —“ اس وقت آپ وہاں موجود نہ تھیں (کچھ فاصلے پر ایک مصنوعی ان ڈور واٹر فال کے نزدیک جلوہ افروز تھیں) ممکن ہے آپ اپنی بہن کی رائے سے متفق نہ ہوں کیونکہ ہم اودھ میں اور آپ دوردراز سی پی میں۔ آپ کو میرے بارے میں یوں بھی زیادہ علم نہ ہوگا۔ باقی یہ کہ اس دو میں بھی مسلمان زمینداروں کے لڑکے عموماً گڈ فورٹیننگ ہوا کرتے تھے۔ بہر حال ناچیز کی مختصر سوانح حیات یوں ہے کہ والدین کی رحلت کے بعد شفیق تایا نے پالا۔ بڑے آبا کی وفات حسرت آیات کے کچھ عرصے بعد ہی زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ ساری عمر پیش و عشرت میں گزری تھی۔ بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بونڈز وغیرہ فروخت کر کے سسٹھ میں لاہور چلا گیا۔ وہاں ایک کاروبار شروع کیا سسٹھ میں انگلستان گیا اور اسی کاروبار کے سلسلے میں بحری جہازوں کے ذریعے سال میں دو چکر لندن نیویارک بمبئی کراچی کے لگاتار ہوا۔ اسی طرح سسٹھ میں کراچی سے لندن جا رہا تھا جب جہاز پر پاکستانی ڈانسر نورماہ خانم سے ملاقات ہوئی جو لاہور کو خیرباد کہہ کر عازم برطانیہ تھیں —

نورماہ خانم دراصل لال باغ لکھنؤ کی ایک اینگلو انڈین رقاصہ تھیں اور وہاں لال بیبیوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ نورما ڈریک کہلاتی تھیں۔ سسٹھ میں لاہور آگئی تھیں — یہ کوٹھی جو آپکے پیارے بھائیوں نے خرید کر دوبارہ تعمیر کروائی ہے دراصل انہی کی ملکیت تھی جو انکے والا مسٹر جارج نورمن ڈریک سابق بی۔ بی۔ آئی نے ایسٹ انڈین ریلوے کی کچھ رقم غبن کر کے خریدی تھی۔

نورمن ڈریک ہمارا یعنی نورما اور اس خاکسار کی آنکھوں کا تاراجو ۷۵ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا (اور بڑا ہو کر ایک غیر معمولی اٹلکچر تل ثابت ہوا) دراصل اسی کوٹھی کو دیکھنے لکھنے لگیا تھا۔ وہاں اسکی جگہ آپکا طرز جدید کا دولت خانہ دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ خاموش رہا۔

نورمن شاعر ہے اور ذہن پرست اور اسکالر۔ وہ اپنی ماں سے محبت بھی کرتا ہے اور ماں کے ادیب، اس کے طبقے اور پیشے اور کمیونٹی کے بارے میں ایک خالص کیڈٹک اور معروضی رویہ بھی رکھتا ہے اور یہ ارادہ کر رہا ہے کہ برطانوی ہند کی اس FRINGE SOCIETY یعنی یورینین فرقے اور اس کی SUB-CULTURE پر ریسرچ کرے اور کمپنی کے عہد میں بنی ہوئی تصاویر حاصل کر کے ایک کتاب شائع

میں اصل موضوع سے بہت دور چلا گیا۔ غرضیکہ عربی نژاد کی ولادت کے بعد بھی اس کی والدہ نے اور میں نے یہ ارادہ کبھی نہ کیا کہ ہم باضابطہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ کیونکہ ہم دونوں پیدائشی آزاد پرندے تھے۔ علاوہ ازیں میں اپنے نہایت منفعت بخش کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رہتا تھا (گو پاسپورٹ برٹش رکھتا ہوں)۔ نورما اپنے فائدہ مند بیوپار کی خاطر لندن میں مقیم رہی پھر ان بہنوں نے مل کر ایک الیکٹورٹ سروس قائم کر لی۔

عرصہ چار سال کا ہوتا ہے مین بوسٹن سے لندن آگیا اور اس الیکٹورٹ سروس میں اپنے وسیع تجربات اور تعلقات کی بنا پر ڈریک سسٹرز کیلئے ایک قابل قدر بزنس پارٹنر ثابت ہوا ہوں۔

میں نے یہ طویل خط پرسوں یہاں تک تحریر کیا تھا۔ کل آپکی پیاری بھتیجی پری سگیم

میں اُسے اپنی کو متن لا بہو کہنے پر حق بجانب ہوں) کسی اردو اخبار یا رسالے کا وہ ضخیم یا تصویر خصوصی نمبر لیکر آئی جو آپ کے فن و شخصیت کے بارے میں ابھی شائع ہوا ہے اور جو آپ نے اُسے بذریعہ ایمریل لکھنؤ سے ارسال کیا ہے (آپ لوگ جس پتے پر اُسے خط بھیجتے ہیں وہ نوٹرن کے فلیٹ کا پتہ نہیں ہے وہ اپنی ایک سہیلی کی معرفت اپنی ڈاک منگوا رہی ہے۔)

بہر حال وہ رسالہ میں نے رات بھر میں ختم کر لیا۔ اسکی رنگین اور مونو کروم تصاویر بلا خط کیں چند مضامین پڑھے۔ آپکی سوانح حیات کے بارے میں جو انٹرویو آپکی بہن شہوار خانم نے رسالے کو دیا ہے اس میں خاکسار کا ذکر بھی موجود ہے یعنی دو جملے مندرجہ ذیل شائع ہوئے ہیں :

”ہمارے کزن صاحبزادہ دلشا علیخان آف دھان پور نامور شکاری تھے ہماری اسٹیٹ کے جنگلوں میں انہوں نے بارہ شیر مارے (مشرودہ سو عزیز بہنو کہ بارہ شیر جو میں نے مارے سو مارے اب تیر ہویں شیرنی کا شکار کرنے عتقرب لکھنؤ آ رہا ہوں) دوسری جگہ پر شہوار بیٹا ایک سوال کے جواب میں فرماتی ہیں ”صاحبزادہ دلشا علی خان کا دھان پور اور ہمارا پردھان پور توام ریاستیں تھیں جیسے محمود آباد اور بلہرہ۔“

یہاں بی بی سے ذرا سی چوک ہوئی کیونکہ دھان پور اودھ میں تھا۔ پردھان پور اگر صوبجات متوسط میں واقع تھا تو اس جغرافیائی فاصلے کے باعث انکو توام ریاستیں نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال اہم نکتہ یہ ہے شہوار بیگم کے بیان کے مطابق میرے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے آپکے پردھان پور پولیس کو کسٹوڈین نے منقل کر دیا۔

اے عزیزہ۔ آپکی ہمیشہ کے اس بیان کی بنیاد پر میں آپکی جائیداد منقولہ وغیرہ منقولہ میں اپنا حصہ طلب کروں ؟۔ لیکن چھوڑیے جانے دیجئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ شہوار خانم نے خاکسار سے رشتے داری کا یہ سارا قصہ کیوں گھڑا۔

اسکی وجہ سمجھ سکتا ہوں کیونکہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیسا ہے اور انواع اقسام کی سنگل خوانین سے سابقہ پڑا ہے۔ شہوار خانم ضرورت سے زیادہ خیال پرست ہیں۔ بے ساختہ جھوٹ بولتی ہیں دروغ کوئی فطرت ثانیہ بن چکی ہے اور جھوٹ وہ محض تفریجاً بولتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر کا شغریٰ میرا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ اسکا انتقال ہو چکا ہے وہ بے ساختہ کہتی ہیں۔ ہمارے کزن تھے۔

سوچا ایک مکرفل شخصیت کا ذکر ہو رہا ہے اس کا پورا حال سن لیا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جسکا نہ جو رو نہ جاتا اللہ میاں سے نانا۔ سمندر پار رہتا تھا۔ کوئی عزیز اقارب نہ رکھتا تھا۔ مرحکا ہے۔ سوچا کون تفتیش کرنے جا رہا ہے۔ جھٹ اُسے اپنا کزن بنا لیا۔ بے ضرر

جھوٹ — JUST FOR THE HECK OF IT

وہی نام ذہن میں رہ گیا تھا تو رسالے کے انٹرویو میں ”کزن دلنا د علی خاں“ بطور نامور شکاری تخیل کے پٹارے میں سے کوڈ کر نکل آتے۔ اب اسہوں نے ایک نہ دو، کجلی بن میں پورے بارہ شیر مارے۔ !!

مبالغہ۔ گپ اور فیکٹس۔ یہ تین عناصر مجھے پیاری بیٹا شہوار کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں۔

منکران کو علم نہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ کزن زندہ سلامت ہیں بلکہ انکے بیٹے ہی سے وہ یہ بات کہہ رہی ہیں۔ لڑکا بے چارہ اس گپ کو صحیح سمجھا کیونکہ آپ فیوڈل لوگوں کی مجھ سے رشتے داری عین ممکن تھی۔

نہ آپکو یہ معلوم تھا کہ آپکی بھتیجی اس لڑکے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ یا پڑنے والی ہے۔

اب معاملہ یہ ہے کہ مجھ سے آپکی ”رشتے داری“ کا ذکر رسالے میں چھپ چکا ہے خود شہوار خانم کی زبانی — وہ اس بیان سے منکر نہیں ہو سکتیں اور پری سگم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اوپری فیشن پرستی اور موڈرن لازم کے ملع کے نیچے اصلیت میں

آپ لوگ کافی قدامت پسند ہیں۔ بالخصوص رشتے ناتوں کے معاملے میں۔ آپ کا منجھلا بھائی ایک بہت نیک شریف لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر آپ لوگوں نے منع کر دیا۔ محض اس لئے کہ ”اس کی ذات میں گڑبڑ تھی“ یعنی شاید اس کی ماں طوائف رہ چکی تھی۔ اب یہ حقیقت کہ آپ کی نوربصر لندن میں ایک طوائف زادے کے ساتھ رہ رہی ہے جسکی سگی خالہ باقاعدہ پکیڈی سرکس کی اسٹریٹ ڈاکر بھی تھی اور دونوں بہنیں برسوں لندن میں ایک فیشن ایبل قحبہ خانہ چلاتی رہیں جسکی آمدنی سے اس لڑکے نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی) تو یہ اطلاع آپ سب کو بیہوش کرنے کیلئے کافی ہے۔

مزید برآں پری بیگم نے یہ بھی بتایا کہ اسکی منگنی آپ لوگوں نے کانپور کے ایک قدامت پرست پابند صوم صلوة کروڑ پتی پنجابی سوداگر چمڑہ فروش خاندان میں کر دی ہے۔ عقد کی تاریخ طے ہونے والی تھی مگر پری بیگم ضد کر کے آگے پڑھنے کیلئے یہاں آگئی۔ اب قصہ یہ ہے پری بیگم کے سسرال والوں کو بھی نورمن کے متعلق اطلاع پہنچ سکتی ہے۔ چھوکر اندا کا کسی گزشتہ امیر زادی قمر چہرہ اور یوریشین گارڈنر کے طوفانی رومانس کی مثال دینے کے علاوہ پوچھتا ہے کہ چور محل اور مسٹریس کی پرانی منافقت بہتر ہے یا پیڈ کا اعلان اور اخلاقی دیانت داری۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

مندرجہ بالا کو ایف کے مد نظر اگر آپ فدوی کو سر دست مبلغ چاس ہزار پاؤنڈ جلد از جلد روانہ فرمائیں تو اس میں سب کا بھلا ہے۔ گو یہ یاد رہے کہ پری سلمہا بالغ ہے اور میرے غیر قانونی لڑکے کے ساتھ غیر قانونی طور پر رہ رہی ہے۔ مگر اس کا آپ قانونی طور پر کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس کا یہاں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیوں ہندوستان کے برعکس یہاں اس نئے لائف اسٹائل کو سماجی اجازت مل چکی ہے۔

لیکن ہندوستان میں آپ کے خاندان کی بدنامی وغیرہ کی روک تھام کے خیال سے ہی میں تجویز کرتا ہوں کہ فی الحال مبلغ چاس ہزار پاؤنڈ جو آپ کے ملک لتیاری بھائیوں کیلئے کوئی بڑی رقم نہیں۔ اسکا کاروبار منڈل ایسٹ میں بھی ہے۔ مسقط میں مقیم آپ کا چھوٹا بھائی بنک ڈرافٹ مجھے بھیج سکتا ہے۔

در نہ عین ناول کے جشن اجراء کے روز حاضر خدمت ہونگا۔ یوں بھی آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔

پس نوشت: تاش کے پتوں کا مہر فن میں کہلاتا ہوں۔ مگر تاش کے محل شہوا زانم اور آپ تعمیر کرتی ہیں۔ اَلَا مَاشَا اللہ۔

میں ہوں آپ کا دور افتادہ ابن عم
دشاد علی خان (سابق ٹکا کر صاحب آف دھان پور راج۔ اودھ)

”بلڈمی بلیک میلنگ باسٹرڈ — بد معاش کریمیل کروک — حرام الدہر —“
”شہواریہ شریف زادیوں کا طرز گفتگو ہے؟ خاموش۔“
”لندن کی پیوں سے رشتہ داری قائم ہو چکی۔ شریف زادیاں! — مینہ — اور
یہ کیسے — بلیک میلر — چار سو بیس پر فیشنل جگ لو اب آپ کا سمدھی ہے —
شریف زادیاں!!“
”شٹ اپ — قصور تمہارا — بھگتیس ہم۔“

”قصور؟ — میں نے تو محض ایک چھوٹی سی گپ ہانک دی تھی۔ مجھے کیا پتہ
تھا کہ بخت زندہ ہوگا۔ مگر آپ کی مارے انگلیچوں تل پن کے حالت خراب — مشہور ناولسٹ
جو ٹھہریں۔ وزٹنگ انگلش پوٹیک کی روز دعوتیں۔ بھتیجی کو اسکے ساتھ ڈرائیو پر دیکشا اور
چنہٹ بیج رہی ہیں۔ وہ نکلا P کا لڑکا — اور کراس بریڈ۔“

”لاؤ خط مجھے دو۔ بھئیوں کے ہاتھ لگ گیا تمہاری میری ناک چونی کاٹ کر —“
”اجی وہ کیا ناک چونی کاٹیں گے۔ وہ تو آپ کی چہیتی بھتیجی ہی نے کاٹ دی۔ کیا یہ
بات چھپنے والی ہے۔ اس روز بہت بڑھ بڑھ کر منصور کو سنا رہی تھیں۔ ہم ڈاکٹر عمر ہیں
بیگ سے نہیں ملتے — ہمارے یہاں طوائف زادیوں سے میل جول پسند نہیں
کیا جاتا — عبرت —“

بس خاموش۔ آہستہ۔ سب آواز باہر جا رہی ہے۔
 ”ہمارے یہاں کی آوازیں باہر نہیں جاتیں۔ کالے دھن سے بھٹیوں نے بہت
 ساؤنڈ پروف گھر بنوایا ہے۔“

”مگر عقل کی پتلی تمہیں سوچھی کیا تھی جو کسی اجنبی دشناؤ علی خاں کو اپنا کزن بتایا اور
 اخبار والوں کو یہ سن گھڑت سنانے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”مجھے کیا معلوم تھا کہ منصور نے غلط سنا کہ مافیاء والوں نے اُسے مار ڈالا۔ مجھے کیا
 خبر تھی کہ کجنت مرا نہیں اور یوں بلیک میل کریگا۔ کچھ بھی ضرورت نہیں تھی تم کہیں اوٹ
 پٹانگ ناول لکھتی رہتی ہو؟ ویش فل تھیننگ ہی نو کرتی ہو۔ میں بھی ویش فل تھیننگ
 کرتی ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بد معاش کو پچاس ہزار پاؤنڈ۔“

”کہیں انکو گالیاں دیے جا رہی ہو۔“
 ”اے۔ ہے۔ اُس پر فیشنل جگ لونے چار چینی چپڑی باتیں لکھ دیں۔ ریشہ خطمی
 ہو گئیں۔ اے باجی تمہاری یہ نوبت آگئی ہے کہ ایک بین الاقوامی شہرت کے کارڈ شارپر
 اور کوکین فروش نے تمہاری تعریف کر دی اور تم لہلوٹ۔ عبرت۔ عبرت۔
 میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ یہ خط ڈی۔ آئی۔ جی کے حوالے کر دوں۔ منصور اسی ڈنرو لے روز
 بتا رہے تھے کہ جب یہ بوسٹن میں تھا انکے زیر علاج۔ اس وقت بھی انٹرویو کی فہرست
 پراسکانام تھا مگر مافیاء والوں کا اُسے پروٹیکشن ملا ہوا تھا۔“

”مگر تمہارا تو یہ حال لگ رہا ہے DESPERATION کا کہ وہ یہاں پہنچا اور تمکو
 سونے کی چیز یا سمجھ کر پیغام مناکحت دیا تو اسے منظور بھی کر لوگی۔“

”وہ میرا معاملہ ہے۔ اگر وہ لڑکپن سے بُری صحبت کی وجہ سے بگڑ گئے۔
 ریس زادے بگڑ ہی جاتے ہیں۔ تو انکی اصلاح بھی کی جاسکتی ہے۔ بے چارے
 نے خود خط میں لکھا ہے کہ والدین بچپن میں مر گئے تھے۔ تنایا نے پالا۔ اصلاح بھی
 ہو سکتی ہے۔“

”پینسٹھ سالہ عادی مجرم کی اصلاح۔! اے باجی میری تم تو بالکل سٹھیا گئیں۔“

”توبہ ہے لڑکی میں تو مذاق کر رہی تھی اور تم کو کیا معلوم کہ انکی عمر پینسٹھ سال ہے؟“
 ”خود حساب لگا لو۔۔۔ لکھنا ہے بد معاش کہ پہلی بار تین سال قبل۔۔۔“
 ”انتیس۔“

”بھئی انکو ہماری بہن کو تو سارا خط ازبر ہو گیا۔ اچھا انتیس سال قبل۔۔۔ وہ انگلستان گیا تھا تو اس وقت دودھ پینا بچہ تھا منحوس؟ ارے جب ہی کم از کم بنیتیس برس کا تو رہا ہو گا۔ اور بچیا سنو تو سہی۔ یہ تم کو اس روز کیا سُوجھی جب وہ اخبارچی انٹر ویو لے رہے تھے تو اپنا سنہ پیدائش ۱۹۵۷ بتا دیا؟ انھوں نے بڑی شکل سے اپنی سنہی ضبط کی۔“

”تم نے کہہ تو دیا کہ میں وِش فل تھنگنگ کرتی ہوں۔“
 ”اے مگر کچھ خدا سے ڈرو باجی۔ تم کو سنہ پینتالیس کی پیدائش کون سمجھے گا ساری بنیا سنس رسی ہے یہ انٹر ویو پڑھ کر۔“

”کہہ دو نگی کتابت کی غلطی ہے۔ میں نے ۱۹۵۷ کہا تھا۔“
 ”۱۹۵۷۔۔۔ اے باجی ۱۹۵۷ میں تو اللہ رکھے منجھے بھیا پیدا ہوئے تھے پ تو اللہ رکھے بڑے بھیا سے بھی دو سال بڑی ہیں۔۔۔“
 ”توبہ میری تو شہرت میرے لئے عذاب جان ہو گئی۔ چلو میں ۱۹۵۷ میں پیدا ہوئی تھی لوگوں سے مطلب؟ جان کھالی ہے۔۔۔ ہاں نہیں تو۔۔۔ اور بھنو دوسری بات یہ کہ تم بھی ننھی مٹی بچی نہیں ہو۔ ڈاکٹر منصور تم سے دس پانچ سال چھوٹا ہی ہو گا بس پر تم لہلوٹ۔“

”خیر۔۔۔ وہ میرا معاملہ ہے۔ یہاں بات اس جراثیم پینٹہ ٹھگ کی ہو رہی ہے۔“
 ”تم کو کیا معلوم پروفیشنل جگ لو ہے؟“
 ”منصور ہی نے بتایا تھا۔ منصور بوسٹن ایک فیشن ایبل اسپینال میں ڈاکٹر تھے۔
 نہی دولتمند امریکہ کی سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ کنٹری کلب اور یہ اور وہ۔
 وہ بھی اُسی سوسائٹی میں گھومتا تھا۔“

”چلو خیر یہ ویمنیز لپ کا زمانہ ہے۔ اگر مرد WOMANISE کر سکتے ہیں تو عورتیں

MANISE کیوں نہیں کر سکتیں۔ اور کیوں نہ ہوں جگ لوز۔“

”سبحان اللہ باجی۔ ڈاکٹر منصور کے سامنے تو تم بڑی روایت پرست بنتی ہو اس

منافقت کی کیا ضرورت ہے؟“

”بیٹا تمہارا تو سنس اف ہیو مر بھی غائب ہو گیا۔ مگر اب پچاس ہزار پاؤنڈ۔“

”باجی جان۔ ابھی چکی بیٹھی رہو۔ منصور سے رائے لیں گے۔“

”منصور تمہاری حماقت پر ہنسے گا نہیں؟“

”پھر کیا کیا جائے؟ وہی ایک قابل اعتبار شخص ہے۔ جس سے راز کی بات کہی

جاسکتی ہے۔ فیملی ڈاکٹر تو اچھے خاصے فادر کنفیسر ہوتے ہیں۔“

”میرا تو یہ خط پڑھ کر بلڈ پرنشیر اتنا بڑھ گیا ہو گا کہ۔“

”نہیں بڑھا۔ اس راسکل نے خط کے ذریعہ ہی آپ کو مسحور کر لیا ہے۔ منصور تباہ

تھے سید دلکش شخص ہے۔ پروفیشنل چارمر۔“

”جو اس مت کرو۔ کوئی مسحور و مسحور نہیں کیا اور ڈاکٹر منصور کو فون کرو کہ کلینک سے

سیدھے یہاں آئیں۔ میرا بی۔ پی دیکھنے۔“

”دیکھ لینا۔ وہ بھی یہی رائے دینگے کہ اس خطرناک آدمی کو بالکل خط مت لکھو۔ اگنور کرو

اور اگر اس نے اخباروں میں نکلوا دیا۔ پرتی خانم کے بارے میں؟“

”اگر اُسے مزید بلیک میل کرنا ہے تو وہ اتنی جلد اپنا ٹرمپ کارڈ نہیں چلے گا۔ واہ با؟

کارڈ شارپر کی مناسبت سے کیا بات کہی ہے میں نے۔! ہونہہ۔ لکھنا۔“

راسکل کہ آپ ناش کے محل بناتی ہیں۔ شاید اس چند کو یہ معلوم نہیں کہ۔ وہ منصور

کسی مریض کا کیا نیکہ کلام سناتے ہیں۔ پیشہ۔ پیشہ۔ ہر مرض کی دوا ہے تو بڑ

بہن ہمارے پاس بھی خدا کا دیا اتنا پیشہ موجود ہے جو ناش کے گھر کو کاخ مرمر میں بد

سکتا ہے۔ ٹھہرو میں منصور کو فون کر لوں۔“

نواب بیگم کی واپسی

کلاس اودھ ہوٹل
لکھنؤ ۲۸ فروری ۱۸۸۲ء

میری بہت پیاری نورما

فرینک فرٹ سے پالم پہنچ کر لکھنؤ کیلئے انڈین ایر لائنز کا جیٹ۔ صبح کا سہانا وقت۔ تیز سرخ گرم آفتاب کا نظارہ بھول چکا تھا۔ جب اموتی کے گرد پھیلے آم کے باغات پر پہنچا۔ جی بھر آیا۔ اودیس میں رہنے والے بتا۔ اکیا امرتوں میں اب بھی بھولے پڑتے ہونگے۔ لڑکیاں گاتی ہونگی۔ اب کے ساون گھر آجا۔ اور امبواتلے ڈولار کھدے مسافر آئی۔ ساون کی پھوار۔! نورما۔ نورما۔ تم جو کبھی مرحوم جا آج کو یاد کر کے چکھو پھو روئی ہو۔ اب ہندوستان کی سرزمین پر اترتے ہوئے سمجھ میں آیا کوئی اہم پیاری قیمتی شے ہمیشہ کیلئے کھو جائے اسکا کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ ہم نے وہ پرانا ہندوستان کھویا اور اپنی معصومیت کھوئی۔ ایک بار جب آدم گریں سے گر گیا تو اب کیا غم۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ جیسے ہارڈ بوائے سخت جان آدمی بھی جذباتی ہو سکتے ہیں۔ کچھ شرم سی آئی اکیس سال بعد گھر آیا تو کس مقصد سے۔ دو احمق چھپواری اینسٹر عورتوں کو انکی بے ضرر سی سخی کی بنا پر بلیک میل کرنے۔ تبھی طیارے نے اموتی پر لینڈ کیا۔ تم مضر ہو کہ میں تم کو ہمیشہ اردو میں خط لکھوں۔ تم کہتی ہو تمہیں اس زمانے کا بہت ٹوٹلیجیا ہے جب ریلوے روڈ پر جو ملی کالج کا ایک غریب طالب علم تم کو اردو پڑھانے آتا تھا اور تم پچھوہا راج سے کٹھک سیکھتی تھیں۔ میں بھی تو اسی زمانے کی یادگار ہوں۔

جہاز نے اموسی پر لینڈ کیا اور مسافر اترنے لگے تو مجاز یاد آگئے۔ ہائے بیچارہ مجاز۔ میں نے فوراً من بجے کو ایک بار اس کے بارے میں بتلایا تو وہ کہنے لگا بلانوشی اور جو انگریز کے اعتبار سے تو یہ شاعر اردو کا ڈی لن طامس معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اسے کہاں دیکھا ہو گا کھالا نکتہ یہ تمہارے زمانے ہی میں لکھنؤ میں برا جاتا تھا اور ہمارے حلقہ احباب کو رونق بخشتا تھا۔ طیارے کی سیڑھیاں اترتے ہوتے میں بے اختیار گنگنایا۔
رخصت اے ہمسفر! شہر نگار آہی گیا۔

شہر نگار پر نگار خانم یاد آئیں جبکی ادبی تقریب میں بلائے بے درماں اور آفت ارضی و سماوی کی طرح ناگہانی نازل ہونے کیلئے بندہ یہاں وارد ہوا ہے۔ کیا سمجھیں؟ لغت دیکھ لو۔ میں اس وقت مڈ میں ہوں خوب لکھو لگا۔ میرا ہی لٹری می ٹیلینٹ چھو کرے میں آیا ہے۔ کاش میں ایک COMMON CROOK کے بجائے ادیب بنا ہوتا۔
مگر پھر تم کہاں اور ہم اور نورمن کہاں اور یہ خط کیسا۔ وہی ہونا ہے جو منظور جا

شہر نگار پہنچ کر تمہارے مکان یعنی لال بی بی والی کوٹھی گویا شہناز لالہ رخ کے کاشانے پر جانا تھا۔ جواب نگار کے بھائیوں کی ملکیت ہے۔
شہر نگار کی اقتصادیات بدلی ہوئی نظر آتی۔ طیارے سے ہمارے ساتھ چند برقعہ پوش عورتیں اور انکے شوہر بے تحاشا ولایتی سامان (مع ٹوائون) کے ساتھ اترے۔ سعودی عرب وغیرہ میں بجلی کے مستری تھے جھٹی پر آتے تھے۔ ان ان پڑھ خوشحال مستریوں کو دیکھ کر نگار خانم کے ملک التجار بھائی یاد آتے اور پھر اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کیلئے گویا کمر کسی

ایر پورٹ کے چھوٹے سے ہال میں داخل ہو کر سوچا ایر لائنیز کی کوچ یا ٹیکسی سے شہر جاؤں اور کسی ہوٹل میں قیام کا پر بندھ کروں کارٹن، برنگٹن یا راسیل۔ اگر ان تک موجود ہوتے۔ وگرنہ کہیں اور بعد ازاں نگار خانم کو فون کروں۔ مگر ٹین چار لو جو ان "جشن

لکاراں“ کے بلے لگاتے مستعد نظر آتے۔ طبّارے سے چند حضرات ایسے اترے تھے جنکو فوراً پہچان کر بڑے تپاک سے انکی جانب لپکے۔ معلوم ہوا اردو کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ واقعی لگتا ہے اس تقریب کیلئے لکار خانم کے بھائیوں نے بہت پیسہ خرچ کیا ہے۔ انکی برنس کیلئے پبلک ریلیشنز کی یہ بھی بہترین ترکیب —

جی جاہان رضا کار چھو کروں کو مطلع کروں خاکسار کو دشا دھانپوری کہتے ہیں شاعر میں شرکت کیلئے آیا ہوں۔ مگر سر دست اپنی IDENTITY مخفی رکھنا منظور تھی۔ میرے ولایتی سوٹ کیس اور بی۔ او۔ اے۔ سی کے ایئر بیگ پر رضا کاروں کی نظر پڑی۔ میں نے اپنی چارمنگ مسکراہٹ سوچے اُن کر کے ان سے پوچھا معاف کیجئے گا یہاں ٹیکسی مل جائیگی؟ بندے کو ڈی۔ اے۔ چودھری کہتے ہیں برطانیہ کی اردو انجمنوں اور اردو رسائل نے مجھے اس تقریب میں نمائندگی کے لیے بھیجا ہے۔

میرا یہ جملہ کھل جاسم سم کا اثر رکھتا تھا۔ ”برطانیہ کی اردو انجمنوں“ سے سامعین بے انتہا مرعوب نظر آتے۔ ایک نوجوان نے فوراً اسباب میرے ہاتھ سے لیا۔ دوسرے نے اردو ادیبوں سے مجھے ملوایا وہ بھی متاثر دکھلاتی دتے۔

ہم لوگ موٹر وں میں سواریے گئے۔ قافلہ شہر روانہ ہوا۔ بھینسوں کی یلغار۔ بے انتہا ٹریفک۔ حضرت گنج اور مال پر مویشیوں سے گلے۔ یاد آیا ہمارے لڑکپن میں وہاں انگریزوں کا ولیر پورسٹورں تھا۔ سی۔ سی۔ مل فوٹو گرافر کی دوکان کے آگے لکھتو ملب جہاں ہمارے چند ساتھی اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں جایا کرتے تھے پھر انڈیا ”نی ہاؤس“ کا دور آیا جو ہم طلباء کے لئے اپنے اندر ایک معصوم سارومانس رکھتا تھا۔

پیرانی ELEGANCE غائب۔ راستوں میں گوبر کے ڈھیر۔ لکھنؤ پر اب گائے بھینسوں کی حکومت ہے۔ معلوم ہوا — سابق جتناسرکار کے ایک منتری نے اپنے دوٹر گوانوں کو اجازت دے دی تھی کہ سارے لکھنؤ کو اپنا طویلہ اور چر اگاہ سمجھیں۔ در دیوار کی صورت نہ رہی وہ افسوس میں وطن میں کبھی پہنچا تو وطن یاد آیا

اس فاتیوا سٹار ہوٹل کے کمرے میں ”جشن نگاراں“ کے تجاویف میرے منتظر تھے۔ گو بن بلایا مہمان تھا۔ حسن انتظام کا معترف ہوا۔ ایک زبردست گلدرستہ، ایک نفیس ٹوکری میں سیب۔ ٹوکری کے ربن پر نگار خانم کے بھائیوں کے نینی تال والے اور چرڈ کا پتہ۔ انکی پلائی ووڈ فیکٹری میں بنی چند ہلکی پھلکی فینسی چیزوں کے ایکسیکٹ۔ یہ اشیاء دوسرے مہمانوں کے لئے بھی انکے کمروں میں رکھی ہونگی۔ ہاں۔ اور اس رسالے کا وہی نگار خانم نمبر جو لندن میں پری سیگم نے مجھے دیا تھا اور جو اس سفر کا محرک بنا رسالہ کیا۔ SOUVENIR۔ چکنے کاغذ پر ان گنت اشتہار اور دوسرے بزنس ہاؤسوں کی طرف سے ہنستی پیغامات۔ آرٹ اور انڈسٹری کا سنجوگ مغرب میں ہو چکا ہے۔ ادب اور ہائی فائی ٹیکنیکل ناں میل یہاں دیکھنے کو ملا۔

رسالے کے ساتھ دوسرا ایکسیکٹ۔ بڑھیا گفٹ سپرا اور سنہرے ربن سے بندھا۔ کاغذ کھولنا اندر سے وہ ناول برآمد ہوا جسکے ”اجرا“ کے لئے یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ عنوان پڑھ کر چونکا — ”ایکے ساون گھر آجا —“ ہم تو ساون سے پہلے ہی حاضر ہو گئے! اب دھم سے آکھوں گا صاحب سلام میرا!!

شام کو جب سورج نیچے گومتی میں ڈوب رہا تھا مندوین SUNDOWNERS کیلئے چھٹی منزل پر بار میں جمع ہوتے۔ اسی وقت دونوں میزبان بہنیں تشریف لائیں پیش قیمت ساریوں میں ملبوس — میں نے دونوں کے ایک ایک SOLITAIRE مہرے کی قیمت فوراً ذہن میں کمیٹیوٹ کی۔ ماشا اللہ۔ بندہ جیسا کہ تم جانتی ہو بفضل خدا ہر جمع میں اپنی وجاہت اور سلور گرے بالوں کی وجہ سے ممتاز نظر آتا ہے (کھنکارا)۔ دونوں میری طفر متوجہ ہوئیں۔ عرض کیا ڈی۔ اے۔ چودھری برطانیہ کی اردو انجمنوں کا نمائندہ۔ دونوں کھل اٹھیں۔ ٹھٹھکی زیادہ تیز ہے۔ اس نے باتیں کرنے کرتے دوبارہ دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اے شاید کچھ شک ہو گیا ہے۔

دوسرے روز وقت مقررہ پر نگار خانم کے موجودہ اور تمہارے سابق مکان پر پہنچے تو شادی کا سامنظر نظر آیا۔ بینڈ باجے کی کسر تھی۔ عمارت اور سارے درخت برقی قمقموں سے فروزاں۔ شامیانے کے نیچے بڑھیا قالین اور صوفے۔ شاندار اسٹیج۔ پہلو میں ”پریس“ کی طویل میز پر صحافیوں کی قطار۔ مقامی ٹیلی ویژن کیمرا ذاتی ویڈیو کیمرا۔ ہر چیز تیار۔ شہر کی سوسائٹی کے کریم یعنی بالائی طبقے کی بالائی آکر صوفوں پر جمی۔ آرک لائٹس اور فلیش بلبوں کی چکاچوند میں مصنفہ (اُنکے ساون گھر آجا) کی مناسبت سے دھانی غرار سے کا جوڑا اہمان خصوصی کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لائیں۔ بڑھیا شیروانی اور چوڑی دار پانجامے میں ملبوس دونوں بھائی (ان دونوں سے میری ملاقات اب تک نہ ہوئی تھی) اور شہوار خانم (پڑا قے کی گوٹ کا عزارہ) ہمراہ — وہ سب اسٹیج پر پہنچے۔ مجھے ڈائیس کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھا لایا گیا تھا۔ میرے برابر جو صاحب بر اجمان تھے وہ ڈاکٹر منصور کا شغری نکلے۔ چھ سال قبل بوسٹن میں میرے معالج تھے۔ انھیں حضرت نے میرا تذکرہ شہوار خانم سے کیا تھا — جسکی بنا پر میں اپنے نامناسب مقاصد کی تکمیل کیلئے یہاں موجود ہوں — ایک اردو ادیب نے جو میرے دائیں جانب تشریف رکھتے تھے میرا تعارف ڈاکٹر سے کرایا۔ ”مسٹر ڈی۔ اے چودھری۔ برطانوی ڈپٹی گیٹ“

ڈاکٹر نے ابرو اٹھا کر مجھے دیکھا۔ خفیف سی حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ وہ بھی ایک گھاگ ہے۔ بولا ”چودھری صاحب آپ سنہ پچھتر میں امریکہ میں تشریف رکھتے تھے؟“ عرض کی ”اشتقاق بہت ہے لیکن آج تک اس حیرت انگیز ملک کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا۔ لندن میں رہتے ہوئے بس اتنا ضرور سنا ہے کہ پارلیمنٹ ہے ویس سنہرا۔“

”جی۔ اور قدم قدم پر آتش اپنا روپ انوپ دکھاتی ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا —

انکا فقرہ نظر انداز کر کے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”اردو کا عاشق ہوں شعر بھی کہتا ہوں۔ قوم کا جاٹ ہوں۔ لہذا سر پہ کھاٹ رکھ کر قیمت آزمائی کے لئے انگلستان چلا گیا تھا۔ برطانیہ کی کئی اردو انجمنوں کا فعال ممبر ہوں۔ انھوں نے چند کمالیہ یہاں بھیج دیا۔ حالانکہ مدعو نہ کیا گیا تھا۔ سوچا وطن عزیز کے درشن کا اچھا موقع ہے۔ سو اگیا۔

چودھری دھیان سنگھ بندے کا نام ہے۔ آرزو تخلص۔ اسی لئے ڈی۔ اے چودھری کہلاتا ہوں۔
 ڈاکٹر نے توصیفاً سر بلایا۔ گویا میری فنکاری کے قائل ہو چکے ہوں اپنے برابر بیٹھی دو
 خواتین کو مخاطب کیا ”مسز بیگ۔ عنبر۔ چودھری دھیان سنگھ“ پھر مجھ سے کہا ”مسز بیگ۔
 ڈاکٹر بیگ“

میں نے اخلاق سے انکو نمکار کیا۔ فوراً پہچان گیا۔ یاد ہے وہ دو ماں بیٹیاں
 جو کوئٹہ جہاز پر ٹورسٹ کلاس میں تنہا رہی ہم سفر تھیں۔ اڈنبرا جا رہی تھیں سنہ پچیس
 میں۔ مسز بیگ کا سر سفید ہو چکا ہے گو چہرے پر اب بھی رونق ہے۔ اتنی عمر رسیدہ نہیں لگتیں
 شہر سے کیا کم ہونگی۔ لڑکی اس وقت کم سن چھو کری تھی اب ایک باوقار خاتون۔ ماں کے
 برعکس کافی کم رو۔ ان دونوں نے بھی مجھے ذرا غور سے دیکھا۔

ابھی تقریب کی کاروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ شہوار خانم مہمانوں کی دیکھ بھال
 کرتی ہماری جانب آئیں۔ میں نے فوراً بھانپ لیا کہ ڈاکٹر عنبر بیگ اور صاحبزادی
 شہوار خانم کے درمیان برف کے پہاڑ حائل ہیں۔ کارن : ڈاکٹر منصور کا شغری۔
 آہ۔! یہ ابدی مثلث —!!

اب چند رضا کاروں نے (مجھے بعد معلوم ہوا کہ وہ سب نگار خانم کے بھائیوں کے
 دفاتر اور کارخانوں میں ملازم تھے) چکر لگا کر حاضرین جلسہ کو اسی گھنٹہ پیر اور بن میں
 بندھا رسالے کا خصوصی نمبر اور تازہ ناول کی ایک ایک جلد پیش کی گلاب کے عظیم المجتہ باد
 ڈائیں کی میز پر رکھے تھے۔

مدیر رسالہ ایڈج پر بلائے گئے۔ ناظم جلسہ نے مائیکروفون پر یہ بھی اعلان کیا کہ
 برطانیہ کی اردو انجمنوں اور اردو رسالوں نے خاص طور پر اپنے نمائندے مسٹر ڈی۔
 اے چودھری کو لندن سے بھیجا ہے۔ اس اطلاع پر خوب تالیاں بجیں۔ ڈاکٹر منصور
 کا شغری نے پہلو بدل کر دوسرا سگریٹ سلگا با۔
 لمبی لمبی تقریریں شروع ہوئیں۔

منسٹر کا بھاشن اردو اشعار سے پُر۔ یو۔ پی گورنمنٹ فروغ اردو کیلئے جو کچھ کر رہی ہے — (کیا کر رہی ہے؟ مجمع میں بھنبھناہٹ)۔ نگار صاحبہ کی ادبی خدمات وغیرہ کا ذکر۔ انہی کی کتاب انکو پیش کی۔ مصافحہ۔ مصنفہ کی گلبونشی۔ تصویریں۔
تالیاں۔ مزید تقریریں۔

باپ رے۔ اہل ہند کو ابھی تک مرضِ تقریر سے افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ اب تو یہ مارضہ لاعلاج معلوم ہوتا ہے۔

اے میری پیاری نور ماڈریک عرف نرملا دیوی عرف نور ماہ خاتم — تم نے اور میں نے اپنی رنگارنگ اور مختلف النوع مصروفیات سے پُر زندگی میں بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ لیکن اب ایک ایسا واقعہ پیش آیا عجیب و غریب اور BIZZARE جیسے یاد کر کے مجھ جیسے پُر آنے پانی کے روٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے بڑے باپ — مرحوم چودھری جو اعلیٰ خان آف دھان پور کہا کرتے تھے بیٹا اللہ تعالیٰ ہر سزا دے مہربان زارِ رسوا نہ کرے —

اب جو واردات ہوئی اس کے مقابلے میں میری اسکیم گویا بچوں کا کھیل تھی جو میں نے ملتوی بلکہ منسوخ کر دی۔

خصوصی نمبر کے مدیر کی تقریر جاری تھی۔ جب تین نفر پنڈال میں داخل ہوئے۔ ایک سوٹ بوٹ میں۔ دورا جتھانی یگڑ مار واڑی انگر کھے دھونی پوش (ایک بوڑھا ایک فان) ان میں سے ایک نے ایک بڑا سا فوٹو گراف کوئی ۲۱ × ۳۱ سائز کا بادامی کاغذ میں لپٹا اٹھا رکھا تھا۔ وہ تینوں تصویر سمیت اسٹیج کے سامنے پہنچے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا راجتھانی فوک آرٹسٹ۔ شام کے کلچرل پروگرام میں گائیں گے کسی نے ڈا با سرگوشی کی نہیں کوئی فوٹو گراف مصنفہ کی تصویر پیش کرنے حاضر ہوا ہے۔

وہ تینوں مع تصویر کھٹ کھٹ کرتے اسٹیج پر چڑھ گئے۔ اڈیٹر صاحب نے مائیک

پر کہا۔ ”خواتین و حضرات۔۔۔ یہ ہمارے مشہور آرٹسٹ۔۔۔ آپکا اسم گرامی۔۔۔“
 ”محمد شرف الدین۔ اور یہ دونوں شہری کنوڑیا اینڈ سن۔۔۔ جے پور“ کوٹ پتلون
 والے نے جواب دیا۔ اور تصویر کو میز پر کھڑا کر کے اس کا با دائمی کاغذ اٹا مارا۔ اندر سے وہ
 رنگین پورٹریٹ برآمد ہوا جس کے مختصر کمیو کا بلاک بعنوان ”ہر بانی نس دی نواب بیگم
 صاحبہ آف پردھان پور“ نگار خانم نمبر میں شائع ہوا تھا۔

بڑی شاندار تصویر تھی۔ ایک حسین مہ جبین بیگم صاحبہ مغلیہ لباس اور زیورات
 میں سچی نمکنت جلوہ افروز۔ حاضرین جلسہ نے بے ساختہ کلمات تحسین ادا کئے اور اپنے
 اپنے خصوصی نمبر کا وہ ورق کھولا جس میں اس کا کمیو شائع ہوا تھا۔ سارے شامیانے میں
 ایک ساتھ ورق گردانی کی آواز بلند ہوئی۔

اڈیٹر صاحب نے مائیک پر آکر کہا ”جناب صدر۔ لیڈ بڑا اینڈ جٹلمین۔ یہ میرے
 دو معزز راجستھانی دوست ہیں۔ جے پور میں انکے یہاں محترمہ نگار صاحبہ کی گریڈ مدر کی
 یہ تصویر موجود تھی جو چند نگر کے ایک فرنیچر فوٹو گرافر موسیو آندے رینال نے ۱۹۱۱ء میں
 کھینچی تھی بڑا نادرو فوٹو گراف ہے اُسے ہمارے متر شہری گوڈوہن داس رنچھوڑ مل کنوڑیا
 اس مبارک موقع پر مصنفہ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے جے پور سے تشریف لاتے ہیں۔“
 دونوں بہنیں متحیر اور کنفیوزڈ نظر آئیں۔ لیکن نگار خانم نے فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا
 ”میں آپکی مشکور ہوں۔ ہم کو فودعر سے اس کمیو کے اور کجیل کی تلاش تھی۔ آپ کو علیا حضرت
 دادی جان مرحومہ کے اس پورٹریٹ کی منہہ مانگی قیمت دی جائیگی۔“
 ”منہہ مانگی قیمت؟“ بوڑھے مارواڑی نے آنکھیں پھاڑ کر دہرایا۔ اسکی باجھیں
 کھل گئیں۔

”بیٹھ جی۔ یہ پرانے رساں ہیں۔ آپ تو خود جے پور والے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ
 ختم ہو گئیں مگر ان کے وارثوں کی دریا دلی اور آن بان تو باقی ہے۔“ مدیر رسالہ
 ارشاد کیا۔

اب نور ما ڈیر مجھے دو مختلف ردِ عمل نظر آتے۔ نگار خانم کے دونوں بھائی ڈاکس پر موجود ہنگامہ کبھی اس تصویر کو دیکھتے کبھی اپنی بہنوں کو اور کبھی تینوں اجنبیوں کو۔ ادھر میرے نزدیک بیٹھی مسز بیگ یعنی ڈاکٹر عنبر بیگ کی والدہ مہوت دھوڑاں پورٹریٹ کو تنکے جا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے سرگوشی میں ڈاکٹر کا شغری اور عنبریں کو مخاطب کیا: ”آج میں نے مدتوں بعد کسی اور کی زبان سے آندرے رینال کا نام سنا ہے۔“

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس اثناء میں اسٹیج پر ہنگامہ بپا ہو چکا تھا۔ ہویوں کہ نگار خانم نے شیریں اور ممنون آواز میں نوجوان مارواڑی سے دریافت کیا ”اپکو یہ فوٹو کون کہاں سے ملا۔؟“

اس نے جواب دیا ”تمہاری دادی نواب بائی جب جے پور میں تھیں تب ہی کھینچا تھا۔ بٹھا کر مہینوں رنگہ کی گڑھی پہ۔ یہ ہمارے سیکنڈ ہاشی داداجی کے پاس رکھوا دیا تھا۔ یہ تو ہمیں اس اردو پیریکا میں چھپی اس کی کاپی سے جان پڑا کہ نواب بائی۔“
 ”کون نواب بائی؟ کیسی نواب بائی؟ کیا بکتا ہے پاجی۔ مردود۔۔۔ بد معاش۔“
 نگار خانم کے بڑے بھائی نے اچانک آگ بگولہ ہو کر مارواڑی کو ایک زوردار جھانپڑ سید کیا۔ ظاہر تھا کہ انھوں نے اپنے عزیز بہن کے بارے میں نہ وہ خصوصی نمبر پڑھا تھا نہ اس میں چھپی تصویر ملا خط کی تھی۔ حاضرین جلسہ کو سانپ سونگھ گیا۔ سب دم بخود اسٹیج کو تک رہے تھے کہ دیکھتے اب غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

جوان مارواڑی تھپڑ کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ بگڑی سنبھال کر بولا: ”اجی ہمارے کو مارے کیوں چھو۔ چلو نواس کے اندر چل کر بات کر لو۔ یا کارن تو آتے ہیں جے پور سے۔“
 شرف الدین صاحب نے فرمایا: ”حضرت یہاں تماشہ نہ بنا یہ اندر چلتے ہیں۔“

دونوں بھائیوں نے اپنی بہنوں کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اگر وہ حیا دار ہوتیں پٹ سے گر کر جاں بحق تسلیم ہو جاتیں۔ انکے رنگ فق برقی گم۔ شرف الدین صاحب نے تصویر اٹھائی۔

اسٹیج سے اترے۔ دونوں مارواڑی اترنے لگے۔ تو ایک کاپادوں مائیک کے تاروں سے الجھ گیا۔ منسٹر صاحب بھی اپنے حوالی موابیوں کیساتھ فی الفور پھاٹک کی طرف سرک لے۔ مدبر رسالہ نے مائیک پر آکر آواز دی: ”بطیموس صاحب پفناٹوس صاحب اسٹیج پر تشریف لائیں۔“

ایک منخرے سے کیر بیٹرنے جنکا شاید قلمی نام بطیموس یا پفناٹوس تھا فوراً مائیک پر پہنچ کر اناؤنس کیا: ”خواتین و حضرات۔ ایسا لگتا ہے کہ محترمہ نگار خانم کی مقبولیت اور سماجی حیثیت کی وجہ سے انکو بلیک میل کرنا بہت آسان ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس وقت بھی نہایت کمریہ قسم کی افتر پردازی اور بلیک میل کی کوشش کی جا رہی ہے۔ موجودہ صورت حال میں جلسہ جاری رکھنا ممکن نہیں۔ کل شب مشاعرہ اور پرسوں شام افسانہ پروگرام کے مطابق منعقد کی جائیگی۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ افتتاحی جلسہ برخاست کرنا پڑ رہا ہے۔ آج رات ساڑھے نو بجے کلارکس ادوٹیں پروگرام کے مطابق ڈنر ہوگا وہاں تشریف لائیے۔ شکریہ۔“

اب پفناٹوس (یا بطیموس) صاحب اچک کر ڈائیں پر آئے اور اناؤنس کیا: ”ڈنر بھی کینسل۔ نگار صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر منصور۔ ڈاکٹر منصور کاشغری۔ جہاں ہوں مہربانی فرما کر ائبشار والے کمرے میں تشریف لے جائیں۔“

ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ آہستہ سے مجھ سے کہا: ”ماجرادہ صاحب۔ میں سمجھتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ اندر تشریف لے چلیں آپ بخوبی فوراً پہچان لیں گے۔ آیا یہ بلیک میل ہے یا اصلیت۔“

منسٹر بگ چپکے سے بولیں ”ارے بیٹا مگر تم کو تو پورا قصہ معلوم ہے۔“

ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا ”بگیم صاحبہ آپ دونوں اب گھر جاتیے۔“

”توبہ ہے۔ آج یہاں ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ گھر پہ کھانا بھی نہیں پکوا یا۔“ دونوں ماں بیٹیاں اٹھ کر جمع میں کھو گئیں۔

تمہاری پرانی کوٹھی کا محض موٹر خانہ اور شاگردِ پیشہ باقی ہے۔ وہ پابجولاں دیوانہ رقص اسبٹرف جاتا نظر آیا۔ شامیانے میں بڑھتیناک سناٹا طاری تھا۔ ڈاکٹر کا شعری اور میں مکان کی سمت روانہ ہوئے۔ کچھ دیر قبل پرستی محل میں جشن منایا جا رہا تھا اب یہاں موت کی ایسی خاموشی طاری تھی۔ سب بھونچے۔ حیران پریشان۔ بہت سے زیر لب مہتمم۔ کچھ رنجیدہ اور شرمسار۔ عجیب و غریب منظر تھا۔

ڈاکٹر کا شعری کی قیادت میں گیلری سے گذرتا ایک والٹ ڈزنی کی فٹسی نمائندہ میں داخل ہوا۔ سامنے کی دیوار سے مصنوعی جھرنگر رہا تھا۔ وسط میں رنگین فوارہ ایک کونے میں مصنوعی درخت پر مکینکل چڑیاں چھپا رہی تھیں۔ میں اس مجنوں ڈانس کو بھول کر اس نئے عجوبے کی سیر میں محو ہو گیا۔ ڈزنی لینڈ غلط کہا۔ یہ تھان متی کا بڑا سا پٹارا تھا جس کے اندر میں نے دفعتاً اپنے آپ کو موجود پایا۔

العجب! پرانے شہری روضاء اور قصباتی زمیندار اپنی نفاست اور خوش ذوقی کے لئے مشہور تھے۔ ہم دھان پور والے بہت زیادہ دولت مند تھے لیکن جاپلنگ روڈ پر بڑے آبا کی کوٹھی کس خوش ذوقی کی آئینہ دار تھی۔ مگر ان سابق جاگیرداروں نے تو بیہودہ ٹیسٹ کی حد کر رکھی تھی۔

پہاڑی نمائینٹل میس پر قبیلہ دادی جان کا کیسور کھانا نظر آیا۔ سامنے سائبروکیٹ کے صوفوں پر مسٹر شرف الدین، دونوں مارواڑی، صاحبانِ خانہ اور انکی دونوں مسائل خیر بہنیں فروکش تھیں۔ ہمارے پہونچنے کے بعد دروازے اندر سے بند کر دئے گئے۔ بہنوں نے چونک کر مجھے دیکھا گویا کہتی ہوں یک نہ شد دوشد۔ میں نے بر جستگی سے کہا: ”میں لندن میں بیسٹر ہوں۔ اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب مجھے بھی ساتھ لیتے آئے۔ اب بتائیے پورا معاملہ۔“ آپکو اس طرح یہاں پہنچ کر اس معزز خاندان کی بے عزتی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے محسوس کیا کہ نگار و شہوار

نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا جو وہ مجھے سمجھیں تھیں وہ میں نہیں تھا
 ”بے اجتی؟ بالشر صاحب؟“ چھوٹے کنوڑیا نے جواب دیا ”ہم نے کوئی بُری
 بات نہیں کہی۔ بڑے بڑے بادشاہوں مہاراجوں نوابوں نے نرنکیوں سے بیاہ کئے۔
 اگر سُنہری نگار کھانم کے پوچھیہ داداجی نے بھی نواب بانی جے پور والی کو اپنی بیعت
 بنایا تھا تو اس میں بے اجتی کیا ہوئی؟ ہم تو ایک اور کام سے آتے تھے اور اسکی چرچا
 پنڈال میں تھوڑا ہی کرتے۔ وہاں تو ہم کیوں یہ پھوٹو پر سنت کرنے آئے تھے۔ وکیل صاحب
 اب آپ بولو۔“

شرف الدین صاحب نے بریف کیس سے دو عدد قانونی دستاویزیں برآمد کیں۔
 انکو کافی ٹیبل پر پھیلایا۔ میں نے نگاہ ڈالی۔ پرانی جے پور اسٹیٹ کے اسٹامپ سپر
 اردو خط شکست میں مرقوم: —

منکہ مسماۃ نواب بیگم جے پور والی، قوم کھننی۔ عمر جو تینیس برس۔ بالغ، اقرار کرتی ہوں
 کہ مبلغ — آگے پڑھانہ گیا۔ خط شکست پڑھنا آسان نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ لوگ باہر
 کان لگاتے کھڑے ہیں۔ وکیل صاحب سگار سلگا کر بولے — ”دیکھتے صاحبان۔ شہری
 گوردھن داس رنجپور مل کنوڑیا اور انکے پتر شہری جے رام داس کنوڑیا میسر موکل ہیں۔
 انکا کیس مختصر ایہ ہے کہ شہری گوردھن داس کے والد سورگباشی گردھاری لال کنوڑیا
 جو سہری بازار جے پور کے مہاجن اور نواب بانی چاند پول بازار جے پور کی نامی گائیکہ اور نرنکی
 تھیں جنکالین دین شہری کنوڑیا سے رہتا تھا۔ نواب بیگم عرف نواب بانی بہت خراج تھیں۔
 اسوجہ سے مقروض رہتی تھیں رام گنج بازار میں ایک جوہلی سنگ منرخ کی کاٹھیا واڈ کے کسی
 دربار صاحب نے انکو عنایت کی تھی۔ اس کے علاوہ کثیر زیورات طلائی اور جڑوا کی مالک
 تھیں۔ مگر زرقند کی ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ جس زمانے میں وہ ایک تباہ حال جاگیر دار ٹھاکر
 مہیشور سنگھ جی کی ملازم تھیں انہوں نے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں پچاس اور چالیس ہزار
 روپے میں جوہلی رہن رکھی۔ دوسری بار جب وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھیں — شرائط

میں یہ بھی مرقوم تھا کہ مدتِ معینہ کے اندر رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں انکی موت کے بعد اصل مع سود در سود انکے وارثان ادا کریں گے۔

”اس دوسرے اسٹامپ پیپر پر وکیل اور گواہوں کے دستخط کے بعد نواب بیگم نے سیٹھ گردھاری لال سے کہا کہ وہ ان کے فوٹو گراف کو بھی جو ایک یورپین فوٹو گرافرنے کھینچا تھا۔ ساتھ لے جاویں اور اسکے نمایاں شان فریم بنوادیں۔ سیٹھ جی وہ تصویر اپنے ساتھ گھر لے آئے“

”اب بالشر صاحب۔ پن مہاری سنو۔“ بوڑھے مارواڑی نے بات کاٹی۔ ”مہارے باپو جی جو تھے وہ اپنے سارے کالج بتر اپنی تجوری میں رکھیں تھے۔ وہ دن گھرا کر وہ تجوری کھولنے سے پہلے انکی طبیعت کھراب ہو گئی۔ دونوں اسٹامپ پیپر پھملا والا اور یہ دوسرا والا اکھٹے ایک لفافے میں رکھے تھے۔ سوچا ہوگا ابھی یہ لفافہ پھوٹو کے اندر کھسکا دو۔ بھوجن کر کے آرام سے تہہ کھانے میں جائے پانچھ تجوری کھول لینٹری۔“

”تو مہاراسنو۔ انہوں نے پھوٹو گراف کا ٹمپر واری فریم کھول کر کالج اسکی دفنی کے اندر سرکا دینیتے اور کھوکھے واپس جڑ کر چوکے میں جا براجے۔ پیٹ میں اٹھا جو رسکا درد۔ وہیں چٹ پٹ ہو گئے“

”کیا ہو گئے۔؟“ شہوار خانم نے پوچھا۔

”اجی مر گئے۔ دیہانت ہو گئے۔ بیکنٹھ سدھارے مہارے باپو جی۔ واسے میں انکا اکھوتا چھو راجھ مہینے کا تھا۔ میرے چاچا مرنی دھرجی نے بیکانیر سے آکر گادی سنبھالی۔ واقوٹو کسی جا کرنے اٹھا لینٹری۔ اور گودام میں رکھ دینٹری۔ پانچھ گھر کے لوگ رورا کے کیا کرم میں لگ گئے۔ اب مہارے کو بتاؤ۔ چاچا جی تو کچھ نہ جانیں۔ نواب بیگم سے کس پرکار نکاجا کرتے؟“

”داکوڑے چھی؟“ بیٹے نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

”جی۔؟“ میں نے پوچھا۔

”انکا مطلب ہے وہ تھیں کہاں۔“ شرف الدین صاحب نے ترجمانی کی۔
 ”ہاں ہاں وہ تھی کہاں راتوں رات اڑ پھو ہو گئی۔“
 ”کہاں۔۔۔“ میں نے پوچھا۔

”بھگوان جانیں کہاں۔ ادھر مہارے چاچا جی کو جب منیم جی اور وکیل صاحبے
 رہن کی بات معلوم پڑی۔ سارا گھر چھان ڈالا وہ کالج پتر نہ ملے۔ ملتے کیسے وہ تو فوٹو کے
 پیچھے رکھے تھے اور فوٹو ہماری چاچی جی نے گودام میں ڈال دی تھی۔ گودام کے سامان
 پر وہ کبجا کرنا چاہیں تھیں۔ دامیں تلف ڈال کر تالی اپنی موٹی کمر میں لٹکائے پھرتی تھیں۔
 بوڑھے مارواڑی نے جواب دیا۔ ”ادھر صاحب نواب بانی بھاگ گئی۔ اپنا سامان بیچ
 باج کر شان آیا اور چھو کمری کو لیکر نو دو گیارہ۔ جویلی چھانڑ گئی۔ اسکو بولی نیلام کرا کے رقم
 وصول لیتے پن وہ کالج کہاں تھے؟ انکی نکل باپو جی محافظ کھانے میں جمع نہیں کروا پائے
 تھے۔ کس برتے پر وارنٹ نکلو اتے؟ مہارے پاس تو ثبوت ہی کو نٹری چھا؟ بھاگ
 پھوٹ گئے مہارے۔ ایک لاکھ روپیہ واجمانے کا اور بیاج واکا بیاج۔ سوچو کتنی
 تنگدستی رقم تھی۔“

”نواب بانی کا کچھ پتہ نہیں چلا؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”صاحب وہ راجپوتانہ کو نہ آئی۔ ما پھ پھر مایسے نواب صاحب آپکی پوجیہ دادی جی
 لوٹ ہی کے نہ آئیں۔“
 ”خاموش مردود۔ اگر کسی گانے والی کو میری دادی جان کہا زبان گدھی سے کھینچ
 لوں گا۔“ نگار کے بڑے بھائی نے پھر بھٹنا کر جواب دیا۔
 ”سرکار لگتی آپ کے دادا جی کی ہے۔ ڈانٹ آپ مجھے رہے ہو۔ پھر یہ کہ جو بندھ گیا
 سو موٹی۔ اب کا ہے کا گتہ۔ پرانی بات ہو گئی۔ آخر کو آپکی دادی تھی۔ آپ انکی سننان ہو۔
 انکے نام کا پھاتھ درود کرواتے ہو گے۔“
 بڑے بھیا اٹھکر بوڑھے مارواڑی کی ٹھکانی کرنا چاہتے تھے میں نے اور ڈاکٹر

منصور نے پکڑ کر واپس بٹھایا۔ بڈھا مارواڑی بوتارہا — ”مہارے کو ستر سال بعد — وکیل صاحب — اب آگے تم بولو —“

”دیکھئے ایسا ہے — شرف الدین صاحب نے دوبارہ بات شروع کی —“ چندرہ قبل کا ذکر ہے میں راجستھان اردو اکیڈمی کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ تازہ روز محترمہ نگار خاتم صاحبہ کے بارے میں خاص نمبر میگزین پر پڑا دیکھا۔ اٹھا کر ورق گرداؤ شروع کی۔ میں کنوڑیا اینڈ سنز کا قانونی مشیر ہوں۔ نواب بانی کا فرار اور اسٹامپ بیمہ کی گمشدگی انکے ہاں ایک فیملی لیجنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان بے چاروں کا المیہ یہ ہے کہ روایتی پونجی پتی مارواڑیوں کے برعکس یہ لوگ خاصے مفلوک الحال ہیں۔ انکے گھرانے کا زوال انکے والد گردھاری لال کے اچانک موت کے بعد ہی شروع ہو گیا۔ انکے چچ

بھی انکو چوٹا لگا گئے۔ بہر حال تو IRONY یہ ہونی کہ آج سے کوئی پندرہ سال قبل جے رام داس جی نے اپنے چچا زاد بھائیوں سے مقدمہ بازی کے بعد وہ کبھی حاصل اور گودام کھولا تو سارا قیمتی سامان تو انکی چچی غائب کر چکی تھیں۔ کاٹ کباڑ کے علاوہ یہ فوٹو گراف برآمد ہوا۔ فرہیم اور پچھلی دفنی سٹرگل گئی تھی تصویر شیشے اور دوسری دفنی کے درمیان محفوظ تھی۔ جب انھوں نے اسے اٹھایا تو بوسیدہ دفنی کھٹ سے گر پڑی اور یہ اسٹامپ بیمہ برآمد ہوتے نواب بیگم والے جو پیش خدمت ہیں — جب سے یہ لوگ سرگرداں ہیں کہ نواب بانی کے وارثوں کو تلاش کریں۔ انکی جوہلی پر قبضہ مخالفانہ ہو چکا تھا۔ اسیں عرصے سے بندھنی کی چھپائی کا ایک کارخانہ قائم ہے۔ بہر حال تو یہ لوگ صبر کر کے بیٹھ رہے — اب جو میں نے ریڈنگ روم میں اس رسالے کے ورژن اُٹے تو یہ تصویر مختصر کیس کی صورت میں اس کے اندر موجود مع اس CAPTION کے — ملاحظہ کیجئے — بہر بانی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور — میں فوراً کنوڑیا اینڈ سنز کے ہاں جوہری بازار پہنچا —“

”وکیل صاحب بھائے ہوئے آئے بولے سیٹھ جی جیت لی پالی — نواب بانی

گئیں۔۔۔ اچی وکیل صاحب کیسے مل گئیں۔ ۱۹۱۲ء میں پچیس سال کی تھیں تو یا ایک سو چار سالہ بڑھیا کوڑے چھٹی تھی؟ انہوں نے پتیریکا دکھلائی۔ بولے یا جو یہاں سے بھاگی سو اس نے سی۔ پی کی کسی ریاست پر دھان پور کے نواب سے بیاہ کر لیا۔ تو اب یا بات صاچہ ہو گئی۔ نواب سے بیاہ رچانے کے بعد پردے میں بیٹھ گئی ہوگی ہر بانی نس بیگم صاحبہ بن کے۔ اب واکو تو کیسے چلے پھر مر گئی ہوگی۔ اس پتیریکا سے جان پڑا کہ اس کی پوتی۔۔۔ ماچھ کرنا۔۔۔ انکی پوتی مہان لیکھا ہیں۔ وچتر اپنیاس لکھتی ہیں۔ پھلاں پھلان دیوس کو لکھنؤ میں انکے پچاسویں اپنیاس کا اود گھاٹن ہونے جا رہا ہے۔ انکے بھائی بڑے بھاری پونجی تہی ہیں۔ وکیل صاحب بولے۔۔۔ چلو سیٹھ جی یہ پھوٹو پھریم کروا کے لکھنؤ لے چلیں۔ انکو پریجنٹ کریں گے۔ ایک ہتیار روپیہ ہم نے لگایا۔ نیا پھریم۔ جے پور سے لکھنؤ ذیل کا بھارا۔ یہاں ہوٹل کا کھر جاسوا لگ۔ اب آپ انصا پھ کرو۔ آپ سب شریمان جی کمار جی۔ ۱۹۱۲ء سے لیکر آج تک آپکی دادی جی کے کارن ہم گھاٹے ہی گھاٹے میں رہے ہیں کہ نہیں؟ پھر آج سب کے سامنے مار بھی کھائی۔ قصور تھارو دادی جی کا چھو کہ ہمارو؟“

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ منصور بھی مسکرا ہٹ ضبط کر کے مصنوعی جھرنے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دونوں بھائی غصے سے لال پیلے بیٹھے کھولا کیے۔

”نواب آپ کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 مسٹر شرف الدین بولے۔۔۔ ”صاحب آپ لندن میں بار پریکٹس کرتے ہیں (میں زیر لب مسکرایا۔ منصور نے بھی سراٹھا کر ہچت کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اب یہ اچھا خاصہ FARCE ہو رہا تھا) میں ٹھیرا محض جے پور کا ایڈوکیٹ۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہونگے کہ اس معاملے کے قانونی پہلو کے علاوہ ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔“
 ”نواب بانی کا اخلاقیات سے کیا تعلق تھا۔۔۔؟“ میں نے سوال کیا۔

”نواب بائی کے پوتے پوتیوں کا تو ہے۔ اصل رقم مح سود در سود ستر سال میں کتنی بنتی ہے؟ وہ کمپیوٹر بتا دیگا۔ مگر اخلاقی طور پر۔“

اب دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے بھائی نے پتے کی طرح لرزرتے ہوئے گرج کر کہا۔ ”آپ سب کان کھول کر سن لیجئے۔ یہ سارا قصہ جو رسالے میں چھپا ہے شروع سے اخیر تک سراسر سفید جھوٹ اور میری مجبوظ الحواس بہنوں کے خالتو زرخیز تخیل کی پیداوار بلکہ اس ہے غور سے سن لیجئے۔ ہم کسی نواب پردھان پور کی اولاد نہیں ہیں۔ اس نام کی کوئی ریاست موجود نہیں تھی۔ نہ کسی نواب بائی نے کسی نواب پردھان پور سے شادی کی تھی۔ یا اگر کوئی پردھان پور ہندوستان کے نقشے پر موجود تھا یا ہے تو ہم اس سے واقف نہیں۔ ہم معمولی مدل کلاس شریف لوگ بھانسی سے یہاں آئے۔ برنس شروع کی اس میں فائدہ ہوا۔ ہماری عزیز بہنوں کو اسٹوڈنٹ کھلانے کا شوق چرایا۔ نام کیسا تھکا جڑا دی لکھنا شروع کیا۔ یہاں اونچے طبقے کے نئے حلقہ احباب میں مشہور کیا کہ ہم بڑے زمیندار تھے۔ جاگیروں کی ضبطی کے بعد یہاں آگئے۔ میں خاموش رہا رتیں زادی بننا چاہتی ہیں۔ اونچے طبقہ داروں اور سابق تعلقداروں کے اس سوشل فریم ورک میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔“

ٹھیک ہے۔ اگر وہ اس فرضی جاگیر داری کے پس منظر کو مبہم رکھتیں تو خیریت رہتی۔ ہم تینوں بھائی اپنی برنس میں حد سے زیادہ مصروف۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان گدھیوں نے کیا کچھڑی پکائی۔ خیالی بلاؤم کتے۔ خاص نمبر پھینے لگا تو کیا ہوائی قلعے بنائے۔ کیوں ری شہوار۔ شیخ چلی کی بچی۔ یہ تصویر کہاں سے آئی؟ اس کا یہ قصہ کیوں گھڑا؟ ایک جھانپڑونگا۔ طبیعت صاف ہو جائیگی ساری دنیا کے سامنے میرے چہرے پہ کالک پوت دی۔“

شہوار تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گلا خشک۔ رنگ فق۔ بولی ”بھیا میں اور بجیا پھیلے دونوں ڈیکوریشن کیلئے CURIOS خریدنے نچاس گئے تھے۔ یہ کمیونٹر بڑا سوراہا ہے

میں خرید لیا۔ اس کے پیچھے صرف ”نواب بیگم لکھا تھا۔ تفریحاً اسے۔“ ہربائی بس دی
نواب بیگم۔“

”پر دھان پور کیسے خیال شریف میں آیا؟“
”ڈاکٹر منصور نے کسی صاحبزادہ دانش آلودہ دھان پور کا تذکرہ کیا تھا۔“
”جنگلو آپ نے اپنا کزن ظاہر کیا۔“ شہوار نے چونک کر مجھے دیکھا مزید سٹی گم۔
”راکنت سے کہا“ بس میں نے دھان پور کے وزن پہ پر دھان پور۔ ایجا د کر لیا۔

ON THE SPUR OF THE MOMENT رسالے والے آئے تو انٹرویو میں بالکل
سی پی کے جنگلوں میں چھپا پر دھان پور بلیس۔
”کیوں۔“ بڑے بھیا دھاڑے۔

JUST FOR THE HECK OF IT میں نے سوچا مدھیہ پریش ہندوستان
کا سب سے بڑا صوبہ ہے گھنے جنگلوں سے بڑی آزادی سے قبل وہاں ٹیکڑوں پھوٹی
پھوٹی ریاستیں جو اڑے تھے کون تحقیق کرنے جائیگا۔ علاوہ ازیں۔“

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ گویا کٹہرے میں کھڑی ملزمہ کا بیان جاری رہا۔
”علاوہ ازیں میں نے سوچا نجاس میں یہ تصویر کینے آئی ہوگی کم از کم دو سو سال پرانی کسی
مغل شہزادی کی مجھے کیا پتہ تھا کہ نواب بیگم اتنی RECENT تھیں اور طوائف تھیں۔ میں
تو اُسے ایک فرضی کمیو سمجھی تھی۔ بلکہ میں نے دوکاندار سے پوچھا بھی کس کی تصویر ہے۔
بولا معلوم نہیں۔ پرانے زمانے کی کسی بیگم کی ہے۔“
”اے سانس بھی اہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔“ میں نے کہا۔

اب ڈاکٹر منصور کی بازی تھی۔ انہوں نے شہوار کو مخاطب کیا ”سب سے پہلے
جب میں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی تو آپ نے
بڑی بے پروائی سے کہا۔“ آئی کہاں سے ہماری دادی جان کی تصویر ہے۔“

”وہ بھی میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا اس کا مقدمہ کھڑا ہو جائیگا۔“
 ”جتنی بے عزتی اور بدنامی ہوئی تھی وہ تو ہو گئی۔ کل یہ خبر سارے اخباروں میں ہو
 گی خاص طور پر اردو اخباروں میں۔ مع ان مارواڑی حضرات کے سودر سود کے قصے
 کے۔ العظمتہ اللہ۔“ بڑے بھیانے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔

”اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے“ چھوٹے بھائی نے (جو اب تک سر نہوڑائے فرش
 کوتاک رہا تھا) دریافت کیا۔ ”اگر تم پریس میں یہ بیان دیتے ہیں کہ سارا قصہ جھوٹا ہے
 یہ لوگ ہمیں بلیک میل کرنے آئے تھے۔“

”رام دہائی — رام دہائی — ہم بلیک میل — ہاں بوسم انصاف پھ مانگتے
 آئے تھے۔“ بوڑھے مارواڑی نے لجاجت سے ہاتھ جوڑ کر احتجاج کیا۔

چھوٹے بھیانے بات جاری رکھی۔ ”تو یہ معاملہ اتنا شفاف ہے اور
 فول پروف کہ اسے کوئی جھوٹ مانے کا نہیں۔ اور ایک بار نواب بانی کی کہانی عام ہوئی
 تو جس طرح یہ سیٹھ صاحبان انکے واقف نکل آئے۔ اسی طرح چنداڑ بڈھے ٹھٹھے
 نواب ٹایپ لوگ ریٹائرڈ عیاش تماشین یا سنگیت کے ریا اپنی اپنی عمر رفتہ کو آواز دینگے
 اخباروں میں انکے خط چھپیں گے۔ فلاں سنہ میں — فلاں مجرے میں نواب بیگم
 سے قدر پیاگی ایک ٹھمری جیسی سنی تھی پھر کبھی نہ سنی — چنانچہ ایک بیک گراؤنڈ
 حاصل کرنے کے چکر میں میری خواہراں عزیز نے ہم نجیب الطرفین لوگوں کو دلال الطوائف
 بنا دیا۔ شاباش — جس لیڈی ڈاکٹر سے میں شادی کرنا چاہتا تھا میری بہنیں اسکا
 کچن کی جینی کہتی تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں طوائف زادی بن گئیں۔“

دریچے کے باہر ایک سایہ سا ڈولا۔ ایک آدمی شیشے سے ناک چپکائے جھانک
 رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ شکل صاف نظر نہیں آرہی تھی۔

ڈاکٹر منصور نے قہقہہ لگایا اور بے رحم آواز میں بولے:
 ”گمنام نواب کا ایسج کے دنگ میں داخلہ!“

”یہ کون صاحب؟ اللہ رحم کرے۔“ بڑے بھائی نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔
 ”آپکی باجی جان نے،“ ڈاکٹر جوشلی غضبناک آواز میں گرجا۔ ”انکانا درموزوٹی
 کتب خانہ۔ کوڑیوں کے مول خریدا۔ انکا واقعہ بھی سنئے گا؟ اٹھ کر کمرے کا ایک چکر
 کاٹا۔ مصنوعی پرندوں کی چہکار کا سوئچ بند کر کے فوارے کے قریب گیا۔ پلٹ کر بولا۔
 ”صاحبان۔ پچھلے سال کا ماجرہ ہے۔ ایک ثقہ، افلاس زدہ غیور بزرگ
 سے بیل گارڈ کے باغ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بھی ہم سب کی طرح
 زندگی کے تھیمٹر کا دلدادہ ہے۔ اسوقت وہ خود ایسٹج کے سنٹر میں موجود تھا اور ایک
 FIGURE OF TRAGEDY کو متعارف کر رہا تھا۔“ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے
 ہیں غیرت کی وجہ سے اپنا نام پتہ نہیں بتلایا۔ گذشتہ لکھنؤ کے بارے میں عالمانہ
 گفتگو کیا کیے۔ پھر اپنی راہ لی۔“
 ڈاکٹر اب بید مضطرب تھا۔ مجھ سے پوچھا۔ ”وہ کیا ہے یاد ہے آپکو آمنت باللہ
 — وہ اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لانے والی بات۔؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اپنے اضطرابی کیفیت کی وجہ سے کاشغری کو یاد نہ رہا تھا
 کہ دین اسلام سے متعلق یہ سوال مجھ سے نہ کرنا چاہیے۔
 کیونکہ میں اسوقت ”چودھری دھیان سنگھ“ تھا

اسے دفعتاً دھیان آگیا۔ بولا ”سوری۔ بہر حال۔ کہنے کے مطلب یہ کہ میں
 انسانوں کی اچھی اور بُری تقدیر کا قائل ہو چکا ہوں۔ کس طرح۔؟ سماعت فرمائیے
 اس روز سیاسی اور ادبی بحث مباحثے کی رو میں میں نے نواب صاحب کو اپنا نام محض
 مرزا منصور احمد بتایا۔ ڈاکٹر ٹیگ بھی میرے ساتھ موجود تھیں۔ لیکن اس بد قسمت شخص کو
 یہ نہ معلوم ہو سکا کہ دو ڈاکٹروں سے ہم کلام ہیں۔ ورنہ یقیناً اپنے لڑکے کی علالت کا ذکر
 کرتے اور ہم لوگ فوراً اسے اپنے نرسنگ ہوم لجاتے۔

”بیلی گارد کی اس ملاقات کے بعد اگلے ہفتے ہی وہ آپکے دولت کدے پر تشریف لائے
 ”میں بھی اس وقت یہاں پہنچا تھا۔ آپکے دربان نے اندر آکر اطلاع دی کہ وہ
 کتابوں والے بڑے میاں آئے بیٹھے ہیں۔ انکا لڑکا بہت بیمار ہے کچھ پیسے چاہئیں۔ میں
 نے پوچھا کون ہے؟ انسان دوست ناولسٹ نگار خانم نے فرمایا ایک جلد ساز ہے۔
 قدیم مخطوطات کی جلد بندی اس سے کروائی ہے۔ میں فوراً اٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا کہ
 لڑکا اگر زیادہ بیمار ہے مآثر میں اسکے مفت علاج معالجے کا بندوبست کر دوں۔ نگار باجی
 نے زبردستی روک لیا۔“

”کیا یہ بھی امر تقدیری تھا؟ نگار خانم کی ممانعت کے باوجود آپ باسانی یہ چند قدم
 کا فاصلہ طے کر کے برساتی تک پہنچ سکتے تھے۔“ میں نے کہا۔

منصور کا شغری نے اپنا بیان جاری رکھا: ”ابھی گذشتہ منگل میں کسی کام سے بلراپڑ
 ہسپتال گیا۔ وہاں پھانگ پر نواب صاحب مل گئے۔ حزن و یاس کی تصویر زبان لنگ۔
 چند سکند تک مجھے دیکھا کئے پھر پہچان کر بولے ”مرزا صاحب میرے جوان بیٹے کا انتقال
 ہو گیا۔ اسکے بیڈ کے آگے اسکرین لگا دی گئی ہے۔ صبح سے میں تجیز و تکفین کے انتظام
 کے لئے سرگرداں ہوں۔ تب انھوں نے سارا قصہ سنایا۔ والد کی عیاشی کی بدولت انکا
 گھرتباہ ہو چکا۔ شیعے کی رقم گھٹتے گھٹتے قلیل رہ گئی۔ اکلوتا لڑکا آوارہ نکل گیا تھا۔ گھر بیٹیاں
 چکن کاڑھ کر گھر چلا رہی تھیں۔ کسی ذریعے سے انکو پتہ چلا کہ نگار خانم قیمتی کتابیں خرید رہی
 ہیں۔ بشتینی کتب خانہ ابھی انکے پاس موجود تھا۔ لیکن اب نواب صاحب کو لڑکیوں کے بیاہ
 کرنے تھے۔ تارخیں طے ہو چکی تھیں۔ لیکن پیسہ — پیسہ کہاں تھا؟ چنانچہ ان پیش بہا
 کتابوں کو دو گھڑوں میں باندھ کر اس عشر تکدے پر پہنچے۔ انھوں نے جو چند فلمی نسخوں کے
 نام بتائے میں دنگ رہ گیا۔ ایک ایک نسخہ حاصل کرنے کے لئے برٹش میوزیم یا امریکہ
 والے پاؤنڈز اور ڈالرز کے دریا بہا دیتے۔ نگار خانم نے پورا اثاک صرف دس ہزار روپے
 میں اس طرح خرید آگیا۔ نواب صاحب پرا حسان کرتی ہوں۔“

”مزید سنیں۔ اس قسمت کے بیٹے انسان کے لکھے ہوئے سارے تنقیدی مضامین بھی انہی پلندوں میں چلے گئے ہماری نگار باجی اب انہیں اپنے نام سے چھپوا رہی ہیں۔“
”لڑکیوں کو رخصت کرنے کے بعد نواب صاحب پھر کھکھہ ہو گئے۔ لڑکا بیمار پڑا۔
ڈاکٹروں نے کہا اسکی کڈنی بدلوائیے۔“

”کڈنی کیا — گروہ —؟“ نگار خانم کے سوالات لاجواب ہوتے ہیں۔
”جی۔“

”اب مجھے کیا معلوم کسے گروہ بدلوانا ہے کسے کلیجی۔ وہ بڑے میاں تو جب بھی آئے
میں نے ہمیشہ تلویچانش —“

”جی۔ ان جیسا خود دار آدمی بیٹے کی بیماری سے مجبور ہو کر بار بار یہاں آیا کہ وہ ذخیرہ
ایک حاجتمند سے اپنے اتنا سستا خریدا اب کچھ اور رقم بطور قیمت ہی عنایت کریں۔ یا کم
از کم لڑکے کے علاج کا انتظام کروادیں۔ جب کہ آپ کے ہاں ایک ڈنر پارٹی پر ایک
شام میں ہزاروں روپیہ —“

”لو صاحب یہ تو کمیونسٹوں والی تقریر کرنے لگے۔ ہماری ڈنر پارٹیوں میں تو آپ
بھی شامل ہوتے ہیں آپ کون سی پارٹی میں ہیں۔ سی۔ پی۔ ایم یا سی۔ پی۔ آئی۔؟“
نگار خانم نے منہس کر دیا ہفت کیا۔
”خاموش۔“ بڑے بھیّا گرے۔

”نواب صاحب نے یہ بھی بتلایا کہ آپ نے انکو خبردار کر رکھا ہے۔ موروثی تخت خانے
کے اس لین دین کا راز افشا کیا نہیں اور یہ تلویچانش بھی القسط —“
خاموشی۔

یکلخت نگار خانم کی رعوت واپس آگئی۔ انہوں نے پانی پیتے ہوئے کہا ”دیکھتے
جناب۔ آپ کا خیال ہے یہ سب ٹپو نیجے مل کر مجھے پرسیکیوٹ کریں گے یا بلیک میل۔
— تو آپ غلطی پر ہیں۔“

”اب چونکہ نواب جان منظر عام پہ آچکی ہیں یہ نواب صاحب بھی کسی اردو اخبار میں محض ایک خط چھپوا سکتے ہیں ان تنقیدی مضامین کے متعلق — اور کتب خانہ تو ظاہر ہے انکا بھی ٹرمپ کارڈ — اگر وہ چاہیں —“ میں نے کہا: ”ٹرمپ کارڈ“ پر دونوں بہنیں تقریباً اچھل پڑیں۔ پھر نگار خانم نے جو اس مجتمع کر کے بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔

”بھئی! مجھے بھی بولنے دو۔ یہ ساری اسکیم سوچی سمجھی میرے دشمنوں کی ہے۔ وہ RIVAL ناولسٹ فرح خانم —“

”فرح خانم تو دراصل مرد ہے۔“ چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ”اسکا اصل نام لچھی رام چوڑہ ہے۔“

”جیسی تو — اسکی بزنس چوٹ ہو گئی میرے ناول گرم کیک کی طرح بک رہے ہیں۔“

”مگر فرح خانم تو جاسوسی لکھتا ہے۔ تم رومانی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کوئی فرق نہیں البتہ — کوئی فرق نہیں البتہ —“ دریچے کے باہر سے آواز آئی وہ گننام نواب صاحب نہیں تھے۔ کلا دنت دیوانہ تھا جو بیڑیوں سمیت شاگرد پیشے سے نکل بھاگا تھا۔ کیونکہ بار بار انہیں گھنگرہ کی طرح بجا رہا تھا گویا اپنی کنٹری شروع کر چکا تھا۔

”سردست لچھی رام چوڑہ ہمارا مسئلہ نہیں — سوال یہ ہے کہ اب بیلک کو کیا منہ دکھائیں۔ اگر نواب بائی کی کہانی کی تردید نہیں کرتے تو اپنی نجابت اپنے ہاتھوں برباد کی کینچی کی اولاد کہلائے۔ بروز حشر اپنے بزرگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔“

”اماں روز حشر تو دور کی بات ہے۔ تم اپنے بزرگوں کو سردست کیا منہ دکھا رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گلابی ہو گئی ہیں۔ سر پر نوکیلے کان اُگ آئے ہیں۔ اور چہروں پر تھوٹھنیاں اور پیچھے مڑی ہوئی دُمیں۔ یہ آئینہ دیکھو —“ سبز پوش

نے زور سے کھڑکی کا پٹ کھول دیا جس کے پلیٹ گلاس میں کمرے کا منظر منعکس ہو گیا۔ اس نے اس ہولناک انداز میں یہ بات کہی کہ گوا اس نے مجھے مخاطب نہ کیا تھا۔ گھبرا کر غیر ارادی طور پر میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ خیر نور ماتم تو ہمیشہ ہی پیار سے مجھے ”سُور“ پکارتی ہو۔

میں اٹھ کر دریچے میں گیا۔ وہ نیچے گلوں میں کھڑا بڑی معصوم سی ہنسی منہں رہا تھا۔ اس وقت وہ بالکل نارمل تھا۔ بشرے سے نہایت صحیح الدماغ دکھلائی پڑتا تھا۔ اپنے غیض و غضب پر قابو پا چکا تھا۔ اور ٹیکسیر کے PUCK کی طرح کمرے کے اندرونی منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اچک کر دریچے کے اندر سر ڈالنا نگار کے بھائیوں کی جانب اشارہ کر کے ایک انگلش نرسری رائیم پچوں کے انداز میں سننے لگا

THESE LITTLE PIGS WENT TO MARKET

THIS LITTLE PIG STAYED HOME — بھراپنی طرف اشارہ

THIS LITTLE PIG HAD ROAST BEEF,

THIS LITTLE PIG HAD NONE

AND THIS LITTLE PIG CRIED

WEE-WEE-WEE-WEE-WEE

I CAN'T FIND MY WAY HOME

سر باہر کر لیا۔

میں اپنی کمرسی پر واپس آیا۔

بوڑھے مار وارٹی نے آہستہ سے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ ”رام بھو — رام بھو

— یا ماملو بڑے جبر معلو دنیڑے۔ بیٹا یا گھر تو مہانے اندر جاں ساما لوم پڑے۔ یا پاگل

یا میں سے نکل بھاگا چھے —“

تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی بہن بھائی نے اٹھ کر نہ کھڑکی بند کی نہ اسے دوبارہ پکڑنے کے لئے آدمی بلائے۔ ایسا لگتا تھا کہ شام کے ان تابڑ توڑ سانحات سے انکے ہاتھ

پاؤں پھول گئے تھے۔

پاگل کو نظر انداز کر کے چند منٹ کے سکوت کے بعد بڑے بھائی نے پھر اپنی درندہ گشتگو کا آغاز کیا۔ ”اور اگر ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ریاست پر دھان پور من گھڑت ہے تو غور فرمائیے ہم لوگ کس قدر بُرے، واہیات اور ناقابل اعتبار معلوم ہونگے۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے حصول دولت کے بعد اپنے لئے ایک فرضی نوابی ایجاد کی فرضی تصویریں چھپوائیں۔ ایک فرضی پولیس۔“

”اور مرنوٹی کتب خانہ۔“ ڈاکٹر منصور نے لقمہ دیا۔

دونوں بھائیوں نے سر جھکا لیا۔ بہنوں نے شعلہ بازنگاہوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ اگر ان شعلوں میں اثر ہوتا ڈاکٹر وہیں بھسم ہو جاتا۔

میں نے تپائی پہ رکھا میوزیکل سگریٹ باکس کھولا۔
AULD LANG SYNE
کی دھن بجنے لگی۔ باہر کھڑے ”دیوانے“ نے فوراً بڑی دلدوز آواز میں دھن کے ساتھ

SHOULD AULD ACQUAINTANCE BE

FORGOT AND NEVER BROUGHT TO MIND

اپنا شروع کر دیا۔ میں نے سگریٹ باکس کا پٹ بند کیا۔ ادھر جھٹ سے وہ بھی خاموش کھٹک بھرت ناٹیم۔ لپکا گانا۔ اسکاٹش گیت۔ کیا صاحب کمال شخص تھا۔

نگار خانم کا چھوٹا بھائی بھٹنا کراٹھ کھڑا ہوا۔ ”باجی سوچ کر کل تک جواب دیجئے پریس کو کیا بتلایا جاتے؟ آپ نواب بائی کی پوتی ہیں یا پردھان پور پولیس ہوائی قلعہ تھا؟“

”پھنس گئے۔ خود ہی چوہے دان بنایا اسمیں گئے پھنس بیٹا۔ پراسرار سبز پوش نے نعرہ لگایا اور باغ کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دور سے اسکا دوسرا نعرہ سنائی دیا۔ تن من دھن سب راکھ بھینو
لگ گئی آگ بھینچو ر میں

”راکھ بھینو“ اس نے اس جگر پاش انداز میں کھینچا کہ میں نے اپنے منہ اور حلق میں

بیت سی بھرتی محسوس کی۔ راکھ اور ریت راکھ اور ریت — میں نے سر جھٹک کر چاروں
رٹ دیکھا۔ آبشار والا کمرہ اسید طرح جگمگا رہا تھا۔ ایک طرح دار مہری اس بانچن اور ٹھٹھے
سے کافی کی ٹرائی دھکیلتی اندر آرہی تھی گویا کنگ نصیر الدین حیدر والی دھنیا مہری کی
بانٹین دہی ہو۔ اہل ثروت کی زندگیوں کے تمام نشیب و فراز سے واقف۔

دوسری صبح اخباروں میں تو کچھ نہ نکلا۔ بطلموس وغیرہ صاحبان نے اس کا انتظام
رہا ہوگا۔ مگر خصوصی نمبر والے انبار کا مخالف روزنامہ اس اسکیئنڈل کو لے اڑا۔ سارے
شہر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ آبشار والے کمرے کی میٹنگ کی اطلاع بھی باہر پہنچ گئی
ہے۔ اب پچھلے چند روز ”گمشدہ تصویر کا راز“ کے عنوان سے انگریزی اردو اور ہندی
پریس میں جتہ جتہ چھپنا شروع ہو گیا ہے۔ گو خاندان کا نام دینے سے احتراز کیا گیا ہے۔
یہ مقتدر لوگ ہیں۔ بڑے بھائی نیتا گیری بھی کر رہے ہیں۔ اس خبر سے انکی نیتا گیری کو سخت
دھکا پہنچ سکتا ہے۔

چنانچہ پیاری نور ماہ خانم میں نے پلان ملتوی کر دیا۔ میرے اندر بھی کوئی خوابیدہ
برائی خاندانی شرافت نجابت وغیرہ جاگ اٹھی۔ سوچا یہ دونوں بھائی اس قدر شرمندہ
اور پریشان ہیں۔ آگ پر تیل چھڑکنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس شام جب انکے اطاق آبشار سے ہوٹل لوٹا رات کو خواب میں دیکھتا ہوں نگار
خانم کے بڑے بھیا کہہ رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب مجھ سے پچاس ہزار پاؤنڈ بھی لے
لیجئے میں آپکی ایک کورٹ، سروس کا ڈائریکٹر بھی بنا جاتا ہوں۔ آپکے اور نور ماڈریک کیلئے
ایک پرائیویٹ یاٹ بھی خرید دوں گا۔ بطور جہیز باجی کے جسے کاروبار ایک سوئس بینک میں
منتقل کر دوں گا۔ بس آپ اتنا کیجئے ان سے عقد فرما کر اپنے ہمراہ لے جائیے آپ سے انکی
سی انتہا ہے۔ وہ اس مارواڑی بڈھے کی طرح ہاتھ جوڑے ایک ٹانگ پر میرے سامنے
کھڑے تھے۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔

آج یہ خط بالآخر پوسٹ کرنے والا تھا کہ نور من کا کاڈ ملا۔ اس نے صورت حال کو

بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے ”تم کو بھی علم ہو چکا ہوگا کہ وہ اور پری بیگم بہترین دوستوں کے“ ایک دوسروں سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ پری بیگم ایک سو بیڈنگ دوست کے PAD میں منتقل ہو چکی ہیں۔ لہذا وہ پچاس ہزار پاؤنڈ کی اسکیم عت ربودہ پر اخلاقیات والے لوگ حصول زر کیلئے جدید ترین غیر اخلاقی تکنیک استعمال کرتے ہیں مجھے تفصیلات معلوم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ مساجد بھی تعمیر کر رہے ہیں اور سیاسی لیڈ بھی ہیں۔ یعنی جہان سوئم کے اعلیٰ کرپشن کی کلاسیکل تصویر اور انکی طرح ان گنت ہندو مسلمان اس ملک میں پھیل پھول رہے ہیں۔ انکے معاملات کے مقابلے میں میری کارڈ شارپنگ اور دھوکہ دہی تو بچوں کا کھیل ہے۔

ہاں تو حصول زر کیلئے غیر اخلاقی کارروائیاں جائز سمجھتے ہیں مگر اپنی خواتین سلسلے میں قدامت پسند ہیں۔ پری بیگم کو ایک امریکن اسکول میں پڑھایا مگر اس کے موز طرز حیات سے انکو شدید صدمہ پہنچ گیا۔

یہ لوگ نگار شہوار حماقت کی وجہ سے ایکسپوز ہو گئے محض سوشل سطح پر گوسپ کی حد تک۔ انکی ایمپائر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ بائی فائی نینس ان باتوں سے ماورا ہے۔

انکے اس واقعے کو تم ایک قسم کی جدید اخلاقی حکایت سمجھو یعنی MODERN PARABLE جس طرح میں اپنے نیک نہاد خاندان میں ایک کالی بھیڑ نکل گیا۔ اور نصیب آموز ثابت ہوا۔

پری خانم کے متعلق ابھی یہ لاعلم ہیں اور جب جانیں گے تو انکے سامنے بھی سوال کھڑا ہوگا کہ لڑکیوں کو کس حد تک آزادی دینی چاہیے مشرق و مغرب کا این کاؤ تو ہمارے ہاں دوستوں سے جاری ہے اس میں اب مغرب کو کس حد تک غا آنے دیا جاتے بہت ممکن ہے شہوار اور پری بیگم کے واقعات کے شدید رد عمل کے پر یہ تینوں بھائی اسلامی بنیاد پرست بن جائیں۔ وارٹھیاں رکھ لیں اور تبلیغی جماع

شامل ہو جائیں EXTREME SITUATIONS کے رد عمل اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ پرسی بیگم ہندوستان کے نئے دو متحدہ طبقے کے نو جوانوں کی ”ڈسکو کلچر“ پر درود تھی۔ لندن پہنچ کر اگر وہ PERMISSIVE سوسائٹی میں شامل ہو گئی تو اسے کیوں بورڈارٹھیرایا جائے؟ اخلاقیات کی اقدار ہر عہد اور ہر طبقے کی اور فرداً فرداً مختلف تی جاتی ہیں۔ تمہارے پاپائے تم بہنوں کو آرام دہ زندگی اور دولت کی خاطر ساجی بی بنانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا حالانکہ تم بتاتی ہو کہ عادی مجرم نہیں تھے۔ پابندی بے چرچ بھی جاتے تھے۔

اب میں بھی اپنے بنائے ہوئے ایک چوہے دان میں پھنس گیا ہوں۔ جیسے وہ پاگل رات بنکار رہا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ نگار خانم تمہارے اس دیرینہ خادم کی گرویدہ ہو چکی۔ آبشار والے کمرے میں انکشافات کی اس خوفناک رات وہ بھی تاڑ گئیں تھیں کہ وہ وہی شخص ہے جس نے انکو وہ ایک قسم کا محبت نامہ ارسال کیا تھا۔ دراصل یہاں ہر کچھلے چند روز میں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس بے چاری خشک مزاج عورت سے کسی خدا کے بندے نے فلرٹ تک نہیں کیا۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے انکو یہ احساس دیا کہ انہیں بھی پسند کیا جاسکتا ہے۔ نہایت مشتبہ قسم کی ادبی حیثیت۔ بے نخواستہ۔ معمولی شکل و صورت۔ خوشامدیوں کا ہجوم۔ جو سب انکو بیوقوف بنانا چاہتے ہیں اور جانتی ہیں کہ لوگ انکو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ سب ایک سے ایک چوٹ قسم کے بطلیموس آؤس ٹائپ لوگ۔ نواب بیگم کے غیر متوقع DISASTER سے پہلے تک بھائیوں کو اطمینان ناول نویسی کے بے ضرر مشغلے میں مصروف ہیں۔ ورنہ ہوشل ورک یا نینتا گیری شروع۔ اور انکے لئے شاید کچھ پراہم مزید کرتیں۔

چنانچہ خاکسار جیسا کھر فل شخص کلا رگ گیل کا ٹیم شکل، لندن سے وارد ہوتا ہے۔ بلیک کی ایک اسکیم جیب میں ڈالے۔ ساتھ ہی بڑی شائستگی کیسا تھا ان سے فلرٹ بھی کرتا ہے

اور وہ اپنے راہوار تختیل کو جو اب تک اصطبل میں کھڑا گھاس کھا رہا تھا سرپٹ دوڑا دیتی ہیں اب وہ طرح طرح سے چارہ ڈال رہی ہیں۔ کلارکس اودھ میں اب تک انکا ہمان ہوا کل کہہ رہی تھیں۔ ایک سوئس بینک میں انکے بھائی انکے نمبر کا گنام اکاؤنٹ کھول چکے ہیں۔ عبرت کجاست و بختنرب درائے جزمین گرتیر پس چہ باید کرد اقوام انانث یعنی وہ ایک جرائم پیشہ سے بھی شادی کرنے کیلئے تیار ہیں۔ (اس میں یہ ضمانتک نصب العین بھی مضمر ہے کہ بطور نیک پردین ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے کی اصلاح کر سکیں)۔

تم کو پکا یقین دلا دوں میرا قطعی کوئی ارادہ نکار خانم سے مناکحت کا نہیں ہے۔ اور تم اپنی پچیس سالہ برنس پاٹرنشپ میں اس نوع کے متغیر مراحل سے گزر چکے ہیں اور مزید نفع میں رہے۔

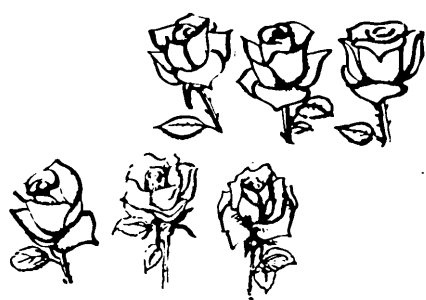
تمہارا دلشاد

پس نوشت

شہوار خانم SULK کر رہی ہیں کیونکہ ڈاکٹر منصور ڈاکٹر عنبر کی طرف پھر متوجہ ہو گئے۔ کل بتلار تھے عنبر آجکل شدید ڈپریشن میں مبتلا ہے جو ایک قسم کی نفسیاتی بیماری ہے۔ کل انکی عیادت کیلئے جاؤنگا میں جلد واپس آنے والا ہوں ۱۹۸۳ء کا لکھنؤ کافی دیکھ لیا۔ شہر نگار — ہا ہا ہا آج صبح ہوٹل کے پھاٹک سے نکلا تو چند بھگیتے اور انکے ساتھ دو بچے کلا بوتسا بولے فٹ پا پیرا کروں بیٹھے دکھلائی دیے۔ مجھے بڑی پُر امید نظروں سے دیکھا۔ شاید صبح سے کوئی راہ گز انکا بے بضاعت تماشہ دیکھنے کیلئے تیار نہ ہوا تھا میں ٹھٹھک گیا تو دونوں کٹھنیلیاں بچا کر یکسانیت سے دہرانے لگے — بچیاں لال ملوں گی — مٹیاں لال ملوں گی — ۱۱

غریب بچوں نے بھی مجھے اداس کیا۔ خدا حافظ!





MASHA NURSING HOME
&
HEALTH CLUB



ہیلتھ کلب

”کامریڈ لن یونانگ۔“

”بولو۔ شمامتہ العنبر۔“

”وہ چینی شاعر کیا کہہ گیا ہے کہ میں نے آدمیوں کی بستی میں گھر بنایا ہے؟ تو اس کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہیے۔“

”رکھ لو گل عنایت۔ یا THINKER'S DEN۔ امبرنیا۔ کدم کی چھاؤں۔ دریا نما۔“

”قطب نما بھی ہو سکتا ہے۔ آئیے۔ آئیے تشریف لائیے۔“

”ڈاکٹر کھنہ۔“ ”ایک بیحد فربہ چنیا بطح نما خاتون نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔“

”جی وہ ابھی آتی ہونگی۔ تشریف رکھیے۔“

خاتون نے طشتریوں جیسی گول عینک پہن رکھی تھی جسکی وجہ انکی شکل پرالو کی گول آنکھوں کی جھلک آگئی تھی۔

”میں نے کل فون پر ان سے اپوائٹمنٹ لیا تھا۔ میں کلکتے سے آئی ہوں۔“

مسنجر ہی مایا بھٹناگر۔

”ہاؤ ڈو یو ڈو مسز بھٹناگر۔ تشریف رکھیے۔“

خاتون صوفے پر فروکش ہوئیں۔ ”آپ ڈاکٹر کھنہ کے مسٹر ہیں؟“

”نہیں صاحب۔ پارٹنر۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپکی مسز ہیں؟“

”نہیں صاحب۔ پارٹنر۔“

”ادہ۔“

”ہاں بھئی۔ دریا نما ہی ٹھیک رہے گا۔“

”اُوں نما۔“ عنبریں نے دنگ کیا۔

”درست۔ لیکن دریا نما رکھ لو۔ بمبئی میں بھی چوپائی پر ایک عمارت کا یہی نام ہے۔“

”وہاں دریا کہاں ہے؟“

”فارسی میں دریا سمندر کو کہتے ہیں۔ بمبئی کے عوام بھی سمندر کو دریا۔“

”وہ ایسی مفرس زبان بولتے ہیں؟“

”ہاں۔ اور مقرب۔ انڈے کو بید کہتے ہیں قلی کو حمال۔“

”ہائے آپ لوگ کتنی اچھی ہندی بولتے ہیں! میں نے سنا تھا لکھنؤ والے بڑی اچھی ہندی بولتے ہیں۔“ مسٹر بھٹناگر نے داد دی۔

”جی ہم لوگ اردو بول رہے ہیں۔“ منصور نے حل کر جواب دیا۔ اور اہل لکھنؤ

اردو بولتے ہیں۔“

”اردو۔“ ہائے اردو تو میں بھی تھوڑی تھوڑی سمجھ لیتی ہوں۔ بڑی سوتیلیٹ لینگوئج ہے۔ میرے تاؤ جی تو کول اردو ہی جانتے تھے۔ ہم لوگ عرصے سے کلکتے میں رہ رہے ہیں لکھنؤ ہمارا پرانا وطن تھا۔ میں نے یہاں اگر آپ کے ہلیتھ کلب کی بڑی دھوم مٹی۔ فوراً پہنچ گئی۔ ڈاکٹر کھنہ شادی شدہ ہیں؟“

”جی نہیں۔“ منصور نے جواب دیا۔

”آپ۔“

”جی نہیں۔“

”آپ۔“ عنبر سے سوال۔

”جی نہیں۔“

”میری طبیعت لکھنؤ آکر خراب ہو گئی۔ آب و ہوا کی تبدیلی۔“ فوراً خیال آیا کہ مستقل اردو بول رہی ہیں۔ سامنے پڑے ہوئے FEMINA پر نظر ڈال کر کہا۔

”یہ۔ بیگم حسین کتنے وحشیانہ لکھتی ہے۔ ہیلتھ اینڈ بیوٹی پہ اس پر کارکی سیمائیں بہ مہلا کو ٹر بل کرتی ہیں SKIN وغیرہ کی — آپ لوگ سب فارن میں رہ کر آئے ہیں نا؟ کسی نے یہی سوچا دی۔ آپ کے ہیلتھ کلب میں دیا ہونے کا کورس کتنے سپتہاہ کا ہے؟“

”ڈاکٹر کھنہ اسکی انچارج ہیں وہی اگر بتلائیں گی“

مسٹر بھٹنا کرنے انگریزی اردو اور ہندی کے ہفتہ وار رسالوں کی ورق گردانی شروع کی۔ جو ”گمشدہ تصویر کاراز“، ”نواب بیگم کون تھی —؟“ ایک معزز خاندان کو بلیک میل کرنے کی ناکام کوشش، ”قسم کے عنوانات سے پُر تھے۔“

”آجکل اس اسکندل کی ہر جگہ چرچا ہے۔“ مسٹر بھٹنا کرنے کہے۔

عسیرین نے ناشتے دان کھولا۔ نوش فرمائیے۔ ”منصور نے اخلافاں کو مدعو کیا۔“

”آپ کھائیں۔ میں تو اپنی CALORIES گنتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر باہر باغ میں چلی گئیں۔

”ہر شاخ پہ اُتو بیٹھا ہے اب رنگ گلستاں کیا ہوگا —“ منصور نے

بناشت سے کہا۔

”تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔ مجھے پھر ڈپریشن شروع ہو گیا۔“

”کیوں؟“

”اُتو نے نواب بیگم کا تذکرہ جو چھیڑ دیا۔“

”تم سے مطلب؟ تم اپنے پر اہل خود CREATE کر رہی ہو۔ بروٹس سسٹرز کیلئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ تم تو خوشی کے شادیاں بجاؤ۔“

”یعنی اگر اسی طرح ساری دنیا کو معلوم ہو جائے کہ نواب بیگم میری نانی تھیں تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا؟“

“AMBER—I DIDN'T MEAN THAT—FOR GOD'S SAKE.”

منصور نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

مسٹر بھٹناگر باغ کا ایک چکر لگا کر واپس آئیں۔

”امی نے آج کو سدا قیا نوسی ٹفن باکس نکال کر بھیجا ہے“ عتبر نے چڑ کر کہا۔
”کلکتے کے زمانے کا۔“

”ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھائے کلکتہ ٹولڈن میں ٹفن“

منصور نے پھر انشاء کا ایک شعر پڑھا۔

مسٹر بھٹناگر غور سے سن رہی تھیں۔ بولیں ”ہائے۔ مجھے تو شاعری بہت پسند ہے۔
میرے تاؤ جی بھی مشہور شاعر تھے۔“

”اچھا۔“ منصور نے نیکیں نکالتے ہوئے پوچھا ”کیا تخلص فرماتے تھے؟“
”احقر۔“ رائے بہادر امبا پرشاد۔ ”وہ اطمینان سے کہتی رہیں۔“ جب
میں نے یہ نواب بیگم کی فوٹو والی خبر پڑھی تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ اسی دیشیا کی لڑکی نے
میری تانی جی کی جان لی تھی۔“

عتبر میز پر سے چچہ اٹھا رہی تھی۔ ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ ہیبت زدہ سی ہو کر
اجنبی خاتون کو تکنے لگی۔ منصور نے گھبرا کر انکو دیکھا۔ ملا گیری ٹمپل۔ سی۔ کلائیوں
میں پلیٹیم کے عبا سے مزین درجنوں چوڑیاں۔ کانوں میں سچے موتی۔ گلے میں سچے موتی۔
کوئی ڈھائی من کا وزن۔ اسوقت یہ قصہ چھڑتے ہوئے وہ دنیا کی مسرور ترین اور مطہین
ترین ہستی معلوم ہو رہی تھیں۔ منصور کو لگا رخانم کے منجھلے بھائی کی پیش گوئی یا د آئی
جو اس نے اس رات آبشار والے کمرے میں کی تھی۔ کہ جب یہ داستان پریس میں
آئیگی نواب بانی کے واقف کار کہاں کہاں کے کونوں کھدروں سے نکل آئیں گے۔

اس مٹلی کو یہ کتنا شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کاش میں نے اسکے تاؤجی کا تخلص نہ پوچھا ہوتا۔ مگر تیرکمان سے نکل چکا تھا۔

مسٹر ہرٹی مایا بھٹنا کرنے اپنے بیگ میں سے سونف برآمد کی۔ ایک پھینکا لگایا اور گویا ہوتیں۔۔۔ ”تاؤجی کلکتہ کے بڑے شوقین مزاج رہیں تھے۔ نواب بیگم ویشیا کی بڑی بلبل انکی رکھیل تھی۔ دو تین سال انکے پاس رہی پھر انکو خوب لوٹ کر ایک محمدن ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی۔ ڈاکٹر کھنہ کب تک آئیں گی؟ میں چاہتی ہوں وہ مجھے جلدی سے REDUCE کر دیں آپکو پتہ ہے میرے کزن بردر کی بڑکی مس آنڈیا کے FEMINA والے CONTEST میں جارہی ہے مس دارجلنگ بن چکی ہے اور میں بھی اپنے کالج میں بیوٹی کونین رہ چکی ہوں بس مسبرج CAN YOU BELIEVE IT کے بعد مٹایا چڑھ گیا۔۔۔ وہ مس بلبل کا قصہ مجھے میری ماما جی بتاتی ہیں۔ میرا تو جہنم نہیں ہوا تھا اس سے۔ تاؤجی نے بلبل کو بہت سرچڑھا رکھا تھا۔ اینگلو انڈین پھوگری۔ فزاک پہن، ہیٹ لگاتاؤجی کے ساتھ موٹر پر دلاہتی چمکے کے چکر لگاتی کبھی گریٹ ایسٹرن کبھی گھوڑ دوڑ۔ تاؤجی نے اسے پیروں سے لاد دیا۔ ہماری تانی جی اسی عورت کی ڈاہ میں بیمار پڑ گئیں۔ ٹی۔ بی۔ ہو گئی۔ اگلے زمانے کی پتی دزناسی ساوٹری۔ کیا کریٹس گھلتی رہیں۔۔۔ گھلتی رہیں۔۔۔“

مسٹر بھٹنا کرنے ڈرامائی تانز پیدا کرنے کے لیے آہ بھری۔ عنبر دم بخود بیٹھی تھی۔

”پھر صاحب۔ بھگوان کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ خود ہی اپنے محمدن ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی۔ مگر ڈاکٹر صاحب۔۔۔“ انھوں نے چاروں طرف دیکھ کر آواز نیچی کی گویا اب گہرا راز افشا کرنے والی ہوں۔ ”ہماری ماما جی بتاتی ہیں کہ تاؤجی کو معلوم ہو گیا تھا کہ کیا بات ہے کیا نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے بڑی خوشی سے خود ہی بلبل جان کا بیاہ کر دیا تاکہ مستان اس ٹیچر کی سمجھی جاوے۔۔۔“

عنبر کا رنگ سفید پڑ گیا۔

منصور نے جرح کی۔ ”معلوم کیسے ہو گیا تھا؟ کیا خود بلبل لے بتلایا تھا؟“
 مسنر بھٹنا گرنے پھر ادھر ادھر دیکھا حالانکہ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی
 موجود نہ تھا۔ آہستہ سے بولیں۔ ”آپ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا۔ بلبل کی
 ایک اڑتہ بہترانی تھی۔ بھنگن۔ وہ ہماری تانی جی کی جاسوس تھی۔ وہ ڈالی گنج
 والے منگلے سے آکر رتی رتی بات انھیں بتلا جاتی تھی۔ اسی نے تانی جی کو بتلادیا تھا کہ کیا
 معاملہ ہے کیا نہیں۔“

عقبہ میں اچانک میز پر سر جھکا کر آگے کو گرہی گئی۔ منصور نے لپک کر اسے سنبھالا۔
 بولی۔ ”ڈونٹ وری۔ چکر آگیا۔ مجھے بھی ہانی بلڈ پریشر ہو گیا ہے۔ جی مسنر بھٹنا گرنے۔ سوری
 — پھر کیا ہوا۔“

منصور نے میز کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر اسکا سر دھاتھ تھام لیا۔ مسنر بھٹنا گرنے بولتی
 رہیں۔ ”بس جی۔ پھر بلبل نے اس مسلمان ٹیوٹر کے ساتھ میرج کر لی۔ پھر کیا ہوا کیا نہیں
 ہوا۔ جانے ہماری بلا۔ تانی جی البتہ اچھی نہ ہوتیں۔ مرگئیں ٹی۔ بی سے۔“ انھوں نے
 اس لہجے میں کہا گویا تانی جی کے مرنے سے انھیں بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔
 ”چار پانچ سال بعد تاؤ جی بھی مر گئے۔ انہی کی تو یہ پوتی ہے جو مس دار جلنگ بتی تھی۔
 بڑی بڑھیا کتھک ڈانس رہے۔ فارن میں جا کر بھی ڈانس کرتی ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے نا۔
 ہماری تانی جی پردے میں رہتی تھیں۔ انکی پوتی کتھک ناچتی ہے جو پہلے بلبل جیسی دیشیاؤں
 کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔“

”اچھا جناب WOULD YOU BELIEVE IT — میں نے بھی کالج میں مٹی پوری
 ڈانس سیکھا تھا۔ میں اتنی تیلی تھی۔ ڈاکٹر کھنہ انک نہیں آئیں۔ وہ مجھے کتنے دنوں
 میں ریڈیو س کر دیں؟“
 عقبہ سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہی۔

”ایک بات بتائیے ڈاکٹر صاحب۔“ مسنر بھٹنا گرنے سونف کی شیشی منصور کو پیش کرتے

ہوئے دریا فت کیا۔ ”آپ محمدؐ ن لوگ میں پردہ سٹم اتنا زیادہ تھا اور اب بھی کافی ہے۔
یہ کیا بات ہے۔ ویشیا میں بھی محمدؐ ہی ہوتی تھیں۔“
باہر کا راگر رکی۔

”جی ہاں۔ یہ نکتہ قابل غور ہے۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”بیجے ڈاکٹر کھٹہ آگئیں۔
آئیے آپ کو انکے دفتر تک پہنچا دوں۔“

مسٹر ہری مایا بھٹناگر کو نشانہ داکھتہ کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آنے کے بعد
منصور نے دیکھا کہ عین اسی طرح بُت بنی بیٹھی تھی۔ خالی خالی نظروں سے اسے تنگ کر
عجیب سی آواز میں پوچھا۔ ”منصور۔۔۔ میں کون ہوں۔؟“

”وٹ ڈیوین تم کون ہو۔۔۔؟“
”منصور امی نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔؟ وہ تو تمہاری شہوار خانم سے
تو گنا جھوٹی نکلیں۔ ساری عمر میں نے انکو اتنا کھرا اتنا سچا سمجھا تھا۔“

I HATE HER I HATE HER I HATE HER .”

اس نے میز پر زور کا مکہ مارا۔ اگر جدار قہقہہ لگا کر چڑھنٹ بعد وہ آہستہ آہستہ لاپٹے لگی۔

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

FALLING DOWN, FALLING DOWN,

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

FALLING DOWN, FALLING DOWN,

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

MY CROOKED LADY

ڈاکٹر منصور کا شغری سنائے میں آگیا۔ ڈاکٹر عین بیگ پر جُتوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

(۳۱)

جھاڑو تارا

”کہو بھتی ملکِ عنبر —“

”ہاں بھتی ملک کا نور۔“

”کیا حال تے چال ہے۔“

”بُرا۔“

”آوازیں — ؟“

”ہاں۔ مسلسل۔ جیسے کان کے اندر ریڈیو بج رہا ہو — اور چیزیں نظر آتی ہیں۔“

”نگار خانم کے شاگرد پیشے میں داخلے کی تم بھی کینڈی ڈیٹ ہو۔ خوب گزرے گی بابا

سبز پوش کے ساتھ۔“

”پھلیٹ جوک۔“

”جون آف آرک کو بھی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔“

”پھلیٹ۔“

”تم سے اتنا کہا نور منزل ہو آؤ۔“

”گنتی۔“

”انکے ہاں امریکہ سے ایک بڑا توپ سائیکٹر سٹ۔“

”میں بھی کچھ کم توپ ڈاکٹر نہیں ہوں۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔“

”کہنے لگا بس آپ کو اور ورک کا اسٹریٹ ہے۔ اور کچھ ایمونٹل ڈسٹر بنس۔“

”میں بھی یہی کہتا ہوں۔ ہماری اپنی تشخیص کیا ہے؟“

”مجھے سہفت نظری کی نظر لگ گئی ہے۔“

”سہفت نظری کون بلا ہے؟“

”بلا ہی تو ہے۔ جس طرح گجر آبائی کی لڑکیوں نے نانی کے خلاف کلوا بیر کے ذریعے تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تم متحیر نظر آرہے ہو۔ تم سوچ رہے ہو مجھ پر جنون کا دورہ پڑا۔ ہسٹریا کی اگلی اسٹیج پاگل پن۔ کیوں؟“

”اجی چھپ چھپ کے مت دیکھو جی بھنورجی۔ ہم کو خبر لگ جائیگی۔“

”میں یہ سب نہیں سوچ سکتا۔ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔“

”دیکھو جی کنورجی۔ تم نے ابھی سے میرے ساتھ نرمی کا وہ برتاؤ شروع کر دیا جو ہم ڈاکٹر لوگ اعصابی اور ذہنی مریضوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ سنو جی کنورجی۔ کیوں ہنسے۔؟“

”ٹھا کر دلشاد علی خاں یاد آگئے۔“

”وہ انٹرنیشنل کروک؟“

”دلچسپ آدمی ہے۔ کل جب میں تم کو فون کر رہا تھا کلاس اودھ سے۔“

”ملک آرجن منصور وہاں کیوں گیا تھا؟“

”صاحبزادہ دلشاد علی سے ملنے۔“

”وہ اب تک یہاں براجتے ہیں؟“

”جب میں نے وہاں سے تم کو فون کیا اور ملک عنبر کہہ کر تم سے بات شروع کی اور بعد اُنکو بتایا کہ تم کو کبھی ملک عنبر کہتا ہوں تم مجھے ملک کا فور یا ملک آرجن منصور یا کاشغری، مناسبت سے کوئی انٹ سنٹ جینی نام۔ اور اسکا ٹیلنڈ کی مناسبت سے تم کو کبھی لیڈی آف ایبرڈین پکارتا ہوں۔ تو راجہ دلشاد علی نے تو اس نکتے کو بہت ایجو اسے کیا مگر رخا تم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کیوں اسکی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جواب دیا کیونکہ لوگ بہت جھیلے ہیں۔ پوچھا جو کیلے کیا؟“

”ہا ہا ہا۔ نگار خام وہاں راجہ دلشاد کے چکر میں آئی ہونگی۔“

”ظاہر ہے۔ وہ انکے مہمان ہیں۔“

”بہت خوش تھیں؟“

”شاد کام۔“

”اور شہوار؟“

”ناشاد۔“

”کیوں؟“

”اسی لیے کہ اب میں انکے یہاں نہیں جاتا۔“

”جھوٹ تو رچی — تم بھی مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔“

”کیسا جھوٹ — کیسا سچ — سب ہری کی مایا ہے!“

”ہری کی مایا — ہری کی — ہری مایا بھٹنا گر —“

YOU LOW-DOWN SWINE. TRYING TO HIT BELOW THE BELT—

GET THE HELL OUT OF HERE—DROP DEAD. ”

”منصور — منصور — حضرت سلیمانؑ کی عصا میں —“

”دیمک لگ گئی۔“

”کمال ہے۔“

”ہاں خاتون جوتی۔“

”کیا اس دن میں بالکل BUNKERS —؟“

”ہاں۔ تم اسی طرح CALMPOSE پر چڑی رہیں تو اسکا اڈکشن ہو جائے گا۔ خطرنا

”منصور دراصل مجھے IDENTITY CRISIS ہو گیا ہے۔“

”تم اس کرائس میں تنہا نہیں ہو HONEY — تھرڈ ورلڈ کے بہت

انٹلیکچوئلینز اور رابینز بھی IDENTITY—CRISIS—WALLAHS بن چکے ہیں۔“

”تم میری ہر بات ہنسی میں اڑا دیتے ہو۔ میرا مسئلہ اب یہ ہے کہ میں کون ہوں۔
شکورت حسین یا مس امبا پرشاد۔“

”تمہارا تو بہت محدود ذاتی مسئلہ ہے لیڈی آیمبر۔ سموچی قومیں آجکل IDENTITY CRIS میں مبتلا ہیں۔ کہ انکے اندر امبا پرشاد نے کس حد تک سرایت کیا ہے رکن حد تک شکورت حسین۔ وہاں امبا پرشاد کو بالکل مسترد کر دیا گیا ہے۔ یہاں ت سے لوگ شکورت حسین کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں۔ تمہارا معاملہ اردو بھی ملتا جلتا ہے۔“

”پھلیٹ جوک۔“

”اور تم اس گھیلے کو بالکل بھول جاؤ تو کیسا رہے۔ بغیر کامپوز کھاتے۔“
”نصیحت کرنا آسان ہے۔ اب بتاؤ موجودہ صورت حال میں میری اصل SETTI کیا ہے؟“

”سنو امبرینا۔ جب سے انسان غار سے نکلا ہے۔ ایک دوسرے سے ہل چل کر ہی
س اور تہذیبیں بنتی گئی ہیں۔“

”ہاں مگر کتنے خون خرابے اور نفرتوں کے ساتھ۔“

”جو ہوا سو ہوا۔ اب تم اسکے متعلق کچھ کہ نہیں سکتیں۔ تم ماضی کو کس طرح بدل سکتی ہو؟“
”بھوت کال کے بھوت تو موجود ہیں۔“

”اگر تم کماری امبا پرشاد ہی ہو تو کیا حرج ہے؟ لیکن اس صورت میں منترہری مایا جیسی محفول کی کمانڈر انچیف یو۔ کے۔ پی کی فرسٹ کزن البتہ ثابت ہوگی۔ افسوس۔
امبا پرشاد۔ تو انکے بارے میں جو کچھ اب تک سنا مجھے تو نہایت پھلے آدمی معلوم ہوتے۔“
”بکواس۔ ایک سے ایک نام معقول لوگوں کی ناجائز اولاد ہونا میری قیمت میں لکھا
ندے رینال۔ نانا۔ ایک چالو BIRD OF PASSAGE۔ ایک بیوقوف
قلب ڈانگ گریل کو چونا لگا کھنٹا ہو گئے۔ نانی ایک ہارڈ یو ایسلڈ نائیک۔ والد

مخترم امبا پر شادی نہیں اپنی اولاد سولیکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یا والدہ ایک نمبر کا منافق۔ دروغ گو۔“

”اب میں آپ کے اس غیر معمولی اور دلچسپ شجرے کو مثبت طور پر پیش کرتا ہوں۔“
 نانا ایک DASHING مہم جو آرٹسٹ فوٹو گرافر۔ نانی ماہر فن مہتر اور باکمال رفا
 مانند اور ٹھہری ایکسپرٹ۔ والد راتے بہادر امبا پر شادی کا حق ایک وضع دار
 نیک طبیعت رئیس جنہوں نے اپنی طرف سے تمہاری بہتری کی کوشش کی یعنی تم کو ایک
 مسلم شخص دینے کی خاطر سید شکور حسین سے تمہاری والدہ کی شادی کروادی۔
 منسز بھٹناگر والی روایت صحیح ہے۔ مگر راوی ضعیف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس اڑ
 مہترانی اور منسز بھٹناگر کی تانی جی اور ماتا جی اور دوسری بیوقوف عورتوں کی بنائی ہو
 Gossip منسز بھٹناگر جس قسم کی ذہنیت کی نمائندہ تھیں انہوں نے جو طومار باندھ
 اسے سچ ماننے میں مجھے تامل ہوگا۔

”لہذا اب UNUS آیا مسٹر شکور حسین پر۔ وہ البتہ نہایت چڑچڑات ثابت ہو۔
 مگر اس میں بھی اللہ میاں کی مصلحت مضمر تھی۔ تم انکے گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے
 نکلیں۔ بہترین تعلیم و تربیت ہوئی۔ وغیرہ۔“

”لیکن میں انکی جائیز اولاد تو ہوئی۔ انکی بیٹی کی حیثیت سے پستی بڑھتی۔“
 ”ایل۔ ایم۔ سی ماحول اور شدید پردہ۔ سب منظور ہوتا؟“

”بیشک۔ اس IDENTITY CRISIS کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ یاد ہے ایک روز
 جب گوہر جان کے اوصاف بیان کر کے کہنے لگیں کہ یہ اسکے یورپین خون کا اثر تھا وہ
 میں نے کہا تھا شکر ہے میں نہ ہوں کسی قسم کی MIXED BREED اس ایک COMPLEX
 سے تو بچی رہی۔“

”جو حالات شکور حسین صاحب کے گھر کے تم نے بتائے ان میں تمہارا وہاں
 کر بڑا ہونا ناممکن تھا۔ چلو ہو گیا قصہ ختم۔“

”تم ہی بتلاتے ہو شکور صاحب کا ماحول پاکستان جا کر بالکل بدل گیا۔ کایا پلٹ“
 ”ہاں۔ کو لو ٹولہ سے کراچی جم خانہ۔ سہ ماہی میں انکے رویے انکے طبقے کے معاشی اور
 سماجی حالات نے تخلیق کیے تھے۔ لاکھوں لوگوں کی طرح پاکستان میں رفتہ رفتہ انکی کلاس
 بدل گئی۔ اپ درڈلی موبائیل۔ اسکے ساتھ انکے سوئٹل روئے۔“

”تمہاری ماں کو انہوں نے طلاق نہ دی ہوتی اور تم دونوں انکے ساتھ ڈھاکہ چلی گئی
 ہو تیں تو ڈاکٹر صاحب تمہاری زندگی کے تین مختلف منظر نامے ممکن تھے۔ تم جنگ بنگلہ دیش
 میں ماری گئی ہو تیں۔ یا ریفیوجی بنکر دوبارہ کلکتہ آتیں۔ یا براہ نیپال کراچی پہنچیں اور آج
 بہر حال وہاں کی چمکدار کنزیومرسوسائٹی کی ایک SMUG رکن ہو تیں۔ آؤ گنج چل کر
 کافی پی آئیں۔ جلو اٹھو۔“

”نہیں۔ امی نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ ساری عمر جھوٹ بولتی رہیں۔ وہ اڑیہ بھنگن
 جی تھی۔ تم مجھ سے ہمدردی کر رہے ہو۔ سو راجی — STOP BEING SO BLOODY

PATRONISING— GET LOST YOU TWO—TIMING RASCAL.

ر نہ جوتا کھینچ کر ماروں گی۔ بد معاش —
 ”نون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ شہوار خانم نے بلایا ہو گا۔ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔
 ”شام مجھے گومتی پر جھاڑو مارا نظر آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کوئی منحوس بات ہونے
 والی ہے۔“

”منصور بیٹا اسے پھر دئی لے جاؤ۔ آل انڈیا میڈیکل انسٹیٹیوٹ — سنو وہ لوگ —
 — وہ کہیں راپنچی وانچی تو تجویز نہیں کر رہے؟ تمہاری بے چاری پدمابھن جی اسکی
 طرہ جعمرات کو شاہ میٹنا صاحب جاتی ہیں۔ تروپتی کے مندر جانے کو کہہ رہی ہیں وہاں
 منت مان لی ہے۔“

”کیا حماقت ہے۔ میں نے پدماکو سختی سے منع کر رکھا ہے مگر وہ باز نہیں آتیں
 AH—WOMEN!! SILLY GEESE !! ہیں نا؟ مگر منصور بیٹے عتبر جیسی ہوشمند پڑھی
 لڑکی کا یہ حال کیوں ہوا؟“

”نروس بربک ڈاؤن پڑھے لکھے لوگوں ہی کا ہوتا ہے“

”مگر عتبر ہی کیوں؟“

”یہ مجھے بھی تعجب ہے۔ بیخیت ڈاکٹر اسے اس جائیز ناجائز اولاد کے چکر کو اتنی اہمیت
 نہیں دینی چاہیے تھی۔“

”یہ بات میں سمجھ سکتی ہوں۔ اسوجہ سے اس نے ہمیشہ SUFFER کیا ہے جب
 سے بڑی ہوئی اسے خیال رہا ہے اسکی جو UNFORTUNATE بیک گراؤنڈ ہے اسکی د
 سے کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ کلکتہ میڈیکل کالج میں ایک ہم جماعت سید زادہ
 نے پیغام بھجوایا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ صاحب جائیداد اعلیٰ خاندان
 نیک لڑکا تھا۔ میں نے بیاہ کی تیاریاں کر لیں تا رنج طے ہونے سے ذرا قبل ان لوگوں۔
 منگنی توڑ دی۔

”میں نے چھپانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر ان لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ لڑکے کی والدہ
 ٹرین میں پٹنہ سے کلکتہ واپس آرہی تھیں ایک شناسا بیوی ہمسفر تھیں۔ ان سے ذکر کیا۔ فلاں
 لڑکی سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر پی پڑھ رہی ہے دلی کے مغل لوگ ہیں۔ ان پنجابی بیوہ
 نے ناک پہ انگلی رکھ کر جواب دیا۔ اے بہن نہ مغل نہ وُوغل — آپ کس گندی موری
 گرنے جا رہی ہیں وہ تو کنجریوں کی اولاد ہے — لیجئے صاحب۔ انھوں نے کلکتہ پہنچتے
 نسبت توڑ دی۔ ایک اور بیوی میری شناسا کمپارٹمنٹ میں موجود تھیں۔ انھوں نے یہ وا
 مجھے سنایا۔

”اسکے بعد ہی میں نے طے کیا لعنت بھیجو اس معاشرے پر۔ ہم یہاں رہیں گے ہی نہ
 برطانیہ چلی گئی۔“

”پھر واپس کیوں آتیں؟ وہیں رہے جاتیں۔ وہاں تو یہ مسئلہ بیک گراؤنڈ کا پیدا نہ ہوتا

”یہ مسئلہ وہاں بھی خوب پیدا ہوا وہاں ہندوستانیوں پاکستانیوں کا اپنا سماج بن چکا ہے۔ کچھ پرانے دلی والے موجود تھے۔ کچھ کلکتے والے۔ جے پور والی گجربائی کی ایک نواہی بھی وہیں رہتی ہے۔ اس کمنٹ نے سارے میں پھونک دیا۔“

”تعجب ہے۔ آجکل تو لوگ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ خصوصاً باہر رہنے والے۔“
 ”خوب کرتے ہیں۔ عین کو اپنے اس ہینڈی کمپ کا OBSESSION ہو چلا تھا —
 — لیبیا سے یہاں آئی۔ اسی سال نگار خانم کا بھلا بھائی — دونوں بہنیں ایسی اول بول
 ہیں۔ وہ آدمی بہت سمجھدار ہے۔ اس نے پیام دیا۔ عین نے منظور کر لیا۔ مگر ان بہنوں نے
 بھی اسی بنا پر رشتہ نہ ہونے دیا۔ انھوں نے بھی کہیں سے پتہ چلا لیا تھا —

”اسی وجہ سے جب میں نے محسوس کیا کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو میں نے طے کیا
 اس سے قبل کہ تم کو کسی اور ذریعے سے پتہ چلے اور تم بھی بدک جاؤ اور عین غریب کو ایک
 اور زبردست دھکا پہنچے بہتر ہے کہ میں تم کو خود ہی بتلا دوں۔ بلا کم و کاست۔“

”لیکن مجھے حیرت یہ ہے کہ جب ایک عجیب و غریب QUIRK OF FATE کے ذریعے
 خیاط فلک نے نواب بانی کی زرنکار ٹوٹی نگار و شہوار کو اڑھا دی۔ عین کی نانی ان
 دونوں کی دادی بن گئیں۔ جگ ہنسائی ان کھنڈی بہنوں کی ہوئی۔

”تو میرا خیال تھا کہ BOTH OF YOU WILL HAVE THE LAST LAUGH
 مگر اسکے بجائے عین کی حالت روز بروز تیزی سے بگڑتی جا رہی ہے۔ کیا اسکے خاندان میں
 سی پست میں دیوانگی تھی —؟“
 ”دفعاً وہ چپ ہو گیا۔ خاندان کون سا —؟ امبا پرشاد کا یا
 سید شکور حسین کا؟“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ مسٹر بیگ نے جواب دیا۔

”اس پر پہلے ہٹریا کے دورے پڑ چکے ہیں؟“

”نبوروس شاید اس نے نواب بیگ سے ورثے میں حاصل کیا ہے وہ بیدار عصاب
 تھیں۔ بات بے بات رو پڑتی تھیں۔ انکے حالات زندگی ہی ایسے رہے تھے بلکہ
 میں عین کی اس لڑکے سے ملنے ٹوٹی تب بھی اس کا نورس بریک ڈاؤن ہو چلا تھا۔ فوراً ہی

ہم لوگ اڈنبرا چلے گئے۔ وہاں ماحول بدلا۔ ٹھیک ہو گئی۔ اب اس کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ شہوار اسے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے۔“

”یہ تو ذہنی مریضوں کا عام خوف ہوتا ہے۔“

”وہ مجھے بھی اپنا دشمن تصور کرتی ہے۔ جب دورہ پڑتا ہے مجھے گالیاں دیتی ہے یقین نہیں آتا یہ عین ہے۔“

”آپ نے فرمایا تھا آپ کو بھی اپنی والدہ نواب بیگم سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے۔ کہ آپ کو انکا کبریکٹر اور طرز زندگی ناپسند تھا لیکن، مسز بیگم، میں آپ کو ایک بات بتاؤں عین کی اس موجودہ حالت کی ذمہ دار آپ نہیں میں ہوں۔ جی نہیں۔ شہوار کی وجہ سے نہیں محض اپنے زیادہ بولنے کی بدولت۔ جب اس چٹیا بطخ مسز بھٹنا گرنے کہا میں تاؤ جی مشہور شاعر تھے مجھے اس وقت انکا تخلص دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہ وہ تخلص بتائیں نہ پٹاری میں سے امبا پر شاد دوبارہ نکلتے بطور پتاجی۔ نہ عین کی یہ حالت۔“

”مگس کو باغ میں جانے نہ دینا؟ نہیں بھی۔ وہ مسز بھٹنا گرنے کے سالوں میں نواب بیگم کے فوٹو والی خبریں پڑھ کر خود ہی یہ قصہ چھڑ چکی تھی۔ باقی تفصیلات بھی اسی طرح بیان کر دیتی۔ ہونی کو کوئی مال نہیں سکتا۔ مگر واقعی کاش یہ بات نہ نکلتی اور عین مجھے ریاکار اور دروغ گو نہ سمجھتی۔“

”اب آپ اسے باور نہیں کر سکتیں کہ یہ قصہ غلط ہے؟“

”بیٹا اگر کوئی نہ ماننا چاہے تو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے؟“

”آج کل وہ رسی تلاش کرتی پھرتی ہے۔“

”خودکشی کی خواہش؟“

”وہ کہتی ہے تم اور شہوار ملکر اسے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ وہ ہیوسو نیشن دیکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے جس طرح شہوار نے اپنے سب سے بڑے بھائی کو پاگل کر کے شاگردیشہ میں بند کر دیا اسی طرح وہ اسے بھی پاگل کر کے چھوڑے گی۔“

”وہ شاگرد بیٹھے والا خطی ان لوگوں کا بڑا بھائی ہے؟“
 ”عینتر کو اسکی ایک مریضہ نے بتلایا جو ان لوگوں کی ہم وطن ہے۔ علاوہ ازیں انکی بسنتی
 مہری نگار خانم کی دوائیں لینے تمہارے کلنک آتی جاتی رہتی ہے۔ وہ دونوں طرف خبریں
 پہنچانے میں مصروف ہے۔“

”گڈ ہیونز۔۔۔!“

”اسی بسنتی مہری نے عینتر سے کہا کہ انکا بڑا بھائی گھر سے بھاگ کر سادھوؤں کی
 ٹولی سے جا ملا تھا۔ برسوں ہمالیہ کی گچھاؤں میں رہا۔ شمشانوں میں بیٹھ کر کپالیوں سے
 متنزک عملیات سیکھ رہا تھا جیسی اسکا دماغ چل گیا۔“
 ”مسٹر بیگ۔ مجھے اس بیان میں شہوار کی افسانہ طرازی نظر آرہی ہے۔ چلیے۔ خبر

پھر۔۔۔؟“

”بیٹا یہ ممکن ہے۔ کلکتے میں قاضی نذرا لاسلام کے لئے یہی مشہور تھا کہ وہ متنزک
 علم سیکھتے سیکھتے کوئی چیز الٹی کر بیٹھے اسوجہ سے انکا دماغ ماؤف۔“

”آپ بھی اس قسم کی NONSENSE پر یقین کر لیتی ہیں؟“

”قطعی نہیں لیکن یہ تو عین ممکن ہے کہ ایک آدمی روزانہ آدھی رات کو شمشان گھاٹ
 پر جا کے بیٹھے گا تو وہاں کے ہولناک ماحول کی دہشت سے دماغ آپ سے آپ ہی چل
 جائے گا۔“

”چلیے مان لیا۔ پھر۔۔۔؟“

”بسنتی مہری راوی ہے کہ اس نے شہوار سے سنا کہ بڑے بھائی بنا برس کے
 پینچ گنگا گھاٹ پر مردوں کی راکھ کے ڈھیر پر برسوں بیٹھے رہے۔“

”شہوار خانم کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنا چاہیے برائے نکلش۔“

”چنانچہ عینتر کو اب یہ وہم ہو گیا ہے کہ شہوار خانم نے اسی متنزک بھائی کے ذریعے جو
 اب خطی سبز پوش باباجی کہلاتا ہے تم کو آٹکا گوشت کھلوا دیا ہے۔“
 ”کسے۔۔۔؟“

”تمہیں۔ یعنی ڈاکٹر منصور کا شغریٰ کو۔ مزید برآں شہو آرخانم موٹھ بان کے ذریعے اسکا یعنی ڈاکٹر عنبریں بیگ کا کام تمام کیا جاتی ہے۔“

”موٹھ بان کیا شے ہے؟“

”بقول بسنتی مہری دیوالی سے ایک رات قبل اپنے اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے ساحروں کے ذریعے موٹھ بان چلائے جاتے ہیں۔ جادو کی ہنڈیاں اڑتی ہوئی آکر — VICTIM کو لگتی ہیں اور وہ پٹ سے مرجاتا ہے۔ یعنی ایک قسم کا جادوئی فلائنگ بم۔ روکٹ۔“

”اللہ رحم کرے۔ یہ تو عجیب گورکھ دھندا ہو گیا۔ عنبر انڈیا کو کیریئر کنسٹری کہتی تھی فوڈ CRAZY ہو گئی۔ میں اسے جلد از جلد یہاں سے لے جاتا ہوں بوسٹن۔ چند مہینوں میں اچھی ہو جائیگی۔ بسنتی کے علاوہ وہ اور کین لوگوں سے ملتی ہے؟ پدمابھن جی کو تو میں نے منع کر دیا ہے کہ بھارٹ پھونک ٹونے ٹوٹنے کی بات اس سے نہ کریں۔ اور کون؟“

”تم لوگوں کے کلنک میں طرح طرح کی خواتین آتی ہیں۔ ایک سے ایک تو ہم پرست وہ اسے جانے کیا کیا بتلاتی رہتی ہیں۔“

”مگر میں نے اسے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کلنک نہ جائے۔ گھر پر آرام کرے۔ اور میں نے تو اسے وہاں کبھی موجود نہیں پایا۔ نہ شاردانے۔“

”دیوانہ بکار خویش۔ اسے معلوم ہے تم اور شارد اوہاں دس بجے صبح سے پہلے نہیں آتے۔ وہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ۔“

”میں نے آپ سے کتنی بار کہا کہ کار کی کنجیاں چھپا کر رکھیں۔“

”چھپادی ہیں بیٹا۔ وہ مجھ سے کہتی ہے ذرا چہل قدمی کراؤں۔ تھوڑی دور جا کر رکشا لے لیتی ہے۔ کبھی کہتی ہے ذرا کا پتور خرید لاؤں۔“

”کا پتور۔“ میں نے اسے کا پتور کی بھی ممانعت۔“

”میں نے بخشور کشا والے کو منع کر دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں نہ لے جائے۔“

”بخشور کون۔“

”وہی۔ رفعت آرا بریگم کی کینیز انارکلی کا بیٹا۔“

”MY GOD—WHAT A MESS.“ مگر یہ بستی مہری بھی بڑی نمک حرام عورت ہے۔

اپنی مالکن کے بتلائے راز جا کر باہر اگل آئی۔

”اسکی نمکحرامی ہمارے کام آگئی۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ عنبر کے ذہن پر کن واہموں کا خوف

مسلط ہے۔“

”میں ابھی جا کر دو کام کرتا ہوں۔ سبر ایک عنبر کو پوسٹن لے جانے کی تیاری۔ نمبر ۲۔

راجہ دلشاد علی خاں کو شہوار کے ہاں بھیجنا ہوں کہ وہ جا کر ان باباجی سے انکی اصلیت معلوم

کریں۔ اور یہ بھی کہ یہ پاکھنڈی باباجی وہاں بیٹھے بیٹھے کیا فراڈ کر رہے ہیں۔ راجہ صاحب

کمرؤک آدمی ہیں اصلیت فوراً پہچان جائیں گے۔ علاوہ ازیں ان دنوں وہ خاندان بنگلور

گیا ہوا ہے لائین کلیر ہے۔“

”لیکن انکی کوٹھی پر تو گورکھے پہریدار بھی موجود ہیں اور کتا بھی اور باباجی کو ہمیشہ منقل

رکھا جاتا ہے۔ راجہ صاحب ان تک پہنچ پائیں گے؟“

”صاحبزادہ دلشاد علی خان۔؟ منریگ۔ جو میرا شیر آج تک WEST کے

سات ملکوں کی INTERPOL کی گرفت میں نہ آسکا وہ شہوار خانم کے سرونٹس کو ارٹر

تک نہیں پہنچ سکتا؟“



جہانِ مستور

”السلام علیکم باباجی۔“

”وعلیکم السلام۔ ٹھا کر صاحب۔“

”آپ ناجیز سے واقف ہیں؟“

”آپکے نام نامی اور ذات گرامی سے کون واقف نہیں آپ مثل آفتاب کے ہیں جو دنیا کے تاریک ترین گوشوں کو منور کرتا ہے۔ کل شام ہی آپ سے پائیں باغ میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”پائیں باغ میں؟“

”تاریک سڑنگ کے دوسرے سرے پر ایک سہانا چمن ہے۔ گلاب کے پھولوں اور ببل ہزار داستان کے نغموں سے معمور۔ اسی گلستان میں جہاں ع — ارٹنی ہے شراب پھول بن کر۔ ان دنوں بے چاری عتبرین چہل قدمی کرتی نظر آتی ہے۔“

”بہت خوب تو آپ معمول میں بات کرنے کے عادی ہیں لیکن۔ بندہ معے حل کر لینے کا عادی ہے۔ کوئی قفل ایسا نہیں جو کھولا نہ جاسکے۔“

”جناب والا۔ چند قفل ایسے ہیں جنہیں نہ آپ کھول سکتے ہیں نہ میں۔“

”مثلاً۔۔۔؟“

”مرزا غائب نے فرمایا تھا۔ منو عالم دو ہیں! موصوف گنتی میں کمزور تھے۔ عالم بے شمار ہیں۔ یہ سبز رنگ جو آپ میری پوشش کا دیکھتے ہیں فی الحال۔ ایک عالم اور ہے۔ جھٹ پٹے کا دیس۔ وہاں سورج نہ ڈوبتا ہے نہ نکلتا ہے۔ اسی سڑنگ سے ادھر۔ سہانے

باغ سے ملحق۔ جہاں ممت۔ جی۔ آیا خیال شریف میں؟“

”جی۔۔۔“

”بڑا نفیس پائپ ہے۔“

”شکریہ۔“

”سلفے سے شوق فرمائیے گا؟“

”جی نہیں۔ شکریہ۔ میں سلفہ نہیں پیتا۔“

”میں بھی نہیں پیتا۔ تو وہ لوگ سبز فام ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد سب کی رنگت سبز۔
واجگان سبز رنگ۔ خواتین سبز فام۔ میں نے ایک ولایتی کتاب میں یوں پڑھا تھا کہ سترھویں
صدی میں — ریسٹوریشن پیریڈ — جی؟“

”جی —“

”آپکے لئے چاء بناؤں؟ کوٹھی میں تو آپکو نفیس چاء ملتی ہوگی۔“

”جی نہیں۔ عنایت۔ وہ فہمہ سنائیے۔“

”کون سا —؟“

”وہی۔ ریسٹوریشن پیریڈ۔“

”OH I SEE. WELL, MY DEAR FRIEND, I

HAPPENED LONG LONG AGO—IN THE SEVENTEENTH
CENTURY ANNO DOMINI.

دو بچے۔ بہن بھائی۔ سبز فام۔ اس جھٹ پٹے کے دیس سے بھٹک کر عالم آب و گل میں
آسکے تھے۔ انھوں نے پرسان حال کو بتلایا کہ ایک سیاہ ندی ہے۔ اسمیں ایک کشتی پڑی ہوئی
ہے۔ بے پروا کی ناؤ۔ اس پر غلطی سے بیٹھ کر وہ اس کنارے آ پہنچے۔ وہ کہیتوں میں بھٹکتے
پھر رہے تھے۔ ایک کسان انکو اپنے گھر لے آیا۔ عالم آب و گل کا وہ خطہ انگلینڈ کہلاتا تھا۔
اس کسان نے دونوں بچوں کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ وہ ان بے چاروں سے بہت شفقت کروانا۔
اور وہ محض سیم کے بیج کھاتے تھے — وہ کہیتوں میں محنت کرتے کرتے گھل گھل
کر مر گئے۔ یعنی دوبارہ مر گئے۔ اور اس کتاب میں یوں مرقوم تھا کہ عیسائیوں کے ہاں
مرنے والے کی فاتحہ وغیرہ کی رسوم کے لئے بھی چرج میں BEANS ہی پکائی جاتی ہیں۔

اور وہ سبز فام بچے بھی محض BEANS کھاتے تھے۔ بے نالرزہ خیز بات ؟
 ”جیسی تو ولیم صاحب کہہ گیا ہے کہ زمین اور آسمان پر بہت سی چیزیں ایسی ہیں
 جنکے متعلق تم بالکل نہیں جانتے۔ تم نے انگلش لٹریچر پڑھا ہے ہو ریشو — ؟“
 ”تھوڑا سا۔“

YOURS TRULY IS M.A. IN ENGLISH BRACKET FIRST CLASS
 GOLD MEDALLIST BRACKET CLOSED.

”پھر آپ اس لائین میں کیوں کر آتے ؟“
 ”آجا مورے بالما لائین کلیر ہے — کون سی لائین — ؟“
 ”یہی — فلندری — بابا گیری — وغیرہ۔“
 ”آپ اپنی لائین میں کیسے آتے ؟“
 ”میری لائین ؟“
 ”دہی جو آپ نے انیکر لائین پہ شروع کی تھی — لائین مارنے والی — بچہ خبردار۔
 — دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے۔ تاک تاک تھتی —“
 ”آپ تو لگانے اور کنٹھک کے بھی بلند پایہ استاد ہیں۔ کہاں سیکھا ؟“
 ”بچہ۔ ہیراگی کی ٹوہ لینے آیا ہے ؟ بطلیموس اور پفناؤس کا بھائی چیرٹناؤس۔ ارے
 وہ دونوں تو تم سے بہتر ہیں کہ لقمہ حلال کھاتے ہیں۔ ڈونٹ وری۔ ہیراگی صاف بات کہنے
 کا عادی ہے۔ آج عرصہ ۲۴ ماہ کا ہونا ہے کہ ایک رشتے جوگی کو اس چاہ تارک میں برادران
 یوسف نے قید کر رکھا ہے۔ اور خود چاہ زریں پڑے ڈکیاں لگا رہے ہیں۔“
 ”وجہ — ؟“

”دنیا میں ہر چیز بلا وجہ ہے۔ بے مطلب۔ لایعن۔ ہر مصیبت ناگہانی۔“
 ”کچھ آفات کی وجوہات تو بڑی صاف ہوتی ہیں۔ اسباب و نتائج علت و معلول۔“
 ”نہ۔ انھوں نے کُن ہی کیوں کہا۔ ارے جب بنیاد ہی کج ہے تو اب جو حال ہوا سو ہوا۔“
 ”آپ تو بابا جی کفر —“

”باخدا دیوانہ باشند۔“

”یہ دیواروں پر آپ نے کیا کیا سجا رکھا ہے؟“

”چاہ یوسف کو چاہ باپل بنا دیا ہے۔ وہ قبا کہ ہے یہود کا۔ وہ تنترک ہنود کا۔ وہ منڈل مٹی لاماؤں کا۔ اسطرت ہتھ لوگ کی پوتھیاں رکھی ہیں گی وہ کالی جلد والی پُتک اندر آجال۔ پرانی ہندی میں لکھی ہوئی۔ بنارس میں ایک کباڑی سے خریدی تھی۔ نایاب کتاب ہے۔ کالے جادو کے متعلق۔“

”اچھا۔ بابا جی یہ تو تنتر کیا چیز ہے؟ اردو جنریلوں میں اسکا اشتہار بہت دیکھا ہے۔“

”وہ بھی ایک علم دریا تو ہے۔ وہ اس کو نے میں علی گڑھ کا ڈھونا سگ رہا ہے۔“

”آپ کی کنڈلنی شکتی جاگ گئی ہے؟“

”قطعاً نہیں۔ مگر انی دلشاد۔ تم آدمی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو اب میں خاموش رہوں گا۔“

”کیوں؟“

”بعد مدت آپ پہلے شخص ہیں جو بندے کے پاس آن کر بیٹھے ہیں۔ بات چیت

کرنے۔ اب میں خاموش رہوں گا۔“

”لیکن کیوں؟“

”میری مرضی۔“

”ابھی ابھی تو آپ بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہے تھے۔ خاصے نارمل۔“

”تو کیا تو ہمیں ABNORMAL سمجھتا ہے بے؟ آؤٹ آؤٹ۔ بھاگ جا بے

لقد رے۔ عیار۔ چھندر۔ تو کو ہے بے۔“

”اچھا یہ علی گڑھ کا ڈھونا کیا شے ہے؟“

”من کنت مولاه فعلی مولاه۔ در تو م تانا نانا در تو م تانا نانا۔ الالی الالی

اللی اللہ یا للہ الالی الالی یا للہ من کنت مولاه فعلی مولاه۔“

(۳۳)

علی کا دُھونا

”اسلام علیکم شاہ جی!“
 ”وعلیکم السلام! کیوں بھائی۔ کل بھی آئے آج پھر نازل۔ آج دُودھو۔ منکر نکیر۔
 کہتے حضرت آپ کو کیا تکلیف ہے؟“
 ”باباجی۔ یہ ڈاکٹر کا شغریٰ۔“
 ”محتاج تعارف نہیں۔“

”ایسا ہے کہ کل یہاں سے جا کر میں نے ان کو بتلایا تو ان ترانہ علیؑ مولانا من کنت
 مولانا آپ نے یوں الاپا کہ میں نے کسی بڑے سے بڑے تو آل سے ایسا نہیں سنا یقین
 جانے مجھ پر تو لرزہ طاری ہو گیا۔“
 ”جھوٹ مت بک۔“

”واللہ! ڈاکٹر صاحب بھی آپ سے کچھ سننے کے خواہشمند ہیں۔“
 ”اللہ کے ترک امیر خسر و علیہ الرحمہ کا ترانہ سننے کی غرض سے آپ تشریف لائے ہیں!
 یا آپ صاحبان مجھے واقعی دیونہ سمجھتے ہیں۔ یا پرلے درجے کا بیوقوف۔ فرمائیے۔ آپ مجھ
 سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔؟ اور یاد رہے اگر دفعتاً مجھ پر جنون کا دورہ پڑ گیا تو
 آپ دونوں کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔“

”باباجی! ہمیں اپنا پر خلوص دوست سمجھیے۔ ہم آپ کی مدد کے خواہاں ہیں۔“
 ”پُر خلوص۔ بابا۔ واٹ اے جوک۔ اور ڈاکٹر صاحب اپنے حساب آپ دہنوں
 کو کریدتے ہیں مگر ہمارے حساب آپ بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔
 اصلیت آپ بھی نہیں جانتے۔“

”آپ جان گئے ہیں باباجی؟“

”نہ۔“

”تو پھر ہم یہ کیوں رعب ڈال رہے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ کل آپ نے بٹھا کر صاحب کو تو آدھ گھنٹے ہی میں بھگادیا۔ میں ڈاکٹر ہوں اور آپ سے مدد لینے آیا ہوں ٹوہ لینے نہیں۔“

”ہم اپنی مدد ہی نہیں کر سکتے تمہاری کیا۔“

”پامال جملہ ہے۔ باباجی۔ کام کی بات ہو جائے۔“

”پامال تو سارا کارخانہ قدرت ہی ہے۔“

”باباجی۔ کام کی بات۔ ہم مانتے ہیں کہ آپ بالکل صحیح الدماغ ہیں۔ بن رہے

ہیں۔ مستقل بن رہے ہیں۔“

”صاحب۔ بنایا گیا ہوں۔“

”یہی سہی۔ مگر کیوں بنائے گئے ہیں؟ وجہ؟“

”کوئی حسب حال شعر پڑھوں یا باموقع گیت چلے گا؟“

”کاش آپ کے بھائی بہنوں میں اتنا سنس اف ہو مر ہوتا۔“

”تو آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ وہاں ہوتے۔“

”مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟“

”بد نفسی، خود غرضی، اور حالات اور ناگہانی حادثات کا مجموعہ آفات۔“

”کچھ ہیں بھی بتلائیے تاکہ ہم لوگ عبرت اور نصیحت پکڑیں۔“

”ڈاکٹر صاحب آپ تو شاید پکڑ لیں نصیحت مگر صاحبزادہ صاحب چکنا کھڑا ہیں۔“

یہ بتائیے آپ کو وہ لوگ ادھر آنے ہی کیسے دیتے ہیں؟“

”آپ کو تو معلوم ہے وہ سب بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے موقع غنیمت جانا۔“

”اور پھانک کے پہریدار۔ اور قبلائی؟“

”بسنٹی مہری زندہ باد۔!“

بستی مہری۔ وہ پیر بخارا کی شہد؎۔
 ”جب میں اس طرف آیا۔ تو خوش قسمتی سے منشی جی سامنے ہی نظر پڑ گئے۔ پہچان گئے۔
 پہلے پہل آپکے دو لٹانے پر حاضر ہوا۔ ان سے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ امرود تو فر دیا تھا۔
 ”اچھا۔ بابا جی سے آپکی بھینٹ ہو چکی ہے۔“
 ”آپکے بابا جی؟“

”ٹھہریئے۔ ذرا وہ فوٹو گراف اتار دیجئے گا۔ بہت اوپر لگا ہوا ہے۔ اس الماری
 پر چڑھ جاتے۔ اور اوپر۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ جس طرح آپ نے اس روز امرود توڑا تھا۔
 جی۔۔۔ چڑھ جا بیٹا سٹولی پر۔ رام بھلی کریں گے۔ شاباش۔ تھینک یو۔ اب اپنے
 نفیس رومال سے اسکی گرد صاف کیجئے۔ کڈ۔ تھینک یو۔ اب دیکھئے آپکو اسمیں کیا
 نظر آتا ہے؟“

”کھیریل کا ایک برآمدہ ہے۔ اسکے سامنے کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ شاید
 میاں بیوی اور انکی اولاد۔“
 ”جی اور بتائیئے۔“

”ایک جوان لڑکی ہے۔ ایک کمسن تین کمسن لڑکے اور ایک کوئی پچیس سالہ
 نوجوان۔ کوٹ کے کالر پر گولڈ میڈل لگائے۔“
 ”کرسیاں کیسی ہیں؟“

”معمولی۔ جیسی کرسیاں ہوتی ہیں۔“
 ”گھر کیا ہے؟“

”اوسط۔ جیسے شرفار کے گھر ہوتے ہیں۔“
 ”کرسیوں کے نیچے ایرانی قالین بچھا ہے؟“
 ”نہیں بابا جی۔ دھاری دار درسی۔“

پیر بخارا لکھنؤ کا ایک محلہ ہے جہاں کی عورتیں اپنی تیز زبانی اور طراری کے لیے مشہور ہیں۔

”حضرات ایتھویر بے بی براؤن سے کھینچی گئی تھی۔ آج سے بیس سال قبل جب میں نے ناگپور کی ایک میوزک کانفرنس میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ یہ میرے والدین ہیں۔ دونوں چھوٹی بہنیں اور تینوں چھوٹے بھائی۔ مقام اللت پور۔ وقت ۱۹۵۶ء۔ دیگر احوال: والد اوسط درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ بیدایماندار اور مستشرق۔ چند ایکٹرز میں پرکاشت ہوتی تھی۔ اولاد مقامی اسکولوں میں زیر تعلیم۔

”میری والدہ آباجی کی پہلی بیوی ہیں دوسری سے یہ پانچوں۔ یہ لوگ بڑے ہو چکے تھے جب انکی ماں کا انتقال ہو گیا۔ انکو انکے نہایوں نے یہ پٹی پڑھائی کہ میں نے آباجی اور اپنی والدہ کے ساتھ سازش کر کے انکی ماں کی دوا میں زہر ملا دیا تھا۔ اس بہتان نے والد کو دل شکستہ کر دیا۔ میں نے پرداہ نہیں کی۔ نہ ان پانچوں کی محبت میرے دل میں کم ہوئی۔

”ہم اپنی میڈیوکر قانع زندگیاں گزارے جاتے اگر ملک میں REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONS نہ آیا ہوتا اور مجھے پکا کانا سیکھنے کا شوق نہ ہوتا میں کالج میں پڑھتا تھا اور شام کو گانا سیکھنے ایک گوالیاری استاد کے پاس جاتا تھا۔ وہ استاد ایک بندلیکھنڈی نواب زادی کو ستار سکھلاتے تھے۔ اس طرح اُس نیک بخت سے اس بد بخت کی ملاقات ہوئی۔ عشق صادق دونوں طرف پیدا ہوا۔ باپ کے خلاف مرضی شادی پر تیار ہوئی۔ سُن رہے ہیں؟“

”ہم تن گوش“

”ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ مجبوراً بندے کے عقد میں اسے دیدیا۔ وہ کثیر زیورات اور جہیز لیکر غریب خانے پر آئی۔ بہت جلد میری بہنوں نے اس غریب کی زندگی اجیر کر دی۔ والد صاحب کی نیشن ہو گئی۔ مہنگائی تیزی سے بڑھی۔ میں مقامی کالج میں انگریزی کا لیکچرر ہو گیا۔ شام کو ٹیوشن کرتا۔ تاکہ بھائی بہنوں کی تعلیم مکمل کر اسکوں۔ تمنا تھی کہ ایک روز سنگیت سمرٹ کھلاؤں۔ سارے عالم پر اپنے فن کی دھاک بٹھاؤں۔

”سینے کیا آپ حضرات کو واقعی میرا گانا پسند آیا؟ عرصہ گزر گیا مجھ سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہاں تم ایسے ماہر فن ہو۔ کسی نے مجھ سے گانے کی فرمائش نہیں کی۔ آپ جو کہیے سناؤں گا۔ مگر وہ لوگ نہ آجائیں۔“

”ڈریئے مت باباجی۔ ہم لوگ آپکے ساتھ ہیں اپنا قصہ پورا کر دیجئے“

”سمتیرگان نے یہ ضد کی کہ میرا نڈاؤس دہلی میں پڑھیں گی۔ بیوی کے چند زیور فروخت کر کے انکی یہ فرمائش پوری کی۔ ایک بار باباجی ان سے ملنے دلی گئے۔ ہوسٹل کے پھانگ پر تانگے سے اترے۔ معمولی شیروانی پہنے مسکین سے آدمی۔ بہنوں نے کالج میں بڑا ہانک رکھی تھی کہ بندریلکھنڈ کے جاگیردار کی بیٹیاں ہیں۔ والد کو دیکھ کر دوسری لڑکیوں سے کہا ہماری ریاست کے منشی جی آئے ہیں۔ باباجی نے یہ بات سن لی۔ اس دن سے انکا جی دنیا سے اچاٹ ہوا۔ رفتہ رفتہ SENILE ہو گئے۔“

”ابھی میرا دل دنیا سے اچاٹ ہونا باقی تھا۔ اب باقی کل“

”یہ غضب نہ کیجئے باباجی — کیا پتہ وہ لوگ آج شام کی فلائیٹ سے ہی لوٹ آئیں؟“

”پھر کہاں ہم کہاں آپ دونوں؟ بہت خوب سینے۔ نیک بخت کے ہاں پہلو مٹھی کے بچے کی ولادت کی ساعت آتی۔ میں ضروری کام سے جھانسی گیا ہوا تھا۔ والدہ نے بہو کے لئے ڈاکڑنی بلانا چاہی۔ بہنیں دلی سے آئی ہوتی تھیں بولیں لیڈی ڈاکٹر فضول خرچی ہے۔ محلے کی قابلہ بلوائی گئی جو کیس سمجھال نہ پائی۔ جب میں گھر پہنچا ماں اور نوزائیدہ بچہ کھیریل کے نیچے کھڑی چار پائی پر مردہ پاتے۔“

”بیوی اور بچے کی موت کے صدمے سے، بہن بھائیوں کی یحسی اور بے رحمی سے میرا کلیجہ الٹ گیا۔ قلب لوٹ گیا۔ آپ جانتے ہیں کس طرح لوٹتا ہے قلب؟ نہیں جانتے — ہر حضرت دیوانہ ہو گیا۔ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ قبرستان کے نزدیک ایک درگاہ میں جا بیٹھا۔“

”اس خطے میں بھی اولیاء کے مزارات کی کثرت تھی۔ میں نے ان بزرگوں سے گفتگو شروع کی۔ ایک طرفہ سن رکھا تھا ادھی رات کو اولیاء ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ رات رات بھر سرگڑاں رہا کہ انوار کی جھلک مجھے نظر آجائے۔ مگر نہیں صاحب۔ پردے اتنی آسانی سے تھوڑا ہی اٹھتے ہیں ورنہ بھی واقف اسرار ہو جائیں۔

”بیابانوں میں مارا مارا پہلا۔ ایک سنان گھنے جنگل کے وسط میں الاؤ جلتا دکھلائی دیا۔ چند ملنگ اسکے گرد بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ وہ الاؤ علی کا دھونا کہلاتا ہے۔ اور قلندر اسے چوبیس گھنٹے سلگائے رکھتے ہیں۔ وہ ملنگ اپنے دستور کے مطابق لوہے کے کڑے اور زنجیریں پہنے رہتے تھے۔ میں بھی ان کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ انکے ساتھ ایک بڑے جہان مستور کی سیر کی۔ ایک درویش ایسا دیکھا جو اچانک اڑ کر اونچے درخت کی پھنگ پر جا بیٹھا تھا۔ پھر واپس آجاتا تھا اور بالکل خاموش رہتا تھا۔

”مسکرائے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اسوجہ سے میں آپ لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خیر تو اب میں دن دن رات رات بھر بھوکا رہتا۔ طرح طرح کی ریاضتیں کرتا۔ چلے کیھنچتا۔ اس عالم میں مجھے HELLUCINATION نظر آنے لگے۔ چاروں قسم کے۔ بصری۔ سمعی۔ حسی۔ لمسی خوشبوؤں کی پیٹیں آنے لگیں۔ درگاہوں میں جب قوال ترانہ شروع کرتے — علیؑ مولا من کنت مولا — میں وجد میں آکر رقص کرتا — خواجگان چشت کی پیروی میں۔

”گھومتے پھرتے بندیلکھنڈ سے روکیلکھنڈ پہنچا۔ وہاں بھی درگاہوں کی افراط پائی۔ گادوں میں رات کے وقت روہیلے پٹھان دف پر جہا بیت کے مقابلے کرتے۔ انکی ٹولیوں میں شامل ہو جاتا۔ جہاں کہیں کسی طرح کی موسیقی کی آواز سنائی دیتی میں اس طرف پکتا۔ چند ماہ ایک قوال پارٹی کے ساتھ بھی گھوما۔“

”مگر آپ ایک ماہر گویئے ہیں کہیں کسی میوزک کالج میں ملازمت کر لیتے۔ اس طرح کوچہ گردی سے کیا حاصل ہوا؟“

”کوچہ گردی اور صحرا نوردی کا لطف عاشقانِ پاک طینت سے بوجھو۔“

تن من دھن سب راکھ بھینو

لگ گئی آگ بھینور میں“

”باباجی آپ ڈرامہ بھی اچھا کھیل سکتے ہیں۔ افسوس ایک فرسٹ ریٹ پرفورمنگ

آرٹسٹ کی زندگی اس قید خانے میں رائیگاں جا رہی ہے۔“

”اور شجاعت کے جنگل کے شیر علی کا کوئی نام بیوا مجھے چھڑانے نہیں آتا۔“

ایک بار میرا گزر رامپور کے ایک گاؤں سے ہوا۔ جہاں لوگ رات کے وقت الاؤ کے گرد

جمع ایک قسم کی آٹھارے تھے۔ ہمارے بندیلکھنڈ کی آٹھارے جیسی سناؤں —؟

افسوس میرے پاس کوئی ساز نہیں وہ تعالیٰ اٹھا دیجئے۔ دف کا کام دیتی ہے۔ حضرت

میں اردو ہندی بھوپوری پنجابی رقم رقم کے گانے گاسکتا ہوں۔ بنارس کے ایک گرو

سے کتھک سیکھا ہے۔ جب لٹ پور کالج میں پڑھتا تھا جھانسی ریلوے کو لوئی کے اینگلو

انڈین چھو کروں چھو کروں کے ساتھ انگریزی گانے گاتا تھا۔ اس وقت آپکی خدمت میں

ایک روہیلکھنڈی آٹھارے پیش کرتا ہوں — سنیے گا — محمد بن حنفیہ پسر علی دیوؤں سے

کس طرح لڑے تھے۔ ایک غلام بادشاہ توران سے جا کر عرض کرتا ہے

اک لڑکا مسلم کا شاہ گھس گیا شاہی باغ میں آئے

ڈر اور نا کچھ خوف تھا اسکو پسر علی کا ہے بتلائے

”تو شاہ اپنے سپہ سالار سے بولا۔ کیا بولا —؟

لشکرے جا ساتھ تو اپنے پسر حیدر کا ہیں بتلائے

بیٹا ہے گر شیر علی کا اگلے سے مارا نہ جائے

غضب ہے اور بڑا کھلاڑی بتلائیں حیدر کا لال

باپ نے اس کے دنیا بھر سے دیوی دیوتا دیئے نکال

بولا آگے بڑھ کر حاکم سُن رے لونڈے کان لگائے

کیوں توڑے ہے خدا ہمارے سانپ ہکودو بتلائے

”باباجی۔ بات سینے۔“

”اب سینے صاحب۔ عمر عیار شہزادی ماہ پروین کو بیاہنے کی مہم پر چلے۔“

باباجی۔ ایک بات سینے۔ وقت ہمارے پاس کم ہے۔“

”پہلے مسجد نبویؐ میں پہنچے۔ وہاں کیا دیکھا۔؟“

ابوبکرؓ ڈہنے کو بیٹھے دھورے انکے عمر فاروقؓ

پاس انکے عثمان غنیؓ ہیں اور بھی بیٹھے شاہ ملوک

حسن حسینؓ آنے گئے ہیں شیر علیؓ کے دونوں لال۔“

”باباجی۔“

”ابے کیا باباجی کی ٹلگا رکھی ہے۔ بڑے آپ طرم جنگ بنتے ہیں۔ ہے آپ میں

اتنا بوتا کہ ایک بیگناہ بے قصور آدمی کو ان موزیوں ان دیوؤں کی قید سے چھڑوا لیں؟

نہیں ہے نا۔؟ اب آگے بات کیجئے۔ کہنے لگے ہم آپ کے پر خلوص دوست ہیں۔

”صاحبان ذی شان مہربان پاندان خا صدان۔ اب آگے کا سین احوال۔ عمر عیار

کا شاہ توران کے سامنے رسول خداؐ کی چھٹی پیش کرنا۔

آ۔۔ سرخ ہوا غصے میں کافر سنکرا اس چھٹی کا حال

پھاڑ ریاض احمدؒ جی کا ٹکڑے ٹکڑے کیے فی الحال

بکھرے پھر نوا ایسے عمر و ایک ہاتھ میں لیے تلوار

لات کسی کے ڈھال کسی کے مارن لاگے عمر عیار۔“

”ارے رے رے باباجی یہ کیا۔ ارے آپ تو ہمیں کو مارنے لگے۔“

”گڈ گڈ۔ ارے بھئی بس کیجئے۔“

”دیوہوں میں اور بھنگا ہے تو مجھ سے کیوں لڑنے کو آئے

بیجھ تو لڑنے نبیؐ علیؓ کو تو کیا جانے رن کی سار

— زندہ ہے جب تک یہ لونڈا نبیؐ علیؓ کیوں لڑنے آتیں۔“

”باباجی — باباجی صاحب — بس کیجئے — دیکھئے آپکی ڈاڑھی کا احترام ہے
ورنہ ہم بھی آپکو ٹھیک کر دیتے۔“

”اے جاسالے — مجھے بھی تیری کچھڑی مونچھوں پر ترس آگیا۔ ایک گھونٹے میں
ہانپنے لگا۔ بڑا عمر و عیار کا جانشین بنتا ہے۔ آیا تھا اپنے حسابوں انگلیڈ سے چل کر میری احمق
الذی بہن کو ٹنگنے — اے بڑھو گلفام — تیرے تو میں دھوئیں اڑا دوں — گاجر
کے حلوے گل خیر و کے پھول —“

”آپکو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس سیز بخارا کی شہدن نے آپکو یہ اطلاع صحیح نہیں پہنچائی۔
”چپ بد معاش۔ اور ٹوڈا کرٹ بوگس کا شعری۔ میں شاہ توران ہوں تجھ تورانی
طیب کا بھی حلیہ ٹائیٹ کر دوں۔ ادھر بے چاری ڈاکٹر کی کو سبز باغ دکھلاتا ہے ادھر
میری چھوٹی بہن۔ اس بھولی بیوقوف لڑکی پر ڈورے — ایک ٹکٹ میں دو تمنا
— کیوں؟ اچھا جاؤ بچہ۔ تمہیں بھی معاف کیا بیٹھ جاؤ۔ سالے نقلی امریکن —
آئے تھے۔ ہماری مدد کرنے۔ ارے آپ کیا مدد کریں گے ہماری —
”پھر وہی اچھا اچھا تشریف رکھیے۔ صراحی کہاں ہے؟ پانی پیئے۔“

”معاف کرنا مسٹر۔ میں نے تم لوگوں کو پہلے خبردار کر دیا تھا اگر ایک بارگی مجھ پر پڑ
گیا دورہ پھر تمہاری خیر نہیں۔“
”باباجی اگر دوبارہ ہماری ٹھکانی نہ کرنے کا وعدہ کیجئے تو عرض کروں آپ بہترین
اداکار بھی ہیں۔ واقعی کاش آپکا اتنا ورثا ٹیل ٹیلنٹ اس طرح برباد نہ ہوتا۔“
”اچھا اب باقی قصہ سنو گے؟“

”بالکل لیکن بیچ میں کچھ گائیے بجائیے گا نہیں۔ یہ عادت آپکی خطرناک ہے“
”ٹھیک ہے۔ جاؤ معاف کیا۔ علی کے دھونے کے دھورے بیٹھ جاؤ۔“

”اچھا صاحب۔ تو میں حضرت سلطان العارفينؒ کی سرزمین روہلکھنڈ سے نکلا۔“

لکھ جگاتے جوگیوں کا ساتھ ہو گیا۔ گنگا پار کی حضرت سلطان الاولیاء نظام المشائخ کے ودھی یاروں کے ملک میں داخل ہوا چندے زرد پوش دارشی فقراء کی صحبت اٹھائی۔ یہاں سے پورب کا رخ کیا۔ بنارس جا پہنچا۔“

”جہاں آپ نے پنچ گنگا گھاٹ پر اگھوڑیوں اور کپالیوں سے متنترک یوگ سیکھا۔“
 ”بالکل غلط۔ جھوٹ سراسر جھوٹ سفید جھوٹ۔ متنترک سیکھنا جان جو کھوں کا کام ہے۔ پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ یہ ہوائی بھی میری گدھیا بہن شہوار نے اڑائی ہوگی۔“
 ”سنا ہے آپ لوگوں کو الو کا گوشت کھلا دیتے ہیں۔“

”جو لوگ پیدائشی چنند ہیں انکو مزید لحم چنند کھلانے کی کیا ضرورت ہے۔ گو تھاس کے چڑھیاروں کے ہاں ایک اچھا الو واجب قیمت پر مل سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے؟“
 ”باباجی۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ۔“

”جی صاحب سمجھ گیا۔ کچھ بعید نہیں شہوار نے پیر بخارا کی اس شہدن کو پٹی پڑھا دی ہو کہ جاکر ڈاکٹر عنبرین کو اس طرح کی لغو باتوں سے ڈراتی رہے۔“
 ”مگر آخر کیوں۔؟“

”عورات کے ذہنوں کے بھید کون جان سکتا ہے؟ عورت عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ نہیں صاحب۔ خاطر جمع رکھیے۔ occult کا شوق بہت تھا۔ ہاتھ کچھ نہ آیا بس مارا مارا بھڑا۔ تو اپنیوں اور کیرتنوں میں بے تکان گایا۔ نوٹنکیوں میں سوانگ بھرے۔“

”مرزا پور میں ایک نوٹنکی لیلے مجنوں دکھا رہی تھی۔ اس میں شامل ہو گیا۔ مجنوں کا پارٹ کرنے لگا۔ ذکیہ جنتی کی یاد سے دل میں ہوک اکٹھی۔ مجنوں کے بھیس میں ایسے لغزے لگائے کہ منڈوے کی چھت اڑ گئی۔“

”ذہیں پر میرے بھائیوں کے کسی شناسا نے مجھے پہچان لیا۔ فوراً انہیں اطلاع دی۔ وہ لوگ للٹ پور سے آئے۔ پکڑ کر گھر لے گئے۔“

”یہاں تو انھوں نے سوتیلے پن نہیں دکھایا۔ خون کی محبت نے جوش مارا۔“
 ”حضرات! اس وقت میں بھی ہی سمجھا تھا۔ مگر دراصل یہ میری مرحومہ بیوی کے
 زیوروں کی محبت کا جوش تھا جسکے لاکر کی کچی اس غریب کی جوانمردی کے بعد جوش جنوں
 میں نے کہیں پھینک دی تھی۔ اور وہ میری عدم موجودگی میں تلاش بسیار کے باوجود
 انکو نہ ملی تھی۔ ملتی بھی تو لاکر میرے نام کا تھا۔ قصہ کوتاہ قلب پہلے ہی گداز ہو چکا تھا۔
 والدین اور بھائی بہنوں کی محبت میں روتا پٹتا وطن پہنچا۔ گھر کی حالت ناگفتہ بہ نظر آئی۔
 سات آٹھ سال غایب رہا تھا۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔
 انکی خالہ کی لڑکیوں سے۔ دونوں کو معمولی سی ملازمتیں مل گئی تھیں۔ گرائی بڑھتی جا
 رہی تھی۔ میرا نڈا ہاؤس بیدر مہنگا کالچ تھا۔ دونوں بہنیں کوئی ڈگری ایسے بغیر واپس
 آگئی تھیں۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے انکے بیاہ نہیں ہو پائے تھے۔ جس قسم کے عالی مقام
 شوہر وہ چاہتی تھیں۔ ہم کم حیثیت لوگوں کو اس وقت دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ دونوں
 ایک مقامی گرلز اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ ذکیہ مرحومہ کے جہیز کی بیش قیمت اشیاء
 فروخت کر کے انھوں کو دونوں بھٹیوں کی شادیاں رچائی تھیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ
 میری تلاش ان لوگوں کو بنک والے زیورات کی وجہ سے تھی پھر بھی، میں خوش ہوا کہ
 انھیں میری یاد آئی۔ گھر واپس بلایا۔

”بڑی بہن کا اصل نام خوشنودی ہے۔ چھوٹی کا آبادی۔ بڑی لکھنے کی خداداد
 صلاحیت رکھتی تھی۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے اس نے رومانی ناول لکھ کر دو دو سو
 روپے میں نگار خانم کے فرضی نام سے دلی کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کیے۔ میں
 یہ ضرور کہوں گا ان دونوں نے بڑی بہادری اور محنت سے اتنے دنوں گھر کی گاڑی
 چلائی۔ تینوں بھائی ایسوجہ سے انکے بہت ممنون تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کی
 تعلیم انھوں ہی نے پوری کروائی۔ میں نیم دیوانہ کسی نوکری چاکری کے لائق نہ رہا
 تھا۔ گھر والے بھی مجھے مجذوب سمجھنے لگے تھے۔“

”ایک رات، رمضان شریف کی گیارہویں تاریخ میں نے خواب میں ایک ہر ابھرا نکل دیکھا۔ برف پوش پہاڑ اور لکڑی کی ٹالیں۔

”صبح اٹھ کر بھائیوں سے کہا۔ ہلدوانی جاؤ اور لکڑی کی تجارت کرو۔ اللہ برکت دے۔ اسی روز مندوچہ زیورات بنک سے نکال کر انکے حوالے کیا اور کہا اسے فروخت کر کے ٹمبر کام شروع کرو۔ وہ تینوں ہلدوانی پہنچے۔ لکڑی کا بیوپار کیا۔ جنگلات کے ٹھیکے لینے لگے۔

”حضور علیگڑھ اور نیڈمڈل کلاس کو باجماعت پاکستان سدھارے جگ بیت تھے۔ دیوبند بریلی اور نیڈمڈل چھوٹے بڑے سرمایہ دار نے اسکی جگہ لی۔ جنگلات۔ ٹرانسپورٹ۔ صنعتیں جنگی فنکاری مغل انکے اجداد کو سکھلا گئے تھے۔ خوجہ فیروز آباد۔ بیدر۔ مری پور۔ لم گڑھ۔ مراد آباد۔ نگینہ۔ اور صاحب سارا کو شل ساوتھ۔ اور کانپور کا پنجابی سوداگر ربمبئی کا خوجہ بوسہ ڈائیگن۔ گجرات کے چھپی۔ یو۔ پی کا جولاہا۔

”ڈاکٹر صاحب۔ زمیندار اور پروفیشنل کلاس کی جگہ ایک باہمت بارش الحاج رخانے دار ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ بھیانک فساد ہوتے ہیں۔ وہ انہیں بہادری سے جھیل لے جاتا ہے۔ وہ نئی مساجد تعمیر کرواتا ہے سیاسی اور سماجی اعتبار سے زیادہ تر دائیں بازو کا حامی۔ عموماً دیانت دار۔ اوسط درجے کے زمیندار جو ابولشن کی زد میں آئے انہوں نے اپنی زمینوں پر بھٹے، کولڈ اسٹوریج چھوٹے کارخانے لگالیے ہیں۔

”شاہ جی مسلم انٹیٹینیا اور پروفیشنل کلاس میں بھی توتیزی سے اضافہ ہو رہا ہے“

”شیور۔ شیور۔ اور رکشا والوں کی تعداد میں بھی۔ ڈاکٹر صاحب“

”آبادی بے پناہ بڑھ رہی ہے شاہ جی“

”ڈاکٹر صاحب ہم اس سیمینار کو مختصر کر کے باباجی کی داستان پر واپس آئیں؟“

”شاہ جی۔ کاش آپ۔“

”جی ہاں حضور۔ اے کاش۔ کبھی میں بھی تصور کرتا ہوں یونیسکو پیرس کے موسیقی میں بیٹھا خیال کے اور چین پر ریسرچ میں منہمک ہوں۔“

”خیال کے ادیبین پر ریسرچ۔ لطیف نکتہ ہے!“

”شکریہ۔ کبھی سوچتا ہوں اڈینبرا فینٹول میں تانیں اڑا رہا ہوں۔ اور البرٹ ہال لندن — دنیا ان مواقع سے انہی لوگوں کو ہمیشہ محروم رکھتی ہے جنکے وہ سب زیادہ اہل اور مستحق ہیں“

”بابا جی ممکن ہے اس شک کی وجہ سے بھی آپ کے بھائیوں نے آپ کو اور خود اپنے باپ کو ایسی کڑی سزا دے رکھی ہے“

”کون سا شک؟ حضرت دنیا شکوک ہی پر قائم ہے“

”وہی کہ انکی ماں کو خدا نخواستہ آپ نے — یعنی! — YOU DID HER IN!“

”ممکن ہے۔ ایک شرعی رشتے دار میرے نانا سے ایک مقدمہ ہار گیا تھا اسکا بدلہ اس یوں لیا کہ ہمارے خلاف ان پانچوں کے کان بھرے اور خود کراچی نکل گیا۔

”بھائی اسمگلر وغیرہ نہیں لیکن سرمایہ داری کے اندر جال کے ماہر جادوگر۔ میری شدید ایمانداری انکے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے رانچی بھجوا دیا۔ اپنے ذاتی ڈاکٹر کے ساتھ اسٹیشن روانہ کرتے وقت مجھ سے بولے بھائی جان پوری سوسائٹی اوپر سے نیچے تک بے ایمان اور کرپٹ ہو چکی ہے آپ ہمیں ہی ایمانداری کی تلقین کیوں کرتے ہیں۔ وہی کلیشے جو آجکل ہر شخص دہرا رہا ہے۔ کو صاحب۔ مجھے پاگل خانے بھیج کر خود یہاں آ گئے۔

”سال بھر رانچی میں بند رہا۔ اس صدمے نے والدہ کو قریب المرگ کر دیا۔ انہوں نے ان لوگوں سے التجا کی کہ مجھے واپس بلوائیں۔ چاہے بیڑیاں پہنا کر رکھیں۔

”میری دیوانگی اور رانچی جانے کی خبر ان برادرانِ یوسف کے لیے بھی ایک پراہم بلکہ مہتی۔ اگر یہ مشہور ہو گیا کہ بڑا بھائی سبڑی فائر العقل ہے تو پاگل پن موروٹی سمجھا جائیگا۔ بہنوں منجھلے بھائی اور آگے چل کر پرسی بیگم اور دوسرے بچوں کی شادی بیاہ پھٹ کھنڈ پڑے گی۔ لہذا مجھے واپس بلا لیا گیا۔ لیکن والد انکی مفروضہ سابق جاگیر کے

درمیں انکا بیٹا بتلایا گیا۔ یہ جاگیر والی بات بہنوں نے مشہور کی تھی۔ بھائیوں کا اس من گھڑت میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن اسے نبھانا پڑا۔ ارے سربراہ آج اشتہار ایک دیکھا کہ ناچیں گی شب کو مس آقبال پتلی۔

”چنانچہ جیسا کہ آپ نے اس جشنِ اجرائی کی شام بس آقبال پتلی — سوری — مس نواب بانی کی تصویر کے فراڈ کے انکشاف کے موقعے پر ملاحظہ فرمایا — دیوانہ میں نہیں میری بے چاری بہنیں ہیں۔ اللہ انکا محافظ ہو۔ اللہ میرے بھائیوں کا بھی محافظ ہو۔ میں اس اندھیری سُرنگ کے آگے جو باغ ہے اس میں اپنا وقت گزارتا ہوں۔ شاید کوئی خدا ہے — شاید کوئی عالمِ روحانی ہے۔ ورنہ سب ذہن کے الجھٹے — گتھیوں کی گتھیاں — امیر پرست دماغ جو سبز باغ دکھلاتا ہے — ورنہ سب سبز فام مُردوں سے آباد جہانِ ممات —“

”مگر یہ آپ کے بھائی —“

”یہ اخوانِ الشیاطین —“

”مطلب یہ کہ کیا وہ واقعی اتنے بد نفس اور بے رحم ہیں؟ آپکے بھائی بہن تو اس داستان کی روشنی میں بدی کے پتلے معلوم ہوتے ہیں۔“

”گویا ابتلائے مسیح کے ایلزبتھن ڈرامے میں شیطان اور اسکی دُریات —؟ بیشک وہ ایسے ہی ہیں۔ انکی شخصیتوں کا وہ پہلو جس سے میرا سابقہ پڑا ایسا ہی ہے۔ خود غرضی انسان کو پیٹ بھر کر بد اور احسان فراموش بنا دیتی ہے۔“

”صاحبزادہ صاحب۔ آپکو ایک نہایت خوش اطوار خوش مزاج دلکش اور دلچسپ آدمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اندر سے آپکی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی ہے —“

”جی۔۔۔؟“

”جب وہ انگریز لونڈا یہاں آیا تھا وہ شاعر چھو کر اور اس کے ڈنر کے موقعے پر ڈاکٹر صاحب آپ نے میری چھوٹی بہن کے سامنے ذکر فرمایا کہ صاحبزادہ دلشاد علی خاں

کو مافیہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے عالم بالا کی طرف چلتا کر چکی ہے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہے کیا مسلسل قید تنہائی انسانوں کو واقعی PSYCHIC

دیتی ہے؟“

”نہ سائیکلک نہ پائیکلک۔ بندے کی عادت ہے کہ کن سوتیاں پتا ہے۔“

”—۹۹“

”جب کوٹھی میں کوئی اہم ڈنر پارٹی ہوتی ہے خاکسار چپکے سے جا کر اس کھڑک کے نیچے جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہے۔ حضور والا آپ بھی مجھے وہاں دوبار دیکھ چکے ہیں اسی طرح راجہ صاحب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائیوں نے آپکے مخفی احوال کے متعلق اپنے کھوجیوں کے ذریعے ساری انکوائری مکمل کروالی ہے۔“

”جی—۹“

”جی ہاں۔ مگر فکر مت۔ وہ آپکو کوئی گزند نہ پہنچائیں گے کیونکہ اس صورت

میں انکی مزید بدنامی کا خدشہ ہے۔“

”باباجی ایک بات بتائیے۔ جب آپ اکثر اس قید خانے سے نکل بھاگتے ہیں تو یہاں

فرار کیوں نہیں ہو جاتے۔۔۔؟“

”ڈاکٹر صاحب۔ پھانک کے گورکھوں سے بچ کر اگر نکل بھاگوں تو جاؤں کہاں۔

پھر در بدر بھٹکوں۔ بھیک مانگوں۔ اب اس عمر میں مزید آوارہ گردی کی ہمت نہیں بھننے

ہوں اور تنہائی کے عفرتوں سے بیٹھا لڑا کرتا ہوں۔“

”باباجی— چلیے آپکو مغرب میں انٹروڈیوس کر دیں JET-AGE سوامیوں کے

سرکٹ میں۔ میں آپکا منیجر بن جاؤں گا۔ واقعی اس تجویز پر غور کیجئے۔“

”راجہ صاحب۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بنوایئے میرا پاسپورٹ اور لے چلیئے سا۔“

سوامی تو نہیں ایک استاد گویئے کی حیثیت سے۔ مگر مجھے نکلنے کون دیگا۔؟ میں ان لوگو

کے معاملات کے بہت سے راز جانتا ہوں۔ اور باہر کی دنیا میں جا کر اب کروں گا بھی

میری ہمت شل ہو چکی ہے۔ مجھے اپنی ہولناک تنہائیوں، تاریکیوں اور اندرونی آوازوں

اور سنناتے سناٹوں کی عادت ہو گئی ہے۔ میں موسیقی کی خاموش آندھیوں کی زد میں زندہ ہوں۔ میں ایک دھوئیں کی لکیر یا ہوا لے کی طرح ایک سوراخ میں رہتا ہوں۔ جب اس سوراخ پر گندگی انڈیلی جاتی ہے۔ تو برا فروختہ ہو کر جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہوں۔ جیسے اس شام نکلا تھا جب نواب بانی کی تصویر کے وسیلے سے میرے خاندان کے ناموس پر میری جاہ پرست ہمشیرگان نے کچڑا انڈیلی مٹی۔

”چوبیس گھنٹے یہ اس کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل رہتا ہے۔ میں کھڑکی میں سے جھانکتا رہتا ہوں۔ بسنتی یا دوسرے ملازم کھانا اور چائے لیکر آتے ہیں تب یہ دروازہ کھلتا ہے۔ یہ غریب لوگ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور باہر کی رتی رتی خبریں مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔ الامان والحفیظ۔“

”مگر خدا نہ کرے جو ڈاکٹر عنبریں کی یہ حالت ہو۔ وہ مجھے ایک روز شرننگ کے اس پار باغ میں ٹہلتی نظر آئی تھی۔“

”باباجی۔ آپ بالکل صاف باتیں کرتے کرتے پھر اپنے استعاروں میں چلے جاتے ہیں۔“

”جی ہاں کیوں نہیں“

”کیوں نہ؟“

”کیا آپ سب نارمل صحیح اندماغ لوگ اکثر و بیشتر ایسا نہیں کرتے؟ پوری طرح

صاف بات کون کرتا ہے۔ سوائے پاگلوں کے۔؟“

”باباجی۔ کیا عنبریں اس باغ سے لوٹ آئیگی؟“

”یقیناً۔ اسکا مرض لا علاج نہیں۔ کیونکہ اس سے محبت کرنے والی دو ہستیاں

ہیں۔ اسکی ماں اور آپ۔ ڈاکٹر کا شغری۔ آپ دونوں مضبوط ہستیاں ہیں۔ مجھ سے

محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ سوائے میری کمزور اور لاچار ماں کے۔ باپ خود۔“

”باباجی۔ آپ رو رہے ہیں“

”اب آپ صاحبان تشریف لے جائیں۔ آؤٹ۔ آؤٹ۔ گٹ آؤٹ۔ بھاگ جاوے۔“

بھاگ بے لٹو — جلدی جھٹ پٹ — وہ خواجگان مہنہ فرام تمہاری گھات میں
ہیں۔ کالی ندی پر کالی ناؤ بندھ گئی ہے۔ تمہاری منتظر۔ راجہ دلشاد علیاں آپ بھی بے
نیل و مرام یہاں سے لوٹ رہے ہیں۔ میرے بھائیوں نے آپکے متعلق اپنی انکوائری مکمل
کروالی ہے۔ اور خوشنودی عرف نگار خانم پر آپ سے ملنے کی پابندی لگا دی ہے اس
وجہ سے وہ اسے اپنے ساتھ بنگلہ ور لے گئے ہیں تاکہ اس دوران میں انکا جنرل منیجر یا
کوئی سکریٹری آپکو نہایت عزت و تکریم کے ساتھ دلی لیجا کر لندن والے ہوائی جہاز پر
بٹھماں دے۔

”اب نوٹنگی۔۔۔ قاصد آیا لیکے پاتی جس میں مطلب سارا۔ بانیچے کون اب چل دیا
آپ ہی باچن ہارا۔۔۔ خبر آئی ہے واں سے، ہوگئی ہے یاں خبر پہلے۔ اجی یاں خبر
سوچ سوچ کے بن ناحق کو مورکھ تو ہے روتا۔ تجھے لازم تھا۔ اے بے تجھے لازم تھا اپنے
کام کرنا سوچ کر پہلے۔

”آپ یہاں سے ناکام لوٹ رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب۔ اور جب آپ کا ہوائی جہا
یہاں اوپر سے گزرے گا میں اس کھڑکی میں سے رومال ہلا کر آپکو ٹانگڈ بانی کہوں گا۔

بھاگ جا بے THE PITY OF IT, IAGO, THE PITY OF IT.

— ذرا اس کھنٹی پر سے میری ترکی ٹوٹی اتار کر دیتے جانیے۔ اب میں دی ڈانینگ درویٹر
آف قونیہ بتا ہوں — بشنو — بشنو — از نے چوٹ حکایت می کند۔ چوٹ —



(۳۳)

بن دیوی

”ہے عشق اور جنوں بھی — کہیں آہ سرد — کہیں دل میں درد —
 کہیں رنگ زرد — ہے یوں بھی اور —“
 ”پناہ بجزا — یہاں بھی فوٹنگی ہو رہی ہے۔ جدھر جاؤ ادھر فوٹنگی“
 ”ہے یوں بھی اور یوں بھی“
 ”عنبر — یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“
 ”اک مہ جبین نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے —!“
 ”کیا تم خطی لوگ گائے بغیر بات نہیں کر سکتے؟“
 ”ہے مگر اس — نہیں پی کے پاس۔“
 ”عنبر تم پھر گھر سے نکل بھاگیں — یہ کیا رکیٹ —“
 ”نہیں پی کے پاس — غم ورنج دیاس دل کو پڑے ہیں سہنے۔“

“STOP SHOUTING AMBER YOU CANT SING FOR NUTS”

”پھولوں کے زرد گہنے — اک مہ جبین نے پہنے۔“

“AMBER, HONEY, I'M SORRY, BUT YOU' CANT DANCE EITHER”

”پائپ ڈاؤن۔ میں نواب سگیم اور بلبل دی ڈانسر کی اولاد ہوں۔ ان سے بہتر
 ناچ سکتی ہوں“

”عنبر۔ پلیز۔ بات سنو۔ تمہاری امی مسجد پریشان ہیں۔ تم کارے کر پھر نکل بھاگیں۔“
 ”تم لوگ مجھے بابا سبز پوش کی طرح قید میں رکھنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری سازش
 کامیاب نہیں ہونے دوں گی — لو پھر بسنت آئی۔“

”بیٹھ جاؤ۔ اس صوفے پر — آرام سے۔ شاباش۔“

”مجھے زنجیروں سے تو نہیں باندھو گے؟“

”ہرگز نہیں۔“

”تھینک یو۔“

”یہاں کیسے پہنچیں —؟“

”لوگ کہیں سے کہیں کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ طیور آوارہ۔ سائبریا کے پرندے۔“

”ناٹک بند کرو غیر۔“

”امی جان کار کی کنجیاں چھپا دیتی ہیں۔ گملوں میں — گملے بدلتی رہتی ہیں۔ میں بھی جنگلی چوہیا کی طرح لگی رہتی ہوں۔ سارے گملے میں نے کھو ڈالے۔ نکال لیں کنجیاں۔“

”تم کو پتہ ہے تمہاری والدہ کس قدر پریشان —“

”اودہ FORGET HER اچھا تم نے مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا؟“

”جیسے تم نے کنجیاں تلاش کر لیں۔ لیڈی واٹسن —“

”یہ اس پاجی چوکیدار نے فون کیا ہوگا۔“

”رائیٹ۔ اس نے کہا نکھلتو والی ڈاکٹر صاحب یہاں بیٹھی ہیں ڈاک بنگلے میں۔“

”ضلع سینٹاپور میں — محمود آباد جانے والی سڑک پر۔“

”اور کیا بتایا؟“

”اور یہ کہ کمرہ اندر سے بند کر رکھا ہے اور باجہ لگا کر ناچ رہی ہیں — غنبر کتنے افسوس

کی بات ہے۔ سارے یو۔ پی میں تمہاری احمقانہ حرکتوں کے چرچے ہو جائیں گے۔“

”اور ماشائے سگ ہوم کی بدنامی ہوگی۔ جب اس کی ڈاکٹر ٹی ہی سٹرٹن ہے تو وہاں

علاج کروانے کون جائے۔ اور تمہاری آمدنی کم ہو جائے گی۔ — HEY DOC!

GET BACK TO BOSTON—GET BACK TO WHERE YOU BELONG”.

”میں تم کو کبھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

” NO WAY — میں تو سیتا پور کے جنگل میں رہوں گی سیتا جی کی طرح —
 — اور کشدہ الفاظ کے معانی تلاش — ارے حسن حسین بڑے اولیا — جنگل
 بلا لگے — رے دیا — ہمرے اللہ — میں دھے رو رہی ہوں — تم میرے
 بچھے پیچھے یہاں کیوں پہنچے ؟ یاد رکھو یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے ۔“
 ” تمہیں زردو بھجی سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے جنگلی چوہیا — جنگلی بطخ — اچھا
 موصیحا کا اخبار دیکھا ؟“

” موضوع گفتگو تبدیل مت کرو۔ بتاؤ میں اصلیت میں کون ہوں ؟“
 ” سنو تو عنبر۔ آج صبح کے اخباروں میں چھپا ہے کہ نامور برطانوی شاعر نورمن ڈریک نے
 لندن میں پیری سیگم سے سول میرج کر لی اور پیری سیگم کے والد نے اسے عاق کر دیا۔
 ساناؤ لنمنٹ کے ساتھ اخبار والوں نے ایک فٹ نوٹ بھی چھاپا ہے کہ نورمن ڈریک
 زادی قیل کے لکھنؤ کی مشہور اینگلو انڈین رقاصہ نورما ڈریک عرف نرملا دیوی کا بیٹا ہے
 اور کچھ عرصہ قبل یہاں آیا تھا — یہ اطلاع ان بے چاروں کی بدنامی کے تابوت میں
 نری ٹیل — سُن رہی ہو — بے چارے بیوقوف لوگ — دنیا کو خریدنے چلے تھے۔
 ہے ناز و در آج کی تازہ خبر۔“

” ذرا دہ بن دیو سی والی نظم سنا دونا —“

” عنبر تم حد سے زیادہ خود غرض ہو گئی ہو — خود پرست۔“

” ہاں میں تو ہوں ہی بُری۔ کسی کو میری پرواہ نہیں۔ میری اتنی سی خواہش کوئی پوری نہیں
 بنا۔ سب چاہتے ہیں انکی مرضی پر ہمیشہ انکی مرضی پر چلتی رہوں کیا میں اپنی آزادی سے کہیں
 م پھر نہیں سکتی جو تم پولس کانسٹیبل کی طرح مجھے گرفتار کرنے آئے پہنچے ؟ — کیا میں تنہا ڈرائیو
 لئے جنگلوں میں نہیں جاسکتی — کسی خاموش ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر ملکہ کھیراج کے
 نہیں سُن سکتی۔ بالوں میں زرد پھول اڑس کے — تم سب منافق چار سو بیس
 ں سے دور — مجھ سے توکل کی چھو کر پیری سیگم ہی اچھی۔ اپنی مرضی سے جو چاہتی
 کر رہی ہے۔“

”تم کو ساری زندگی مکمل آزادی ملی رہی اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟“
 ”اپنی ماں کے ماضی کے ری ایکشن میں“
 ”او۔ کے۔ تو وہ تمہارا اپنا انتخاب تھا۔ اب اس سے آزاد ہو جاؤ۔“

”NOW IT IS TOO LATE.“ ساری عمر دوسروں کی خدمت۔ ہسپتال نرسنگ ہوم
 آپریشن تھیٹر۔ اڈبورا۔ لندن۔ اصفہان۔ بن غازی ہر جگہ زیادہ سے زیادہ پاؤنڈ
 ٹومان پٹرو ڈالر کمانے کی مشین۔ کیا اب میں ذرا جنگوں میں نہیں گھوم سکتی؟
 اس چکیدار نے تم کو فون کس طرح کیا؟“

”I.A.S. کا کوئی چھو کر ایہاں موجود تھا۔ احمد۔ وہ ہم لوگوں سے واقف ہے۔ چلو
 اب گھر چلیں۔ یار بورمٹ کرو۔ بہت ہو لیا۔ تم اپنی ماں کو پرسیکیوٹ کر کے کس قسم کی
 سزا دینا چاہتی ہو؟ اور اپنے آپ کو کیوں پرسیکیوٹ کر رہی ہو یار۔“
 ”میں اپنے مکان کی صحیح SETTING بنانا چاہتی تھی۔ خود میری SETTING میں
 گر بڑھ گئی۔ میں امبیکا دیوی ہوں یا شا کرہ خاتون؟“

”پھر وہی مرعے کی ایک ٹانگ۔ عنبر تم امبیکا دیوی ہو نہ شا کرہ خاتون

”تم ایک نہایت TROUBLESOME اڑیل ٹٹو خاتون ہو جو اب دوسروں کو
 تنگ کر کے خوش ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم نے میں باتیں برس ایک بے چہرہ
 ہستی کی طرح دوسروں کا علاج معالجہ کیا انکے COMPLEXES کو جھیلا ہے۔
 — اب تم خود سنٹراف انٹیشن بننا چاہتی ہو۔ عنبر تین تم دنیا کی واحد مخلوط النسل اولاد
 نہیں جو تم نے یہ آفت جوت رکھی ہے۔ سچ ہے۔ عورتیں بعض دفعہ اگر چاہیں تو منطق
 بالکل استعمال نہیں کرتیں۔“

”تم SEXIST ہو۔ MALE CHAUVINIST PIG“

”تمہاری والدہ کے شدید FEMINIST روئے نے تمہارا یہ کبار کیا۔ بھئی
 تم تو واقعی جھاڑ کا نشان گیتیں
 ”جھڑک کر بات مت کرو۔ کیسے ڈاکٹر ہو۔“

”دماغ کے ڈاکٹروں کی رائے میں تمہارے ذہن کے کل پُرزے ٹھیک ہیں تم نے اگر اپنی یہ ایکٹنگ نہ چھوڑی تو تمہاری امی تو تم سے دستبردار نہیں ہو سکتیں۔ میں ہو سکتا ہوں۔“

”تم — تم بھاگ جاؤ گے؟“

”قطعاً۔ رات کو بار بار فون کر کے جگاتی ہو۔ فلاں دو اکام نہیں کر رہی فلاں گولی بے اثر ہے۔ فلاں دوا لے کر اسی وقت پہنچو۔ جو دوائیں میں نے منع کر رکھی ہیں وہی ٹھونستی رہتی ہو ہر وقت۔ تم کو پتہ ہے جب تم کار لے کر آدھی رات کو مال آئیو نہ پہنچ جاتی ہو اور میری کھڑکی کے نیچے مسلسل ہارن بجاتی ہو تو سارا ایریا جاگ اٹھتا ہے اور مجھے کس قدر شدید کوفت ہوتی ہے۔ اس وقت۔ پہلے سب کو تم سے ہمدردی تھی اب لوگ تنگ آ گئے ہیں۔ پتہ ماہن جی بے چاری سب کو سمجھاتی پھرتی ہیں۔ پہلے لوگوں کو نواب بگم کی تصویر ایک موضوع گفتگو مل گیا تھا اب GOSSIP یہ ہے کہ ڈاکٹر بیگ کا دماغ چل گیا۔ اور اس کی طرح طرح کی وجوہات بیان کی جا رہی ہیں — یاد رکھو عنبرین۔ تم علاج کے لیے میرے ساتھ چلو نہ چلو اگر تم اسی طرح پریشان کرتی رہیں تو میں مائٹا میں اپنا حصہ فروخت کر کے جلد از جلد امریکہ چلا جاؤں گا واپس —“

”نہیں — نہیں — تم ایسا نہیں کر سکتے۔ منصور تم مجھے چھوڑ دو گے؟ — پلیز — اچھا بس ایک دفعہ وہ بن دیوی والی —“

”تم بن دیوی چھوڑ مہا بن دیوی ہو۔ تم کال بن کی دیوی ہو۔ تم سارے گوریلاؤں کا جدہ ہو — تم بور سے لدے آم کے درختوں سے گزرتی ہو تم خود بور ہو۔ دوسروں کو ور کر رہی ہو۔“

”ہرے — جولی گڈ — چلو باہر چلو — میں آم کے جھڑ میں سے گزرنی تم مجھے دور سے دیکھ کر بتانا کیسی لگتی ہوں —“

”تم ہمیشہ ہر جگہ اچھی لگتی ہو۔ تم ایک دلکش خاتون ہو۔“

”میرا دل رکھنے کے لئے کہہ رہے ہونا — میں ایک ضعیف العمر کم روڈاکٹر نی

ہوں جسے اکیس سال کی عمر سے لے کر آج تک برابر ریجکٹ کیا گیا ہے۔“

”بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ چلو لکھنو واپس چلیں۔“

”نہ۔ اب میں بنوں میں رہوں گی۔ انسانوں کی سستی سے دور۔ میں نے انسانوں

کی سستی میں غلط گھر بنایا۔ وہ تمہارا چینی شاعر۔“

”چینی شاعر کو مار دو گولی۔“

”وہ تو ڈھائی ہزار سال پہلے ہی مر گیا۔ جانے کس طرح مرا ہو گا غریب۔ تمہیں

پتہ ہے برٹش ڈاکٹر مصری میوں کو ایکڑا من کر رہے ہیں یہ معلوم کرنے کیلئے وہ کن

امراض سے مر رہیں۔“

”امریکن ڈاکٹر بھی کر رہے ہیں۔“

”ہنیمہ۔ امریکن ڈاکٹروں کو کچھ نہیں آتا جاتا۔ ہمارے برٹش ڈاکٹروں نے تینک

معلوم کر لیا ہے کہ تو تِ عِخ آمن کو بچپن رہتی تھی بیشتر میاں کس طرح مر رہیں ان کو معلوم

ہو گیا ہے۔“

”میاں مر رہیں اور مرے۔ اور پہلی بات تو یہ کہ وہ مرنے کے بعد میاں بنے۔

یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا ہر حسین عورت دوبار مرتی ہے۔“

”تمہاری والدہ نے تو یہ مفروضہ غلط ثابت کیا۔“

”ہنیمہ۔ پھر میری والدہ۔ ساری عمر انھوں نے مجھے بیک گراؤنڈ میں رکھا۔ ہر جگہ

ہر ملک میں ہر سوسائٹی میں لوگ انہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔“

”کمال ہے یا۔ بعض ماؤں کو اپنی جوان لڑکیوں کی وجہ سے COMPLEX ہو جا

ہے یہاں انا صاحب۔“

”ظاہر ہے تم تو یہ کہو گے ہی۔ تم بھی امی ہی کو ایڈمائیر کرتے ہو۔ مسز بیگ

مسز بیگ۔ میں تو یونہی ایک فالتو سکندری چیز رہی ہوں ہمیشہ میں کسی

میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اسی لئے اب میں بن باسی بن جاؤں گی۔ میں بن دیوی ا

اور بن پر واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”جزاک اللہ۔ جا کر درخت پر اٹھ لٹک جاؤ۔ شاباش۔“

”ALOMA OF THE SOUTH SEAS میں ہوں۔“

”اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہوائیں گنا رہجنا سیکھ لو۔ پھر گراس اسکرٹ پہن کر ان کے پیچھے بڑا سا پھول اڑسو۔ تھوڑو تو اسی رپورٹ کی گراؤنڈ ہوسٹوں میں بھرتی ہو جاؤ۔ ہوائی کے ہوائی اڈے پر ————— عنبر ڈیسر تم کو بھی شہوار کی طرح FANTASY کا شوق ہے ہر عورت کو ہوتا ہے اسی لیے وہ طرح طرح کے لباس اور زیور پہن کر سجا کرتی ہے۔ نت نئے فیشن اپناتی ہے۔“

”عورتوں کی فیشن تو بالکل بے ضرر ہے۔ سردوں کی فیشن ساری دنیا کو تباہ کر دیتی ہے گریٹ لیڈر۔ رہبر قوم۔ فاتح عالم۔ سنو۔ کیا مجھے بھی نگار و شہوار کی طرح

DELUSION OF GRANDEUR ہونا چاہیے؟“

”تم ان بوگس خواتین سے دس ہزار گنا زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہو تمہیں ڈوژن اف گرینڈ بھی نہیں ہو سکتا۔ تم بس اپنی ذات کو نہ ہلکے خیر بنانا چاہتی ہو ————— شاید تمہیں بھی پرفورمنگ آرٹسٹ ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹری غلط پیشہ اختیار کیا۔“

”اپنی ماں اور نانی کی طرح۔ ہیں نا؟ بد معاش کہنے۔ جو تماروں کی گٹ اوٹ۔“

”ان دونوں خبیثوں کے ہاتھوں پٹنا ہی ہماری قسمت میں لکھا ہے آجکل۔ اچھا اب ذرا چپکی بیٹھی رہو۔ رو دمت سہنی۔ دبیس اے گڈ گرل۔ ارے بھئی۔ چوکیدار۔ ڈاکٹر صاحب کا سامان کار میں رکھ دو۔ کم آؤن عنبرنی اے اسپورٹ۔ کم ایلوگ۔“

”تم — تم کون ہو —؟“

”نیو رمانینڈ — چلو لکھنؤ چلیں۔“

”لکھنؤ کیا ہوتا ہے؟“

”چلو گنج چکر کافی پیئیں گے۔“

”کافی کیا ہوتی ہے؟“
 ”عنبر تم نے باقی کیسیٹ کہیں راستے میں پھینک تو نہیں دیے؟“
 ”کیسیٹ کیا؟“

”اب اس نے ایک اور ریکٹ شروع کر رکھا ہے۔ وہ چیزوں کو پہچاننے سے
 منکر ہے۔ مثلاً میں نے پوچھا عنبر تم نے آج کا ٹائمنز آف انڈیا پڑھا؟۔“
 ”ہولی ٹائمنز آف انڈیا کیا؟“
 ”کہا فریڈہ خانم کے ٹیپ منگوائے ہیں۔ ہولی فریڈہ خانم کیا ہوتی ہے؟ اس سے
 میں تاڑ گیا اس نے فریڈہ خانم کیا ہوتا ہے نہیں کہا۔ بن رہی ہے۔ شارڈا نے کہا میں
 عنبر جی یہ پورج کھا لیں۔ ہولی پورج کیا ہوتا ہے؟“
 ”میں نے کہا تمہاری ساس کا سر ہوتا ہے۔ کھاؤ سیدھی طرح ورنہ ایک جھانپڑ
 دول گا۔ ہولی تمہارے اندر غورت کو DOMINATE کرنے کی خواہش موجود ہے
 میں نے شارڈا سے کہا اسے اس کی والدہ کے ویکٹیز لب نے برباد کر دیا۔ فوراً گرج کر
 ہولی میری ماں کو برا نہ کہو وہ دنیا کی بہترین ماں ہیں۔ شارڈا نے خوش ہو کر مجھ سے
 کہا اب عنبر اچھی ہو جائے گی۔“

”سبزیگ۔ اس وقت میں بے حد فکر مند ہوں۔ اب وہ بعض لوگوں کو واقعی
 نہیں پہچانتی اور الفاظ کے سچے بھولتی جا رہی ہے۔ کل صبح میں اپنے کلنک میں بیٹھا
 تھا۔ نرس اس کے کمرے سے اس کا پرچہ لائی یہ دیکھئے۔ ڈیر منسور۔ تم کو یہ معلوم کر کے
 خوشی ہوگی کہ آج میں بے ہتہر ہوں۔ اردو افسانوں کی کوئی کتاب بھجوا دو۔ پڑھنے
 کے لئے۔“

”اب وہ انگریزی بھی اسی طرح لکھتی ہے۔ چھوٹے پتوں کی طرح۔ ذہن کے تباہ

ماؤن ہونے کی یہ پہلی علامت ہے۔ ٹھا کر دلشاد علی عیادت کے لئے نرسنگ ہوم تشریف لائے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے بوسٹن لے جانے سے پہلے لندن آجائیے ہارلے اسٹریٹ کے ڈاکٹر روزن باؤم بڑے نامور سائیکسٹرسٹ ہیں۔ راجہ صاحب بین چارڈن بعد انگلستان واپس جا رہے ہیں۔ وعدہ کر گئے ہیں پہنچتے ہی روزن باؤم سے اپوائنٹمنٹ لے کر مجھے لکھیں گے۔ ہاں اور یہ بھی کہا کہ آپ لوگ قیام و طعام کے متعلق فکر نہ کریں۔ ساؤتھ ہیر میں غریب خانہ موجود ہے۔ جتنے عرصے چاہیں وہاں رہیے۔ بہت بڑا مکان ہے۔ نورما آپ لوگوں کی بہت خاطر میں کرے گی۔ بے حد بھلی عورت ہے۔

”چلو مکان کا مسئلہ تو یوں حل ہوا۔ لندن کی مہنگائی سے ڈر لگ رہا تھا۔“

”جی ہاں خدا کا شکر ہے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔“

”خدا۔۔۔!! بیٹا یہ اتفاقات کا ایک اندھا دھند سلسلہ ہے۔ سارا معاملہ لٹ پیچ۔“

”یوں ہی سہی۔ مگر بہر حال۔ واقعی جن لوگوں کے متعلق ہم اتنے بدگمان ہوتے ہیں آڑے وقت میں وہی کام آتے ہیں۔ اب بتائیے۔ دلشاد علی خاں اور نورماہ خانم۔“

ان سے زیادہ ردِ خلافت ہستیایاں اور کون ہوں گی۔ اور وہی اس وقت —

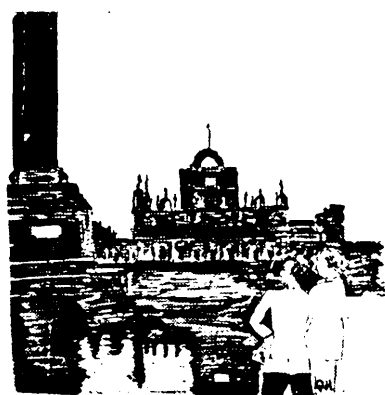
”ذرا نرسنگ ہوم فون کرو۔ غنیمت کیا کر رہی ہے۔“

”جب میں وہاں سے چلا تھا تو نوٹس کی میں مصروف تھی۔ متواتر بیٹھی رٹ رہی تھی کوئی ایسی سکھی چا تر نہ ملی۔ ہلو۔ ہلو۔ لیجئے۔ لیجئے۔ لیجئے سن لیجئے۔“

اب بھی وہی رٹ — کوئی ایسی سکھی چا تر نہ ملی جو پی کا دوا رہتا دیتی —







(۳۵)

مارٹین کوٹھی

خواجہ سبز پوش کے آخری الفاظ تھے — راجہ صاحب آپ یہاں سے بے نیل و مرام واپس جا رہے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر سخت ڈپریشن طاری تھا۔ گذشتہ ہفتے نورما کو مطلع کیا تھا لندن روانہ ہو رہا ہوں۔ مگر اس اشنا میں ایسا واقعہ ہوا جسکے متعلق کاش میں اپنے انٹیکوئیل لڑکے نورمن سے کچھ ڈسکس کر سکتا۔ گو وہ میرے اس ذہنی ورثے سے قطعی ناواقف ہے جو میرے تایاٹھا کر جو ادیبانوں کے کتب خانے میں بھی محفوظ تھا لیکن میں جسے مسترد کر کے پچھتم کے چکوروں کی دنیا جا پہنچا تھا۔ زوال کے بعد اس فردوس گمشدہ کی بازیافت کا خیال بھولے سے بھی نہ آیا۔

نورما کو خط پوسٹ کر کے لوٹا۔ کلاس اودھ کے پھانک پر دو ننھے منے نٹوں کو کھٹکتیاں بچانے دیکھا۔ لکھنؤ کی رنگا رنگ دلفریب دنیا سے کلچرٹ، اکتا کر ہوٹل کے اندر گیا۔ بابا سبز پوش کا الٹا اعلیٰ جملہ کانوں میں گونجا۔ راجہ صاحب آپ یہاں سے بے نیل و مرام — رنگا رشتہوار اینڈ کوہنوز بنگلوں میں بیٹلی فون پر ڈاکٹر کا شغری سے ڈاکٹر ٹریگ کی خیریت دریافت کی۔ خدا حافظ کہا۔ لیفٹ کی طرف بڑھانا کہ اپنے کمرے میں جا کر سلیپنگ شروع کروں۔ خیال آیا پہلے ہوائی جہاز کا وقت دریافت کر لوں۔

سامنے حضرت محل پارک پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ریسپشن کاؤنٹر کے پیچھے اپنی تصویر کے BLOW-UP میں بیگم حضرت محل تلیان کی نئے ہاتھ میں تھامے جہان گذراں کا نظارہ کر رہی تھیں۔

میں انڈین ایر لائنز کے متعلق کلرک سے بات کرنے ہی والا تھا کہ بلواپ کے مقابل میں ایک جانی پہچانی سی بارعب و جیہہ صورت دکھلائی پڑی۔ کینیووں پر گرے بال۔ بڑی

بڑی ٹوکلی مچھیں۔ کھلے کالر کے اندر سبز رنگ کا اسکارف منہ میں پایپ۔ ذرا سا گنجا اور فریہ

پُرانا HUNTING SHOOTING FISHING ٹائپ

وہ بھی ٹھٹھک کر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ارے وہ تو اپنا پرانا یا رنگارنگ لڑکپن کا ساتھی۔ لا مارٹنسر کا ہم سبق — کنورسینڈی اینڈ ریش نرائن سنگھ!! اپنے باپ دادا کی طرح اردو فاکا اسکی بھی گھٹی میں پڑی تھی۔ ”بہتر ہے ملاقات میا خضر سے“ کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ جب سگھہ میں پاکستان گیا تھا اسی بے چارے نے ویزا پاسپورٹ وغیرہ کی دوڑ دھوپ کی تھی۔ گالیاں دیں۔ ”بد معاش کہاں غائب ہو گیا تھا۔ پاکستان جا کر ایک پوسٹ کارڈ تک نہ لکھا۔ پھر ہم نے سنا کہ ولایت میں جا با ہے“ وغیرہ وغیرہ۔

دادا نانا بن چکا ہے۔ تعلقہ داری کے خاتمے کے بعد علاقے پر فارمنگ کرتا ہے۔ میں نے اسے میہم سابتلایا کہ لندن میں اپنی بزنس ہے۔

ہم لوگ ہوٹل کے گلفاٹم ریٹوراں میں جا بیٹھے۔ میں نے کہا بار یہ چلو۔ بولا شراب چھوڑ دی ہے۔ تعجب ہوا۔ ہم پرانے احباب کا تذکرہ کرنے میں ایسے محو ہوئے کہ کنور نے مجھ سے مزید ذاتی سوالات نہیں کیے۔ محض اتنا کہا۔ یا رتم نے تو ولایت میں کسی میہم صاحب سے بیاہر چالایا ہوگا۔ میں نے پھر ہوں ہاں کر دی۔

”کتنے لڑکے ہیں؟“

”ایک“ یاد آیا دودھ والے اولاد کے لیے محض لڑکے استعمال کرتے ہیں۔ لڑکیاں قابل ذکر نہیں۔ مختصر آجواب دیا۔ ”ایک لڑکا ہے۔ لندن میں اخبار نویس ہے۔“

کنور نہایت مسرور و مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ تعلقہ داری کے خاتمے کا اس پر ذرا جو اثر ہوا ہو — لنچ کے بعد کہنے لگا۔ چلو ذرا اپنا کالج گھوم آؤں۔ مارٹن -

تیسرے پہر کو ہم لوگ اس سنٹی منٹل جرنی پر نکلے۔ ہوٹل کے پھانگ سے برآمد ہو کر سامنے اشارہ کرتے ہوئے کنور نے کہا۔ ”واجد علی شاہ قبصر باغ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ بنانا چاہتے تھے اب یہ بد مذاتی کا آٹھواں عجوبہ ہے۔“

”اس معاملے میں تم عنبرین بیگ کو اپنا ہم خیال پاؤ گے!“

”ماتنا والی ڈاکٹر صاحب ہ قطعی —“ وہ سکندر باغ کی طرف مڑ گیا۔ وہاں اسے جانِ عالم کی جینتی نواب سکندر محل کا سمر باؤس یاد آیا۔ ایک آہ بھری: ”یہاں بھی تو گھسان کارن پڑا تھا۔“

”وہ نواب بھی پڑ رہا ہے!“ نئی کورڈونی سے آراستہ بنارسى باغ میں شہریوں کے جم غفیر دیکھ کر میں نے جواب دیا۔ گویا مغرب سے آئے ہوئے ایک یو۔ این ایکسپرٹ کی نظر سے جہان سویم کو دیکھ رہا ہوں۔ بہت جلد اپنے نفیس وحین OVER-POPULATED جہان اول واپس چلا جاؤں گا۔ دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان بھیانک مسائل سے بچ کر کیا بروقت یہاں سے نکل بھاگا تھا۔

بنارسى باغ سے روانہ ہو کر ہم لوگ نواب سعادت علی خاں کی HUNTING LODGE پہنچے — وہ شکار گاہ ٹوکب کی غائب ہوئی۔ نواب قدسیہ محل کے ٹوٹے بھوٹے ولائٹی کاسل کے نزدیک فوجی افسروں کے بنگلے دکھلائی پڑے۔ اچانک یاد آیا۔ اسی دلکش باغ کے اندر ۱۹۴۳ء میں، ادریس لوئیس لائیڈ لکھنؤ کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی دعوت پر بڑے ابا مرحوم فوجی دلخوش سبھا کے جلسے میں تشریف لے گئے تھے۔ اسٹیج پر نورما ڈریک کو بطور ”نرملادیوی“ ناچتے دیکھ کر ان پر یہ بیتناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ لال باغ کی ایک ”لال بی بی“ ہیں!

دلکش کے احاطے کے باہر نئے سرکاری اپارٹمنٹ بلاکس کے آگے سے گزرتے ہوئے دور سبز وادی میں اچانک لامارٹینز کا اونچا مینار نظر آیا کیونکہ نے اپنی مریڈلز موٹری۔ چھاؤنی کی طرف واپس آئے۔ ایک ٹکڑ پر HODSON'S HORSE کے دو نوجوان افسروں کی مرمری قبروں نے متوجہ کیا۔ یہ نوجوان غدر ۱۹۵۶ء میں مارے گئے تھے۔ ارے کیا ہم خود اپنے اپنے غدر میں اندر دنی طور پر نہیں مارے گئے؟

قبروں کے نزدیک ایک لپاٹا مقبرہ استادہ تھا۔ کس کا ہے؟ — قریب کی ایک کوٹھی کے باغیچے میں کسی فوجی افسر کی ہوی، ہاؤس کوٹ میں ملبوس، مالی سے پودے گوارہی تھی۔ اس سے پوچھا۔ کہنے لگی۔ کسی سیکم کی TOMB ہے۔

گوری بی بی معاکسی پُرانی گرل فرینڈ کی طرح یاد آگئیں۔ سٹیڈی نے کارٹاٹ کر تے ہوئے کہا۔ ”کیا یورپین اقوام واقعی ہم سے بہتر ہیں؟ اس عیسائی کالج کا ٹرسٹ جنرل مارٹن کی اس مسلمان دارت کے مقبرے کی کیسی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اسی شہر کے دوسرے مقابر کی شکستہ حالی دیکھو۔ ٹرسٹ انکے بھی موجود ہیں۔“

”نکھنوں میں بیگمات یا مقابر میں مدفون ہیں یا برقعوں میں ملفوف۔“ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

کنورلیکھت ذرا جوش سے بولا۔ ”اور یہ جو سینکڑوں بے پردہ مسلم لڑکیاں کالجوں میں پڑھ رہی ہیں تم کو دکھلائی نہیں دیں؟ تم لوگ دراصل چند مفروضات لیکرواپس آتے ہو اور انکو بدلتا نہیں چاہتے۔ ہاکی چیمپین، بیڈمنٹن کی انڈیا نمبر ون سوکینگ کی انڈیا نمبر ون سب تو مسلم لڑکیاں بن چکی ہیں۔ ہانی سوسائٹی بھی پہلے کی طرح بیگمات سے جگمگا رہی ہے۔ کیا تم ان سے کسی کلب یا پارٹی وغیرہ میں نہیں ملے؟“

”یار۔ یہاں کی نئی ہانی سوسائٹی کی دو ممتاز خواتین سے سابقہ پڑا۔ اب مزید سے ملنے کی تمنا نہیں۔“

کہنے لگا۔ ”دلن بھائی۔ تم بڑے CYNICAL ہو گئے ہو۔ کیا معاملہ ہے؟“

مدتوں بعد کسی نے دلن کہہ کر پکارا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہی آنسوؤں میں جھلملاتی فنگ غازی الدین حیدر کی نہر سامنے نمودار ہوئی جو گورنمنٹ ہاؤس کے پیچھے سے نکل کر سبزہ زاروں سے گذرتی عالم باغ کی سمت رواں تھی۔ جنرل مارٹن کا پاؤڈر میگزین۔ سعادت علی خاں کی حیات بخش۔ یو۔ پی کے لاٹ صاحب کی کوٹھی۔ اب اتر پردیش کا راج تھون۔! لاریب اس آج کو کا بہت پانی اب تک بہہ چکا ہے۔

صوفیا، پانی بہنے کی آواز اپنے اندر سن لیتے ہیں۔

چاروں طرف دلکش کے پرسکون سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ محمد باغ اس برصغیر کی حسین ترین اور انگریزوں کی چھائی ہوئی قدیم ترین چھاؤنیوں میں سے ایک ہے۔ شکر ہے

اس نئی تعمیراتی بیہودگی کا شکار نہیں ہوا۔ ان حسین راستوں پر سے گذرتے ہوئے میرا ذہن سامنے بہتی بادشاہی نہر کی طرح بہتا ہوا دور نکل گیا — اگر میں دو ماہ قبل نگار خانم کو بلیک میل کرنے کے ارادے سے یہاں نہ آتا — سینڈی یعنی سندریشور رائے سنگھ، اس ہمدردیرینہ سے ملاقات کیونکر ہوتی۔

مال روڈ پر واپس آکر دوبارہ گونمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گذرے تو کہنے لگا — ”نواب آصف الدولہ کرنل مارٹن کو روہیلوں سے لڑنے کے لئے بھیجتے ہیں، آصف الدولہ کی فائنڈری میں یہ یورپین افسر ایک خوفناک توپ ڈھالتا ہے اسے انگریز ٹیپو کے خلاف میدان جنگ میں لیجاتے ہیں۔ افسوس“

”جنگ ایران و عراق میں بھی ناک فونزیری بمباری سے متعدد شہر تباہ —“ مرے ڈیزر کے ریڈیو پر خبریں آرہی تھیں، کنور نے سوچ بچ بند کیا۔

”یار تم مسلمانوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔ کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیا،“ پھر خود ہی فوراً موضوع تبدیل کیا — ”یہ حیات بخش کوٹھی پہلے برٹش گورنروں کے لئے حیات بخش ثابت ہوئی تھی اب سودیشی راجہ پالوں کے لئے —“ اس نے قہقہہ لگایا۔

سنہری روشنی میں خاموش خوشگوار راستوں پر سے گذرتے رہے۔ غازی الدین حیدر کنال نے عالم باغ کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔

عالم آراء بیگم کیسا انکا فعل بنوایا تھا جانعالم نے کہ دریچہ ایک نہیں اور ہوادار۔
”وہ کیسے لوگ تھے بھی“ میں نے باوا بلند کہا۔

”کالج میگزین میں تم خاص مضمون نگاری کیا کرتے تھے۔ انگلستان واپس جا کر ایک آرٹیکل لکھنا —“ CAMELOT REVISITED

”اب وہ کہاں ہے۔“

”کیم لوٹ کی خصوصیت یہی تھی کہ چند روزہ تھا“

جنرل کلاڈ مارٹین کا اطالوی محل CONSTANTIA پھانگ پر وہ مانوس تختی

LA MARTINIER COLLEGE 1840

کنور مصنوعی بھیل کے فلک بوس مینار کو نکلنے لگا یا دے وہ ایک بوڑھا انگریز ہسٹری کا استاد ہم سے کہتا تھا۔ آپ لوگ BARONS OF OUDE کی اولاد ہیں آپ کے بڑے بھائی نے بی گم حضرات کا حال کا ساتھ دیا تھا مگر ہارنے کے بعد سمجھداری سے کام لیکر پرتش کر اؤں نے وفادار بن گئے تھے۔ اب آپ لوگ بھی وفادار رہیے۔
”یہ لیکچر کیوں دیا تھا اس نے مجھے بالکل یاد نہیں۔“

”ہم پہاڑ سے لوٹ کر آئے تھے اور وہ جو چٹان تھی نانی تال میں جس کے لیے مشہور تھا کہ جس رسات میں یہ ٹوٹ کر بھیل میں گری اس سال راج کا خاتمہ ہو جائیگا۔ کلاس میں اسکا ہتھ سنا رہے تھے۔“ وہ ہنس پڑا۔

کالج کے گوفن کورس اور زو کا چکر لگایا۔ کارٹولاس اور ہوڈسن ہاؤس کے پیورٹس یاد کیے اور وہ ہاتھی جو بنارسی باغ سے چرایا تھا۔

مادر در سگاہ! — کنور بولا: ”جب ہم یہاں کھیلا کوڈا کرتے تھے ہمیں طعی احساس نہ تھا کہ فرانس کے ایک جولاہے کا بیٹا اپنی ساری دولت یورپین لڑکوں کی تعلیم کے لیے کیوں چھوڑ گیا۔ وہ اس نئے یورپ کا نمائندہ تھا۔ ہم جو مؤجد، اکمال انجینئر۔“
”یہ دولت تو اس نے یہیں سمیٹی تھی۔“ میں نے یاد دلایا: ”مارٹین کوٹھی بھی اس نے نصف الدولہ کو چونا لگانے کے لیے بنائی تھی۔“

کنور نے سر بلایا: ”ایک روز آصف الدولہ سے کہنے لگا آپ کے لیے ایک کروڑ کی مالیت لی کوئی چیز اتنی کم نہیں بنائی اب ایسی عجوبہ روزگار عمارت تعمیر کروں گا جس میں ہر طرف سے رتے موسموں کا نظارہ کیا جاسکے۔ بجلی، بارش، طوفان، سیلاب، چاروں کھونٹ کی ہوائیں، سردی، گرمی۔“ چلو دیکھ آویں وہ موسموں کی گردش کس طرح جھلکتا ہے۔ چاروں کھونٹ کی ہوائیں اسکے اوپر سے کس طور سے گزر رہی ہیں۔“

— سر جھکائے پایپ پینا ایک روش پر ہویا۔ اسکے ساتھ ساتھ قدم رکھتے ہوئے

مجھے خیال آیا کیا ہم سب چلتی پھرتی مارٹین کو ٹھیاں نہیں کہہواؤں اور بدلتے موسموں
 طوفانوں کو سہتے چلے جاتے ہیں۔ کجی میں میں شہزادہ سلیمان شکوہ والی ٹیڑھی کو ٹھی بھی تو
 — اگر انسانوں کی شخصیتوں کو طرز تعمیر سے تشبیہ دی جائے — کلاسیکل — گو
 باروک۔ روکو کو — اپنا کنور مغل را چوت کا آخری نمونہ ہے۔

ہم دونوں نے مارٹین کو ٹھی کے زنان خانے کا رخ کیا۔ اس کے سامنے ایک فرنگی
 کرسی پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ سینڈی کو پہچان کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھ
 ”کنور سندریش نرائن سنگھ!“

”یہ بھی میری طرح یہاں کے پُرانے اسٹوڈنٹ ہیں —“ کنور بولا۔ ”راجہ دشا
 ہندوستان کی اضطراب انگیز تاریخ کے تین فریق — جو کبھی ایک دوسرے
 کے ساتھی بنے کبھی دشمن — اس وقت اس سیاہی مائل رومینٹک طرز تعمیر کی عمارت
 کے سامنے ایک بدلے ہوئے رنگ آسمان کے نیچے کھڑے تھے۔

اندر ”زنان خانے“ کے اطالوی اور ہسپانوی نقش و نگار اس طرح چمک رہے
 تھے۔ رائل اکیڈمی کے مصور کا بنایا ہوا گوری بی بی کا پورٹریٹ ڈرائنگ روم کے آئینہ
 ہنوز موجود۔ ایک اونچے سرسبز درخت کے نیچے سرو قد غرارہ پوش حسین و جمیل گوری بی
 ساتھ ایک کمن لڑکا — جنرل کا متنی جیمز ذوالفقار مارٹن —

کافی پیٹے ہوئے کنور نے ایک بحث طلب موضوع چھیڑ دیا۔ ”گوری بی بی اور سیلی
 جنرل کی حرم تھیں یا بے پالک بیٹیاں؟ مسلمان اور انگریز مورخ تو انہیں حرم ہی بتاتے
 ”بالکل غلط“ میزبان نے نیچے پن سے جواب دیا۔ ”جب او وہ میں تھپڑا ان فاقہ
 موزلم لڑکیوں کو بیٹیاں بنالیا تھا۔ انہیں عیسائی نہیں کیا۔ ان کے لیے ٹرسٹ چھوڑے
 ”میں نے تو کہیں پڑھا ہے کہ سیلی بیگم بیوہ جنرل مارٹن نے شہزادہ سلیمان شکوہ
 ایک بیٹے سے عقد کیا۔ سیلی بیگم کا مقبرہ کوئٹہ میں موجود ہے۔“

”غلط۔ اچھا میں آپ کے لیے کنجی لے آؤں۔“

میزبان کے جانے کے بعد کنور نے آہستہ سے کہا: ”مطلب یہ کہ وہ اولڈ بیچلر اتنا پاکباز تھا اور برتریورپین بھلا وہ نیٹو لو کیوں کا حرم کیوں رکھتا۔“

”مگر وہ تو اس زمانے کے ہندوستان میں یورپیوں کا عام دستور تھا اور فرانیسی آج تک نسل پرست نہیں۔“ میں نے کہا۔ فرنگی کبھی لیکر واپس آیا۔ ہم لوگ تہ خانے کا زینہ اترے۔ بیڑھیوں پر ”سیف الملک جنرل مارٹن صاحب“ کے نام کی مرمری تختی کا ایک ٹکڑا دھرا ہوا تھا یہ سیڑھیاں زندوں کی دنیا کو مردوں کے جہان مستور سے ملاتی ہیں میرے جسم میں سنسنی سے دوڑی۔ پھر موت کے خوف نے آن دلوچا۔ یہ عمر کا تقاضہ ہے۔

نیچے اتر کر ہم جنرل کے قائم کیے ہوئے بنک کے وسیع مرمریں والٹ میں داخل ہوئے۔ ”ایشیا کا پہلا بنک اس نے اس ہال میں کھولا تھا۔“ فرنگی محجر کا دروازہ کھولنے آگے بڑھ گیا۔

”ملٹی نیشنل نہیں قائم کی؟“ سینڈی نے دانتوں میں پائپ دبا کر بڑی مٹھاس سے پوچھا پھر کہا۔ ”دن بھاتی۔ جب اودھ میں قحط پڑا ہے اس چالو چکر آدمی کے دیا لو آقا آصف بطور ریلیف بڑا امام باڑہ تیار کر دیتے ہیں اور رات کے وقت اسے تعمیر کیا جاتا ہے کہ فاقہ زد شرفاء کو مزدوری کرتے شرم نہ آئے۔ یہ شخص اسی زمانے میں ذخیرہ اندوزوں کے لیے بنک کھولتا ہے۔ یہ آہنی دروازہ دیکھو۔ جب سے اب تک ٹس سے مس نہیں ہوا۔“

”یار اب تم ہندوستانی نسل پرست تاریخ داں بن رہے ہو۔“ مارٹن صاحب کا بنک تو بڑا پروگریسو ایسٹپ تھا۔ فیوڈل ازم سے سرمایہ داری کی طرف پہلا قدم۔ ایشیا میں پہلا گیس کا غبارہ بھی اس نے اڑایا۔ اسی مارٹن کو ٹھہی کے باغ سے۔ نہ بھولو کہ اس کے محض دو سو سال بعد آدمی چاند پر پہنچ گیا۔“

”چالو چکر۔“ کنور نے آہستہ سے دہرایا۔ ”پہلے آصف الدولہ کی خاطر یہ محل بنوایا۔ مرتے وقت سوچا نواب وزیر کے جانشین اس پر قبضہ نہ کریں۔ وہ اس میں یورپین بچوں کے لئے اسکول قائم کرنا چاہتا تھا۔ خود کو ہمیں دفن کروا گیا۔ تاکہ عمارت مقبرہ بن جائے۔“

”ہاں سعادت علیاں مقبرے میں تو آکر رہیں گے نہیں۔“ میں نے کہا۔

ہم بنک کے ہال سے ملحق مرمیں کوٹھری میں گئے عرصہ دراز بعد وہ کتبہ پڑھا

HERE LIES GENERAL CLAUD MARTIN,

BORN IN LYONS

THE FIRST DAY OF JANUARY, 1735,

ARRIVED IN INDIA

AS A COMMON SOLDIER,

DIED AT LUCKNOW

THE THIRTEENTH SEPTEMBER 1800

A MAJOR GENERAL.

PRAY FOR HIS SOUL

ماکین صاحب اٹھارہویں صدی کا شمالی سو بجا فوریچون نام کر گیا۔ میں بیسویں صدی کا ایک حقیر چلتا پرزہ۔ اٹھائی گیارہویں چگ۔ اودھ کے دریا دل فرمانروا جنرل مارٹن کے مرنے تھے۔ مانتیا کے بے رحم سرغنہ میری پشت پناہی پر ہیں۔ مغرب کے کسی سرد، کہراؤد شہر میں جب مجھے موت آئیگی تو کیا میرے لوح مزار پر یوں لکھا جائے گا۔

HERE LIES DILSHAD ALI KHAN,

BORN IN DHANPUR, 1919,

ARRIVED IN ENGLAND AS A MODERN

FREEBOOTER

DIED AT _____ A COMMON CROOK

PRAY FOR HIS SOUL.

لرزہ سا طاری ہوا۔ دیکھتے دیکھتے زندگی کی آخری سٹیج آگئی۔ اب اجل کتنی دور ہے۔

سینڈی دوسری طرف کھڑا تھا اسے میری کیفیت کا اندازہ نہ ہوا۔ ہم لوگ باہر نکلے۔ مشرقی پیمائش پر رکھی ”لارڈ کارنوالس“ کو چھوڑا۔ سلطان ٹیپو کی آنکھوں نے اسے دیکھا تھا۔ کانوں نے اسکی گرج سنی تھی۔ شیردل نے اسکے گولوں کا سامنا کیا تھا۔ فتح سری رنگا ٹیپم کی یادگار۔ لکھنؤ واپس لا کر اس توپ کو اسکے خالق کلاڈ مارٹن کے دروازے پر نصب کر دیا گیا تھا۔ اللہ اللہ۔ میں نے اپنی پلکوں پر نمی سی محسوس کی۔ یہ لکھنؤ اگر مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مرتبہ کنور نے مجھے غور سے دیکھا۔ چند لحظے خاموش رہنے کے بعد بولا ”چلو کل ذرا بارہ بجی تک ہو آویں۔ تم دھان پور نہ جاؤ گے۔“

”دھان پور۔“ وہاں جانے کی ہمت ہے نہ رشتہ داروں سے ملنے کی میں کل صبح کے پلین سے دلی جا رہا ہوں۔ بڈنایٹ فلائیٹ سے لندن روانہ براہ ٹوکیو۔“

ڈوبتے سورج کے مقابل میں سرمی آسمان کے نیچے CONSTANTIA ایک سیاہ پہاڑی ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ اور اسکی چھت پر نصب اونچے کلاسیکل مجسمے سیاہ میاں۔ ہم عمارت کی طرف لوٹے۔ سامنے ایک دیوار پر نشانات لگے ہوئے تھے۔ فلاں سنہ میں گومتی کا سیلاب اس نشان تک۔ فلاں سنہ میں اس نشان تک۔ فلاں میں۔۔۔ فلاں میں۔۔۔

”نیلے پانی کی طرح بہتی جاتی ہیں کبھی ان میں طغیانی بھی آجاتی ہے۔ تب بڑی نساہی مچتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آخری طوفان کب آئے گا۔“

”یہ تم بڑی منفی باتیں کرنے لگے ہو“ کنور نے جواب دیا۔

ہم دونوں ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ لامارٹینیر کی موجودہ نسل سامنے سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ طلباء کی ایک لہر کے بعد دوسری گومتی کے مانند بہتی گئی ہے۔ اس وقت پورڈنگ ہاؤس کے ہندو مسلم سکھ بچے اچھلتے کودتے کھیل کے میدان سے واپس آ رہے تھے۔ ایک

لڑکے نے دور سے آواز دی — رکی — وکی — عمران — سینڈی —
 کنور سینڈی مسکرایا: "ہول اور ملٹری کے اعلیٰ عہدے ان لڑکوں کے منتظر ہیں۔ انہیں
 بخشو کی کیا پہچان؟" میں نے کہا۔
 "بخشو کون —؟" کنور نے پوچھا۔

"ہے ایک۔ میرا نیا دوست۔ ہوٹل کے پھانک پر رکشا کھڑی کرتا ہے۔ سابق غلام زادہ۔
 ہم تم BARONS OF OUDH کے غلاموں کی اولاد۔"

"یا رکیا تم ولایت میں رہ کر LEFTIST ہو گئے ہو —؟" کنور نے دریافت کیا۔
 "میں اور لفٹسٹ —؟" میں نے زور کا تہفہ لگایا۔ دل میں عجیب قسم کی شدید بے چینی
 موجزن تھی۔ سورج دُور ندی میں غروب ہو رہا تھا۔
 رائیگاں۔ رائیگاں۔

کنور پر بھی اداسی طاری ہو گئی۔ سنبھالتی کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔
 ایک گورا پیرا سا بچہ سامنے سے بھاگا جا رہا تھا۔ "ادھر آنا بیٹا —" کنور نے اسے
 آواز دی۔ "یہ میرے پوتے کا کلاس فیلو ہے۔ خوب گاتا ہے۔ عمران زیدی۔ یہاں آؤ بیٹا۔ یہ
 تمہارے گریٹ انکل لندن سے آئے ہیں۔ انکو ذرا کوئی گیت سُنا دو جھٹ پٹ۔ شاہباش۔"
 بچے نے فوراً اُنشن کھڑے ہو کر انگلش اسٹائل سے منہ اوپر اٹھایا اور گانا شروع
 کر دیا۔ عہد نامہ قدیم کا ایکسوسینٹیوواں لحن
 BY THE RIVERS OF BABYLON

THERE WE SAT DOWN, YEA, WE WEPT.

جھیل کا پانی شفق رنگ ہو گیا۔ عبرانیوں کی قید بابل ڈھائی ہزار سال قبل کی —
 بہت دُور کی بات تھی۔ بہت دُور کے سُر — گوتی کا یا نی بھی بہت فاصلے سے بہتا ہوا آرہا
 تھا۔ بچے نے بونی ایم کا گیت ختم کیا اور بھاگ گیا۔ ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔
 میں نے آہستہ سے کہا —
 BY THE WATERS OF LUCKNOW

THERE WE SAT DOWN, YEA, WE WEPT

”ہاں۔ اب تک کی زندگی تو ا کا ر ت گئی۔ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ نہ تمہارے ہاں۔ نہ ہمارے۔“ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن —“ ادھ جلا سگریٹ دور پھینک کر اس نے دیا۔ ”بقیہ زندگی تو سوار ت کی جا سکتی ہے۔“

کلا د مارتین نے CONSTANTIA کے نیچے ایک سرنگ بنوائی تھی جو امام باڑہ آصفی دل بھلیاں سے جا ملتی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے، ایک شے دوسری شے، ایک وجود دوسرے وجود سے کن ان دیکھی پراسرار سرنگوں کے ذریعے منسلک ہے؟

شغنی کی روشنی میں کنور پانی کے کنارے کھڑا تھا۔ کالر کے اندر اپنا سبز اسکارف ت کرتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ”چلو کل ذرا بارہنگی کا چکر لگا آویں۔“ میں جھنجھلا گیا۔ یہاں زجلہ پیرس پہنچ کر اپنی ایک کورٹ سروس کا براؤنچ آفس کھولنا ہے۔ اسکے لئے پٹا خہ ریاں بھرتی کرنی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں چلو بارہنگی۔“ یار رہے تم کنویں کے مینڈک، پیرس جانا ہے آپ نے بارہنگی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ارے اتنا پیسہ ہے ذرا ولایت کی لراؤ۔“ ہماری ایک کورٹ سروس تم جیسے روساء کے لیے ہی تو قائم کی گئی ہے۔ میں نے یں اضا فہ کیا۔ ہم لوگ پھانک کی طرف واپس آئے۔

میرا دوست کا میں بیٹھتے ہوئے بولا ”کل تبسیرے پہر روانہ ہو جائیں گے۔ بس ٹوٹھ برش اور سیلینگ سوٹ پیک کر لینا۔“

لڑکپن میں ہم دونوں اسطرح اچانک اپنی اپنی بنیاں اور بندوبستیں اٹھا کر ب بیٹھتے اور پھیلی اور تیز اور مرغابی کے شکار کے لئے چٹھٹ گکریں اور بچشی کے ب کا رخ کرتے۔ یا لکھنؤ سے روانہ ہوتے۔ راستے میں عہد شاہی کی گر بلا میں۔ آصفی رہمہ راجہ ٹکیٹ رائے کی تعمیر کردہ مسجدیں اور شاہان اودھ کے کنٹری ہاؤس چھوڑتے دور جنگلوں کی سمت نکل جاتے۔ میں نے طے کیا۔ ٹھیک ہے۔ لکھنؤ ۸۳۔ اکر لیا۔ اب ذرا اضلاع و قصبات کی ایک جھلک بھی دیکھ لیں۔ پرسیوں ٹوکھو۔

(۳۶)

بن ساگر کے باسی

دوسری صبح ہوٹل آکر کنور مجھے اپنی نئی کوٹھی پر علی گنج لے گیا۔ اسکی بیوی اور بہو تیر
مینی تال گئی ہوئی تھیں، بڑے علاقے پر تھے۔

تیسرے پہر ہم لوگ روانہ ہوئے۔

ازابلاتھو برن کالج۔ فیض آباد روڈ۔ نیا اور برج۔ کرامت حسین گز کالج۔ ”یہ
تک چل رہا ہے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کنور کھربیدہ خاطر ہوا۔ ”اور تمہارا کیا خیال
بند ہو گیا ہوتا۔“

لڑکیوں کے غول کے غول کالج کے وسیع کیمپس سے نکل کر آرہے تھے۔ آگے نشاط گز
نیا بازار۔ پھر اندرانگر۔ حد نظر تک نئے رہائشی اپارٹمنٹ بلاک۔ یوگپٹس کے ایونیو۔ شہر نوا
چکا۔ ہم ہندوستان ایرٹو بیکل فیکٹری کے سامنے سے گزر رہے تھے جب کنور بولا۔ ”خاصہ طویل
ہے پینچتے پینچتے شام ہو جائے گی۔“

”بارہ بجی تو صرف پندرہ میل دور ہے۔“

”ہم ذرا اور آگے جا رہے ہیں۔“

ہم لوگ باتوں میں اسقدر مصروف تھے میں نے اب تک پوچھا ہی نہ تھا کہ کہاں کا
ہے۔ اب دریافت کیا تو بولا۔ ”ہم جہاں جا رہے ہیں وہ اپنے مہمانوں کو بلدی واپس،
آنے دیتے۔ شاید کل بھی ٹھہرنا پڑے۔“

میں جھنجھلا گیا، ”تم رہے ہندوستانی چیٹرفنات۔ وقت کی پابندی تمہارے لئے کوئی

نہیں۔ علاوہ انہیں میں کسی اجنبی کے ہاں ایک دن سے زیادہ ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔
 ”تم نقلی انگریز بن چکے ہو۔ لندن میں رہت ہو۔ مگر ہمارے پیر مہانوں کو بڑے اصرار سے
 روکتے ہیں۔“

”پیر— کیا مطلب؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”جہاں تک مجھے یاد ہے تم تو نامی گرامی
 پلے بوائے ہو کرتے تھے۔“

”تمہارے اسٹائل سے لگتا ہے کہ تم اب تک پلے بوائے چلے جا رہے ہو۔ مگر ہمارا راستہ
 بدل گیا۔ ہم مدھوشالا سے چلے تو مدھوبن میں جانکے۔“

ویسٹ میں کسی گرو یا سوامی کا چیلنا ایسا ایک FAD ہے۔ ہمارے زمانے میں یہاں بے شمار
 اہل ہنود مسلمان درویشوں وغیرہ کے معتقد ہو کرتے تھے۔ مگر آجکل بھی ایسا ہو رہا ہے۔ العجب!
 ہرے بھرے چینٹ سے گذرتے آگے بڑھے۔ دونوں طرف بے پناہ سبزہ۔ شادابی۔
 جھیلیں۔ آم کے باغات۔ ”مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ انڈین کنسٹری سائیڈ اتنی خوبصورت ہے۔“ میں
 نے اظہار خیال کیا۔

”دو تین بجاتی۔ تم تین برس ولایت میں رہ کر بالکل یو۔ کے۔ پی بن گئے۔“
 ”یو۔ کے۔ پی؟“

”لکھنؤ میں ڈاکٹر منصور کا شغری سے ملنے کا اتفاق ہوا؟ ماشا زنگ ہوم والے۔“
 میں چونک پڑا۔ میں نے اسے بتلایا تھا کہ آجکل سہارنپور کا فرینچر امریکی کمپیوٹر کیا جا رہا
 ہے۔ میں اسے برطانیہ امپورٹ کرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہوں۔ اور لکھنؤ کا چکن بادلہ
 درک وغیرہ۔ نواب بیگم کی تصویر والے قصبے کا لکھنؤ میں عام چرچا تھا لیکن کنور نے اب تک اسکا
 تذکرہ بھی نہیں کیا اپنے آپ میں گن تھا۔ کہنے لگا۔ ”میری بیوی اور بہو میں ماشا ہیلتھ کلب جاتی
 رہتی ہیں۔ ڈاکٹر کا شغری کو بھی ہم جانتے ہیں۔ باغ و بہار آدمی ہیں۔ انھوں نے بڑے دلچسپ
 محقق استخراج کر رکھے ہیں۔ یو۔ کے۔ پی یعنی اتو کے پتھے۔“

میں نے اطمینان کی سانس لی۔

چند منٹ بعد ہم بارہ بنکی پہنچ گئے۔ ایک بس اسٹاپ پر غرارہ پوش مسلمان عورتیں

دکھلائی پڑیں۔ پھر وہی خیال آیا جب تک غرارہ باقی ہے کلچر باقی رہیگی۔ بارہ بنکی سے نکل کر پھر شاہراہ پر آئے۔ ایک جگہ ایک بس سے انٹر کر سیاہ برقعے اوڑھے کالج کی لڑکیاں کتابیں سمجھاتے ایک کھیت کی پگڈنڈی پر ہوئیں۔ اور دور ایک گاؤں کی طرف روانہ ہو گئیں جسکی سفید مسجدوں کے کنارے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ دیر تک ان لڑکیوں کے رنگ برنگے غرارے ان کے برقعوں کے نیچے سے نظر آیا کیے۔ اب مجھے غرارہ کو مپلیکس ہونا جا رہا ہے۔

سات میل بعد دیوہ شریف۔ ہائے دیوہ شریف۔ بچپن میں بڑے آبا مرحوم کے ساتھ عرس کی نمائش میں آیا کرتا تھا۔ ایک ماموں بھی وارثی فقیر ہو گئے تھے۔ کنور بولا۔ ذرا اور چند روز ٹھہر جاؤ تو میلے اور مشاعرے میں شریک ہو لینا۔ کروا چوتھ کا چاند میری بیوی اور بہنیں یہیں آکر دیکھتی ہیں۔“

نمائش گاہ کے راجہ اعزاز رسول گیٹ اور بارہ دریوں کے سامنے سے گذرتے ہوئے ایک مستند گائیک کی طرح اطلاع دی۔ ”اس میدان میں دو دروازے موشی — ادھر نمائش حاجی صاحب کا مرمیں مقبرہ ٹھہریوں سے بقتہ نور پونم کے چاند ایسا — اور — اور رات کے سمندر میں پچاس ہزار ہندو مسلمان یا تریوں کا جوار بھاٹا۔“

کنور پہ اب شاید کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ میں خاموش رہا۔ سینٹ پال کے DOME کی عادی آنکھوں کو دور سے روئے کا گنبد دکھلائی دیا۔ سامنے سے ایک جلوس جا رہا تھا۔ ہار پھول اور چادریں لیے مزید غرارہ پوش بے پردہ عورتیں۔

ہر طرف لوکل کلر کی افراط۔ دیوے شریف سے نکلے۔ اب ذرا اکتا کر کنور سے پوچھا ”تمہارے پیر صاحب کسی جنگل بیابان میں رہتے ہیں؟“

وہ خاموش رہا۔ گویا اپنے پیر کا بلا وجہ سرسری تذکرہ کرنا بے ادبی تھی — شاہراہ چھوڑ کر ایک کچی سڑک پر کار موڑی۔

”نم کو راجہ صاحب محمود آباد دیا ہیں؟ راجہ امیر احمد خان مرحوم ۱۰ چند منٹ تک چکولے کھائے کے بعد میں نے سوال کیا۔

”بالکل یاد ہیں۔ سچ نیک انسان تھے۔“

”ہاں۔ ایک زمانے میں جب ان پر مذہب اتہا سے زیادہ طاری ہو گیا تھا انہوں نے کیا کہ باری باری ہر پیغمبر کے طرز حیات کی پیروی کرینگے۔“

”ہمیشہ جو کی روٹی کھاتے تھے۔ سادہ و سادہ سنت آدمی تھے۔“

”ہاں۔ انبیاء بھیڑ میں بھی چرایا کرتے تھے چنانچہ راجہ صاحب نے آسٹریلیا سے بہترین بھیڑیں منگوائیں۔ انکو ندی کنارے چھوڑا گیا۔ اب روز صبح راجہ محمود آباد اپنی رولز پر چراگاہ شریف لے جاتے۔ چوبدار بھیڑوں کو گھیر گھار کر انکی خدمت میں پیش کرتے۔ آپ ایک عصا نبھال کر چیمٹ تک بھیڑوں کو ہر۔ ہر کرتے پھر کار میں بیٹھ کر قلعے واپس چلے جاتے۔“

”تو —؟“

”تم بھی جی کر رہے ہو۔ اپنی مرے ڈیز پر بیٹھ کر کچے راستوں کے دھکے کھاتے کسی کو ردہ ناطف رواں ہو جہاں کسی پیر صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی آئنا کو فائدہ پہنچانے کی دشن کرو گے۔“

”بکومت۔“

”آج کل پاکستان میں بھی فیشن چل پڑا ہے۔ بالخصوص دو متمند سگمات ایک ایک پیر صاحب کی معتقد ہیں۔ وہاں کی طرح یہاں بھی تصوف کا تذکرہ نیا انٹلیکچوئل فیشن معلوم ہوتا ہے۔ ایک سے ایک پرانا مارکسٹ صوفیاء کی بات کرتا ہے بسلسلہ انسان دوستی۔“

”ذہنی فیشن بدلتے رہتے ہیں، کنور نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ایک نامی گرامی مارکس وادی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ دنیا خدا نے پیدا کی۔ انسان خدا نے بنایا۔ بچپن کے نماز روزے کا اثر انسان کی سائیکس میں باقی رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”واٹ اباؤٹ یو؟ تمہاری سائیکس کا بھی یہی احوال ہے؟ یا تم تو انکو ٹپک ہو کرتے تھے۔“

”ہم محض اپنے مرشد کو مانتے ہیں۔“

”ہمارے خیال میں تم تنگ گئے ہو۔ بڑھاپے میں کوئی نہ کوئی تنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ تم ٹھیک گئے ہو یا سینڈی۔ پتہ ہے تمہاری اس روحانیت کے چکر میں میرا انجمن بھر ڈھیلہ اچھلا۔“

اس ناممکن سٹک پر اور کتنے میل جانا ہے؟“
 ”چپ چاپ چلے چلو — مگر تم ظاہری مذہب پرستی اور سچی دینداری میں آج تک تمیز نہیں
 کر پاتے؟ ساری دنیا کا تجربہ تو رکھتے ہو؟“

میں نے کہا: ”یہ سب بڑی اضافی اصطلاحات ہیں سچی دینداری وغیرہ“
 ”GENUINELY RELIGIOUS“ لوگ ہی MYSTICISM کی طرف چلے جاتے
 ہیں۔ کنور نے جواب دیا۔

مجھے طیش آگیا: ”ارے یار۔ صوفی شاعروں کی سرزمین میں آجکل کیا دیوان حافظ سے
 فال نکالی جاتی ہے کہ آج کتنے دانشوروں کو پھانسی دی جائے کتنی حاملہ عورتوں کو گولی ماری
 جائے؟ وہ لوگ بھی تو خود کو سچے دیندار سمجھتے ہیں جو یہ سب کر رہے ہیں وہاں۔“
 ”کامیاب بزنس مین کے علاوہ تم ایک باشعور سیاسی مبصر بھی بن چکے ہو!“
 ”جس لائن میں ہم ہیں اس میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے ضروری ہیں۔“
 ”کون لائن —؟ اچھا وہ ایکسپورٹ امپورٹ؟“ کنور نے بھولپن سے پوچھا۔ پھر بولا۔
 ”ہاں۔ ہم تم سے متفق ہیں۔ مذہب ہمارے ہاں تو BIG BUSINESS بھی بن چکا ہے۔
 بہت سے نینا لوگ ایک دوسرے کے خلاف لگیے اور سون کرواتے ہیں جیوتشی اور روانی یا
 مشیر بنے ہوئے ہیں۔ عجیب ہڑبونگ مچی ہے۔ لہذا — جو چند ایک سچے نفقرا اور یوگی موجود
 ہیں انکی طرف سے بھی لوگ بدظن۔“

”تصوف تو دودھائی سو سال سے آلودہ ہو چکا ہے اسی کرشن اور توہم پرستی کے خلاف
 ہمارے ہاں شاہ ولی اللہؒ نے —“
 ”معلوم ہے۔“

”کم از کم ایک بات تو ہے۔ اپنے مرشد کے اثر سے تم نہایت لائق فائق ہو گئے!“
 ”شکریہ۔ شکریہ!“ کنور نے منہسکر کہا اور کار کو ایک گڑھے کے کنارے سے نکالنے
 میں منہمک ہو گیا۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد پھر بولا — ”تم کو معلوم ہے کمبیرج یونیورسٹی
 کے پروفیسر ڈیبراگ نے کچھ عرصہ قبل ایک مضمون لکھا کہ نظریاتی فزکس میں جو کچھ ہو سکے کی چیزیں

تھیں وہ تو اننگ ہو چکیں جو پر اہم باقی ہیں وہ عرصہ دراز تک حل نہیں ہو سکتے۔
 ”فرانس میں —“ اس نے کار کو پھر ایک جگہ لوے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”فرانس میں بہت سی ریاضی داں ایسے ہیں جو اپنے کام کے ذریعے مٹھیمیکس میں زبردست انقلاب لائے۔ اپنی PRIME پر پہنچ کر وہ دفعتاً MYSTICISM کی طرف چلے گئے۔ انتہائی
 اٹلکچرٹیل سرگرمیوں کے بعد انسان کہیں اور — آگے دیکھنے لگتا ہے TRANSCENDENTAL POWERS کی طرف۔“

”کیا دانشوروں کا دماغ خراب نہیں ہو سکتا؟“ میں نے کہا۔ ”بڑے بڑے سائنسداں
 ایک وقت آتا ہے کہ SENILE بھی ہو جاتے ہیں۔“
 ”فرانس کے ان جوان سال MATHMETICIANS کی بات کر رہا ہوں یا جو اپنے
 PRIME میں کیتھولک تصوف کی طرف چلے گئے۔“

”انکی سائنسی میں جو انکے رومن کیتھولک ورثے کا اثر تھا وہ عود کر آیا —“ میں نے جواب دیا۔
 کنورچپ ہو گیا۔ میں باہر دیکھنے لگا۔ دونوں طرف دھان کے کھیت۔ طراوٹ۔ آم کے
 باغ۔ جھیلیں۔ درمیان سے گذرتی شکستہ کچی بل کھاتی سڑک — چار سٹوہریابی پر اپنا
 جادہ حیات بھی تو اسی طرح اُڈ بڑکھا بڑ ہے۔ بیڑھا میڑھا میرا بطنی لینڈ اسکیپ۔
 کنور جانے کیا سوچ رہا تھا، کچھ دیر بعد بولا ”دلن بھائی۔ ہر درخت، ہر ندی، ہر پھل
 پتہ دھرتی کا ایک اسٹیمٹنٹ ہے۔“

بانس کے ایک بھنڈ میں چھپرے تلے غرارہ پوش لڑکیاں سہاگ گارہی تھیں۔ جی بیٹھ گیا۔
 کنور سے کہا ذرا گرنا۔ کان لگا کر سنا۔ ایسا لگایہ آوازیں دھان پور سے آرہی ہیں۔ پنڈت جو
 آویں راجہ راس گنا نے۔ پنڈت کانگ میرے ابا کو دیکھو۔ سہاگ مانگن گئی حضرت
 بی بی کے انگنا — حضرت بی بی کے انگنا۔

کنور نے کار آگے بڑھائی راستے کے کنارے چند مضبوط اونچے درخت جڑ سے
 اکھڑے پڑے تھے۔ پچھلی آندھی میں بڑی تنہا سی آئی۔ اس سال پہا کا بھی خطرہ ہے۔
 بو۔ پی ادبہار میں بہت گڑ بڑ بھالا چل رہا ہے دلن بھائی۔ کریشن اتنا ہے کہ ٹھیکیدار کمزور بندہ

باندھتے ہیں جو ہر برسات میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمالیہ پر درخت بے تحاشا کاٹے جا رہے ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کی مٹی گر گر کر ندیوں کو اٹھلا کیے دے رہی ہے۔ سیلابوں کا زور بڑھ گیا۔ ”یا تم تو خوش نصیب ہو کہ اپنی جگہ کھڑے ہو جڑوں سمیت“ میں نے کہا۔ ”تمہیں اپنے آپ کو انگلیٹنڈ وغیرہ ٹرانس پلانٹ کرنے کا خیال نہ آیا“

”ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی بہت بڑھیا موقعہ ملنا تو چلے جاتے“

”مزید کچے جھونپڑے“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”راستے میں اتنی نئی فیکٹریاں ملیں اور ساتھ ساتھ ایسے پسماندہ گاؤں“

”انہی پسماندہ گاؤں سے نکل کر لڑکیاں لڑکے الیکٹرونک انجینیر بن رہے ہیں“

کنور بڑا قوم پرست آدمی ہے۔

پھر زور سے دھکا لگا۔ اس جگہ راستہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ”بڑی اٹکل پچو ترقی ہے یا۔ ایسی بڑھیا شاہراہیں اور ایسے کچے راستے“

”ترقی ہو تو رہی ہے۔ اٹکل پچو ہی سہی۔ میرا ایک سالانیو جزی کے ایک حسین گاؤں میں سیٹل ہو گیا ہے ایک بار آیا تو اپنے شاندار مکان کی تصویریں دکھلا رہا تھا۔ بات بات پر میرے ویلج میں، یہ اور، میرے ویلج میں وہ۔ میں نے کہا تم ان کچے جھونپڑوں والے غلیظ گاؤں کو مسترد کر سکتے ہو انکے چھروں اور بکھڑوں کی وجہ سے جھینپ بھی سکتے ہو مگر کیا یہ امیکر قریہ واقعی تمہارا گاؤں ہے؟ تمہاری اولاد کا شاید ہو جائے۔ دلتن بھائی کیا وہاں رہتے ہوئے تمہیں بھی اپنے ایشیائی اور بچن سے شرم آتی ہے؟ اس نے مسکرا کر ذرا غو سے مجھے دیکھا۔ قطع سے تو تم بامسانی اینٹیلین سمجھے جاسکتے ہو۔“

میں خاموش رہا۔

”نام بھی بدل سکتے ہو۔“ DELI SHAW ELI KAHN ”وہ مذاق کر رہا“

لیکن مجھے اپنے کار کے پیچھے گرمی محسوس ہوئی۔

کہنے لگا: ”تم درختوں کی بات کر رہے تھے۔ ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہ گھرانہ ساڑ

پانچ سو سال سے اسی دنیاؤسی گاؤں میں رہ رہا ہے۔ وہی درگاہ۔ وہی کچے مکان۔ وہ

کھیت کھلیاں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے لیکر آج پرانے منسٹر انڈر کانڈھی کے دور تک۔ افق پر ایک گھنا WOODLAND دیکھتے ہو؟ اسمیں محبت کے جنگل کا تیسرے رہتا ہے۔“
میں نے اس لڑکی کی جگہ کی داد دی۔

دھان کے لہریں مارتے ہرے سمندر کے کنارے ایک مسجد نظر آئی۔ نیلے آسمان میں ایک چمکیلا سفید کٹ آؤٹ۔ سیاہی مائل سبز درختوں کا جزیرہ جو ہرے سمندر سے گھرا ہوا تھا۔
”بن ساگر کے بن باسی“

”کون چیز؟“

”ہمارے شیخ کے جدا مجد بہت بڑے بزرگ تھے۔ سنٹرل ایشیا سے آئے تھے۔ مائے دیں میں گھومتے پھرتے مالوہ پہنچے۔ وہاں کا سور یہ ونشی راجہ انکا مرید ہو گیا۔ مالوہ سے چلنے لگے تو بہت دکھی ہوا کہنے لگا آپ کے جانے سے میرا جل سا گر بے رنگ ہو جائے گا۔ اپنا بالک یہیں چھوڑ دیجئے۔“ جل سا گر سارنگ ہو جائے۔“

”ساگر تو ہوتا ہی جل کا ہے بھئی۔“ میں نے کہا۔

”فقراے ہنود کی بول چال میں عالم علوی بن ساگر کہلاتا تھا اسکا مشاہدہ کرنے والے بن باسی۔ عالم غلی جل ساگر۔ ہم تم سب جل باسی ہیں۔“
”دیسری انٹر سنگ“ میں نے اخلافا کہا۔

”مرشد زادے کو راجہ نے بیٹا بنالیا۔ اسکے مرنے کے بعد راجکمار سارنگ جو تھے وہ گدی نشین ہوئے۔ شہر سارنگ پورا انہوں نے ہی تو بسایا تھا ریاست دیو آس میں۔“
”ای۔ ایم۔ فورسٹر والا دیو آس؟“

”ہی۔ اچھا تو سورگیہ راجہ کی جو بیٹی تھی۔ وہ مخدوم۔“ آئی مین۔ راجکمار سارنگ کی گویا بہن ہوئی نا؟ اسکا بیاہ فیروز شاہ تغلق کے بیٹے شہزادہ محمود سے ہوا۔ تو اس رشتے سے شہزادہ راجہ سارنگ کا بہنوئی بن گیا۔ بادشاہ نے انہیں دئی باکرا اونچا منصب ملا مقرر کیا۔ کنور نے گاڑی کی رفتار دھیمی کی۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سندھ سے دئی تشریف لائے۔

یاریہ بڑے FASCINATING بزرگ رہے ہونگے۔ ایک روز فیروز شاہ نے خانقاہ میں انہیں
 حاضر بھیج دیا۔ ملک سارنگ ساتھ گئے۔ سوچو کیا منظر رہا ہوگا۔ غلاموں کا جلوس سر پر جوان پوش
 اٹھائے جلعت پہنے ملک سارنگ آگے آگے گھوڑے پر

”اچھا۔ تو کوئٹہ فیروز شاہ سے روانہ ہو کر اس خانقاہ کے پھانک پر پہنچے ہیں۔ مخدوم جہانیاں
 نے لکھا ہے سلطان نے انہیں دلی کی چالیں خانقاہوں کا انچارج مقرر کیا تھا۔ تو جناب ملک
 سارنگ اسپ تازی سے اتر کر اندر پہنچے ہیں۔ دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔

”مخدوم درباری امیر سے انکا حال احوال دریافت کرتے ہیں تب ملک سارنگ کو پتہ
 چلتا ہے کہ وہ تو مخدوم جہانیاں کے فرسٹ کزن ہیں۔

”خود مخدوم زادے تھے۔ جہانیاں جہاں گشت کے اثر سے سنیاں لے لیا۔ حج کرنے کیلئے
 پیدل روانہ ہو گئے۔ وہاں سے لوٹے گھومتے پھرتے دلی سے سینکڑوں میل دور اس بن بھوم
 میں آپہنچے۔ گیان دھیان کرنے“
 سینڈی تصوف اور یوگ کی اصطلاحات بتے لکان استعمال کر رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک گاؤں نظر آیا۔ سامنے جو جنگل ہے یہی انکا تپ دن تھا۔ وہ دیکھو مسجد
 کے نزدیک ہر گنبد دکھائی پڑ رہا ہے۔ انکا مزار شریف۔ لکھنؤ کے شاہ مینا صاحب انکے خلیفہ تھے۔
 ”بہت خوب“

”غرض انکا کل ہی ختم ہوا ہے۔ انکے وصال کے پانچ سو سال بعد اس خاندان میں میاں
 کے والد پہلے دلی پیدا ہوئے۔ میاں دوسرے“

گاؤں میں داخل ہو کر کنور نے مرسیڈیز ایک برگڈ کے نیچے روک لی۔

(۳۷)

دریائے نور

میلہ اٹھ چکا تھا۔ دوکانیں بڑھانی جا رہی تھیں کچی سڑک پر چرخ چوں کرتا ایک چھکڑا
ن کر رکھا۔ گوگلز لگائے سفید ساری میں ملبوس ایک گوری جیٹی خاتون اس پر سے اتریں۔ کنور کو
ہچان کر نمسکار کیا۔ درگاہ کی سمت چلی گئیں۔ پھاٹک پر ایک صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے
نور کو آواز دی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے دوڑا گیا۔ میں مرتے ڈیز سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
نام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مکانوں میں چراغ جل رہے تھے۔ تین برس مغرب کی چکا چوند میں
زار نے کے بعد میں وطن کے ایک نیم تاریک خالقہی گاؤں میں موجود تھا۔ اپنے دوست کی
توں پر غور کیا۔ شرک۔ بدعت۔ توہمات۔ ری ایکشن اور غیر سائنسی ذہنیت کو فروغ دینے
اے یہ پیر فقیر، خواص و عوام کے لیے اتنی بڑی افیم تھے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ اس ادھام
رست ملک میں یہ آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔ گھڑی دیکھی۔ کنور کے بچے نے اس کو ردہ میں
اڈالا۔ یہاں ساری شام کس طرح کٹے گی۔ اور رات مجھ پر بھی ضرور ہونگے۔ اس وقت طیارے
کے انتظار میں آرام سے پالم کی لاؤنج میں بیٹھا شیوا اس ریگال سے شغل کر رہا ہوتا۔

سامنے دوپٹی لٹپیوں اور تہمد پوش مسلمان کسانوں اور دھوتی پوش ہندو کسانوں کا جھوم
ڑھتا جا رہا تھا۔ ایک شامیانے کے نیچے کرسیاں اور کھاٹ بچھے تھے۔ وہاں بھی لوگ جمع
تھے۔ چند قدم پر سرکنڈوں سے گھرا تالاب۔ درگاہ کے نزدیک ایک وسیع کچا مکان۔
پھاٹک پر ایک سرخ پوش فقیر نے نعرہ لگایا — حق — حق — حق —

ایسی وقت بند دروازوں اور سبز پردوں والی ایک جیپ تیزی سے آن کر مکان کے صدم
روازے پر رکی۔ بڑھیا گوگلز لگائے ایک خوشرو نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا۔ دوسرے لمحے سفید
ون اور آبی رنگ کی جرسی میں ملبوس گھنگریا لے بالوں والا تھیلیٹک قسم کا وہ کشیدہ قامت

شخص دروازہ کھول کر جیپ سے اتر ا۔ ہمارے کنورینڈی کی طرح کا ایک اوفیشن ابل ٹیس زادا جو اپنے پیر سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔

لیکن جوں ہی وہ گاڑی سے نمودار ہوا بھیڑ اسکی سمت لپکی۔ اس نے مسکر اکر سب کو اشیرواد دی اور شاہانہ وقار کے ساتھ مکان کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔

اب میں پکرایا ممکن ہے یہ پیر صاحب کا بھانجا بھیجیا ہو جو MOD ہو گیا ہے اور پیر صاحب کے معتقدین اسکے بھی دست بوسی قد بوسی کرتے ہیں۔

گلیمرس نوجوان ڈیوڑھی کی کچی سیڑھیوں پر پہنچا ہی تھا کہ کنور بھاگتا ہوا آیا اور جھک کر اسکے پیروں پر سر رکھ دیا۔ نوجوان نے شفقت سے مسکر اکر کنور کے سر پر ہاتھ رکھا۔

میں حیران پریشان کار کے پاس کھڑا تھا۔ کنور نے مجھے آواز دی میں وہیں ٹھٹھکا رہا۔ نوجوان اندر چلا گیا۔

چھکڑا کھڑا کھڑا آنا ہوا برگد کی چھاؤں میں پہنچا۔ اس پر سے اتر کر برساتی پوش خاتون کچھ دیر قبل درگاہ میں گئی تھیں۔ گاڑی بان مرہل گھوڑے کو چارہ کھلانے میں مشغول ہوا میں وہاں کھڑا کھڑا در عجیب سامحوس کر رہا تھا۔ مجھ جیسا دنیا دار آدمی۔ کنور صاحب کے مرشد سے کیا بات کرونگا۔ یہ میرا دائرہ عمل ہی نہیں۔ انکا جو یہ MOD بھانجا بھیجیا آیا ہے اس سے البتہ دوستی ہو سکتی ہے۔

میں نے گاڑی بان کو ایک سگریٹ دیا۔ اس نے بتایا کہ قیصر باغ بس ڈپو سے جو بس خاص طور پر یہاں آنے کے لئے چلائی جاتی ہے وہ شام کو یہاں پہنچ کر دوسری صبح سویرے نکھنوا پس چلی جاتی ہے۔ اسوجہ سے بہت سے لوگ دوسری بسوں پر قہصے نگ اکر کھڑا کرانے پر لیتے ہیں اور سات کلومیٹر طویل کچی سڑک پر پیچو لے کھاتے یہاں پہنچتے ہیں کیونکہ لوگ میاں کو بے انتہا چاہتے ہیں۔ دور دور سے آتے ہیں۔ میاں کھد مت کھلک کے لیے زیادہ تر دور سے پر رہتے ہیں انکے انتجار میں یہاں ہفتوں مہینوں پڑے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ سیکھیں اور رانیاں۔ بوڑھے۔ جوان۔ امیر۔ گریب۔

گاڑی بان بڑا دلچسپ آدمی نکلا۔ میں نے پوچھا کب سے یہ کھڑکھڑا چلا رہے ہو۔
 ”صاحب۔ تین چار سال سے۔“
 ”پہلے کیا کرتے تھے؟“

ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ ”تجور۔ بُرا کام کرتا رہے۔ پتھرین کے پیچھے طبلہ ہار موسیم بجا دیتا ہے۔ اس نے کسی گاؤں کا نام لیا۔ ”ہواں اب بھی چالینٹ ڈیرے ہیں۔ گاتی بجاتی گاؤں اُن گھومتی ہیں۔“

میں نصف صدی قبل کے اودھ میں پہنچ گیا۔ وقت یہاں جیٹ کے بجائے کھڑکھڑے موارا اپنا سفر طے کر رہا ہے۔

”صاحب۔ آپ کو میاں یا دفر مار رہے ہیں۔“ ایک آدمی نے آکر کہا۔ بادل ناخواستہ پیر چھا۔
 بے آستانے کی سمت روانہ ہوا۔ سورج کی آخری کرنوں میں جھیل سنہری ہو گئی۔ سارنگ۔
 تنک کی روشنی کا تالاب۔

کچھ مکان کے بیرونی طویل کمرے سے گذر کر خادم کے ساتھ اندر پہنچا۔ کچے فرش کے
 مضاف ستھرے آئینے میں چاروں طرف خوش رنگ پھولوں کے گلے۔ ایک کونے میں ہینڈ
 پ۔ سامنے کچا سدرہ۔ خدام اور اراکین مندوں کا ہجوم۔ دالان کی سیڑھیوں پر درجنوں مسلمان
 رہنمد لڑکیاں سر ڈھانپے ہوئے بانہ بیٹھی تھیں صحن میں کرسیاں اور کیمپ کوٹ۔ وسط میں
 بکیمپ کوٹ پر وہی مہنس مکھ نوجوان کا وٹکیے کے سہارے نیم دراز بیچوان کے کش لگا ہوا تھا۔
 یہ صاحب غالباً ابھی حجرے میں تھے یا مسجد سے نہ لوٹے تھے۔ کنور نے میرا تعارف کرایا۔
 مرکاز۔ یہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ راجہ دلشا د علی خان۔ اب بدلتوں سے ولایت
 رہت ہیں۔“

نوجوان نے شفقت سے مسکرا کر ”السلام علیکم“ کہا۔ میں نے برطانوی انداز میں ”ہاؤ
 یو ڈو“ ایک پریشان صورت غریب عورت بچہ گود میں لیے آکر نوجوان سے بات کرنے لگی۔
 ”نچکے سے کنور سے پوچھا۔ تمہارے پیر صاحب کہاں ہیں؟“
 ”ارے یہی تو ہیں۔“ کنور نے جواب دیا۔

میں بھونچکا۔ آنکھیں پھاڑ کر گلیمرس نوجوان کو دیکھا۔

میاں میرے استعجاب سے بہت محفوظ نظر آتے۔ اجنبیوں کے اس رد عمل کے عا
معلوم ہوتے تھے مجھے AT EASE کرنے کے لئے لندن کے متعلق باتیں کرنے لگے۔
مسکرا کر مجھ پر نظر ڈالی۔

اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گوڈ پیپلز محسوس ہوا میرے ماضی اور حال
رتی رتی بات اس روشن ضمیر انسان پر عیاں ہے۔ اس بوقت وہ کھڑے کھڑے والی خاتون
زنانہ مکان سے برآمد ہوئیں۔ نمسکارا اور قدیم بوسی کے بعد ہاتھ جوڑ کر پائنتی کھڑی ہو گئیں
میاں کے اشارے پر ایک کرسی پر ٹپکیں۔ بہت نروس معلوم ہوتی تھیں۔ میاں بے پناہ سنس اف
کے مالک نکلے کہنے لگے ”ہم آپکے پیچھے پیچھے یہاں پہنچے۔ آپ تو اس طرح کھڑے کھڑے پر
تھیں برسائی اور تھ گولڈز لگاتے جیسے فلم کی شوٹنگ کے لئے جا رہی ہوں۔ غضب کے پورے
میں کنور کے ساتھ ذرا فاصلے پر جا بیٹھا۔“ میاں اتنی کم عمری میں اتنے بڑے ولی کیے
ہو گئے؟“ میں نے طنزاً دریافت کیا۔

”پیدائشی“ ایک سرخ داڑھی والے بوڑھے پٹھان نے جواب دیا ”پانچ سال کی
میں دستار بندی کی گئی تھی“

”میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی صاحب وقت تھے۔ میاں اس دور کے قطب ہیں۔
”بلکہ قطب الاقطاب“ شلو ارمیس میں ملبوس ایک ڈبلی لڑکی گفتگو میں شامل ہوئی گونور
اسکا تعارف کرایا۔ وہ عربی میں ایم اے تھی اور شمالی افریقہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھا چکی تھی
”نہایت MOD قطب ہیں“ میں نے آہستہ سے کہا۔

دفعتاً لڑکی نے مجھے مخاطب کیا ”راجہ صاحب۔ آپ حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی
کے اسم گرامی سے واقف ہیں؟“

میں نے ذرا مبہم سا سر ہلایا۔ سوچ رہا تھا کہ واقعی بُرے پھنسنے۔ لڑکی کہنے لگی ”ا
سے نواب عبدالباسط خاں نے قطب وقت سے ملنے کی تمنا ظاہر کی۔ حضرت مولانا
فرمایا تم نے شاہ مینا صاحب کی درگاہ میں کل کسی سے جو تاملوایا تھا؟ انہوں نے جواب

ہاں میں نے انکو کافی سخت سٹ سے بھی کہا تھا۔ مولانا نے فرمایا۔ اچھا خیر۔ نواب بولے حضرت طرح قطب سے ملنے سے کیا فائدہ۔ ہم چاہتے ہیں ملیں اور پہچانیں۔

”ایک روز نواب صاحب معالی خاں کی سرائے جا رہے تھے۔ راہ میں گول دروازے ایک بانکے ملے۔ انہوں نے کہا السلام علیکم۔ انہوں نے جواب دیا۔ وعلیکم السلام۔ اور آگے ل دیے۔ جب مولانا عبدالرزاق صاحب سے ملے۔ انہوں نے فرمایا کل تم سے قطب ملے تھے اور سلام بھی کیا تھا۔

”اسکے بعد جناب عالی ایک بھشتی کی وضع میں قطب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے بکوپچھوایا۔ نواب نے سلطنت اور دھک کی واپسی کی خواہش کی۔ انہوں نے جواب دیا مقتدرات کسی کو دخل نہیں ہم تو مقتدرات کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ عرض کرنے والے دوسرے منرات ہیں۔ تمہارے پیر اگر چاہیں تو ہو سکتا ہے۔“

”ناجانے کس بھیس میں نارائن مل جائیں، کنور نے کہا۔

”ایک قصہ تو ہمارے دادا ابائاتے تھے“ عربی داں لڑکی نے بات جاری رکھی۔

انکے ایک دوست تھے بہرائچ میں۔ احمد اللہ شاہ۔ انکے ہاں ڈنر پر ایک انگریز آیا تھا وہ انہوں نے بعد میں بتایا کہ فلاں جگہ کا قطب ہے۔“

”CURIUSER AND CURIUSER“ میں نے ایس آئن فیلڈر لپٹ

طرح کہا۔ سرخ ریش مولوی صاحب رسان سے بولے۔ ”ان معاملات کا مذاق نہیں لانا چاہیے۔ جن باتوں کو آپ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے انکے بارے میں خاموشی بہتر ہے۔“

سرخ پوش فقیر نے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر حق — حق — حق — کا نعرہ لگایا۔ صحن چکر کاٹا اور میاں کو ڈنڈوت کر کے باہر نکل گیا۔

”یہ شخص“ کنور نے کہا ”نرائی کے علاقے کے ایک بڑے مندر کا پجاری تھا۔ فقیری لیکر اُن پر آ رہا ہے۔“

میاں اٹھ کر حجرے کی سمت گئے۔ کچھ دیر بعد لنگی کرتا اور دوپٹی ٹوپی پہنے واپس آکر پلنگ پر بیٹھ چھان کی منہ سے لگائی۔

ہم لوگ پھر انکے قریب جا بیٹھے۔ میں نے ایک عجیب بات نوٹس کی مسلسل حقہ پیتے رہتے تھے مگر دھواں غائب۔ سُن رکھا تھا کہ صوفیاء اور یوگی ایسی چیزوں پر قابو پا لیتے ہیں جو اتنا سوچا ہی تھا کہ میاں نے سچوان کا دھواں اڑانا شروع کر دیا۔

دالان میں خاصہ چٹا گیا۔ غورتوں کا گردہ کھانے کے لیے زانا خانے کی سمت روانہ ہو بیس پچیس لوگ میاں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے۔ ”باقی دوسری شفٹ میں کھائیں گے،“ کہنے میں پیمپ پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا ”سال کے بارہ مہینے صبح شام دعوتی کھانے کی یہ فراہم بھی کرامت ہے۔ لوگ بسوں میں بھر کر آدھی رات کو یہاں پہنچتے ہیں انکے لئے دینوں کھانا تو میں خاموش رہا۔

”سرکار کی ہمیشہ رگان اور برادر خور دھبی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔“
 اندر دالان میں میاں سید اخلاق سے پلیٹوں میں کھانا نکال نکال کر سب کو پیش کرتے تھے۔ ”میاں اسوہ حسنہ کی مثالیں پیش کرنے پر مامور ہیں۔“ عربی داں لوکی نے کہا۔
 ”خلق اللہ کو اپنے دسترخوان پر کھانا کھلانا صوفیائے اکرام کی روایت ہے۔“
 — اس دسترخوان پر کنویر نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا ”میاں کے مخالفین بھی موجود ہیں۔“
 ”میں میاں انکو بھی اسی محبت سے کھلاتے ہیں۔“
 ”مخالفین کون ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”بہت ہیں۔ کہتے ہیں۔ میاں داڑھی کیوں منڈاتے ہیں انگریزی لباس کیوں پہنتے ہیں باغ میں دس پندرہ گتے کیوں پال رکھے ہیں کبھی کبھی جماعتیں گاؤں کی مسجدوں میں آدھی رات کو گرتی ہیں۔ وہ انکو بدعتی کہتے ہیں۔“ سرخ ریش نے جواب دیا ”میاں ملا متی فقرا کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوگ جتنی انکی غیبت اور ملامت کرتے ہیں انکے مدارج بڑھتے جاتے ہیں۔“

دسترخوان پر بھانت بھانت کے اشخاص موجود تھے۔ چن صوفی ٹائیپ بوڑھے، دو برہمن کئی لڑکے میاں نے پوچھا میاں اپنے مخالفین کی سرزنش نہیں کرتے۔
 ”طریقت میں انتقام نہیں ہے“ مولوی صاحب نے جواب دیا۔

”بے شمار ہندو شیوجی یا کرشن کا اوتار مان کر میاں کی پرستش کرتا ہے۔ کنور نے ”گو انہوں نے آج تک اپنے متعلق کسی قسم کا دعویٰ نہیں کیا — دوست کے بھید ظاہر نہیں کرتے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بتلانا مشکل ہے۔“ کنور پر پھر کیفیت طاری ہوئی۔

ذرا تامل سے جواب دیا ”بس یوں سمجھ لو کہ میاں میں ہمیں بنگلوان کا سروپ نظر آتا ہے۔ رنہ ہم جیسے چالو چکر آدمی اور ایسی بھکتی؟“

”نرالی شان۔ جمالی شان۔“ سرخ ریش نے کہا۔

”میاں ہر انسان کو فرداً فرداً اس کے ظرف کے مطابق مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں۔ MYSTICISM کا ایک نکتہ ہے۔“ کنور بولا۔

”CHARISMATIC تو ہیں۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔

”CHARISMA تو بعض سیاسی لیڈروں اور فلم اداکاروں میں بھی ہوتا ہے۔ یہ جمالِ بلایت ہے۔“ عربی باجی نے خوش سے کہا۔

اب گاؤں کے لوگ بھی آگئے تھے صحن کھینچ بھر گیا۔

”خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا ہے۔“ عربی باجی نے مجھے مخاطب کیا، ”ولی کی پہچان یہ ہے کہ اسکی پیشانی پر نور چمکتا ہے اور چہرے پر رعب داب۔ لقائے الہی کو دیکھنے والوں کا چہرہ منور ہوتا ہے۔“

”آپ کا کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم خواجگانِ چشت کے اودھی سلسلے پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔“ میں نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔

”رت جگا یہاں کا معمول ہے۔ آپ کو نیند آرہی ہے؟“

”جی نہیں۔ جی نہیں۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا۔

طعام کے بعد ہم لوگ صحن میں واپس آگئے۔ کنور نے ایک سانولی پستہ قد خاتون کو تپاک سے آداب عرض کیا۔ ایک کرسی سرکاتے ہوئے بیساتہ خاتون کے منہ سے نکلا ”بی تے شن — ایلیر!“ میں چونکا۔ ”تم عربی باجی سے ملے۔ یہ ہماری جرمن آپا ہیں۔ زیادہ تر ویسٹ جرمنی میں رہتی ہیں۔ انکا بھی تمہاری طرح یورپ میں کاروبار ہے۔“ کنور نے کہا۔

”ماشا اللہ!“ میں نے جلدی سے کھڑکھڑے والی بی بی کو کرسی پیش کی۔ انہیں یہاں دیدی پکارا جا رہا تھا۔ گفتگو سے اخذ کیا کہ دھواٹھکرائین ہیں۔ سوتیلے دیور جیٹھ نے سچاس لاکھ کی جائیداد ہٹپ کر لی۔ میں سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ بے چاری بے انتہا عاجزا اور پریشان معلوم ہوتی تھیں۔ باری باری ہم سب کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت مجھے خیال آیا اگر میری گونا گول جعلازیوں کا کوئی شکار دیار مغرب سے یہاں آن پہنچے تو کیا ہو — انگریہ امر محال تھا۔ بجے ابھی سے مجھے داسموں نے آن گھیرا!

پتہ چلا دیدی خورشید منزل یعنی لامارٹینگر گزرا سکول کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک مشترکہ موضوع سخن ہاتھ لگا۔ طریقت اور معرفت وغیرہ کی گفتگو سے بور ہو چکا تھا۔

کنور نے پوچھا ”آپ نے میاں کے درشن آج ہی کیے ہیں؟“

”جی نہیں۔ دس بارہ دن ہوتے۔ لکھنؤ میں پہلی بار اپنا دکھڑا دیا تو بولے درگاہ پر آجائے گا۔ یہاں آکر دیکھا یہ تو بڑا چتر سا آشرم ہے! لیکن ہم جب چل رہے تھے تو ایک لیڈی جانے کیا کہنے لگیں ”جرمن باجی بولیں؟“ دیدی آپکو ایک بات بتائیں میاں کے مخالفین کی بُرائی کبھی نہ کیجئے گا۔ میاں لوگوں کی احمقانہ حرکتوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ان میں اتنی ہی سمجھ ہے۔ اتنی ہی سکت ہے۔ ہر ایک تمہاری طرح دانشمند تو نہیں ہو سکتا۔ ایک روز لکھنؤ میں چند لوگوں پر اعتراض کر رہی تھی اچانک گلا بیٹھ گیا۔ حلق سے آواز ہی نہ نکلے۔ دہشت زدہ ہو کر بھاگی بھاگی یہاں پہنچی۔ میاں سے معافی مانگی۔ آواز کھل گئی۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا تھا خلق خدا کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا تصوف ہے۔“

”عربی باجی“ کی طرح یہ ”جرمن آپا“ بھی نہایت بقراط نکلیں۔

میاں صحن میں آکر پلنگ پر نیم دراز ہوتے۔ ایک قوال نے بغیر ساز کے فارسی کلام سنانا

شروع کیا۔ اس کے پیچھے دوسری کرسی پر بیٹھا اسکا مسکین ساسا تھی تال دیتا جاتا تھا۔

”کفرش ہمہ ایماں شد — تا وعدہ جنین وعدہ —“

ہینڈی آنکھیں بند کر کے جھوٹا کیا۔

”ہم خانہ و مہماں شد — تا وعدہ جنین وعدہ

از بسکہ در آمیزی

تبریز خراساں شد — تا وعدہ جنین وعدہ —“

”تبریز خراساں شد — سبحان اللہ — سبحان اللہ —“ میاں نے داد دی۔

مرلی قوال عرس کے لئے شاہجہاں پور سے آیا تھا۔ صبح چھ بجے کی بس سے واپس

جانے والا تھا۔ اب صبح کا دو بج رہا تھا۔ میں ہاتھ روم سے واپس آیا تو ایک بچے کی سُریلی

باٹ دار آواز سنی۔ وہ میاں کے پاس کھڑا غزل گارہا تھا۔ ٹھکرائین دیدی نزدیک کی کرسی پر

بیٹھی تھیں۔ میاں نے ان سے کہا ”یہ مچھلی کا بچہ ہے۔“

”مچھلی کا بچہ —؟“ انہوں نے دہرایا۔

قوال بچے نے ٹھمری شروع کی۔

جھومت آویں تند کے لالہ گلین میں۔ نین کجرا پاگ بسنتی

گلے موتیں کا ہار رے۔ مکھ پرائے نور براجت

چتوت ہیں چنچل چال رے۔

سرخوش فقیر دوبارہ نمودار ہوا۔ ڈیوڑھی کے پاس کھڑے ہو کر ناپنے لگا۔ بھر غایب ہو گیا۔ دو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ایک برہمن ایک ٹھکرائین میاں کو نیکھا جھلنے میں مشغول تھیں۔ یہ دونوں میاں کو کرشن اوتار سمجھتی تھیں اور انکی آرتی اتارے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ دونوں کے شوہر دیوار کے پاس دست بستہ کھڑے تھے۔ یہ دونوں جوڑے دور دراز کے شہروں سے آئے تھے۔

”میاں بعد نماز فجر حجرے میں تشریف لے جائیں گے۔“ عربی باجی نے کہا۔

ہم بہت کنفیوزڈ ہیں۔ پچھلے تین دن اور تین راتوں میں اپنی روح کے کھڑکھڑے پرسوار ایک انوکھی اجنبی دنیا میں نکل آئے۔ یہ جملہ لوگس معلوم ہوتا ہے۔ میں کنور کی گفتگو کو بھی سمجھ رہا تھا۔ برین واش ساہو رہا ہوں۔ کیا چکڑ ہے۔ ابھی دالان کی جاکم پر لٹا ہوا کنور کہہ رہا تھا۔ دلن بھائی بڑی سہانی بھور ہے چلو ذرا میاں کے کھیتوں تلک گھوم آویں۔ تو میں نے ایک عجیب و غریب سجدہ آؤٹ آف کر میکس جواب اسے دیا۔ میں نے کہا: نہیں صاحب۔ ہم تو نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ باجماعت۔

ہم نے نماز عصر سے پڑھی ہی نہیں۔ آخری بار جو جماعت کے ساتھ ادا کی تھی وہ بڑے ابا مرحوم کی نماز جنازہ تھی۔ اس وقت ایک مولوی صاحب نے بتلایا تھا کہ اس نماز میں مرحوم امامت کرتا ہے کہ جماعت کے آگے ہوتا ہے مردوں کی۔ یہی واحد نماز ہے جس میں عورت بھی امامت کرتی ہے یعنی اسکا جنازہ امام ہوتا ہے عیش باغ کے چمن خاص میں گلشنِ افروز کے نیچے کھڑے مولوی صاحب جب یہ سب کہہ رہے تھے بڑا ڈر سا لگا تھا۔ ہمیں یاد ہے بارش کی پھوار پڑنے لگی تھی اور سرسبز قبرستان میں دو درو سفید گھوڑے دوڑتے جا رہے تھے۔

تو کیا آج ہم اپنا جنازہ اپنے سامنے رکھ کر نماز پڑھیں گے؟ فجر کی دو و سیر و ثنی آسمان پر پھیلتی جا رہی ہے عرشِ نافرش ٹوڑکا دریا سا بہہ رہا ہے۔ ہم نے نوٹس کیا ہے کہ اب ہم بھی کنور کی طرح معرفتی جیلے استعمال کر رہے ہیں۔

نکتہ: برسہا برس کھڑی بولی والوں سے میل جول کی وجہ سے پڑی بولی کے ہم کئے بجائے ہیں کہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اب رفتہ رفتہ ہم بھی واپس آ رہا ہے۔ ولیمکیم ہوم دلن اولڈ جیب۔

(۳۸)

روم و تبکیریز

وسے ٹی کن کا ایک پکچر پوسٹ کارڈ نوٹرز نے لکھنؤ ہمارے ہوٹل کے پتے پر بھیجا تھا۔ وہ پری بیگم کے ساتھ سنی ٹون منانے روم گیا ہوا ہے۔ جب وہ لندن میں پیدا ہوا تو رمانے ہمیں امریکہ اطلاع بھیجی تھی۔ لکھا تھا چرچ میں بپتسمہ دواتے ہوئے اپنے باپ جارج نوٹرز ڈریک کے نام پر اسکا نام نوٹرز رکھا ہے۔ کیونکہ ہماری شادی نہیں ہوئی لہذا وہ اپنے نانا کا SURNAME ڈریک اختیار کرے گا۔

پڑھ کر ہم دہل سے گئے تھے۔ سوچا تھا ہمارے بھولے، نیک نفس، دین اسلام، خاندانی آن اپر جان دینے والے راجہ جواد علی خان جب اس روز سہرے کے کمرس ویک میں اپنی غلط فہمی کی بدولت نور مآڈریک کے بنگلے پر جا پہنچے تھے اور اس اینگلو انڈین رقاصہ کے بدتوارہ باپ نے انہیں خوش آمدید کہا تھا، محکمہ قضا و قدر کے منجروں نے قہقہہ لگایا ہوگا۔

ٹھا کر صاحب جلد وہ وقت آنے والا ہے جب آپکا پوتا اس ہاٹ کاسٹ دلال کا نواسا ہوگا۔ اور اس آپکے پوتے کا نام اسکے یہودہ نانا کے نام پر رکھا جائیگا۔

عبرت کا یہ تازیانہ ہمارے لئے کافی تھا۔ بہت پیچ و تاب کھایا مگر کچھ کرنے سکتے تھے۔ ہم جس قسم کی لاقانونی زندگی گزار رہے تھے نور مآہم سے بیاہ کر کے خطرہ مول نہ لینا چاہتی تھی نہ اپنی آزادی کھونے پر آمادہ تھی۔

بہر حال اسکے دادا کنور بہزاد علی خان مرحوم برادر خور در راجہ جواد علی خان مرحوم کے اسم گرامی پر نور چشم کا نام ہم نے اپنی طرف سے بہزاد علی رکھ لیا۔ اور سوچے دل میں اسے اسی نام سے یاد کریں گے۔ اس غریب کا نہ حقیقہ ہوا۔ نہ میر اسٹین گاہیں نہ ڈومیناں ناچیں۔ نیویارک کی ایک بار میں اشک بہاتے، شراب پیتے، آنسوؤں سے میز کی سطح پر لکھا راجہ بہزاد علی خان آف دھان پور۔

نورمن کو اپنے اس دوسرے ”انڈر گراؤنڈ“ نام کی معنویت کا علم نہیں۔ دادا کون تھے۔
یا بہزاد کون تھا۔ علی کون تھے۔

ایک روز یہاں میاں کے ہاں کوئی شخص ایک مصرع بار بار پڑھ کر سر دھن رہا تھا ع
اک کر بلا میں اک مراساتی نجف میں ہے۔

مکہ مدینہ نجف کر بلا سب سے بے نیاز کنور بہزاد علی خاں مرحوم کا پوتا تو روم نکل گیا۔
مگر ہمیں اس کا اتنا غم کیوں؟ ان راہوں کا انتخاب ہمارا اپنا نہ تھا؟ کل سبڈی کہہ رہا تھا
کہ ازل میں ساری روحیں، ایک تھیں۔ بعد میں الگ الگ ہو گئیں۔ تو کیا میری اور سندیشو زراٹن نگہ
اور پوپ آف روم کی روح ایک ہے؟

نہیں صاحب۔ یہ باریکیاں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر میاں کی شخصیت ایسی مقناطیسی
ہے کہ یہاں سے جانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ جب آئے تھے تو پکا ارادہ تھا کہ رات گزار کر صبح ہووے
لکھنؤ چلے جائیں گے۔ اتنے اصرار اور اخلاق سے میاں نے روکا کہ کچھ کہتے نہ بنا۔ لکھنؤ آدمی بھیج کر
ہمارا سوٹ کیس بھی ہوٹل سے منگوایا۔

کنفیوژن دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لکھا جائے۔ کاش ہم ایک ٹھگ کے بجائے
ادیب ہوتے۔ لیکن اسکی کیا گارنٹی ہے کہ ادیب بن کر بھی ہمارا کروک پن نہ جاتا۔ اسوقت روپیے پیسے
کا گھپلا کرتے ہیں تب اردو زبان و ادب کے معاملات میں گول مال کرتے۔

میاں نے ایک بار بھی ہم سے کوئی ذاتی سوال نہیں کیا۔ نہ انشاورہ کسی قسم کی سرزنش۔ وہ
لوگوں کو کسی بات کی ممانعت نہیں کرتے۔ یہ کرو وہ نہ کرو — البتہ ایک رات جب صحن
میں محفل شعر و سخن پڑھتی تھی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے اور چپکے سے کہا

بڑے بھولے بھالے بڑے سیدھے سادے

ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں!

ان کو بے شمار اردو فارسی اشعار یاد ہیں۔ اور رامائین کی چو پائیاں اور کبیر کے دوہے۔

ایک سپہر حجرے میں فرش پر لیٹے روٹی کے اشعار سُنا رہے تھے ہم نے پوچھا آپ نے فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کہنے لگے: ”ارے ہم نے اردوئے کون سی پڑھی ہے جو فارسی پڑھتے۔“
یقین نہ آیا۔ بعد میں عربی باجی سے پوچھا وہ بولیں: ”راجہ صاحب اسے علم لدنی کہتے ہیں۔“

ایک دیہاتی مسلمان حجرے میں داخل ہوا۔ میاں کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی داستان الم بیان کرنے لگا۔ سر جھکائے سنا کیے پھر آہستہ سے بولے۔ دیکھو۔ بندر کے بچے کی طرح جو اپنی ماں کو کپڑے رہتا ہے اپنے رب کو کپڑے رہو۔ بلی کا بچہ دیکھا ہے نا کس طرح اپنے آپ کو اپنی ماں کے سپرد کر دیتا ہے؟ وہ اسے اپنے دانتوں میں دبوچے پھرتی ہے پکھڑا تھن سے منہ لگاتا ہے اسے فوراً ماں کا دودھ مل جاتا ہے۔“ میاں اس دیہاتی سے اسی کی ایجری میں بات کر رہے تھے بہر حال زبردست ماہر نفسیات ہیں۔ یہ صوفیاء صدیوں سے عوام کیلئے سائیکسٹریٹس کا فریضہ تو انجام دیتے ہی رہے ہیں۔ باقی روخائیت وغیرہ اپنے پلے نہیں پڑتی۔
حجرے میں مجمع لگ چکا تھا۔ ایک شخص نے عرض کیا ”میاں ہم نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں دنیا بھر کے کبابیں دماغ میں آتی ہیں؟“

”ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔“ ایک بیگم صاحبہ نے کہا۔
”جب آپ پر تیز روشنی پڑ رہی ہو تو آپکے دماغ کے اندر جو سامان بھرا ہوا ہے روشنی کی زد میں وہی تو دکھلائی دے گا۔“ میاں نے جواب دیا۔

”میاں یہ تعویذ بن گیا ہے۔“ بیگم صاحبہ نے کہا۔
”اس پر بارہ اماموں کی نیاز دلو کہ یہن لیجے۔“ میاں نے فرمایا۔
دو میاں بی بی دروازے میں نمودار ہوئے۔ میاں اخبار پڑھنے میں مصروف ہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر آرتی اتاری۔ مٹھائی کا ڈبہ پیش کیا۔ اسکو ہاتھ لگا کر پھر اخبار میں مہمک۔
مسز تیواری نے حاضرین میں گویا پرشاد تقسیم کیا۔

ہم اُخلاقاً برنی کا ایک ٹکڑا لیکر ہاتھ میں تھامے رہے۔ وہ دونوں پالاگن کر کے باہر گئے۔
ایک نوجوان آیا۔ میاں اس سے ٹسٹ میچ کے تازہ اسکو پر تبادلو خیالات کرنے لگے مولانا تاتاری

داخل ہوئے۔ یہاں ہمیں نرائی کے ملمان بہت ملے۔ ہمالیہ کے دامن میں دینی عربی، اہلس کی کثرت ہے۔ چنگی باریک دائی والے مولانا بھی نکلا منگول معلوم ہوتے تھے۔ میاں انکو بہت چھڑتے۔ ہمیں مخاطب کیا ”دیکھئے پچھلے ساڑھے تین ہزار سال سے ایسے خدو خال کا کوئی انسان پیدا نہیں ہوا۔“

مولانا دئی سے شایع ہونے والے دینی رسایل اور اردو بلیٹز اور دوسرے اردو ہفتہ وار اخبارات کے مضامین میاں کو سناتے۔ اور جاسوسی ناول۔ وہ دراصل ایک قسم کی بیک گراؤنڈ میوزک ہیں۔ میاں لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ خود اخبار پڑھنے میں مصروف ہیں یا مولانا کو ننگ کرنے کے لئے خود اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سناتے جا رہے ہیں یا آنکھیں بند کیے غودگی کے عالم میں ہیں۔ اور مولانا ہیں کہ محمود غزنوی کے معرکوں کی داستان بے تکان پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ادھر انہوں نے کوئی لفظ غلط پڑھا میاں نے ٹوکا۔ اور لغت منگوائی۔ مولانا اپنی بات پر مصر۔ دونوں میں سجد و لچپ ٹکرا رہی تھی۔ کور نے ہم سے کہا ”وہ بنیادی طور پر غالباً بہت تنہا ہیں۔ جس ناقابل تشریح بلندی پر وہ موجود ہیں وہاں عام انسان کا گذر نہیں۔“

”عاشق حسینؑ ہیں۔ محرم میں تعزیر داری کرتے ہیں۔ ایک روز حضرت علیؑ کے متعلق فرما رہے تھے ارے ہمیں جو کچھ سامان ملتا ہے شاہ ولایت ہی سے تو ملتا ہے۔ سامان‘ میاں کا مخصوص لفظ ہے۔ انکی مراد انکی اپنی ولایت سے تھی۔“

یہ کچا مکان جتنا MODEST ہے درگاہ اتنی ہی وسیع اور شاندار۔ پختہ فرش۔ چاروں طرف برآمدے۔ وسط میں مخدوم کا روضہ۔ ایک طرف میاں کے والد کا مزار۔ سرے پر خوبصورت مسجد۔ ایک طرف شاہ مینا صاحب کا چلہ۔ روضے کے دیوار میں ایک پتھر نصب تھا اس پر ہاتھ کا گہرا نشان۔

”یہ مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا نشان ہے۔“ سیاہ رنگ کی BERET پہنے ہوئے میاں کے شو فر نے نہایت وثوق سے اطلاع دی ”واقعہ یہ ہے کہ جب اسی جگہ پر حضرت مخدوم کا دھال ہوا انکے صاحبزادے گھر پہ موجود نہ تھے۔ انکے

مرید شاہ مینا صاحب تنہا تھے۔ بہت پریشان ہوئے کہ اکیلے کس طرح تجہیز و تکفین کریں۔ کیا دیکھتے ہیں ایک نقاب پوش بزرگ سبز عمامے سبز عبا میں ملبوس گھوڑے پر سوار جنگل میں سے نمودار ہوئے وہ مشکلات علیٰ شیر خدا تھے۔ حضرت مخدومؒ کی تجہیز و تدفین میں شاہ مینا صاحب کی مدد کی اور واپس تشریف لے گئے۔“

میں خاموش رہا۔ کنور سر پر رومال باندھے ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے روضے کی دلیز پر کھڑا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کوڈرینگل کے برآمدوں میں کنبے مقیم تھے۔ مجاد راوہ بھکاری مفقود۔ رات ہو چکی تھی۔ درگاہ کے باہر درختوں میں بھگی ہوئی ہوا سرسرا نے لگی۔ عربی باجی نے کہا۔ ”عین اسی جگہ ان اولیاء کے کچے جھونپڑے موجود تھے۔ صدیاں ہمارے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گزر رہی ہیں۔“

”حق — حق — حق —“ سرچوٹ برہمن بجماری نے احاطے میں نعرہ بلند کیا۔

”میاں جس کچے مکان میں رہتے ہیں وہ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ہر سال برسات میں اسکا کچھ حصہ گر جاتا ہے اسے پھر لیب پوت کر ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔ صدیاں بھی تو خام اینٹیں ہیں ڈھے جاتی ہیں تو مٹی سے نئی گھڑ لی جاتی ہیں۔“ عربی باجی نے کہا۔

مجھے نیویارک کی اسکانی لائن یاد آئی اور شکاگو کا پلے بوائے کلب۔ زمین حق کیوں نہ ہوئی۔

”چرچ کی رسومات کو MYSTERIES کہا جاتا ہے۔“ کنور بولا۔ درگاہ سے باہر اگر ہم لوگ دھان کے کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ میاں بڑی جھیل کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ غروب آفتاب کی سرخی پانی پر منعکس تھی دوسرے کنارے پر گھنا جنگل سرسرا رہا تھا۔

”ہولی مینوین۔“ کنور نے جھیل اور آسمان کے گھلے ملے اغوانی رنگ کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہی تو ہمارا بند بن ہے۔ وہ ہمارے بن راج کھڑے ہیں۔ پانی کے کنارے۔ تنہا۔ کہنیا کی مڑی اور پیر دہی کی نئے سب ہم سن لیتے ہیں۔ جبرس نے بھی نوکھا تھا اسے روجو میرے ساتھ ناچو میں تمہارے لیے بانسری بجاؤں گا۔“ حضرت علیؑ نے ناقوس کی آواز سن کر فرمایا نام

سمجھتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے —؟ سبحان اللہ خفا خفا ان المولیٰ قد یغیٰ —

ہم نور کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ اپنا پرانا لوفرسینڈی تو نہیں تھا۔ جانے کون تھا۔

”وٹن بھائی۔ روم میں ہم نے ہزاروں ہزار یورپین اور امریکن زائرین کو دیکھا ہے جو عیسائی اولیاء کے تبرکات کو چومنے کے لئے جوق درجوق گر جاؤں میں جاتے ہیں۔ تم انکو نہ جاہل کہتے ہو نہ تو ہم پرست جینز و بیٹ فادرز سے زیادہ پڑھا لکھا کون ہوگا؟“

”سائیکولوجی آن ریلیجن ایک کتاب ہے۔ ہم تم کو پڑھنے کے لئے بھیجیں گے لندن سے۔“

”وہ بھی ہم نے پڑھ رکھی ہے۔ مدھوبن میں پہنچنے سے پہلے۔“

کھیت کی منڈیر پھلانگ کر ہم دوسری روٹ پر آگئے جو آم کے باغ میں سے گذرتی درگاہ کی سمت جاتی تھی۔ سیاہ درختوں میں سے جھلکتا جھیل کا پانی چٹائی کی واٹش معلوم ہو رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے میاں کا یا تو منڈھا بندھا ہوا تھا۔

سایبان میں چرمی کاٹنے کی مشین رکھی تھی۔ ایک سفید ریش بنچ پر بیٹھے تھے۔ دور گاؤں کے ایک مکان میں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ عبداللہ کے آنگٹوا میں خوریں ناچیں چھا چھم — خوریں ناچیں۔ جھیل پر بہتی پڑوائی نے عورتوں کا گیت لہروں کی طرح پھیلا دیا۔

”LIVING WATERS“ بائبل میں اسی کو کہا گیا ہے ”کنور تیز تیز چلتا ساحل

پر پہنچا۔ میاں سے کچھ فاصلے پر موڈ بانہ جا کھڑا ہوا۔



(۳۹)

جنگل میں جگنو

— نورما کو خط لکھنے کے لیے بریف کیس کھول کر قلم اور پیڈ نکالا۔ وہ حیران ہوگی اب
سیکوں نہ پہنچا۔ اس تاخیر سے پیرس والے معاملے میں جو نقصان ہوگا سوالگ کنور کو اپنی
رفت آتے دیکھ کر پیڈ ایک طرف رکھ دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”رانی صاحب کو اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی؟“ اس نے ڈانٹا۔ ”ہر بی بی کا قاعدہ
ہے اپنے شوہر کے پرانے دوستوں سے جلتی ہے۔ رانی صاحب بھی سوچیں گی۔“

— الجھ کر بات کاٹی۔ ”نہیں یا۔ خط تو ہم لکھ چکے ہیں۔ پھر جھوٹ بولا۔ میاں کے
مدت میں لوگ با وضو حاضر ہوتے ہیں ہم کم از کم اپنی دروغ گوئی ہی سے باز آئیں۔
ہم لوگ شامیانے کے نیچے بیٹھے تھے۔ کنور نے اچانک ہمیں مخاطب کیا۔“ لکھو۔

لمھو۔ آں خطاط۔

— آں خطاط۔

”سمہ گو نہ خط نوشتی۔ کیے ادخواندی، لاغیر! کیے راہم ادخواندی، ہم غیر،

کیے نہ ادخواندی، نہ غیر او۔ آں خط سومنم۔ اب دیدانت کا ایک نکتہ۔“

اسی وقت شامیانے میں چند ڈکیت نما صاحبان اطمینان سے آکر ایک کھاٹ پر ڈٹ
گئے میں نے کنور کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میاں کے ہاں محض تمہارے ایسے انٹلیکچوئل ہی نہیں آتے۔“

مجھ جیسا انٹلیکچوئل! ارے سنڈیش نرائن سنگھ کو کیا معلوم ایک انٹرنیشنل ڈکیت سے
بات کر رہا ہے۔

”شروع شروع میں کنور کہتا رہا، میاں کے ساتھ چند نامعقول سے آدمیوں کو دیکھ کر

ہم نے پوچھا تھا آپ کیسے بے تکے لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں فرمایا ٹوٹی پھوٹی موٹر میں تو کارخانے میں مرمت کے لئے آتی ہیں۔ میاں جہاں جاتے ہیں بھانت بھانت کے انہی کا ہجوم انکے ہمراہ ہوتا ہے۔ گویا شیوجی کی بارات۔ پھر کہا تو انہوں نے محض جواب یہ دیا کہ جو ان دیکھے لوگ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں تم کو نظر آجائیں تو تمہارا کلیجہ شق ہو جائے مولوی صاحب ٹھکرائیں دیدی، عربی اور جرمن باجیاں اور ایک نووارد خاتون آ رہیں۔ میاں کے الوکھے فضائل کا تذکرہ چھڑا۔ وہ خاتون بولیں: ”جب مجھے لوگوں نے بتایا کہ وہ میاں کو بیک وقت کئی مسجدوں میں نماز پڑھتے دیکھ چکے ہیں تو میں۔۔۔ زور کا قہقہہ لگایا۔ پہلی بار آئی سرکار بس اسٹاپ تک چھوڑنے قصبے تشریف لے گئے کوئی میلہ چل رہا تھا۔ بھڑکی وجہ سے جیپ بس اسٹاپ سے بہت دور روکی۔ میں اتر کر بمشہ ہجوم سے نکلتی بس میں پہنچی وہ کچا کچھ بھری ہوئی۔ دھکا پیل میں بچہ گھبرائی۔ پلٹ کر دیکھ سرکار دور اپنی جیپ میں موجود تھے۔ کیا دیکھتی ہوں بس کے اندر کھڑے مسکراتے ہیں۔ مجھے جگہ دلائی اور خدا حافظ کہہ کر اتر گئے۔“

”اولیاء“ عربی حاجی بولیں: ”زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ رات کو جہاں دیوٹی لگائی جاتی ہے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اکثر صبح گیارہ بارہ بجے تک حجرے کے دروازے نہیں کھلتے۔ اس وقت وہ بچانے کہاں کہاں ”ASTRAL TRAVELS“ میرا پاکستانی بھانجا۔“ نووارد خاتون نے کہنا شروع کیا ”امریکہ میں تھا۔“ کے حادثے میں بُری طرح زخمی ہوا ہسپتال لے جایا گیا وہاں سے ٹرنک کال آئی بچے امید کم تھی۔ میں نے ہڑ بڑا کر میاں کو بتلایا۔ وہ لکھنؤ پہنچے۔ ایک ہسپتال میں جا کر ایک پینڈ پر لیٹ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کر رہے ہیں۔ چند روز بعد امریکہ سے اطلاع آئی کہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور پاکستان آ رہا ہے۔ آپا جان یہاں آئی ہوئی تھیں۔ فوراً واپس جب وہ روانہ ہو رہی تھیں میاں نے ان سے فرمایا خواجہ فرید گنج شکر کے روئے پر جا ہمارا سلام کہے گا۔ ہم مطمئن ہو گئے کہ میاں نے اس بچے کو خواجہ فرید کے سپرد کر دیا مولوی صاحب بولے: ”راجہ صاحب ان لوگوں کا اپنا ایڈمنسٹریشن ہے۔ رات کو

کی کانفرنس ہوتی ہیں۔ وہاں سب معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں سب سے بڑی کانفرنس اجیر شریف میں سلطان الہند کے آستانے پر ہوتی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بڑی مدینہ شریف میں۔ دربار نبویؐ سے احکام جاری ہوتے ہیں۔“

”ایک بار کنور نے کہا: ”میاں نے ہم سے محض یہ فرمایا تھا کہ ساری دنیا میں ساڑھے تین سو قطب موجود ہیں۔ وہ سارا نظام چلا رہے ہیں۔“

ہمیں وہ پہلے روز کا انگریز قطب والا قصہ یاد آیا۔ پوچھا: ”چینی قطب بھی ہوتے ہونگے امریکن اور فرنج بھی لیکن سوویٹ یونین میں شاید کوئی قطب موجود نہیں۔ اچھا یہ بتائیے ان قطب نے ہائیڈروجن بم وغیرہ کیوں بننے دیے؟“

”دنیا دارالکافات ہے۔“ سرخ ریش نے جواب دیا۔

”میاں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ قطبیہ بھی موجود ہیں۔ خاتون قطب۔ اور رجال الغیب میں عورتیں بھی شامل ہیں۔“ عربی حاجی نے کہا: ”لیکن کچھ مٹا عورتوں کو ناقص العقول۔۔۔“

”چار نوش کیجئے۔“ میں نے عرض کی۔

”ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ بعض اولیاء عالم طیر رکھتے تھے۔“

”آپ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں یہی سب پر یوں کی کہانیاں لکھ رہی ہیں؟“ میں نے باستعجاب دریافت کیا: ”یہ سائنس اور عقل کا زمانہ ہے۔ چارنو نکال سے مغرب پر یوں کی کہانیاں مسترد کر چکا ہے۔ ہمارے ہاں سرسید احمد خان وغیرہ نے زندگیاں اکی جلد جہد میں صرف کر دیں کہ ہم اپنے توہمات سے خود کو آزاد کریں۔ آپ لوگ ہم دیکھتے ہیں کہ ازسرنو اپنے ذہنوں پر میڈیول تصورات طاری کر رہے ہیں کیا واقعی یہ ایک عالمگیر سازش ہے کہ تھرڈ ورلڈ کو پھر مذہب پرستی اور ادھام کے جال میں گرفتار کر دیا جاوے۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں میاں کی گونا گوں کرامات کی حکایتیں سن رہے ہیں۔“

چند لمحوں بعد ایک خادم ڈیوڑھی سے نمودار ہوا: ”راجہ صاحب۔ کنور صاحب۔ میاں آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔“

”یہ بہت معمولی بات ہے۔ تم میاں کے متعلق جن ٹیک و شبہات کا اظہار کرو گے میاں کسی فاصلے پر ہوں انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔“ سینڈی نے قہقہہ لگایا۔

”اسے TELEPATHY کہتے ہیں جس چیز کو تم میاں کی روحانی طاقت گردانتے ہو محض

E. S. P. ہے۔ دراصل سائینس نے ابھی تک انسانی ذہن کی بہت سی

قوتوں کو ڈسکور نہیں کیا ہے۔ اگلے سو پچاس سال میں ساری حقیقت کھل جائیگی۔ وہ کیا ہے باپوانرجی۔“

”باپوانرجی!“ کنور نے دہرایا: ”یہ اصطلاح روسیوں نے ایسے اختراع کی ہے کیونکہ وہ روح کے منکر ہیں۔ اور کسی حالت میں اسکے وجود کا اقرار نہیں کر سکتے۔“

”روحانیت اور مادیت کے متعلق یہ بڑے مبتدیانہ مباحثے ہیں۔“ میں نے اکتا جواب دیا۔

ڈیوڑھی، صحن اور دالان عبور کر کے میاں کے ممرے میں پہنچے۔ مسکرا کر بولے: ”آئیے آئیے۔ تشریف رکھیے۔“ چاء بنا کر پیش کی۔ حجرے میں اس وقت ہم لوگوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں مٹا کہنے لگے۔ ”یہ سائنس اور تعقل کا زمانہ ہے۔ نہ کہ ادھام پرستی کا۔“

ہم ہڑبڑا گئے۔ میاں ہمارے الفاظ دہرا رہے تھے اسکے بعد انہوں نے گویا ایک بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑا۔ کہنے لگے۔ صوفی کو پہلے غوطے میں کرامات حاصل ہوتی ہیں۔ اسکے بعد ایک ہزار مقامات ایسے ہیں کہ اگر صوفی کرامات کی طرف نظر کرتا ہے تو وہ ایک ہزار مقامات اس پر منکشف نہیں ہو پاتے۔ حجاب حائل ہو جاتا ہے۔ راجہ صاحب اور چاء۔؟ لیجئے یہ سمو سے نوش کیجئے۔“ انہوں نے مجھ پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی اور کہا ”عبادت بغیر توبہ کے تشنہ ہے۔ عاصی اپنے عصیاں سے۔ زاہد اپنے زہد سے۔ خدا کا دوست اپنے مقامات و کرامات سے توبہ کرتا ہے۔ توبہ زلیت و امروں ہے۔“

”میاں صوفی اپنے مقامات سے بھی توبہ کرتا ہے؟“ جرمن باجی نے سوال کیا۔
”اوہو جرمن باجی! آج تو آپ نے بڑا اسمارٹ لیا س پہنا ہے۔ بالکل بوائے اسکاؤٹ

جی ہاں مقامات صوفی کے لئے حجاب بن جاتے ہیں۔ تو بہر کے بعد وہ صفات کے بجائے ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نبی کے لیے معجزے کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کے لیے کرامت کا انفا لازم ہے۔ کیونکہ جب ولی کرامت کا اظہار کرتا ہے اتنی دیر کے لیے اسکی توجہ خدا سے ہٹ جاتی ہے۔ اس دوران میں وہ تو مقامات نیچے اتر آتا ہے۔ اسی لیے وہ کرامت کا اظہار بدرجہ مجبوری کرتا ہے۔“

صحن میں کوئی شخص روتا چلا آتا داخل ہوا۔ میاں نے کہا۔ ”ہم ابھی آتے ہیں۔“ انکے باہر جانے کے بعد کنور نے کہا: ”شاید کوئی پاگل لایا گیا ہے۔ دِلن بھائی۔ جو کام میاں کرتے ہیں وہ فیض ہے کرامت نہیں ہے۔ سمندر میں جاؤ تو موتی ملیں گے۔ وہ سمندر کی خاصیت ہے۔ اسی طرح میاں کے فیوض جگنو از خود روشنی کر کے اڑتا ہے۔ میاں کے فیوض برکات عوام انکو کرامت سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ جب باہر نکلتا ہے اسکی خوشبو آپ سے آپ پھیل جاتی ہے۔ کرامت وہ ہے جس کے لیے CONCENTRATE کیا جائے فیض خدا کے دوستوں کا وصف ہے۔ دوسروں کو خود بخود پہنچتا ہے۔“

خاتمی روایت کا مابعد الطبیعیاتی تسلسل۔

شام میاں حسب معمول مکان کے کچے آنگن کے اندر پلنگ پر بیٹھے بچوان نوش کرتے تھے۔ پیچھے ایک مرید کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ ہمیں بار بار اس اس خیال نے تنایا کہ گو ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں مگر یہ منظر مانوس سا ہے۔ کچھ دیر سوچا۔ ایک دم یاد آگیا۔ اٹھارویں صدی کا نگڑہ فلم کی ایک تصویر۔ مینا تو رسی۔ بالکل ہی سین۔ برآمدے کے سامنے آنگن میں بچا پلنگ۔ اس پر چھڑوانی۔ آدھی اُلٹی ہوئی۔ گاؤنیکہ۔ مہتابی چہرے والا ایک نو عمر صوفی۔ ذرا بھاری جسم۔ سر پر گول ٹوپی۔ سفید لباس۔ آلتی پالتی مارے بیٹھا۔ حقہ کی نئے ہاتھ میں۔ ذرا سنجیدہ۔ بالکل میاں والا انداز۔ وہی شکل اور رشتہ اور لباس۔ مہری کے پیچھے مورچیل سنبھالے ایک سیاہ فام خادم۔ حیرت انگیز۔

تصویر کی تفصیل اسوجہ سے یاد ہے کہ ہم نے اسے ڈبلن کے ایک میوزیم سے اڑالیا تھا۔

جھٹ پٹے وقت کنور کے ساتھ جھیل کے کنارے ٹہلنے چلے گئے۔ ایک کنج میں ٹھٹھکے، مکمل خاموشی ہو سکتا۔ افق پر طلوع ماہ کی روشنی پھیل رہی تھی۔ چنبیلی کی بھاڑی میں جنبش ہوئی، ”LITTLE PEOPLE“ میرے منہ سے نکلا۔

”جہاں پھول ہیں وہاں پریاں بھی ضرور ہونگی“ کنور نے ساڈگی سے کہا۔
ہم لوگ دو بچے تھے جو صحن چمن میں کھیلنے اور تکیوں کے پیچھے دوڑنے نکل آئے تھے۔
فطرت کے قریب پہنچ کر انسان اپنی بدی فراموش کر دیتا ہے۔ میں نے کلیخت اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

”ٹہل پیل۔“ کنور نے دہرایا وہ بھی اپنی نرسری میں پہنچا ہوا تھا۔ ایک آنرش گورنر نے اسکی پرورش کی تھی۔ ”کہتے ہیں یہ ننھے ننھے لوگ مرغزاروں میں جمع ہو کر چاند کے نیچے بانسریاں بجاتے اور گاتے ہیں۔“ — NATURE SPIRITS — انکی آوازیں ہمارے کانوں میں نہیں پہنچتیں — MYSTIC انکوسن لیتے ہیں۔“

”شاعر تو ہر ماہر سے ہی سب الپ رہا ہے۔ تم نے اسے LITERAL سمجھ لیا!“
”حقیقت کو شاعری تو تم گردانتے ہو۔“ مس سیلون بتاتی تھیں انکی کاؤنٹی کورک کے کسانوں کو چاندنی راتوں میں مشروم پر بیٹھے ELVES نظر آ جاتے تھے!“
”آئر لینڈ غریب اگر پکچرل ملک ہے۔ لہذا تخیل پرست۔ انڈسٹریل ریوولیوشن سے قبل۔“
میں نے جواب دیا: ”جہاں غریب کے سارے مرغزار پر یوں سے آباد تھے۔ دماغی الجھنوں سے آزاد سادہ لوح کسانوں کو فطرت سے ہمکنار رہتے ہوئے پریاں تو آپ ہی نظر آویں گی۔“
معبصویت معصومیت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دیکھو بچے اور جانور ایک دوسرے کو کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہارے بھارت درش میں جہالت اور غربت کی فراوانی ہے چنانچہ اتنا ہی تخیل بے مہار چٹھا ہوا ہے ہر درخت پر تو تمہارے کے ہاں کوئی نہ کوئی دیوتا براجمان ہیں۔“
کنور نے قہقہہ لگایا۔ جامنوں پر اترنے والوں کی چہکار پشپ تاؤں پر تسلیاں گھاس پہ بیر بھوٹیاں سب سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے سارس لہروں پر راج تھیں ہرے درختوں کے نیچے گلہریاں۔

”مائی گوڈ۔“ میں نے بیباختہ کہا۔ ”یہ کنج تو بالکل AS YOU LIKE IT کا سیٹ
علوم ہوتا ہے۔ یاد ہے۔ ہم نے مارٹ میں جس سال اسٹیج کیا تھا اور اسکا گیت میں نے
ہی گایا تھا۔“

میں نے گنگنا نا شروع کیا UNDER THE GREENWOOD TREE
کنور نے آواز ملائی WHO LOVES TO LIE WITH ME
دونوں نے ایک ساتھ ملکر اٹھایا AND TURN HIS MERRY THROAT
UNTU THE SWEET BIRD'S NOTE
COME HITHER, COME HITHER, COME HITHER.
HERE SHALL HE SEE NO ENEMY,
BUT WINTER AND ROUGH WEATHER

دفعہ میں نے نوٹس کیا کہ بطرح اس روز شام لا مارٹینیر میں عمران زیدی نے منہ اٹھا
انگلش اسکول بوائے انداز میں گایا تھا ہم دونوں بھی اس بطرح انٹن کھڑے الاپ رہے تھے
یا پل کی پل میں نصف صدی قبل کے لا مارٹینیر کے دو کسٹما بعلم بن چکے تھے۔ مالی جھونپڑے
سے نکل آیا تھا تعجب سے منہ کھولے ہمیں نگ رہا تھا۔ میاں کی خدمت میں بھانت بھانت کے
منی آتے ہیں مگر یہ ادھیڑ عمر کے دو ٹھو صاحب لوگ تو ایک اندھیرے کنج میں انٹن کھڑے
مکریزی گانا گارہے ہیں!

میں نے چپا کی ایک ٹہنی سامنے سے ہٹائی۔
چونک کر چاروں طرف دیکھا — کنورا ایک نوکیلے کانوں والے آئرش پریرا کی طرح
تبسم اور شاداں۔

”شاہراہ خود آگا ہی!“ اس نے کہا۔
”خود آگہی یا خواب گری؟“ میں نے دریافت کیا۔
”تو میں بھی ایک چڑیا چھپائی۔“

میاں پکڑندی پر مل گئے کہنے لگے چلیے کل آپ لوگوں کو ذرا باہر گھملا دیں۔

آج جب ہم میل اور میل کے جھرمٹوں کے درمیان سے گذرتی شاہراہ پر پہنچے
شام ہو چکی تھی۔ میاں فراتے سے ڈرائیو کرنے میں مصروف حسب معمول زیر لب وظیفہ
پڑھ رہے تھے۔ ہیڈلائٹس کی زد میں آکر سفید رنگ میل چمک اٹھتے۔ گھما گھما گھاٹ —
فیض آباد — ایودھیا —

”ایودھیا سے نکل کر —“ دیدی بولیں ”بھگوان رام مہارانی سیتا اور لچھمن جی
انہی بارہ بنوں میں تو گھوما کیے۔“ وہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھیں۔
”بڑھی سیتا۔ من راون۔ گیان رام“ پیچھے سے کنور نے گویا کنسٹری کی۔ پھر بولا: ”دلتن
بھائی۔ حضرت عبدالرزاق کھانا تمہیں کیا یاد ہوگا۔“
”وہی جنکا قصہ اس روز عربی باجی نے سنا یا تھا؟“

”جی نہیں۔ وہ تو حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی تھے۔ یہ سید عبدالرزاق بانسوی بزرگ ہیں
صدی۔ ملّا نظام الدین فرنگی محلی کے پیر و مرشد۔“ عربی باجی نے جواب دیا۔ وہ اور جرمن باجی
جیب کے پھلی نشستوں پر فروکش تھیں۔ ”اُس سب زدہ لوگ انکے روضے پر جاتے ہیں۔ شفا یاب
ہونے۔“ بانہ شریف ————— حضرت کلیانی ندی کے کنارے برگد تلے عبادت فرماتے
تھے۔ ایک رات ہوکا عام پایادہ لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ جنگلوں میں پہنچ کر
راستہ بھول گئے — دو لہو جان ملے۔ تیر کمان لیے۔ ایک گورا ایک سانولا۔

”وہ انہوں نے کہا آج رات ہمارے مہمان رہیے۔ حضرت کو کٹی میں لے گئے
مومن بھوک کرایا۔ کٹی میں دو شیر موجود تھے۔ لڑکے بولے آپ کی حفاظت کے لئے منگوائے ہیں۔
حضرت نے رات وہیں گذاری۔“

”حضرت عبدالرزاق بانسوی کے ہاں کرشن مراری کی ایبجری بھی خاص اہمیت
رکھتی ہے۔ اس خطے کے دوسرے صوفیوں کے ہاں بھی۔ یہ بزرگ اودھ میں شہر کہتے تھے

اور کرشن اور رادھا اور گویوں اور برج بایسوں کی تلیحات کو تصوف کی علامتوں اور استعاروں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔“ میں عربی باجی کے بت پرستی پر متحیر رہا۔

جگنوؤں کی بارات اڑتی ہوئی سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔

”ایک اور حکایت ہے، کنور کی آواز آئی۔“ حضرت کے ایک مرید بانہ شریف جا رہے تھے۔ رات پڑے ایک چوپال میں رُکے۔ وہاں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ وہیں پر ایک سانولا خوبصورت نوجوان موجود تھا۔ اس نے کہا آپ جہاں جا رہے ہیں انکو ہمارا سلام کہیے گا۔ مرید جب بانہ شریف پہنچے حضرت کو سلام نہیں پہنچایا۔ انہوں نے فرمایا ایک سانولے خوش جمال نوجوان تمہیں راہ میں ملے تھے؟ انہوں نے ہمیں سلام کہلوایا تھا۔ وہ کرشن جی تھے۔“

عقائد کی دنیا عجیب و غریب ہے۔ راجندر جی اور کرشن جی مغلیہ او دھ میں! بی بی مریم پرنگال میں اسلامی عہد کے فاطمہ نامی شہر کے چند گز ریہ بچوں کو دکھلائی دیں۔ اب ساری دنیا کے کیتھولک OUR LADY OF FATIMA کے نام سے انکے بُت کی پرستش میں جُٹے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے مدینۃ الفاطمہ اور مدینۃ الزہرا جیسے شہروں والے اسپین کو مسلمانوں نے کیوں کھویا۔ کوئی معجزہ ہو جاتا۔

میاں نے وظیفہ پڑھتے پڑھتے مجھ پر نظر ڈالی۔

میں سو جا کیا۔ اس برصغیر میں کہیں قدم رسول پایا جاتا ہے۔ کہیں حضرت علی کا پنجہ کسی مقام پر امام حسین اور حضرت عباسؑ گھوڑے پر سوار نمودار ہوئے۔ چودھویں صدی بارہنکی کے اس جنگل میں حضرت علیؑ تشریف لے آئے۔ حضرت مخدومؒ کی تجہیز و تکفین میں مدد کے لئے۔

معا میاں نے میری طرف جھک کر کہا ”ہوں“ اور خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے۔

میٹا فر کس کو فر کس سے الجھانا نہیں چاہیے۔

بد و سرائے سے کئی میل آگے نکل کر ایک سنسان مقام پر فروزاں درگاہ کے سامنے

چپ روکی: ”ملا مت شاہ کا مزار“ دروازہ کھول کر اترتے ہوئے ہم سے کہا: ”ملا متی بزرگ۔“
گھپ اندھیری رات۔ ان گنت جنگوں۔ قبریں۔ چاروں طرف گھنا جنگل۔ مورچلا رہے تھے
جیتنے میں ملبوس مرشد نے سگریٹ سلگایا۔ اور لوگوں سے باتیں کرتے بھاٹک
میں چلے گئے۔ کنور نے کہا: ”لگتا ہے کوئی یورومین ٹورسٹ ادھر سیر کرنے آ نکلا ہے۔“
میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی ملا متی تھے۔ بر جس پہنکر شہسواری کرتے تھے۔ وہ بھی نہایت چمکے
اور میاں کی طرح پروگریسو۔“
ہم لوگ نئے مسافر خانے کی منڈیر پر جا بیٹھے۔ دونوں باجیاں لگاتار بولا کیں:

”سید احمد بخش“

”انکے جد تھے۔ کہاں بخش۔ ایران۔ کہاں بارہ بنکی کا یہ جنگل۔ حیرناک معاملات
حضرت عبدالرزاق بانسوئی؟ ملا مت شاہ اور سنت جگ جیون داس۔ یہ تین دوست تھے۔
تین چار فقراء اور ایک جوگی کسی درخت کے نیچے اسوقت بھی اکڑوں بیٹھے ہیں —
فیثوں سے گھٹنے باندھے — ہاتھ میں دھارہ۔“

”کہاں؟“

”مغل تصویروں میں۔“

”نورمن ڈریک — انگریزوں کے قبرستانوں ہی کی خاک چھانتا پھر روز ایک
آرٹیکل اسکا کسی نہ کسی کھوسٹ فرنگی کی قبر کے بارے میں اخبار میں موجود۔“
”انگریز قوم ہندوستان کو کی طرح بھول نہیں سکی ہے۔“

”تغلق شہزادہ مخدوم سارنگ کو جنگل جنگل ڈھونڈا کیا اس جگہ پہنچا جہاں فتحپور۔“
”معلوم ہے۔ ایک بزرگ ملے انہوں نے فرمایا اس جگہ کو بسا دو توشیح کا اتہ پتہ
بتا دیں اس نے پانچ گھر آباد کروائے۔“

”محلہ پنج گھر — اُمیں نے بے اختیار پلٹ کر سوال کیا: ”کیا اب بھی آباد ہے؟“
”بالکل۔“

”وہیں ہمارے ایک مامون رہتے تھے۔“ میں نے یاد کیا۔

جگنو بے نیازی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ ”یہاں بھی عرس ہوتا ہوگا“ میں نے کہا۔
 ”زبردست“ کنور نے جواب دیا۔ ”سنت جگ جیون داس کی سما دھی پر بڑا بھاری میلہ
 تاسے۔ کوٹوا دھام میں۔“

”عُرسوں اور میلوں کے علاوہ سیاسی اور معاشی تحالقی کیا ہیں۔“ میں نے چڑکر پوچھا
 وہ عربی باجی سے مخاطب ہو چکا تھا میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اس تاریک جنگل میں
 اجنبی جگہ پر۔۔۔ اجنبی تو نہیں۔ صدیوں سے یہاں موجود رہا ہوں۔ خلیجوں کے زمانے
 سے آباد علمائے ظاہر و باطن کی اس سرزمین نے مجھ جیسے ناکارہ لوگ بھی پیدا کیے۔

آزادی سے پہلے اس صوبے کی زمین کا پانچواں حصہ مسلمان زمینداروں کی ملکیت
 تھا۔ گو آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۳۱ فیصدی تھا۔ محض اودھ میں ۷۷ مسلمان تعلقدار
 تھے۔ میں یہاں سے کیوں بھاگا۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد اپنی بدلی ہوئی کمتر حیثیت
 منظور نہ تھی میں نے کیا غلط کیا۔ ہر شخص اپنی بہتری چاہتا ہے۔ برطانوی تسلط کے بعد مسلم شرافہ
 خوار و خجل ہوا تھا۔ انکے پاس جدید تعلیم نہ تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم تو بہت بہتر رہے کہ سرسید
 انگریزی پڑھا گئے تھے۔ لیکن آج پھر وہی حالت ہے۔ اردو اخبارات میں ہندوستان کے
 سینکڑوں مسلم کالجوں اور بائی اسکولوں کے کمزور نتائج پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے۔ مسلم کاریگر
 اور تاجر اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے بجائے انہیں کاروبار میں لگا رہے ہیں۔ ہندی سلمان
 بلحاظ تعلیم ایک بار پھر بقیہ آبادی سے دس گنا پیچھے رہ گیا ہے۔

میں جو عرصہ دراز سے مغرب کو اپنا وطن بنا چکا ہوں ان معاملات پر اس قدر مضطرب
 ہوں؟ میں نے تبدیل شدہ حالات کا مقابلہ کیوں نہ کیا؟ میں تو دھانپور ہی کے غریب
 مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ جناح اب مجھے ان سب سے اظہار ہمدردی کا
 کیا حق پہنچتا ہے؟ میں اور ان بہادر باہمت لوگوں کے لیے سرپرستانہ ترحم کا رویہ رکھوں؟

سراٹھا کر عربی باجی کو دیکھا جو کسی دور افتادہ پوربی ضلع میں اپنی موروثی باغیچہ اراضی پر خود کاشت کر رہی تھیں۔ جرمن باجی قابیل بانی کی کاروباری ہیں۔ انکے قصبے میں دنیا کے ہر بڑے بینک کی شاخ کھل چکی ہے۔ ایک بیکم صاحبہ مشرق کی ہیلینا میں اٹلیاں کھلا رہی ہیں۔ حوصلہ مند اور کامیاب لوگوں کی اب یہاں کمی نہیں ۱۹۵۵ء میں ہم سب کتنے بہت ہمت ہو گئے تھے جبھی تو میں یہاں سے رونچکڑ ہوا۔ غدار کے بعد تو کتنے مغل شہزادے بیراگ لے کر جنگلوں میں جا بسے تھے۔ بانیوں سے انگریزوں نے جھاڑو دین تک دلوایتیں۔ ہر طرح سے تحقیق کی۔

تاریخ کا جو ربحا ثابت و سالم اشیاء کو کھلے سمندر میں پہنچا دیتا ہے۔ خستہ اور بیکار چیزیں ساحل کی ریت میں معدوم ہونے کے لیے پڑی رہ جاتی ہیں۔ اتہاس کی تلچھٹ۔ ایک روز نگار خانم اصرار سے بیکم کے کرتے خریدنے چوک لے گئیں تھیں۔ بہت کہا دلالت کے موسم کے لیے یہ کرتے بالکل بیکار ہیں۔ ہرگز نہ بایں۔ واپسی میں پرانے شہر کی سیر کرائی۔ فرنگی محل لے گئیں۔ وہاں تنگ و تاریک گلیوں میں بے شمار مرد اور عورتیں کھیلٹوں پر بیٹھے نظر آئے مرد کرتے سی رہے تھے عورتیں پھولوں کے ہار گوندھ کر بیچتی تھیں۔ یہ لوگ ان مغلوں کی اولاد تھے جنہوں نے ۱۸۵۶ء میں جان بچانے کیلئے گاؤں میں پناہ لی تھی۔ ہنگامہ فرد ہونے کے بعد انکی عورتیں فرنگی محل پہنچیں۔ بولویوں کے ہاں نوکری کرنے۔ تاکہ انکی عزت برقرار رہے۔ پارچے والی گلی سے نکل کر مرزا قدرت اللہ بیگ عرف کدسی کے چاء خانے سے سگریٹ خریدی اور فرامیسی جھلک والے ان خستہ مکانات پر نظر دوڑائی۔ کہ سادہ و جز اپنے پیچھے ساحل پر یہ نشانات چھوڑ گیا۔

لیکن کنور نے کچھ دیر قبل کسی بات پر مجھ سے کہا تھا دلن بھائی تمہارا پر و ہم یہ ہے کہ تم محض تاریکی پر نگاہ جمائے ہو۔ اندھکار میں چمکتے جگنوؤں کو نہیں دیکھتے۔ میاں جیپ کی طرف جا چکے تھے ہم منڈیر سے اٹھے۔ بن تاول میں پریوں کے جلسہ گھر جگمگایا کیے۔

(۴۰)

قطبِ ستارہ

بھادوں کی کالی رات میں تارے بھی بڑی تیزی سے چمکتے ہیں۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ روشن کن کھجورے کی ایسی ٹرین دور غائب ہوتی نظر آئی۔ ملائت شاہ کی درگاہ سے روانہ ہو کر جنگل کی معطر فضا میں پاکیزہ ہوا کے جھونکے کے مانند گزرتے ہوئے میاں نے تین میل کا فاصلہ طے کیا اور ایک کچی سڑک پر ٹہر گئے۔ حد نظر تلک ویرانہ اور تاریکی۔ رفقا تے سالار مسعود غازی کی ان گنت قبریں۔ ہم لوگ جیب سے اترے۔

”اس گنج شہیداں میں“ سرخ ریش مولانا نے کہا ”ایسے ایسے مرقد میں بوکھلے پڑے ہیں۔ اور انکے اندر سات سات فٹ لمبے غازیوں کے جد مبارک صحیح و سالم رکھے نظر آتے ہیں۔ لوگ ڈر کے مارے دن میں بھی اس طرف سے نہیں گزرتے۔ میاں آدھی رات کو چلے آتے ہیں۔“ وہ مزے سے آگے آگے جا رہے تھے۔ دیدی اور دونوں باجیاں سر ڈھانپے ہم لوگوں کے ہمراہ قبروں کے درمیان سے گزریں۔ — برسات کی رات۔ ایک ہزار سالہ پرانی قبروں سے پُر ویرانہ۔ سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن بیہڑ۔ اونچی اونچی گھاس۔ خاردار پودے۔ ناگ پھنی کی جھاڑیاں۔ گڑھے ٹیلے۔ ”تعجب ہے یہ بیبیاں اس بیخونی سے چسلی جا رہی ہیں گویا سکندر باغ میں ٹہلتی ہوں“ ہم نے اظہار خیال کیا۔

”میاں ساتھ ہوں تو کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔“ مولوی صاحب نے کہا۔
چلتے چلتے کسی قبر کے پاس رک کر میاں ”السلام علیکم“ کہتے گویا وہ شخص سامنے موجود ہے اور اس سے مخاطب ہیں۔

چند مقابر کے نزدیک پہنچے۔ گلریز درختوں کی پیچیدار شاخوں کے نیچے سے گزرتے ایک گھیر کے دروازے پر گئے۔ اندر جھانک کر آہستہ سے آواز دی ”السلام علیکم“ آگے بڑھے۔

ایک ہزار سال قبل سالار مسعود غازی نے اس مقام پر کوئی جنگ لڑی تھی۔ یہ قدیم گورستان کبتوں سے بیگانہ تھا۔ لیکن میاں تھے کہ یہاں کسی گمنام قبر پر ٹھٹھک کر اسلام علیا کہتے اور آگے بڑھ جاتے ٹیلے پھلانگتا میں ان ادھ کھلے مزاروں کی طرف نکل گیا جنکے لیے کہا جاتا ہے کہ ان میں رکھے دیو قامت غازیوں کے جنازے اب بھی دکھلائی دے جاتے ہیں۔ سرخ ریش نے دور سے پکارا — راجہ صاحب۔ ادھر نہ جاتیے۔

شکستہ نیچی دیوار بل کھاتی دوڑ تک چلی گئی تھی۔ گویا مختصر سی دیوار چھین جو ظاہری دھ کو اس پر اسرار کائنات سے علیحدہ کرتی تھی۔ دُور افق پر چنبر و شنیاں ٹٹم رہی تھیں۔
 ”وہ دیکھتے۔“ میاں نے مجھے مخاطب کیا۔ ”وہ جو روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ قصبہ کنتور ہے۔ اسے اربعین کی ماں مہارانی کنتی نے بسایا تھا۔ بہت قدیم ہے۔“

یہاں ہر چیز قدیم ہے۔ نئی کون سی ہے۔ ہم نے سوچا۔ کیا خود میاں بہت قدیم نہیں ہیں۔ بنجانے یہ کیا معاملات ہیں۔
 ”مہابھارت والی مہارانی کنتی۔ پانچوں پانڈؤں کی ماں، کنور مجھے ایجوکیٹ کرنے پر کمر بستہ تھا۔“ وہ لوگ اپنی جلا وطنی کے زمانے میں یہاں آن کر رہے تھے۔
 ”کنتور“ عربی باجی بولیں ”سالار مسعود نے فتح کیا۔ سترہویں صدیوں سے یہ علماء اور مجتہدین کا مرکز رہا ہے۔ علامہ کنتوری کا نام یاد ہے آپکو —؟“
 ”جی نہیں“

مولانا حبش کرامت حسین بھی کنتور کے خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے۔
 ”اچھا وہ کرامت حسین گریز کا لچ —“ ہم نے ذرا بے دھیانی سے کہا۔
 ”اور آیت اللہ خمینی بھی —“ سرخ ریش بولے۔ ”انکے اجداد کو شاہان اودھ نے ایران سے بلا کر یہاں آباد کیا تھا۔ غدر کے بعد وہ لوگ ایران واپس گئے۔“
 ”آیت اللہ خمینی نے اس بات کی تردید کر دی ہے۔“ ایک اور صاحب نے جواب دیا۔

جرمن باجی گورستان کی دیوار پر بیٹھی آسمان کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ ”بعض تارے اتنے روشن۔ باقی مدھم۔ اور پھر اندھیرا۔ نور اور تاریکی کا یہ کیسا سلسلہ ہے۔ لامتناہی۔“ انھوں نے حیرت سے کہا۔ ہم دیدی کی طرف مڑے۔ وہ بولیں۔

”تارے دیکھت ہیں چاچا۔ وہ دیکھیے۔ وہ رہا پست رشی منڈل۔“

دیدی کو تو رشی ہی نظر آتی تھیں۔ لیکن مجھے اور آن دھتی اور روشی کا خیال آیا۔ دیدی کہ وہاں پورے ایک پڑوسی راجہ کی بیٹی نکلیں۔ میکے کے رشتے سے ہمیں چاچا پکارنے لگی تھیں۔ افسوس کہ ہم پہلے بوائے کے بجائے چاچا بن گئے۔

”وہ رہا دھرتارا۔“ دیدی نے اطلاع دی۔

”قطب ستارہ۔“ عربی باجی بولیں۔ ”اُدھر۔“

”گورستانوں کے سلسلے بھی نو رستان کی طرح لامتناہی ہیں۔ جیپ کی سمت واپس

جاتے ہوئے جرمن باجی نے اظہار خیال کیا۔ ”تارا منڈل کے مانند انت۔“

ہانی دے سناں پڑی تھی جیپ اڑی جا رہی تھی۔ اچانک ایک جیم سیاہ پرند سامنے آن کر ادھ کھلے شیشے سے ٹکرانے ہی کو تھا کہ میاں نے بریک لگائی۔ پرند پل بھر کے لیے ہوہاں معلق رہ کر انجن پر پٹ سے گرا اور زخمی ہو کر اڑ گیا۔

”یو۔ کے۔ پی۔!“ میاں نے مسکرا کر مجھ سے فرمایا۔

دیدی متوحش نظر آئیں۔ دریافت کیا۔ ”میرے لیے بھیجا گیا تھا؟“

”واپس گیا۔“ میاں نے تنگننگی سے جواب دیا۔

رات بھیگ چلی تھی مگر آستانے پر حسب معمول بے انتہا چہل پہل۔ گیس کی روشنیاں۔

مہانوں کی آمد و رفت۔ میاں مکان کے اندر تشریف لے گئے۔ طعام شب کے بعد تینوں

خواتین اور سرخ ریش کے ساتھ ہم باہر شامیہ میں جا بیٹھے

”اُو کا چھٹیا بُری چیز ہے۔“ دیدی بار بار کہہ رہی تھیں۔ ”میاں نے پچالیا۔ میاں نے۔“

”اُلوکا جھٹیا کیا شے ہے؟ ہمیں سنسی آگئی۔

”چاچا۔ ہمارے دشمنوں کو معلوم ہو گیا کہ ہمارے خلاف انہوں نے جو مشترک کام کروائے تھے انکا یہاں اتار کیا جا رہا ہے۔ اسی مارے آج انہوں نے اس سے اُلو بھیجا۔ چاچا۔ اما دس کی گھور کالی راتوں میں ندی کنارے عمل کروا کے ہماری جھٹھانی ہمارے خلاف پرتیوں کی چوکیاں بھجواتی رہی ہیں۔ ایک عامل صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہمارے اوپر چودہ تختیوں کا اثر ہے۔ چودہ بُری آتماؤں کا۔ اٹھارہ سال تک ہمیں بیماریوں نے گھیرے رکھا۔ رام رے۔ کیا دھجا تھی ہماری۔ اتنے دنوں میں ہیرا پھیری کر کے ہمارے جھٹھانی نے ہماری پچاس لاکھ کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ ہمارا یہ حال کہ سونے کو ہاتھ لگاویں تو مٹی بن جائے۔ کوئی سادھو عامل کھاؤ پیرایا نہیں جسے ٹرائی نہ کیا ہو۔ چاچا ایک بڑے میاں ایسے ہمارے پاس آئے اُتار کرنے جنکے پاس ایک کتاب تھی۔ شبد تو اسمیں عربی فارسی جیسے تھے مگر سب اُلٹے لکھے ہوئے۔ سب ملا کر تین لاکھ روپیہ ان لوگوں پر برباد کیا۔ ہم بحیثیت انکے ”میکے والے“ ہمدردی سے سُنا کیے۔ وہ ہماری ”بٹیا“ تھیں۔ ”پھلے مہینے الہ آباد اپنے پیرسٹر سے ملنے گئے تھے۔ وہاں کسی نے میاں کا ذکر کیا ہم نے دھیان نہ دیا۔ طے کر لیا تھا اب کسی کے پھیر میں نہ پڑیں گے۔ بلکہ نوڈ منزل جا کر اپنے دماغ کا علاج کروائیں گے۔ شاید مصیبتوں نے ہم ہی کو وہی بنا دیا ہے۔

”لیکن جب ان صاحب نے بہت سارے قہقہے ہم جیسے دکھیا روں پر میاں کی کپڑا کے سُنائے تو ہم ان کی شرمن میں پہنچے لکھتو۔ ان کو اپنا ماجرا سنانا شروع کیا۔ بیس سال لمبی کہانی تھی۔ مگر میاں نے دس منٹ بعد ہی بڑی مدھرتا سے کہا: ”اب کچھ نہیں ہوگا!“ جب ہم اس روز یہاں آئے تو میاں نے ان دونوں میں سے ایک سجن کو بلوایا وہی جو میاں کے انسٹرکشن پر لوگوں کو تعویذ وغیرہ دیتے ہیں۔ چینی کی پلیٹوں پر زعفران سے نقش لکھ کر دیتے ہیں پینے کے لیے۔ میاں نے ان سے خالی اتنا کہا — دیدی کے اوپر سے چار ہانڈیاں اتار دو۔

”پیرسوں سے آج سویرے تلک تین ہانڈیاں اتاری جا چکی ہیں بکل سویرے چوتھی

ہانڈی اتاری جاوے گی تو دیکھتے آج ہی بیروں نے اٹو بھجوا دیا۔“
 ذید می کی ہانڈیوں نے والد سمیں چکرا دیا۔ پوچھا: ”یوہی جن میں کھانا پکتا ہے؟“
 بولیں: ”جی ہاں چا چا مٹی کی کورھی خالی ہانڈیاں۔ ایک کے اوپر خادم نے ہمارا اور
 ہماری ماں کا نام پوچھ کر نکلے ارد دیں۔ اور عربی میں کچھ کچھ اور لکھا۔ پھر اسے ڈھکن سے
 بند کر کے آٹے کا کڑا لگا دیا۔ پھر چالیس بار ہمارے اوپر سے اتارا۔ اب جو ہم نے دیکھا
 چا چا تو آٹا خون سے لال خادم کہنے لگے ہانڈی بہت بھاری ہو گئی ہے۔ پر ماتم کی
 شان ہے۔ کتنی بڑی بلاؤں نے ہمارے اندر گھر کر رکھا تھا۔ اٹھارہ بیس برس سے۔ وہ صاحب
 ہانڈی لیکر باہر چلے تو ہم نے پوچھا کہاں جاتے ہیں بولے اب اسکو من بھر کڑی کے الاؤ پر رکھ دیا
 جائے گا دن بھر کھد بکتی رہے گی ساری بلائیں اندر ہی اندر بھسم ہو جا دیں گی۔“
 ”آج سویرے دوسرے ہانڈی اتاری گئی تو دیکھتے دشمنوں نے اٹو بھجوا دیا۔ اسے میاں
 نے فوراً واپس لوٹا دیا ادھڑا کر کے۔ آپکے سامنے کی بات ہے۔ اب ہمیں کوئی چننا نہیں۔“

ہم کرسی سے سڑک کر سامنے تالاب کو دیکھا کیسے۔ ہم میاں کی پاکیزگی، منفرد شخصیت اور
 صنِ اخلاق کے گردیدہ ہو چکے تھے مگر یہ جادو ٹونے کا آثار، جنات اور بد رواج کے قصے۔

THIS WAS A BIT TOO MUCH

”اس تال کے کنارے۔“ کنور نے کہنا شروع کیا۔ ”بے شمار ہانڈیاں دفن ہیں۔ میاں
 کے والد علیہ الرحمہ کے پاس بھی اسی طرح پریشان حال لوگ آتے تھے۔ بالائے شریف اور کچھوچھ
 شریف سے آسیب زدہ لوگ پاگل دیوانے یہاں لائے جاتے ہیں وہ میاں کی توجہ سے
 اچھے ہو جاتے ہیں۔“

”کچھوچھ شریف میں ابھی ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔“ عربی حاجی شگفتگی سے بولیں ”وہ ایک
 مامور ماہر اسلامیات ہیں نا۔ ڈاکٹر شمل۔ وہ کچھوچھ شریف تشریف لے گئی تھیں۔ شاید وہ
 بھی راجہ صاحب آپکی طرح کی SCEPTIC ہیں۔ مغربی دانشور۔ وہاں پر حسب معمول آسیب
 زدہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ انہوں نے غالباً جنات وغیرہ کے متعلق عدم یقین کا اظہار کیا۔ اس کے بعد

ہوں نے آسیب زدہ سچوم کی تصویریں کھینچیں۔ ڈیولپ کرنے کو دیا تو سارا رول بلیٹک "کیمرے میں کوئی خرابی رہی ہوگی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے تصویر پر یاد آیا، جرمن باجی بولیں!" میں نے ٹینگن یونیورسٹی کے میوزیم۔ ایک مغل پینٹنگ دیکھی تھی۔ ستلہء کی بنی ہوئی۔ کہ حضرت سلیمانؑ جو ہیں وہ مغل بادشاہوں لباس پہنے تخت پر بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف پریاں۔ جنات اور قسم قسم کے جانور۔ ایک خوش موٹی مٹی پریمی انکے سامنے گھڑی ہے۔

"دیو اور جن شکلوں سے بڑے سوئیٹ لگ رہے تھے۔ اس مغل مصور کا تخیل زوردار ہوگا۔ بڑی WIERD عجیب الخلقیت صورتیں بنائی تھیں۔ وارڑھیاں۔ جانوروں کے اڑے بڑے بڑے کان۔ پر۔ ایک صاحب کے سر پر ایک سینگ۔ سب ایک سے ایک کیوٹ۔" "اسوقت آپ کو ایک نہایت کیوٹ اور سوئیٹ جن نظر آجائے تو کیا ہو؟ میں نے فحش ہو کر پوچھا۔

"میاں کی موجودگی میں میں کون ڈرا سکتا ہے؟" جرمن باجی نے اطمینان سے جواب دیا۔

ایک ساؤتھ امریکن مصنف نے اپنی کتاب میں JBLINS, GENII AND OTHER IMAGINARY BEINGS شاید اسکا عنوان ہے۔ اس نے دنیا کے

کے کم فہم لوگوں اور جنگلی قبائل اور قدیم تہذیبوں میں رچے ہوئے نسلی واہموں کی عم اور نفسیاتی وجوہات کا تجزیہ کیا تھا۔ لیکن یہ خواتین و حضرات نہ قبائلی تھے نہ کم عقل۔ تعجب سُرخ ریش کہنے لگے۔ "راجہ صاحب۔ آپ یقین نہیں کر سکتے۔ آپ لوگوں کے ر

مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان ہیں تو فرشتوں کے وجود کو مان لیں گے کہ وحی حضرت جبریل علیہ ہی لیکر آئے تھے۔ مگر اجنہ کو واسمہ سمجھیں گے۔ قرآن حکیم میں انکے متواتر تذکرے کے "صبح عاشور زعفر جن امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی

حکم دیجئے تو میں پل کی پل میں اپنے لشکر کو بلا کر فوج یزید تہیں نہیں کر دوں۔ مولانا نے نہیں تم واپس جاؤ۔ مجھے ایسا فریضہ پورا کرنا ہے۔"

”مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کا ایک اور واقعہ آپ کو سنا دیں؟“ عربی باجی نے دریافت کیا۔
 ”انکے مدرسہ نظامیہ میں ایک جن بصورت انسان پڑھنے آیا کرتا تھا۔ مولانا نے ایک روز اس سے دریافت کیا اس وقت قوم اجنبہ میں سے کوئی صحابہ بھی حیات میں نہ تھا۔ اس نے کہا میرے ایک چچا ہیں۔ حضور کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ترک دنیا کر کے ایک صحرا میں مقیم ہیں۔ مولانا پتہ نشان معلوم کر کے اس صحرا میں گئے اور اس سے ملے۔ اس نے بتایا کہ حضور کی خدمت میں رہ چکا ہوں حضور کے ہمراہ اکثر غزوات میں بھی شریک ہوا۔“
 ”مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں توجہوں کے بچے اکثر پڑھتے آتے تھے۔“ سرخ ریش نے صاف کیا۔ ”بیٹا یہ تو ہماری یاد کی بات ہے۔ حضرت مولانا عبدالباری مرحوم کے مکان کے تھانے میں جن رہتے تھے۔ انکے بچے مدرسے میں پڑھتے تھے۔ پھر جانے کیا بات ہوئی مولانا نے ان سے درخواست کی کہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ وہ مان گئے رات کو کسی نے دیکھا کہ بے چارے سردوں پر کھانے کے طباق رکھے ہوئے تھے خانے سے نکلے صحن میں سے گذرتے ڈیوڑھی سے باہر چلے گئے۔“

دفعاً سب خاموش ہو گئے۔ برگدوں کے ادھر کسی گھر میں رت جگمگنا یا جا رہا تھا۔
 ولادت رسول کے اسی گیت کی آواز بلند ہوئی۔ عبداللہ کے انگنوا میں ٹوہریں ناچیں چھماچھم
 ”HARK THE HERALD ANGLES SING!“ کنور نے آہستہ سے کہا۔ ”سارا ویسٹ کرسس سینئر میں الاپتا ہے تو سوچتے ہو فرنگی بھی فرشتوں کو مانتا ہے تو چلو فرشتوں پر یقین رکھنے سے تم کو جاہل اور توہم پرست نہیں سمجھا جائیگا۔ لیکن جن بھوت — خرافات!“
 ”یار — میں نے رچ ہو کر جواب دیا۔“ یہ جوان نے روکت خلا میں چھوڑے جا رہے ہیں انہیں تو راہ میں کوئی آسمانی مخلوقات نہیں ملیں۔ سو ویٹ یونین میں جنات کیوں نہیں پائے جاتے؟ جن کو مانوں تو بھوت پریت چڑیل مسان سب کو مانتا چلا جاؤں۔“
 ”نہ مانو کون کہتا ہے کہ مانو۔ اتنے دنوں میں تم نے نوٹس کیا ہو گا کہ میاں کبھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ — میاں کے ساتھ جو انکے

یہ بٹاش اور خوش اخلاق خدام تم مستعد دیکھتے ہو انکے علاوہ چند جنات بھی ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ جنات متیعنہ محض ایک بار انہوں نے وہ بات کہی تھی کہ اگر وہ ان دیکھے لوگ تم کو نظر آجائیں جو ہمارے ہمراہ رہتے ہیں تو ہیبت سے تمہارا کلیجہ تنق ہو جاوے۔

”اور ایک اور مرتبہ کا واقعہ ہمیں کسی نے بتایا تھا۔ عربی باجی نے کہا: ”میاں کہیں تشریف لا رہے تھے۔ انکے خیر مقدم کے لیے کچھ لوگ ایک کار لیکر کسی جگہ پہنچے۔ باقی لوگ دوسرے راستے سے آئے۔ دیر سوچکی تھی۔ جب وہ لوگ اس خالی کار کے پاس گئے جہ لے کر میاں کے پاس جانا تھا اسیں دوسفیلوش پچھلی سیٹ پر بیٹھے نظر آئے۔ یہ صاحبزادہ قریب پہنچے تو وہ دونوں دروازہ کھول کر اترے اور فوراً غائب ہو گئے۔ جب انکے میسر یا میاں کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا آپ نے دیر لگا کر ڈیوٹی کے لوگوں کو پریشان کیا“

میں چپ چاپ بیٹھا دال موٹھ کھاتا رہا مگر مولوی صاحب جھٹکیا کیا شے ہے؟“

سرخ ریش نے مجھے بغور دیکھا ”راجہ صاحب جن چیزوں سے آپ واقف نہیں؟“

یہ مطلب نہیں کہ انکا وجود ہی نہیں؟“

”آپ نیوکلیر فزکس سے واقف ہیں؟“ عربی باجی بولیں۔

”افوہ بھائی عربی باجی آپ ذرا چپکی رہیے جی مولوی صاحب۔“

”راجہ صاحب۔ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آجہ کو آگ سے پیدا کیا۔ اور احکامات نازا کیے کہ بندوں کو گزند نہ پہنچانا۔ وہ اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ ہر جگہ بے چارے نیک جنات بعض اوقات اپنی غفلت اور اپنے حجم کی وجہ سے انسان کو نادانہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ آگ کی خاصیت جلانا ہے۔ آپ اسکی زد میں آئیے جھلس کر رہ جائیں گے۔ رہیں بدارواح۔“

”اور الٹا جھٹکیا۔“

”سفلی عمل والے آلودہ کرتے ہیں۔ انکو یہاں سزا مل جاتی ہے۔“

”اس جگہ پر محض نیک جنات رہتے ہیں کل بڑا لطف آیا۔“ جرمین باجی بولیں ”میا

کے ایک خادم درجوبیل کا جنگل ہے نارات کے وقت وہاں چلے گئے تھے۔ وہاں جنوں نے انکی خوب ٹھکائی کر دی۔ نمودار ہو کر بوئے یہاں ہماری مسجد ہے تم کیا کر رہے ہو۔ اس نے بحث کی مسجد تو وہ سامنے درگاہ میں موجود ہے۔ دوسری مسجد کہاں ہے دکھلاؤ۔ وہ بوئے ہم میاں سے ڈرتے ہیں ورنہ تم کو ٹھیک کر دیتے۔“

پاکستان میں بھی ضعیف الاعتقاد لوگوں کی کمی نہیں۔ کراچی میں ہمارے ایک دوست کی بیوی نے ایک بارتنا یا تھا کہ اسکا بیٹا کسی بد دعا کے اثر سے ناگہانی مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ ایک لائٹنل ایرلائینز کے ایک سینئر پاکستانی پائیلٹ بھی انہوں نے کہا پوشیدہ بزرگ ہیں۔ انہوں نے ایک چھڑی پڑھ کر لڑکے کو دی۔ چند روز میں ادھر بد دعا کا اثر زایل ہوا ادھر وہ چھڑی غائب!

میں ان معقول سنجیدہ انسانوں کی سمجھ بوجھ پر متحیر بیٹھا رہا۔ سامنے تالاب میں تارے منعکس تھے۔ سپت رشی۔ دھرتارا۔ ساری آکاش گنگا۔
صدر دروازے پر گیس کی لائٹنیں جنگل میں بھیگی ہوئی ہوا میں سنسنایا کیں۔ اندر صحن سے بنشاش تہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ چلو انہ رچلیں۔ میں نے کنور سے کہا۔

ڈیوڑھی میں پہنچے تو حاضرین کے تہقہوں کے درمیان ایک باریک غیر انسانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ باریک ہنسنی، خفنی سی ہنسی۔ ایسی UNCANNY, NASAL آواز آج تک نہ سنی تھی۔ پھر ایک کڑک دار مردانہ آواز صحن میں پہنچے تو دیکھا میاں حسب معمول پلنگ پر نیم دراز فلیان فوشی میں مصروف۔ ایک خوش پوش چھیری سی لڑکی پیشانی پر سرخ بندی۔ پائنتی زمین پر بیٹھی وہ غیر انسانی ہنسی سن رہی ہے۔ موٹی موٹی ساری پیسے ایک مسلمان دیہاتن میاں کے سرھانے کھڑی نہایت گرجدار مردانہ آوازیں بنکار رہی تھی۔

ادھر وہ شہری ہندو لڑکی ناک میں بولتی اور بھیانک ہنسی سن رہی ادھر وہ مسلمان دیہاتن زور زور سے تقریر کرنے میں مصروف۔ ”ہم بچ رگ ہیں۔ ہم کامت سناؤ۔ ہم معمولی جن بھوت

نہیں ہیں۔ بج رگ ہیں۔ پھر اس نے لمبا قصہ کسی عورت سے اپنے جھگڑے کا شروع کر دیا۔ حاضرین محفل کے لیے یہ یہاں کے روزمرہ کے واقعات تھے۔ وہ محفوظ میں منحصر۔

”یہ دونوں دو مخالف سمتوں سے ابھی ابھی یہاں پہنچی ہیں۔ ایک پورب سے آئی ہے ایک پچھم سے“ ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔

دیہاتن بڑی مزیدار تقریر کر رہی تھی۔ مجمع بار بار تھپے لگا رہا تھا۔ میاں بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نیلی ساری والی لڑکی پھر زور سے خنکا کر کہی۔

”یہ بے چاری کالج میں پڑھتی تھی کوئی چڑیل اس پر مسلط ہو گئی۔ ابھی ابھی شام کی بس سے اسکا بھائی اسے یہاں لایا ہے۔ فیض آباد سے کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گی“ ایک خادم نے میاں کا حقہ تازہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کچھ دیر بعد ”چڑیل“ والی لڑکی رخصت ہوئی۔

وہ دیہاتن اسید طرح بھاشن دیتی رہی۔ پھر اس نے سید کرار اسلام علیکم کہہ کر میاں سے مصافحہ کیا اور باہر گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی۔ اب وہ بالکل نارمل تھی۔

”جن باہر ڈیوڑھی میں کھڑا رہ گیا ہے۔ میاں نے حصار کر دیا۔ کنور چیکے سے بولا۔

دفعۃً وہ پھر مردانی آواز میں بنکارنے لگی اور اسید طرح گرجتی ہوئی جا کر ڈیوڑھی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

گاؤ ٹکیوں کے سہارے نیم دراز میاں بڑی بٹاشٹ کے ساتھ سیدھے ہاتھ کی دو ٹنگیوں سے آہستہ آہستہ گویا کسی کو جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ اور شریریت سے لگا ہوں سے مجھے دیکھا۔

باہر سے عورت کی نارمل آواز آئی۔ چند لمحوں بعد میاں نے پھر اشارہ کیا۔ مکان کے باہر سے عورت نے دوبارہ دھاڑنا شروع کیا۔ اسید طرح جینیتی چلائی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

”یہ بھی صبح تک ٹھیک ہو جائے گی“ کنور نے کہا۔



(۴۱)

مَدھوبُن

ہمالیہ کے دامن میں سدا بہار جنگلات ہمارے ساتھ ساتھ رواں تھے۔ پیر شکوہ درختوں کے کیتھڈرل! ہوائیں آرگن بجاتی ہیں۔ پرند کوایر گار ہے ہیں! اسارا ہندوستان۔ ”کنور نے گونجتی ہوئی سی آوازیں کہا ”کیا ایک اوپن ایرویسٹ ٹر ایب نہیں؟ وہ اولڈ وک کی اسٹیج پر طامس بیکٹ کارول ادا کرنے والے سر ڈونلڈ وولفٹ نا طرح بول رہا تھا۔ ”زائرین کے جلوس بیکٹ کی قبر پر جاتے تھے تو انگلش لڑیچہ نے اسے زندہ جاوید کر دیا۔ محض ٹھیٹر اور کتابوں میں — ہم اپنے فوک ہیر و موسموں کی پشپالا وروک کیتوں سے سے بے بریٹ کرتے ہیں۔ یہ سارا ایریا سالار مسعود کنڑی ہے۔ جیٹھ مہینہ باتے میاں کی شادی، پلنگ پڑھیاں جھنڈے اٹھائے ہندو مسلم باپا دادہ زائرین کے نافلے۔“

اس نے کاری رقرار دھیمی کی۔ ایک قدیم درگاہ کی بنسواری میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ایک سیاہ پوش بوڑھا بانسری تراشنے میں منہمک تھا۔ طویل گلہ ٹن ٹن کرتا سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ گوری رنگت کے گڈریے نے مسکرا کر ہمیں دیکھا۔ گاڑی روکنی پڑی۔ بھینسوں کی آہستہ خرامی اور ایشیائی زندگی کی رقرار مجھے ایک سی معلوم ہوئی۔ ”گڈر لنگ چپ کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔ ”مسلمان گڈی سنتے ہیں انکے اجداد گاچی میاں کے لشکر کو دودھ پیلانی کرتے تھے۔ سالادیم دی کو نکر رسالار مسعود کا تقریباً کن کم پریری تھا جنوبی انگلینڈ کے ملکین یہ تو کہتے نہ ہونگے کہ انکے فور فادر نورمن فوج کے لیے۔“

”یار یہ سب یاد رکھنے کے بجائے انہیں اور بہت سے کام بھی ہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان

میں کاسٹ سسٹم نہیں ہے۔ بنارس کے ملاح کہتے ہیں انکے پرکھوں نے راجندر جی کو بن باس کے لیے کاشی کے اسی گھاٹ سے گنگا پار کرائی تھی۔“
 ”عین ممکن ہے“

”سوڈوٹ — تمہارا پروہلم یہ ہو گیا ہے کہ تم کو منہرا کی ہر گوالن میں ایک گوبی نظر آتی ہے۔ یہ مہٹری کا OVERKILL ہے سینڈی“

پراٹم منسٹر صاحبہ جب کسی بیرونی سفر پر روانہ ہوتی ہیں اودھ کے ایک سابق تعلقے کے ایک صاحب کے پاس ٹرنک کال آتا ہے وہ فوراً دہلی پہنچتے ہیں ساتھ ریاستی لباس میں نانی — چاندی کی تھالی میں امام ضامن رکھے۔ وہ میڈم کے بازو پر باندھا جاتا ہے۔ آتے دن وہ مندروں میں جاتی رہتی ہیں۔ باپ اتنے سائنٹفک ذہن کے لادین آدمی تھے۔ اپنا اپنا مزاج ہے۔ خواتین بہر حال زیادہ مذہبی ہوتی ہیں۔ سوشلسٹ سماج کی عورتوں کو تو عرصے سے اس جذباتی سہارے کی حاجت نہیں رہی — تیسری دنیا میں مذہب پرستی ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن جن چیزوں کو میں تو ہم کہتا ہوں کنورا سے خوش عقیدگی بتائے گا۔ الفاظ اور تصورات کا کمیونی کیشن بریک ڈاؤن۔

”گھوڑا شہید کا چلہ —“ ایک کافی آلود گنبد کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے اناؤنس کیا۔ امرتوں میں کوئل کوک رہی تھی۔
 ”ان باغوں میں چھپے کسی پراچین آشرم یا درگاہ کی جھلک دیکھ کر عجب سامحوس ہوتا ہے۔ اس فیلنگ کو میں پن پولائنٹ نہیں کر سکتا“
 ”تم ایک رومینٹک آدمی ہو سینڈی“

”کسی موڈرن ہندی پوسٹیٹ کی یہ ایک لائین پھلے دنوں مجھے اچھی لگی — ایک سمجھدار تپہ گر نے کی تیاری کر رہا ہے“ — سنو۔ دلتن بھائی تمہارا کبھی یہ جی نہ چاہا کہ کسی ہرے بھرے ووڈ لینڈ میں بہتے دریا کے کنارے جا بسو؟ شاردہ۔ موہن ندی۔ گوتمی۔ سر جو۔ بس ایک ندی اور ایک غمبق جنگل۔ تمہارا کبھی جی نہ چاہا —؟“

”نہ جو گیم کہ جو گیم بہ برگ کو کنار ہا۔“

”ہا ہا۔“

اب ہم ایک پل پر سے گذر رہے تھے۔

”میاں کی خانقاہ اب زیادہ دور نہیں“ کونر نے کہا۔

خانقاہ! ایک وقت یونان میں راہب کا بھیس بدل کر فدوی ایک نادر و بیش بہا باز نطنی آئیکن پر ہاتھ صاف کرنے کی غرض سے ایک گریک اور تھوڈ کس ری ٹریٹ میں گیا تو کیا پراسرار جگہ پائی تھی۔ نیم تاریک راہداریاں۔ سرد اندھیرے زینے۔ سلاخوں دار دروزن۔ اونچی شمعیں عود و دوبان کے مرغولے۔ لباس تیرہ سرسراتے گھنی طویل ڈارھیوں والے راہب۔ باہر زیتون کے پڑوں پر دمکتا تہا چاند۔ اور قرون وسطیٰ کے اسلامی رباط۔ تعلق اور لودھی قسم کی نیچی محرابیں۔ ٹھوس عمارت۔ عود و دوبان سے معطر۔ نقش چغتائی کے ایسے لبادے پہنے غلامی آنکھوں اور باریک ستواں ناکوں والے درویش۔ آہو چشم کد و بدست گداگر۔

ناچیز اپنے دائرہ مٹی جیسے زور و تخیل سے عاجز ہے۔ گو اسی کی بدولت اپنے ناگفتہ بہ ارادوں کی پلاننگ میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اس وقت میاں کی خانقاہ کے پراسرار ماحول اور رہ و رسم خانقہ کی تصور کیا سینڈی پھر بولا: ”ہم تو ہفتوں وہاں جا کر رہتے ہیں۔“

”چھوڑ رباط کہن کو صوفی۔“

”ٹک ٹک تو تم بھی۔“

”ٹک ٹک تو کیو کا نہ کٹائیں۔“

”ٹالو۔“

”ٹریڈ میں ٹوٹا ٹاٹا بھی نہیں پسند کرتا۔“

”ٹائیں ٹائیں مت کراے بیوقوف طوطے۔“

”ہمیں طوطا مقرر کیا ہے؟ ہم ایک مصروف تاجر ہیں۔“

”ٹھا کر صاحب ان ٹوٹنہم کورٹ روڈ۔ یو۔ کے۔ پی۔“

میں نے قہقہہ لگا: ”اسکول میں ہم لوگ پہروں اس قسم کی فون سنس۔“

”سُسن تو آپکے اندر اب بھی بہت زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔“

کسی گاؤں کی ٹٹماتی ہزریا۔ دوکانوں میں بیٹھے لوگ گویا میڈیول تصویریں۔

بغداد اسکول جو سالار مسعود غازی کا ہم عصر تھا۔ اسکا ایک نادرا لہم ہم نے ایک باری ڈنمارک کے ایک میوزیم سے پا کر کیا تھا۔ ترائی کے اس بازار میں بالکل اسی طرح کے باریش دوکاندار ترازو سامنے رکھے، برقعہ پوش عورتیں۔ گول ٹوپیاں اوڑھے بچے۔

یہ سندیش نرائن سنگھ ابھی مابعد الطبیعیاتی تسلسل کی کیا بات کر رہا تھا۔

اور حلوائی کی دوکان کے نیچے بیٹھا ایک پرامید کتا۔ ایک پرامید۔

امید کرتا ہوں کہ نور مائی وہ ٹوکیو سان فرانسسکو والی اسیکم نہایت بار آور رہے گی۔

ہمارا پلان یہ ہے اور کیا سود مند پلان ہے کہ سیاحوں میں ایسی ہستیاں جو نہ بیہوش میں

ہیں نہ شیوں میں۔ انکی میزبانی کی خاطر پیرس ٹوکیو لاس اینجلس سے ایسی ہستیاں جو نہ

معاڈر سالگا۔ فاسد و قبیح اور ادوں کے غول بیابانی میں کہ اپنی لالین چمکائے جا رہے ہیں۔

چوروں کی طرح سینڈی کی طرف دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جمال تمنیش نے اسے بھی پوتر،

شدھ کر رکھا ہے۔ میاں بہت آگے آگے جا رہے تھے۔ انکی ایمبیڈر کی سرخ روشنی تاریکی میں

تذیل رہبانی کے مانند جھلملاتی۔

ایک شہر ہماری سمت بڑھا۔ پیچھے ہٹا۔ افق پر روشنیاں نمودار ہوئیں۔ جنگل میں منگل

جو میرے بن مائی نے لگایا ہے۔ ”سندیش نرائن سنگھ خدا سے خوش رکھے، اپنے ممدوح کو

کبھی بن مائی کہتا ہے کبھی بن راج، اور تہواری کہ یہ سری کرشن کے القاب ہیں۔ یوسف تانی

پکارتا ہے کبھی شہر یار ملک عرفاں۔ میں دلشاد علی کنہا ہر بیٹوں میں سے ہوں میں نے اپنے اس

قدیمی یار کو پھر ڈاؤن توڑتے واپس لانا چاہا۔ ”ان جنگلوں اور ندیوں میں ہم نے کتنے تیر مارے

کتنے ماہ شیراب و ایلڈ لائف کے لیے ساری دنیا میں پناہ گاہیں بنادی گئی ہیں۔ انسانوں

کا شکار بلا لائسنس۔“

”ہاں۔ مچان بھی ایسے باندھے گئے ہیں کہ نشانہ خطا نہ ہو۔ اور کنکریٹ کے مہابنوں کے

اندر کمین گاہیں۔“

”کیم ریزر دیہاں سے کتنی دور ہے؟“

”میاں کے ساتھ موقع ملے تو ضرور جانا۔ میرے دینو گوپال اس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ ہرن فلائیں بھرتے اگر ان انکے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انکو تنکا کرتے ہیں۔ رمضان شریف میں اگر وہ خانقاہ میں موجود ہوں انکے ساتھ افطار کے لیے آدم جانے کہاں کہاں سے امنڈ آتا ہے، مدھوبن — شہد کا جنگل! کبھی مدھیہ پردیش میں حسین ٹیکری گئے ہو۔؟ امام حسین کی زیارت گاہ۔؟ نہیں۔؟ اسکے گرد جو فورسٹ ہے اکثر صبح صبح اسکے پتوں پر شکر جی ملتی ہے۔“

”چلو شکر کا مسئلہ تو یوں حل ہوا۔“

”ہاتھ لنگن کو۔ جا کر دیکھ آؤ۔ تمہیں محل دینے کے لیے ٹیکری کے منتظین راتوں رات لاکھوں پتیوں پر چینی تو چھڑکنے سے رہے۔ دن بھیا ہو۔“ وہ خالص اودھی انداز میں بولا۔ ”تم لوگوں کا پرولیم یہ ہے کہ خرد کی عاجزی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔ درنہ۔ پچھم کے لال بھکڑوں نے جو گیان بھون تین سو سال میں تمہارے لیے تیار کیا ہے وہ پل بھر میں۔“ ایک نیلگوں پھانک سامنے آیا۔ اندر جا کر سایہ دار راستے پر سے گذرتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ”یہ سامنے جو عمارت دیکھتے ہو۔ اسکی تعمیر کا تمہاری عقلی توجیہ سے کوئی علاقہ نہیں یہ دیرانہ تھا۔ ایک کہنہ تلے کے آثار اور بالے میاں کے ایک ساتھی کا مرقد۔ دس بارہ برس قبل کا ماجرا ہے میاں اچانک یہاں وارد ہوئے اس بلڈنگ کا نقشہ بنایا۔ لارٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایزاے نیک سینٹ۔ جیز جوائس نہ لکھ پاتے۔ البتہ گرم گریں۔“ گاڑی باغ کے صدر دروازے پر روکی۔ مرشد بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ سامنے ایک خوبصورت گلانی بنگلہ اور اسکا گلشن برقی قمقموں سے فردزاں تھا۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے۔ ہر برگ گل چوں شب چراغے۔ اس کو شک بعل اور چین کی چہل پہل دیکھتے آگے بڑھے۔

نصف شب سے زائید گذر چکی تھی۔ اشجار میں پوشیدہ تیز روشنیوں کی زد میں ایک سیم صاحبہ وسطی روش پر ٹہلتی نظر آئیں۔ میاں پھانک پر گردہ مشاقاں میں گھرے کھڑے تھے۔

قریب آئیں بعد خاکبوسی یوں گویا ہوتیں۔ ”میاں کل رات ہم پچھلے برآمدے میں تہجد پڑھ کر اٹھے ہی تھے کہ ایک بید لائے سفید پوش دکھلائی پڑے۔ گورے چٹے نہایت خوبصورت اور نمسن۔ پورے ہنس منٹ تک نظر آیا کیے۔“

”وہ سب نوجوان لڑکے تھے۔ مختلف ملکوں سے آئے تھے۔“ مرشد نے اطمینان سے فرمایا اور بنگلے کی سمت روانہ ہو گئے۔

”مگر اتنے لائے؟“ محترمہ نے دہرایا۔

”آج کے کینیڈین بھی تو بے تحاشا لمبے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ دور دور سے آئے تھے۔“

— ایک صاحب چاء کی کیتلی اٹھاتے پاس سے گذر رہے تھے۔ ٹھٹھک کر گفتگو میں شامل ہو گئے۔ ”قفقاز۔۔۔ اور اسکا نام لیجئے مازندران۔۔۔ جرجس۔۔۔ سرخس۔۔۔“

مجھ دلشاد علی نے پھر آنکھیں ملیں اور کانوں پر ہاتھ پھیرا۔ رات کے دو بجے اس بقولہ جانفرا گلزار میں جمع یہ افراد کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ ہاں سپید پوست بالادقہ عمر۔۔۔

— پراسرار بندے۔۔۔ ہاں ان میں سے چند کے ادھ کھلے طویل مزار تو ہم کشتور کے نزدیک

بھی آدھی رات کے وقت دیکھ کر آرہے ہیں۔ یہ سالار مسعود کنڑی ہے۔ اس ماحول کا اثر ان بی بی کے دماغ پر ہو رہا ہے۔ قطع سے یونیورسٹی لیکچر معلوم ہوتیں (کمپٹری کی ریڈر نکلیں)

ہمارے ویسٹ میں کیتھولک راہب خانے LAY اہل دانش کے لیے عارضی ری ٹریٹ کا کام دیتے ہیں۔ میاں کی اس انوکھی سی ”ری ٹریٹ“ میں مقیم ان صاحبہ کو غالباً اپنے ذاتی مسائل

کے بوجھ تلے مہلو سی نیشن دکھلائی دے رہے ہیں۔ موصوفی صہل منزل نور منزل ہے۔ لال باغ، نکھو میں کر سچین مشنریوں کا مشہور شفا خانہ جس کے غیر ملکی ڈاکٹر مند توں سے میڈیکل سائنس

کی جدید ترین دریا فتوں کی روشنی میں ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کا علاج کر رہے ہیں۔ نور منزل پر عین بیگ یا د آئیں کہ گذشتہ ماہ میاں کے ہمراہ چند روز کے لیے بندہ نکھو

گیا تو اہل پری محل اور ڈاکٹر منہور کا شغری سے نہ ملا لیکن سینڈی کی کوٹھی پر کنور رانی صاحبہ سے معلوم ہوا ڈاکٹر بیگ بے چاری کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور وہ نور منزل میں

زیر علاج ہیں۔ غالباً ڈاکٹر کا شغری کے چکر میں۔۔۔ افسوس۔

رباط گلوں کی جانب بڑھے بسک مخروطی ستونوں والے طویل برآمدے میں کرسیاں اور مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ خلقت کی آمد و رفت آدھی رات کو بھری دوپہر کی ایسی گہما گہمی۔ سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ عارف کامل کے آگے رات دن یکساں ہیں۔ عربی باجی نے کہا تھا۔ گداؤ لد عربی باجی۔ وہ تینوں بارہ نکی سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں تھیں۔

عریض زینطے کر کے کنور کے ساتھ اوپر گئے۔ بُرجی نما کمرہ۔ جو تھی تاریخ کا چاند سنہرے غزال کی طرح متحرک بادلوں میں چوڑیاں سی بھرتا معلوم ہوا، بٹلے کے نیشب میں تر و تازہ تیر ہرے شبنم آلود کھیت۔ جس سے جگر لالہ ہیں۔ جب سب سوتے ہیں خدا مریم کیساتھ خنک کشت زاروں میں ٹہلتا ہے۔ ایک یورومین کیتھولک مرشک کا جملہ۔ انوہ۔ مارے مسی سیزم کے حالت خراب۔ سمندریش نرائین اپنے ذہنی اور کلچرل فریم ورک میں مدھوشودن کے مدھوسن کی بات کرتا ہے۔ مسلم گڈی گڈی بان نورمن کو شاید بیت لحم کے چرواہوں کی یاد دلائیں۔ نیچے کیلے کے جھنڈ میں ایک بوسیدہ کنواں دکھائی پڑا۔ تین سید قدیم مجڑوں کے اتنا رچھیل کے نزدیک ایک غازی کا مزار۔ بالے میاں کا دیں!

واپس اترے۔ مرشد بڑے ہال میں فرش پر کچھ بستر پر جلوہ افروز۔ چاء کا دور۔ عوام کی بھیڑ۔ آدھی رات کو یہ سب شہر سے یہاں کس طرح آئے۔ بسیں بند۔ رکشا میں مفقود۔ پایادہ آئے۔ میاں جب کسی جگہ پہنچتے ہیں جتنا کو آپ سے آپ کس طرح اطلاع ہو جاتی ہے۔

صبح چار بجے کے قریب باہر ایک ریڈیڈنٹ قلندر کا نعرہ حیدری سنائی دیا پھر وہ چلایا ”لافتی الاعلیٰ، لا سیف الاذولفقار۔ لافتی“ دیوداروں میں کوئی صاحب خوش لمحنی سے مناجات کر رہے تھے۔ باغ سے آواز آئی۔ مرجاسید کی مدنی العربی۔

ناشتے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فاضل ایک نوجوان مولوی صاحب نے مستوی مولناروم شروع کی۔ باغ اور میدان کے اس پار کسی مغل بادشاہ کی بنوائی ہوئی تین گنبدوں والی مسجد دھوپ میں چمکی۔ اس سے ملتی میاں کے قائم کردہ جویریہ بانی اسکول میں پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ کنور کے ساتھ ٹہلتے وہاں پہنچے ”بھوگول“ کی ایک کلاس میں بھانکا۔ ”اس لمبنی کے ایک اسکول میں رتن ناتھ سرشار اردو پڑھاتے تھے۔ بھما سے والد کی

جربیشن تک ایسے کالیتھ بزرگ موجود تھے جو پوجا کرتے وقت کہتے تھے — ایک فلوئس
 ایک بادکش ویک صراحی بشری کرشن ارپن میدہم — ہمارے پوتے دروائے کو درواجا
 اور زمین کو جین کہتے ہیں۔ جمیلہ کو زمیلہ —

ہم دونوں پائپ کے کش لگاتے سر جھکائے اسکول گراؤنڈ طے کرتے رہے۔ چند
 منٹ بعد کنوڑجوش سے بولا — ”لیکن اردو زندہ رہے گی!“ مجھے منہ ہی آگئی۔ ایونوپرہنچے۔
 ایک فیٹ باغ کے پھاٹک پر آن رکی۔ ایک خوش پوش سُرخ دسپید، خوبرُو
 نوجوان اس میں سے نکلا۔

”لکھنؤ میں آج صبح سویرے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ہمارا کمرہ اچانک میاں کے
 سچوان کی خوشبو سے بھر گیا ہم سمجھ گئے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔ فوراً دوڑے“

تہجد گزار بی بی کے بھری ہیلوسی نیشن۔ اس غیر مسلم نوجوان کے جتنی۔ ہم بھی ان داہلوں
 میں گرفتار نہ ہو جاویں۔ سوچے اب یہیں سے گھر کی سیدھ بھریں۔ چند گھنٹے کے ارادے
 سے کنوڑ سینڈی کے ہمراہ بارہ بنکی پہنچے تھے۔ اتنے دن گذر گئے۔ رجعت تہقہری۔ اس سے
 قبل کہ ہم اپنی نانی دادی کے دور میں واپس چلے جائیں ہم کو بھاگ نکلنا چاہیے۔ یہ بہت
 بوڑھا تمدن اپنے سینکڑا چائلڈ بڈ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہ کلچر سینا بل ہو چکی ہے۔ ذہنی
 صحت بڑی نعمت ہے جو ہم کو اب تک مغرب میں میسر رہی۔ وہ سرد، بے پرواہ، خود پسند،
 مغرور دیا غیر سہی۔ لیکن ایک نہایت منظم، سائنٹیفک حقیقت پسند معاشرہ ہے۔ جیک
 اندر ہمارا پرسل کمپیوٹر ہمارا منتظر ہے۔ بیشک میرا ڈائلا فورٹن چند سال بعد مجھے نورما د
 سیلی سمیت کسی بوڑھوں کے گھر میں ڈال آئے گا۔ لیکن وہ بھی کیا فرسٹ کلاس ”ہوم“ ہوگا
 یہاں تو ممکن ہے کسی سڑک کے کنارے ہم ٹپ ہو جائیں اور راہگیر پلٹ کر نہ دیکھیں۔ تشدد
 خود غرضی بے حسی اور لالچ ان پر ختم ہے مگر اپنی ”روحانیت“ کی ڈھلی بجائے جا رہے ہیں۔
 ویسٹ جیسی اعلیٰ ترین کمیونٹی سرد سیز اور ہوک سنس اگلے ہاں اگلے سو سال میں بھی نہیں پ
 ہوگا شرم انکو مگر نہیں آتی۔ ارے ان سب کو سیاہ پوش گریک کورس کی طرح اپنے حال زار

ما تم کرنا چاہیے۔ یہ اہل مشرق کس منہ سے مغربی مادیت کو بُرا کہتے ہیں۔ دراصل ہندوستان کے متعلق نور کی مسلسل لیکچر بازی نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔

جس مخقر سے فرقے سے نو دارد تعلق رکھتا ہے وہ اپنی بے پناہ انگریزیت کے لیے مشہور ہے لیکن اسکا کنبہ عرصے سے شمالی ہند میں آباد ہے لب دلہجہ کے اعتبار سے اس میں اور کور میں کوئی فرق نہیں۔ اور نفیس اردو پر اسکی زبان جاری ہے۔ دوسری شام وہ ہمارے ساتھ پہلو کے لان پر آن بیٹھا۔ کنور اور رجن وہاں بید کی کرسیوں پر پہلے سے موجود تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ میاں کو کتنے عرصے سے جانتا ہے۔ ”پچھلی جنوری میں ہم لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے کہا میاں تشریف لائے ہیں اور تم کو بلاتے ہیں۔

”کون میاں اور ہمیں کہاں سے جانتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا سروکار۔ ہمارے رشتے دار نامور لوگ ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو ہمیشہ بیک گراؤند میں رکھا۔ ہمیں مذہب اور روحانیت سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ دوست نے پھر کہا بڑی شان اور مرتبے کے بزرگ ہیں اور اپنے طریق میں یگانہ۔ اور وہ تمہیں بلارہے ہیں۔

”ہم کچھ عرصے سے شدید قسم کی نجی پریشانیوں میں مبتلا تھے لیکن انکا حل ڈھونڈنے کے لیے پیروں اور سوامیوں کے پاس دوڑنا ہمارے لالیف اسٹائل میں شامل نہیں۔ دوست مصر رہا۔ دوسرے روز حضرت گنج کی ایک دو منزلہ کوٹھی پر لے گیا۔ اوپر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایک بڑی نشست گاہ میں چاء کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ ایک طرف ویڈیو چل رہا تھا۔ تخت پر بیٹھے مہمان خصوصی چند نوجوانوں سے جوڈو کراٹے پر گفتگو کر رہے تھے اور حاضرین کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑے جمال و جلال والی شخصیت رکھتے تھے لیکن اب انہوں نے کرکٹ کاڈ کرچھڑا سا تھی چپکے سے بولا۔ ”انہوں نے اسکول تو آٹھویں کلاس سے چھوڑ دیا تھا کہ یہ کتابیں ہمیں کیا بتائیں گی۔ والی بال اور شہسوار کی کے البتہ جمیں رہے۔“ تم ہمیں کسی اسپورس مین سے ملوانے لائے ہو؟ ہم نے پھر چاروں طرف دیکھا۔

”چند منٹ بعد ان صاحب نے ہم پر نگاہ ڈالی اور بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ آہستگی سے کہا ”اپکی حاضری تو لگتی رہی مگر ملاقات آج ہوئی۔“
 ”ہم اور چکرائے۔ یہ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ دوسری باتوں میں لگ گئے اور ہم جیران بیٹھے رہے۔ ہماری حاضری اسکول اور کالج میں تو لگتی تھی اور کہاں لگی۔“
 ”سو جا کیے۔ معاً سمجھ میں آیا۔“

”دریائے گنگا کے کنارے جہاں ہم رہتے ہیں سول لائینز کے نزدیک برگد تلے چند مزار ہیں۔ ہم چار ساڑھے چار سال کے رہے ہونگے تب سے ایک انوکھی کسی کشش ہر جمعرات کو ہمیں وہاں لے جاتی تھی۔ مغرب کے وقت کھیل کو دھچھوڑ کر ہم وہاں پہنچ جاتے۔ وہاں چراغ جلتے۔ لوگ آکر چلے جاتے۔ ہم ایک طرف چپ چاپ کھڑے رہتے۔ ممی ہمیں ڈھونڈنے کے لیے ملازم دوڑاتیں۔ جو ہمیں کبھی تلاش نہ کر پائے۔ کچھ دیر بعد ہم خود ہی گھر پہنچ جاتے۔ بڑے ہو گئے لیکن یہ معمول جاری رہا۔ شہر میں جہاں بھی ہوتے کسی پارٹی یا دعوت یا کسی اہم سے اہم کام کو چھوڑ کر ہم چند منٹ کے لیے وہاں پہنچ جاتے۔ آج تک ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم اس جگہ کیوں جاتے ہیں۔ ہم کو مزاروں اور ان سے وابستہ عقائد کا کچھ علم نہ تھا۔ لیکن اس مرتبہ لکھنؤ آنے سے قبل تک ہم وہاں اس بطور حاضری دیا کیے اور ہم نے آج تک کسی سے اپنے اس دھڑے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ کیسے جانے اور ہمیں کیوں بلایا اور کیا فرماتے ہیں کہ حاضری برابر لگائی لیکن ملاقات آج۔“

”دل پر سببت سی طاری ہوئی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ بعد میں میاں نے نہ کبھی وہ بات دہرائی نہ اسکا مطلب بتلایا۔“

”پرسوں رات“ رنجن نے کہا ”میاں فرما رہے تھے کہ ملفوظات ادبیاء میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض حاشیے کی گفتگو ہے۔ راز کی باتیں بتانے کا کسی کو حکم نہیں۔“

یہ شیشہ پہلی نظر میں وہ آرٹھی قسم لگتا ہے جو اس ملک کی پچھلے گیلریوں اور فلم کلبوں میں پائی جاتی ہے۔ اصلیت میں ایک مہذب اور دھڑی برہمن زادہ — مریدین میں اور تھوڑے کس برہمنوں کی ہم نے بہت دیکھی۔ ”بھید ہم تم کیا سمجھا دیں گے“ وہ کہہ رہا تھا۔

ڈھال پر بھٹکتے تالاب کا آدھا حصہ آبی درختوں میں پنہاں ہے پر لے کنارے پر
ستادہ بستی کے سفید مکانات ڈوبتے سورج کی روشنی میں گلابی ہو گئے۔
گویا گویا یا ایل گریکو کا کوئی منظر ہوا چلی۔ باغ میں یوکلپس سرسراے۔
”گلشن راز۔“ کنور نے سر اٹھا کر کہا۔

”کون چیز۔۔۔؟“ ہم چونکے۔

”ایک ایرانی صوفی کی کتاب۔ اور فیہا ما فیہا۔ یعنی اس میں ہے جو کچھ ہے۔۔۔“
ملفوظات رومی“

”معاف کرنا ہم جب سے یہاں آئے ہیں بہت کوشش سے یہ محسوس کرنا چاہ رہے ہیں
یہ قلعہ اسرار و رموز کا گڑھ ہے۔۔۔ لیکن ہمیں کوئی بمٹری نظر نہ آئی۔ ایک بات نے ضرور
تجربہ کیا کہ تمہارے شیخ ہر وقت اس قدر بنشاش اور شگفتہ نظر آتے ہیں“

”سچا صوفی مسرور و مطمئن رہتا ہے کہ خوف ورجاسے آزاد ہے“ سینڈی نے عربی باجی
ن طرح کسے بڑے دلی کو کوٹ کیا۔

”ایک بار اارتقا کا تذکرہ کرتے ہوئے جرمن باجی کو مخاطب کیا۔ آپ بھی ذرا پیچھے چلیے۔
علوم ہوا ڈال پیٹھی ہیں۔ پھر ایک صاحب کے متعلق بولے۔ انکو پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔
اب بھی ڈال پیٹیں۔

”ایک روز ہم سرکار کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ کہنے لگے سامنے سے جو کار آویگی اسکا
برنوٹ کرنا۔ ہم چکراٹے جانے کیا سیریں بات ہے۔ چند منٹ بعد جو گاڑی پاس سے گزری
نکی نمبر پلیٹ کے آخری عدد ۴۲۰ تھے!“ رجن نے کہا۔
ہم سب نے تہقہہ لگایا۔

”بیجے رانی صاحب آگئیں“ کنور بولا۔

سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ جو عمر خاتون معمولی سوتی ساری اور گرد آلود چپل پہنے خفیف
۔ لنگ کے ساتھ تیرنیز چلتی ہماری طرف پہنچیں وہ قطع سے رانی کے بجائے ایک نڈل
اس بند وگر بہت لگ رہی تھیں۔

”اسلام علیکم۔ وہ گریں۔ ہم اور حیران۔

”نمک رانی صاحب“ رنجن نے پر نام کیا۔

”کہاں ہیں ہمارے باپ؟ سورہے ہیں؟ یا کہیں گئے۔؟ ہمیں انہوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ یہ دیکھو اسٹیشن سے نہ رکشائی نہ بس دو کوس چلے پیدل“ وہ بڑبڑاتی ہوئی بنگلے کی طرف چلی گئیں۔

”یہ کہیں کی رانی صاحب تھیں؟ سابق؟“

”بچہ۔ ایک دم بلو بلڈ۔“

”خبطی ہیں؟“

”قطعاً نہیں۔ ماں کے برابر ہیں مگر انکو اپنا باپ کہتی ہیں۔ وہ ہم سب کے باپ تو میر پر اتنے کم عمر انسان کو اس لقب سے پکارنا ذرا فنی لگتا ہے۔ آئی شو دھا کی طرح ڈانٹتی ہیں مٹنا بھگتی۔ شو دھا میا والی“ سینڈی نے کہا۔ ”مگر بھرت مٹی کے نورس اکثر دل مل جاتے ہیں“

”مشاہدہ حق کے بادہ وسا غریں کوک ٹیل“

”آسمانی باپ۔ دوست آقا۔ کھر سچین۔ مشک۔ اسلامی۔ ایک روز مشد نے ایک قصہ سنایا۔ محمود نے ملازموں کو حکم دیا محل کے سارے قیمتی ظروف توڑ دیں انہوں نے تعیل کی۔ تب اس نے انکو زوب بھاڑا۔ بولے۔ جہاں پناہ آپ ہی نے تو کہا تھا۔ ایاز کو ڈانٹا۔ اس نے دست بستہ عرض کی۔ غلام سے تقصیر ہوئی۔ یہ داس بھگتی ہے۔ سدا ما کی اپنے مٹر کرشن کے لیے سکھا بھگتی۔ رادھا اور میرا کی پریم بھگتی۔ دشمنی کے مضبوط بندھن والی بیز بھگتی سے آج کی دنیا سب سے زیادہ مانوس ہے۔ راون رام کے ہاتھوں ہلاک ہونا چاہتا تھا۔ سب سے بڑا بھگتس بھگت وہی تھا۔ ہمارے دلن بھائی کی شردھا گج۔“

بھگتی۔۔۔

سب ہنسے۔

”ہم اسوقت باسیہ رس میں ہیں۔ چار سو سبزہ نورس۔ نورس زیر بحث۔ اور آپ

موش۔ کچھ فرمائیے صاحب۔“ میں نے فیٹ والے نو دار کو مخاطب کیا۔

”ان مہاپنڈتوں کے درمیان؟ اور آپ بھی گنوان نکلے۔“

”تھوڑی سی شدید ہے۔ پچھم کے تھوڑے خانوں کی بدولت۔“

”آپ آرٹ ڈیلر ہیں؟“

”جی۔“ بجکٹ بدلائے۔ ”یا رکھو۔ تمہارے اس بندابن میں سب رس ملے الا شرنگار

س۔ راس لیل بھی نظر نہ آئی؟“

”کھٹک یا منی پوری لباس مجازیں؟ اور شرنگار رس یہاں ملے گا؟ گھاس تو

ہیں کھا گئے؟“

”حقیقی راس لیل کی سبلمزم میں“ رجن گویا ہوا۔ ”نوائے سردی پر رقصاں نسائی

وجوں کا ٹوٹل سرنڈر۔ کہ چاندنی راتوں میں ہر رقصاں گویا ایک ایک کرشن اپنے

ساتھ ناپتا نظر آتا تھا۔ من تو شدم۔“

کنور بولا۔ ”رنگ اور سرادر رس۔ حرکت۔ اور تال۔ اور لے ساری کائنات۔ اور لفظ

ابتدا میں تھا مگر یہ حرف شیریں۔“

میں نے احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔ ”اتنی آفاقیت کے بجائے محض دھانی پوری رس

ہاریوں کی! مشگری پریم ایک پوری کتاب تصنیف کر سکتے تھے۔ بھائی ہم کو مکروہات زمانہ

بے فرصت نہ دی ورنہ ہم بھی یہ مابعد الطبیعیاتی ٹوشگافیاں کرتے۔ نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ یکساں

ٹمک اصطلاحات تلمیحات کے باوجود کرشن اور راہا اور گویاں اور براہیڈ زاف کراہیٹ۔

راولیاں کا وصال اور عرس اور گوری سوئے سچ پر مگر یہ ڈالے کیس۔ اور یہ کہ مولانا حسرت

ہانی سری کرشن کو اونچا عارف سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ صوفیا کا محبت کا باغ مدھیہ کال اودھ

پریم ہارگی صوفیوں کا پریم بن اور مرگادتی اور مدھومالنی۔ دی ورس۔ قوموں

بالکل اندرونی سائیکل پر زیادہ فرق نہیں پڑا۔ ذرا سا گرید تو۔ ایک آخری امید

لڑیو منزم سے تھی وہ ہو گئی فیل۔ ساری دنیا میں۔“

چند خدا مگھاس پہ آن بیٹھے۔ ان میں سے ایک مٹھو صاحب۔ نام اور انداز سے نواز دے۔

اب سراپا عجز و انکسار۔ ہمہ وقت نماز روزے اور خدمت میں مصروف۔ خاصے گندھرو بغیر محنت کی مستقل آمدنی رکھنے والوں نے تین چار کام اس جہان فانی میں کیے۔ عیسائیت ستم گری۔ تہذیب کی آبیاری اور پرداخت۔ اور علم دوستی۔ منجھ صاحب کے متعلق معلوم ہے پہلے ستم پیشہ یا رنگیلے تھے یا نہیں۔ البتہ اعلیٰ نفاست انہی جیسوں کے ہاں پروان چڑھتا ہے۔ بڑے آبا مرجم آخری زمرے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسکا لرشپ۔ اکثر الفاظ کی ٹوہ میں لگے رہتے۔ لال بی بی نے انہیں پریشان رکھا۔ ایک روز کہنے لگے بھیا۔ کرشن بن راج بیا کے گیتوں میں بنرا اور بتا بنے۔ سیدھی سادی پُر امن پر وسس تھی۔ مگر اب الفاظ علام کے اصل معنی پر خون خرابہ۔ معنی بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اور جو جان گئے ہیں ان میں سے کچھ چپ سادھ لیتے ہیں یا تارک الدنیا ہو جاتے ہیں۔

منجھ صاحب موضوع کی مناسبت سے گنگنانے لگے۔ مدھوبن میں راوھیکانا چھے۔

”گردھری کر لیا باجے رے“ سینڈی نے سر دھنا: ”یہ ہے اصل حقیقت۔ حقیقت مرکزی نقطہ۔ سمجھنے والے کی موت۔ ہائے۔ ہائے۔ نبی دامن کم آخر چوں دم دیدار غی قصم؛

جھیل کے کنارے ایک طاؤس رقصاں تھا۔ باغ پر چھپے کسی نے گلاب کے شیشے انڈیل دیے۔ پکھر چھپا رہے تھے اور غنبریں ہوا چل رہی تھی۔ ع۔ اے اودھ کی نیم عقدہ کٹہ وہ ملیں تو بیام یہ کہنا ذرا۔ کیا کہنا۔ اے اے سادون گھر آجا۔! دھینتہ ہونگار خانم آئے تمہارے کارن۔ یاں بن میں دھن پایا۔

”آپ پک کی طرح مسکرا رہے ہیں!“ نو دار دوجوان نے کہا۔

پہلے میفسٹو۔ اب پک! دھینتہ ہو سا رنگ نگر کی کے مدھو سودن!

آسمان برابر چھا رہا تھا۔ منجھ صاحب نے سراٹھا کر دیکھا پھر بولے ”بادلوں کا سوا کرتی، کچن تنو، لوچن کمل، گلرخ، زعفرانی ساری، ہاتھ میں شہد کا پیالہ۔ جلو میں طاؤس کہنیا جی کی مدھو ما دھو رانی۔ چاندنی راتوں میں جب وہ نہی بجاتے ہیں، نمودار ہوتی۔

مارے رینڈیٹنٹ استاد بتایا کرتے تھے فلاں ٹھہرانے کے فلاں خانصاحب نے کون کوئی اگنیاں بس میں لکری تھیں۔ جب ان میں سے کسی کو چھیڑتے وہ ظاہر ہو جاتی۔ یعنی اس کی دآتما اپنا مخصوص روپ دھار لیتی۔

”ہمارے دادا اعرش آشیانی نے علم موسیقی پر نہایت مکمل قسم کی کتاب لکھی تھی۔ شی نوکشتور نے چھاپی۔ ہم تو محض روایات ہی سنا سکتے ہیں۔ واللہ علم بالصبواب کہتے ہیں۔ بعضے راگ راگنیوں کی خاص بندشیں اگر صاحب کمال گائے وہ چند امراض سے شفا دیتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں سے سنا ہے دلی والی دلتواز راگ سے علاج کرتی تھیں۔ ہمارے برداد کی شادی میں انکا مجرا ہوا۔ سوہتی ایک نہایت خواب آور راگنی ہے۔ انہیں نے ائی تو حاضرین جلسہ گہری نیند سو گئے۔“

”تکان اور بوریت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔“ میں نے دبی زبان سے کہا۔
 ”یہ آپ کی عادت ہے۔ اچھی بھلی بات میں بھس ملا دیتے ہیں۔“ کنور بڑبڑایا۔

”—قاعدے کے مطابق علاج کے لیے بغیر طبلے کے گاتی تھیں۔ جھنجھوٹی اور پہاڑی رائے در دوسرے اختلاج قلب اور صفراوی عارضوں کے لیے سندھی بھیروی میں غمیش لرب فقیر ہو کر کیا جو ہو سو ہو۔۔۔ پھر سنا ہے خود بھی بیراگ لے لیا۔ سات حج کیے۔ دُرن بھیجے لگیں۔ اتفاقیہ آتش زدگی سے بھلس گئی تھیں۔ جب یہ جبرآگ کی طرح پھیلی خاص و علوم نے بسیاختہ کہا بی دنوازانے دیسک چھیڑا ہو گا جو شعلہ لپکا۔

”ہمارے استاد مرحوم کا ارشاد تھا دو پہر کو کلیاں میں گائے ع آئی بہار باغ بس بلبل نفس میں ہے۔ تو غصہ دھیا ہو۔ سکون ملے۔“

”یہ تو بہت غصہ دلانے والی بات ہے۔ سکون کیسے ملے گا۔“ میں نے کہا۔

”—استاد سے یہ بھی سنا کہ لکھنؤ کی حیدر جان کے مانند جے پور والی نواب بانی نے بھی ایک بار ملہار سے مینہ برسا دیا تھا۔ راجہ کوڑیا کھولو۔۔۔ ان بے چاری کو کسی دشمن نے پان میں سندور کھلا دیا۔

”راجہ کوڑیا کھو لورس کی بوندیں گریں۔ آئی گھٹا گھٹا گھنگورس کی بوندیں۔۔۔۔۔
 کہتے ہیں اگر تیز بارش میں زور زور سے گاتے تو ملہار کو قابو میں کرے۔ بجلی کا دھڑکا
 کڑک کا خوف دل سے جائے۔

”ایک روز سماع پر بات ہو رہی تھی۔ میاں نے فرمایا انسان تو اشرف المخلوقات
 ہے اونٹ سے بحث کیجئے کہ وہ عربی نغمے پر کیوں مستانہ وارد وڑتا چلا جاتا ہے۔“
 بوند باندی شروع ہوئی۔ ہم لوگ برساتی میں جا بیٹھے۔ منجھ صاحب اب ”بھری لگری
 موری ڈھر کا نی شام“ الاپ رہے تھے۔

ہماری بھری گاگر بھی تو اب ڈھلکنے ہی دالی ہے۔ نجانے کس گھڑی شام کنکری مار رہی
 اور ہم اس ساربان سرائے بے بنیاد سے ناس۔ معاموت کے خوف نے پھر آن دبوچا۔

بادل چھٹے۔

شام رنگ آسمان پر دھنک نکلی۔۔۔ اندر دھنش۔ بادلوں کے راجہ اندر کی کمان۔
 اسکے رنگ باغ کے پھولوں میں اتر آئے۔ طرح طرح کے نایاب پھول پودے۔ میں نے
 ہاتھ بڑھا کر ایک تیز سرخ گلاب کو چھوا۔
 گلاب صوفیاء کے نزدیک حسن ازل کی ایک علامت ہے۔

ہم لوگ اٹھ کر ہال میں پہنچے۔ رانی صاحبہ نند کشور کو ڈانٹنے میں مصروف۔
 بتیں: ”ہم دو مہینے سے آنا آنا کر رہے ہیں تم نے راستے میں اتنی اڑچیں ڈالیں آنے بھی
 نہ دیا۔ اب دیکھو تم نے ہمیں لنگڑا بھی کر دیا۔“
 ایک ماہر نفسیات کے تحمل کے ساتھ متبسم۔

عربی اور جرمن باجیاں مع اپنے اپنے رشتے داروں کے آن پہنچیں۔

ایک روز صبح صبح دیدی کی آواز آئی ”اسلام علیکم چاچا۔“

”اب تو آپ کو بلائیں نہیں سنا تیں؟“ سہ پہر کو باغ میں بٹلتے ہوئے ہم نے مکر کر پوچھا۔
 ”تو بہ اب انکا نام نہ لیجئے۔ چاچا ہو! یاد ہے دھان پورا درہمارے علاقے کے بیچ
 میں ایک تھیل پڑتی ہے؟“

”جی ہاں۔ یاد کیوں نہیں؟“
 ”اسمیں سے کبھی کبھی ایک ٹھو بھیروی نکلا کرتی تھی آدھی رات کو۔ اما دس میں؟“
 ”چڑیلین بھیروی بھی لاپتی ہیں؟۔۔۔۔۔ یا وہ عورت تو نترک سہیوں کی
 میڈیم بنتی ہے؟“

”چاچا! دیدی نے صبر سے گویا ایک کم فہم بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”جس یوگنی کی
 پتیا سپھل نہیں ہوتی وہ مکر بھیروی بن جاتی ہے۔ بھر شٹ یوگنی؟“
 ”اوہ۔۔۔ وہ بھیروی۔ والدہ کلو آہیر۔“ یاد آیا ہماری کہانیں کچھ بے سرو پا قے
 سنایا کرتی تھیں دیدی سے انکی نوک لور سُننے باور چنانے کی طرف نکل گئے۔ اندر جھانکا
 پھونس کے اس عریض جھونپڑے میں عربی باجی اور چند لڑکیاں نذر کی کھیر تیار کرنے میں
 مشغول تھیں عربی باجی نے پرس میں سے میسوری اگر بتیوں کا بنڈل نکالا۔
 ”بھئی آپ تو اس شعبے میں بہت درک رکھتی ہیں۔ یہ خوشبوؤں کا کیا سلسلہ ہے؟“
 ”نادانستہ آپ نے کہا خوب۔ خوشبوؤں کا سلسلہ۔ بات یہ ہے کہ روہیں خوشبو پسند
 کرتی ہیں۔“

”کھانا دانا بھی کھاتی ہیں؟“
 ”حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز نے تو ایک جگہ حضرت ابن عباسؓ کو کوٹ کیا ہے کہ
 روہیں کھانا بھی کھاتی ہیں اور صوفیا ایک دوسرے سے ملنے بھی جاتے ہیں۔۔۔۔۔“
 ”نو کڈنگ۔۔۔۔۔؟“

”حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے تحریر فرمایا ہے کہ فیروز شاہ تغلق انکے لئے خوان

لے کر آیا تھا۔ خانقاہ میں۔ ایبوقت شیخ محی الدین العربیؒ — جاتے ہیں نا آپ؛ وہی اسپین والے۔ — وہ ایبوقت ان پر کال کرنے آگئے۔ مخدوم نے اسوقت ملنے سے معذرت چاہی۔ جب وہ چلے گئے انہوں نے ماحضر تناول فرمایا۔ بہت بے مزد لگا۔ انہیں بڑا افسوس ہوا۔ کہ ممکن ہے ابن العربیؒ بھوکے رہے ہوں۔ آئے تھے تو کھانا کھا کر جاتے؛ نذر کی سینی اٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔۔۔ ”مگر ہم نے میاں سے کبھی اس مسئلے کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ چلیے آج پوچھیں گے۔“

بال کے اندر میاں اپنی مسرت پاش آوازیں کوئی حکایت بیان کر رہے تھے۔ ”ایک سینٹ جنت کے دروازے پر پہنچے۔ وہاں ایک بلی اور ایک چوہا پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مارے سینٹ پنے کے۔۔۔“
 مارے سینٹ پنے کے۔۔۔! مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ حکایت ادھوری چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ دو فورسٹ آفیسر انکے فرش پر بستر کے نزدیک دو زانو بیٹھے تھے میاں نے مجھے مخاطب کیا۔۔۔ ”چلیے کل رات آپ کو نیشنل پارک لے چلیں“

وہ ہمیشہ رات کو سفر کرتے ہیں۔ دوسری شب وقت مقررہ پر ہم نے تیاری پکڑ لی اور گاڑیوں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بہت دیر انتظار کیا۔ دوسرے ”بابہ رکاب“ اصحاب و خواتین مطمئن معلوم ہوتی تھیں ہم جھنجھلا کر خانقاہ کی طرف لوٹے۔ باغ کے مصفا راستے پر تہجد گزار بنی بنی گئیں۔ ان سے پوچھا۔

”وہ تو آرام سے لیٹے سوویت دیس میں ایک افسانہ پڑھ رہے ہیں“

فوراً اندر پہنچے۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے انہوں نے ہم سے کہا ”عجیب گنجشک کہانی ہے یہ۔“

”میاں۔۔۔ وہ گیم رزرو۔“

”کل رات!“

”پر دو گرام تو آپ نے آج کا بنایا تھا۔ کل بھی چلیں گے یا نہیں؟“

کنور دروازے میں کھڑا تھا۔ اشارے سے ہمیں باہر بلایا: ”فقیر سے کبھی اسکا ارادہ نہیں پوچھنا چاہیے۔“
 ”تم لوگ انکے اس قسم کے معمول کے عادی ہو۔ ہمیں بہت کھل رہا ہے۔ بھلا کوئی بات ہے بتائے بغیر پروگرام ملتوی۔“

صبح کوچہ کے بعد سینڈی کے ساتھ باغ میں ہوا خوری کرتے رہے طبیعت میں چڑچڑاہٹ
 باقی تھی۔ ہم درلڈ ٹریویر آدمی۔ سفر حض کے لئے منٹ منٹ کا حساب رکھنے والے طے کرنا
 تھا کہ وائلڈ لائف کی سیر کے بعد بذریعہ ٹرین دہلی نکل جاویں گے۔ وہاں سے سیدھے ٹوکیو۔

محمدی باجی بڑی سادگی سے ایک پوربی سلام ننگناقی باد چھانے کی سمت چلی گئیں۔
 ”اتنی عرض ہے روضے پہ تمہرے۔ آئے کے ہم ہو پڑھتے سلام اے پیارے نبی۔“
 محمدی باجی انہیں بیک وائرز کی رہنے والی۔ برسوں سے ان گنت مہمانوں کا کھانا
 صبح شام بڑے آرام سے پکارتی تھیں۔ ساری کاپو دیہاتی انداز سے آگے ڈالے ہمیشہ متبسم۔
 اسے نفس مطمئنہ!

مگر جہانِ سونم کے تمام غریب و مساکین مذہب کے سہارے اس طرح مطمئن رہتے
 ہیں۔ یہی سارا پروہلم ہے۔ لیٹن امریکہ اور میکسیکو کے گرجا اور سنٹس کے شراہین پسماندہ اور نادار
 کینٹھولک آبادی سے پُر۔ سال کے بارہ مہینے مذہب مذہب مذہب۔ بے دین پروٹسٹنٹ
 شمال بلا وجہ ترقی یافتہ اور دولت مند نہیں ہو گیا۔

یکلخت خیال آیا نور ماہماری روپوشی کی عادی ہے مگر اس بار سوچتی ہوگی انجام کار انڈیا
 میں دھڑلے گئے۔ وہاں ہمارا کاروبار چوٹ ہو رہا ہوگا۔ ہم دین کی طرف مائل ہوئے یو پار
 ذہن سے نکل گیا۔ وہ بے چاری ہمیں لکھنؤ ہوٹل کے پتے پر خط لکھ رہی ہوگی۔ چرچ میں ہماری
 سلامتی کے لیے شمعیں جلائی ہوگی۔ بیشتر اہل دنیا کی طرح پارٹ ٹائم ایمان رکھتی ہے۔ ہم ہول ٹائیمر
 بننے کے چکر میں پڑ گئے۔ ہم ہو۔

”آئے کے ہم ہو پڑھتے سلام اے پیارے نبی۔“ محمدی باجی باد چھانے کے سامنے

گھاس پڑھی آلو چھلپتی ہوئی سننا یا کیس۔ اے پیارے نبی۔۔۔ تارے گنگن میں تمہارا نام۔۔۔

تسلیم درضا۔ یعنی سرنڈر۔ مگر کا ہے کے لیے ؟

ایک ہفتے سے متواتر یہی ہو رہا ہے۔ ہم آدھی رات کو رختِ سفر باندھے کھڑے ہیں اور سویرا ہو جاتا ہے۔

آج رات مرشد سفاری کے لیے تیار ملے۔ رنجن ہمیں دیکھ کر ہنس پڑا۔ ”پچھلے تین چار روز سے آپ نے ان سے جرح نہیں کی تھی نا سرنڈر کر دیا۔ شاید اسیلے“

صبح کا تین بجا تھا۔ صبار قارمیاں حسب معمول خاموشی سے اوراد میں مشغول۔ ہم پچھلی سیٹ پر۔ باقی ساتھی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن مجھ پر اب سفر سوار ہے۔ گیم ریز روکے قریب کوئی ریلوے اسٹیشن ضرور ہوگا۔ چھوٹی لائن ہی تھی۔

کیوں نہ۔۔۔ ایکسپریٹ سروس کی ایک شاخ سینر دبی میں کھولی جاوے۔ پٹا نہ لڑکیاں اور طرہ دار چھوکرے سیاہیوں کو سفاری پر لایا کریں۔ کینیا سے گرنار۔ پریرا۔ کوربٹ۔ دودھوا۔

دفعاً میاں نے کار موڑ لی۔ سب چپ رہے۔ ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ دل نے کہا دلشاد علی۔ تمہارا نام خطا کاروں کے دیوان کے اندر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ تمہارے غول بیابانی نے لائٹن چمکانی اور تم پھر ادھر لپکے۔

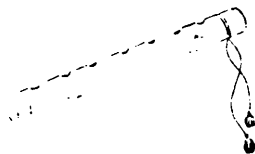
شاید ہم اپنی سفاری پر کچھ کچھ تو چل پڑے ہیں۔
”آج کہیں اور گھوم آویں۔“ اس روشن ضمیر رواں شناس نے مسکرا کر کہا۔ دوسری گاڑیوں کا کارواں پیچھے پیچھے لوٹا۔

ان ہی سنا رہے ہیں جیسے بک گیم ہنٹر کو اپنی سابقہ شکار گاہ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ اسکے

بجائے، دو راقادہ دیہات! کسانوں کے جھونپڑوں میں شب باتی۔
 ایک رات ایک برہمن گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اگلی سیٹ پر شیخ کے ساتھ برہمن
 سامنے دیکھتے جہاں پٹرول کی سوئی صفر کے نشان پر لگی ہوئی تھی۔ ارادتمندانِ خوارق
 کے عادی ہو چکے ہیں انکا تذکرہ نہیں کرتے۔ ہم بھی اب چپ رہتے ہیں۔
 او۔ کے۔ سائیکولوجی اینڈ سوسیولوجی اوف ریلی جن کے بجائے پیرا سائیکولوجی اور
 پیرا سائنس —

سارے برہمن گاؤں میں دیوالی کا سا چراغاں۔ عورتوں کی ٹولیوں نے آرتی اتاری۔
 بھیجن گائے۔ کنور نے کہا تنہا صاحبِ وقت کی ایک پہچان یہ ہے کہ بلا تفریق ہر مذہب و ملت
 کے انسان اسے بے انتہا چاہیں۔

صاحبِ وقت دراصل دو ہیں۔ ایک پورب والا۔ ایک کچھم۔
 وہ اپنے آپ کو طرح طرح سے پہنچواتے رہتے ہیں۔ ایک موسم سرما میں سموری ٹوپی
 اور پوستین پہنتا ہے۔ اور درخشاں قرمزی کوکب والے حصار میں اسکا آستانہ ہے۔ دوسرا
 ایک بیتِ الایض میں مقیم ہے۔ درجہ قطبیت حاصل کرنے سے قبل تماشاگر تھا۔
 ان دونوں کی نوائے سرمدی پر انسانی روحیں مشرقین و مغربین میں رقصاں ہیں
 مگر ناز۔ پسِ ذوق کہ پیش یار میِ قصم۔ وہی دونوں روئی کے نے بھی اپنے پاس رکھتے
 ہیں گردِ ہر کی مر یا بھی۔ یہی ہے اصل حقیقت۔ ساری حقیقت کا مرکزی نقطہ۔ بھائی سینڈی
 میں بھی نبی کی سبلمزم ہی میں بات کر رہا ہوں۔ سمجھنے والے کی موت ہے۔



(۴۲)

کلیانی ندی

ایک نازک پل پر سے گذرے۔ ذرا سی آجڑی۔ سرارٹس واٹر لوکی ”لونیگ کے کنارے“ کا
ایسا پچر پیک منظر۔ (برسوں مصوری کا پروفیشنل مطالعہ کیا تاکہ اصل اور نقل میں امتیاز
کر سکوں اور پھر ان شاہکاروں کو چراؤں۔)

دھانی دوپٹے پر ٹکے رو پہلے لچکے کے مانند چمکتی کلیانی۔ حضرت عبدالرزاق بانہوی کی
ندی کہ اسکے کنارے مراقبہ کرنے والوں کو کلیان ملتا تھا۔

کلیان کیا شے ہے؟ جنگل جنگل الفاظ کے معانی تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ وہ جگنوؤں
کی طرح چمک کر پھر اندھیرے میں بجھ جاتے ہیں۔

گنگ وجمن اور چناب وراوی ان لوگوں کے خون میں بہتی تھیں جنکو اب ڈارٹ اور
مول اور ٹرنیٹ اور کینیٹ کے کنارے کلیان

حضرت عبدالرزاق بانہویؒ کی ایک بہنہ زادی سوربون میں تعلیم یافتہ اپنی اولاد
کے ساتھ نیویارک میں رہتی ہیں، گھرائی ہوئی تھیں۔ دالان میں منتظر۔ اور بہت سے لوگ
سب چشم براہ۔ ایک تہمد پوشش چوکوشیہ ٹوپی والے باریش جواں سال نفر ایک در کے
نیچے مونڈھے پر بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب، چاء۔“ چھینٹ کی شلوار قمیص میں ملبوس ایک گوری چھری
سی لڑکی نے پاس آکر ان سے دریافت کیا۔ یہ صاحب غالباً ہو میو پیٹھیابی۔ یو۔ ایم۔
ایس حکیم بھی تھے۔ اپنا سفری بیگ فرش پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ راستے بھر چھینکیں
آیا کیں۔ ڈاکٹر صاحب نزلے کی دوا عنایت ہو،

”سوری! میں دوسری قسم کا ڈاکٹر ہوں“

”اسلامیات؟ علیگٹھ؟“

”فنونولوجی۔ سوربون“

چھریری لڑکی چاء کی ٹرے کشمیری اخروٹ کی مینز پر رکھ کر واپس گئی۔ میں لوگوں کو چند سکند میں بھانپ جانے کا ایکسپرسٹ ہوں ابھی ابھی دھوکا کھا چکا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں قیاس آرائی ضروری نہ سمجھی۔ اس وضع قطع اور رنگ روپ اور انداز کی بیچیاں یہاں یو۔ پی میں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ شرمیلی، مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ مودب، سگھر، دیندار۔ دیہ لڑکی برابر زیر لب درود شریف پڑھ رہی تھی۔ ذرا زیادہ ہی دیندار تھی، اس قسم کی کرامت حسین یا علیگٹھ میں پڑھنے والی سیدھی سادی بھارتی مسلم لڑکیوں کی پاکستان کی میرج مارکیٹ میں بہت مانگ ہے۔

ڈاکٹر اف فلاسفی نے نسیم جیب میں ڈالی۔ تقرقی انگشتریوں سے لدی انگلیاں چہرے پر پھیریں۔ میزبان نسیم صاحبہ نے مہری کو پکارا، انکی اولاد دلیانی سے ہڈسن۔ بیہوشی جی سوربوں کو مع فنونولوجی مسترد کر کے سین سے کلیانی۔ اٹھارویں صدی میں واپس؟

اب انہوں نے جیب سے انگریزی کا قرآن شریف نکالا میرا استعجاب دیکھ کر ہنس پڑے ”آپکو مزید پریشان رکھنا نہیں چاہتا۔ دراصل میں نے جس کلمہ میں جنم لیا اسمیں سنیا س کی پریم پرابھت قدیم ہے۔ ایک آسٹریلین یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا۔ اچانک جی اچاٹ ہو گیا۔ مذاہب کی اسٹڈی شروع کی اس طرف بہت کشش معلوم ہوئی۔ سوا ڈھڑا گیا۔ چند سال مدھیہ پریش کی درگا ہوں میں بتائے۔ حسین ٹیکری پریشارت ہوئی کہ میاں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ انکا نام نہیں بتلایا گیا، صرف شبیہ نظر آئی۔ کئی بار۔ وہ ذہن سے نکل گئی۔ پھر بھٹکا پھرا۔ ابھی پچھلے مہینے کسی نے انکا نام پتہ بتلایا۔ اثر پریش آیا۔ خانقاہ پر پہنچا معلوم ہوا سفر پر گئے ہیں۔

فلاں تاریخ کو شاید اس قصبے میں پہنچیں، اس کو ٹھی میں آکر اتریں گے۔ آپ لوگوں کی آمد سے کچھ دیر قبل ہی بس کے ذریعے یہاں آیا۔۔۔۔۔ سب ہدایت اللہ کی طرف سے ہے حضور گائیڈ کر رہے ہیں، ”فونولوجی کے ڈاکٹر نے بڑی سادگی سے بات ختم کی۔ ان حضرت نے دور حاضر کے دماغ کو چھٹی دیدی اور سترھویں اٹھارہویں صدی کے خوابیدہ ذہن کو جگا کر شانتی پا گئے۔ وہ مشرقی ذہن جو سوال کرنا نہیں جانتا تھا۔

رات - وسیع پختہ صحن میں کسی میڈیول کارواں سرارے کی ایسی چہل پہل - دیوار کے نیچے چولہے سلگاتے جا رہے تھے - محمدی باجی کی آواز آئی — لُچیا — اے لُچیا بیٹا — ”مومنو — ابھی آئے۔“

دوبارہ دھوکا کھایا۔ وہ لڑکی ایک چولہے کے پاس بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی۔ سگریٹ کے لئے ماچس لینے کے بہانے قریب جا کھڑا ہوا۔ بیوقوفوں کی طرح سرکھایا — اس نے پوچھا۔ راجہ صاحب خاکینہ پسند کرینگے یا چاند تارا ؟ مجھے حیران پریشان دیکھ کر صوفی جی کی طرح وہ بھی مسکرائی ”راجہ صاحب - تشریف رکھیے۔ وہ مونڈھالے لیجئے۔ آپکو قلعے پر دیکھ چکے ہیں۔ جس روز آپ لوگ دُھوا جا رہے تھے ہم اسی شام لکھنؤ سے پہنچے۔“

”قلعے میں بھی ہم زیادہ تر بادور چنیا نے ہی میں رہتے ہیں۔ آج دوپہر کی بس سے یہاں آئے۔ تاکہ آپ لوگوں کو جو این کریں“

”صاحب ہم بروکن ہوم کی اولاد قطعی نہیں ہیں۔ ہمارے ماں باپ دونوں میلان میں یونیورسٹی پروفیسر ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش۔“

”والدہ یہودی ہیں۔ نہیں ہم مسیحی بھی کبھی نہیں بنے۔ اسکی ہمارے مزاج میں گنہائش نہیں تھی۔ ہمارے ایک چچا جیرو ویٹ فادر ہیں۔ کسی افریقی مشن میں۔ ہم بھی بہت بکے کیتھولک تھے۔ ہندوستان سیر کرنے آئے۔ گھومتے پھرتے ترائی پہنچے۔ اور بالکل اتفاقیہ قلعے“

”خوب جت بھری!“

”جت؟ جی نہیں۔ رفتہ رفتہ۔ اٹلی سے ہر سال آنے لگے۔ مہینوں رہے۔“

”اتنی سیلیس بامجاورہ اردو۔“

”آپ سات آٹھ برس اٹلی میں قیام فرمادیں تو اسی روانی سے اٹیلین نہیں بولنے لگیے گا؟“

”آپکی تو شخصیت ہی بدل گئی!“

”میاں کی بہنوں کا اثر ادرائے ہاں کا پاکیزہ ماحول۔ ہمیں یہ طرز معاشرت پسند ہے ہر لحاظ سے محفوظ سا بھی ہے۔ اور صاحب رہی شخصیت کی تبدیلی۔ تو اگر آپ کو اردو میں گفتگو کرتے نہ سنا ہوتا تو اٹلے ہم آپ کو اٹیلین سمجھتے!“

میری کھوکھلی ہنسی۔ بیشک دنیا خربوزے کا کھیت ہے مگر مافیا کے سٹیلین نثر ادر افراد کا رنگ اتنا واضح؟

”آپ کے دوست سینڈی صاحب دکھلائی نہیں دے رہے؟“

”لکھنؤ گئے۔ کل آجا دیں گے۔ سینورا۔ سینورینا۔ ایک بات نے مجھ اور اکثر متعجب کیا۔“

”آپ بہت حیران ہونے والی روح معلوم ہوتے ہیں!“

”سو تو ہے! لیکن حیرانی یہ کہ ویٹ میں گوری جو گین ہزار ہا نظر آرہی ہیں آپکی ایسی

خواتین اکا دکا۔“

”اسلام کانینگٹو ایسج۔“ ”لوچیانے لوچیوں کے لیے پھرتی سے پٹرے کاٹنے شروع کیے۔

”اور یہ مذہب جو ڈیوکر سچین ٹریڈیشن کے کافی نزدیک ہے۔ اور کلر فل نہیں۔ اور سخت گیر۔ یونو دوٹ آئی مین۔“

”علاوہ ازیں۔۔۔ انڈک مذاہب ویسٹرن ورلڈ ویو سے اسقدر فاصلے پر ہیں اور

بالکل مختلف۔ متضاد عناصر ہمیشہ ایک دوسرے کو اٹریکٹ کرتے ہیں۔ اور انکے فلسفوں میں

لوچ بہت ہے۔

”علاوہ ازیں۔ انڈک مذاہب کے فارن مشن اسقذر کے ویل اور گنائیز ڈھیں انکا لٹریچر اتنے سلقے سے شائع ہوتا ہے دنیا کی ہر زبان میں۔ آپ لوگوں کو اپنے آپس کے سیکلیرین جھگڑوں ہی سے فرصت نہیں۔ شروع شروع میں“ اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا ”مجھے لکھنؤ کے شیعہ سنی تعصب اور بلووں نے سید بد ددل کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اسلام ازائے سیک ریلی جن۔“

— سراٹھا کر مجھ پر نظر ڈالی ”آپ لوگ موڈرن ویسٹ کی زبان میں — ویسٹ کی تجسّس روح سے کیونکی کیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ اور باہر بھی۔ کٹر پنہتوں کے ہاتھ میں۔“

چولہے کی دوسری طرف پر چھائیوں میں چھپے نواب منجوتھے کے لیے کوئلے دہکار ہے تھے۔ فسانہ عجائب کا ایک پراسرار سا کردار۔ ویسٹ کی تجسّس روح سے یہ صاحب کیونکی کیٹ کر سکتے ہیں؟ میں نے سوچا۔ افسوس کہ دارالاسلام کے لوگ باقی دنیا کو باربرین ہی سمجھا کیے ”اتنی تمباکو نوشی پیر کھجاکر میں نے اظہار خیال کیا۔“ صحت کیلئے مضر ہے — اتنے سگریٹ۔ دن بھر میں چالیس پچاس چلیں —“

”جی ہاں۔ کوئی شخص اتنی چلیں نہیں پی سکتا۔ لیکن حقہ نوشی سرکار کا ایک نوع کا ذکر ہے؟“ کوئلوں پر پنکھا جھلتے جھلتے انہوں نے معاً مجھے مخاطب کیا ”جناب والا ہم بھی سیدھے ہو گئے۔ فرعون بے ساماں بنے گھوما کرتے تھے۔ بد دماغ۔ خود پسند۔ جتنا بڑا یہ مکان ہے اتنا بڑا ہمارا ایگو تھا۔ اگر آپ انگلش ایکسپریشن استعمال کرنے کی اجازت دیں۔ ہم جیسے لارڈ آدمی — اب چلیں بھرنا اپنے لیے باعث فخر جانتے ہیں“

”ربانی یوزرے کا ارشاد ہے —

”لارڈ شپ آدمی کو دفن کر دیتی ہے۔ ریلٹی کی خاک بھی مہلک ہے۔ امارت کا مطلب ہے اقتدار سے محبت۔ لیکن جو شخص علم حاصل کرنے میں کوشاں ہو اسے کبھی نہ رو کو امیروں اور حکام وقت سے ہمیشہ احتراز کرو۔“ لوجیا نے کہا۔

لارڈ آدمی — لارڈ — کچھ یاد آیا۔

”نواب صاحب سنا ہے آپ کا نام موسیو سے بگڑ کر منجھو ہو گیا بقول ڈاکٹر کا شیغری“

”ربائی یوزرے نے ربائی یوحنا بن زکائی سے سنا۔ ربائی یوحنا نے ربائی خلیل
— اس نے — ”لوچیا گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے دہرا رہی تھی“ نام — الفاظ —
ہورات انکے ایسوسی ایشن — سب رفتہ رفتہ بدل جاتے ہیں —“

ڈاکٹر صاحب اس قسم کی تحقیقات بہت کرتے ہیں۔ لکھنؤ پریورین کلچر کا اثر —
سیو سے منجھو کوئینز سے کلن — لارڈ سے لڈن —

نواب منجھو صاحب جلم لیکر لگنا تے ہوئے روشن دالان کی طرف پیک گئے ۔

واپس آکر ایک گرسی پرفسور دکش ہوئے۔

اد پر تاروں پر نظر ڈالی۔

گرسی کا ہٹھا بجانے لگے۔ جمائی لی۔ ”ملاحظہ کیجئے۔ اصل چپن ڈیل صاحب آج
اسلم آرائش بھنڈی بازار یا کر خندار اسٹائل کہلاتی ہے تو خون کے آنسو روتا ہوں۔“
”نتی ہندو KITSCH بھی یہاں گھوم کر کافی دیکھی“ میں نے جواب دیا ”ملاں ہوا“

آنگن میں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ قوالوں کی ایک پارٹی دالان کے ایک گوشے میں
ی پر جا بیٹھی۔ یہ ملت ملت پیرمناں ہے۔ یہ ملت —

”دیکھیے کتھر محنت کش عوام یہاں جمع ہو گئے۔“ نواب منجھو نے کہا۔

”صوفیوں نے ایسٹبلشمنٹ کا ساتھ کب دیا تھا؟“ لوچیا نے پوچھا۔

”پچھلی بار جو یہاں بھی آئی تھی پورے پورے ضلعے پانی میں ڈوب گئے۔ بڑی بابا“

مچی، ”نواب بنجوبوئے“ ایک روز ایک اردو اخبار میں ایک عجیب خبر چھپی۔ اخبار کا نمائندہ کسی گاؤں میں پہنچا گذشتہ شب لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں میاں بچائیے بچائیے۔ ایک عورت چھتیس گھنٹے سے اپنے بچے کو گود میں لیے ایک درخت پر چڑھی اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ایک سانپ اپنی جان بچانے کے لیے اسکے پاؤں سے لپٹا ہوا تھا۔ تب ہی چند نوجوان موٹروں کے ٹائروں پر بیٹھے اس گاؤں تک پہنچے اور عجیب و غریب طریقے سے لوگوں کی جانیں بچا کر غائب ہو گئے۔ اور یہ لوگ کسی سرکاری ٹیم کے افراد نہیں تھے۔ اسی زمانے میں راجہ صاحب عجیب اتفاق ہے کہ سرکار کے حجرے کے دروازے رات بھر بند رہتے اور صبح کو میاں بنجا رکھانی میں مبتلا ملتے۔“

میں قرون وسطیٰ کی ایک کارواں سرائے میں بیٹھا فسانہ عجائب سن رہا ہوں۔

”لکھنؤ رینڈیسی کے میوزیم میں ایک موڈل ڈاکٹر جوڈا کی کوٹھی کا بھی رکھا ہے۔ توجناب۔ گھسیاری منڈی میں ایک کوٹھی تھی اسکی مالکہ ایک اینگلو انڈین لیڈی مسز جوڈا تھیں۔ ان ڈاکٹر جوڈا نے لکھنؤ میں شادی کر لی تھی وہ بھی شاید انہی کے خاندان کی تھیں۔ تو اس کوٹھی میں ایک اسکول تھا۔ بنارس اڈمشن ہائی اسکول۔ اس میں ہماری ایک خالہ پڑھتی تھیں۔ یہ صاحب بہت عرصہ گذرا۔ جب کا واقعہ ہے۔“

”تو ایک روز وہ اسکول سے گھر آرہی تھیں۔ تانگہ والے نے ان سے کہہ کر بیٹھا چربا بھیل پر فلاں بیگم صاحبہ رہتی ہیں انکا آخری وقت ہے وہ آپلو بلارہی ہیں خالہ نے ان بیگم صاحبہ کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ دہل گئیں۔ تانگے والا انکو سکندر باغ کی سمت لے چلا انکی فٹنگ بن گئی جاڑے کا زمانہ سورج ڈوب چکا تھا اتنے میں اس نے تانگہ روکا اور سناٹا بن گیا۔ اے کنارے کھڑی ایک انگریز بڑھیا کو آواز دی اسکا چہرہ بخوکا ایسا۔“

سامعین داستان گو کے گرد جمع ہو گئے۔ میں وہاں سے اٹھا۔

سارا وقت ایک ہے۔ قرآنی وقت۔ آن واحد۔ خدا کے نزدیک سب ”آج“ ہے۔ زادِ سزا جاری ہے روز قیامت بھی ہے۔ آئینا لا نہیں۔ موجود ہے۔ پھر بری سی آئی۔ لوجیا ن تالمودی ربائیوں کے نام لے رہی تھی وہ کہیں گئے نہیں۔ ابن العربی ”مخدوم جہانیاں“ لے ساتھ کھانا کھاتے ہیں — ایک مرید بتا رہا تھا اکثر جب میاں رات کو اپنے جد کے قبر سے کے اندر تشریف لے جاتے ہیں دوسرے ادلیا بھی وہاں آتے ہیں — آج کی شک میں ملبوس، ایک دو کلین شیو۔ دماغ چکرا جائے گا۔ زیادہ کرید نہ کرو۔ خاموش

صاحب معاملہ خود پرداز کرتا ہے۔ وہ فصل پہلے کاٹ چکا ہے۔ پھر سے بوتا ہے۔
لق کی مردوریت سے نہ مردودیت ہے نہ خلق کی مقبولیت سے مقبولیت۔ اور کیا کہا تھا۔

کوٹھی کے پچاس کمروں میں سے بیشتر بند پڑے ہیں۔ نجلی منزل میں لوگ جمع ہیں۔
وہر کا ستاٹا۔ میں ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں جا نکلتا ہوں۔
حاجی وارث علی شاہ کا پورٹریٹ۔ پرانی وضع کے بریکٹوں سے آویزاں ہے۔
شدان پریگنی خاندانی تھاویر۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل اکسفورڈ میں زیر تعلیم ایک جوانمرد۔
وار پر ایک گروپ فوٹو گراف میں سائے اور سفید ٹوپ پہنے میمیں اور چھوٹی چھوٹی
نچھوں والے انگریز سلسلہ موڈل ”ڈبل فٹن“ موٹر کار کے سامنے استادہ شکاری
تصور دہلی دربار ۱۹۱۱ء کی۔

جاپلنگ روڈ لکھنؤ کا ڈرائنگ روم آنکھوں میں گھوم گیا اور دل سچپن ہوا۔ کیوں؟
مخوہ۔ مجھے اُس دقیانوسی بوسیدہ کوٹھی سے بہتر مکانات اور اُس پرانے دھرانے
سے بہتر اور کہیں زیادہ بیش قیمت ساز و سامان بعد میں میسر آیا۔ امحض پرانی چیزوں
چمٹے رہنا کس قسم کی مریضانہ نفسیات ہے؟ پھر بھی آنکھیں بھرسی آئیں۔

باہر جانے کے لیے پلٹا تو ایک معمر بی بی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے پوچھا: ”بھیا آپ — دھانپور کی خیر النساء بیگم کے عزیز تو نہیں —؟ چھوٹی ٹھکرائیں صاحب —“

”ہماری والدہ تھیں“

عرصہ دراز بعد کسی نے مجھ سے میری ماں کی بات کی تھی۔ انکا نام لیا تھا۔ یہ ابھی بی بی مجھے ایک سجدہ نادر اور قابل قدر سہتی معلوم ہوئیں۔ یہ میری ماں سے واقف تھیں۔

”آپ کو تو یاد نہ ہونگی“

”یاد ہیں“

انہوں نے درد مندی سے مسکرا کر سر ہلایا پھر دو چار باتیں کر کے باہر چلی گئیں۔

میری ماں۔ نازک نازک گوری سی۔ بادامی سلک کا غرارہ۔ سفید لیس کی قمیص۔ بایوں میں چنبیلی کے پھول۔ آپ رواں کا دھانی دوپٹہ۔ پچکاٹکا۔ کلیانی ندی۔ رنگین پايوں والی پلنگڑی پڑی تھی ہیں۔ چاندی کی پٹاری کا بڑا سا گنبد نما ڈھکن کھلا رکھا ہے۔

ابا کی گرجدار آواز — سنتی ہیں۔ آپکے صاحبزادے پھر پتے کھیلنے پائے گئے۔ اماں اماں آپکے نام کا کیا مطلب ہے؟

حضرت بی بی کا لقب ہے بھیا۔ ارے ہماری بالی کہاں گئی —؟ دیکھیے دیکھیے بالوں میں تو نہیں الجھ گئی۔

نہیں بالوں میں بھی نہیں — ابھی ابھی تو —

یہ لیجئے۔ اماں۔ ہم تو اپنے ہاتھ کی صفائی دکھلا رہے تھے۔

بھیا تم نے کب اتار لی ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔

آنکھیں زرد سے میچیں۔ پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خالی کمرے سے باہر نکلے۔

تیسرے پہر تک قریبی اضلاع کے مزید کنبہ خانوادوں کے افراد۔ یہ ایک عجیب نٹ ورک تھا۔ اور پہلے کی طرح آج بھی جوں کا توں موجود۔ فرق محض اتنا تھا کہ انکی برقعہ پوش یا بے پردہ لڑکیاں اکثر بی۔ ایچ۔ ڈی بوجیا انکے ساتھ گھلی ملی نظر آرہی تھی۔

”سدا سہاگن ابھی بتا رہے تھے حضرت اکمل شاہ کہنے لگیں۔“ ”لوچیا کسی سے مخاطب ہوئی۔“

”سینورینا! ردو اتنی سلیس بولتی ہے مگر تذکیر تائینٹ میں اب بھی گڑ بڑا جاتی ہے“ میں نے ڈاکٹر اف فونونولوجی سے کہا۔

”سدا سہاگن کو آپ ابھی دیکھ لیجئے گا اکمل شاہ صاحب ایک احرام پوش دار ثقیف ہیں۔ بیحد خوش شکل۔ مرید بناتی ہیں“

”خاتون پیر۔!“

”جی ہاں۔ لیکن عورتوں کے لیے بیعت لینا جائز نہیں۔ دار ثقی فقراء نے بھی انکو احرام باندھنے کی اجازت نہیں دی تھی ایک نے دی۔ بڑا زبردست کیمپ انکا یہاں لگتا ہے۔“

— موٹروں کی قطاریں۔ اپنے آپ کو شاہ صاحب کہلواتی ہیں۔“

”دیمینز لرب والیوں کو خوش ہونا چاہیے“

”کیوں خوش ہونا چاہئے؟“ ”لوچیا نے بحث کی“ ”کسی بھی لائن میں اپنی شخصیت منوانے کے لیے مرد کا استعارہ اختیار کرنا ضروری ہے؟ جارج ایلٹ اور جارج سینڈ سے لیکر آجنگ؟“

پائل کی جھنکار۔ ایک طویل القامت فرد سرخ لہنگا۔ ہری اوڑھنی۔ چھم چھم کرتے الاں میں داخل ہوئے۔ درسی پریٹھ گئے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

”یہ وہ نہیں ہیں جو تم شاید سمجھ رہے ہو“ سینڈی نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر اف فونونولوجی کو حکیم صاحب سمجھا۔ اطالوی لوچیا کو قصبائی مسلمان بیٹھا۔ اب تیسری بار دھوکا کھانے کو تیار نہیں۔

”یہ ایک قابل تعظیم بزرگ ہیں جسین ٹیکری سے ہر سال یہاں آتے ہیں“ سینڈی نے مزید اطلاع دی ”حضرت موسیٰ سہاگ کا سلسلہ“

”دیکھنا زب دایوں کو مسرور ہونا چاہئے کہ ایک گروہ نے عورت کا استعارہ اختیار کر لیا کیوں صاحب بے میں نے لوجیا کو نا تھانہ انداز سے مخاطب کیا۔ وہ ہنس پڑی۔

ما تھے پرسونے کا ٹیکہ۔ ناک میں بھاری بلایا اور تھکے کلائیوں میں سبز کانچ کی چوڑیاں سونے کے ٹھوس کٹرے۔ گلے میں ٹھسے۔ چمپا کلی۔ چندن ہار۔ سر پر گوٹے لچکے کا دوپٹہ۔ چہرے پر داڑھی۔ درمیانی عمر۔ خوش خلق۔ سدا سہاگن آلتی پالتی مارکر فرش پر بیٹھ گئیں“

”شاہ صاحب۔ حافظ پیاری کا کلام سنائیے“ سینڈی نے فرمائش کی۔

”اچھا ذرا تلک پہن آؤں۔ ابھی آتی ہوں“

اٹھ کر جھم جھم کرتی زینے کی سمت چلی گئیں۔

”تلک لگاتے ہیں یا پہنتے ہیں؟“ میں نے سینڈی سے پوچھا۔

”پیشوا کی ایک قسم جو زیور ناک میں پہنا جاتا ہے اسے چھاپ کہتے ہیں“

چھاپ۔۔۔ تلک۔۔۔ چھاپ۔۔۔ تلک۔۔۔ میں نے کچھ یاد کیا۔ ”یار یہ تو امیر خسرو والی وہ مشہور تو آئی ہے۔ چھاپ تلک سب چھپنی موسے نیہا لگائے کے۔ یہ سلسلہ جب سے چلا آ رہا ہے؟“

”کہتے ہیں امیر خسرو کے زمانے میں ایک صاحب نے جتنا کے کنارے آیا۔ بند و حیدر سنی ہوئے دیکھی تو انکو خیال آیا کہ ایک کمزور عورت ارضی خاوند کی خاطر جسم ہوسکتی ہے تو — ایک روایت ہے کہ حضرت موسیٰ سہاگ عورتوں کی مزاروں پر حاضری کے غما تھے جب تنہا ہوئی بطور پریکچت خود زنا نہ پوشاک پہننے لگے“

اس قسم کے معاملات کے لیے یہاں کتنی فرصت لوگوں کے پاس ہے —

ذہن کہیں اور نکل گیا۔ دلو آراجین مندر کوہ آبو کی مرمریں فرسکو۔ اجنتا او

بارغ کی دیواری تصاویر۔ قدیم اور میڈیول ہندوستان برتھ۔ بیل گاڑیوں میں سوار تاجر۔ گھوڑے کی نعل نما محرابوں کے نیچے سے گزرتے بڑے پنکھے سنبھالے جلوس جھروکوں سے بھانکتی عورتیں۔ رنگین گول ستون۔ پیڑھیاں۔ گج راج۔ ہر چیز جامد۔ بھاری۔ شانت۔ ناک میں موٹے زیور پہنے دکن اور گجراتی مینا توروں کی بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں۔ وسط ہند کی ان ”سدا سہاگن“ کو دیکھ کر مجھے وہ مینا تو رکیوں یاد آ رہے ہیں۔ مصوری اور سنگتراشی کا ”پرفیشنل مطالعہ“، کبھی اس نظریے سے نہ کیا تھا کہ ۱۹۸۲ء کے ہندوستان میں انکے اور پچھل دکھلائی دے جائینگے۔

”یہ بہت بڑی آزمائش ہے“، کنور کہہ رہا تھا ”چالیس سال سے یہ شاہ صاحب سدا سہاگن بنے ہوئے ہیں یہ مسلک اختیار کرنے سے پہلے دو بیویاں رکھتے تھے دونوں کو طلاق دیکر انکی شادیاں کر دادیں۔ بہت بڑی آزمائش ہے۔ تمام عمر خلق خدا کی ہنسی مذاق کا نشانہ بننا۔ ملامت کے تیر سہنا آسان بات نہیں“

”مگر کیوں —؟ آخر کیوں؟ اسکی ضرورت کیا ہے؟“

”انسان اپنے انتخابات میں خود مختار ہے“

”بھئی کیتھولک راہبات، برائیڈ زاف کرائسٹ، کہلاتی ہیں نن بننے کے لیے سفیدیل پہن کر باقاعدہ مع انگلشٹری چرچ میں انکی شادی، جیزس سے کی جاتی ہے۔ وہ خود عورتیں ہیں یا۔ بٹ دس ازویرڈ“

مجھے لگا میں ہیون ساگ یا ابن بطوطہ ہوں اور اسی پرانے ہندوستان کے عجائب و غرائب کے مشاہدے میں مصروف۔

سدا سہاگن زر دتلیک پہن کر واپس آئیں۔ ڈھولک سامنے رکھی گانا شروع کیا۔ ایک قبا پوش لڑکے نے آنگن میں کھڑے ہو کر زور کا نعرہ لگایا — حق اللہ۔ حق حق حق۔ پھر اس نے اڑنگ بڑنگ تقریر شروع کر دی۔

”اس لڑکے کو دیکھ کر ہمیں شاہ دولہ کے چوہے یاد آتے ہیں“، میں نے ایک ”نی مہمان سے کہا۔

”جی ہاں۔ شکلاً۔ لیکن یہ بڑا ذہین لڑکا ہے۔ کہتے ہیں اسے بھیڑیوں نے پالا ہے۔
میاں کے یہاں آیا بول نہیں سکتا تھا اب انٹ سنٹ تقریریں کرتا ہے۔ لوگ
اسے ہولی نوئل سمجھتے ہیں۔“ نواب منجھو نے بتلایا۔ ”اگر آپ غور کریں تو اسکی بظاہر نوں سنس
کے اندر ایک بنیادی ربط ضرور ہوتا ہے؟

”واقعی؟ میرا تو خیال ہے دلف بوائے ایک کامیاب موڈرن کرٹیک بن سکتا ہے۔“
نوجوان نے کہا۔ ”راجہ صاحب اسے اپنے ساتھ امریکہ لے جائیے۔ ہٹ گرو بھی ثابت ہوگا۔“
”ہم تو پھر کہتے ہیں اکتوبر نومبر تک رک جاؤ۔ دیوے شریف کا عرس کر کے جانا۔
میوزک کانفرنس۔ مشاعرہ۔ روز روز اس طرف کب آتے ہو۔ تیس سال بعد اگلے سے آئے
اب مزید تیس سال بعد کی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔“ کنور نے کہا۔

دیوہ شریف کی میوزک کانفرنس کا ذکر چھڑا تو منجھو صاحب نے اپنے ریڈیڈنٹ استاد
سے سُنی ہوئی چند حکایات گوش گزار کیں۔ صوفی منش سہگل کو جموں کے ایک شاہ صاحب
کی اشیرداد حاصل تھی۔ اُستاد اللہ دے خاں نرت میں ایک آنکھ سے روتے۔ دوسری
سے اظہارِ مسرت۔ ممتاز علی صرف ایک گھنگرو بجاتے۔ بندو کہ چاندی کے جھولے پر
پڑ بیٹھی رہتیں، باہر مسلح سوار کا پہرہ، سنگیت کی بڑی پنڈتا تھیں۔ ”پنجاب گھرانے
کی بانی بھی ایک گئی عورت تھی۔ گورکھی بانی۔ بہار کی ڈھیلہ بانی یورشین تھیں
اصل نام میری۔ ڈسٹرکٹ کلب میں انگریز افسروں کے ساتھ ٹینس کھیلتی۔

جرمن باجی بولیں۔ ”ہماری میراٹین بھی اپنے گویے اور مرثیہ خواں مردود
سے کم گئی نہیں۔ گو وہ کسی میوزک کانفرنس میں نہیں گاسکتیں۔ بیگمات کی محفل
ساز۔ بجاتی عورتوں کی مغل راجپوت تصاویر جیسے مناظر ہمارے زنا خنوں میں اب تک
”گھونٹ کا ناچ۔۔۔۔۔“ مجھے یاد آیا۔

”جی ہاں۔ اسے دوئی اللہ میں کا ہے کو بازار گئی تھی۔ اور نہستی کے وقت ہمار
نوروزی میراٹن۔ اندر بابل چھیڑتی ہے عین اسی لمحے باہر سینس کا پردہ تھامے اُسکا یہ“

وہی بابل شروع کرتا ہے۔ صدیوں کی پریکٹس کا پرفیکشن۔ لیکن نوروزی کا پوتا کینک من گیا ہے خود کو میراثی ٹھہلوانا پسند نہیں کرتا۔

”شادی بیاہ عید بقرعید موسمی پرندوں کے مانند نمودار ہو کر چڑیوں کا صدقہ اتارنے والی ہندو چڑیا غورتیں۔ بسنت بچھی پر گہیوں کی تازہ بالیاں سنبھالے ہمیشہ دلبہمان الاپتی میراثیں۔ نویں محرم کو دہے روتی بجا رہیں۔ اس قصبائی تمدن کو بھی سیاست اولیٰ و شیرن عنقریب ہڑپ کر جائیگا“

”لیکن صاحب ہم خوش ہوئے کہ ہمارے کسے ہاں کی ایک میراثن آپکے ہاں مشہور ٹی وی اسٹار بن گئیں“ نواب منجھو نے سرحد پار سے آئے مہمان کو مخاطب کیا۔ پھر مجھے ”استاد کبیر کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ حال ہی میں۔ میری پت راکھ لیجئے شیخ سلیم چشتیؒ اور — توڑ پہاڑ خیر اکھاڑا، نواب صاحب دھرد گنگنائے — ”رٹ“ من رٹ حیدر کو نام — اور ایک گزشتہ مہاراجہ بنارس کا بنایا ہوا دھرد پھیر دیں۔ پیارے ہوالہ کے — نواسے نبیؐ کے۔ علیؑ کے جگر بند۔ کاشی کے راجہ کے کاٹھ پھند۔ ایک سابق راجہ صاحب استاد کی سنگت پکھا و ج پر کر رہے تھے۔ تب ہم سوچے کاش ساری دنیا کی حکومتوں کی پالیسی فنکار بنایا کرتے تو یہ خون خرابہ نہ ہوتا!“

میں نے عرض کی ”حضور رنگیلے پیا اور آخر پیا دونوں کی حکومتوں کا انجام آپکو معلوم ہے اور جان عالم نے تو ساری عمر ایکو نماز فجر قضا نہیں کی“

ایک اجنبی بڑھیا دلائی سوٹ — قطع سے اعلیٰ ایکڑ کیٹو — دکھ سے بوئے۔

”توسنگیت اور رام نام میں کوئی شکستی نہیں“ گوئے بارود سے زیادہ؟ میں نے سوال کیا۔

”عربی باجی کہنے لگیں“ ”آپکو کیا پتہ منجھو صاحب کہ اقتدار حاصل کرتے ہی فنکار لوگ کیا کریں گے؟ فلاں بائی اور فلاں کنور نے تو ایک پوری سلطنت اکھیڑ بھینکی۔ ہم تو جانتے ہیں کہ زیادہ تر کلاکاروں کے دماغوں میں واٹر ٹائیٹ خانے ہیں۔ ایک میں انکا ٹیلٹ۔ باقی خانے عام انسانوں جیسے۔ یا خالی۔ اور راجہ صاحب ہم نے آپکے ویٹ میں

بھی اکثر مصوٰغی پائے۔ اور پورے رہے ہمارے ادیب اور شاعر لوگ۔ پہلے بھی حکمرانوں کے قصیدے اور ایک دوسرے کے خلاف بچو لکھتے تھے اور آج بھی۔۔۔۔۔

”سب نہیں — سب نہیں“ اجنبی، بُرا مان کر۔ جوش سے۔

”تیس برس بعد“ میں نے منجو صاحب کے کہا ”واپس آکر آل انڈیا ریڈیو سنا تو تعجب ہوا۔ بے شمار پاکستانیوں کے فریادیں ریکارڈ روزانہ۔۔۔۔۔ ادھر سارا ہندوستان ہم نے دیکھا کہ پاکستانی موسیقاروں پر ٹوٹا۔ اسکے باوجود کیا دونوں طرف ایک دوسرے کے لیے شدید بگڑاؤ اور تلخیاں برقرار نہیں ہوں اب صاحب۔ محض فنونِ لطیفہ اور ادب قومی روئے اور حالات بدلنے کے لیے کوئی کیمیائی اثر نہیں رکھتے“

لوچیا جگ اٹھائے گویا ”لاڈو ناء موہیلے“ کی دھن پہ رواں سامنے سے گذری۔

”سرکار کے لیے تازہ پانی“ میں اٹھ کر صحن کے پچھوڑے کنویں پر پہنچا۔

یہ بڑی پرفضا جگہ تھی۔ شہتوت، انجیر اور فالسے کے پیڑ۔ گلہائے رنگارنگ۔ کسی مغربی شاعر نے کہا ہے کہ راگوں جیسے متناسب پھولوں کے اصل نام باغِ جنت میں محفوظ ہیں۔ پرند خیالات کے مانند کبھی آسمان کی سمت اُڑتے۔ کبھی نیچے آجاتے ایک ڈالی سے دوسری۔ یا چکر کاٹتے۔ انجیر کی چھاؤں میں ہرے پتوں کے گویا دلِ بادل کے نیچے ایک راگ دھاری جھینگر کی تانیں سنائی دیں۔

لوچیا جگ منڈیر پر رکھتے ہوئے بیترس کی تصویر نظر آئی۔ کہنے لگی۔ ”بہن جھینگر سینٹ فرانسس کو گیت سن کر ابھی لونی ہیں۔ ایک روز انجیر کی شاخ پر بیٹھی الابی تھیں سینٹ فرانسس نے کہا شاہباش جھینگر باجی۔ سبحان اللہ۔ پھدک کر اُنکے ہاتھ پر آن بیٹھیں اور طبیعت سے گایا۔ انہوں نے کہا اب چپ ہو جاؤ۔ چپکی ہو گئیں۔ اُنکے حجرے کے ایک کونے میں جا بیٹھیں۔ آٹھ دن تک متواتر گایا کیں۔ تب سینٹ فرانسس نے فرمایا جھینگر باجی تم نے اپنے گیتوں سے ہمیں بہت شاد کیا۔ اب جا سکتی ہو۔ پھدک کر غائب“ سینورینا خود اس جھینگر کی طرح آزاد اور سرور معلوم ہوتی تھی۔

”لوچیا بی بی کیا تمہارے سارے مسئلے حل ہو چکے ہیں؟“
 ”ایک تھخے پولش پتے نے ابھی لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اسکے ماں باپ
 چل بے۔ اسے دُعاؤں کی ایک بہت بھاری کتاب ترکے میں ملی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر
 سنے گوگ میں لے گیا اور پریڈ ایک پردھر کے پکارا۔۔۔ خدایا۔ مجھے دعا مانگنا نہیں
 آتا۔ یہ پوری کتاب ہی سمجھے دیے دیتا ہوں۔“
 جگ بھر کے وہ واپس چلی۔

ہر جگہ میاں کا کیمپ ایک نوع کا روحانی ہائیڈ پارک کو زربن جاتا ہے۔ اب
 آنگن میں ایک ٹاٹ پوش کھڑے بھاشن دے رہے تھے۔ دوبارہ دیکھا تو وہی ایک بکڑو
 انکا سوٹ تہہ کیا ہوا کرسی پر رکھا تھا۔
 ”چہ خوش یہ کون مہاشے ہیں؟“
 ”سادھوؤں کی ایک ایسی ٹولی سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی دُنیاوی پوشاک کے
 نیچے ٹاٹ پہنتی ہے۔“ لوچیا نے جواب دیا۔
 وہ فرما رہے تھے ”حقیقتِ محمدیؐ کیا ہے؟ پر ماتما کی اچھا شکستہ۔ شیش سن؟
 صلوٰۃِ معکوس۔ خواجہ فرید شکر گنج چودہ برس تلک۔۔۔“
 سینورینا سمیت ان فرار پسند اہل درو کو انکے حال و قال پر چھوڑ کر ہوا خوری
 کے لیے باہر نکلا۔
 پھر سینڈی کی بات یاد آئی۔ تین سال بعد آئے۔ اب اگلے تین برس کی
 گنجائش ہی باقی نہیں۔

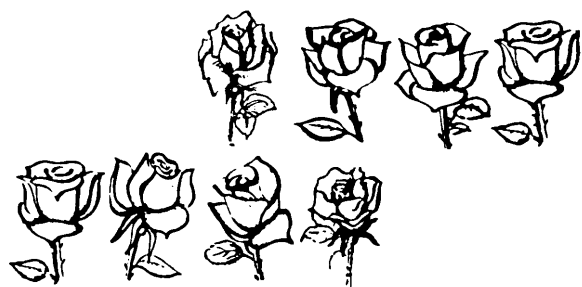
”صاحب وقت وقت کو گردش دیتا ہے۔ دن اور رات اور مہینہ اور سال اسکے
 سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں اور اسے حساب دیتے ہیں۔“
 وقت کے حساب کتاب کے آئینہ دار کتنے پرانے مکانات کچھلے چند ماہ میں ان

قصبات میں دیکھے۔ کوٹھی سے ملحقہ زنانخانے کے کھنڈر پر نظر دوڑائیں۔
 ان تین لوگوں نے مسجد کے ایک گوشے میں گھنٹہ گھر تعمیر کروا رکھا تھا۔ گجرجا۔
 اور آگے بڑھا۔ بارش کی پھوار پڑی۔ ایک جامن کے نیچے ہویا۔ میرے ل کے
 اندر تو بن موسم برکھا ہوتی ہے۔ گرم اور سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ دل کی ندی میں بارھا آتی
 ہے تو پیروں میں کوڑیا لے سانپ پیٹ جاتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ یہ ذرا سی پھوار کیا
 چیز ہے۔

شام ہو گئی مطلع صاف ہوا حاجی صاحب کے گنبد کے عقب سے بدر کامل نے جھانکا۔
 جھڑبیری کے نیچے چند قدیم قبریں دکھلائی پڑیں۔ یا ایک مختصر وود کٹ۔ چاندنی رات
 میں انگلیںڈ کا ایک سنسان، پرانا گورستان۔ ٹیڑھے ترچھے زمین میں دھنسے سنگ مرار۔
 ایک کتبے کی عبارت بتایا دکنے کے لیے ذہن پر زور ڈالتا مکان کی جانب لوٹا۔
 ڈیوڑھی میں ثواب منجوز پریشان اور محفوظ سے کھڑے تھے۔ ”میاں فرما رہے
 ہیں یہاں سے کیوں نہ دلی ہوتے آویں!“

اچانک وہ تحریر یاد آگئی۔







(۴۳)

بیلے میں میلہ

روشنیوں اور دھندلکوں اور پرچھائیتوں میں سے چھتے ہندوستان کو اب
فنِ مصوری کے پارکھ کی نگاہ دیکھ رہا ہوں۔

اصل نام مہرولی۔ اب عرصے سے مہرولی ۲ زیرِ سیٹ جانے سے کیا فرق پڑا۔
ولی تو موجود ہیں، نواب منجوں نے کہا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا کوپلیکس مجھے
عبدالرحمن چٹائی کے نازک ماورائی نقوش کا موڈل معلوم ہوا۔ ایک کے بعد ایک ادبچی
سپید محرابیں اور صحن اور مرمریں غلام گردش اور دروازوں کے اندر دروازوں کا
سلسلہ وار تناظر۔ مرمریں جالیاں۔ اچانک قرمزی گلاب۔ اور زمرؤں بلیں سپید
مزارات۔ ایک اونچے گنبد کے نیچے بالکل داستانی ماحول میں بیٹھے چند درویش۔
طلوع آفتاب سے بہت قبل ہم وہاں پہنچے تھے جیسے معاً ایک بے آواز بیکراں
خواب میں داخل ہو گئے ہوں۔

وقت مقررہ پر ایک خرہ پوش گروہ نے ایک قدیم دروازے کے سامنے کھڑے
ہو کر حمد و نعت پڑھی۔ بعد ازاں انکے قاید نے کوڑ پر دستک دی اور دروازہ کھولا۔
”روز صبح دستک اسیلے دی جاتی ہے کہ خواجہ صاحب اکثر اترتے کو باہر تشریف رکھتے
ہیں انکو اطلاع ہو جائے کہ اب لوگ روخصے میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ ہماری نظروں
سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔“ دروازے کے اندر جاتے ہوئے منجوا صاحب نے مجھے اطلاع
دی۔ میں نے سر ہلایا۔ اور خاموش رہا۔ یہ سارے اولیائے کرام اگر اس وقت بھی موجود
ہیں کم از کم اسی راجدھانی میں ہونے والی بے انصافیوں اور مظالم کا تذکر
فرمادیں۔ یہ کیا مہرولی ہے۔ ان سرکش باغیانہ خیالات کے ساتھ بندہ اس رشتہ الہفا

میں داخل ہوا۔ روشوں پر سے گذرتے ہوئے سوچا۔ مسجد۔ روضہ۔ مدرسہ۔ یہ تثلیث جو دارالاسلام کی روحانی، ذہنی، فقہی تہذیب کا مرکز رہی ہے ڈینیوب ووالگا سے لیکر برہمپتر اور کاویری تک اس کے تعمیراتی اور مجموعی تاثر کی وحدت یقیناً حیرت انگیز ہے مگر یہ ہمہ گیر تمدن آج تنگ نظر اینٹی انٹلیکچوئل، اینٹی انکوائری، عیاش، خون ریز و خونخوار کن اندرونی اور بیرونی وجوہات کی بنا پر سمجھا جا رہا ہے؟

مزار شریف کے باہر آدیزاں پنکھا۔ اگلی پھول والوں کی سیر پر نیا لگا یا جائے گا۔ نواب منجور دیک آئے۔ ”شہزادہ جہانگیر“ انہوں نے لکھنؤ کی آنکھوں سے پنکھا ملاحظہ فرمایا اور ان کے لکھنؤی حافظے نے کچھ یاد کیا۔

”شہزادہ جہانگیر“ میں نے دہرایا۔ تاریخ ہند کے سب سے کرناک باب کا ایک ذیلی کردار ”اینٹی برٹش تھے۔ اور کچھ بس نہیں چلتا تھا ریڈیٹ کوٹوٹو ہے بے کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ دارسلطنت سے الہ آباد جلا وطن کیے گئے۔ ماں نے پنکھا چڑھانے کی منت۔“

”لوٹو ہے بے“ میاں نے اس فقرے کی داد دی۔ بہت محفوظ ہوئے۔ ”اجی وہ کیا سلطنت تھی از دلی تا پالم ایر پورٹ۔ اور کیا اس سے جلا وطنی۔ سب نوٹنگ تھی“ منجھ صاحب بولے۔ ”لکھنؤ پہنچے تو کس قدر کی ہڑبونگ چمائی شراب پی کر راہگروں کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں تلے روندتے چلے جاتے تھے نہ داد نہ فریاد۔ وزیر ہند چیپ کہ صاحب عالم ہیں۔ اور مہمان وہ ایک طوائف کو لے بھاگے۔“ ”ہم لوگ خواجہ صاحب کے مزار کے پاس کھڑے ایک مرحوم شہزادے کی عیب جوئی کر رہے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔“ ایک ساتھی نے کہا۔ ”ہم سب اپنے اپنے دور کی پیداوار ہیں۔“

”بیشک اس اعتبار سے شہزادے کو افسور ڈیں پڑھنا چاہیے تھا۔ اسی دور میں محمد علی خاں برہیلہ کو بغرض تعلیم یورپ بھیج رہا تھا“ میں نے جواب دیا۔

”خواجہ صاحبؒ ہی کا ارشاد ہے قینچی سے کاٹنا نہیں سوئی دھاگے سے جوڑتا ہوں۔
انگریزوں نے پھول والوں کی سیر بند کرادی تھی۔ پنڈت نہرو نے پھر سے شروع
کردائی“ ایک خادم نے مطلع کیا۔

”جی ہاں۔ اور نیتاؤں کو قومی اتحاد پر کھوکھلے بھاشن دینے کے لیے ایک اور
پلیٹ فارم مل گیا“ منو صاحب تلخی سے بولے۔

روشنی سے باہر نکلے تو اچانک افق۔ زمین کا کنارہ اور پھر آسمان۔ گویا ہم کرۂ ارض
کے چھو پر پہنچ گئے ہوں۔ پوچھت رہی تھی عیاں نمایاں بام گردوں سے جبین جبریلؑ۔
احاطے کی دیوار سے ملتی ایک قصر شکستہ کہ بے چارے فتح کے باپ، دین کے
چراغ مع فیملی اسمیں قیام کر کے ساون مناتے تھے۔ آہا۔ قطب صاحب۔ بنشی
کاتالاب۔ جھرنا۔ اندھیری باغ۔ باگ اندھیری تال کناے۔ جھولاکن نے
ڈالوری امریاں۔

تخت و تاج اور تاخت و تاراج میں بھی فرق محض تین حروف کا ہے۔

پچھلے پہر اور طلوع سحر کی اس ناقابل بیان کیفیت، تیسرے پہر کے سلطان
کی چہل پہل اور جم غفیر کے بعد حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی ایسی خاموش
شام جس میں فرشتوں کی پرواز سنائی دے جائے۔

”حضرت کو سکون پسند تھا۔ آج تک وہی عالم“ منو صاحب نے کہا۔ میاں
آگے آگے جا رہے تھے۔ ”اپنے شاہانہ انداز میں خراں ایسا لگتا ہے گویا اپنے لوگوں
سے ملنے جاتے ہوں“ میں نے اظہار خیال کیا۔
”حقیقت تو یہی ہے۔“ منو صاحب نے فرمایا۔

ایک پولیٹین میں حضرت نصیر الدینؒ کا نقشیت تخت۔ ایک تختے سے ترشا۔
کارگیری کا نادر نمونہ۔ اس پر دایاں ہاتھ لگایا۔ پھر اپنی انگلیوں پر نظر ڈالی ساتھ

سال اس لکڑی میں پنہاں ہیں۔ جیسے میری ساری ”فنکاری“ میری انگلیوں کی پوروں میں۔

”نور پوروں میں ہوتا ہے۔ اور یہاں۔ پیشانی میں۔“ میاں نے دفعتاً مجھے مخاطب کیا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں وہیں ٹھٹھکا رہا۔ ”جدید سائنسدانوں نے انگلیوں میں پوشیدہ روشنی کی عکاسی بھی کر لی ہے“ سینڈی نے کہا۔ ”گو میاں نے وہ انگریزی رسالے پڑھے ہیں نہ کتابیں۔“

میں نے کنور کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اس لمحے اس گویا طلسماتی تخت کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اپنے نارمل حالات میں دلی آہتا تو اس وقت کسی اعلیٰ درجے کی بار پر موجود ہوتا۔

حضرت چراغ دہلی کی شام۔ سندھیا کال کا اندرونی دھیان۔ بے نام بے آواز رانگی۔

قدسیہ باغ کے نزدیک جائے قیام پر ایک بیڈ روم میں حسب معمول فرش پر مرشد کا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ ایک رات دیکھا کہ آپ ایک اور بچھونا بچھاتے بیٹھے ہیں۔ لیکن پہلا بستر اسی جگہ موجود۔ ہم اسے پھلانگ کر دوسری جانب جانے لگے فرمایا اسے نہ پھلانگیے گا۔ ادھر سے چلے جائیے۔

”—؟ بعد میں منجھ صاحب سے دریافت کیا۔

”معلوم نہیں۔ یہ باتیں خواجہ کی چوکھٹ ہے۔ بزرگان دین رٹرن کال کیلئے اس مکان میں بھی آرہے ہونگے۔ کیا جانے کیا معاملہ ہے۔ کرئید نہ کیجئے۔“

دوسرے روز ایک مشکلک دانشور جو پہلی بار پیر سے ملے تھے پوچھنے لگے۔ ”ڈرائنگ روم میں کل شام کوئی صاحب چنبیلی کا عطریا تیل لگائے ہوئے تھے؟“

”نہیں تو۔“

”عجیب بات ہے۔ مجھے برابر جنیبل کی خوشبو آیا کی۔ شام کو راج پر ٹہلنے نکلتا تب بھی اسی خوشبو نے پیچھا کیا لیجئے۔ اس وقت پھر — میرا داہمہ ہے۔“

”عین ممکن ہے۔“

”کجی یک خط مسطرچہ تو ہم چہ یقین؟“

”جی“

”آپکے مرشد سے ملنے کے بعد یہ خیال ستا رہا ہے کہ ہماری عقل و دانش علم اور تجربہ، علمیت، اور نظریات کس قدر منحنی اور ناکافی اور حقیر ہیں؟“

”جی ہاں یہ خیال تو ہمیں بھی برابر اتار ہوتا ہے۔“

”اب کیا کیا جائے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”مگر یہ تو از حد پریشان کن بات ہے۔“ وہ ذرا بچپنی سے پایپ سلگا کر برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ انکے جانے کے بعد میں باغ میں جا بیٹھا اور بہت دھیان کیا آنکھیں میچیں تھوڑے شیخ۔ ایک خیالی نقطے پر توجہ۔ سب ناکام۔ ایک بار پھر اس افسوسناک نتیجے پر پہنچا کہ اس حقیر پر تقصیر کے اندر روحانیت کی ذرا سی رمق موجود نہیں۔

اگلی صبح حضرت اپنا ٹریک سوٹ پہن کر جو گنگ کے لیے نکلے۔ ساتھ ساتھ دوڑنے کی سعی کر رہا تھا۔ میرے خیال سے انہوں نے رفتار دھیمی کر دی۔ قدرتیہ باغ کا چکر لگایا میلہ روڈ پہنچے۔ جتنا کہ مانند بہتا ذہن پھر کہیں اور نکل گیا۔ بیلے میں میلہ۔ غدر کی ماری شہزادیاں۔ ست و نئی۔ کم ٹو موٹ۔

فوٹو گرافک یادداشت کی بدولت وہ الماری سامنے آئی جس میں والدہ خیر النساء بیگم کی کتابیں رکھی رہتی تھیں اور جنکو وہ بڑے چاؤ سے پڑھا کرتی تھیں۔ نانی عشو۔ ولایتی ننھی۔ نظامی بنسری۔

بیلے میں میلہ۔ منازل آسائیرہ۔ شام زندگی۔

شام کو مرشد نے کہا چلیے کناٹ پلپس گھوم آویں۔

”اگر اجازت دیجئے تو گھر پہ ہی رہوں۔ چند خط لکھنے ہیں“ انکے جانے کے بعد پھر بیلہ روڈ پر ہوا خوری کے لیے نکلا۔ کیا عجیب بات تھی۔ لڑکیں میں پڑھی کتابوں کے عنوان ایک بار پھر بیچھا کرنے لگے۔ مونا وانا۔ تین پیسے کی چھو کری۔ سیب کا درخت۔ کم ٹوٹ۔ اگر میاں میرے دل سے موت کا خوف نکال دیں تو بالآخر انکو مان جاؤں۔ سورہ یونس پر استہور ہا تھا۔ سن سیٹ اینڈ یونگ اسٹار۔ الفریڈ لارڈینی سن۔ ہو ہو ہو لامارٹ کا وہ بڈھا انگریزا سٹریجوئی ننٹ وکٹورین قسم کے گل مجھے رکھتا تھا اور اس معصوم بچپن میں ہمیں موت کا راگ سنا تا تھا۔ جو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سن سیٹ اینڈ یونگ اسٹار۔ معصوم۔ ہاتاش اور جواہ فیقر کھیلتا تھا۔ ماں کے زیور بندہ چڑاتا تھا۔ چھپ کر سگریٹ احقر نے پیئے۔ میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی۔ مگر وہ تو ساری تاریخ انسانیت کی تعمیر میں مضمر ہے۔ صورت خرابی کی۔

دوسری جنگ عظیم جاری تھی، میڈنز ہوٹل کے سامنے سے گذرتے ہوئے خیال آیا، جب سینڈی اور میں ایڈونچر کی تلاش میں گھر والوں سے چھپ کر دتی بھاگ آئے۔ اس ہوٹل میں ٹھہرے۔ ارادہ یہ تھا کہ رائل انڈین ایر فورس میں بھرتی ہو جاویں اور ذرا ”ایکشن“ دیکھیں۔ مگر ہماری ”گمشدگی“ سے ہمارے گھروں میں کھرام مچ گیا تھا۔ بڑے ابا اور کنور کے باپ آنجہانی راجہ صاحب نے آدمی دوڑائے۔ دونوں کو پکڑوا کر واپس بلوایا۔

اب میں مدتوں سے کھوچکا ہوں مجھے ڈھونڈنے کے لیے کارندے دوڑانے والا

کوئی نہیں۔

لیکن اُن چند دنوں میں ہم نے یہاں کیا عیش کیے افوہ۔ دونوں لارڈ بنے کناٹ پلپس میں گھومنا کرتے۔ کوری اور سانولی ویک آئی چھو کریوں کو ڈسے وی کوڑے لے جاتے۔ انگلش فلم دیکھتے۔

سر جھکائے ایک بوڑھا جلازان انگریزی پکچروں کے نام یاد کرتا آہستہ

آہستہ چلتا بیلہ روڈ پہنچ جاتا ہے۔ ادھر خربوزے کے کھیت اور ریتی جہاں سنا ہے ایک زمانے میں دلی کے سیلانی جیوڑے چاندنی راتوں میں سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ بیلے میں میلہ۔ کون کون سی فلمیں اُس بار دلی میں دیکھی تھیں؟ کیس لائیٹ۔ اینا کرینا اور جان گریفٹن کی وہ کون سی فلم تھی بیٹی ڈیوس کے ساتھ۔؟

جان گریفٹن —؟ وہ تو ہالی ووڈ اسٹار نہیں کسی پرانی جان ڈرنک واٹر کی ایک نظم کا کردار تھا۔
جان گریفٹن —

میاں دلشاد علی تم کڑ بڑا چلے۔ نہیں وہ پوری نظم یاد کر کے چھوڑیں گے اسکے حاشیوں پر بل فلاور بنے تھے۔ اور اٹھارویں صدی کے لباس میں بوڑھا جان گریفٹن اور لندن ٹاؤن کا ہجوم اور — سب لوٹ آیا۔ ٹوٹل ری کال۔ جان گریفٹن سات دن اور سات رات انگلستان کی خاموش معطر سڑکوں پر چلا کیا تاکہ لندن پہنچ کر جشن تاج پوشی میں شامل ہو سکے۔ ہمیشہ خواب دیکھنے والا جان گریفٹن ڈارک کے ہرے کنجوں سے نکل کر لندن ٹاؤن میں وارد ہوا۔ اسکے پاس داخلے کے لیے ایک سلور شلنگ تھا مگر گوگوں نے اسے ویسٹ منسٹر ایسے میں نہ جانے دیا۔ تب وہ ہنسا اور اس نے سیٹی بجائی اور سنسان راستوں پر سے گذرنا دارک کے ہرے کنجوں میں واپس آیا۔ شفق کے رنگ وادیوں اور ٹیلیوں پر پھیل گئے۔ اسکا آوارہ گرد دل مضطر نہ تھا — ندیوں اور پہاڑیوں پر سے اتر کر قوس قزح میں بلبوس قہقہے لگاتی منور ہستیاں اسکے سامنے نمودار ہوئیں۔ بوڑھے جان نے انکو دیکھا اور پھر ہنسا۔ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ درختوں اور بڑھڑاؤں اور پھولوں اور آبشاروں اور کوہساروں اور پرچھائیوں اور سنہری دھوپ اور روپہلی بارش کے نورانی پیکر۔

وہ ان سب سے واقف تھا۔ انکے وجود میں نغمے چھپے ہوئے تھے۔ اور موسیقی۔ اور لونگ اور تپتیا گھاس کی خوشبو۔ ہمیشہ خواب دیکھنے والا بوڑھا جان گریفٹن اکیلا سفر

کر تا موسم گرما کی اس معطر شام واپس آگیا اور اس نے سر پر اپنا تاج خود پہنا۔

میرے پاس بھی ایک سلور شلنگ تھا۔ جسے میں نے خود گنوا دیا۔ جو مے میں ہار گیا۔ اب وہ مجھے شاید واپس مل گیا ہے اور شاید مجھے بھی ولیٹ منسٹر ایبے میں داخلے کی اجازت مل جاوے۔

میں ایک جذبات زدہ بوڑھی میم بنتا جا رہا ہوں جو رکننگ چیر پیٹھی کشیدہ کاری کے اڈے پہ برنٹ روز اور سویٹ برائیر کاڑھتی ہے اور جان ڈرنک واٹر کی نظموں پر آپس بھرتی ہے۔

جائے قیام پر واپس پہنچا۔ میاں اور انکے ساتھی میزبان سمیت ابھی نئی دلی سے نہیں لوٹے تھے۔ ڈرائنگ روم میں جا کر میاں فرما رہے تھے سر مد شہید کے مزار پر بھی جاویں گے ایک روکنگ چیر پیٹھی گھسیا۔ بوڑھی مسز بیرل گرلٹ نانا ابا کی روکنگ چیر پیٹھی فخر آگوانگریزی پڑھاتی ملیں۔ کشیدہ کاری کا اڈا سنبھالے۔ نانا ابا کے جوانی کے زمانے کی روغنی تصویر کے نیچے پیٹھی فخر آنے مجھے دیکھ کر فوراً دوپٹے سے سر ڈھانپا اور کتاب پر جھبک گئی۔ لوچیا کی ایسی دبی دہائی۔ سلونی۔ لوچیا مجھے اسی لیے اتنی اچھی لگی کہ اسمیں فخر آئی جھلک مسز گرلٹ کے لیے ہفتے میں دو بار ضلع ہیڈ کوارٹرز کے مشن اسکول نانا ابا کی پرانی شیو بھیجی جاتی ہے اور وہ دھان پورا کر فخر آگوانگلش، حساب، ولایتی دستکاری۔ اماں کتنا بوڑھا نام ہے فخر النساء بیگم بدل ڈالے۔ نہیں چند ایسا نہیں کہتے۔ یہ حضرت بی بی کا لقب ہے۔ رسول اللہ، حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسین، بڑے پیر صاحب جسکا نام آوے اماں فوراً مزید سلیقے سے بطور ادب سر ڈھانپ لیتی ہیں۔ ہمیشہ سے کرمید کی عادت۔ اور اماں حضرت فاطمہ کے نام کا مطلب کیا ہے؟ اماں کے بجائے عالم فاضل نانا ابا روکنگ چیر پر سے جواب دیتے ہیں۔ بھیا۔ خاتون جنت کے اسم مبارک

فاطمہ کے معنی ہیں امن لانے والی۔ دوزخ کی آگ بجھانے والی۔
 آنسوؤں کی چند بوندیں انگلیوں کی پوروں پر گریں۔ چار ماہ سے مینی کیور ہی نہیں
 کروا سکا۔

دقیانوسی مسز گرانٹ فخر آکولیزی ڈینزی کے ٹانگے میری خالہ کی لڑکی ٹھیکرے
 کی مانگ نہایت تندہی اور بھولپن سے کشیدہ کاری میں مشغول

ٹینس کھیل کر جا پلنگ روڈ گھر واپس گیا تو بڑے ابا کو اپنے کمرے میں آنسو بہاتے
 پایا۔ دل دھک سے۔ اب تلک اماں ابانا ابائینوں ختم ہو چکے۔ اب کس کی باری ہے۔
 دھان پور سے سناؤنی آئی تھی۔ خالہ زادسترہ سالہ فخر النساء میری حسین منگیتر
 بعارضہ ٹائیفائیڈ۔ اس رات اپنے ایک انگریز دوست کے ہاں جا کر غم غلط کرنے کیلئے
 اسکے اصرار پر پہلی بار شراب

سول لائینز دہلی کی ایک پرسکون کوٹھی میں مرشد کے ایک معتقد کی روکنگ چیر
 پر بیٹھا دشا علی جذبات زدہ دقیانوسی انگریز مسز گرانٹ ہوں۔ جیسے ایک بارش
 قوی ہیکل پیر مرد ”سدا سہاگن“۔ ایک اطالوی سینورینا قصباتی پابند صوم و صلوة
 دوشیزہ منکہ دشا علی، ہندوستانی مسلم، سابق زمیندار۔ پلے بوائے اف دی
 ویسٹرن ورلڈ بیک وقت۔ یہاں سے لوٹ کر نورمن نے کہا تھا ڈیڈی۔ انڈیا جا کر
 انکشاف ہوا۔ ہر شخصیت ہر شہر ہر نظارے کے کتنے پرت ہیں۔ پیاز کے چھلکوں جیسے۔
 تری مورتی کے تین رخ ہیں۔ متعدد جلوے۔ دس ہاتھ۔ کثرت ہی کثرت۔ اور وہ
 اردھناری بھی کہلاتا ہے۔

اٹھ کر دریچے سے باہر جھانکا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ پڑوسیوں کی روشن کھڑکی
 میں دوسرے نظر آئے۔ ایک خاتون۔ ایک کمن لڑکا۔

اماں اماں کیا کر رہی ہو؟
 بھیا ہم نے فجے میاں کی دہن کو رونمائی میں دینے کے لیے صندوقچے سے
 ایک اشرفی نکالی تھی۔ غائب ہو گئی۔ یا بی بی سیدہ۔ میری اشرفی کیجئے پیدا۔ سلام
 کرونگی چودہ۔ یا بی بی سیدہ۔

اماں یہ رہی اشرفی۔ مسہری کے نیچے پڑی تھی۔

سر اچھی طرح ڈھانپ کر فوراً درود شریف پڑھنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ قبلے
 کے رُخ جھک جھک کر چودہ مرتبہ سلام — اب وہ سواتیرہ آنے کی شیرینی منگو کر
 بی بی کی نذر دلوائیں گی۔ میں اپنی فنکاری پر نازاں کھڑا مسکرا رہا ہوں۔ اس رات
 ان دونوں کے سردھانپور کی کوٹھی کے ایک روشن دریچے سے کس کو نظر آئے ہونگے؟
 ایک بھولی نیک سیرت دیندار ماں۔ اور ایک مستقبل کا نامی گرامی بد معاش۔

خاتونِ جنت امت کی شفاعت کی سفارش فرمادیں گی۔ بی بی فاطمہ امن لانے
 والی۔ دوزخ کی آگ بجھانے والی۔

دریچے میں کھڑا رومال سے اپنی نم آنکھیں خشک کر رہا ہوں۔ پھاٹک پر کاروں
 کی روشنیاں۔ فوراً برآمد سے میں جاتا ہوں۔ میاں گاڑی سے اترتے ہوئے مسکرا کر
 فرماتے ہیں ”کہیئے جناب۔ آپ بیلہ روڈ پر بہت دور تلک ہو آئے؟“

آدھی رات کو جنبا پار کر کے ہمارا قافلہ گنگا گھاٹی جانے والی پرفضا شاہراہ پر
 آگیا۔ دورویہ کیکر کے جھنڈ اور یوکیٹس کے سرسبز پلانٹیشن۔ اوپر تاروں بھرا آسمان۔
 میں پوربی ترانی کی سمت اس خوشی اور طمانیت کے ساتھ واپس جا رہا ہوں گویا وہیں
 میرا گھر ہے۔ میں جان کر لیٹاؤں۔

(۴۴)

گل عجائب

یہ بُبک سا نہال جن کہ انوکھے گل کھلاتا ہے، لاطینی نام نامعلوم۔ لیکن اسکے گھڑی گھڑی رنگ بدلنے والے پھول اردو میں گل عجائب کہلاتے ہیں۔ پہلی بار ڈاکٹر عنبریں بیگ کے باغ میں دیکھا۔ اسکی ہری ٹہنی پر ایک مرغ عشق چھپا رہا تھا جس سے تعارف عنبریں کی طور آشنا مادر محترم نے کرایا۔ میں کہ خود ایک خاص الخاص قسم کا ”برڈ وچر“ رہا ہوں اسوقت یہ سوچ رہا تھا سینئر بیگ خاتون کے لب و لہجے انداز اور بشرے سے خفیف سا مترشح ہے کہ ایک ماضی رکھتی ہیں۔ ان خاصی مالدار مادام سے راہ و رسم بڑھائی جاوے تو کس حد تک فائدہ رہے گا۔ نگار خانم کے معاملے میں مایوس ہو کر اور خواجہ سبز پوش سے آخری ملاقات کے بعد ہٹل آیا تھا اور اپنے پرانے خدنگا حُصین بخش اور بیگ ماں بیٹیوں کو خدا حافظ کہنے ٹہلتا ہوا رد و رنگ روڈ چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر اس لب دریا مہمان سرائے کے ایوان پذیرائی میں سینڈی سے اتفاقاً ڈبھیر ہوئی۔ اسکے بعد سے آج تک کے احوال غریب رقم کر چکا ہوں۔ ادرا ب کہ طائروں، پھولوں، موسموں اور ندیوں سے روابط بڑھتے جا رہے ہیں۔ گل عجائب کو آج گلستان شیخ میں دیکھا اور پہچانا۔ اسکے نزدیک جو شجر کھڑا ہے اسے دن کا راجہ کہتے ہیں۔ پیچھے پیچیدہ شاخوں والا نخلستان۔ وہاں روز روشن میں بھی اندھیرا رہتا ہے۔

یہ اجالا کہاں سے آیا ہ کنج بالکل تاریک تھا چھوٹے اور پیڑوں کا اندھیرا گھٹا ٹوپ بادل بکڑ فلم ڈیولپ کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج رہا تھا کہ مرشد مزار کے دروازے میں کھڑے نظر آئے۔ رول حتم کرنے کے لیے قریب جا کر کیمرا کلک کر دیا۔ نہ فلیش گن پاس تھی نہ آسمان

پہ بجلی چمکی۔ لیکن آج تصویریں بن کر آئی ہیں تو آخری فولٹو گراف میں بیک گراؤ نڈر روشن اور عیاں۔ صبح سے اسے بار بار دیکھ رہا ہوں پیکٹ سرکار کو پیش کیا انہوں نے سچوان پتے ہوئے سرسری نظر ڈال کر واپس کر دیا۔

”کیلی فورنیا میں ایک سائنسداں ہے ڈاکٹر کرپنر۔“ سینڈی نے حسب عادت اپنے حوالے دینے شروع کیے۔

”بھائی میں اس تصویر کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”ڈاکٹر کرپنر۔ اپنے دارالعمل میں اس نے ایک شخص کی انگلیوں کا عکس لیا ہے۔ پوروں میں سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اپنے اپنے AURA کی بات ہے۔ کیف یا لطیف یا متور ہالے۔ اگلی صدی تک سائنسداں شاید گزشتہ آوازیں بھی ریکارڈ کر لیں۔ اور اندرونی بھی۔“

”مگر اس اور اکا عکس میرے کیمرے میں کیسے آگیا۔؟“
 میں ہری دُوب پر حیران پریشان پلتھی مارے بیٹھا ہوں۔ سینڈی گویا سر پہ تینوں کا غیر مرئی تاج پہنے درجہ کی طرح استادہ۔ اوج فلک پہ چاند کی رقاصہ نغمہ سرا۔
 فرصت کشمکش مدہ ایس دل بقیہ اررا
 ”سید عبداللہ دروئیؒ کو مالوہ کے راجہ نے سارنگ بتایا۔ روشن۔ مرید ہندی کہہ رہا ہے۔ روم سے۔“

روم۔ کون سا؟ میں چونکتا ہوں۔ نورمن ڈریک والا۔ روم اولے سینٹ پیٹر کا۔
 روم ثانی قسطنطین کا۔ یا روم ثالث پیردی گریٹ کا۔ ماسکونی الحقیقت آج بھی روم سوم ہے ہمارے ان اہل کتاب کا جنکا پیشوا پیغمبر نہ تھا لیکن بغل میں کتاب رکھتا تھا۔ ہالہ نہ دارد۔

اور سپکنگ؟ روم چہارم!!
 بابا بابا۔ یک دو شکن زیادہ کن کیسوئے تا بد اررا

ردم روم سے حق حق حق —

پاچھے پاچھے ہر پھر میں کہت کبیر کبیر —

”یار سینڈی یہ تصویر —“

”ہر منظر ایک تصویر ہے۔ دھندلی یا منور گذشتہ رجب، سلطان الہند کے آستانے پر —

رس کی ایک شام —“

”وہاں کیا ہوا؟“

”ہوا کچھ بھی نہیں۔ ہم ایک منظر یاد کر رہے ہیں۔ آستانے کے اندر شہنشاہیاں بچ رہی تھیں
نوں گلاب کے انبار۔ قوال بچوں کی تانیں۔ جم غفیر سبز مخمیس چادروں کے رواں شاملیانے
زائرین کے جلوس۔ تیز روشنیاں۔ رات بھگی اور ہجوم چٹا ہم باہر آئے۔“

”پھر؟“

”پھر کچھ نہیں۔ ساڑے گیارہ بجے رات کا عمل۔ تب ہم نے وہ منظر دیکھا۔ دلی دوانے
لی ڈھال میرے پیرتین فقرار سے ہم سخن۔ اودھ کے دو عدد زرد پوش نوجوان وارثی درویش
ننگے پاؤں۔ دونوں بالکل کرایسٹ کے ہم شکل۔ فلیٹی انکو دیکھ پاتا مسیح نامری کارول ان میں
سے ایک کو دیتا۔ بھائی دشا دلی پیلے لباس والے موڈرن تعلیم یافتہ وارثی فقیروں کے کوہنوں
کی تم شناخت رکھتے ہو؟“ وہ چپ ہو جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے ”تیسرے ان میں سے براؤن رنگ
کا خرچہ پہنے ایک طویل القامت سجادہ نشین تھے برہان پور کے۔“

”برہان پور —؟“

”ہاں۔ دندھیا چل کے اس پار۔ برہان پور۔ بیجا پور۔ کرنول۔ گلمبرگہ شریف۔ ورنگل۔ اہل
معاملہ اور اہل مشاہدہ کی ایک اور دنیا آباد ہے۔ ساؤتھ ہیرد کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“

”اس سونچنا کے لیے دھینہ داد۔“

”میرے شیخ ان سے بڑی مسرت آگئیں باتیں کر رہے تھے۔ انکو ملیس کیا اور وہ تینوں
دلی دروازے کی سمت لوٹ گئے۔ ننگے پاؤں۔“

”ع مہارنا قہ کو پشت ناقہ پہ ڈال کر پیادہ ہو جا —!“

”بخارا سے روم — یعنی سلجوقیوں کا اناطولیہ۔ قونیہ سے ایران و ہندو سندھ۔ یہ لوگ کتنا سفر کرتے تھے۔ میاں کو دیکھو۔ ہر وقت پیابہ موٹر کار۔ مسلسل دورے۔ ہٹری کا OVERKILL کہ مجھے گڈیوں میں سالاز مسودہ گئے گھوسی اور میاں کی ایمبیڈر میں مخدوم جہانیاں کا ناقہ نظر آئے۔ بے کیا کیا جائے۔ اپنی آنکھ ہی ایسی ہے۔“

”تیسری؟“

”نہیں بھئی۔ ہماری ایسی قیمت کہاں؟“
 ”یہ ڈاکٹر کریئر کون ہے۔ نام سے یہودی لگتا ہے۔“
 ”سولہ آنے۔“

”قوم جہود کے افراد بھی چشم سوم رکھتے ہیں؛ مارکس اور اینگلز لو۔ فرائیڈ لو۔ آئین اسٹائن“
 ”تیسری آنکھ ہی جو ٹھہری۔ جس سمت بھی کھل جائے۔“

اب غنچوں کو نیند آرہی ہے۔ تالاب کے کنارے جگنو اڑ رہے ہیں۔ سندریشور زائن گویا ہے۔
 ”۔۔۔ پھر اس نے کہا اے مولے۔ تم نے میرا گھوڑا موڑ دیا۔ اب ہم ساتویں آسمان پر ہیں اس مقام پر نہیں جہاں تم لے تھے۔ ہمیں پتہ نہیں ہم نے تم سے کیا کہا تھا؟“
 ”کیا۔۔۔؟ میں پھر چونک کر پوچھتا ہوں۔“

”کل شام سرکار حضرت مولے اور گڈریے کی حکایت بیان کر رہے تھے۔ وہ رمزا نصیحت فرماتے ہیں تم سمجھ ہی نہیں پاتے۔“
 گلاب باڑی کے ادھر دونوں باجیاں مصروف گفتگو ہیں — اپنے ذہن کا انتشار بھلانے کے لیے انکی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

خوابیدہ پھولوں کے درمیان باجیوں کا مکالمہ :-

”اجیر شریف جاتے ہوئے آدھی رات کو میاں نے جے پور میں ایک مسجد کے سامنے کار روکی۔ پھاٹک پر ایک کمن لڑکا تندی سے جھاڑو دے رہا تھا۔ نصف شب

اموش، روشن مسجد تھوڑے سے تہجد گزار۔ اور یہ نوعمر لڑکا اس انہماک سے جا رہا کہ کبھی بس مشغول۔ میں بھی یہ منظر نہیں بھول سکتی۔

”اجیر شریف سے واپسی پر وہاں پہنچے تو پوچھنے والی تھی۔ شاہراہ کے کنارے شہر کی لمبی فاصل پر سفید کبوتر آ بیٹھے۔ سنگ سرخ کی مسجد کے اندر رنگ برنگی پگڑیوں والے نمازی۔ ہنگر۔ چند بیکر۔ مینا کار۔ مینا توری مصور۔ گلابی دھندلے میں لپٹے۔ صبح کی سہانی صبح۔“

خنک دم ہوا ہمالیہ سے ٹکر کر تریا پر سے بہتی آرہی ہے۔

”آہا جنت کی کھڑکی کھل گئی۔“ باجیوں کی بات چیت جاری ہے۔

”باغ ارم کی خنکی کا تھوڑا سا آئیڈیا تو ہمیں ہو چکا ہے۔“

”رائی نکھیت بہ کشمیر؟“

”ملک عنبر کی مسجد۔ اورنگ آباد۔ پن چکی سے ایرکنڈ ٹینڈ۔ ایسی ٹھنڈی۔ راحت انگیز۔ سایہ دار۔ فرش کے نیچے بہتی نہریں۔ تین سو سال سے وہ پن چکی متواتر چل رہی ہے۔ کوئی فرنگی انجنر اسکا راز نہ جان سکا۔ اتنی دوڑھیل پہاڑوں سے نکال دہ پانی کس طرح لائے جو اب تک جاری ہے۔“

وہ کیسے لوگ تھے بھئی۔ میں دل میں دہراتا ہوں۔

”پچھلے مہینے ایک سیمنا کے لیے پھر گئی تھی جے پور۔ یونیورسٹی۔ لوٹتے میں مڈے ہاؤس کے ایک پٹر کے نیچے مسٹر غنڈیب بیگ بھی نظر آئیں۔ دوسرے نیچے پون کمار میہرا۔“

”اوہ۔ پون میہرا۔ جرنلٹ۔“

”غنڈیب بیگ ڈاکٹر سالم علی کے چیلوں کے ہمراہ برڈ وچنگ کے لیے پرند آباد بھرت پڑا جا رہی تھیں۔ انکے ساتھی چڑھیوں سے مشابہہ تھے۔ ایک سارس نما امریکن۔ ایک کالوٹا ایسا پارسی۔ ایک شلوار پوش پاموز مرغابی۔“

”جس چیز میں انسان کو شدید دلچسپی ہو ویسا ہی لگتا ہے۔ ریس کے جو کی دیکھو۔ اور سارنگی نوار۔ خود گھوڑے اور سارنگی معلوم ہوتے ہیں۔“

”من تو شدم۔“

”غذیب بیگ نے اپنی ڈار کے ساتھ طائرستان کا رخ کیا۔ پون مہرا نے بتلایا کہ انکے اخبار نے انہیں نواب بیگم کے متعلق کھوج لگانے کے لیے بھیجا تھا۔ ناکام لوٹ رہی ہیں۔ اتنا بتا کر پون بھی ہوا ہو گئیں۔ ان سے پوچھ نہ سکی کہ انکی طلاق کے مقدمے کا کیا ہوا۔ یا یہ کہ جھڑنا آجکل کہاں ہیں“

”تعجب ہے نواب بائی اف جے پور کی مٹری اب تک سولونہ ہو پائی“

”مٹری کس کی سولو ہوتی ہے۔ ہماری تمہاری اور سب کی ہو گئی؟“

”بارش آنے والی ہے“

”اب کیا چیز ہے۔ ہوا کیا ہے“

”مرزا غالب جغرافیہ میں بالکل کورے تھے۔“

”یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں“

”پری چہرہ نواب بیگم کون تھیں۔ پری محل والوں کی دادی تھیں یا نہیں“

”ہم تم کون ہیں۔؟۔۔۔ تھے۔ ہیں۔ اور نہیں ہیں“

”اللہ مقدر مینا فریکل گفتگو فرما رہی ہیں آپ“

”آداب عرض کرتی ہوں“

”پون کماری کی سنا ہے دونوں بہنوں کی طلاق ہو گئی“

”ابھی محض کائن کی ہوتی ہے۔ یہ پانچ بہنیں ہیں بجیا۔ کاندن۔ چندن۔ پون۔

پانچویں پیدا ہوئیں تو سنا ہے ایک بکڑے دل نے انکے باپ سے کہا انکا نام متونا تھ بھئی لکھ لیجے

انہوں نے تجویز اچھڑنا“

”اب وہ بن گئیں ماتیشوری جھڑنا دیوی“

”بجیا جب یہ گرو جی کے پھر میں پڑیں۔۔۔ یہ بھٹیشور سے گئے تھے سکاگو۔ بزنس ٹینشن

پڑھنے۔ پھر مڈ ویسٹ میں ایک فاسٹ فوڈ چین اسٹور کے منیجر ہو گئے۔ جب یہ ”گوڈ مین“ بنے

جھڑنا بطور انکی گروپی ساری دنیا میں گھومیں۔ باجی ہو۔ مقبول فدا حسین تو کمپیوٹر کے ذریعے پیٹ

ہی کرنے لگے ہیں۔ ان گرو جی نے اپنی روحانیت کمپیوٹر پر ڈال دی۔ پون میں انکا فیوچر شک آئٹم

سے ضلع اعظم گڑھ میں نور بانمی کا بڑا مرکز

ہم نے دیکھا ہے۔ جھڑنا اسکی منتظم تھیں۔ وہیں جرمنی میں انکے اوپر آکاش بانی آئی کہ گروجی سے انکی روحانی شادی ہوگئی ہے۔ ایک دن مجھے بازار میں ملیں مانگ میں سندور۔ پاؤں میں کھوے کڑوا چوتھ کا برت رکھے۔ گروجی قدامت پرست نیک اڑیہ آدمی۔ پکے برہمچاری۔ سید خفا ہوئے چیلوں نے جھڑنا دی کو دوڑا دیا۔ آشرم میں روز بھگڑے رہنے لگے۔ گروجی نے غصے میں آکر منیجر کے منصب کے لیے ایک عدد روٹو خرید لیا۔ اب بہن جھڑنا روز صبح اسکی آہنی پیشانی پر صندل کا نقشہ کھینچتیں وہ انہیں پرنام کر کے اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہوتا۔ ایک دن شاید انہوں نے اسے غلط پروگرام کر دیا تھا نمسکارم کے بجائے اس نے انکی پیشانی کر دی کس کس کے فولادی جھانپڑیہ آشرم سے بھاگ کر فرانس پہنچیں وہاں خود مآجی بن گئیں۔ اب ایک فریخ کاؤنٹ انکا مینجر ہے۔ اسکا نام انہوں نے بادل سوامی رکھا ہے۔ جھڑنا اور بادل۔ آدمی وہ بھی صورت دار ہے۔“

”خدا کی پناہ۔ آپ کس قدر کی گوسپ کرتی ہیں؟ کنوریکارا۔“
 ”مردوں سے زیادہ نہیں۔ بہت سے دانشور۔ اہل قلم یونیورسٹی پروفیسر کو ہم نے سنا ہے۔ اپنے معاصرین خصوصاً لیڈرز کی غیبت کرتے۔ موقع پڑنے پر بھانجی وہ ماہرین۔ شراب پی کر ایک دوسرے سے لپاؤنگی وہ کریں۔ میری کتاب خواجگانِ چشت کے اودھی سلسلے پر چھپ جائے۔ میں بھی مصنفین کے زمرے میں شمار کی جاؤں گی۔ پھر دیکھے گا۔ منہ پر تعریفیں پٹیٹھ چھپرائی اور تعجبیک۔ گروہ منافقین۔!“

”یہاں اردو کی ادبی دنیا کا یہ حال۔“ میں کنور سے پوچھتا ہوں۔
 ”خال خال۔ ہے تو کچھ ایسا ہی۔“

”ساؤتھ ہیروے آگے جہاں اور بھی ہیں! میں چوٹ کرتا ہوں۔ وہ منہ لٹکا لیتا ہے پھر آہستہ سے کہتا ہے ”یار ریکتی سینا والیاں بھی تو ہیں مہارنا قہ کو پشت ناقہ پہ ڈال کر بے مہار“

ہرے کنج حمد و نعت کی صداؤں سے گونج اٹھے۔ خدام چاؤ کی سینیاں اٹھائے۔ روش پر

نمودار ہوئے۔ دور سڑک پر سے گذرتے گدیوں کے گلوں کی ٹٹناہٹ۔ پرندوں کی چہکار پھولوں کی مہک۔ پروائی کے جھونکے۔ عنقریب میں یہاں سے جانے والا ہوں۔ کہرے کے شہر واپس پچھلے تیس سال سے دلیں میں روزانہ اسے طرح سویرا ہوتا ہے۔ اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

میرے غریب دل تجھے بھائی مسافت کی شام

ایک وقت آئیہ کا ذکر نکلا۔ مرشد کہ عاشق حسین ہیں، ہال میں تشریف فرما، ایک صاحب سے ”آں امام عاشقاں پور بتول“ والے اشعار سن رہے تھے بعد ازاں ایک شخص نے حاضرین میں سے کہا ”خواجہ حسن بھری کا ارشاد ہے کہ اہل بیت اطہار معانی کی ایسی نازک کشتیاں ہیں جو کہرے پانیوں پر رواں ہیں، ملازمہ خیال کی بدولت ہمیں شبِ برات کی شام گومتی پر چلتے بارہویں امام کے نام کے وہ منور بحرے یاد آئے جو لکھنؤ میں یکے پل سے روانہ ہوتے ہیں اور عوام پیرتے ہوئے ان تک پہنچ کر اپنے حصے حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت ہم نے سوچا کچھ ابھاگے ایسے بھی ہیں جو ایک ناؤ کی طرف جاتے ہیں مگر اپنا بھاگ حاصل کرنے سے قبل ہی موجوں کا تھپڑ اٹکوا مخالف سمت بہا لے جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پھر اپنے بیوپار اور اپنی بزنس پارٹنر کی فکر سار ہی ہے۔ ہم بہت بڑی بلا میں ڈالے گئے ہیں۔“

ہال سے بیجاں نکلے۔ باہر گھاس پر بقول جرمن باجی وہ اتنا کیوٹ قلندر بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت شانت چہرہ۔ ہلکی چھدری دار اٹھی بیسز کوٹ۔ چند خدام اسکے قریب براجمان۔ وہ بڑے ہی شیریں لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھوں سے انکا نام پوچھت رہے۔ کہیں لیلے۔“

یہ جملہ ٹوٹکی یا تھپڑ کی سیج پر CORNY معلوم ہو۔ اس وقت معنویت سے بھر پور! سارا

فرق سینک پیدا کرتی ہے۔ ہم قلندر کی پرسکون شکل دیکھا کیے۔

اے نفس مطمئنہ —!

اے نفس مطمئنہ —؟

کنور سینڈی یوکلپٹس کے جھنڈیوں سے نمودار ہوا۔ قریب آکر بیٹھ گیا۔ قلندر اب تالاب کی طرف نگاہ کیے رسائیت سے پڑھ رہا تھا۔ ”جب لگ تن جرت — اور من نہیں مرجات۔ تب لگ مورت شام کی وجہں کہاں دکھات۔ ساہن سے کچھ پر سچے نہیں اور چورن سے بیوہار —“

اد۔ کے۔ میاں کا طریقہ ہے جو کچھ خود نہیں کہنا چاہتے گویا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دوسروں سے کہلوادیتے ہیں اب یہ قلندر سنائے جا رہا ہے اور ہم سن رہے ہیں۔ ”ساہن سے پر سچے نہیں — چورن سے بیوہار — وجہں جگ میں آئے کے۔ جائیں جو کچھ نیاں۔ نبی نام کی سمرن کیجئے اور علی پر رکھیے دھیان۔“
”یہ کوئی پریم مارگی صوفی رہے ہونگے —“ میں نے کنور کو مخاطب کیا۔
”ہلو۔ تم تو بڑے ہوشمند ہوتے جا رہے ہو۔“

”یار۔ اب ایسے ہوش بھی نہیں ہیں۔ مروجہ بڑے باپ یہ سب ملک محمد جیسی، قطبن وطن نہیں پڑھا کرتے تھے؟“

قلندر: ”پیرنگر کو پہنچ کے نبی نگر کو جائے۔ تب وجہں گھٹ ہی اندر ہر گالوں پائے۔ بنت بنت بن جی ہے ایسا — کوئی دن منصوور یا جیسا۔“

”منصوور یا جیسا۔ اہا دتو دای ای ٹ — جرمن باجی نے پیچھے سے آکر داد دی۔“
”ملا مت می کند خلقے من بردار می رقص —“ کنور نے الاپنا شروع کیا۔ قلندر نے دہرایا: ”تب وجہں گھٹ ہی اندر ہر گالوں پائے۔“

(۴۵)

خطِ ستوم

اودھی زبان کے چشتیہ صوفی شاعر وجہن کی پانچویں سپیٹرھی کے دو جواں سال بھائیوں نے اپنے پھانک پر میاں کا خیر مقدم کیا۔ وہ دونوں بھائی لامارٹینیئر کالج کے تعلیم یافتہ تھے لیکن ان کا مکان بہت قدیم تھا۔ اور جس قصبے میں وہ رہتے تھے وہ اور بھی زیادہ پرانا تھا اور ایک وقت مدینۃ الاولیاء کہلاتا تھا۔ خیر آبادی کے لحاظ سے اب بھی بہت بارونق تھا مگر جگہ جگہ ان مشہور مدارس اور جولیوں کے کھنڈر نظر آتے تھے جن میں سے بہت سی انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کھڑوا ڈالی تھیں۔

جس وقت ہم وہاں پہنچے ہیں وسیع مردانے مکان کے سرے پر بنی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی اندر جماعت کھڑی ہوئی اور ہمارے ساتھ آئی ہوئی مسلم خواتین نے بیرونی چوڑے پر مٹھے بچائے۔

نماز کے بعد میں مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی نسل کے ایک بزرگ کا مکان شہر لاہور میں اس جگہ پر تھا جسے شاہجہاں نے جامع مسجد کی تعمیر کے لیے منتخب کیا۔ ان صاحب سے کہا گیا آپ بطور معاوضہ سلطنت میں جہاں چاہیے جا کر آباد ہو جاتیے۔ انہوں نے ایک دور دراز مقام کا نام لیا کہ انکا ایک دوست وہاں رہتا تھا۔ چنانچہ وہ پنجاب سے چل کر اودھ میں آن بے۔ حضرت وجہن شاہ مجذوبؒ کے جد امجد۔ یہ قصبہ بھی سینڈھی نے یہاں آتے ہوئے گوش گزار کیا تھا۔

لکھنؤری انیٹوں کی سیڑھی پر بیٹھے بیٹھے میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ برطانیہ میں

خالی گرجا گھر مساجد میں تبدیل کیے جا چکے ہیں۔ یعنی یورپ کے کلیساؤں میں دوبارہ اذانیں۔ تو کیا تیسویں صدی مغرب میں اردو پریس اس قسم کے اعلانات شائع کرے گا۔

عرس حضرت برہنگوں پیر
تین سو سال قبل حضرت کے جد اکبر ۱۵۵۶ء میں راولپنڈی سے برہنگوں۔

صندل مبارک حضرت — شاہ خطب ٹورانٹوی حضرت کے بزرگ ۱۹۹۲ء
میں حیدر آباد دکن سے تشریف لائے تھے اور —

والٹر مٹی کا تخیل پھر کارفرما ہو چلا تھا کہ ایک آہٹ نے چوکایا۔
ایک صاحب، سر پہ آسٹرن ہیٹ جس میں نیلا پر لہرا رہا تھا، بڑھیا دلائی برساتی
سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہیٹ اتار کر آداب عرض کیا۔ اجازت چاہ کر سیڑھی پر بیٹھ
گئے۔ سامنے کا منظر بغور ملاحظہ کرنے لگے۔

احاطے میں ایک کوچ کھڑی تھی۔ چند کاریں، رکشائیں، سائیکلیں، پوچھٹ رہی
تھی اور گرد و نواح سے ایک ہجوم میاں سے ملنے کے لیے آن پہنچا تھا۔ امیر غریب ہندوؤں
کا ایک گروہ مردانے مکان کی سمت جاتا نظر آیا۔

”یہ سب مرید بننے کے لیے آئے ہیں۔ عجیب فومنن ہے۔ یا بھگتی۔ یا بیعت۔ جناب
بخوبی واقف ہونگے۔ غیر مسلمین کو مرید کرنا چشتیہ مسلک ہے۔ — محبت۔ جہاں۔ نغمہ۔
جولی گڈ۔ ڈوٹ۔“

سگار سلگا کر چند منٹ خاموش رہنے کے بعد اچانک وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب
ہوتے: ”جناب آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ نظام کائنات کے سارے سیارے اور آفتاب پہلے
محض گیس اور میلیم کے روشن بادل تھے۔“

”جی ہاں“

ایک اور سنگی۔

”اور کرۂ ارض پر پہلے لاکھوں برس تلک موسلا دھار بارش ہوا کی“

”جی“

”اور ٹش ٹن کے آخری دھماکے کے بعد آئندہ لاکھوں برسوں تک پھر جھڑی لگ رہے گی“

”عین ممکن ہے“

”تو اس کروڑوں اربوں برس کے گیس اور بادلوں اور بارشوں کے سلسلے کے درمیانی وقفے میں فقط دس بارہ ہزار سال کی انسانی تہذیب اور اسکے تخلیق کردہ معبود اور ادیان اور فلسفے اور روحانیت وغیرہ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جبکہ طرہ یہ کہ سارا کائنات مسلسل پیچھے ٹھسک رہی ہے۔ آپ وہ سامنے والی سرخ کوٹھی دیکھتے ہیں؟

”سرخ — ہ مجھے تو زرد رنگ کی نظر آرہی ہے“

”جی نہیں۔ سرخ۔ وہ پھانک کے دائیں جانب“

”وہاں ایک جنگل کھڑا ہے“

”وہی پہلے آپ کے ان میزبانوں کی وسیع کوٹھی تھی۔ گذشتہ تیس برس کی برساتوں میں درود یوار پر سبزہ آگ آیا تو یہ اپنی دوسری سالم کوٹھی میں اٹھ آئے۔ اسم شریف

”دھان پور“

”ادہ — ان لوگوں کے — ہم لوگوں کے مانند سابق بیرن ایکوں صاحب۔

دھان پور کو کتنا ثبات رہا؟“

ہم نے یہ سنکر متبسم کیا۔

”اسی طرح سارے کرۂ ارض کو بارش اور جنگل بڑھ کر لیں گے آپ میں کس خیال میں؟ جناب والا۔ اربوں برس کی متحرک گیس اور چٹختے ہوئے آتشیں سیار

درگھٹا ٹوپ برف اور لگتا رہبرسات اور جب ذرا کی ذرا مطلع صاف ہوا تو آپکا یہ انٹرویو۔
 درلا محدود کائنات کے مقابلے میں گویا بحر الکابل پر تیرتے مٹر کے دانے جیسی حقیر دنیا
 —ایسی سچویشن میں روحانیت اور الہیات اور مابعد الطبیعات کی کوئی حقیقت ہے؟
 ”مزید برآں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھیے کہ
 نہرت عام اور بقائے دوام کی تمنا میں بلکان ہوئے جاتے ہیں؟ انہوں نے برساتی
 لی جیب سے ایک پلندہ نکالا۔

”ملاحظہ ہو۔ ایک بے انتہا نامور شاعر لونیورسٹی میں میرے استاد تھے۔ وقتاً فوقتاً
 بنی تعریف میں خود مضامین لکھ کر بھیجتے رہتے ہیں کہ میں انکو اپنے نام سے چھپوا دوں۔“
 ”اور آپ چھپواتے ہیں؟“

”جی استاد کا حکم۔“
 ”آپ صبح صبح یہ فائیل لیکر گھر سے نکلے؟“

”سرکار کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں۔ انکو اپنا تازہ کلام سنانے۔ سرکار
 بہت شفقت فرماتے ہیں۔“
 اپنی تجریدی نظم سنانے لگے۔

جمع بڑھتا گیا۔

ایک مسکین سا آوارہ کتا پھاٹک پر کھڑا تھا۔ کسی بچے لے اسے کھینچ کر پتھر مارا۔
 تپاچیں چیں کرتا بھاگا۔

”کیوں مارتے ہو۔ وہ بھی خدا کی مخلوق ہے۔“ مسجد کی سیڑھیاں اترتے ہوئے
 ں نے تنبیہ کی۔ اور کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

پر لگی ہیٹ والے شاعر میری طرف متوجہ ہوئے ”جناب کو تو علم ہوگا صوفیاء کے
 ں کتا بھی ایک مقام رکھتا ہے۔“
 ”جی۔“

”میاں کا ارشاد ہے کہ بقول خواجہ حسن بصریؒ ”مخلصین، صادقین، متوکلین، راضین اور شاکرین کی ایکس صفات ایسی ہیں جو کتے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ شب زندہ دار ہے صابر۔ محبت شعار۔ یہ تمام خصوصیات ایک عام انسان میں ہوں تو وہ دلی ہو جائے۔ محبت توکل۔ عجز۔“

بات ادھوری چھوڑ کر وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

دید کی چاء کی کشتی اٹھائے نزدیک آئیں۔

”چا چا ہو۔ چا۔“ اہوں نے پیالیاں پوتے پر رکھ کر مجھ سے کہا۔

اسٹریٹ ٹی وی والے صاحب ”ایلس ان ونڈر لینڈ“ کے MAD HATTER کی طرح چاء کی پیالی ہاتھ میں سنبھالے، میاں کے تعاقب میں چل دیے۔

زرد رنگ کی کوٹھی میں ناشتے کے بعد کنور بولا۔ ”میاں کا فیورٹ اخبار ابھی نہیں پہنچا۔ چلو لپک کر شہر سے لے آؤں؟“

راستے بھر وہ سُر داس کا ایک دلاؤیز پیکنگناٹا آیا۔ کوہے جنگ، جینی کو کہینہ کوناری۔ کو داسی کیسورن۔ ہمیش سے کیسو۔ کسے ہی رس میں ابھیلاشی۔ شہر پہنچ کر اس نے اپنی مرمت طلب گاڑی درکشاپ میں چھوڑی۔ سائیکل رکشا پر کتب فروش ہاں پہنچے۔ چند منٹ بعد ایک اسٹیشن وگن آکر رکی۔ ایک نسوانی آواز نے چونکایا

”کیوں صاحب آپکے پاس نازہ ہڈی ہے؟“

”جی۔۔۔؟“

”ہڈی۔ ہڈی۔ وہ ریلی جس میگزین دلی سے نکلتا ہے شاید“

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ”اسٹڈی این بلو“ نیلے سلیکس کا بیش قیمت جوڑا۔ چوٹی ایٹری کے بڑھیا جوتے۔ طویل روپہلی زنجیر سے آویزاں اطالوی پرس۔ لطیف و نفیس میک اپ مصنوعی طور پر سنہرے کیے ہوئے بال۔ گوارانگ۔ سجان اللہ۔ غالباً یلیج آباد کی ایک صبح بھان زادی باغات انبہ کی آمدنی سے مالا مال۔ خدا کی پناہ۔ دولت کا خیال کسی طرح دل سے نکلتا ہی نہیں۔

”یو مین ٹو سے ہڈی میڈم۔“ انکی وضع قطع دیکھ کر دوکاندار انگریزی پہ اترا۔
 ”ہاں۔ ہاں۔ وہی۔“

”آخری پرچہ بچا تھا میڈم وہ ان صاحبان نے خرید لیا۔“
 ”ادہ۔ میرے ماموں جان نے تاکید کی تھی تازہ پرچہ لیتی آؤں۔ شاہجہاں پور میں بھی نہیں ملا۔“
 ”اگر مناسب سمجھیں تو پتہ بتلا دیجئے چند روز بعد اسے پوسٹ کر دیں گے۔“ کنور نے اخبار ^Uاپلندہ اٹھاتے ہوئے عرض کی۔ ”یہ پرچہ اپنے مرشد کے لیے خریدا ہے۔“

”مرشد؟ وچ کلٹ؟“
 ”نو کلٹ۔“

”انڈونیزیا کا ایک صوفی سنٹر بھی کور کر چکی ہوں۔ اسکا ایڈریس بتائیے۔“
 ”نوسنٹر۔ نو آفس۔ نور جٹررز۔“

”آپ تو نو نو ہی کیے جا رہے ہیں۔“
 ”ابھی نفی کے مقام پہ ہیں۔“ کتب فروش نے مسکرا کر کہا۔

”جی۔۔۔ سنیے حضرات۔ میں فری لانس جرنلسٹ ہوں۔ ویسٹ کے ایک سے ایک اسٹریم لائینڈ یوگا آشرمزوں سے واقف۔ آپ کی کون سی ایسی انوکھی جماعت ہے؟“
 ”نوجماعت!“

”آپکے گرو کا اسٹوڈیو کونے چلتی ہوں۔“
 ”اسٹوڈیو۔۔۔ ہا ہا۔“

انہوں نے بڑی شان سے اپنا سنہرہ کارڈ پرس میں سے نکالا۔ اسٹاک ہوم کا پتہ۔
او۔ لا۔ لا۔ لا۔ میں نے دل ہی دل میں سیٹی بجائی۔ اس نوع کے خوش آئند این کاؤنٹر
تو ہم بھول ہی چلے تھے۔

بوجہ میں نے اپنا تعارف مختصر رکھا۔ علی اینڈ سنگھ۔
”گویا اینٹھ اینڈ اسمتھ“ وہ مسکرائیں۔ مغربی یورپ کی ایک گھٹاگ اخبار نویس۔ اب
چوکنے رہنا چاہیے۔

”اپنی بہن سے ملنے شاہجہاں پور آئی ہوئی ہوں۔ کل معلوم ہوا اس شہر میں ایک عدد
برائڈرنگ ہوگئی ہے۔ صبح صبح موقع واردات پر پہنچی۔ پتہ چلا اطلاع غلط تھی یا معاملہ ہش
آپ کر دیا گیا۔ مگر جیسے باؤ لے گاؤں میں اونٹ۔ پل کی پل میں پھیر لگ گئی میں ہڑبڑا کر کار کی
طرف بڑھی۔ ایک اچکا میرا کمرہ چھین کر بھاگا۔ چلیے سے مسلمان لگتا تھا۔ شکر ہے کمرہ خالی تھا۔“
”افسوس۔ تھانے میں ریٹ درج نہ کی؟“

”نیورمانیڈ میرے پاس ان گنت کمرے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھیا۔ چلیے اس مفلس
ملک کے ایک مفلس مسلمان کو اسی بہانے ایک جرمن کمرہ تول گیا۔“
کنور نے سراٹھا کر چھت کو دیکھا۔ کتب فروش مسکرایا۔ وہ کہتی رہیں: ”صبح آپا جان کے
گھر سے چلتے وقت جلدی میں ناشتہ بھی نہیں کیا۔ یہاں قریب کوئی سلا دبار ہوگی؟“

”سلا دبار۔۔۔؟ بیگم صاحبہ۔ یہ امریکہ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ کتب فروش
کے مشورے پر ان کو نزدیک کے شان اسلام محمدی ہوٹل لے گئے۔ ایک وسطی میسنپر
جا بیٹھے۔ چھوکرے نے لپک کر جھاڑن سے پھولدار پلاسٹک کا میز پوش صاف کیا۔ سامنے
تنور پر مرغن کھانے تیار ہو رہے تھے۔ ایک تہمد پوش نوجوان نہایت فن کاری سے رومالی
چپاتیاں ہوا میں اچھالنے میں مصروف تھا۔

”اسی قسم کے ریسٹورانوں کے چھوکرے ہمارے لڑکیں میں وہ فلسفیانہ آواز لگایا
کرتے تھے کھایا پیا کچھ نہیں کلاس توڑا چار آنے۔“ کنور بولا۔
ٹیل ڈیشن پر کرکٹ میچ دکھلایا جا رہا تھا۔ آبی اور سفید ٹائیوں والی دیواروں پر

سنہرے فریم میں آیات قرآنی، گنبد خضرا۔ طغرے۔ مالک طعام خانہ کا فوٹو کرافت دو پہلو والی
کی تصویریں بڑے بڑے آئینوں پر منقش اشعار گنڈاؤلڈ مسلم سوسائٹی۔ لذیذ کھانے اور اردو
شاعری —

چند حضرات اردو اور ہندی اخباروں میں منہمک تھے کبجے شریف اور مسجد نبوی
کی تصاویر والے بڑے بڑے کیلنڈروں پر انکی مسلمان کمپنیوں کے نام ہندی رسم الخط میں۔
نیا ہندوستانی مسلم معاشرہ۔

صحافی خاتون نے طعام خانے کا جائزہ لیکر آہستہ سے کہا — ”کلچر شوک پیکچر شوک“
”بیشک۔ بیشک“ کنور نے متانت سے سر بلایا۔ اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔
”میرے شوہر شینگ میں ہیں۔ ہم سوئیڈن میں رہتے ہیں۔ پہلے نورتھ امریکا میں
تھے۔ جرنلزم میں نے یونیورسٹی آف سسکاچیون سے کی“

”خاکسار نے سنسنائی سے“ بہت دنوں بعد اپنے قوم پہ تھا۔
”خوب! تو گویا آپ میرے کولیگ ہیں۔ مسٹر اسمتھ۔ آئی مین — مسٹر علی۔ تھرڈ ورلڈ میں
آپ بھی کسی پروجیکٹ پر آئے ہوئے ہیں۔؟“
”جی نہیں یوں ہی۔“

”آپ کو یہ ملک بیک درڈ نہیں لگتا۔؟“
”کیا کیا جائے مائیں بھی تو دنیا نویں ہوتی ہیں اور اکثر ایئرڈ۔۔۔“
”سنٹی نٹل مش۔ یہاں منسٹروں سے لیکر دانشوروں تک سب کلیشے رٹ رہے ہیں۔“
”حتیٰ کہ کلیشے کی شکایت بھی کلیشے بن چکی ہے۔ میم!“

”سکنڈریٹ لٹریچر۔ تھرڈ ریٹ ٹی۔ وی۔ فور تھر ریٹ ہیومر — ڈیم — میں اپنی
بھانجی کی شادی انڈ کر نے آرہی تھی۔ ایک سوئیڈش میگزین نے فوٹو فیچر کا اسائن منٹ
بھی دیدیا — کیونل رائیٹس — برائیڈ برنگنگ۔ قحط — بھکاری — یونواؤل دیٹ۔
بے شمار رول تو میں نے ٹرینوں کی چھتوں پر لدے مسافروں پر ہی ختم کر دیے۔ ایسٹرن
یو پی۔ بہار — ناقابل یقین“

کنور واپس آیا۔ ساتھ ساتھ تھوڑے کھٹے ناشتے اور چاء۔

”بس یہی ایک چیز یہاں دل کو گرماتی ہے۔ لوگوں کی مہمان نوازی اور خلوص۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”آپ تو واقعی بہت ہی زیادہ مشفق و نرم رز کی طرح بات کر رہی ہیں۔ آپ

خود کہاں کی رہنے والی ہیں۔ بلیا۔۔ بستی؟“

”شاہجہاں پور۔“ ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ ”لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں

بیابان ہوا۔ اس کے چند سال بعد ہم لوگ باہر چلے گئے۔ پچیس سال سے وہیں ہیں۔ بچ میں

محض ایک مرتبہ آئی تھی جب۔۔ جب۔ میرے ابو کا انتقال ہوا تھا۔“

چندر دز کے لیے وطن آنے والے ”غریبوں“ کا وہی پامال منظر نامہ گھسے پٹے مکالمے

وہی مانوس رد عمل اور ترجم آئینہ سر پرستانہ انداز۔

”آپ لوگ اسی شہر میں رہتے ہیں؟“

”کھنؤ۔“ کنور نے جواب دیا۔

وہ چونک پڑیں۔ ”کرامت حیئن کی پرنسپل سے واقف ہیں؟“

”ہماری بی بی جانتی ہیں شاید۔“

”میں اپنی لڑکیوں کا داخلہ کروانا چاہتی ہوں۔ مسٹر سنگھ سفارش کر دیں گی؟ سنا ہے

انڈیا میں داخلے بڑی مشکل سے۔“

”لڑکیوں کا داخلہ۔۔ مگر آپ تو سویڈن۔۔“

”کرامت حیئن۔ ورنہ علیگڑھ۔ جب ہم یہاں تھے ہماری شدید تمنا تھی کہ اس قابل

ہوں کہ اولاد کو ویسٹ میں پڑھا سکیں۔ اب وہیں کے دو تہہ باشندے ہیں اور چاہتے

ہیں کہ۔۔ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟“

”بالکل نہیں مادام۔“

”آج سے دس سال قبل جس روز ہمارے سادھو انڈین اور تھوڈو کس برہمن

پڑوسیوں کی میٹی کمر تک لمبے سرخ بالوں والا ایک خوفناک، تھوڑے پوپ سنگھ اپنے

ماں باپ کے ہاں سے آئی یہ فیصلہ ہمیں جمعی کر لینا چاہیے تھا۔ مگر جب ہماری بڑی میٹی بھی

فریک آؤٹ کر گئی تب ہمیں ہوش آیا چلو خیر لڑکا جو چاہے کرے مرد ذات مگر بینیاں بڑی لڑکی یہاں سے پانچ سال کی گئی تھی چھوٹی دونوں وہیں پیدا ہوئیں۔ انہیں یہاں بھیج دے گی۔
”یہاں وہ بس فٹ نہ ہوگی؟“

ظاہر ہے۔ بچہ۔ لیکن آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے؟ میں اتنی پریشان ہوں کہ انالس میں بھی جا چکی ہوں۔ فائدہ ہوا خاک دھول۔ جب ہم دونوں یہاں سے مائیکریٹ کر رہے تھے اس پر دلم کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ فیوچر اسوقت بہت دور تھا۔ لوم صاحب پلک جھپکتے میں وہ سامنے آگیا۔

”فیوچر شوک۔“ کنور بولا۔ ”مادام۔ ہم اور ہمارے دوست۔ مسٹر علی، ہم دونوں کی جنریشن تو سمجھے حد سے حد سن سال اور کھینچ لے جائیگی لہذا۔ یہ خود غرضی کی بات ہے۔ لیکن ہم کو اتنی فکر ہے نہیں۔ آپ کی مڈل جنریشن کو البتہ ابھی کو اٹر سچری اور زندہ رہنا ہے۔“

”اماں کیوں ایسی ہولانے والی بات کرتے ہو؟ میں نے اعتراض کیا۔
’لہذا مسز خان۔ آپ لوگوں کو ابھی بہت کچھ اور دیکھنا باقی ہے اسکے لیے ابھی سے جی کمر اکر لیجیے۔“

”ہماری بڑی لڑکی نے جولائی اسٹائل اختیار کیا ہے۔ وہ فیشن ڈیزائنر ہے۔ الگ فلیٹ لیکر رہتی ہے۔ اب کم از کم چھوٹی دونوں۔“
کنور آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”سیارے سیاروں سے ٹکرا رہے ہیں۔ پہاڑوں کے گالے کے مانند اڑیں گے۔ اور۔“

”جی۔۔۔ ہنسی۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟ اسوقت لکھنؤ جا رہے ہیں۔“
”بیگم صاحبہ۔ ہم کارخانے سے کار لے آویں اس کا رخیر کے لیے آپ کو فوراً لکھنؤ لے چلیں گے اور اپنی بی بی سے آپ کو ملو اگر فوراً لوٹ آویں گے۔ آپ کہاں مقیم ہیں؟“

”بتلایا تو۔ شا جہاں پور۔ اپنی بڑی بہن کے ہاں۔ فوٹو فیکر کا کام مکمل ہو گیا مائیس براڈ برننگ جسکا افسوس ہے۔ اب کالجوں کے متعلق معلوم کر کے اتوار کو یورپ واپس۔“

ہم تینوں ہوٹل سے نکلے۔

کارخانے کے مالک حاجی صاحب نے کہا گاڑی تیسرے پہر تک —
 ”مجال ہے جو اس ملک میں کوئی کام وقت پر ہو جائے“ مسرخان بڑبڑاتی ہوئی اسٹیشن
 دگن سے اتریں۔

”بیگم صاحب۔ ہم ابھی آتے ہیں پانچ منٹ میں۔“ انکے ڈرائیور نے کہا اور غائب ہو گیا۔
 ”نیسے۔ ایسا کرتے ہیں“ کنور سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے شو فر کو پتہ بتلائے دیتے ہیں۔
 غریب خانے پہ تشریف لے جائیے۔ پرتیبھا گھر پہ ہونگی انکو یہاں سے بھی فون کیے دیتے ہیں۔
 ہم لوگ بس پکڑ کر حضرت کی خدمت میں واپس جائیں۔ بہت دیر ہو گئی۔“
 ”مجھے شک آؤں مت کیجئے۔“ انہوں نے ندوس انداز میں سگریٹ جلایا۔ ”میں بھی فکر مند
 ہوں۔ چلیے آپکو آپکے صوفی سٹر پہنچائے دیتی ہوں مجن خاں۔“
 ”کھانا صاحب شاید چاء پینے چلے گئے۔“ ایک مٹری نے جواب دیا۔

”میرے رشتے داروں کی کار ہے۔ میرا شو فر ہوتا اس وقت نکال باہر کرتی۔“ وہ جھنجھلا کر
 ایک کرسی پر ٹپک گئیں۔ سینڈی اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ حاجی صاحب چاء اور ناشتے کی
 کشتی اٹھوائے پہنچے۔ انہوں نے اصرار کیا۔ ”غیر ملکی،“ ہمان نے انکار۔ انکے جانے کے بعد
 بولیں۔ ”یہاں لوگ خاطرہ کے مارے بھی ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ ایسی بھی کیا گرمجوشی۔“
 اب ایک ملازم دیسی کوکٹ لیکر حاضر ہوا۔ انہوں نے پھر ناک بھوں چڑھائی ہیں
 نجل ہو کر سٹرک کی طرف دیکھنے لگا۔ جوہری کی دوکان کے سامنے ایک کار آکر رکی۔ نفیس
 غراو میں ملبوس بیگمات اتر کر اندر گئیں۔ پھر ایک جنرل اسٹور کے سین نے متوجہ کیا۔
 شیردانی میں ملبوس ایک بارش نوجوان صابن خریدنے میں مصروف تھا۔ مٹا سا سرخ غرارہ
 پہنے ایک بچی نے ہاتھ اونچا کر کے کاؤنٹر سے پلاسٹک کا کوئی کھلونہ اٹھایا اسٹ پلٹ کر
 اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ”ابو“ اس نے چہرہ اٹھا کر باپ
 کو ہلتی نظروں سے دیکھا۔

”کیا قیمت ہے؟“ نوجوان نے دریافت کیا۔

”چھ روپے۔“ دوکاندار نے جواب دیا۔

”بیٹا۔“ شخص مذکور نے جھک کر بڑی نرمی سے کہا ”اس مہینے ہم نے تمہارے

لیے نیا فراک بنوا دیا ہے یہ کھلونہ اگلے مہینے خرید دیجئے۔“

وہ بہت چھوٹی بچی تھی پانچ یا چھ برس کی۔ لیکن اس نے ضد نہیں کی۔ چپ رہی دو ٹیپ

سنبھالتی باپ کی انگلی تھامے آگے چلی گئی۔ رضا و تسلیم۔ ۹۔ باپ رے۔

”سوئیڈش“ لیڈی بھی محویت کے عالم میں یہ دلدوز منظر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف

متوجہ پا کر مسکرا سے آلودہ نم پلوں پر چھٹکیا پھیری۔ کچھ توقف کے بعد بولیں: ”میرے ابو۔

ایسی طرح میں انکی انگلی تھامے بازار جاتی تھی۔ لہجائی نظروں سے کھلونے دیکھتی۔

وہ خرید نہیں پاتے تھے۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھے۔ میں بھی بالک ہٹ نہیں کرتی تھی۔ اماں

نے اس کمسنی میں سمجھا رکھا تھا۔ پتہ مارنا سیکھو۔ بیٹیوں کے لیے پتہ مارنا بہت ضروری ہے۔

”اب میرے پاس برن آؤٹ یوں کی اتنی دولت ہے کہ مجھے کسی چیز کے لیے پتہ مارنے

کی ضرورت نہیں۔ میری لڑکیاں تو اس تصور ہی سے نا آشنا ہیں۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی

سانس بھری۔

”میرے شوہر اچو منٹ کی اس اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں کہ اب اپنی بورڈم کو صبح سے شام

تک شراب میں غرق کرتے رہتے ہیں۔ ہماری بڑی بچی شروع شروع میں بالکل فریک آؤٹ

کر گئی تھی۔ میرے شوہر اس صدمے سے تقریباً الکحلک ہو گئے۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے ہیں

میں نے دن رات جدوجہد کر کے یہ دولت اسیلے کمائی تھی کہ میری بیٹی۔۔۔ اوہ۔۔۔

گوڈ۔۔۔ مسٹر علی ابھی مسٹر سنگھ نے وہ کیا بتایا تھا۔ کھایا یا کچھ نہیں گلاس توڑا چار آنے

۔۔۔ مسٹر علی ہم واقعی اپنے میرے جواہرات، منگ کوٹ، سوئس اکاؤنٹ چبا کر نگل تو نہیں

سکتے۔ اور ہماری بچی گلاس کی طرح ریزہ۔ ریزہ۔۔۔“

”آپ اس جملے کی ذرا زیادہ ہی فلسفیانہ تاویل کر رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے حالات

اتنے نہیں بگڑے۔“

”آپ حیران ہونگے کہ — سر راہے، اتفاقاً پہلی ملاقات میں ذاتی مسائل بیان کرنے بیٹھ گئی۔ لیکن شاید اس ایٹھنک کلچر کا اثر ہے فیملی اور سٹڈ سوسائٹی جہاں لوگ چھوٹے ہی ایک دوسرے کو باجی دیدی بھیا چچا پکارنے لگتے ہیں“

بالکل حیران نہیں۔ عاصی اس قسم کی متمول پریشان حال میکڈاپ بیویوں کے اچانک کنفیشنز کا عادی رہا ہے۔

”یا آپ کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو کوئی ڈنس اسپائیئر کرتی ہے؟“

بندہ اسی کو اٹھائی کی وجہ سے ہمیشہ کا مران رہا۔

”میں ابھی اپنی ایکسٹنڈ فیملی کے خلوص کا تجربہ کر کے آرہی ہوں۔“

”جبکہ آپ کو اپنی نیوکلیر فیملی کی عادت ہو چکی ہے“

”نیوکلیر — کا کیا ذکر تھا بھئی —“ کنور نے واپس آتے ہوئے پوچھا ”جب پہاڑ

روٹی کے گالوں کی طرح اڑیں گے — اور —“

”— میں آپ دو اجنبیوں سے خود کو ریلیٹ کرتے پارہی ہوں۔ مسٹر سنگھ میں آپ کو

ہر سال یورپ سے راکھی بھیجا کر دوں گی۔ آپ کی چال ڈھال اور نوکیلی مونچھوں سے ظاہر ہوتا ہے

کہ آپ راجپوت ہیں۔ ایم آئی رائٹ ہ راجپوت بھائی کی پٹھان بہن — داؤ — !

رکشا بندھن کا تہوار کس مہینے میں پڑتا ہے؟ انہوں نے پرس سے نوٹ بک نکالی۔

مسٹر خان اب ہندوستان کے روٹینک ٹرپ پر چلی گئی تھیں۔

راگیدوں کے ہجوم میں سے انکا ڈرائیور نمودار ہوا۔

قصے کی طرف واپسی کے دوران وہ بالکل خاموش رہیں۔ کنور نے پھر سُر دا س

گنگنا نا شروع کیا — کو ہے جنک، جننی کو کہیت۔ کوناری کو داسی — کیسو ورن —

بھیش ہے کیسو — کے ہی رس میں ابھیلاشی — کون دیس کے باسی رے اووہو

ایٹشن دیگن میزبانوں کے پھانک میں داخل ہوئی۔

تیسرے پہر ایک درگاہ پر گئے۔

”اسکا کچھ بیک گراؤ نڈر دیکھتے۔“
 ”شاہ مینا صاحب کے خلیفہ۔ کیلف نہیں۔ بیگم صاحبہ۔ لکھیے۔ خلیفہ۔“ کنور بولا۔
 ”او۔ کے۔ نیور مائینڈ۔ انہوں نے نوٹ بک بند کر دی۔“

خواص و عوام نے میاں کو گھیر رکھا تھا۔ دہلی ٹویوں اور نرم چہروں والے ثقہ عمر
 رسیدہ شرفائے قصبہ کو دیکھ کر میرے حلق میں کوئی چیز آن اٹکی۔
 ”کلچر شوک۔“ کنور نے مجھے اداس پا کر آہستہ سے دریافت کیا۔
 ”بکومت۔ بڑے آبایا آگئے۔“

”بھائی۔ جس اوڈیسی پہ تم نکلے ہو اسمیں بڑے بڑے مقام آدینگے۔ جان لیوا۔“
 ”اوڈیسی۔ ہڈانس۔ ہڈانسر بھی ہیں؟ غیر ملکی۔ مہمان۔ قوالی کے شور
 کی وجہ سے بات صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔“

”ہم ہیں وابستگان زلف دراز۔ دور تک سلسلہ تمہارا ہے۔ دور تک۔“
 ”یہ مقبرہ فنی نے آگرے سے معمار بھیج کر بنوایا تھا۔“ کنور سینڈی۔

”آگرے سے ہ سنا ہے وہ خود تو بیردت میں رہتے ہیں۔“
 ”شو۔ شو۔ قوالی سننے دیجئے بھی۔“ پیچھے سے ایک خاتون۔ انکے گردہ میں

کھسک رہی۔ ”یہ کون بی بی ہیں؟“

”انگریز برگماں از سوئیڈن۔“

”ڈونٹ بی کیٹی ٹکھت۔“

”شو۔ شو۔“

”ایسے بلیم کی دھوم مچی ہے۔ لاگی ہے پریم بچریا۔ مورے بانکے انوکھے سانواریا۔ مورے

گئیٹاں۔ ہم ہیں وابستگان زلف دراز۔ لاگی ہے پریم بچریا۔“

مسز خان نے درگاہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مایوس ٹورسٹ کی آوازیں کہا۔
 ”کسی کو حال تو آیا ہی نہیں۔“

”میاں کا روحانی کنٹرول۔“

”آپ لوگ کس دنیا میں رہتے ہیں؟“

کنورا کے ڈرائیور محسن خاں سے مخاطب ہوا ”دیکھو بھئی ایسا کرو کہ اب سیدھے لکھنؤ جاؤ اور علی گنج پہنچ کر۔“

”بسب ہندوستانی شتر مرغ ہیں۔ سنیے میں کل تک یہاں ٹھہر سکتی ہوں؟“

دوسری شام۔ میزبانوں کا مردانہ مکان۔ محمود آباد کے قوال۔ مسرخان کنور سے:

”دہی سنو ایسے۔ لاگی ہے پریم بزرگ۔“

رات۔ ایک قدیم درگاہ سے ملتی ایک خوش منظر قریہ۔ میزبان ایک نوجوان حاجی۔ میاں کے آئیں رو پہلی بروکیڈ کی صدری پہنے۔ دوسری منزل پر ٹی ڈی چل رہا تھا۔ ایک لڑکے نے جاپانی کیمرو نکال کر تصاویر لینی شروعات کیں۔ کنور نے ذرا گھینے پن سے مسکرا کر مسرخان کو دکھایا۔ وہ ہاتھی کی یادداشت رکھتا ہے۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ انہوں نے ذرا جھپ کر پوچھا۔

”نئے KULAK —“

میاں بی بی سی کی خبریں سننے میں منہمک تھے۔ سارے مہمان انہیں تکے جا رہے تھے۔ ہم لوگ ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ بروکیڈ کے غرارے پہنے چارپائے عورتیں کمرے میں آئیں۔ بعد دست بوسی فوراً واپس گئیں۔

”قبضوں میں پردے کی بڑی شدت ہو کر رہی تھی۔“ مسرخان۔

”اب بھی ہے مگر پردہ لیڈرز کو میاں کی زیارت کے لیے مجمع عام میں آنے کا سوشل سینکشن

حاصل ہے۔ یہ قدامت پسند معاشرہ اپنے دلی پہچانتا ہے۔“

”کیا وہ ہجوم کی ذہنیت کو پیوری فائی کر دیتے ہیں؟“

”حقیقت تو یہی ہے۔“

”یو نو سم بھنگ مسٹر علی! آپ مجھے ایک سچی کٹرفل آدمی معلوم ہوئے۔ نجائے یہاں کیا کر رہے ہیں۔“

”میاں نے میرے ذہن کو بھی پیوری فائی کر دیا ہے۔“

”اِن ڈیڈ —!“

”اُسی ابھی خبر آئی ہے کہ فیض آباد کی خاتون ڈاکو ماراؤتی پکڑ لی گئیں۔ ترنت جا کر انکی گرفتاری کو رکھیجئے اپنے فولو فوجر کے لیے۔“ جرمن باجی کا مشورہ۔
 ”آپ مجھے یہاں سے بھگانا چاہتی ہیں؟ کیونکہ شاید پہلی مرتبہ آپ کے اس چارڈ سِرکل میں ایک فرد ایسا آیا ہے جو۔“
 ”مہاراج کی خلافت بہت جسنے کرتے ہیں۔“
 ”خلافت؟“

”سر لا دیدی کا مطلب ہے مخالفت۔ کل آپ جن بزرگ کے روضے پر گئی تھیں انکو اگر نے اگر سے بلایا۔ فیضی نے بطور آزمائش بی اور چیل کا تو رمہ ستر توان پر پیش کیا۔ آپ نے فرمایا جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ۔ بی قاب سے نکل کر بھاگ گئی چیل ار گئی۔ فیضی آپکے قدوں پر گر پڑا۔ آپ نے فرمایا ہم پانی کا حکم رکھتے ہیں جو ہم پر پڑا گذر گیا ہمیں کدورت سے مطلب نہیں“
 ”شوگ اینڈ بل کے بجائے کیٹ اینڈ کائیٹ اسٹوری —“ مسز خان نے کہا۔
 ”ادب سے بات کیجئے“ کنور غز آیا۔

تیسرے روز۔ ایک خان صاحب کے اونچی دیواروں والے ترک کی قسم کے خانہ باغ میں چار۔ چمن کے ایک گوشے میں ایک صاحب قہہ سنا رہے تھے۔ ”تو جناب والا حضرت امام حسین علیہ السلام نے تو کر دیا منع۔ مگر آپ کی شہادت کے بعد زعفران کا لشکر تاقیامت نوہ گر رہنے کے لیے دشت کر بلا میں خیمہ زن ہو گیا اب تک وہیں موجود ہے اور روزِ حشر تک گریہ کرتا رہے گا۔“

”ہاؤ سوئیٹ۔ آڈ ٹومی ای ہاٹ۔“ جرمن باجی۔

”دشت کر بلا میں تو اب بازار ہیں اور ایک عدد فائو اسٹار ہوٹل۔“ مسز خان ہنس پڑیں۔
 ”روشن پراگے بڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔“ مگر تعجب ہے اتنے اور تھوڈ وکس ماحول میں ایسی ری ایکسڈ قسم کی میکسڈ سوسائٹی۔ شاید اسوجہ سے کہ سب کی توجہ فرد واحد پر مرکوز۔“

”درست۔“

”گویہ جرمن باجی کافی Low I.Q. رکھتی ہیں بے چاری“
جرمن باجی کی انکے متعلق یہی رائے تھی۔

چوتھی رات۔ بعد نماز عشاء مسرخان بوکھلائی ہوئی چوتھرے پر آئیں۔ ”مسٹر علی۔ ابھی ایک صاحب کسی شخص سے سرگوشی کر رہے تھے میں میاں کے پاس ایک پرولم بیکر آیا تھا۔ جانداد کے مقدمے کے متعلق چند نکات کا محض میرے والد مرحوم کو علم تھا وہ موجود نہیں۔ سرکار نے فرمایا تو ان سے پوچھ کیوں نہیں لیتے میں نے عرض کی حضور آپ کو تو معلوم ہے والد کی وفات کو چھ مہینے گزر چکے۔ آپ نے میری آنکھوں پہ ہاتھ رکھا۔ ہٹایا تو آبا جان سامنے موجود۔ میں ہڑ بڑا گیا۔ ان سے مقدمے کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ آپ نے دوبارہ میری آنکھوں پر دست مبارک رکھا۔ ہٹایا تو گھر سے میں کوئی نہیں۔“
”صاحب میں اس فیشی سے ری لیٹ نہیں کر سکتی افسوس کہ میرا فیڈبیک آپ کو مایوس کر گیا۔ میرا ڈیلیما ہر موڈرن مائینڈ کا ڈیلیما ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟“
”پھر انالس میں جاتیے۔“

پانچوس رات۔ وہ کارواں میں شامل ہونے کے لیے گیٹ ہاؤس کی محراب میں کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں ”آل راؤنڈ کمیونی کیشن گیٹ۔ ابھی جب میں نے دہلی سے لکھنؤ کے لیے ٹیک اوف کیا ایر ہوٹس کی آواز آئی یا تریوں سے نویدن ہے کر پیہ ڈھوم پان نہ کریں۔ میں سمجھی وہ کہہ رہی ہے۔ مسافر پان کھا کر دھوم نہ مچائیں۔“
”آپ بھی کر پیہ۔“ جرمن باجی۔

”کیوں۔“ اور یہ مسٹر راجا علی جو ہر وقت چینی کی طرح۔
”لیکن قوانین مشرق۔“

”ڈیٹم قوانین مشرق۔ آپ کبھی ٹڈل ایسٹ گئی ہیں؟“
”جی اور سال میں چھ مہینے ویسٹ جرمنی میں رہتی ہوں۔“

”آپ ویسٹ جرنی میں رہتی ہیں اس سے مجھ پر کس طرح لازم آیا کہ میں دھوم پران نہ کروں؟
مشرعلی۔ میاں اسقدر دلچسپ کن ٹم پریری گفتگو کرتے کرتے — کوئی پوائنٹ نکال کر
اچانک کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جسکے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ شام فرما رہے تھے ہم
نے ایسے دیوانوں کو دیکھا صحرائیں گھومتے ہوئے انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے
رکھی تھیں۔ اسکا کیا مطلب ہے —؟ اور فرمایا مکاں اور لامکاں میں ڈھونڈاؤ مگر انہوں
نے اپنا پتہ بتلا رکھا ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتے ہیں۔ مگر میں پوچھتی ہوں یہ اچھی دل
لگی ہے کہ پہلے خود ہی ایسے اسباب پیدا کر کہ دل ٹوٹے پھر اس میں آکر رہنے لگو۔

”میں نے پوچھا۔ سیلاب۔ زلزلے۔ جنگیں۔ فساد۔ لاکھوں بے گناہ مارے جاتے
ہیں — یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میاں نے فرمایا۔ آپ کے پاس بارغ ہے؟ جب آپکا
جی چاہتا ہے اسکے درخت کو ڈالتی ہیں — مشرعلی اسکا کیا جواب ہے؟“

شہر۔ ایک اور معتقد کا ”ادین ہاؤس“ ہم صحن میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے
تھے۔ اہل ہنود کی آمد و رفت جاری تھی۔

”یہ بھگتی کا چکر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا دایسے مذہب جنکے درمیان — جنکے درمیان“
”بعد القبطین ہے“ عربی باجی نے مسرخان کی بات پوری کی ”لیکن ایک قطب —“
”آسان اردو پلیز“

”او۔ کے۔ سینے۔ داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں — شیخ ابوطاہر جرنی ایک روز اپنے مرید
کے ساتھ بازار میں سے گز رہے تھے ایک شخص نے ان پر زبان ملامت دراز کی۔ مرید اور
بازار کے لوگ جوش میں آگئے۔ مرید نے اس شخص کی ٹھکانی کر دی اور خود زخمی ہوا۔ شیخ
نے اس سے کہا اگر تو چپ رہے تو تجھے ایک ایسی بات بتاؤں گا کہ تیرا رنج جاتا رہے گا جب
اپنے مکان پر پہنچے شیخ نے صندوق کھولا جس میں خط بھرے ہوئے تھے۔ فرمایا۔ دیکھ۔ کسی
نے مجھے شیخ الاسلام لکھا ہے۔ کسی نے شیخ زکی۔ کسی نے شیخ زاہد۔ کسی نے شیخ الحرمین۔ اسی

طرح کے القاب ہیں نام کسی نے نہیں لکھا۔ ہر ایک نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے ایک لقب دیدیا تو کیا ہوا۔ یہ جھگڑا کیوں اٹھاتا ہے؟“

”گرو دی سین۔ لیکن میں کوپ نہیں کر سکتی۔ دوسری صبح شاہجہاں پور لوٹ گئیں۔ اسی مکان میں تیسری شام ایک بیرونی کمرے میں دیوار پر آویزاں کعبہ شریف کے بڑے کٹ آؤٹ کے نیچے ٹیلی ویژن چل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پانچ ٹیو کیڈز پاؤ کا بلب روشن دونوں کمروں کی چاندنیوں پر تیل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اچانک بجلی سیدمدم پڑ گئی۔ میاں نے لیٹ کر دلانی اوڑھ لی۔

”پاور کٹ“ میں نے کہا۔

”عام طور پر ہوتا نہیں۔“ میزبان بولے۔

”میاں۔ اے میاں۔ ہمرے لڑکے کو نیک ہدایت۔ اے میاں۔“ ایک برقعے والی عورت بار بار کہے جا رہی تھی۔

”آرام کرنے دو اماں“ لڑکی نے کہا۔

”ہمرے لڑکے کو۔“

زیادہ تر ہندوستانی مسلمان مائیں شاکی ملیں کہ لڑکے پڑھائی کے شوقین نہیں لڑکیاں کالجوں میں پہنچ گئیں۔ ہم یہ سب باتیں نوٹ کرتے جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے بیٹے کی طرح اخبار نویس ہونا چاہیے تھا۔ اے کاش زندگی از سر نو شروع کر سکتے۔

شور مچ رہا ہے۔ ٹی وی اسکرین پر روشنی کی لکیر باقی رہ گئی ہے۔

ٹھیک نو بجے روشنی تیز ہوئی۔ میاں دلانی چہرے سے ہٹا کر اٹھ بیٹھے۔ یحیٰ ان تازہ کیا گیا۔ دسترخوان بچھا۔ صبح ساڑھے تین بجے لکھنؤ روانہ ہوئے۔

کمترین نے بے آواز روتن رائیس پر بھی سواری کی ہے مگرمیاں کی ایمبیڈ رینجر آدا جنیشن اس طرح رواں تھی محسوس ہوا طیارے میں بیٹھا ہوں۔ دو گھنٹے کا راستہ تین منٹ میں طے کر کے داخل حضرت گنج ہوئے مقتدین کی کوٹھی پر پہنچے۔ دن نکلا۔ انگلستا

واپس جانے کی اجازت لی۔ کلاس اودھ گئے۔ ڈاک طلب کی۔ افسوس کہ نورمن یا نورما کا ایک بھی خط موجود نہ تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں انہیں ہماری یاد نہ آئی۔ افسوس۔ پھانک پر نکلے جست و پیچان گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ ”عیش باغ لے چلو بھائی جست و پیچلی بار دو ماہ نگار خانم کے چکر میں رہے ایک روز وہاں جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ارادہ تھا چلتے وقت فاتحہ۔“ راستے میں گلاب اور اگر بتیاں دلواتے چلنا۔ ”عربی باجی نے بتلایا تھا وہیں خوشبو پسند کرتی ہیں۔“

قبرستان کے نزدیک گنجان بستی آباد ہو چکی۔ ایک مکان کے آگے چند انصاری صاحبان کرگھے لگائے بیٹھے تھے جھینسی جھینسی مینی چدریا۔ ایک طرف ایک کھڈے پر سرخ رنگ کی ریشمی ساری تنی ہوئی تھی ایک نوجوان نہایت چابکدستی سے زردوزی میں منہمک تھا۔ رکشا سے انکر ہم دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ پل کی پل میں اس نے چند گل بوٹے بنائے۔ نفی میں سر ہلایا۔ ایک طرف سے سنہرا تار کھینچ کر سب اُدھیر ڈالے۔ دوسری سیل شروع کر دی۔

ڈھال پر اتر کر نئے پھانک کے اندر گئے۔ تعجب ہوا۔ چمن خاص اتنا پر فضا بنا دیا گیا۔ شاداب درخت پھولوں کی جھاڑیاں۔ سبزہ طویل بختہ روش پر چلتے اسطرف پہنچے جہاں بڑے آبا کو سیر و خاک کیا گیا تھا۔ تلاش کرتے پھرے۔ حد نظر تک پرانی اور نئی قبریں بالآخر ایک ہرے بھرے درخت کے نیچے انکا مز ا نظر آیا۔ دوڑے۔ کتبے پر حجبی گرد و مال سے صاف کی۔ راجہ جواد علی خان مرحوم مغفور۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۹ء۔

تیس سال سے یہ مزار بے چراغ پڑا ہے۔ اپنے پیاروں کی تربتوں پر آنے والے تمام اہل القبور کے لیے جو جہل فاتحہ پڑھتے ہیں بے چارے بڑے آبا اسی میں شامل رہے جب کہ نالائق مرد و دھیتجا سارے کرۂ ارض پر بد معاشیاں اور بے ایمانیاں کرتا پھر رہا تھا گلاب کے پھول بکھرے اگر بتیاں سلگائیں۔ فاتحہ پڑھی۔ قلب گداز ہو چکا ہے۔ زار و قطار روئے کوئی گورکن پاس سے گذرا ایک سن رسیدہ صاحب بہادر کو بچوں کی طرح بلکتے

دیکھ کر ٹھٹھا۔ آگے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا آدمی پانی کی بالٹی اٹھائے آیا۔

”بھیا۔ سلام علیکم“

”علیکم السلام ہمیں پہچانتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔ آپ پاکستان جاتے وقت آخری بار یہاں تشریف لائے تھے۔“

ہڑبڑا کر بالٹی اسکے ہاتھ سے نی۔ ہر دھونی۔ اسکے ساتھ ملکر بھاڑ بھنکاڑ صاف کیے۔

نوٹ پر گوکھروچیک گئے۔ ہاتھوں میں کانٹے چبھے۔ میں دشا دلی کہ ابلیس سے معاملہ نکھتا

تھا۔ خوفِ الہی سے تھر تھرا کر کیا کہ اب خود میرے اور گورگڑھے کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا

ہے۔ میاں ایک روز ادھی کے چند اشعار پڑھ رہے تھے وہ یاد آئے۔ احمد سنگ جو

چاروں یارا۔ چاروں سدھ میت کرتارا۔ پہلے ابو بکرؓ جو سانچے۔ پہلے پریم پنچھ وہ راجے۔

دوسرے عمرؓ دین کی کھامبا۔ کین عدل جگت تین تھامبا۔ تیسرے عثمانؓ پنڈت بلہاری۔

لکھ سو پران دین سناری۔ چوتھے علیؓ سورجک بھانا۔ کفر بھنج سب لوگ بکھانا۔ انت گھڑی

آوے جی کون باندھے دھیر۔ احمد چاروں یار سنگ، کھیں لگاویں تیر۔

روش پروا پس آئے۔ ایک بار پلٹ کر دور سے بڑے آبا کو خدا حافظ کہا۔

بڑے آبا جو بھید میں بلائے گئے۔

دھوپ ہوا میں اڑ رہی تھی۔ ویسے قبرستان پر آخری نظر ڈالی۔ پیڑ سرسرائے۔

بھید کا آپ بن۔

باہر مرجاں مرنج جتوڑ کشا پریم دراز اس ٹھاٹھ سے آرام فرما تھے گویا صوفے پر

لیٹے ہوں۔ ایک نابینا پیر مر دلاٹھی ٹیکتے، دھوپ میں چمکتی سفید مسجد کے سامنے سے گذرے

خیال آیا شاید یہ ان حافظ جی کو جانتے ہوں جنکو ہم نے بڑے باپ کے مزار پر قرآن خوانی

کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوڑ کر انکے نزدیک پہنچے۔ ”السلام علیکم“

”علیکم السلام بھائی“

”حضرت یہاں ایک حافظ جی۔ سنہ انچاس میں ہم نے انکو اپنے بڑے باپ۔

”آپ کے بڑے باپ — راجہ صاحب دھاپنور —“

”آپ کیسے پہچانے —“

”آپ کی آواز سے پہچان گئے — ہمیں آوازیں یاد رہتی ہیں۔ آپ عبد القیوم کو پہچانتے ہیں؟“

”جی — شاید یہی نام تھا۔ لڑکے سے تھے۔“

”ہم ہی ہیں۔“

”آپ —“ دل کٹ کے رہ گیا۔

”جب سے یہیں ہیں۔“

ہم دنیا بھر کے عیب کرنے کے بعد ویسے ہی ٹانٹے، پھیلا بنے گھوم رہے ہیں۔ وہ ذوقِ نادارِ حافظ جی اس وقت ایک بوڑھے نادارِ حافظ جی۔ یہ سارا عرصہ انہوں نے اسی عیشِ باغ میں گزارا۔ وہی مسجد۔ وہی جنازے۔ وہی قبریں۔ قرآن خوانی — اور وہی پرسکون صلیت قناعت، رضا و تسلیم کی تصویر۔

ہدیہ پیش کیا کہ بڑے آبا کے مزار پر تلاوتِ کلام مجید پھر شروع کر دیں۔

لاؤ ڈاسپیکی پر اذان ہوئی۔ بخٹو بھاگے ہوئے آئے۔ ہم تینوں اوپر گئے۔ وضو کیا۔ بخٹو ہمارے برابر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف حافظ عبد القیوم۔ ہم نے نیت باندھی۔

جمعہ پڑھ کر واپس چلے۔ جی تھا کہ امنڈا آ رہا تھا۔ قلب کچھ زیادہ ہی گداز ہو چلا ہے۔ رکشا شارعِ عام پر آگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بیچ منزلہ، نئی ٹیوی، چمکتی دکتی پچی کاری سے مزین گلابی رنگ کی بلڈنگ دکھائی پڑی۔ اسکی پیشانی پہ لکھا تھا ہذا من فضل ربی۔

اہلِ پری محل کو فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کنور کے گھر جا کر لُخ کھایا۔ انڈین ایرلائنرز کے دفتر سے ٹکٹ بنا کر شام کے چھ بجے حضرت گنج والی کو ٹھہری پر پہنچے تو وہاں میلہ سالگاتھا۔ ایک کار قریب آ کر رکی، فرخندہ بیگم اور انکے شوہر برآمد ہوئے ان دونوں سے پہلے کئی بار مل چکے تھے۔

”میاں کل سے نکھنوں میں ہیں ہم اتنک حاضر نہ ہو سکے“ بیگم صاحبہ نے کہا۔
 ”ہم لوگ تو آج صبح چار بجے یہاں پہنچے کل تو میاں سینٹا پور میں تھے“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آٹھ سے نو بجے رات تک تو وہ کل شاہ مینا صاحب میں موجود تھے
 بہت سے لوگوں نے انہیں وہاں دیکھا اور ان سے ملے۔

”انہوں نے ہم پر بڑا کرم فرمایا۔ ہم آج تیسرے پہر کے میلاد شریف کے لیے بلائے
 بھیج چکے تھے عین وقت پر معلوم ہوا جن مولوی صاحب کو مدعو کیا تھا وہ نہیں آسکتے دیکھا
 ایک مولانا چلے آ رہے ہیں کہنے لگے میاں کل شام شاہ مینا صاحب میں ملے انہوں نے فرمایا
 کل میلاد شریف پڑھنے فرخندہ بیگم کے ہاں ضرور چلے جائیے گا۔“

”نہیں صاحب۔ ناممکن کل شام تو۔۔۔۔۔ میں نے دہرانا چاہا۔ دفعتاً زبان گنگ
 سی ہو گئی۔ کل رات آٹھ سے نو بجے رات تک سینٹا پور کے ان کمروں میں بجلی مدھم پڑ گئی تھی اور
 میاں دلانی میں منہ ڈھانپ کر استراحت فرما رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر زینے پر چڑھا۔ عربی باجی
 دروازے میں مل گئیں۔ ان سے کہا: ”لوگ کل شام شاہ مینا صاحب میں۔۔۔۔۔“
 ”اجانک آنا پڑا ہو گا۔“

وہ کسی کام میں مصروف آگے چلیں گئیں۔ میاں ڈرائنگ روم میں مسجد نبوی کے نگین
 فوٹو گراف کے نیچے دیوان پر تشریف رکھتے تھے۔ لکھنوی لباس جب معمول سر پہ مانگ۔ کہ
 یہ خواجگان حشت کا مسلک ہے۔ ہاتھ میں بیچوان کی نے۔ ہم بوکھلائے ہوئے جا کر ایک کونے
 میں بیٹھ گئے۔ رنجن دروازے میں نمودار ہوا۔ یہ سوچ کر فوراً اٹھے کہ اسکو یہ جیترناک واقعہ بتا دیں
 میاں نے ذرا ڈانٹ کر کہا: ”بیٹھے رہیے۔ کہاں جا رہے ہیں۔“

کچھ دیر بعد کھانے کمرے میں پہنچے۔ عربی باجی میزبان بہنوں کا ہاتھ بٹانے میں مشغول
 تھیں۔ انکو بتلایا۔ وہ سلا دینا بتاتے بناتے بولیں ”حضرت دانا گنج بخش علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے
 کہ امت کی کرامتیں جناب رسالت پناہ کا معجزہ ہیں آپ کیوں حیران ہوتے ہیں؟“

”حیران؟ ارے صاحب اکیسویں صدی آیا ہی چاہتی ہے؟“

”تو کیا اکیسویں صدی میں ہمارے نبی کی دلیلین نعوذ باللہ معدوم ہو جائیں گی؟ آپ

ابتک تشلیک کی وادی میں سرگرداں ہیں۔“

”میرا ڈیلیما ہر موڈرن مائنڈ کا ڈیلیما ہے۔“ میں نے بیاختہ ”سوئڈش“ لیڈی کے الفاظ دہرائے۔ دیوار پر لگے گھڑیاں پر نگاہ گئی۔ میں اب تک، اتنے مافوق العادت واقعات تجسم خود دیکھنے کے باوجود اس پند و لم کی طرح یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا ہوں، کیونکہ واقعی میرا موڈرن مائنڈ اپنی ہار کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ جتنا ہے ردی ہار ہے رازی۔ وغیرہ — ۹

دوسرے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک ضیعیف العمر شیریں پنڈت تشریف فرما تھے۔ ملک کے مقتدر سیاسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن سیاست سے بیگانہ اور رمز آشنائے روم و تبریز معلوم ہوتے تھے۔ وہ میاں کے فضائل و مناقب بالکل ملفوظات کی زبان میں بیان کر رہے تھے۔ ”ہمارے شیخ کو ترک و قناعت و فراغت تینوں چیزیں حاصل ہیں جو اولیائے کرام نے مردِ کامل کے لیے ضروری بتائی ہیں۔ دنیا کے اندر رہ کر بے غلٹی۔

”عارفوں کے چاند خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ارشاد ہے کہ ولی کی شناخت یہ ہے اسمیں آفتاب جیسی شفقت ہو۔ زمین جیسی نرمی۔ اور دریا جیسی فیاضی جمع نہ کرے منع نہ کرے طمع نہ کرے۔ قطب صاحبؒ سے خواجہ غریب نوازؒ نے نصیحت فرمائی تھی کہ ایسی درویشی کرو جس سے تو نگرہی ظاہر ہو۔“

میں درپچے میں جا کھڑا ہوا۔ میں خود کون ہوں۔ روح کی تاریکی میں اپنے آپ سے جنگ کرتا ہوا ایک جدید انسان۔ ہو ہو ہو۔ کس قدر بے پایاں جملہ۔

میں فیضی، بحرِ پیمیا۔ میں ثانی رے سیس۔ میں منسیریل گرانٹ۔

کمرے میں اسٹائیش بیگمات کی آمد و رفت جاری ہے۔ گودہ مائیکل اینجلو کا تذکرہ نہیں کر رہی تختِ رواں کے سین سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہونے والے خود میاں ہیں۔ سارے اتھاہ ماضی سے جانے کس قسم کا گہرا پراسرار رابطہ رکھتے ہیں اور حال میں پوری طرح سے شامل۔ ایک موڈرن مائنڈ رکھتے ہیں۔ اور قدرت نے ان کو ناقابلِ یقین

روحانی طاقتیں عطا کر رکھی ہیں۔ ”نا قابل یقین —“ میں نے با آواز بلند دہرایا۔ کنوڑیچے میں آکر بولا — ”یا تم ایک شدید قسم کے ذہنی اور روحانی کرائس سے گزر رہے ہو۔“
 ”اس اطلاع کا شکریہ۔“
 ”تم ہوم سیک ہو۔ گھر جاؤ۔“

ہم دونوں باغ میں اتر گئے۔
 ”ایک بات بتاؤ۔ تم اور رنجن اور وہ کشمیری پنڈت جی اور وہ ٹاٹ پوش وغیرہ اس قسم کے لوگ اس دیس میں کتنے ہونگے؟“
 ”تھوڑے سے۔ لیکن ہیں تو سہی۔“
 ”DYING BREED“

”شاید یہ روایت —“ کنوڑی نے ایک برڈ ہاتھ کے نزدیک بچ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا،
 ”ختم ہونے والی نہیں۔ ان گنت غیر مسلم میاں کے حلقہ ذکر میں شامل ہوتے ہیں۔“
 ہم اپنی بات پراڑے رہے۔ ”ایک ہزار سال تو یہاں صوفیوں اور سنتوں نے اپنی سی کر ڈالی لیکن آسام میں آج بھی قتل عام ہوتا ہے۔“
 ”جیزس کرائسٹ کی اُمت دو ہزار سال سے ساری دنیا میں خون کی ندیاں بہا رہی ہے۔ بدھ صٹھینی جاپانی زبردست مار کاٹ میں ہمیشہ سے جُٹا ہوا ہے۔ گوتم کی اہنسا کا اس پر کوئی اثر تو ہوا نہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہاں بھی بے شمار صوفی ایڈز آشتی کا پرچار کرتا رہے۔ لیکن تشدد اور منافرت ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا اہل اللہ کو چاہیے کہ اپنی کوششیں ترک کر دیں۔“
 ”اس قدر کریشن۔ تم خود ہی بتا رہے تھے اس روز —“

”کردار کا کرائسٹ ساری تھرڈ ورلڈ کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ — اگر میاں کے ایسے نیک بندوں کے اثر سے فرداً فرداً لوگ بہتر انسان بن جائیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بہت سے ضمیر فروش میاں کے ہاں پہنچ کر مُدھر گئے۔ ارے ہم خود دیکھتے ہیں اکثر نیا لوگ اگر میاں سے درخواست کرتے ہیں دعا فرمائیے کہ ہم منسٹر ہو جائیں۔ یا کاروبار میں ایک کروڑ کا

فائدہ ہو جائے۔ میاں انکو بہتر خیالات کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ تمہاری بولندن میں امپورٹ
امپورٹ کی بزنس ہے۔ اگر اس میں کچھ گھیلے بازی نہیں کرتے صحیح قسم کا بیوپار ہے میاں کے
فیض سے ضرورتاً کو فائدہ ہوگا تم اس روز بتلا رہے تھے کہ سہانپوری فرتیچر برطانیہ میں
امپورٹ کرنا چاہتے ہو۔“

ہم خاموش رہے۔ ایکسپورٹ امپورٹ۔ گوری پلی سانیو کالی چھو کر یوں کی درآمد برآمد۔
نہایت اسٹریج لائینڈ مہذب بردہ فروشی۔ ان لڑکیوں کی رضامندی کے ساتھ بچپن میں ہم دھانپو
میں دیکھا کرتے تھے ہماری فائدہ کش کسان عورتیں اپنی بچیوں کو سوار وسیہ اور ڈلیا بھر
کو دوں کے بدلے عمر بھر کی غلامی کے لئے بیچ جاتی تھیں۔ انکو کلمہ پڑھا کر شاعرانہ فارسی نام
رکھے جاتے تھے۔

ساری عمر وہ ہمارے ہاں چکیاں پیستی تھیں گرمیوں کی طویل دوپہروں میں تپتے
برآمدوں میں بیٹھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچتی تھیں جب ننھی نو بہار باہر ڈور کھینچتے اور ننھے لگتی
پنکھے کی رفتار دھیمی پڑ جاتی تھی ہمیں اچھی طرح یاد ہے ہم اپنے پھیر کھٹ پر لیٹے لیٹے ڈور کو
پاؤں کے انگوٹھے میں پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتے۔ پنکھے کی جنبش فوراً تیز ہو جاتی۔ سوار وسیہ
اور ڈلیا بھر کو دوں۔

اب ہم لوگ فینش ایبل، چاتر، بھولی بھالی، ہر قسم کی لڑکیوں کی خرید و فروخت ٹوکروں
پٹر وڈالز اور مارک اور فرینک اور ہر قسم کے مکہ رائج الوقت کے ذریعے کر رہے ہیں۔
بوسٹن میں ایک بار ڈاکٹر منصور کا شغری نے بتلایا تھا کہ بمبئی کے جنرل وارڈز میں کوئی
مرنے والا ہوتا ہے وارڈ بوائے ڈاکٹر کو جا کر اطلاع دیتے ہیں ۴۴ نمبر خلاص ہونا مانگتا۔
ہم لوگ بوسٹن بنکوں کے گننام اکاؤنٹس کے خفیہ نمبروں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور
شاید اب ہم بھی خلاص ہونا مانگتے ہیں۔

تیسری منزل کی کھلی چھت پر یہاں بھی رت جگا۔ سامنے کچھ فاصلے پر حضرت گنج میں
وضع جدید کا رومن کیتھولک کیتھڈرل استادہ تھا۔ اسکے فلک بوس مخروطی SPIRE پر

سرخ صلیب جنگ گاتی رہتی سیاہ نمل پر چمکتا یا قوت —

امشب ایک جمبو جٹ فراز کلیسا پر سے پرواز کرتا جہانِ اول کی سمت نکل گیا۔ تاریکی میں اسکی جلتی بجھتی سرخ بتیاں کچھ دیر تک نظر آئیں۔ اہل تثلیث، آل موسیٰ، اشتراکی ملاحدہ ہی جدید سائنس کے بانی اور ماہر۔ اب آنکھیں میری باقی انکا نہیں۔ میری آنکھیں بھی انہیں کی ہیں جن سے ہم ساری زندگی کو دیکھ رہے ہیں۔ جدید اہل ایمان کی یہ تہی دامن کی بنیاد پرست عنبر کو بھی برائے علاج ادھر ہی جانا ہے۔ ان ہی کے ایجا دکرو طیارے پر۔

حب عادت اپنے آپ سے مباحثہ کرتے ہوئے وہیں مہتابی پر بیٹھے بیٹھے ایک دور نکتہ سوچا۔ سائنس میں بھی ایک فیکٹر ایکس ہوتا ہے۔ مخدوم کی دعا سے اپنے معذور لا علاج بچے کی حالیہ صحتابی کا تذکرہ تو ایک خاتون کل ہی کر رہی تھیں۔ لہذا اپنے ذہنی تحفظات کے باوجود پچلی منزل میں جا کر کاشغری کو فون کیا۔

”منصور عنبر کی حالت کیسی ہے —؟“

”بُرمی“

”تم ایسا کرو — کہ انہیں لیکر فوراً یہاں آجاؤ“ کوٹھی کا پتہ بتایا۔

”کیا کوئی امریکن سائیکسٹرسٹ وہاں آیا ہوا ہے؟“

”نہیں ایک بہت پائے کے صاحبِ نصرتِ چشتیہ بزرگ —“

”وٹ —؟“ منصور دوسرے سرے پر دہاڑا: ”حضور والا پہلے یہ بتائیے آپ اتنے دنوں

سے کہاں غائب تھے؟ ہوٹل میں آپکو ڈھونڈا نگار خانم بنگلور سے آگئی ہیں ان سے پوچھا۔“

”بس۔ ذرا ادھر ادھر گھوم رہے تھے عنبر کو لے کر فوراً پہنچو یہ ایک بہت بڑے دلی ہیں۔“

”بھائی دشا دعلی۔ آپ کے دماغ پر بھی اس CRAZY ملک کا اثر ہو گیا؟ آپ کو کس نے

HYPNOTISE کیا؟“

”سنو تو —“

”ہوکس پوکس - مہم جو۔ دودو۔ چھو منتر، مجھے تو اب آپکے دماغی توازن کے متعلق

بھی فکر ہو گئی۔ WITCH DOCTORS اور FAITH HEALERS“

محسوس کیا کہ میں اور وہ دو بالکل متضاد زبانوں میں گفتگو کر رہے ہیں۔
 ”آپکے مزاج میں شدت تو ہمیشہ سے تھی۔ جولائن پکڑی اس میں غلو فرمایا۔ اب اس
 لائن میں اگر کچھ سکون مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ لگے رہے۔ مگر خان صاحب۔ شرک اور
 بدعت سے بچئے“

تھل کے ساتھ جواب دیا ”واقعی؟ لیکن بھائی ڈاکٹر اس روز پری محل میں تو
 تم شہوار کے سامنے لکھنؤ کے محرم کی مدح سرائی کر رہے تھے“
 ”محض اسکی تہذیبی اور تاریخی اہمیت کی حد تک۔ باقی یہ کہ ہوسن جوبن ہوکس
 پوکس — اچھا خیر۔ ایک بات بتائیے۔ میں عنبر کو باہر لے جا رہا ہوں۔ آپ ہی نے
 روزین باؤم کا ذکر کیا تھا۔ انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں؟“
 ”بچوں کے ذریعے۔ انکی لڑکی اخبار میں نورمن کے ساتھ کام کرتی ہے۔“
 برطانوی سائیکسٹرسٹ کا پتہ نوٹ کروا کے فون بند کیا۔
 انکی قسمت میں نہیں ہے۔

آج شام تخت والے کمرے میں ”سوئیڈش“ لیڈی نظر آگئیں۔ غرارہ پہنے
 فرینے سے سر ڈھانپے عورتوں کے ایک گروہ میں قالین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔
 ”ارے آپ ابھی سوئیڈن نہیں گئیں؟“
 ”چلے جائیں گے۔“

”کابجوں کے متعلق کیا ہوا؟“
 ”وہ بھی ہو جائے گا۔ میں تو یہاں روز حاضر ہوتی ہوں۔ آپ نے بھیڑ میں دیکھا نہیں۔
 ماموں جان بھی آئے ہیں۔“
 ”اچھا۔۔۔ ہیری، والے ماموں۔۔۔؟“

تھینپ گئیں۔ ”ہم لوگ ٹبلر گنج میں پھیرے ہیں۔ آپ؟ علی گنج؟ اچھا ایک بات بتائیے مجھے حیرت اس چیز پر ہے کہ اتنا اوتھنٹک جینیوین صوفی اور ویسٹ اس سے ناواقف“

”آپ کو تو ویسٹ کا سودا ہے۔ ایسٹ کے محض ایک خطے کے لوگ جان گئے ہیں تو انکو پل بھر آرام نہیں۔“

کنور رانی پر تھینچا دیوی کمرے میں آئیں۔ ہمیں دیکھ کر ہلکا سا گونگھٹ کاڑھا۔ کہ ”جیٹھ“ سے کا ناپردہ انکی سوسائٹی میں واجب ہے۔ بولیں ”میاں وزیر گنج گئے ہوئے ہیں وہاں سے سیدھے شاہ مینا“ صاحب آئیں گے۔ یہ کہہ رہے ہیں وہیں چلے چلیے۔ باجی آپ بھی“

یہ دونوں پھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ مسز خان نے کہا ”کل ایک جگہ ڈنر پر ایک ننگ چوٹی بی بی سے ملاقات ہوئی۔ وہ نکلیں۔ آل انڈیا فیم کی ناوسٹ۔ نگار خانم۔“

کنور رانی بولیں۔ ”ادہ نگار خانم۔! نواب بانی جے پور والی کی۔“

”نواب بانی؟“ مسز خان نے سبھری سے بات کاٹی۔ ”کون تھیں؟ اور بتائیے۔ اور۔“

”تھیں ایک پرانے زمانے کی گراموفون سنگر۔ پی۔ یو نووٹ آئی مین۔“

ادہ۔ پی۔ پی۔!!

دونوں خوب ہنسیں۔ کنور نے ڈرائیو کرتے کرتے مڑ کر اپنی دھرم پتی کو ڈانٹا۔

”تم عورتوں کی یہ کتنی بُری عادت ہے۔“

”ہم کوئی اپنی طرف سے تھوڑا ہی بوڑھے ہیں۔ سارا لکھنؤ جانتا ہے۔ پیپرزمیں نکل چکا ہے۔“

”اول رائٹ۔ شٹ اپ۔“

”پیپرزمیں۔ کب؟“ مسز خان نے کہا۔ ”جیہی۔ جیسے ہی وہ گئیں انکی ایک سہیلی نے بتایا آجکل بے چاری بہت دکھی ہیں۔ انکا منگیتر اڑنچھو ہو گیا۔ بھتیجی بھاگ گئی۔ گئے کی آنکھیں کمزور ہو گئیں۔!“

”کُتے کی آنکھیں کمزور ہو گئیں — جب بھی منگیتر اور بھتیجی بھاگ نکلے اپنی بیبا دیوی نے شگفتگی سے کہا۔

وہ دونوں اب کھکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ ہم دم بخود اور تب، اس لمحے دل ہی دل میں میاں سے التجا کی — آپ نے اب تک میری عیب پوشی کی ہے اب عین میری روانگی کے وقت سینڈی کے آگے میرا بھانڈا نہ پھوٹے — ہم اس نیک نفس آدمی سے آنکھیں کس طرح چار کر سکیں گے۔ میاں — پلینز — اب آنکھوں کی سوتیاں باقی رہ گئی ہیں — پلینز —

یاد آیا، نورمن نے یہاں سے واپس جا کر بنایا تھا۔ ایک رات پرسی محل میں اتفاقاً میرا ذکر نکل آیا تھا اور وہ تھر تھر کانپا تھا کہیں اس کا راز فاش نہ ہو جائے کہ وہ خالص انگریز نہیں۔ بازی گریباپ بیٹے اپنی اپنی جگہ دونوں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے۔ گو اسی اتفاقاً تذکرے کی بدولت ہم دلالت سے لکھنؤ نگار خانم کو بلیک میل کرنے پہنچے۔ محض چھ ماہ قبل آج وہ کسی اور زمانے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اب؟

منرخان کی گفتگو جاری تھی۔ ”نگار خانم نے جبراً اوساؤن جھڑی گلے میں پہن رکھی تھی۔ انکے جانے کے بعد انکی عزیز بہیلی نے یہ بھی بتایا کہ ایک خستہ حال وثیقہ دار بیگم سے کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔ ایسی خوبصورت ساؤن جھڑی رانی صاحب کہ کیا بتاؤں میری ممانی جان اور آپا دونوں انکے ناول بہت پڑھتی ہیں اسی وجہ سے میں ان سے خصوصیت سے ملی۔ بلکہ میں تو سوچ رہی تھی اپنے فوٹو فیچر کے لیے بطور ایک پاپولر انڈین دامن ناولٹ انکی ایک آدھ تصویر بھی لے لوں — ان سے کہا۔ ایک دم بھر گئیں کیسی تصویر — آپ کون ہوتی ہیں میری تصویر کھینچنے والی۔ سوری۔ فوٹو۔ نوکمنٹ — باپ رے اتنی بدماغی — اور میں دراصل ایک پی کی اولاد — تو بہ —“

”منرخان —“ کنور نے اب انہیں ڈانٹا — وہ واقعی سادھو آدمی بن چکا ہے۔

شاہ مینار روڈ پہنچے تو معلوم ہوا پاٹے نالے پر ”سیسنی“ ہو گیا۔ راستے بھر ہم دیواروں

پرچسپاں نفاق بین المسلمین کے جلسوں کے بڑے بڑے اردو پوسٹر دیکھتے آرہے تھے اب جالی دار ڈھالیں سنبھالے، بلوہ کنٹرول کرنے والی پولیس کے دستے مارچ کرتے نظر آئے۔ ”خدا خیر کرے“ کنوڑے درگاہ کے پھانگ پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ مجھے بڑی شرم

میڈیکل کالج کمپاؤنڈ میں کہا گئی۔ سلاطین شرقیہ کے لکھنؤ میں مدفون شامینا صاحب کے مزار پر عرس۔ اسی گومتی کے کنارے آباد ”شیراز ہند“ جو نیور کو دتی کے بہلول لودھی نے اجاڑا تھا۔ زوال لکھنؤ کے مرثیہ خواں ہر گلی کوچے میں موجود ہیں۔ سقوط جو نیور کے فوج گروں کو ناپید ہوئے بھی پانچ سو برس گزر گئے۔

میلے کی بھیڑ چیرتے مخدوم کے شامیانے کا رخ کیا۔ وہ دورہ ہی سے دکھلائی دے گئے۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ ناپید۔ درمیانی گزرگاہ پر چلتے انکے نزدیک پہنچے۔ ایک ٹھپے کے پاس منجھو صاحب مل گئے۔ طبیعت سے ”ٹریفک“ کنٹرول کرنے میں مشغول۔ بوئے۔ سیدھے ہال میں چلے جایئے۔

ہال کی بیرونی دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا ایک سلاخوں دار بند کھڑکی کے نیچے مسند پر سرکار تشریف فرما۔ سلام عرض کرتا چار قدم آگے بڑھا۔ ہم چاروں صحن میں داخل ہوئے۔ ہال کے پہلے دروازے پر شہر کی برقعہ پوش عورتوں کا جھگھٹ۔ سب اندر جھانکنے کی کوشش میں مصروف۔ میاں تو ابھی باہر تشریف رکھتے ہیں ممکن ہے اس دریچے میں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اسکے پٹ بھی بند ہیں۔ بدقت تمام اسی دوانے سے اندر پہنچے۔ تو میں ہیبت زدہ رہ گیا۔

میاں ہال میں اپنے تخت پر متمکن تھے۔

”سینڈی۔ سینڈی۔ میاں تو ابھی، ابھی چند سکند قبل باہر شامیانے میں۔“

”باہر۔“ میں نے تو نہیں دیکھا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا۔ کہ انکی خالی مسند کے پاس سے

گذرتے ہوئے تم نے اتنے ادب سے سلام علیکم کسے کہا تھا۔“

او ڈپکل الوژن؟ پرسوں رات کا شغری ٹیلی فون پر ہی پہچان گیا تھا۔ غبر کی طرح میرا بھی کریک اپ ہوتا جا رہا ہے۔ میں بھی ہیلوسی مینشن کا شکار ہو چکا ہوں۔ اب کس کے پاس جاؤں؟ اب میں بالکل تنہا ہوں۔

”آریو آل رایت — تمہارے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ تمہارا رنگ فق ہے۔ اور تم لرز رہے ہو۔ تم ایسے دہشت زدہ نظر آتے ہو جیسے ارجن جب مہا بھارت کے میدان میں انکے الوہی رتھ بان نے انکو اپنی لیلاد کھلائی تھی۔ اپنا سروپ“

”سینڈی۔ سینڈی۔ دراصل یہ کون ہیں؟“

”قطب الاقطاب۔ تم اب تک نہ پہچانے۔ ری لیکس۔ ٹیک اٹ ایزی یار“

چاروں طرف طایفہ مجبان کے مانوس چہرے۔ باجیاں۔ دیریاں۔ رانی صاحب فرخندہ نیگم۔ رجن۔ لوجیا۔ فنو منو لوجی کے پروفیسر۔ مسرخان۔ پرتیجھا۔ خانوادوں کی پی۔ ایچ۔ ڈی لڑکیاں۔ حضرت گنج کے میزبان۔ تہجد گدار بی بی۔ بوڑھا سنیا سی۔

نجانے کون کون۔

کیا یہ سب لوگ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں؟ یا محض اندھی عقیدت سے سرشار؟ وکٹورین انگلش بولنے والا یہ برہمن سادھو بہت دور سے پیدل چل کر حضرت گنج والی کوٹھی پر بھی آتا ہے کہ سواری استعمال کرنا شاید اسکے مسلک میں ممنوع ہے۔ اور چپ چاپ بیٹھا شیخ کو تکا کرتا ہے۔

انہوں نے اسے بلا کر اپنے پاس تخت پر بٹھالا۔ آنچرے میں دودھ منگوایا۔

تالیف قلوب۔ مروت۔ خوش خلقی۔ مہمان نوازی۔ کامل بے نفسی۔ حکایت و تمثیل کے ذریعے پند و نصائح کہ اہل طریقت اعلانیہ نصیحت کو ملامت گردانتے ہیں۔ دوسروں کی دل شکنی سے استراز۔ صوفیائے کرام کے طریق۔ مروجہ ذہنی رویوں فیصلوں اور اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے اچانک ایسے طرز عمل سے واسطہ پڑے جو گذشتہ ادوار سے تعلق رکھتا ہے۔ عشق کی تقویم میں اور زمانے حاضرین اُس تقویم

سے بھی منسلک ہیں۔ اس لیے سکون سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ کچھ دیر قبل میں نے مخا کو بیک وقت دو جگہ دیکھا اور یقیناً میں صبح الدماغ بھی ہوں۔ وہ پنڈتاہن دیوار لگی بیٹھی تھیں جو آرتی اتارے بغیر اپنے برت نہیں توڑتی تھیں۔

”سندھیا کا وقت تو ہو گیا“ میں نے نازل بات چیت کی غرض سے انکو یاد دلایا۔

”اب ہم انکی آرتی نہیں اتارتے“

”منع کر دیا؟“

”منع وہ کسی چیز کو نہیں کرتے۔ ہم نے خود بخود چھوڑ دی“

طویل القامت ”سدا سہاگن“ چھم چھم کرتی آن کر ایک دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ ایک قصباتی مسلمان گویا ڈفلی لیے اندر آیا۔ دیوہ شریف میں اس نے ایک چیز سنا لی تھی اسکے چند بول مجھ یا درہ گئے تھے۔ بھاگ جاؤ۔ گھوم جاؤ۔ ویدراج لوٹ جاؤ۔ وید میں ہنواری لال تم ہونا ڈی۔ اب اس نے تخت کے سامنے جا کر ایک کیر بانی چھڑی مکڈنی نکوڑی اندھریا میں ناچے۔

میں نے اس سے ویدراج والے گیت کی فرمائش کی۔ کہ وہ کاشغری اور رونیو نا۔ دونوں کو کس اطنان اور سادگی سے چلتا کر چکا تھا۔ اس نے دف اٹھا کر اپنا شروع کیا بھاگ جاؤ۔ گھوم جاؤ۔ میاں کو مخاطب کیا۔ ”تم ہو اودھ بہاری۔ قاسم پیر انا ڈی۔“

پچھلی بار یہ گانا سنکر سینڈی سے ہم نے کہا تھا برج اور ایو دھیا کی تلمیحات ایہ زمانوں میں نظم کی گئیں جب ان شاعروں کو اپنی شناخت اور تشخص کھودینے کا خدشہ نہ تھا۔ اور زندگی اتنی گجھلک نہیں ہوئی تھی۔ اسی ہال میں ایک غریب دستقان مسلم۔ اکڑوں میٹھی نیچی آوازیں اودھی کے کبت دہرائے جا رہی تھی جن میں سالار مسوودو اولیاء اور آخر میں میاں کے نام آتے تھے۔ وہ ان بقراطی سیمنا روں سے نا آشنا تھی اس کے بارے میں منعقد ہوتے ہیں اور جن کی موشگامیوں کے فوائد اس تک نہیں پہنچے۔

ڈفالی کے بعد ایک جواں سال مسلمان سابق راجہ صاحب نے پیر کے سامنے
دست بستہ کھڑے ہو کر ترنم میں اپنی حقانی غزل پیش کی۔
اَہ—! اردو تہذیب!!— اعلیٰ تمدن جتنے وسیع ہوتے ہیں اسی قدر دیرپا
کیوں نہیں ہو پاتے۔ گومتی کے ساحل پر بیچ تو سال قبل شیراز ہند بھی تو جگمگاتا تھا۔

باہر نیچ کا لنگر تیار ہو رہا تھا۔ قلعے سے آئے ہوئے کیڑیٹ قلندر نے صحن میں نعرہ
حیدری بلند کیا۔ لافتی اِلا علی لا سیف الا ذوالفقار۔ دولف بوائے زور سے چلایا۔
حق حق حق — آل محمد آل محمد آل محمد —

اس احاطے سے چند فرانگ پر مسلم افتراق کا پیشین پلے بھی جا رہی ہے۔
لڑکے نے اندر آ کر اپنی بے ربط تقریر شروع کر دی۔
ٹھیک ہے بھائی دولف آتے۔ تمہاری طرح میں بھی بیٹریوں کے بھٹ سے
نکلا۔ اور اب ایک مخفی زبان سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہمارا ایک مہرج کا تعلیم یافتہ بیٹا بہنراد نورمن BEATIFIC VISION کی بات

کرتا ہے۔ اس سے پچھلی نسل کے نوجوان اسی چکر میں BEAT GENERATION کہلانے لگے تھے۔ وہ ایل۔ ایس۔ ڈی کھا کر ہیڈوسی نیشن دیکھتے تھے۔ چنانچہ امریکیں ہم خفیہ
فروشنوں کی چاندی ہو گئی۔ گو سم نے کسی قسم کا فیشن ایل نٹ، بھنگ، چرس، ایل، ایس، ڈی
وغیرہ کبھی نہ چکھا۔ کہ یہ نوجوانوں کی لت ہے۔

ہماری نوٹ بک اب قریب الختم ہے۔ چند صفحات باقی رہ گئے ہیں۔ اعمال نامہ۔
اگر یہ انٹرنیٹوں کے ہاتھ لگ جائے؟

میاں جج کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ انکو رخصت کرنے کے لیے آنے والوں
کا ہجوم بڑھتا گیا۔ وسیع باغ میں خیمے نصب کیے گئے۔

کمرے مہمانوں سے بھر گئے۔ رات کو فرش پر بستر بچھائے جاتے ہیں۔ دوسرے شہروں

سے قافلے آ کر اتر رہے ہیں۔ احاطے میں دلیغیں گاڑ دی گئیں۔ درگاہ شاہ مینا صاحبہ باورچی آئے۔ لنگر جاری ہو گیا۔ ادھر کمروں میں خوبصورت امام خاٹوں اور گلاب کے بھاری ہاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔ میاں کے رشتے دار اور لواحقین گاؤں سے لکھنؤ پہنچ چکے ہیں۔ صبح سویرے باغ میں وہ سرخپوش برہمن فقیر بالنسری، بجاتا ہے ماہر فن نے نواز بہ — تر و تازہ گھاس میں بچکتی بارش کی ننھی مٹی جھیلوں کے کنارے لوگ کرسیاں ڈالے گھنٹوں منتظر رہتے ہیں۔

اس آخری شام ہم نے اپنا BEATIFIC VISION دیکھا۔

دوسری منزل کے صحن میں حسب معمول بیجاہوم تھا۔ میاں کے ایک مرید کا آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ اسے دیکھنے ہسپتال جا رہے تھے۔ نہانے کے بعد اپنے کمرے میں دروازے بند کیے عبادت میں مصروف تھے۔ پھر دروازہ کھلا وہ سفید براق کپڑے پہنے کمر میں سُرخ ٹپکا باندھے دوپٹی ڈوٹی اوڑھے شہزادے ایسے تیزی کے ساتھ کمرے سے نمودار ہوئے۔ ہم سامنے کھڑے تھے۔ ایک اچھتی سی نگاہ ہم پر ڈالی۔

اس لحظے ہم نے BEATIFIC VISION دیکھا۔

میاں بسرعت زمین اتر کر نیچے گئے۔ کار میں بیٹھے۔ ہاتھ باہر نکال کر دو انگلیوں سے "وکڑی" کا نشان بنایا اور مسکراتے ہوئے پھاٹک سے نکل گئے۔

کل صبح حج کے لئے روانہ ہوئے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر روئے اجتماعی ہسٹریا۔ اموس جانے والوں کے لئے اسپیشل بسیں چلائی گئیں۔ ایر پورٹ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ چند آدمی سیہوش ہو گئے۔ عورتیں زار و قطار آنسو بہا رہی تھیں۔ حیرت انگیز۔ مزار کی جب بند لائن سے جاتے تھے گویاں اسبطرح روتی تھیں۔ میاں کی دلشہنو بھگتنوں کو دیکھ کر ہم نے سوچا۔

آج صبح بالآخر اموسی کے لیے تیاری پکڑ رہا تھا گیسٹ روم کے دریکچے سے

بخٹو دکھلائی دیے گئے، ہینڈی کی مرسیڈیز کے نزدیک اپنی چرخ چوں رکشا کھڑی کیے صبر سے منتظر تھے۔ فوراً باہر گیا۔

”سلام حضور،“ کوری مارکین میں لپٹے دو عدد امام ضامن حبیب سے نکالے۔
 ”کل دوپہر ہم حضرت گنج گئے تھے۔ معلوم ہوا آپ آج سدھارنے والے ہیں۔ حضور جانے سے چند روز قبل بھائی حُصین بخش نے ہماری بی بی سے کہا تھا بھیا ولایت لوٹ رہے ہیں انکے لیے امام ضامن سی دیجئے۔ ایک چمکتا روپیہ گومتی میں غوطہ دیکر پاک کر لائے تھے دیہ دوسرا امام ضامن ہماری طرف سے باندھ لیجئے۔“

”شکریہ بخٹو۔“ آپ لوگوں نے بڑی زحمت کی۔ حُصینی کہاں چل دیے؟“

انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ کو نہیں معلوم؟ اسی امام ضامن کیلئے زرد دوزی کا سامان خریدنے شہر گئے۔ جمہرات کی شام۔ پائے نالے پر شیعہ سُنی شروع ہو گیا۔ بھگت پرمجی۔ جان بچانے کے لیے یہ بھی دوڑے۔ بوڑھے آدمی۔ دھان پان۔ گر پڑے۔ سر میں چوٹ آئی۔“

”پھر۔۔۔؟“

”رات کا دُخت۔“ کرفیو۔ خود ہی گرتے پڑتے رکشا کر کے ماشا پہنچے۔ سسٹر نے منصور بھیا کے گھر پہلی فون کیا۔ وہ پری محل گئے ہوئے تھے۔ دعوت میں۔ وہاں کا نمبر ملا۔ ان بے پرواہ لوگوں نے بہت دیر بعد ڈاکٹر صاحب کو خبر دی۔ وہ فوراً دوا خانے پہنچے۔ خانہ سالماں جی کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ مگر انکا ایم آچکا تھا۔ کل انکا تیجا بھی ہو گیا۔“

میں سنائے میں کھڑا امام ضامنوں کا نفیس کار چوب دیکھا کیا۔

اب بخٹو نے سفید رومال میں بندھا کٹور دان رکشائیں سے برآمد کیا۔

”ابھی ایک روز اللہ بہشت میں جگہ دے وہ مرحوم ہم سے کہنے لگے جو آپکے من بھاتے کھانے وہ جا پلانگ روڈ پر پکا یا کرتے تھے آپکے تشریف لے جانے سے قبل وہی خاص تیار کریں گے۔ کہنے لگے۔“ غنبر بیٹا بیمار۔ بیگم صاحب پریشان۔ ورنہ بھیا کو کوٹھی پر بلاتے، اب

ٹفن باسکٹ سینڈی بھیا کے بنگلے پر پہنچا دینگے۔ ہمیں انکی یہ بات یاد رہی۔ سرکار ہماری گھر والی نے وہی چیزیں پکا دی ہیں راستے کے لیے۔“ چند سکند بعد ذرا جھینپ کر بولے۔ ”ارے ہمیں پتہ ہے ہوائی جہاز میں ولایتی کھانا ملتا ہے مگر تھوڑا سا یہ بھی چکھ لیجئے گا۔ جینی بھائی مرحوم کی روح خوش ہو جاوے گی۔“ پھر سوچ کر کہا۔ ”مگر ولایت میں تو ہم نے سنا ہے بھکاری ہوتے ہی نہیں۔ امام ضامن کے روپیے کس کو دیکھے گا۔“

سب سے زیادہ حاجتمند بھکاری ہم خود ہیں۔ بھائی، بخشو۔ یہ دو مقدس سکے ہم اپنے آپ کو دینگے۔ جان کر تیشن کو اب تک کئی سلور شلنگ مل چکے ہیں۔

مبتلائے بحث کو راز خدا کی کیا خبر۔ معنی بے لفظ و لفظ بے صدا کی کیا خبر (اکبر الہ آبادی) مگر راز خدا سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ بخشو کے جانے کے بعد میں سا اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ واہ صاحب واہ۔ کیا راز خدا ہے اور کیا قدرت کا انصاف۔ میمرنگ سے آخری ملاقات کے لیے جب گیا تھا وہ تازہ اخبار میں کسی ضمنی ایکشن کی رپورٹ پڑھ رہی تھیں فرمایا۔ ایک مرتبہ حسین بخش کہہ رہے تھے بیگم صاحب ہمارے کیا اوقات کان معاملوں میں زبان کھولیں۔ مگر ووٹ بھی تو ہمیں سے مانگنے آتے ہیں۔ ہم کس کو ووٹ دیں؟ ان لڑنے لڑوانے والوں کو؟ دنگوں میں غریب ہی مارے جاتے ہیں۔ پھر پولیس۔ لیکن ٹھا کر صاحب اگر آپ نے ہندوستان کو خیر باد نہ کہا ہوتا۔“

انکی بات کاٹی۔ ”یہ کوئی اہم یا تاریخی واقعہ نہیں مگر شک میں اپنی پرانی جگہ سے حسین بخش کو میرے ہاں آنا پڑا۔ میں بھی اپنے متوسلین کو بے اسرا چھوڑ کر چلا گیا۔“

”جی اگر نہ جاتے اور سیاسی اکھاڑے میں آپ بھی بقول منصور کو دی مارتے تو یقیناً اپنے سابق علاقے اور ضلع کے بیشتر ووٹ آپ ہی کو ملتے۔ سابق والیان ریاست عام طور پر انتخاب جیت جاتے ہیں۔“

”شاید اسوجہ سے کہ اکثر نئے حکمران بہتر ثابت نہیں ہوتے۔“

”مائی باپ سنڈروم! لہذا ثابت ہوا کہ وہ پرانا نظام بہتر تھا کیونکہ کبھی کبھی آپ لوگ

پنی رعیت کے ساتھ پدرانہ شفقت بھی برتتے تھے! مینر ہاؤس اور کاٹج والا غنوار آقا
وروفادار عایا کا رشتہ! یوں تو اب آپ اگر چاہیں تو ایک انگلش کنٹری اسکوائر بھی نظر
سکتے ہیں۔“

۵۶ء میں وکٹوریہ جہاز پر وہ میرے نئے بہروپی ”کریر“ سے واقف ہو چکی تھیں۔
ٹری کہہ گئیں۔ بات ہمیشہ کٹروی کرتی ہیں۔ لیکن اکثر صحیح۔ جنوری میں جب حسین بخش مرحوم
پہلی بار دوڑے دوڑے مجھ سے ملنے ہوٹل پہنچے دیر تک باہر کھڑے رہے۔ مجھے دیکھ کر
باچھیں کھل گئیں۔ آنکھوں میں آنسو۔ میں بھی ان سے اسی ”پدرانہ سرپرستی“ سے ملاتا تھا۔
مسز بیگ حسب معمول بحث کے موڈ میں تھیں۔ چنانچہ عرض کیا ”اپنی تمام خرابیوں
کے باوجود کردار سازی فیوڈلزم کا ایک وصف تھا۔ آج کردار کی تباہی۔ ہم اپنے
نہیاں کے پرانے خدمتگاروں کو ماموں پکارتے تھے۔“

”آں۔ ہاں۔ انکل ٹام۔!“

”سن رسیدہ نوکروں اور ہندو مسلمان اہل محلہ اہل قریہ بڑے بوڑھوں کی عزت۔
کوئی دادا۔ کوئی نانا۔ کوئی چاچا۔ مذہبی تعصبات مفقود۔ کردار کی پختگی۔ ادب لحاظ۔
تمیز حفظ مراتب۔“

”حفظ مراتب! آج جمہوری عوام خصوصاً ہر بچوں کی نئی خودداری اور سیاسی شعور
لو آپ جیسے صاحبان انکی بدتمیزی اور اگر سمجھتے ہیں!“

معلوم ہوتا ہے عندیہ بیگ پیدائشی طور پر حزب مخالف سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور
بے پناہ ریڈیکل۔ مگر حسینی باورچی انکے سامنے بھی موڈ بکھڑا رہتا تھا۔ انہوں نے
اسے کرسی پر بیٹھنے کو نہ کہا۔

اچھا صاحب جنتی حسین بخش اور بھولے بھالے میاں بخٹو جو سائیکل رکشا
لیے ہنوز دم کھینچ رہے ہیں۔ الوداع!

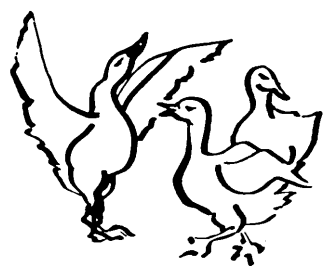
پالم انٹرنیشنل ایرپورٹ۔ ٹینو اس ریگال کے بجائے میلی المونیم کا چھوٹا سا

ناتسے دان جو میرے بڑھیا اسباب کے ساتھ رکھا عجیب لگ رہا ہے۔ ہمسفر چلتی نظروں سے کبھی مجھے دیکھ لیتے ہیں کبھی اسے۔ ذرا الزاں ہاتھوں سے ڈھکن کھولتا ہوں میری پسندیدہ چیزیں۔ جو جینی، خشکو بتلا گئے تھے۔ کروندہ قیمہ۔ کمرخ آلو۔ نرگسی کوفتے۔ نہایت رغبت سے بطور تبرک کھانا شروع کرتا ہوں۔ اچھی کیس سے ضخیم نوٹ بک نکال کر ورق گردانی کرتا جاتا ہوں۔————— تعجب ہوا عہد وسطیٰ کے صوفیائے کرام کے ملفوظات انکے مریدوں نے اسی تفصیل سے قلمبند کئے تھے۔ وہ حکایات اور فوق العادت واقعات ناقابل یقین اور مریدوں کی والہانہ عقیدت کا کرشمہ اور میڈیول ڈسن کی کارفرمائی معلوم ہوتے ہیں اس نوع کی متعدد تصانیف بڑے ابا مرحوم کی الماریوں میں موجود تھیں۔ — ترک وطن کرتے وقت مرحوم کا کتب خانہ ایک کباڑی کے ہاتھ بیچنے گئے تھے۔

اس دنیا میں ہمارے ایسے شاطر بھی موجود ہیں اور بابا بسزپوش کے ایسے بد قسمت بھی۔ وہ میاں کے ٹوٹی پھوٹی موٹروں کے کارخانے میں کیوں نہ پہنچ سکے؟ ڈاکٹر عسریں بیگ جیسی نیک لڑکی تینکے چنے لگی۔ اور ہمارا پرانی لوفری کا ساتھی مندریش نرائن سنگھ تین سال بعد ہمارے لیے خضر راہ ثابت ہوا۔ کیا مقصود ازل نے ہم سب کے لئے یہ سب پہلے سے طے کر رکھا تھا؟ ہم ٹائیٹ کلب اور CASINO سے نکلے تو ایک خانقاہ میں جا پہنچے کیا یہ بھی پہلے سے طے تھا؟

پھر میں نے سینڈی کو الوداعی خط لکھنا شروع کیا مگر اپنے الفاظ کے بجائے قلم سے بیباختہ چارلس لیب — کھیل کود کے ساتھی، مسرور بچپن کے ہمدرس اور ندیم، سب گئے۔ غایب ہوئے وہ مانوس چہرے۔ آسیب کے مانند میں ان مقامات میں گھومتا پھر جہاں لڑکپن گزارا تھا۔ زمین مجھے ایسا صحرا معلوم ہوتی مانوس شکلوں کی تلاش میں جسے عبور کرنا میرا مقدر تھا۔ میرے مونس، میرے بھائی کاش — تم نے میرے باپ کے گھر میں جنم لیا ہوتا تاکہ ان ہستیوں کا ذکر کرتے۔ کیسے کچھ معدود





(۴۶)۰

جنگلی بطخ

”گڈ ایوننگ مسز بیگ — راجہ دشا دیناں پھر غائب۔ مفقود البحر — آپ اسوقت اندھیرے اسٹوڈیو میں کیا کر رہی ہیں؟ روشنی جلا لیجئے۔“
 ”ہوں۔ ہوں۔“ — ”مسز بیگ کے سر اور ہاتھوں میں منصور نے نوٹس کیا خفیف سارے آگیا تھا۔ انھوں نے شراب کی الماری کے پٹ بھیڑے۔

تمہارے لیے ایک بلڈی میری بنادوں؟ میرے پاس وڈ کا بھی موجود ہے۔“
 ”جی نہیں۔ شکریہ۔“ انکے لرزاں ہاتھوں پر نظر ڈالی۔ انہوں نے دیکھ لیا۔
 ”موروپ میں چند کتھولک راہب اور راہبات کی ہتھیلیوں میں زخم نمودار ہو جاتے ہیں
 STIGMATA میری بلڈی ہونی ممایں گڑی میخیں میری ہتھیلیوں میں۔ بابا“

”عبر کہاں ہے؟“
 ”سورہی ہے۔ ماشا سے گھر آئے ایک ہفتہ ہونے آیا۔ زیادہ تر سویا ہی کرتی ہے۔“
 — شام سے بجلی غائب — ٹیلی فون خراب پڑا ہے بنیا باورچی بھی رفوچکر۔ بطخیں
 تک تو خاموش ہیں۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ چڑیوں کو بھی لگتا ہے سانپ سونگھ گیا۔
 — ہاں وہ دشا دیناں کی کیا خبر سنا رہے تھے؟“

”مسز بیگ — راجہ صاحب نے لندن کو خیر باد کہا۔“
 ”بہرو پیسے ہیں۔ کوئی اور سوانگ رچایا ہوگا۔“

”نورمن کا خط آیا ہے وہ لکھتا ہے سعودی عرب تشریف لے گئے ہیں۔“

”کوئی شیخ پھانس لیا ہوگا۔ ٹھہرو۔ میں ذرا موم بتیاں جلا لوں۔ تم چپ چپاتے آگئے۔“
 موٹر سائیکل کی آواز تک نہ سنی۔ میں ڈر گئی۔ بڑا ڈپرینگ وقت ہے۔ تو بہ موم بتیوں کا بندل“

دیتے۔ ہم تینوں پارٹنرز شازادہ، عنبر نس اور خاکسار کے برعکس!“
 ”تھینک یو۔“ عندلیب نے طعنے کو محسوس کر جواب دیا۔ ”اگر تمہاری ایک پارٹنر

اس طرح بیمار پڑ جائے تو تمہیں اسکا خیال نہیں کرنا چاہیے؟“
 ”میں آپکے ددھیال کی بات کر رہا ہوں۔ مائینڈ یور اون بزنس والا یورین روٹیہ
 بہر حال۔ تو نورمن لکھتا ہے کہ نور ماڈریک نے مسٹر دشا علی کی بدلی ہوئی کیفیت کا
 زیادہ نوٹس نہ لیا۔ اسبطرح کمرے بند کیے بیٹھے رہے۔

”ایک شام کھانے کی میز پر کچھ محبت رعقول واقعات کا تذکرہ کرنے لگے۔
 سامعین کو مسکراتے دیکھ کر پھر چپ سادھ لی۔ ایک دن نور ما سے کہا اپنے کاروبار سے
 دستبردار ہو جائیں۔ مسجد میں چل کر ان سے نکاح پڑھوا لیں۔ نور ما اور سیلی کو یقین
 ہو گیا کہ انکا دفاع خراب ہو چلا ہے انکو ایک منیٹل ہوم میں داخل کرنے کی فکر کی۔
 اسبطرح مسز بیگ جیسے بابا سبز پوش کی نصیحتیں سن کر انکے بھائیوں نے انکو پاگل
 مشہور کر دیا ہے۔ تب راجہ صاحب نے اپنی ساری جائیداد منقولہ وغیر منقولہ
 نور ما کے نام منتقل کر دی۔ یہ پندرہ دن کے اندر کے واقعات ہیں۔ ایک روز
 بنک جا کر فانیل کارروائی سے فارغ ہوئے ہی تھے اور کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب
 کیا کریں گے آئندہ گزراؤات کا کوئی ذریعہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ نور ما کے ہاں رہنے کو
 تیار نہ تھے۔ اتنے میں ایک عرب شیخ فغ فغ کرتا کاؤنٹر پر پہنچا۔“
 ”نورمن نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ فغ فغ کرتا۔“

”وہ انگریزی سے ناواقف تھا۔ انہوں نے فوراً اسکی ترجمانی شروع کی۔“

”موصوف عربی بھی جانتے ہیں؟“

”عربی؟ ایٹلین۔ اینیش۔ سو اعلیٰ تک تو انکو آتی ہے۔ گورے چٹے آدمی۔ امریکہ میں

تب تھے انٹرپول سے بچنے کے لیے کبھی گریٹ بن جاتے تھے۔ کبھی میکیزین یا اسپینرڈ
 بہاں مسٹر ڈی۔ اے۔ چودھری بن کر وارد ہوتے تھے۔ چودھری دھیان سنگھ آرزو
 برطانوی مندوب۔ ایا دے؟ بعد میں نگار خانم پر اصلیت ظاہر کر دی۔

”خیر تو عرب نے انکو بتایا کہ اپنے لڑکے کو اسکول میں ڈالنے آیا ہے ایک سیکرٹری کا متلاشی ہے۔ نورما کو گڈ بانی کہہ کر عرب کے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ اسنے طے شدہ معاوضے سے چوگٹی رقم عنایت کی۔ اپنے نورمن سے کہا یہ زندگی میں پہلی بار حلال کی کمائی ہے۔ جدے کا ٹکٹ خریدا۔ پہلے ہنری چک تھے حاجی قاز کی طرح اڑ گئے۔ عمرہ کرنے۔ سب کام جھٹ پٹ ہو گیا۔“

”مجھے دلی والی دنوازا کا قصہ یاد آگیا جو مانتا تھا کہ وہ بھی عمر بھر کی حرام کی کمائی بہن کے نام منتقل کر کے حج کرنے چل دی تھیں۔“ عندلیب بانو نے قہقہہ لگا کر کہا۔
 ”آپ کو یہ واقعہ حیرت انگیز نہیں معلوم ہوا؟“
 ”تمہارے اللہ میاں نے میرے قلب پر مہر لگا رکھی ہے۔“

”نورمن لکھتا ہے کہ جاتے وقت انہوں نے کہا انڈیا کے ایک MAN OF GOD کی نگاہ کرم نے قلب ماہیت کر دی۔ وہ لکھتا ہے یہ بھی ایسٹرن مسٹی سزم کا ایک کیلشن ہے۔ کسی کی نگاہ کرم کیا ہوتی ہے اور اس سے کسی کی قلب ماہیت کس طرح ہو سکتی ہے؟“
 ”ٹھیک کہتا ہے۔ یہ جواتنے بزرگوں اور GODMEN کی یہاں ریل نیل ہے اپنی نگاہ کرم سے ملک کے حالات کیوں نہیں بدل دیتے؟ نہ شیعہ سنی ہندو مسلم مارا مارا ہو نہ ہریجن زندہ جلاتے جائیں نہ دلہنیں۔ نہ لوگ بھوکوں مریں نہ کوئی بیمار پڑے۔ نہ حادثے ہوں۔ بس ایک ایک تعویذ سب نے پہنا اور سارے دلزدہ دور —
 روزین باؤم کی بات کرو۔ نورمن نے کچھ لکھا ہے؟“

”راجہ صاحب نے پہنچتے ہی وعدے کے مطابق روپین باؤم کو فون کیا تھا۔ وہ انگلستان سے باہر گیا ہوا تھا۔ نورمن نے ۲۸ اکتوبر کا اپوائنٹمنٹ لے لیا ہے۔ میں یہی بتانے اسوقت آیا ہوں۔ آپکا فون ڈیڈ تھا۔ غنبر کو جگا دیجئے۔ اور فوراً پکینگ شروع کیجئے آج ۷ اکتوبر ہے۔“

عندلیب بانو ایک شمع باتھ میں لیکر اسٹوڈیو سے غائب ہو گئیں۔
 موم بتیوں کی روشنی میں تصویریں جھلکایا کیں۔ بلجیم کے مناظر۔ سائیسین پر نرند

گومتی کی جل بہار۔ ایک مقامی بنجارن ایک اسپیش جیسی ڈانسز سبلی گارڈ کے کھنڈر
ایک تاریک کونے میں عندلیب بالوکادہ فوٹو گراف رکھا ہوا تھا جسے وہ پورٹریٹ
ان اے ناچ گرل II کہتی تھیں۔ اسکے آگے نواب فاطمہ کی سرخ پٹاری ایک اسٹول
پر موجود تھی۔ شاید ڈرائیگ روم کی صفائی کرتے ہوئے لاکر یہاں رکھ دی ہوگی یہ پٹاری
PANDORA'S BOX ثابت ہوئی تھی۔ اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے دو تصویریں
اٹھائیں جو کیوس اور برشوں کے ڈھیر میں فرش پر اوندھی پڑی تھی کٹورین گاؤں میں
ایک دیسی میم پری پیکر نیچے نام — ملکہ جان والدہ گوہر جان۔ پشت پر :

GARRICK'S STUDIO, 3, WATERLOO STREET,

CALCUTTA 1874

مزید اطلاع نیچے مرقوم تھی کہ مسز گرگت ہندو اور مسلم لیڈیز کے فوٹو انکے مکانوں پر
لینے کے لئے دو گنی رقم چارج کریں گی۔ گلاس اور فریم سمیت پورٹریٹ ۱۶ روپیہ۔
آئیل کا فوٹو پچاس روپیہ۔ دوسرا فوٹو گراف۔ ایک خوش شکل تیز طرار سیلور پوٹین لوجوان
نیچے اسٹوڈیو کا نام — JACQUES CORBIN, CHANDRGORE, 1909.

منصور چند لمحوں تک موسیو آندرے رینال کو ملاحظہ کرتا رہا — پھر ملکہ جان
ارمنی اور آندرے رینال بلجین دونوں کورنگوں اور کاغذوں کے انبار میں واپس
دفن کر دیا۔ اور دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ رام کلی کے ہاں تلسی میں دیا جل رہا تھا۔
تالاب کے کنارے بطنین پردوں میں چونچیں چھپاتے محو خواب تھیں قریب کی کوٹھی
سے مجلس کی آواز آرہی تھی۔ کہیں بانوسیس نواؤں کہاں موراٹیاں تو موبے بسا رگیو۔
میں تو دو دھن دھارے نہائے رہی۔ میں تو پوتن بھاگ سہائے رہی۔ میں تو لالک
سنگھار بنائے رہی موراٹیاں سنگار بگاڑ گیو۔ مورا اکبر لال جوان گیو۔ مورا اصغر بالک ندان
گیو۔ مورے لال سکھی انمول ہتے۔ آج شام نگر کی بجار گیو۔

منصور دروازہ کھول کر باغ میں اتر گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر نوہ سُننے لگا —
میں تو ہاتھ پار کے بھیکھ لے۔ موری پونجی جنم کی دیوندمی۔ میں تو جنگل جنگل ڈھونڈ پھری

مورے لال کا پتہ نہ نشان ملو ————— مسز بیگ جانے کہاں رہ گئیں۔ عجبز جانے کے بعد شاید باتھ روم میں ہو ————— والدہ کچن کی طرف جاتی نظر آئیں۔ اس نے سوچا پکار کر کہے کہ کافی وغیرہ کا تکلف نہ کریں لیکن پڑوس میں ایک اور دلدوز نوہ شروع ہو گیا ————— آج حسین اکیلے ہیں لٹ گئی جو مایا تھی ————— سنان کر بلا سے آواز آرہی ہے۔

کر بلا کی دھرتی پہ تھک کے سو گئے ساتھی ————— لیکن یہ رن سے کیسی ————— ایک چنچ سنائی دی ————— ”منصور ————— منصور ————— عجبز بھر نکل بھاگی“ وہ لپک کر اندر گیا۔ ”میں سرشام سے اسٹوڈیو کے دروازے بند کیے بیٹھی تھی۔ جانے کس وقت فرار ہو گئی۔ کچن۔ باغ سب دیکھ لیا ————— موٹر خانہ کھلا پڑا ہے۔“ مسز بیگ پیٹری میں تو اس باختمہ کھڑی تھیں ”میٹر دیکھو۔ میٹر۔“

”کیسا میٹر؟“

”ارے بجلی کا میٹر اور کیسا میٹر ————— سامنے کے برآمدے میں میں نے کار کی کنجیاں اسیں چھپا رکھی تھیں۔“

منصور باہر بھاگا۔ موٹر گیراج خالی پڑا تھا۔

وہ مالی کو آواز دیتا پچھانک کی طرف دوڑا۔ عندلیب بیگ ہانپتی کانپتی اس کے پیچھے۔

رام سروپ مالی باغ کے نل پر بیٹھا انگوچھا چھانٹ رہا تھا۔ وہ تینوں روربنگ روڈ پر پہنچے۔ ”اس کیمخت شہر میں ٹیکسی بھی تو نہیں ملتی“ عندلیب بانو نے جھڑ جھڑی آواز میں فریاد کی سٹرک پر ٹریفک کم ہو چلا تھا۔ روشنیاں مضحل۔ راہگیر سیاہ پوش۔ برابر والی کوٹھی میں نوہ خوانی جاری تھی۔ منصور نے مالی کو دوسری سمت دوڑایا خود پلووار پر سے گذرتی موٹروں کو دیکھنے لگا۔ ہر سبز ایمبیڈر کو تاکتا مگر وہ زن سے آگے نکل جاتی۔ پندرہ منٹ گذر گئے۔ ”میں شاردا کے ہاں جاتا ہوں ————— ذرا کوئی خالی رکشا روکیے۔“ سب بھری ہوئی جارہی تھیں۔ چند منٹ بعد رات کی دھند میں ایک رکشا نمودار ہوئی ایک خاتون شال سے سیاہ سر ڈھانپے اس پر بیٹھی تھیں تجھو کی صورت نظر آئی۔ اس کے بعد عجبز۔

وہ حمرولی کالی چادر میں ہاتھ چھپاتے بھٹی بھٹی متوحش نکلا ہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ تیوری پر بل ڈالے گویا مایوسیا کی مریض خلا میں پوشیدہ الفاظ پڑھنے کی کوشش میں مصروف۔ ناک کی سیدھ میں ٹککی باندھے۔ دایاں ہاتھ دایں آنکھ پر رکھتی پھر بائیں ہاتھ بائیں پر۔ گویا کوئی آنکھوں کا ڈاکٹر مختلف قسم کے شیشے لگا کر اسکی بینائی ٹسٹ کر رہا ہو۔ منصور اور مسز بیگ اسکی طرف دوڑے۔ عنبر نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ ساری میں چھپالیے۔ شال کا ایک کونہ خون میں تر ہوتا تھا۔ ہاتھ خون آلود۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ آنکھیں خون آلود۔ ہاتھوں میں زخم۔ ڈرپ۔ ڈرپ۔ ڈرپ۔ اشک خونیں ہیں بھرے۔

اشک خونیں ہیں بھرے۔ دیدہ خونبار میں۔ دفعتاً اس نے زور زور سے نوحہ و ماتم شروع کر دیا۔ آئے ہیں پُر سے کوہم۔ آئے ہیں پُر سے کوہم۔ آپکی سرکار میں رکشا پر بیٹھی بیٹھی ماتم کرتی وہ بڑی غضبناک معلوم ہوئی۔ گویا شیر بہ سوار درگا۔ اشک خونیں ہیں بھرے۔ دیدہ خونبار میں۔ آئے ہیں پُر سے کوہم۔ آپکی سرکار میں۔ حسین حسین حسین حسین حسین حسین حسین۔

بخشو کھٹھی کے پھاٹک میں مٹھے۔ عنبر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر منصور نے اسے خاموش کرنا چاہا۔ عنبر نے زور سے اسکا بازو جھٹک دیا۔ اور ماتم میں مصروف رہی۔ دفعتاً وہ چپ ہو گئی۔ چند لمحوں بعد آہستہ سے بولی۔ ”مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں“

منصور رکشا کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ مسز بیگ ہانپتی کانپتی پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ برآمدے کے سامنے رک کر بخشو نے کہا: ”بیٹا۔ اتر یہ۔“

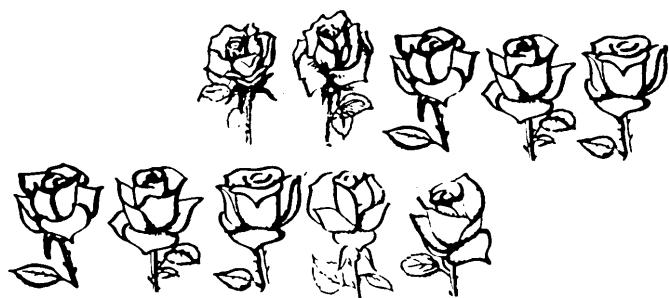
وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بخشو منصور کو ایک طرف لے گئے۔ جلدی جلدی بولے۔ ”بھیا۔“ مولا نے کرم کر دیا۔ ورنہ غضب ہو جاتا۔ ہم گھر واپس جا رہے تھے دیکھا بیٹا وہ جو اسٹڈیم کا نیلا پیلا پھانک ہے اس سے گاڑی ٹکرانے میں جٹی ہیں۔ ایک د

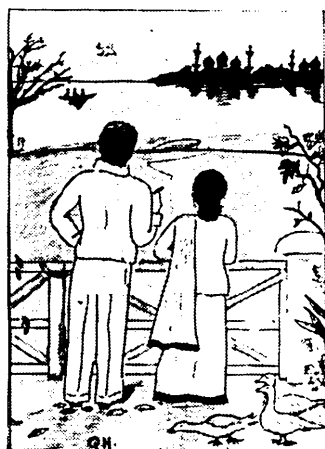
راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہم ترنت پہنچے۔ بیٹا چلائے جا رہی تھیں یہ پھاٹک یہاں فٹ نہیں بیٹھتا میں اسکو تہس نہس کر ڈالوں گی۔ تیسری بار دھکا مارا تو پھاٹک کیا ٹوٹا گاڑی کے لمب چکنا چور۔ کھڑکی کا کانسج بھی ٹوٹ گیا بیٹا کو زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ ہاتھوں میں شیشے چھ گئے۔

عندلیب بانور کشا کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ اور وحشت زدہ نگاہوں سے کبھی ڈاکٹر کو دیکھتی تھیں کبھی بیٹی کو۔ انکا سر ہلنے لگا تھا۔ جیسے وہ — سفید بالوں والی ایک گڑیا ہوتی ہے ذرا سا ٹھوکا لگا دیا پھونک مارا تو دیر تک اسکی مُنڈیا ہلتی رہتی ہے۔ — یک بیک وہ ایک سوراہ ضیعفہ معلوم ہو رہی تھیں تنہا۔ لاچار سمنز رائل ہونے کے بعد رائیڈر ہیگس ڈکی SHE — منصور بھاگ کر گیلری میں سے فرسٹ ایڈ کا بکس اٹھا لایا ناخات اماں اور رام سر روپ پھاٹک میں داخل ہوئے۔ رام کلی رکشا کے پاس کھڑی عنبر کو انر نے کیلتے پچکار رہی تھی پھر اسنے کہا: ”دیارے۔ بیٹا تو جاو پتھر کی مورتی ہوئے گئیں۔“

”منصور“ مسربیک نے فریاد کی ”یہ تو ماشا سے بھلی جنگی ہو کر لونی تھی۔ نہیں؟ اب یہ کبھی اچھی نہیں ہوگی؟“
 ”نیم — ہم لوگ فوراً سے پیشتر لندن جا رہے ہیں نا۔ آپ سب ملکر اسے رکشا سے اتارنے کی ترکیب کیجئے۔ مجھے تو اس نے ابھی بڑے زور کا دھکا دیا۔“ منصور نے ذرا تاسف سے اپنے بڑھیا امریکن کوٹ کی آستین پر رنگاہ ڈالی جس پر عنبریں کے خون آلود پنچے کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔

اکبر علی اور رام سر روپ گھبرائے ہوئے پہنچے۔ رام کلی پانی کا جگ اور چلمی لیکر حاضر ہوئی۔ عنبرین نے اپنے چاروں طرف لگے مجمع کو گھور کر دیکھا۔ پھر ریڈیڈنستی نظریں جمائیں اور اپنی پوری طاقت سے چیخی — ”ہے ہے“





(۴۷)

دریائے نما

سنہرا اکتوبر گلِ عجائب کھلنے کا موسم ہے۔ اس کے شگوفے صبح سویرے گلانی، دوپہر کو
سپید، شام کو ارغوانی ہو جاتے ہیں۔ گلِ عجائب۔

وہ دونوں پھانک پر کھنیاں ٹیکے ندی کی سیر کر رہے تھے۔ آبی رنگ کی ساری میں
لبوس ایک خاتون بہت دور ڈھال پر سے آتی دکھلائی دیں۔

”مسٹر جوردن — ابوننگ واک کے لئے آج دیر میں نکلیں“

”مسٹر جوردن کا انتقال ہو گیا منصور۔ یہ تو امی ہیں۔ بیلی گارڈ گئی ہوگی۔ ہاتھ کا پنے لگا ہے
مگر اسکیچ بنانے میں جٹی رہتی ہیں“

وہ ان کے نزدیک پہنچیں۔ منہ اٹھا کر مسکرائیں۔ جس طرح آسمان پر سے گزرتے
پرندوں کو دیکھ کر مسرور ہوتی تھیں۔ آنکھیں چندھیا کر بولیں ”اوہو — لون ریخبر اور گرل
فرنیڈ — گھوڑے کھونٹے سے باندھ کر ڈوبتے سورج کا نظارہ — آخری سین“
”جی ہاں آخری سین۔ لون ریخبر — گٹار بجاتے ہوئے شفق میں غائب —“ منصور
نے شگفتگی سے جواب دیا۔

عندلیب بانو چند قدم آگے جا کر آم کے درخت کے نیچے رک گئیں۔ ڈالی پر ایک زرد رنگ
کی چڑیا بیٹھی تھی۔ سنہری زنجیر والی عینک لگا کر اسے دیکھا۔ ”لو برڈ۔ انگریزی میں — فارسی میں
اسے سرخ عشق کہتے ہیں۔ جب خوش ہوتا ہے خوب چھپاتا ہے ورنہ چپ رہتا ہے“ وہ بغیر توش
سر جھکاتے تیز تیز قدم اٹھاتی تو کٹھن کی طرف چلی گئیں۔

”امی نے اس مرتبہ لندن میں بے شمار فلم دیکھے کا ڈولوائے پکچرز تک نہیں چھوڑیں۔ پب

سے نکلتیں تو سینما ہال میں جا بیٹھتیں۔ وہاں سے واپس آکر پھر پ میں — منصور امی الکحلک ہوتی جا رہی ہیں۔“

”معلوم ہے۔ آؤ کچھ خوشگوار باتیں کریں۔ اس مکان کا نام سوچو۔ اب تک بے نام پڑا ہے۔“

”امبیکا بھول“

”خدا کی پناہ۔ پھر وہی وظیفہ شروع ہو گیا۔“

”الکحلک ماں۔ اور نیورونک بیٹی۔ کہاں تک جھیلو گے۔ عاجز آکر بھاگ جانا چاہتے ہو۔“

لیکن اب تمہارا فرار بہادری سے برداشت کر لوں گی۔“

”نام تو سوچو یا جب بھاگوں گا دیکھا جائے گا۔ دریا نما ہی رکھ لو۔ پہلے بھی کہا تھا۔“

”دریا نما۔ قطب نما — نہیں بھتی۔ چوبے نا۔“

”اچھا — اور سوچتے ہیں۔“

”لندن برج از فالنگ ڈاؤن۔ فالنگ ڈاؤن فالنگ ڈاؤن مائی فیر لیڈی —“

”یکوں یاد آیا؟“

”ایک بار کہا نہیں تھا جھلکیاں بہت سی ہیں آدمی ایک۔ جھانکیاں۔ تخت رواں۔ روشن۔“

”چوکیاں۔ جل بہار کے بھرے۔ سب پانگ شو۔ سب ایک دوسرے میں مدغم — جیسے —“

”یو جین پیٹرسن اور انڈا دیوی —!“

”ہاں۔ مرزا دلدار علی برلاس اور نواب فاطمہ اور آندرے رینال اور غنڈلیب بالو —“

”ارے پتہ ہے — شمو کی بیٹی یعنی مہر و خالہ کی نواسی چھوٹا ہے بمبئی میں موجود ہیں۔ بوڑھی پوئم۔“

”سینا نیل ہو گئی ہیں۔ اور بہری پٹ ایک پڑ پوتے کے ساتھ رہتی ہیں جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔“

”ریو الونگ اسٹیج —! چھایا ناٹک!!“

”ٹھا کر ہیشورنگھ۔ امبا پر شاؤسکو حرمین۔ فلو مینا۔ بابا سبر پوش —!“

”راجہ دلشاہ علی خان آف دھان پور۔“

”جولار وند سے اتر کر نکل بھاگے!“

”کوئی شخص کھیتا برا نہیں۔“

”ہاں۔ بطور ایفیس بھی تو کہا جاتا ہے ہارٹ آف گولڈ کی مالک ہوتی ہیں۔ نور ماڈریک کو دیکھو۔
 سال بھر ہم لوگوں کی کیسی مہمانداری کی۔“

”دبا کر پیسے بھی تو وصول کیے تم سے۔ بطور لینڈ لیدی۔“

”چلو خیر۔ امی نے ایک مرتبہ کہا تھا نا فیصلوں میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا پتہ
 نگار خانم کے اندر بھی کوئی پوشیدہ خوبیاں موجود ہوں۔“

”ہم ان خوبیوں کے نمود کا صبر سے انتظار کریں گے۔“

”وہ بیچ اینڈ جوڈی شو یا دے انگلینڈ کے دیہاتی میلے والا۔ اور ڈاربی اور جون۔“

”ہاں۔ گلابوشتا بو۔“

”مسٹر ہری مایا بھٹناگر۔“

”تم جن چیزوں کو بھولنا چاہتی ہو ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرو۔“

”دس مہینے تک روزین باؤم بھی یہی رٹا کیا۔ کوئی نیا نسخہ باندھو یا۔“

”نہیں کچھ بھی یاد۔ یوں ہی بامراد۔ یوں ہی شاد شاد۔ گویا رہے گی برسوں
 پھولی ہوئی ہے برسوں۔ گویا رہے گی برسوں۔“

”یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ گویا رہے گی برسوں۔ کہاں ہے پچھلے برسوں کی بزنس۔
 اور پچھلی بزنس کی برسوں۔“

”عبدالرحمن کا بلی۔ شیخ افتخار الرسول۔ گوہر جان اف کلکتہ۔“

”حسین جمیل اینڈ ریٹیل۔ مصنوعی دانتوں والی ایک رعشہ زدہ مضحکہ خیز سی اینگلو انڈین
 بڑھیا۔ امی بہت لڑیں زندگی سے۔ اب تھک ہاں گئیں۔“

”اسوقت تم بہت سیڈ ہو رہی ہو۔“

”کیا۔“

”ایک روز میں نگار خانم کے ہاں گیا۔ ایسے ہی گودھولے کے وقت۔ وہ دریچے میں بڑا
 رومینٹک پوز بنائے کھڑی تھیں کہنے لگیں اسوقت ہم بہت سیڈ ہو رہے ہیں۔“

”نگارو شہوار کا بار بار ذکر کر کے میرا نفسیاتی علاج جاری رکھنا چاہتے ہو۔“

منصور۔ ایک بات سنو۔ مردہ خانوں میں رکھی لاشیں جیسے دھرنا دیدیں۔

”لاشوں کا یہاں کیا ذکر ہے؟“

”منوں وزنی ہو جائیں۔ تاکہ انکو اٹھایا نہ جاسکے۔ یا سب کھڑے ہو کر زندگی کا مطالبہ کر سکیں۔ میں نہیں بخش سب سے آگے نواب فاطمہ۔ چہرہ گیسر سے مسخ او کیسجن ٹنٹ کا گھونٹ۔ ناک میں کیسجن کی نلیوں کا بلاق۔ پانی پانی ہوتی بے نور آنکھیں۔ بیہوشی میں بار بار امی کو پکارتی تھیں۔ یا آبا۔ آبا۔ چلاتی تھیں۔ لیکن امی کھڑکی کے پاس کھڑی رہیں۔ فلومینا نے کہا اینڈی بابا۔ بابا کے پاس جاؤ۔ تب گئیں۔ آہستہ سے کہا ماما۔ تب نانی کی بے نور تیلیوں میں اچانک خبیث اشک لگی تھی۔ پھر آنکھیں پتھر گئیں۔ اتنے میں مولوی صاحب نازل ہوئے۔ امی انکے پیچھے دوڑیں۔ اور گرینی ختم۔“

”غیر۔ اتنی پرانی بات ہے۔ روکیوں رہی ہو۔ اب تو سب ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے؟ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ منصور۔“

”عمبر۔ چیراپ۔ اس طرح دونوں وقت ملتے رویا نہیں کرتے۔ ہنسو۔ ہنسو بھی رشا باش۔ اپنے باغ کو دیکھو اور آسمان کا نظارہ کرو۔ موج گل۔ موج صبا۔ موج شفق۔“

”موج شراب۔“

”نام جنلمین۔ بھاگو۔ مجھے امی کے ساتھ ایک اہم مشن پر جانا ہے۔“

”کہاں۔؟“

”کل بتاؤں گی۔ کلنگ میں۔“

”کچھ اتہ پتہ۔“

”اس مشن کی وضاحت کے لیے لفظ معلوم نہیں۔ وہ کیا نظم تم نے ایک بار سنا آتی تھی؟“

”اوہ۔۔۔ میں مشرقی جنگلے پر کھڑا کاہلی سے گل داؤدی توڑتا ہوں۔“

امن سے جنوبی پہاڑوں کو نکلتا ہوں۔

ڈوبتی روشنی میں ہوا خوشگوار ہے۔

آوارہ پرندوں کے جوڑے اڑتے جارہے ہیں۔

ان باتوں میں کچھ گہرے معنی موجو ہیں۔

میں اسکا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

مگر اچانک وہ الفاظ بھول گیا۔

منصور مجھے الفاظ واضح یاد نہیں رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ الفاظ دفعتاً غائب ہو جائیں یا انکے معانی بدل جائیں تو کیسا لگتا ہے۔ یاد ماغ اچانک کام کرنا چھوڑ دے۔ ”بڑے آدمیوں کے دماغ اتھل پھل ہو جاتے ہیں تب بھی انکو نارمل سمجھا جاتا ہے وہ ملکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اعلان جنگ کرتے ہیں۔ دنیا کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔“

”اب کس کا بیڑا غرق ہو رہا ہے بھتی۔“ مسٹر بیگ نے باہر آکر مرمت شدہ ہری ایمبیسڈر میں بیٹھتے ہوئے آواز دی۔ پھر اتر کر اندر چلی گئیں۔ شاید کوئی چیز بھول گئیں تھیں۔

”یہ ایک مرتبہ تم نے کیا کہا تھا۔ باغ نہیں آؤ غنبریں۔!“

COME INTO THE GARDEN MAUD.

”مغرب کے وقت باغ میں چڑیاں پکار رہی ہیں۔ مَوڈ۔ مَوڈ۔ مَوڈ۔ میں گیٹ پر تنہا ہوں۔ دُودُ بایں اور گلاب کی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”اُدھو۔ تم تو اچانک نہایت با اخلاق ہو گئیں! کیا بات ہے۔“

”اس نظم کا اگلا حصہ میں سناتی ہوں اخلاق کی وجہ۔“

MY LIFE HAS CREPT SO LONG ON A

BROKEN WING

THRO' CELLS OF MADNESS, HAUNTS

OF HORROR AND FEAR

THAT I COME TO BE GRATEFUL AT

LAST FOR A LITTLE THING

منصور خاموش رہا۔ افسردگی کے ساتھ سٹرک کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”تم نے جب وہ نظم سنائی تھی میں نے امی کی کتابوں میں سے ٹینیسن نکال کر ساری پڑھ
 ڈالی۔“

”اوہ۔“
 ”اسے پڑھ کر مجھے کلکتے کے کسی اداس گارڈن ہاؤس میں تباؤں کے نیچے بیٹھی جھال بردار
 بلاؤز اور وکٹورین سایہ پہنے کسی اداس تنہا لڑکی کا خیال آیا۔ یونواٹ آئی رین۔
 منصور۔ کیا میں اپنے آپ کو تمہیں سمجھا پائی ہوں۔“
 ”یس مائی ڈیر۔“

”اچھا۔“ اس نے یکلخت بڑی طہایت اور خوشی کے ساتھ کہا۔ ”اب تم اپنی موبائیک پر
 بیٹھو۔ اور آگے آگے جاؤ بطور پائیلٹ۔“
 ”کہاں تلک۔“
 ”چھتر منزل۔“

مسٹر غنایب بیگ باہر آکر پھر کار میں بیٹھ گئیں۔ ہارن بجایا۔

”مشن خفیہ ہے۔ میں اور امی ایک ایسی جگہ کا قصد رکھتے ہیں جہاں جانے کو تم منع
 کرو گے۔“

اچھا تو میں کلب کی طرف نکل جاؤں گا۔
 ”شیور۔ HAVE FUN۔ گڈ نائٹ۔“
 ”گڈ نائٹ عنبر۔ بیو اے نائیس ٹائم۔“

(۴۸)

پانیوں پہ بہتی موسیقی

ہلکے سبز غرارے کے جوڑا، زمرہ کے گوشوارے شہوار خانم حسب معمول نہایت پرکشش اور گلیمس معلوم ہو رہی تھیں۔ سیٹر ڈے نارٹ — کلب جانے کے لئے برآمدے میں تیار کھڑی تھیں۔ برساتی میں بیگ — ماں بیٹیوں کی کار آن کر رکی — فوراً ٹوٹ گیا کہ دونوں نے پیرس کے تازہ ترین فیشن کے کوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ انہیں اپنے یہاں آنا دیکھ کر متعجب ہوئیں۔ لیکن خواتین کی ایک دوسرے کے خلاف کولڈ وار کے اصولوں کے تحت آگے بڑھ کر بڑے ہی خلیق لہجے میں بولیں: ”اوہ — ہلو — آداب عرض۔ آپ کہاں۔ آئیے۔ آئیے۔ مزاج شریف۔“

عندلیب بانوا اور عنبر اسی منافقانہ انداز سے مسکراتی برآمدے کی مرمریں سیڑھیاں چڑھیں۔ شہوار نے انکو اندر لے جاتے ہوئے کہا: ”سناتھا آپ لوگ باہر گئی ہوتی تھیں۔ آپ کی ڈاکٹر صاحب طبیعت ناساز تھی۔ مجھے تو معلوم کر کر کے بڑی فکر ہوئی۔ باجی سے کہا بھی آپ کی عبادت کرائیں۔ پتہ چلا آپ لندن جا چکی ہیں۔ ہم لوگ بھی اس سال زیادہ تر باہر ہی رہے۔ کچھ عرصہ یورپ میں گزارا باقی بنگلور۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟“

”بہتر ہوں۔ شکریہ۔ ڈاکٹر لوگ زیادہ عرصے تک صاحب فرمائش نہیں رہ پاتے۔ اپنے مریضوں کی خاطر انہیں دیر یا سویرا چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ تین ماہ کے لئے کئی تھیں وہاں علاج معالجے میں پورے دس مہینے لگ گئے۔“

”جی — جی —“ شہوار نے سر ہلایا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر قبلائی بھاؤ بھونکا۔ ”فرنیچر کو بلائی کھان — فرنیچر — کیپ کو ایٹ — آئیے۔ باجی نیچے ہی ہیں۔ انکی طبیعت بھی خراب چلی جاتی ہے۔ منصور نے نئی دوائیں شروع کر دادی ہیں۔ گیلبری کے سرے

پر پہنچیں۔ لکھنؤ میں تو ابھی سردی نہیں پڑی آپ نے کوٹ پہن رکھے ہیں! یہ پیر کا ڈین تو نہیں ہیں۔ سبستی اندر جا کر دروازہ کھولو۔ پیر کا ڈین تو علیحدہ پہچان لیے جاتے ہیں۔ میرے پاس تو ایو سینٹ لارنٹ کے بھی بے شمار کوٹ ہیں۔ اس سال بیرس سے کچھ نہیں خریدا۔ ایئر فورس لاسٹ میں اور بجیا چند سینٹ لارنٹ اور کارڈین لے آئے تھے۔“

”ایس تو ریں اور پیخ کا غدیس۔“ عنبر نے فوراً نہایت اخلاق سے تلفظ کی تصحیح کی۔ ”یہ لائیٹ کوٹ ہم نے اس لیے پہن رکھے ہیں کہ لکھنؤ میں گلابی جاڑے تو شروع ہو چکے اور ہم دونوں زکام میں مبتلا ہیں۔“

مہری نے دروازہ کھولا۔ وہ تینوں آبشار والے کمرے میں داخل ہوئیں۔ یکسر ہنگام بیٹیوں نے پہلی بار دیکھا اور متحیر نظر آئیں۔ شہوار نے انکے استعجاب کو رشک و تحسین پر محمول کیا۔

نگار خانم مصنوعی جھرنے کے سامنے بلوڑیں صوفے پر نیم دراز نئے ناول کے پروف دیکھ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھائی۔ نو واردوں کو دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئیں۔

”آئیے۔ آئیے۔ آئیے۔ آداب عرض کیسے آنا ہوا۔ سنا ہے آپ کا تو۔“

”جی ہاں۔ دماغ چل گیا تھا۔ انگلستان گئی تھی۔ پچھلے سال اکتوبر میں۔ بغرض علاج ابھی واپس آئی ہوں۔ چند روز قبل بہتر ہوں۔“

”تشریف رکھیے۔ کیا پیسے کی؟ کافی۔ چاء۔ سبستی۔“

وہ دونوں دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ سوشل گفتگو شروع ہوئی۔ نگار خانم نے عنبر کا ناقدانہ جائزہ لیکر بڑی رس بھری آوازیں کہا: ”انگلستان کی آب و ہوائ آپ کی صحت پر بہت اچھا اثر کیا۔ ماشا اللہ۔ اپنی عمر سے دس سال کم لگ رہی ہیں۔ ہیرا سٹائل بدلوا لیجئے۔“

شہوار اکی بار وہاں میرے پیچھے پڑی کہ بال کٹوا لوں میں نے کہا بھیا اپنا اولڈ فیشن جوڑا ہی بھلا۔ مگر آپ۔۔۔ اکی بار آپ لندن جائیں تو ایک پتہ دوں گی۔

”ایک ہیئر ڈریسر ہے۔ ایسا ہنگام بھی نہیں ہے مگر ایسے ہیرا سٹائل بناتا ہے کہ ہر طرح کے چہرے کو سوٹ کرتے ہیں۔ اور ڈائی کے بجائے مہندی بہتر رہتی ہے۔“

”ضرور — ضرور“ — غبر نے جواب دیا اب اسکی باری تھی۔ نہایت گرجوشی سے دریافت کیا: ”یہ آپ کا کون سا ناول ہے؟“

”چھٹی سو ال“ —

”ماشا اللہ۔ عنوان کیا رکھا ہے؟“

”ابھی کچھ سوچا نہیں“

”منزل کہاں ہے تیری؟ — رکھ لیجے یا — آئے بھی وہ گئے بھی وہ“

”ہم لوگ آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں“ عندلیب بانو نے دند و سیٹ پر جا کر بیٹھتے ہوئے بات شروع کی۔ ”حالانکہ آپ ہم جیسوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں لیکن مجبوری“

”بھگلو بھگلو کے — بھگلو بھگلو کے —“ درپچے کے باہر سے ایک باریک سی آواز آئی۔

حب معمول خواجہ سبز پوش گملوں میں چھپے کن سوتیاں لے رہے تھے۔ منصور نے سال گذشتہ شاگرد پیشے میں اس عجیب و غریب ملاقات کے بعد عندلیب بیگ کو ان بے چارے کی اس المناک عادت کے متعلق بتایا تھا۔ آواز سے دھیان ہٹا کر عندلیب بانو نے ایوان نشست کا جائزہ لیا جسکا تذکرہ منصور سے اننا سن رکھا تھا۔

نینگلوں مصنوعی آبشار کے اوپر پہاڑی نما میٹل میس پر صندل اور تانبے کی چندورتیاں رکھی تھیں جو ظاہر تھا کہ اس بار دونوں بہنیں میسور سے خرید لائی تھیں۔ سب سے اونچی چوٹی خالی پڑی تھی جس پر منصور نے بتایا تھا کہ نواب بیگم کا کیمبو سجا رہتا تھا

خالی جگہ دیکھ کر عندلیب بانو دھک سے رہ گئیں۔ نگار خانم کو مخاطب کیا — ”دیکھتے وہ — ایسا ہے کہ — وہ مختصر تصویر کی وجہ سے پچھلے سال وہ سارا غدر مچا اسے واپس کر دیں تو ممنون ہوں گی۔“

”اس تصویر سے آپ کا کیا تعلق تھا؟“

”آپکا تجاہل عارفانہ قابلِ داد ہے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ وہ کیمبو چڑایا گیا تھا اور آپ مال مسروقہ کی خریدار تھیں۔ گو آپ لاعلم تھیں۔ ہم دنیا کے بہت سے معاملات کے متعلق غلط باتیں کرتے ہیں غلط ایجنج غلط نظریے قائم کرتے ہیں — کیونکہ ہم بیخبر ہیں۔“

اب تو آپ جان گئی ہیں۔ وہ تصویر واپس کر دیجئے۔ اور وہ بڑا پور ٹریٹ بھی جو مارواڑی اپنے ساتھ جے پور سے لا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور تفصیل بتاؤں۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

PORTRAIT OF A NAUTCH GIRL

—BY ANDRE RENAL—

CHANDRANA GORE—

1911

”ادھو۔ آپ کو خوب ازبر ہے۔ وہ کس طرح؟ تو عرض یہ ہے کہ وہ کمیو تو منجھے بھیانے اسی رات کو ٹرے میں ڈال دیا تھا۔ اور وہ بڑا فوٹو بلیک میلر مارواڑی لائے تھے اسکے تو بڑے بھیانے پر نیچے اڑا دیے ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر سڑک پر پھینکوا دیا۔ بلیک میلنگ کی یہی سزا ہے۔“

عندلیب بانو ششدر رہ گئیں۔ ”میری ماں کی تصویریں رڈی میں پھینکنے کا حق آپ کو کس نے دیا۔۔۔۔۔؟“
 ”لاعلیٰ نے۔۔۔۔۔“
 ”ڈھونڈیے۔ شاید وہ کمیو مل جائے۔“

”اب کہاں ملے گا۔ ڈیڑھ سال پرانی بات ہے۔ ہمارے ہاں صبح شام صفائی ہوتی ہے۔ وکیوم کلیئر سے الگ اور جھاڑو سے الگ۔“

اتنے جوتے کھا کر بھی نگار خانم کے دماغ کا خناس نہیں گیا۔ بہت ہی بدعورت ہے۔ عندلیب بانو نے کھولتے ہوئے سوچا۔ ترشی سے بولیں۔ ”مجھے معلوم ہے جمعدار دل کی پلٹن آپکے گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرتی ہے۔ اسکے علاوہ آپکے ہاں کا ڈرنیٹن بھی سبلک میں دھلتا ہے۔“

”شاباش۔۔۔۔۔“ درپچے کے نیچے سے آواز آئی۔

”شاید آپ کو یاد ہو۔ آپکے مینٹل بیس پر وہ کمیو سجا دیکھ کر اسوقت تو ڈاکٹر منصور چیپ رہے۔“

لیکن جب رسالے کے خاص نمبر میں اسکا بلاک چھپا تو انہوں نے آپ دونوں بہنوں سے کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر ریگ کے ہاں کی تصویر ہے۔ انکے نیپالی ملازم نے چڑا کر نتاس میں فروخت کی اور وہاں سے آپ خرید لائیں۔ آپ نے بیڑھی سے دوبارہ وہی جواب دیا کہ یہ آپکی دادی حضرت کی شبیہ مبارک ہے۔ بطور ثبوت آپ نے اسکی نشت پر لکھے فرضی خطابات وغیرہ بھی دکھائے۔

— اے چند روز بعد ہی آپکے ہاں وہ ہنگامہ خیز تقریب منعقد ہوئی۔

”اسوقت آپ نے ایٹج پراگر کیوں نہ ثابت کیا کہ یہ آپکی ماں کی تصویر ہے؟“

”کیا ضرورت تھی؟ آپکے شاہی نوابی سبوروں کے سلسلے میں ہم بولنے والے کون؟ ہم نے سوچا کیا پتہ نواب بیگم نے کچھ عرصے کے لئے کسی رئیس پر دھان پور سے نکاح یا شہ کر لیا ہو یا یونہی انکے حرم میں داخل ہو گئی ہوں لیکن کوئے بکنی نہ بننا چاہتی ہوں اور آپکے ابا جان کی ولادت کے بعد پھر بازار میں جا بیٹھی ہوں۔“

ہنگار و شہوار کے چہرے سرخ ہو گئے پیچ و تاب کھایا کیں۔ مگر بولنے کی گنجائش نہ تھی چپ رہیں۔ لبنی جگمگاتی ٹرائی دھکیلتی داخل ہوئی۔

”وہ تاریخی تصویر آپ لوگوں نے غائب کر دی۔ یہ بڑی زیادتی اور بے انصافی کی بات ہے۔ اس کی ملکیت کی اصل حقدار یہ خاکار ہے۔“

”اگر حقداروں کو انکی چیزیں واپس کرنی شروع کی جائیں تو دنیا میں بہت کم لوگ ایسے رہ پائیں گے جنکے پاس کچھ باقی بچے گا۔“ نگار خانم نے بے نیازی سے بات کی۔

”آپ اس گھر سے ہی اس کا رخیر کا آغاز کیجئے“ عندلیب بانو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اب بیکلخت شہوار پر حق گوئی و میا کی کا دورہ پڑ گیا۔ قہوے کی نقشتیں MIESSEN پیالی ہاتھ میں لیے لیے اٹھیں اور قوارے کی طرف جاتے ہوئے خطبہ انداز میں گویا ہوئیں۔ ”یہ گھر اور کارخیر — اصل حقداروں کی فہرست تو بہت طویل ہے قبل بانی — اس فولکدے کو تعمیر کرنے والے فاتح کش مزدور — ہمارے بھائیوں کے فیکٹریوں کا بھاری لیبر ہمارے کتب خانے کے اصل مالک وہ وثیقہ دار نواب صاحب جنکا لڑکا ایرٹیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ بلرام پور ہسپتال کے خیراتی وارڈ میں۔ کیونکہ باجی نے کتابوں کی بقیہ قیمت۔ وہ حقیر رقم ادا نہ کی

بروقت۔ محض بوجہ کاہلی و بے پروائی۔ اور۔ اور وہ مغلس نوجوان مر گیا کیونکہ اسکے لیے کوفتہ۔ سواری۔ نہ گردہ اسکا نہ کچھی۔
 ”شہوار۔“ نگار نے گرج کر ڈانٹا۔ ”بڑکتو کی طرح باوے پن کے راستے پر نہ چلو۔
 ایں۔ دیوانی ہی ہوئی جا رہی ہیں۔“

”امی۔ اٹھے۔ چلیں۔“ عنبر میں نے کہا۔
 ”ذری میرا بلڈ پریشر دکھیتی جائیے۔“
 ”میں آلہ نہیں لانی ہوں۔“

”میں نے آپ کی کار میں رکھا دیکھا ہے۔ پھلی سیٹ تیر شہوار بولیں۔“ شیا م سنگھ ڈاکٹر صاحب سے چابی لے جاؤ اور انکا آلہ نکال لاؤ گاڑی سے نگار خانم نے حکمانہ انداز میں آواز دی۔

ڈاکٹر کا فرض ہے۔ ڈگری لیتے وقت قسم کھاتا ہے کہ کسی قسم کے ذاتی غصے ذاتی توہین کی پرواہ کیے بغیر مرین کا علاج کرے گا۔ عنبر نے طیش ضبط کر کے پرس میں سے کار کی کنجیاں نکالیں اور لحظہ بھر کے لیے انہیں تکتی رہی۔ یہ کنجیاں پچھلے سال کہاں کہاں چھپائی جاتی تھیں۔
 شیا م سنگھ دربان اسی وقت اندر آیا تھا اور کنگ ایڈورڈ ہسپتال میں شام کی ڈاک لیے کھڑا تھا۔ جو بھائیوں کے دفتر سے بھجوائی گئی تھی۔

عجیب گھر تھا۔ یہ لوگ ولایت سے MIESSEN پیالیاں بھی خرید لائے تھے۔ اور بیش قیمت کنگ ایڈورڈ ہسپتال بھی۔ ساتھ ہی اس کمرے کو پلاسٹک کے اتم غلم سے سجا رکھا تھا۔ عنبر برا فروختہ اور حیرت زدہ بیٹھی رہی۔

شہوار نے چونک کر شیا م سنگھ کو دیکھا۔ اور فارن ایئر میں کالافنہ پلیٹ سے اٹھا کر مسکرائیں۔

”میرے نام کا خط ہے؟“ نگار خانم نے پُر امید آواز میں دریافت کیا۔
 شہوار خانم کے دل میں اسوقت انقلابی خیالات موجزن تھے۔ باجی سے فرٹ ہو رہی تھیں۔
 کینے پن سے جواب دیا۔ ”جی نہیں۔ ایک رسالہ ہے اور حسب معمول چند چٹرنات اوپنوں کے

لفافے۔ آپ سے افسانے منگوائے ہونگے اور کیا۔۔۔

”اردو والوں کو ہمیشہ چیز فانت کیوں کہتی ہو؟ تمہاری مادری زبان فرنج ہے؟ نگار نے جھلا کر پوچھا۔

”خیر مادری زبان فرنج ہونہ ہواب تو فرنج ہی ہونے جا رہی ہے۔ انشا اللہ۔۔۔ یہ ملاحظہ کیجئے موسیٰ القولس دو وال کا مراسلہ“

”ایسے کتنے ہی موسیوز کے لیٹریں نے پھاڑ کر پھینک دیے۔“ نگار نے ہونٹ پچکا کر کہا۔

”اچھا۔۔۔ کب۔۔۔؟“ شہوار نے چونک کر سوال کیا۔

دونوں بہنوں کی سرد جنگ زور کیڑی جا رہی تھی۔ دونوں کو غنیم کا خیال نہیں رہا تھا یا ماں بیٹیوں کی موجودگی غیر اہم ہسپتال سمجھ کر نظر انداز کر دی تھی۔

”اے وہ بھول گئیں مرانڈا ہاؤس میں فرانسیسی پروفیسر کیمسٹری پڑھاتا تھا“

”فرانسیسی نہیں کچھ اور۔ پانڈیچری کا یونیورسٹی تھا“

”اچھا خیر۔ ہوگا“

”اب صاحبزادہ دلشاد علیاں خط نہیں لکھتے؟“ عندلیب بانو نے وار کیا۔

”وہ آپ کی لائن سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو لکھتے ہونگے۔“

”اب تو آپ بھی بفضل خدا اسی طبقے میں شامل ہو چکی ہیں“ عندلیب بانو نے بڑی مٹھاس

سے جواب دیا۔ ”نواب بانی کو تو آپ نے فرضی دادی ہی بنایا تھا۔ نور ماہ خانم اور جبرائیم پیشہ

دلشاد علی آپ کے سچ مچ کے سمدھن سمدھی بن گئے۔ اور انکا حرائی بیٹا آپکا داماد“

نگار شہوار تہلکا کر رہ گئیں۔ عین زور سے منہ ہی۔

”آپ کی اس خوفناک منہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوں کا اثر ابھی باقی ہے“ شہوار نے جوابی حملہ کیا۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔ اے بہن منتے ہی گھر بستے ہیں۔ مبارک ہو بھتیجی کی کھاندائی۔ ہمیشہ دہر

سبحان مبارک باشد۔ آپکے گھر میں خدا خدا کر کے کسی عورت ذات کی شادی تو ہوئی عندلیب

بانو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”عین نے حیرت سے انکو نکا۔ اتنی مینڈ نصف یورپین ماں میں کوئی

ڈونٹی حلوائی گرتی تھی یا اتنے قالب میں لواب سگیم بول رہی تھیں۔

”ہمارے ہاں توڑکے لڑکیاں دُونوں بیاہے جاتے ہیں آپکے گھرانے میں البتہ لڑکیوں کی شادی کا رواج نہیں۔“ نگار خانم نے سرد آواز میں جواب دیا۔
 ”میں تو آپکی نواسی بھی دیکھ آئی۔“ عندلیب بانو بولیں۔

”میری نواسی —“ نگار خانم نے چپیں بجیں ہو کر دہرایا۔
 ”آپکی بھتیجی کی لڑکی آپکی نواسی ہی تو ہوئی۔ بڑی خوبصورت ہے ماشا اللہ۔ اسکی دادی نے چرچ میں پتسمہ دلو کر اسکا نام بھی بڑا پیارا رکھا ہے نورآ — نور آڈریک — بروزن نور آڈریک —“

دارکاری تھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد شہوار بیگم بولیں — ”انکا کیا ہوا۔ ڈاکٹر قندھاری — تا چاری — کچھ عجیب سا نام ہے۔“
 ”کاشغری —“ عنبرین نے شیریں لہجے میں جواب دیا۔
 ”ہاں۔ ہاں — وہی۔ سنا ہے وہی آپکو علاج کے لیے برطانیہ لے گئے تھے۔“
 ”آپ نے صحیح سنا۔ انھوں نے وہاں بڑی دوڑ بھاگ کی میرے علاج معالجے کے سلسلے میں۔ سال بھر۔“

”سال بھر تو وہ وہاں نہیں رہے۔ اکثر یہاں ہمارے ہاں آئیے۔ حسب سابق۔“
 ”انکا نام کیسے بھول گئیں؟ اور وہ برابر کیسے رہ سکتے تھے۔ یہاں ماشا کون چلاتا؟“ عنبرین نے اب ذرا لکنت سے جواب دیا۔

”باجی جان — موسیو دوآل کا خط آیا ہے۔ معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب ذرا میں یہ خط پڑھ لوں۔“ شہوار نے ایرمیل کا طویل نیلا لٹافہ چاک کرتے ہوئے کہا۔ ایک رنگین تصویر برآمد ہوئی۔ خط پڑھ کر بولیں۔ ”لکھتے ہیں اپنے وائن یارڈ میں چاٹو — نئی چاٹو بنوا رہے ہیں۔“
 ”وین یارڈ میں شاٹو —“ عندلیب بانو نے نرمی سے تصحیح کی۔

”ابھی جو ہم لوگ یورپ گئے تھے وہیں ملاقات ہوئی۔ بھیا سے کچھ انکا بزنس کنکشن ہے۔ بے چارے نے سید خاطر مدارات کی پیرس میں۔ شپ اونر میں بہت بڑے۔ چھوٹے بھیا

نے انکو کھدیا تھا کہ یورپ میں ہماری LOOK AFTERY کریں۔“

”لک آفٹری — ؟“ عندلیب بانو نے دہرایا۔

”جی ہاں۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ شادی کرلو — کیوں باجی۔ کتنے مصرتھے؟“

باجی چپ رہیں۔ ”میں نے شرط رکھی مسلمان ہو جاؤ۔ کہا چند مجبوریاں ہیں۔ جائیداد اور کاروبار وغیرہ کی۔ جنگی وجہ سے مذہب تبدیل کرنا ذرا مشکل ہے فی الحال ہمارے ساتھ لندن بھی گئے تھے۔ یہ تصویر ملا خط کیجئے۔ اسلامک کلچر سنٹر میں کھینچی تھی۔ بروز عید الفطر یہ بالکل میسے پیچھے تیسری قطار میں کھڑے ہیں۔“

عنبر نے لچی سے دیکھا۔ شہوار نے گروپ فوٹو میں ایک چھوٹے سے گول مٹول گلابی چہرے پر انگلی رکھی۔ ”بہت مہینڈ سم ہیں۔“ شہوار نے کہا۔

”جی ہاں ضرور ہونگے۔ مگر تصویر اتنی چھوٹی ہے کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا۔“ عنبر بولی۔

”کرٹینا آدنا س بھی ان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر انکو اور نیل لڑکیاں پسند ہیں۔ کہتے ہیں وہ بہت اچھی بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میرے چکر میں مسلمان بھی ہو جائیں گے۔ لندن میں برابر اسلامک کلچر سنٹر جایا کرتے تھے۔ مگر میں نے گھاس نہیں ڈالی۔“

تصویر دکھاتے ہوئے شہوار نے موسیو الفونس دو وال کا خط پتائی پر ڈال دیا تھا۔ عنبر نے اس ٹائپ شدہ مختصر نوٹ پر دیدہ نظر ڈالی۔ ”ڈیر شہوار خانم۔ متوقع ہوں کہ آپ بخیر ہوں گی۔ وہ تصویر جو آپ کے فیملیوں کے روز لندن میں کھینچی گئی تھی حب وعدہ ارسال کر رہا ہوں۔ اب ہے آپ اپنے یورپ کے سفر سے لطف اندوز ہوئی ہوں گی۔ مخلص الفونس دو وال شیا م سنگھ بیگ لے کر حاضر ہوا۔“

”ڈاکٹر بیگ کا بیگ —“ انگار خانم مصنوعی شگفتگی سے بولیں۔ بلڈ پریشر چیک کروا لے صوفیہ پر بیٹھ گئیں۔ تقابست سے اپنا بازو پیش کیا۔

دربان نے باہر جانے سے قبل سارے سوئچ اوں کر دیے۔ وسطی فوارہ ابلنے لگا۔ تقریبی قطب مینار، سوپ اسٹون کا تاج محل اور پلاسٹک کی ٹکلیوں والے گلوب روشن ہو گئے۔ آبشار جاری ہوا اور مصنوعی درخت پر بیٹھی کمینکل چڑیاں چہچہانے لگیں۔ شہوار خانم نے

ہاتھ بڑھا کر میوزیکل مگرٹ باکس کھول دیا۔ "اولڈ لینگ زائین" کی دھن بجنے لگی۔ نگار خانم نے دائیں ہاتھ سے شام کی ڈاک میں آیا ہوا ایک ادبی رسالہ کھولا اور اس میں چھاپا اپنا تازہ افسانہ پڑھنے میں منہمک ہو گئیں۔ منٹ بھر بعد اسے رکھ کر نئے نادل کے پروف اٹھالیے۔

نگار خانم اپنے چھتیسویں نادل کی پروف ریڈنگ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر عنبریں بیگ انکا بلڈ پریشر چیک کرنے میں مصروف تھی۔ شہو اکسی یورپین شپ اور کا خط دوبارہ پڑھتے ہوئے اپنی نئی تخلیق کی تخلیق میں مگن ہو چکی تھیں۔

دریچے کی نشست پر بیٹھے بیٹھے عنذلیب بالونے باہر اندھیرے آسمان کا جائزہ لیا۔ پرندے بسیرا لینے کیلئے اڑتے جا رہے تھے۔

گویا وہ سب اپنے اپنے رول پر واپس موجود تھیں۔

"بنیک ٹودی پولین۔" دریچے کے نیچے چھپے خواجہ سبز پوش نے اُچک کر کمرے کے منظر پر نگاہ ڈالی اور گویا رواں تبصرہ کیا۔ انکو بالکل اپنے قریب موجود پاکر عنذلیب بالونگھبرا گئیں۔ اور دِنڈو سیٹ سے اٹھیں۔ جھاڑ بھکا سر نے فوراً اندھیرے میں ڈبکی لگائی۔

ٹیبل ویرن پرنس شروع ہو چکی تھیں قبلائی ہمدردی سے چلتا اندر آکر ایڈیٹ بکس کے مقابل میں بیٹھ گیا۔ اسے سمجھائی کم دیتا تھا۔

عنبریں نے مریضہ کو انکابی پی بتایا اور اٹھی۔

"کھانا کھا کر جاییے" شہوار نے اخلاق سے کہا۔

"جی نہیں۔ شکریہ۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ بھی تو کہیں جانے والی تھیں۔ افسوس ہے کہ آپ کا راستہ کھوٹا گیا۔"

"پھر ضرور آئیے گا۔"

"ضرور" مسز بیگ نے چلتے چلتے ایک آخری گولہ داغنا مناسب جانا۔ نگار خانم سے مخاطب ہوئیں۔ "برسٹیل تذکرہ۔ آپ کے سمدھی دلشاد علی خاں۔ انکے متعلق تو آپ کو علم ہو گا۔"

تائب ہو کر حج کرنے چلے گئے۔ مکے میں ٹل ہو گئے ہیں۔ وہاں اسکول میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔
 ”میں نے سنا ہے آپ پھر لندن جانے والی ہیں“ نگار خانم نے اپنی مشین گن کا رخ عنبر کی طرف کیا۔

”درست۔“ عنبر نے بولی۔ ”مجھے ہر تین ماہ بعد وہاں جانا ہے براے چیک اپ۔ کیونکہ میرا مرض ایسا ہے آپکو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی۔ کہ برطانیہ کے مشہور ماہر امراض دماغی روزین باؤم نے کہا ہے کوئی گارنٹی نہیں کہ دوبارہ عود نہ کر آئے عین ممکن ہے میری یہ تندرستی عارضی ثابت ہو۔ حیثیت ڈاکٹر میں اس صورت حال کو بخوبی سمجھتی ہوں۔“

”خدا نہ کرے۔ ہیری کے دیدوں میں رائی نوٹن۔ بیماری عود کرے تمہارے دشمنوں کی۔“ عنذلیب بانو نے چمک کر بالکل اپنی ماں نواب بیگم کے انداز میں کہا۔ نانی کی یہ آواز مدتوں قبل کس عنبر سے کلکتے میں سنا کرتی تھی۔

ہمیں اپنی پرچھائیوں سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ دلشاد علی خاں نجائے کس طرح بھاگ نکلے۔ اگر میں ان پرچھائیوں کو قطعاً قبول کر لوں تو شاید اچھی ہو جاؤں۔ عنبر نے اپنی ماں پر نگاہ کی۔ بہت دنوں بعد پہلی مرتبہ۔ محبت اور درمندی کے ساتھ۔ انکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے پرانے دوستانہ لہجے میں بولی ”COME ON OLD GIRL, LET'S GO.“

دونوں بہنیں انکو خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھیں۔ عنبر انکی طرف مڑی۔ ”سمجھیں آپ۔“ خواہران عزیز۔ میں دوبارہ پاگل ہو سکتی ہوں۔ کسی لمحے بھی کسی انسان کے دماغ کا پرزہ اچانک ٹوٹ سکتا ہے۔ آپکے صحیح الدماغ برادر معظم کے برعکس میں چند ماہ تک واقعی محفوظ الحواس رہ چکی ہوں۔ مطلب یہ کہ۔۔۔ منفر کسی صورت میں نہیں۔ نہ مجھے۔ نہ آپ کو۔ نہ دنیا کے کسی اور انسان کو۔ کوئی محفوظ نہیں۔ چاہے وہ بھیانک واقعہ ایک بے ضرر سے گناہ گمبھو نے تخلیق کیا ہو۔ یا کسی جذباتی صدمے نے۔ کوئی حادثہ ہو۔ یا علالت۔

”یا آخری مہلک بیماری۔“ یا کوئی اور ناگہانی مصیبت۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے ہسپتال اور یتیم خانے جیل خانے اور پاگل خانے اور قحبہ خانے سبکس و مجبور مخلوق سے

نہ بھرے ہوتے — اور دلی آگرے کی ایک نجیب الطرفین خاتون گلرخ بانو بیگم عرف نواب فاطمہ کو اس رہن نامے میں — جو پون صدی بعد اس خوفناک رات آپکے اسی خوفناک کمرے میں اس بلوریں میز پر رکھوا لایا تھا — اس رہن نامے میں آج سے ستر برس قبل وہ اعلیٰ نسب مغل زادی خود کو ”قومِ گنجی“ لکھوانے پر مجبور نہ ہوتی ہوتی۔

”امی جان — آپ کو پتہ ہے — مارواڑیوں والے واقعے کے دوسرے روز جب منصور نے مجھے رہن نامے کی یہ عبارت سنائی اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اشکبار نہ دیکھا تھا۔ مرد آسانی سے نہیں روتے۔“
آبشار والے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں بعد ذرا الجھ کر شہوار نے میوزیکل باکس کو دوبارہ کھولا۔ ”اولڈ ٹینگ زائین“ بجنے لگا۔ وہ محبوب جان لیو اسکاٹش نغمہ —

SHOULD OLD ACQUAINTANCE BE FORGOT

AND NEVER BROUGHT TO MIND

عندلیب بانو ٹھٹھک کر اسے سننے میں محو ہو گئیں۔
”امی چلیے،“ عنبریں نے پکارا۔ اسوقت میوزیکل سگریٹ باکس کے قریب ایک اور مانوس چمکیلی شے پر اس کی نظر پڑی۔ منصور کا نفرنی سگریٹ کیس۔ لاہور دی مینا کاری کے موٹو گرام MK سے مزین۔ ہفتہ بھر قبل ان ماں بیٹیوں کی برطانیہ سے واپسی پر جب وہ انکے استقبال کے لیے اموسی ایروپورٹ آیا تھا یہ سگریٹ کیس اسکے ہاتھ میں تھا۔
ٹیلی ویژن کی خبریں سنتے سنتے قبلانی بخارا کارپٹ پر سوچکا تھا۔
منصور شاید پچھلی بار جب نگار خانم کو دیکھنے آیا ہو گا تو یہاں بھول گیا ہو گا۔ عندلیب بانو نے دل کڑا کر کے سوچا۔ وہ بھی اس سگریٹ کیس کو دیکھ رہی تھیں۔

SHOULD OLD ACQUAINTANCE BE FORGOT—

انہوں نے جھک کر نغمہ سرا ڈبے کا پٹ بند کر دیا۔
”آپ منصور سے شادی کب کر رہی ہیں؟“ فوارے کے پاس کھڑی شہوار نے شکر گھولتی آوازیں عنبر سے دریافت کیا۔

”آپ کب کر رہی ہیں؟“ عنبریں نے سکون کے ساتھ بہہ بہہ ”امی! اچلیے بھتی“
 ”بستی ڈاکٹر صاحب کا بیگ اٹھاؤ۔“ نگار خانم نے حکم دیا۔

رنگ برنگی پھیلیوں کے ٹینک کے پاس رک کر عنبر نے میزبان خواتین کو پھر مخاطب کیا
 ”چنانچہ میری پیاری بہنو۔ ہر ناگہانی مصیبت سے ڈرتی رہیے۔ کوئی آزاد نہیں۔ کوئی
 مختار نہیں۔ سارا معاملہ اندھا دھند ہے۔ پانیوں پر بہتی موسیقی کے اس سُریہ آپ دونوں سے
 اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ سیلی۔“

مرمت شدہ ہری ایمپینڈر فرائٹ کے ساتھ پورٹیکو سے نکلی۔ ڈرائیو پر سے گذرتی بند
 پھاٹک سے جانکرائی۔ ایک ہیڈ لیمپ چھین سے ٹوٹا۔ کار دھچکے سے پیچھے ہٹی۔ ایک پچھلا پہرہ
 پام کے گلے پر چڑھ گیا۔
 عنبریں نے سر جھٹک کر سامنے دیکھا اور پوری طاقت سے جیجی۔ ”باسٹرڈ۔“

چوکیدار سڑک پر سے بھاگتا ہوا آیا۔ پھاٹک کھول کر حادثے کا جائزہ لیا۔ جھلا کر بولا
 ”سیک صاحب۔ گالی کیوں دیتی ہیں؟ آپ تو گیٹ توڑے ڈال رہی ہیں۔ ہم
 سامنے گئی پر چلے گئے۔ تھے۔ بیڑی لینے۔ ہارن بجا دیا ہونا۔ اوپر سے ہم کو بائیں ٹرولر تھی ہیں چینی
 کا گملہ چھوڑ ڈالا۔ سویرے ہماری چھٹی بیڑی بنیادس جوتے لگا کر نکال باہر کر سکی“
 شام سنگھ لپکا۔ ”داگدر صاحب کیا ہوا۔ چوٹ تو نہیں آئی۔ ہاتھوڑا سا

بیک کر لیجئے۔ ادھر۔ اور ادھر۔ اب ٹھیک“

”تھینک یو شام سنگھ۔“

”داگدر صاحب سامنے کی ایک بتی ٹوٹ گئی۔“

”ٹھیک ہے۔“

کار چینی کے شکستہ گلے اور پام کے پودے کو روندتی سڑک پر نکل آئی۔

مسٹر بیگ نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ مٹھیاں بھیچے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ انہوں نے چہرے سے ٹھنڈا پسینہ پونچھا۔

”سوری اتنی جان“ منسان سڑک پر کچھ دور جا کر گیر بدلتے ہوئے عنبرین نے کہا: ”اب میں بہت احتیاط سے چلایا کروں گی گاڑی۔“

عندلیب بیگ خاموش رہیں۔

”اتنی پان کھائیں گی؟“ ایک کھوکھے کے سامنے کار روکی۔ بانکی تبنولن نے مسکرا کر پوچھا ”بیگم صاحبہ بگھٹی بناویں؟“

”ہاں۔ دو۔ سادے۔“

دکان میں ٹرانزسٹرنج رہا تھا۔ میرے انگٹے میں تمہارا کیا کام ہے۔ عنبرین چوٹی دیوار پر سچے پرنٹ بے دھیانی سے دیکھا کی۔ امیتا بھ بچن۔ پروین بابی۔ ریکھا۔ شہناز چندنی کی تصاویر پر صبح کے ڈالے ہوئے جنبیلی کے ہار مر جھاگئے تھے۔ نیچے مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ سڑک پر خاموشی طاری تھی۔ اسٹریٹ لیمپ کی زرد روشنی میں بیٹھے ایک سیاہ کتے نے منہ اوپر اٹھا کر دانت نکوسے۔ بھیڑ کی سواری جیسا رنگ تیرہ۔

”نوش کیجئے۔“ تبنولن نے گلو ریاں پیش کیں۔

عنبرین نے پیسے دے کر کار آگے بڑھائی۔

حضرت گنج کے ایک سینما ہال سے تماشائی باہر آرہے تھے۔

عندلیب بانو نے پان منہ میں رکھا۔ گہری سانس بھر کر کہا ”چلو کوئی کچر دیکھیں سیکنڈ شو“

عنبرین نے گاڑی چھتر منزل کی سمت موڑتے جواب دیا۔ ”نہیں۔ اب سیدھے

گھر چلتے ہیں۔ دریا نہ نما۔“

آبشار والے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے اٹھ کر ”خواجہ سبز نوش“ نے کپڑوں سے مہٹی جھاڑی۔ سرد، بھیگی زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سُن ہو چکی تھیں۔ ایک چندل پھر سے اڑا۔ احاطے کے باہر آوارہ کتا مسلسل رو رہا تھا۔ ایک گرگٹ رات کی رانی کی ٹہنی پر سے

اچھل کر عشق پیچاں کی گھسی پیل میں غایب ہو گیا۔ اکیلا جگنو گلاب کی شبنم آلود بھاڑی میں دیکے جا رہا تھا۔ چاروں طرف تاکتے جھکے جھکے، شاگرد پیشے کی سمت بڑھے۔ اپنی اندھیری کوٹھری میں پہنچ کر بجلی کا سوئیچ اداں کیا۔ بلب کا فیوز پھراؤ گیا۔ موم بتی تلاش کی کوڑ بند کر کے چٹنی لگائی۔ اپنی ”چاہ بابل“ کی سلاخوں والی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ آسمان پر زہرہ اور مشتری تیزی سے چمک رہی تھیں۔ قطب ستارہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھینچتا رہا۔ ہوا چلی۔ مینہ برسنے لگا۔

کھڑکی سے ہٹ کر خواجہ سبز پوش کونے میں سُلگتے ”علیؑ“ کے دھوئے کے قریب جا بیٹھے۔ گھٹنوں میں سر دے لیا۔

دھویں کے باریک مرغولے طرح طرح کی شکلیں اور ہیولے بنایا کیے۔ تھوڑی سی خاک اٹھا کر ہتھیلی پر رکھی۔ اسے دھیان سے دیکھتے رہے۔ باہر بارش کا زور بڑھ گیا۔ کھڑکی کے پٹ کھڑکھڑانے لگے۔ خواجہ سبز پوش نے چمکی بھر رکھ اپنے بھارت جھنکار کھڑکی بالوں پر ڈالی۔ اور ایک فلک شکات تہقہہ لگایا۔ جیسے کھوپڑیوں کی مالا پہنے، انگ بھوت لگائے شمشان میں بیٹھا کال بھیروہنے۔

کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز پر وہ چونے۔ انگلیوں سے پلکیں رگڑا کیے۔ باپس تلاش کر کے بھی ہوئی موم بتی جلائی چہرے پہ ہاتھ پھرا۔ ہتھیلی پہ لگی راکھ آستین سے پونچھی پاؤں کی بیڑیاں کھینچتے۔ کھسکتے کھڑکی تک پہنچے اس کے ایک شکستہ پائے کے نیچے رکھی اینٹ نکالی۔ گھڑے کا پانی چھلک گیا۔ دوسرا دھکا لگا کھڑا نیچے آ رہا۔ پانی سے شرابور ہو گئے۔ لیکن انھوں نے پرداہ نہیں کی۔ اینٹ اٹھا کر اسے ہاتھ میں تولابھر پوری طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں مہمک ہو گئے۔



اختتامیہ

اس نیم دستاویزی ناول کے مندرجہ ذیل کردار قطعی فرضی ہیں۔
 ڈاکٹر عنبر بن بیگ۔ غنڈلیب بالنو۔ نواب فاطمہ عرف نواب بیگم۔
 نلومینا۔ منور سی کشمیرن۔ دنواز عرف جتن بی۔ مہرو۔ شمو۔ چھتو۔
 راحت بانی۔ گجر بانی۔ نگار خانم۔ شہوار خانم۔ پری بیگم۔ نورادریک عرف
 نورماہ خانم۔ شیلی ڈریک عرف سرینادیوی۔ ڈاکٹر شاردا کھنہ۔
 کرن بھائیہ۔ ہری مایا بھٹناگر۔ پون کمار سی مصر۔ جھرنادیوی۔
 پریتمبھادیوی۔ ”سویدشس لیڈی“ مسر خان۔
 ڈاکٹر منصور کا شعری گنام نواب صاحب۔ مرزا عثمان بیگ۔
 چودھری فتح محمد۔ شدو خاں۔ دلدار علی برلاس۔ مرزا سبط احمد۔
 شیخ عبدالباسط گوٹے والے۔ نواب سہراب نگر۔ راجہ نیلم گڈھ۔
 پیرانی دلی کے بیری والے شاہ جی۔

کیلاش نرائن ماتھر۔ خان بہادر برکت اللہ۔ کاٹھیا واڑی دربار صاحب۔
 ٹھاکر مہیشور سنگھ جی۔ کرنل ڈالٹن۔ آندرے ریناں۔ چارلس کوریہ۔
 رائے بہادر امبارشاہ حقیر۔ سید شکور حسین۔ ٹھاکر جوادی علی آف دھانیپور۔
 راجہ دشا علی خان۔ سندریشور نرائن سنگھ عرف کنور سینڈی۔
 جارج ڈریک۔ نورمن ڈریک۔ خواجہ سبز پوش اورانکے بھائی۔ نواب منجھ صاحب
 بطیموس۔ پینا توئس۔ زآغ دہلوی۔ جے پور کا کنوڑیا گھرانہ۔
 شرف الدین۔ جرمنی کے آریہ گردی۔ آسٹرین ہیٹ والے شاعر۔
 پری محل اور تعلقہ دھان پور بھی فرضی ہیں۔
 جرمن اور عربی باجی لوجیا حسین بخش مرکب کردار ہیں۔